ای ایف یو

ایک تحریک

تشکیلِ پاکستان کے تناظر میں
ایک ادارے کی تعمیر و ترقّی

مصنّف : وولفرام کرنوسکی

مترجم : باقر نقوی

اوّلین اردو اشاعت 2007ء

جملہ حقوق محفوظ

اس کتاب کا کوئی حصہ یا اقتباس مصنف رمترجم رادارے کی اجازت کے بغیر نقل نہیں کیا جاسکتا۔
بلا اجازت ایسی کسی کارروائی پر قانونی چارہ جوئی کا حق استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا جملہ کام اکادمی بازیافت، کتاب مارکیٹ، آفس # 17، گلی # 3، اردو بازار
کراچی، فون 2751428 کے زیرِ اہتمام ہوا۔

ای ایف یو کے روحِ رواں

روشن علی بھیم جی

کے نام

ترتیب

چند باتیں ... ۱۱
پیش لفظ ... ۱۳
پیش گفت ... ۱۶
تشکر ... ۲۰
تعارف ... ۲۲

پہلا باب

آزادی کا سفر اور مسلمان ... ۲۵

ہندوؤں کی نشاۃ ثانیہ
۲۷

سر سید احمد خان
عظیم مصلح: بابائے علی گڑھ
۳۱

نئی صدی کی آمد
آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل
۴۱

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
شاعرِ مشرق
۴۸

قائداعظم محمد علی جناح
معمارِ پاکستان
۶۰

ایک نئی مملکت کا ظہور
کامیابی یا غیر فیصلہ کن برابری؟
۷۱

دوسرا باب
ای ایف یو اور پاکستان کی اُبھرتی ہوئی صنعت کاری ... ۷۶
ای ایف یو کی تخلیق
۸۵
پاکستان میں بیمے کی صنعت کے پہل کار
این اے قاضی
۹۵
محمد چودھری
۹۷
ایم اے چشتی
۹۹
ایس سی سجالی
۱۰۱
اعجاز اللہ صدیقی
۱۰۵
رُوی دُباش
۱۰۸
معین فدا
۱۱۱

تیسرا باب
نا قابلِ فراموش افراد کے خاکے اور حالاتِ زندگی ... ۱۱۵
سرپرست
عالی مرتبت نوّاب بھوپال
۱۲۱
عالی مرتبت آغا خان
۱۳۴

بنیادکار
عبدالرحمٰن صدیقی
ایک نڈر، اور صاف گو مثالیت پسند
۱۴۹
خوند کر فضلِ حیدر
بھوپال سے ہمارے ساتھی
۱۶۷

نگرانِ کار

عباس خلیلی
ہمارے مدراسی ساتھی
۱۸۳

اصفہانی خاندان
زیبِ داستان
۱۹۷

راجا صاحب محمود آباد
ایک ذی شرف درویش
۲۰۸

اراگ خاندان
مشکل وقت کا ساتھی
۲۱۹

ایس ایم یوسف
ایک بے مثال سرکاری افسر
۲۲۵

سعید احمد
اعتبار کا قلعہ
۲۳۰

جہانگیر صدیقی
مالیات کے جادوگر
۲۳۸

محمد علی سعید
ماہرِ قانون اور خاندان کا ایک فرد
۲۴۷

جسٹس میاں محمد محبوب
ایک محافظ، ایک مصلح
۲۵۲

اشرف تابانی
سندھ کے ہمارے گورنر
۲۵۸

تصاویر۔۱
۲۶۱

عظیم شراکت دار شخصیات

اِروِن سی آئیون
جرمنی کا رابن ہڈ
۲۷۹

خدا بخش
ہیمۂ زندگی جن کی زندگی کا مقصد تھا
۲۸۸

ایس ایم معین الدین
ایک سچا دوست
۲۹۶

ہائنز شوارز
روشنی کا مینار
۳۰۳

میاں سعید احمد
ایک لاہوری سلسلہ
۳۱۰

سید سبطِ حسن
جتنے بڑے ادیب اتنے ہی بڑے آدمی
۳۱۷

ایس ایف عالم
ایک بے عیب اور معتبر انسان
۳۲۷

شرافت علی والا جاهی
ہمیشہ ایک قدم آگے
۳۳۰

ساجد زاهد
ایک آزاد منش
۳۴۰

نواب حسن
سفید فام اشرافیہ کا ایک فرد
۳۴۸

عظیم رحیم
بنگالی اندازِ شرافت
۲۵۵

سلطان احمد
سنگِ خارا
۳۵۹
ڈاکٹر محمد سعید خان
ایک پہل کار طبیب
۳۶۴
ابو المحمو د
کامیابی کا نشان
۳۶۷
ایس اے رشید
آپ کا مخلص
۳۷۱
محمود جعفری
غیر منجمد خفیہ خزانہ
۳۷۵
مرزا فیض احمد
زمین سے آسمان تک
۳۷۹
محمد حسین علوی
شہابِ ثاقب
۳۸۳
ابا علی یوسفی
نگہبان
۳۸۹
محمد فصیح الدین
ایک تیکنیکی ضمیر
۳۹۴
ڈاکٹر تاج الدین مانجی
ہمیشہ حاضر
۳۹۹
حسن علی عبداللہ
ناقابلِ خرید و فروخت جنس
۴۰۵
طاہر ساچک
ایک غیر متوقع نعمت
۴۰۹

سیف الدین زومکاوالا
آزاد بھی اور منسلک بھی
۴۱۹

تصاویر۔۲
۴۳۱

کتابیات
۴۴۷

اِشاریہ
۴۵۲

چند باتیں

باقر نقوی

کیا ترجمہ کرنا آسان کام ہے؟ آسان بھی ہے اور مشکل بھی! یہ ترجمہ کرنے والے پر منحصر ہوتا ہے وہ کون سا راستہ اختیار کرے۔

جب کسی متن کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جا رہا ہو، جس کو آسان سے لفظ میں ترجمہ کہتے ہیں، تو مترجم پر آگے اور پیچھے، دونوں سمت سے ایک جیسی یلغار ہوتی۔ پہلی زبان تقاضا کرتی ہے کہ منتقلی کے عمل میں کسی بھی قسم کے الفاظ استعمال کیے جائیں مگر متن کا لہجہ اور اس کی روح سے بد دیانتی نہیں ہونی چاہیے۔ اور وہ زبان جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہو، تقاضا کرتی ہے کہ متن جیسا بھی ہو، استعمال کیے جانے والے الفاظ اور محاوروں کا لغوی اور معنوی احترام کیا جانا چاہیے۔ گویا، متن کا لہجہ اور روح دونوں کیسے بھی ہوں میزبان زبان کی تہذیب اور آداب کو مجروح نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسا مشکل مرحلہ ہوتا ہے جس سے گزرنا آسان نہیں۔

میں نے حتی الوسع ان دونوں صورتوں سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالاں کہ ترجمے کے دوران ایسے بہت سے مقام آئے تھے جہاں میرے دل میں بے ساختہ کچھ انحراف کی خواہش ابھری تھی مگر میں نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

بعض کیفیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں کبھی متن عبارت پر حاوی ہو جاتا اور کبھی عبارت متن پر قابض ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں اچھا ترجمہ وہ ہوتا ہے کہ متن سے انصاف کے ساتھ ساتھ اس کی عبارت ایسی ہو کہ قاری ایک بار پڑھنا شروع کر دے تو پڑھتا ہی چلا جائے۔

لیجیے! اب کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اور مطالعے کے بعد آپ خود فیصلہ کیجیے گا کہ آپ کو اس کے مطالعے میں لطف آیا یا نہیں۔ اگر نہیں تو میری تقریباً دو برس کی محنت اکارت گئی۔

اس تمہید کے بعد میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مصنف، جناب وولفرام کرنوسکی کو خراجِ تحسین پیش کروں جنھوں نے ایک غیر ملکی (جرمن) ہوتے ہوئے برِصغیر کے حالات اور معاملات کا ایسا تجزیہ کیا ہے کہ اگر اس کتاب سے ان کا نام ہٹا کر کسی ہندوستانی یا پاکستانی کا نام لکھ دیا جائے تو قاری کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ یہ کتاب کسی غیر ملکی کی لکھی ہوئی ہے۔ انھوں نے جس محنت، محبت اور عالی نظری سے واقعات کی تفصیلات جمع کیں اور افراد کی کیفیات کا تجزیہ کیا ہے، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

میں پچھلے دس برس سے شاعری ایک طرف رکھ کر نثر کی طرف راغب ہو گیا ہوں۔ میں نے اس عرصے میں اردو زبان میں مختلف النوع مضامین کی پانچ کتابیں تحریر کی ہیں۔ اٹھارہ سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتابیں ''الفریڈ نوبیل۔ حیات اور نوبیل انعامات،'' ''جینیات،'' ''برقیات مع مختصر تاریخ،'' ''مصنوعی ذہانت۔ ایک مختصر جائزہ'' اور ''نوبیل اور ادبیات'' جیسے (اردو کے لیے) اجنبی موضوعات پر مبنی ہیں۔ آخر الذکر کتاب ادب کے انعام یافتگان کے کوائف کے ساتھ انعام دینے کی تقریبات میں پیش کیے گئے طویل اور پُر مغز خطبات کے تراجم پر مشتمل ہے۔

میں نے دانستہ یہ کوشش کی ہے کہ اردو میں سائنسی موضوعات پر لکھ کر اپنی زبان کی کچھ خدمت کروں، اور شاعری کو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرانِ شعر و نغمہ کے لیے چھوڑ دوں۔ اگر چہ میرے خیال میں زبان کے لیے ان کی خدمات ضرورت سے کہیں زیادہ ہیں۔

میں کُل وقتی ملازمت بھی کرتا ہوں اس لیے اس قسم کے کام کے لیے میرے پاس وقت کی کمی رہتی ہے۔ اس پر مستزاد میری افتادِ طبع ہے کہ جو کچھ بھی کرو دل لگا کر اور ایمان داری سے کرو۔ جلد بازی سے کام خراب ہوتے ہیں جب کہ تخلیقی کام عرق ریزی کے لیے فرصت کے رات دن ڈھونڈتا ہے۔ اور جب فرائضِ منصبی ہی خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیں تو ایسے غیر پیشہ ور کام کے لیے وقت کہاں سے نکلے۔ یہ میرے لیے سب سے بڑی مشکل تھی، ہے اور زندگی بھر رہے گی۔ تو پھر یہ اٹھارہ سو صفحات کس طرح وجود میں آئے؟ یہ سوال ذاتی نوعیت کا ہے اور اس کا جواب دینا ڈینگ مارنے کے مترادف ہوگا اس لیے میں جواب دینے سے پرہیز کروں گا۔

چوں کہ اس کتاب کا موضوع میرے پسندیدہ موضوعات سے بالکل الگ تھا اس لیے اس کے ترجمے کے دوران کبھی کبھی میں ہار ماننے لگتا تھا۔ میری شریکِ حیات فیروزہ بیگم جب مجھے الجھتا دیکھتیں تو دل جوئی کے لیے کچھ آرام کا مشورہ دیتیں۔ ایسی ہی کیفیت میں ایک بار میرے منھ سے نکل گیا کہ بس کل ہی میں سیف الدین صاحب سے معذرت کرلوں گا کہ میں اس کام کو پورا نہیں کرسکتا۔ یہ سنتے ہی فیروزہ بیگم مسکرائیں اور بولیں، یاد رکھیے کہ یہ کام آپ احسان کے طور پر نہیں کر رہے ہیں۔ یہ تو آپ کا فرضِ منصبی ہے اور آپ اس کام سے انکار نہیں کر سکتے۔ غرض 'مرتا کیا نہ کرتا'۔ مرا تو نہیں بس کرتا رہا۔ اس لیے اس کام کے لیے سیف الدین زومکاوالا صاحب، کو صرف فیروزہ بیگم کا ممنون ہونا چاہیے، میرا نہیں۔

متدرجہ بالا جملۂ معترضہ کے بعد میں سیف الدین زومکاوالا اور طاہر ساچک صاحبان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کام کے لیے مجھے منتخب کیا، اس لیے کہ ای ایف یو کے معماروں کی تاریخ میں میرا نام نہیں تو کم از کم مترجم کی حیثیت سے میں اس کی تاریخ سے ہمیشہ منسلک رہوں گا۔

پیش لفظ

رفیق بھیم جی — منیر بھیم جی

سیف الدین زومکاوالا

زیرِ نظر کتاب کے مصنف وولفرام کرنوسکی، جناب روشن علی بھیم جی اور ای ایف یو (ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی) کے معاملات آپس میں اتنے گتھے ہوئے ہیں کہ ای ایف یو سا گا اور ان کے دوست جناب بھیم جی کی سوانحِ حیات کی تصنیف کے لیے مصنف سے بہتر کوئی شخص میسّر نہیں ہوسکتا تھا۔

بھیم جی اور کرنوسکی صرف ایک مشترک پیشے ہی سے منسلک ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی سوچ اور اپنے نظریات کی ہم آہنگی کی وجہ سے بھی ایک دوسرے سے بہت قریب رہے ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ ''روشن میرے نزدیک بڑے بھائی کی طرح تھے۔ انھوں نے کوئی بھی ایسا اقدام نہیں کیا، خواہ وہ ای ایف یو یا دوسرے منصوبوں سے متعلق ہو، جس کا مجھے علم نہ ہوا ہو۔''

ایک شام دورانِ گفتگو دونوں دوست اس بات پر متفق ہوگئے تھے کہ ای ایف یو میں ضرور ایسی کوئی خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کے بنیاد گزاروں میں نواب صاحب بھوپال جیسی شخصیت بھی شامل ہوگئی تھی، جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور پاکستان کی تخلیق کے سلسلے کی ایک نمایاں شخصیت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان دو حضرات نے طے کیا تھا کہ ای ایف یو کی تاریخ مرتب کی جانی چاہیے جس میں پاکستان کی تخلیق کی بھی مختصر تاریخ شامل ہو۔

کرنوسکی کہتے ہیں، ''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں یہ کتاب خود لکھوں گا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس ادارے کے چند نوجوان افسروں اور کچھ تجربے کار محقق حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی کی صدارت کے فرائض انجام دوں گا جس کو یہ کام سونپا جائے گا، مگر مجھے جلد ہی احساس ہوگیا کہ یہ کام محض اس قسم کی 'ٹاسک فورس' کے بس کا نہیں ہوگا۔'' یقیناً وولفرام کرنوسکی کے اندر کا پوشیدہ مصنف انگڑائیاں لے رہا تھا جو اپنے لڑکپن کے دور میں جرمن زبان میں مختصر افسانے، مضامین اور نظمیں لکھتا رہا تھا۔

وولفرام کرنوسکی جرمنی کے مشہور شہر ہیمبرگ میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے بیمے، فنونِ لطیفہ اور موسیقی کے مضامین کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جب وہ ہیمبرگ کی کالج آف آرٹ اینڈ میوزک میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو انھیں موسیقی اور ادب دونوں میں گہری دل چسپی ہوگئی تھی۔ لہٰذا اس کتاب کی تصنیف کا ارادہ گو کہ ان کے لیے ایک دھچکے کی طرح تھا لیکن، صحیح معنوں میں وہ اس کام کے لیے موزوں ترین شخص تھے۔

جو کام اگست ۱۹۹۷ میں شروع ہوا تھا وہ محبتوں اور محنت پر مبنی تھا مگر اس میں کم دشواریاں نہیں تھیں۔ کتاب لکھنے کے لیے مواد اکٹھا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ انھیں کم از کم ستّر افراد سے طویل گفتگو کرنا تھی، جن میں سب سے پہلے ان کے اپنے پیارے دوست روشن علی بھیم جی تھے۔ دوسرا دھچکا انھیں اس وقت لگا جب ان کے سامنے تفصیلات سے پُر بہتر آڈیو ٹیپ رکھی ہوئی تھیں جن کو سن کر ان میں موجود مواد کی

ترتیب اور تحریر کے لیے کوئی مددگار میسّر نہیں ہوا۔ اس ہمالیائی کوشش سے آگے، جس سے ایک ہزار چار سو صفحات سیاہ ہوئے تھے، یہ بھی مرحلہ تھا کہ مزید مواد کے لیے انھیں پاکستان کی تاریخ پر تحقیق کرنی تھی جس کے لیے ہزاروں صفحات کھنگالنے تھے۔ ان مراحل کے بعد بالآخر ۱۹۹۸ء میں انھوں نے انڈونیشیا کے تفریحی مقام بالی سے تحریر کا سلسلہ شروع کیا جو ۱۹۹۹ میں امریکی ریاست فلوریڈا میں ان کی تفریحی تعطیل کے دوران جاری رہا اور باویریا کے پہاڑی سلسلے کے قریب جھیل Starnberg کے ساحل پر واقع Tutzing کے حسین باغیچے تک چلتا رہا جہاں موسم سرما کی برف باری سے بچنے کے لیے کرنوسکی پناہ گیر ہوتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ اور موسیقی کی تعلیم کے بعد، اپنے والد کے اصرار پر، وولفرام کرنوسکی نے ۱۹۵۳ء میں ایک زیرِ تربیت افسر کی حیثیت میں ایک بیمہ کمپنی میں ملازمت کر لی۔ ساتھ ہی انھوں نے ہیمبرگ میں انشورنس انسٹی ٹیوٹ کے امتحانات بھی دیے اور امتیازی کامیابی حاصل کی۔ وہ غالباً اس آخری پرانی نسل سے تھے جو دوسری جنگِ عظیم میں شمولیت سے بچ رہی تھی۔ اس زمانے میں نوجوان کارپردازوں کی کمی تھی جس کی وجہ سے کام کرنے کے لیے جرمن نوجوانوں کو بہت سے مواقع حاصل تھے۔ بیمے کی صنعت میں کچھ ملازمتوں کے بعد خوش قسمتی سے ۱۹۵۹ء میں انھیں مشہورِ زمانہ میونخ ری انشورنس کمپنی میں ایک افسر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ یہ ملازمت ایسی تھی جس میں انھیں سفر کرنے اور دنیا دیکھنے کے بہت مواقع نصیب ہوئے۔

میونخ ری کی ایما پر ۱۹۶۰ء میں ان کو ای ایف یو انتظامیہ کی امداد کے لیے اس کے صدر دفتر کراچی میں منیجر کی حیثیت میں تعینات کیا گیا تھا۔ وہ کہتے ہی کہ ''میں ای ایف یو میں روشن علی بھیم جی سے پہلے شامل ہوا تھا۔'' جب بھیم جی، جو بنیادی طور پر بیمۂ زندگی کے آدمی تھے، ۱۹۶۱ء میں کمپنی کے جنرل منیجر بنے تو جنرل انشورنس کے میدان میں کرنوسکی ان کے تکنیکی مددگار ہو گئے۔ ان کے مراسم آپس کے اعتماد اور ایک دوسرے کی پسندیدگی پر قائم ہوئے۔ بھیم جی نے ایشیا اور ایشیائی ذہنیت کو سمجھنے میں کرنوسکی کی مدد کی جس کے عوض کرنوسکی نے بھیم جی کی، بیمے اور دوسرے معاملات کے سلسلے میں سفر میں ان کی معاونت کی۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کرنوسکی نے کریڈٹ اینڈ کامرس گروپ کی تین کمپنیوں کی ترتیب اور قیام میں اپنے دوست روشن علی بھیم جی کی اس وقت معاونت کی جب انھوں نے ۱۹۷۲ء میں پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کرنوسکی کہتے ہیں کہ ''پاکستان میں ہمارا قیام بڑا دل چسپ رہا تھا، اس قدر کہ یہ ملک ہمیں اپنا دوسرا وطن لگتا تھا۔'' ان کی اہلیہ ارسلا، جو خود ایک پیشہ ور خاتون تھیں، اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان آئیں، جہاں ان کو جرمنی کے سفارت خانے میں ملازمت بھی مل گئی، ایسی ملازمت جس سے ان کو بہت سارے فوائد حاصل ہوئے۔ کرنوسکی کی ملازمت کی نوعیت نے ان کو پاکستانیوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا۔ انھوں نے کہا کہ ''میرے زیادہ تر دوست پاکستانی تھے اور روشن نے مختلف النوع تہذیبی حلقوں سے متعارف ہونے میں میری امداد کی تھی۔''

فنونِ لطیفہ، ادب، تاریخ، سیاست وغیرہ میں گہری دل چسپی کے باعث کرنوسکی اور ان کی اہلیہ نے ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جس سے وہ پاکستان کے بارے معلومات حاصل کر سکتے، اور اپنے کتب خانے کے لیے نہایت قیمتی کتب اور دوسرے نوادرات حاصل کرتے۔ اس 'سنہرے دور' میں اپنے پاکستان میں قیام کے دوران کرنوسکی بے انتہا بے تکلفی سے اندرونِ سندھ اور پنجاب کے شہر شہر گاؤں گاؤں گھومتے، مقامی لوگوں سے گپ شپ کرتے اور اپنے اطراف اکٹھا ہونے والے لوگوں کے ساتھ چائے اور حقہ پیتے۔ ہر ماہ کرنوسکی اپنے گھر میں سندھی موسیقی اور مشاعرہ بھی کرتے اور اپنے دوستوں کو اس میں مدعو کرتے تھے۔

ان کے لیے سب سے زیادہ خوشی اور دل بستگی کا موقع وہ تھا جب ۱۹۶۳ء میں بندر روڈ، کراچی کے سینٹ تھ ڈے ایڈونٹسٹ اسپتال میں ان کی پہلی اولاد، کلاڈیا، تولد ہوئی تھی۔ کرنوسکی خاندان ۱۹۶۶ء میں میونخ واپس چلا گیا جہاں میونخ ری انشورنس کمپنی کی انتظامیہ میں ان کو

ایک بڑا عہدہ دیا گیا جس میں ان کی ذمے داریاں مشرقِ وسطیٰ، جنوب مشرقی ایشیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ میں ان کے ادارے کے مفادات کی دیکھ بھال کرنے پر منحصر تھیں۔ اسی برس ان کی دوسرے بیٹی اینڈریا میونخ میں پیدا ہوئی۔

ان کی اہلیہ ارسلا نے سفر ہو یا حضر، پاکستان، میونخ، جاپان یا دنیا کے کسی خطے میں جہاں ان کو ملازمت کی ذمے داریاں لے جاتیں، وولفرام کرنوسکی کی رفاقت کی۔ ہم نے ہمیشہ ارسلا کو اپنے شوہر کے ساتھ مسکراتے ہی پایا۔ وہ ہر معنوں میں ایک عظیم خاتون ہیں، مشرق اور مغرب کی مختلف اور رنگارنگ تہذیب کا ایک بے مثال آمیزہ!

وولفرام کرنوسکی کہتے ہیں کہ پاکستان میں اپنے چھ برس کے قیام میں ان کو ایشیائی ذہنوں کو پڑھنے کی صلاحیت نصیب ہوئی اور یہ ان کا پاکستان کا تجربہ ہی تھا جس کی مدد سے انھوں نے جاپان میں پانچ کامیاب سال گزارے تھے۔ وہاں بھی کرنوسکی جوڑا جاپانی تاریخ اور تہذیب کی رنگارنگی میں ایسا ڈوبا کہ وہ قدیم Kabuki اور Noh تھیٹر کا دلدادہ ہوگیا۔ کرنوسکی کو صرف اس بات کا افسوس ہے کہ جاپان میں تو ان کو جاپانی زبان کی بنیادی تعلیم پر مجبور کیا جاتا رہا، جب کہ پاکستان میں مقامی زبان سیکھنے میں ان کی ہمت افزائی نہیں کی گئی۔ اردو بولنے اور سیکھنے کی ان کی تمام کوششیں رائگاں جاتیں۔ جب بھی وہ اردو بولنے کی کوشش کرتے تو ان کے مخاطب پاکستانی یہ سمجھ کر کہ شاید کرنوسکی کی نظر میں ان کی انگریزی اچھی نہیں، اس لیے وہ انگریزی بولنی شروع کر دیتے۔

کئی ترقیوں کے باعث وہ ۱۹۹۵ء میں میونخ ری انشورنس کمپنی کی اعلیٰ انتظامیہ کے رکن بن گئے اور پینتیس برس کی ملازمت کے بعد، جس کا بیش تر وقت ایشیائی ملکوں کے سفر میں گزرتا رہا تھا، وہ ریٹائر ہو گئے۔ پھر بھیم جی کے اصرار پر ۱۹۹۶ء میں انھوں نے دوبارہ ای ایف یو میں ڈائریکٹر اور مشیر کی حیثیت سے شمولیت قبول کر لی۔

کرنوسکی گھرانے کو خدا نے دو خوب صورت بیٹیوں سے نوازا ہے اور ان سے تین بچے ہیں جو ان کی والہانہ محبت کا مرکز ہیں۔ بیٹی کلاڈیا، جو بین الاقوامی بینکر تھی، اپنے شوہر اور دو بیٹوں کے ساتھ میونخ کے نواح میں، جہاں اس کے والدین مقیم ہیں، رہتی ہے۔ اینڈریا، جو ایک مینجمنٹ کنسلٹنٹ اور ادیب بھی ہے، برطانیہ کے شہرِ علم آکسفرڈ کے نواح میں اپنے شوہر اور بیٹی کے ہمراہ مقیم ہے اور ہینلے مینجمنٹ کالج اور کئی بین الاقوامی اداروں کے لیے مینجمنٹ پروگرام تیار کرتی ہے۔

کرنوسکی جوڑا اس قول پر ایمان رکھتا ہے کہ ''اگر آپ ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہیں تو زندگی بہت حسین ہوتی ہے۔'' اور اسی کے مطابق زندگی کی مصروفیات کے منصوبے بناتا ہے۔ ولفرام کرنوسکی ہمہ وقت ایک نئے باب کھولنے میں یقین رکھتے ہیں، لہٰذا، آج کل وہ اپنے ایشیائی تجربات کی بنیاد پر جرمن زبان میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ ان کا ارادہ اپنی پیانو نوازی کو آگے بڑھانے کا بھی ہے۔ جسم کو صحت مند رکھنے کی خاطر ان کا ہر صبح دوڑنے کا معمول کبھی قضا نہیں ہوتا۔ وہ گالف بھی کھیلتے ہیں اور اپنی اہلیہ کے ساتھ پیراکی بھی کرتے ہیں اور یہ ساری مصروفیات ان کو صحت مند رہنے میں مدد دیتی ہیں۔

نومبر/۲۰۰۰، کراچی

پیش گفت

مجھ سے بار ہا یہ سوال کیا گیا ہے کہ ایک جرمن نژاد ہوتے ہوئے میں نے کسی پاکستانی ادارے کی تاریخ لکھنے کا بیڑا بھلا کیوں اُٹھا لیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ ادارہ جس کی عمر صرف ساٹھ برس کے لگ بھگ ہے، دنیا کے کسی بھی تجارتی معیار کے مطابق اس کی عمر کچھ اتنی سنسنی خیز بھی نہیں۔

اس کا جواب بہت آسان سا ہے۔ میرے خیال کے مطابق اس ادارے کی تاریخ عام قسم کی نہیں۔ اس کے ڈانڈے اس وقت سے ملتے ہیں جب ہندوستان کی سر برآوردہ شخصیتیں ایک ایسے ملک کے قیام کے خواب دیکھ رہی تھیں جو ان کا اپنا ہوگا نہ کہ ''تاجِ برطانیہ کا ایک نگینہ''۔ اور اس ادارے کے قیام کے پیچھے ایک دور رس نگاہیں رکھنے والا گروہ تھا، خواہ وہ سیاست داں ہوں، تاجر، طالب علم اور دانش ور، ہندو یا مسلمان، سب سمجھ رہے تھے کہ برطانوی راج کے ختم کیے جانے کا وقت آ چکا تھا۔

زیادہ تر لوگ میں جن کے بارے میں لکھوں گا، مسلمان ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو اگر چہ اس خطے کے آبادی میں اقلیت تھا مگر اسی طبقے کے بزرگوں نے اس پر صدیوں حکومت کی تھی۔ یہ اپنے طبقے کی اس جد و جہد کے سرخیل تھے جس کا مقصد ہندوستان کی سیاست میں زیادہ شراکت حاصل کرنا تھا اور جو آخر کار اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اپنے فیصلے خود کرنے کے قابل ہونے کے لیے ان کو اپنا ایک ملک، یعنی پاکستان بنانا ہوگا۔

اسی بنا پر میں نے ہندوستان کی جد و جہدِ آزادی کی تاریخ کو، اس میں مسلمانوں کے کردار کو اور اس ادارے کی تاریخ کو ایک ہی تناظر میں لانے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں اس طرح پاکستان کے اس عظیم ادارے میں کام کرنے والے لوگوں کو اپنے ماضی میں جھانکنے اور اس ادارے کے اسلاف کے اہم کردار پر نظر ڈالنے کے مواقع ملیں گے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے قیام میں حصہ لیا، اس کو کامیابی کی ڈگر پر ڈالا بلکہ اس ملک کے بنانے اور اس کی ترقی میں بھی مدد کی۔

اگر چہ اس ملک میں گزرے ہوئے چالیس برسوں میں ہونے والی سیاسی، معاشرتی اور معاشی تبدیلیوں کا میں عینی گواہ ہوں مگر میں نے اس بات کی کوشش نہیں کی ہے کہ اس ملک کے قیام کے بعد سے ہونے والے تمام واقعات اور ان سارے تجزیوں اور تنقید کو دُہرایا جائے جس پر مجھ سے زیادہ ذمہ دار لوگ پہلے ہی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ حالانکہ سچ پوچھا جائے تو جس شخص نے چالیس برس تک بہت کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اس کو ان کو بیان کرنے کی کی کتنی شدید خواہش ہوگی، خاص کر اس وقت جب کہ یہ ملک اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہا ہو۔ میں وہ چھوٹی سے کہانی واقعی کبھی نہیں بھول سکتا جو میرے تاریخ کے پروفیسر نے مجھے یہ بتانے کے لیے سنائی تھی کہ تاریخ لکھنے والوں کے لیے یہ کتنا کٹھن ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں وہ حتی الامکان مطلق سچ کے برابر ہو۔

وہ چھوٹی سی کہانی کچھ یوں تھی: جن دنوں والٹر ریلے (Walter Raleigh) ٹاور آف لندن میں اپنے سزائے موت کے انتظار میں دن گزار رہا تھا، اس نے اپنے قید و بند کے دن دنیا کی تاریخ لکھنے میں صرف کرنے کی کوشش کی۔ ایک دن جب ریلے اپنے قید خانے کے دریچے سے باہر دیکھ رہا تھا، اس کا ایک دوست ٹاور کی جانب آتا دکھائی دیا۔ عین اسی وقت ٹاور کے برابر سے گزرنے والی سڑک پر کچھ لوگ آپس میں لڑ پڑے۔ تھوڑی ہی دیر بعد والٹر کا دوست اس کے پاس پہنچ گیا اور دونوں نے تھوڑی ہی دیر قبل ہونے والے واقعے کے بارے میں بات چیت کی۔ دونوں ہی اس بات پر حیرت زدہ ہوئے کہ ایک ایسے واقعے کے بارے جو چند لمحے قبل ہوا تھا ان کے بیان اور تشریح میں کتنا تضاد تھا۔ والٹر کا ملاقاتی فوراً ہی چلا گیا اور والٹر نے اپنے اب تک لکھے ہوئے مسودے کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جب دو آدمی، جو ایک دوسرے کے نظریے کا احترام کرتے ہیں، چند لمحوں قبل ہونے والے سادے سے واقعے پر ایک دوسرے سے مکمل اتفاق نہیں کر سکتے تو بھلا کوئی تجزیہ کرنے والا تاریخ داں ایسے واقعات کے بارے میں اعتبار سے کیا کہہ سکے گا جو وقت اور واقعے کے مطابق بہت پہلے ہو چکے ہوں۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ واقعی کہانی ہے یا کوئی افسانہ، مگر خوب صورت ضرور ہے۔ یہ سب کہہ لینے کے باوجود میں ان معنوں میں مطمئن نہیں ہو سکتا کہ اگر ہر لکھنے والے نے سر والٹر ریلے کی مثال سامنے رکھی ہوتی تو آج تاریخ پر کوئی کتاب موجود نہ ہوتی۔ تو کیا دنیا کی تاریخ کے یہ سارے خود ساختہ چوکیدار شر انگیز نہیں ہیں یا اگر مثبت انداز اختیار کیا جائے تو یوں بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ نویسی کے عمل کے لیے کیا یہ لوگ ناگزیر ہیں؟ میرے خیال میں اس سوال کا جواب نہ صرف ہاں میں ہوگا بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر میں ایک افریقی کہاوت نقل کرنا چاہوں گا جو یوں ہے ''جب سارے شیر فنا ہو جائیں گے تو شکاریوں کی کہانی سنانے کے لیے کون باقی رہے گا؟''

میں ان میں سے کسی زمرے میں نہیں آتا۔ میں تو صرف وہ کچھ محفوظ کر دینا چاہتا ہوں جس کا یا تو مجھ کو خود تجربہ ہوا ہے یا دنیا کے اس خطے میں رہنے والے دوستوں یا جاننے والوں سے جو کچھ حقیقتیں، تفصیلات، واقعات میرے علم میں آئے، اور ان افراد کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی اور بالخصوص پاکستان کی تخلیق کے سلسلے میں جد و جہد کی۔ اور پھر جب ١٤/اگست ١٩٤٧ء کو پاکستان کی تخلیق کا خواب حقیقت میں تبدیل ہوا تو ان ہی لوگوں میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو اس نئی مملکت کی سیاسی اور معاشی ترقی کی جد و جہد کے افق پر جھلملائے۔ ان سب کی پیش بینی وہ منبع بنی جس نے ان جذبوں اور ان بنیادی آدرشوں کی آبیاری کی جن کے آثار پر ایک مضبوط ملک کو وجود میں آنا چاہیے تھا۔

میں کوئی تاریخ داں ہوں نہ ہی بننا چاہتا ہوں بلکہ مجھے تو اس قسم کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے تھی اس لیے کہ اس سلسلے میں جن لوگوں سے میں نے ملاقاتیں کی ہیں اور احوال سنے ہیں ان کے بارے میں میرے پاس کوئی دستاویز ہے، نہ کتابیں نہ رسائل۔ بدقسمتی سے ابتدا میں کچھ ایسے واقعات ہوئے، جن میں سے دو اہم واقعے تھے ادارے کے صدر دفتر کی کلکتے سے کراچی ہجرت اور ١٩٧٢ء میں زندگی کے بیمے کے کاروبار کو قومی ملکیت میں لیا جانا۔ مجھے تو ادارے کے سال بہ سال بنائے جانے والے میزانیوں کے سوا ایسا کچھ بھی دستیاب نہ تھا جس کی بنیاد پر تحقیق ممکن ہو سکتی۔ ان مشکلات کی وجہ سے مجھے اوّل دن سے کڑیاں ملانے کا کام بھی کرنا پڑا۔ ایک بوائے اسکاوٹ کی طرح تاریخ کے جنگل میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے پڑے۔ مگر میں ان معنوں میں خوش قسمت نکلا کہ ہر ساتھی نے جس سے میں نے اس کھوج میں باتیں کیں، مجھے ایک مشعل دی جس نے دوسرے ساتھی کا پتا بتایا اور دوسرے نے تیسرے کا۔ اس طرح میری اس تلاش کے عمل کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ کبھی تو ایسا لگتا تھا میں کسی ریلے ریس کے مقابلے میں دوڑ رہا ہوں اور ایک جگہ سے حاصل کیا جانے والے مواد دوسرے کو اور دوسرے سے ملنے والا تیسرے کو پہنچ رہا ہے تا آنکہ آخری لکیر پار ہو سکے

مجھ سے بات چیت میں حصہ لینے والے سارے ساتھی اپنے بلند سماجی رتبے کے باوجود بلاشبہ عام آدمی تھے۔ ان سب نے کہانی

کے ٹکڑوں اور حقیقتوں کو اپنے قیاس کے مطابق بیان کیا جب کہ میں نے ان سارے ٹکڑوں کو ہم رشتہ کرنے سے قبل اپنے تجربے اور اپنی معلومات کی بنیاد پر پرکھا جانچا اور دوسروں سے سنے ہوئے واقعات کی کسوٹی پر کسا۔ اس لیے یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس کتاب میں دی گئی ہر قسم کی تفصیل ہمیشہ اور مکمل سچ کے مترادف ہوگی۔ میں بہر حال اس بات کا یقین ضرور دلا سکتا ہوں کہ میں نے انصاف پسندی کے جذبے کے ساتھ وہی کچھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو کچھ متعلقہ افراد کھلے ذہن اور دماغ کے ساتھ کہنا چاہتے تھے، جن میں سے کچھ نے تو، مجھے ایسا لگا کہ، اس وقت اپنے ضمیر اور اپنے دلوں کو ٹٹولا بھی تھا اور بہت زیادہ صاف گوئی کے عوض اپنے گزرے ہوئے تجربات کی تلخیوں کا مزہ دوبارہ چکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اُن لوگوں نے جو کچھ بیان کیا اُنھیں بعد میں اس پر افسوس بھی نہیں ہوگا۔ یہ سب میں نے بالخصوص اس وقت محسوس کیا جب تقسیمِ ہند کے تجربات بیان کیے جا رہے تھے جن میں اپنی بپتا اور اہلِ خاندان کی ہجرت کے زخم ہرے ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے نہ صرف یہ کہ مال دولت اور جائیداد کا خسارہ برداشت کیا بلکہ قریب ترین اعزہ کو بھی کھو دیا۔ لہٰذا تقریباً ہر گفتگو کے دوران یہ سوال بار بار اُٹھا کہ تقسیمِ ہند کیا ایک سیاسی مجبوری تھی اور کیا اتنے جانی اور مالی نقصانات اپنے ہدف کے حصول کے لیے جائز اور ضروری تھے؟ میری توقع کے مطابق ان سوالات کے جوابات نہ صرف بہت مختلف تھے بلکہ بعض صورتوں میں خاصے متنازعہ بھی۔ بہر حال یہ سارے جوابات میرے علم میں اضافے کا سبب بنے۔ ان نکتہ ہائے نظر اور ان کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات کے علم سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ ان بدقسمت واقعات کے ذاتی تجربات کے بارے میں، جن سے یہ اور ان کے اقربا گزرے یا قصداً نشانہ بنائے گئے تھے، جو کچھ میں نے پڑھ رکھا تھا، اس کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد ملی۔

میں چاہوں گا کہ اس تصنیف کی اشاعت کو ایک ایسے شخص کے مشاہدے پر محمول کیا جائے جو اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کے باعث دنیا کے اس خطے میں ایک طویل عرصہ مقیم رہا تھا اور اس کی زندگی پر اس کے اثرات پڑے۔ پاکستان میں قیام اور ایک مقامی ادارے کے لیے کام کرنا ایک ہیجان خیز تجربہ تھا جس نے نہ صرف میری بلکہ میری شریکِ حیات کی زندگی کو بھی زیادہ دل چسپ اور رنگین بنا دیا۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی سے میرا ربط ۱۹۵۹ء سے شروع ہوا تھا جس کو اب چالیس برس ہو چکے ہیں۔ یہ کمپنی اب اپنی عمر کے اڑسٹھویں برس میں ہے اور مستحکم سے مستحکم تر ہوتی جا رہی ہے۔ جب پاکستان اور ہندوستان اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہے تھے تب میں نے اس کتاب پر کام کرنے کے لیے متعلقہ لوگوں سے ملاقاتیں شروع کی تھیں۔ اس کمپنی اور اس ملک دونوں کے طویل سفر میں جو یہاں تک آ چکا ہے، میں شریک رہا ہوں۔ میں نے ان دونوں کے اچھے اور بُرے وقت بھی دیکھے ہیں اور ان کی کامیابی اور بقا کے لیے کی جانے کوششوں کے سارے مناظر میرے نظر میں محفوظ ہیں۔ تکمیل کی اس راہ میں، جو بلا شبہ کبھی نہ ختم ہونے والا ایک مسلسل عمل ہے، میں نے امیدیں، خواب، سراب، اور ناکامیاں بھی دیکھی ہیں جو کسی بھی انسان کی زندگی میں عام طور پر نظر آتے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ میں محبت اور التفات سے لبریز ایک معروضی ذہن کے زیرِ اثر رہوں۔ جہاں جہاں فیصلے کرنے کے مقام آئے ہیں، میں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے انصاف پسندی کی کوشش مدِ نظر رکھی ہے۔ میں نے یہ عہد بھی کیا تھا کہ میں کسی قسم کی تنقید کی پروا کیے بغیر تمام حقائق، وارداتوں، واقعات اور بڑے لوگوں، مردوں، عورتوں سب کے بارے میں، جنھوں نے اس ملک کو عزت اور تکریم کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کے قابل بنایا ہے، کھل کر رائے زنی کروں گا۔

میں نے اس کتاب کو دو ایسی شخصیتوں کے نام کیا ہے جو مختلف وجوہات کی بنا پر میرے دل سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ اپنی شریکِ حیات کے نام جن کے بڑے صبر اور بے دریغ امداد کے بغیر میں ماضی کا اتنا دل چسپ سفر طے نہیں کر سکتا تھا۔ اور جناب روشن علی بھیم جی کے نام جو چار عشروں تک ایسٹرن فیڈرل یونین کے روحِ رواں اور نجات دہندہ کے طور پر رہے۔ انھوں نے اس کمپنی کی تجسیم کی اور اس کو

☆ ''ای ایف یو ساگا'' کے ساتھ دوسری کتاب ''روشن علی بھیم جی کی سوانح حیات''

اپنی یادگار بنا کر چھوڑ گئے ۔ ان کا انتقال اس وقت ہوا جب میں اس کتاب کے لیے تحقیق کا کام تقریباً مکمل کر چکا تھا اور اس کے پہلے صفحے کی تحریر شروع کرنے والا تھا۔ ہم دونوں ساتھی تھے، دوست ہوئے اور پھر بھائی بن گئے ۔ میری بڑی خواہش تھی کہ ان کی زندگی میں ہی یہ کتاب شائع ہو جاتی، اس لیے کہ اس کی اشاعت اور عوام میں تقسیم سے قبل وہ اس پر صاد کرتے ۔ اس منصوبے کے لیے وہ مشعلِ راہ تھے اور جس وقت سے اس کی بنیاد رکھی گئی تھی، ہر مرحلے پر ان کی شرکت رہی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ بقیدِ حیات ہوتے تو جو کچھ میں آنے والے صفحات میں کہنے کی کوشش کی ہے اس پر اپنی مہرِ تصدیق مہر ثبت کر دیتے۔ ممکن ہے کہ وہ کسی نکتے پر اتفاق نہ بھی کرتے مگر اس کتاب کے بوقلموں پہلوؤں پر من حیث الکل میرے نکتہ نظر سے ضرور اتفاق کرتے ۔ اس منصوبے کی ابتدا ہونے سے پہلے ہی ہم دوستوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ اگر کسی مرحلے پر کوئی تنازعاتی سوالات اُٹھے تو ہم یہ دیکھنے کے لیے کہ ان میں سچ کیا ہے، آپس میں مشورہ ضرور کریں گے مگر میں اپنے فیصلے کرنے میں مختار ہوں گا اس لیے کہ ان کے الفاظ میں ای ایف یو کا ادارہ پاکستان کے عوام کی ملکیت ہے باوجودیکہ یہ ان کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔ ان کی معیت کی وجہ سے اس ساری جد و جہد کے دوران میں نے خود کو بہت کم ہی کبھی اکیلا محسوس کیا ورنہ زیادہ تر دوسراتھ کا احساس رہا۔ میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

آخر میں مجھ پر ان کشادہ ذہن لوگوں کے لیے تہِ دل سے شکریہ واجب ہے جنھوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ اور تکلف کے اپنا راستہ تلاش کرنے میں میری مدد کی۔ یہ لوگ ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتے تھے، کمپنی کے سابق اور موجودہ ملازمین جن کے ماضی کی تاریخ کی مجھے تلاش تھی، کمپنی کے ان اعلیٰ افسران کے اہلِ خانہ جو اگر چہ ہمارے درمیان نہیں مگر ہمارے دل ان کی خوب صورت یادوں سے اب بھی معمور ہیں، سابق اعلیٰ سرکاری افسران، معزز صنعتکار، اشرافیہ، سیاست داں، اور پرانے وقتوں کے دوست وغیرہ۔ ان لوگون کی مدد کے بغیر اس کمپنی کے، جو کہ اب ایک بڑا پاکستانی ادارہ بن چکی ہے، مختلف النوع پہلوؤں کی گتھیوں کو سلجھانا میرے لیے ممکن نہ تھا۔

تشکّر

اگر چہ میں عام الفاظ میں، پاکستان، ہندوستان، لندن اور دبئی میں مقیم تمام خواتین و حضرات کا اپنے دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کر چکا ہوں جنھوں نے بہت کشادہ دلی سے اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کرنے میں میری مدد فرمائی جس کے بغیر میری یہ دونوں کتابیں☆ مکمل نہیں ہوسکتی تھیں پھر بھی میرا خیال ہے کہ میں ان لوگوں کا الگ سے شکریہ ادا کروں جنھوں نے کئی قدم آگے بڑھ کر میری مدد کی۔

ان تین برسوں کے دوران جب میں ان کتابوں کی تحریر میں مصروف رہا، میں مندرجہ بالا جگہوں پر خود گیا اور ظاہر ہے کہ پاکستان برابر جاتا رہا ہوں۔ میں نے درجنوں حضرات سے بات چیت کی جنھوں نے ان شخصیتوں کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات اور اپنی معلومات کی بنیاد پر کوائف مہیا کیے جن کی مدد سے میں نے ان لوگوں کے بارے میں لکھا ہے۔

میرا خصوصی شکریہ ان کے لیے جنھوں نے ان لوگوں سے ملنے اور بات چیت کرنے کے لیے ملاقات کا انتظام کیا، جن سے میں ذاتی طور پر واقف نہ تھا یا پھر ان کے موجودہ پتے مجھے معلوم نہ تھے، میں بے حد شکرگزار ہوں کے ایف حیدر صاحب کے فرزند مصطفیٰ حیدر کا جنھوں نے میری بہت مدد فرمائی۔ اس طرح سے میں ای ایف یو کے کچھ افسران کا شکرگزار ہوں جنھوں نے بہت سرعت کے ساتھ مجھے وہ کچھ معلومات فراہم کیں جن کی مجھے تلاش تھی۔ جناب مہدی امام، جناب ڈی ایچ سدھوا، جناب کھتری حسین، اور جناب ایس اے رشید۔ میں ای ایف یو کے EDP Department کے سربراہ جناب سید احمد حق اور ان کے بہت ہی لائق ماتحت جناب عبدالقادر کا شکرگزار ہوں جنھوں نے کتابوں کے آخری مسودے کو چھاپے خانے تک پہنچانے میں جو تکنیکی امداد ضروری تھی، وہ فراہم کی۔

میرے ہندوستان کے سفر میں جو میں نے معلومات اکٹھا کرنے کے لیے کیے تھے، بالخصوص جن دو حضرات نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر میری امداد کی وہ تھے اے سی مکھر جی صاحب سابق چیئرمین و مینجنگ ڈائریکٹر، نیو انڈیا انشورنس کمپنی، مسٹر بھیم جی کے دیرینہ دوست اور ہندوستان میں MunichRe کے مشیر ایم آر مہتا۔

میرا خصوصی تشکر بنگلہ دیش کی ایک بڑی انشورنس کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر جناب شمس العالم کے لیے بھی ہے جو متحد پاکستان کے زمانے میں PIC کے مشہور افسر تھے۔ انھوں نے پاکستان کی انشورنس کی تاریخ سے وابستہ میری یادوں کو تازہ کرنے میں میری مدد کی۔

برطانیہ میں مقیم مسٹر بھیم جی کے دیرینہ دوست دو سابق ڈائریکٹر ڈیوڈ ڈولن صاحب اور جان پال بھی میری شکرگزاری کے مستحق ہیں اس لیے کہ انھوں نے بہت پرانے واقعات کو قلم بند کرنے میں میرے مدد فرمائی۔

ایک اور خصوصی تشکر MunichRe Australia کے مینجنگ ڈائریکٹر ایلین سی ڈریک کے لیے لطفِ خاص کے لیے جنھوں نے

تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل مسودے کو نہ صرف غور سے پڑھا بلکہ پڑھ کر انگریزی قواعد کی تصحیح میں بھی میرے بہت مدد کی۔

شہریار جلیس، EFU General کے تعلقاتِ عامہ شعبے کے نائب صدر کا تذکرہ اور شکرانہ اس لیے از حد ضروری ہے کہ ان کی بے لوث مدد کے بغیر اتنے بڑے منصوبے کی راہ میں، آخری سطر کے لکھے جانے تک، آنے والی اڑچنوں سے، جو ہر لحظہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں، بچ کر نکلنا میرے بس کا نہیں تھا۔ ان کی امداد کتاب کی شروعات سے اشاعت کے بعد میرے ہاتھ میں آنے تک اسی خندہ پیشانی سے رہی جس کے لیے وہ صحافتی حلقوں میں مقبول ہیں۔

میں شکرگزار ہوں اپنے دیرینہ دوست حمید سجالی کا بھی جنھوں نے اس منصوبے کے آخری لمحات میں تکنیکی الجھنوں کو حل کر کے میرا کام آسان کیا۔

آخر میں معروف صحافی محمد میاں صاحب کا اور جناب سیف الدین زومکاوالا کا شکرانہ واجب ٹھہرا جنھوں نے نہ صرف مسودے کی ہر سطر کا بہ غائر مطالعہ کیا بلکہ میری ہمت افزائی بھی کی اور بہت سے قیمتی مشورے بھی دیے۔ سیف الدین زومکاوالا کا میں خصوصی طور پر ممنون ہوں کہ اپنے دیرینہ رفیق جناب روشن علی بھیم جی کی وفات کے بعد انھوں نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔

آخر آخر میں ان تمام بے لوث اور انتھک صحافیوں کے لیے خلوصِ بے پایاں جو مملکتِ پاکستان کے قیام سے آج تک ملک کی بہتر خدمت کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ حسنِ اتفاق ہی تھا جب میں نے اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کرنا شروع کیا تو عین اس زمانے میں پاکستان کے پچاس برس ہونے والے تھے۔ اس موقعے پر جتنا کچھ مواد ان صحافیوں کے طفیل مجھے نصیب ہوا وہ شاید میں کبھی بھی جمع نہ کر سکتا۔ گویا بیٹھے بٹھائے ایک سونے کی کان میرے ہاتھ آ گئی تھی جس سے میں نے خوب استفادہ کیا۔ میں شرمندہ ہوں کہ ان سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا نہیں کر سکتا اور امید کرتا ہوں وہ میری مشکلات کا اندازہ کریں گے اور میری خطا سے درگزر کریں گے۔

تعارف

اس کتاب کے منصوبے پر میں ای ایف یو میں اپنے قریب ترین دوستوں سے جب بھی بات کرتا جناب روشن علی بھیم جی بار بار اس بات پر زور دیتے تھے کہ قاری کو برطانوی راج کے ہندوستان میں بیسویں صدی کے پہلے نصف میں مسلمانوں کو درپیش سیاسی، تجارتی، نفسیاتی میدانوں میں مسائل کے بارے بتانا کتنا ضروری ہوگا۔ ہم دونوں نے اس بات پر ہمیشہ اتفاق کیا کہ ای ایف یو کی تاریخ میں صرف اعداد وشمار اور کمپنی کے بارے میں حقائق، اور بالواسطہ یا بلا واسطہ کمپنی سے متعلق اور اس کے ایک دو درجن افراد کے کمپنی کی ترقی میں تعاون اور ان کے حالاتِ زندگی اور ملازمت کے دوران کام کے بارے میں، منفی یا مثبت معلومات مہیا کردینا ہی کافی نہ ہوگا۔ ہم نے سوچا کہ جو کوئی بھی اس کتاب کا قاری ہو، خواہ وہ ای ایف یو کے موجودہ کارکنان ہوں، ان کے اہلِ خانہ، دل چسپی رکھنے والے دوست، پاکستان یا اس سے باہر کے انشورنس کے شعبے سے دل چسپی رکھنے والے لوگ، امکان ہے کہ ان سب کو برصغیر ہندوپاک کی تاریخ کے بارے اتنا علم نہیں ہوگا جتنا کہ ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ کچھ لوگوں کو چھوڑ کر، یہ مفروضہ، ہر عمر، صنعت، طبقے اور تعلیمی پس منظر کے لوگوں کے حوالے سے قائم کیا گیا تھا۔

لہٰذا ہم نے طے کیا کہ میں مختصراً ان سیاسی اور تاریخی واقعات کا ایک ایسا خاکہ تیار کروں جو بالآخر برطانوی ہند کی تقسیم پر منتج ہوئے، جس پر تاریخ دانوں کی اکثریت متفق ہو، خواہ وہ پاکستان کے ہوں، ہندوستان کے، یا کسی اور ملک کے۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے وہ قاری جو اپنے کاروباری پس منظر یا اس خطے کے تاریخی پس منظر میں ذاتی دل چسپی رکھنے کی وجہ ان سب سے تبدیلیوں سے واقف ہوں، درگزر کریں گے۔ اگر وہ چاہیں تو اس باب سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں یا پھر ایک جرمن کے پیش کیے ہوئے خیالات سے اتفاق یا اختلاف کرنے کی غرض سے اس کو پڑھیں، جس نے ۱۹۴۵ء میں اپنے ملک کی تباہی کے تجربات کی روشنی میں ایک نئی شروعات اور اس میں پیش آنے والی الجھنوں پر کچھ اپنے مفروضے بنا رکھے ہیں۔

اس وقت کے سیاسی اور تاریخی تناظر میں جب ایسٹرن فیڈرل یونین بنائی جارہی تھی، اس کا قیام ایک منطقی اور ناقابلِ فراموش ضرورت تھی۔ جن لوگوں نے اس ادارے کے قیام میں عملی حصہ لیا یا اس خیال کے مددگار تھے، وہ اس وقت کے سیاسی پیش منظر کے ہندوستانی مسلمانوں کی سربرآوردہ شخصیتوں، یعنی مسلم لیگ کے اہم ارکان میں سے تھے۔ غلام محمد، عبدالرحمٰن صدیقی، اصفہانی خاندان، راجا صاحب محمودآباد، آغا خان، اور نظام حیدرآباد جیسے لوگ تھے جن کے نام پردۂ ذہن پر فوراً اُبھرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ بھلا ایسے سربرآوردہ لوگ اس نتیجے پر کیوں پہنچے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ صرف فائدہ مند ہی نہیں ضروری بھی ہے کہ ان کی تجارتی سرگرمیاں بڑھیں اور یہ لوگ بینک اور انشورنس کے کاروبار میں بھی شامل ہو جائیں۔

روشن علی بھیم جی جیسے انسان کے نزدیک ای ایف یو پر لکھے جانے والی کوئی کتاب اس وقت تک نامکمل ہوگی جب تک کہ ۱۹۳۲ء

میں اس ادارے کے قیام سے قبل کے زمانے اور اس وقت کے سیاسی پیش منظر پر خاطر خواہ روشنی نہ ڈالی جائے۔ بھیم جی صاحب نے پورے عرصۂ حیات میں سیاست میں صرف گہری دل چسپی ہی نہیں لی، عملی سیاست میں حصہ بھی لیتے رہے۔ ایک نوجوان کی حیثیت سے انھوں نے آل انڈیا کانگریس کے حریت پسند سپاہی کے طور پر کام کیا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں انھوں نے ایسے شخص کا کردار ادا کیا جو پسِ پردہ رہ کر کام کرتا ہے۔ اسی سبب سے ان کو بادشاہ گر بھی کہا گیا ہے۔

برصغیر ہندوپاک کی تاریخ اور موجودہ سیاست میں میری دل چسپیاں انھیں (جناب بھیم جی) کے زیرِ اثر تھیں، دراصل انھوں نے ہی مجھے اس طرف راغب کیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں نہ دانشور ہوں نہ ہی تاریخ کا طالب علم، اس کے باوجود بھی اس موضوع نے مجھے ہمیشہ مسحور کیا ہے۔ میں جب پاکستان آیا تو میں نے اس خطے کے تاریخی تناظر پر نظر ڈالنے کی شعوری کوشش کی۔ جناب بھیم جی سے ملاقات کے بعد، جو خود بھی سیاسی شعور رکھتے تھے، میری مشکلات کچھ آسان ہوگئیں۔ انھوں نے مجھے اس خطے کے لوگوں کے بارے میں معلومات بھی مہیا کیں اور اس علاقے کی زبان سے بھی آشنا کیا۔ زبان سے میری مراد وہ زبان (الفاظ اور حروف نہیں)، جو آپس میں بولی جاتی ہے، وہ زبان جو یہاں کے لوگوں کے دل اور دماغ بولتے ہیں، جس کے حروف والفاظ کو نہ دیکھا اور نہ سنا جا سکتا ہے۔

جب ہم اس کتاب کی تحریر کے بارے میں تبادلۂ خیالات کے مراحل سے گزر رہے تھے، ہم اور ہمارے دوست، دونوں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس کتاب کے بہت سارے قاری اس دور کی تاریخ کو شاید فضول ہی سمجھیں گے۔ ہم نے سوچا کہ گزرے عشروں بلکہ صدیوں کی طرف پلٹ کر دیکھنے سے ہمارے موجودہ اور مستقبل کے مسائل کے لیے کیا حاصل ہوگا۔ بہت سے لوگ تو ماضی کے واقعات اور ان سے منسلک اعداد وشمار کے نام سے ہی بدک جاتے ہیں۔ تاریخ کی بات آتے ہی لوگوں کا ذہن اسکول کے دنوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ کی طرف منعطف ہو جاتا ہے جن میں عام طور پر جنگ، صلح اور پھر جنگ ہی کے تذکرے ہوتے ہیں۔ جنگیں، لوگ جن سے اکتا چکے ہیں، بلکہ ان کے نام ہی سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں اس لیے کہ خواہ ان کا ذمہ دار کوئی بھی ہو نقصان تو صرف ہمارا، یعنی عوام الناس ہی کا ہوتا ہے اور صاحبانِ اقتدار تو ہمیشہ محفوظ پناہ گاہوں میں نہ صرف عیش کرتے ہیں بلکہ وہ تو ہمیشہ جیتنے والے ہی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

سچ پوچھا جائے تو وہ تاریخ جو ہم لوگوں کو اسکول میں پڑھائی جاتی ہے، اس میں ماضی میں گزرنے والے واقعات کی اصلیت چھپائی جاتی ہے اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اگرچہ ہمیں اس بات کا پورا علم ہی نہیں ہوتا کہ ہمارے اجداد نے کس قسم کی زندگی بسر کی ہے اور ان کے خیالات کیا تھے، اس کے باوجود ہمارا وجود ہمیں ورثے میں ہی ملتا ہے اور بیش تر ہم اپنے اجداد ہی کے طریقے استعمال کرتے ہیں۔ کسی دانشور نے تاریخ کو ''بڑے لوگوں کے طویل ہوتے ہوئے سائے'' سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ساری بڑی تبدیلیاں اور کامیابیاں ان صاحبانِ عقل وفہم ہی کی دین ہوتی ہیں جو وسیع قلب ونظر کے مالک ہوتے ہیں۔ جی ہاں، جب ہم تاریخ کو بے مقصد جنگوں کے سلسلے، فتوحات اور شکستوں سے پُر سمجھتے ہیں تو کبھی کبھی ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تاریخی شخصیات ہی کے خیالات، سازشوں، منصوبوں، خوابوں اور تصورات کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ کے ان نام نہاد واقعات کے پس منظر میں مشہور شخصیات، بادشاہ، جرنیل، روحانی قائدین وغیرہ کے احوالِ زندگی بھی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سیزر، سکندر، اکبر، حضرت محمدؐ، حضرت موسیٰؑ، گاندھی اور جناح وغیرہ۔ یہ ان لوگوں کے کارنامے ہی تھے جنھوں نے ملکوں، قوموں اور لوگوں کی تقدیر کے فیصلے کیے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس برصغیر کی تاریخ میں بھی کچھ دل چسپی لینی چاہیے، ہمیں ان بڑے لوگوں کی طرف غور سے دیکھنا چاہیے جو اس وقت، پچاس برس یا سو برس بعد کے حالات پر اثر انداز ہوں گے جس کو ہم ''تاریخ'' کہتے ہیں۔ ہمیں کم از کم ان پردوں کے پیچھے نظر ڈالنی چاہیے جو آج کے لمحۂ موجود کو ماضی کے گزرے واقعات سے الگ کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ وہی لوگ تاریخ کو ناپسند کرتے ہیں، جنھوں نے بدقسمتی سے غلط استاد کا انتخاب کیا ہوتا ہے۔ میری مراد ہے، واقعتاً

غلط استاد سے، ایسے جو اپنے شاگردوں کو تاریخ کا ایسا رُخ دکھاتے ہیں گویا جو کچھ بھی ہوا بس وہ اتفاقی یا حادثاتی سلسلہ تھا۔ یعنی تاریخ نہ ہوئی بے کار یا اونچے اونچے خیالات کا مجموعہ، تصاویر کی ایک کتاب جو قبیلوں ملکوں کی سربراہی کرنے والی سو دو سو، ہزار دو ہزار نام نہاد بڑی بڑی شخصیات کے تذکرے، ان کی کامیابیوں، ناکامیوں کے نقش و نگار سے مزین ہو۔ کیا ایسے استاد کی شاگردی بدقسمتی نہیں جو حالات اور واقعات کو اصل کیفیت میں بیان بھی نہ کر سکے، جو آپ کی محبوب یا اہم شخصیات کا صحیح تاریخی تناظر بھی پیش نہ کر سکے؟

اگر چہ یہ ضروری نہیں کہ مستقبل کے پچاس برسوں میں پڑھانے یا بیان کی جانے والی تاریخ مخصوص مملکتوں کے حالات پر توجہ مرکوز کرے (مجھے یقین ہے کہ تاریخ کو وسیع علاقوں، براعظموں وغیرہ پر نظر ڈالنی ہوگی) مگر میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ جنوبی ایشیا کے اس علاقے، یعنی بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں پچھلے ایک سو پچاس برسوں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ ہمیں یہ غور دیکھنا چاہیے کہ برصغیر میں برطانوی راج سے آزادی کس طرح حاصل ہوئی، کیسے اور کیوں پاکستان کا قیام ایک حقیقت بنا؟ یہ ایک جدوجہد کا عمل تھا جس سے اپنی نوعیت کا ایک منفرد نتیجہ برآمد ہوا۔ لیجیے ایک قوم کی پیدائش ہوئی، ایک ملک وجود میں آ گیا ۱۴راگست ۱۹۴۷ء سے قبل دنیا کے نقشے پر جس کا کوئی تذکرہ بھی نہ تھا، ایک قوم جس کی سرحدوں کا تعین اس وقت تک نہیں ہوا جب تک کہ ایک شخص جس نے برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ اٹیلی کے حکم پر، از کار رفتہ نقشوں، آبادی کے پرانے اعداد و شمار اور شراب کی بوتلوں کی مدد سے پاکستان تخلیق کر دیا۔ جی ہاں وہی Sir Cyril Radcliffe جس کو اس کے آکسفرڈ کے دوست 'The Squit' کے نام سے پکارتے تھے، جس کا نام تاریخ کے صفحات پر مرتسم ہو گیا۔ اس نے نقشوں میں ایسی تبدیلیاں کر کے پاکستان بنایا کہ اس کے بنتے ہی اس پر بحث و تمحیص شروع ہو جائے اور طرفین آپس کی پیکار میں مشغول ہو جائیں۔ سرحدیں اس طرح کھینچی گئیں کہ مصنوعی لکیروں کے دونوں جانب رہنے والوں کی قسمت کے یک طرفہ فیصلے ہو گئے۔

۱۵راگست ۱۹۴۷ء سے ایک دن قبل جب برصغیر پر برطانوی پرچم یونین جیک آخری بار اُتارا جانے والا تھا، ریڈکلف نے اپنے پوتے کو لکھا، ''مجھے یقین ہے کہ تم چاہو گے کہ تمھیں ہندوستان سے ایسا خط لکھا جائے جس کے لفافے پر برطانوی تاج بنا ہوا ہو۔ کل شام کے بعد کسی کو ایسے لفافے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اور ایک سو پچاس برس بعد برطانوی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یونین جیک کے بعد کون سا پرچم بلند ہوگا، مجھے ابھی علم نہیں کہ اس کے بیچوں بیچ ایک گھومتا ہوا پہیہ ہوگا یا مکڑی کا جالا۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی بنا پر ہندوستان کا کوئی بھی آدمی مجھے پسند نہیں کرے گا اور مجھ سے شاکی اندازاً آٹھ کروڑ لوگ میری تلاش میں ہوں گے۔ میں ان کے ہتھے چڑھنا نہیں چاہتا۔''

انسان کے کیے ہوئے فیصلے کتنے ظالمانہ، غیر منصفانہ اور دور رس ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود جب ہم تاریخ کے صفحات میں جھانکتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ انسان کی اس طرح کی حرکات قوموں کے لیے زندگی اور موت کا سبب بنتی ہیں۔ یہی نکتہ ہے جو پاکستان کی مختصر سی تاریخ کو دل چسپ اور ہیجان خیز بناتا ہے۔

پہلا باب

آزادی کا سفر اور مسلمان

کیا برطانوی ہند کی تقسیم ناگزیر تھی؟ کیا فرقہ وارانہ مسائل اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ آخر کار مسلم اقلیت کے لیے یہ جینے مرنے کا مسئلہ بن گیا تھا، کیا واقعی یہ سوال ہندوستان کی آبادی کے ایک تہائی مسلمانوں کے لیے موت اور زندگی کا سوال تھا؟

اور وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ اس عظیم برصغیر پر بسنے والوں کے لیے خوشی کا موقع تھا کہ ان کی طویل جد و جہد اپنے آخری مرحلے میں تھی اور طویل انتظار کے بعد ہندوستان کی آزادی کا حصول قریب تھا۔

بہت سے لوگوں کے نزدیک آج بھی یہ مسئلہ اہم ہے اور تقسیمِ ہند کے بعد سرحدوں کے دونوں جانب کے سیاست دانوں اور مؤرخین کے درمیان اس موضوع پر بحث اب بھی وسیع پیمانے پر جاری ہے۔

جب سے میں نے اس برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھا ہے مختلف طبقہ خیال اور درجہ سماج کے لوگوں سے اس جذباتی اور بے حد نازک مسئلے پر تبادلہ خیالات کا موقع ملا ہے اور ہماری زیادہ تر گفتگو متنازعہ اور جذباتی رہی ہے۔ ہم کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ کم از کم خطِ تقسیمِ ہند کے اس جانب سب ایک نکتے پر متفق رہے ہیں اور وہ یہ کہ اگر تقسیم نہ ہوتی تو آزادی کے بعد ہندو قومیت غالب آجاتی اور اس کے اثرات یک طرفہ ہوتے۔ مزید یہ کہ باوجود اپنے تمام تر نیک ارادوں کے نہرو اور گاندھی دونوں ہندوستان کے سیاسی دھارے میں ہندو قومیت اور اس کی جارحانہ عصبیت کے نفوذ کو روک نہ سکتے۔

اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہندوستان کے مسلمان دوسرے درجے کے شہری کا رُتبہ پاتے اور تنگ ذہن ہندوؤں کا نشانہ بنے رہتے۔ ہندوؤں کی قومی اکثریت میں مسلمانوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق حصہ نہ مل پاتا۔ آج کے ہندوستان کے غائر مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ اہم حکومتی اداروں اور ان سے منسلک اداروں میں، اِکا دُکا کے سوا، مسلمان کس درجے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ جب اس باب کو لکھنا شروع کیا، اس وقت میں امریکا میں تھا اور ۱۹ر مارچ ۱۹۹۹ء کو نیو یارک ٹائمز میں ایک خبر چھپی تھی جس کا عنوان تھا'' ہندوستان میں نئے مذہبی فسادات میں ۱۵۷ عیسائیوں کے گھر جلا دیے گئے۔'' خبر کی تفصیل میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں عیسائیوں کے خلاف تشدد اس معاشرے میں عام بات ہے اور جب سے ہندو قومیت کا پرچار کرنے والی بھارتیہ جنتا پارٹی حکومتی اتحاد کا حصہ بنی ہے، اس نوع کے فسادات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ لکھنے سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہندوستانیوں کی اکثریت یا اس کے سیاسی لیڈر مذہبی اقلیتوں کے خلاف ہونے والے تشدد یا قتل کی سرپرستی کرتے ہیں۔ میں یہ بھی نہیں سمجھتا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے سارے لیڈر اس قسم کے تشدد سے اتفاق کرتے ہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج پچاس برس گزرنے کے بعد بھی ایسا لگتا ہے کہ اُس وقت مسلمانوں کا استدلال کہ ہندو اکثریت کی حکومت میں ان کا تحفظ غیر یقینی ہوگا، غلط نہیں تھا۔ آج جو کچھ ہندوستان کی عیسائی اقلیت کے

ساتھ ہو رہا ہے بار ہا وہی ہندوستان میں آباد مسلم اقلیت کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ مسجدوں کو آگ لگانا اور مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل اِکا دُکا واقعات نہیں تھے، یہ سب ہندوستان کی آزادی کے بعد سے مسلسل ہوتا آ رہا ہے۔

یہ سب کچھ لکھ کر بجھتی ہوئی آگ پر نفت پاشی کرنا ہرگز میرا مقصد نہیں۔ اس کے برعکس میں پچھلے چالیس برسوں میں ہندوستان کے بے شمار باسیوں سے ملا ہوں جو اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کی اسی نوع کی شرمساری سے مذمت کرتے ہیں جس طرح کہ سرحد پار کے لوگ اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔

پھر بھی میرا خیال ہے کہ جب ہمیں اس سوال کا جواب ڈھونڈنا ہو کہ اس وقت کے معروضی حالات میں کیا ہندوستان کا بٹوارا ہی واحد حل تھا تو اس قسم کے تشدد اور اس کی مسلسل وارداتوں کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ ایک غیر جانبدار غیر ملکی کی حیثیت سے میں ذاتی طور پر کس نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ اس بحث کے بعد ضرور بیان کروں گا۔ مگر اس مقام پر پہنچنے سے قبل ہمیں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے ابتدائی دنوں کے زمانے میں جانا ہوگا تا کہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ یہ سب کس طرح شروع ہوا۔

تحریک کے ابتدائی دنوں میں آل انڈیا کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ دونوں نے حصولِ آزادی کا مقدس سفر ایک ساتھ شروع کیا تھا۔ کم از کم دکھائی تو ایسا ہی دیتا ہے۔ یہ کیفیت ایک قلیل عرصے تک ہی رہی۔ اس کے بعد ان کے راستے مختلف ہوتے گئے اور آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے ساتھ منافرت کے رویے میں اضافہ ہوتا گیا۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ برصغیر کی تقسیم برطانوی راج کا اصل ہدف تھا جو انھوں نے سلطنتِ تاجِ برطانیہ کی تباہی کے انتقام کی صورت میں لیا جو انگریزوں کی مشہور پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے عین مطابق نظر آتا ہے۔

خواہ وہ ہندوستان کے ہوں یا پاکستان کے، سربرآوردہ تاریخ دان اس بات پر متفق ہیں کہ یہ حالات زیادہ دن نہیں رہ سکیں گے۔ اس لیے کہ ہندو مسلم تنازعہ آج کا نہیں، یہ اس وقت سے چل رہا ہے جب اٹھارہویں صدی میں برطانیہ نے ہندوستان فتح کر لیا تھا۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ کسی بادشاہ کے حکم سے نہیں بلکہ ایک انگلستان نژاد تجارتی ادارے کے ہاتھوں ہوا۔ بے شک، جس کو تجارت کرنے کے اختیارات برطانیہ کے حکمران ہی نے دیے تھے۔ دوسرے الفاظ میں پانچ ملین کی آبادی والے ملک نے ایک پورے برِصغیر پر قبضہ کر لیا جس کی آبادی ایک سو پچاس ملین کے لگ بھگ تھی۔

تو کیا تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی تھی؟ کیا وہی کچھ نہیں ہوا جو اس وقت ہوا تھا جب شمال سے آنے والے حملہ آوروں نے ہندوستان پر مغلوں کی حکومت قائم کی اور سات سو برس تک فارسی دفتری زبان کے طور پر رائج رہی، تو کیا نچلے طبقے کے ہندو مشرف بہ اسلام نہیں کر لیے گئے؟ اور کیا شہنشاہ اورنگزیب، جس کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا، ہندو مسلم آویزش کا ذمہ دار نہیں تھا جس کے ذریعے مغل حکومت کو اسلام کا لبادہ پہنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ بہت سارے مسلمان تاریخ دانوں نے اورنگزیب کی ان کوششوں کی تعریف کی ہے جن کے نتیجے میں اس کی مسلمان رعایا کو علیحدہ نظریاتی اور مذہبی تشخص حاصل ہوا۔ بدقسمتی ہی کہیے کہ اس کے انتقال کے بعد سے ہی ان اہم عہدوں پر سے مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور مسلمانوں کا اثر تیزی سے ختم ہونا شروع ہو گیا۔ یہ صورتِ حال اس حد تک بگڑتی نظر آنے لگی کہ ہندوستان کے ایک نامور صوفی نے افغانستان کے تاجدار کو مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ایک خط بھیجا تھا جس میں اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ:

''المختصر، مسلمان بہت ناگفتہ بہ حالت میں ہیں۔ حکومت کے سارے ادارے ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں اس لیے کہ وہ ہی مستعد اور صلاحیت والے ہیں۔ دولت اور خوشحالی ان کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گئی جب کے ہم مسلمانوں کے حصے میں سوائے عسرت اور بدحالی کے کچھ نہیں۔''

جس سرعت سے مغلوں کی حکومت کا زوال ہوا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ تہذیبی اور عمرانی طاقت کے طور پر سات سو برس تک

ہندوستان پر اسلام کا غلبہ رہا۔ فارسی دربار کی زبان رہی اور جیسا کہ سر ولیم ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں لکھا، ''سارے اہم عہدے مسلمانوں کے قبضے میں ہوگئے تھے۔ ہندوؤں نے دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں پر شکریے کے ساتھ اکتفا کی تھی۔ مگر اورنگزیب کے انتقال کے بعد مسلمانوں کی قوت میں کمی ہونے لگی۔ سرکاری دفاتر سے فارسی زبان کو دیس نکالا ملا اور اس طرح انتظامی عہدوں پر مسلمانوں کا اثر ختم ہوگیا۔

۱۸۵۷ء کی ''بغاوت'' کے نتیجے میں مسلمانوں کو سب سے بڑا دھچکا پہنچا۔ مسلمان قربانی کا بکرا بنا دیے گئے۔ برطانیہ نے تحریکِ آزادی کو ''غدر'' کا نام دیا جس کے لیے عام طور پر مسلمان ہی ذمہ دار ٹھہرائے گئے۔ انگریز حکمرانوں کے نزدیک اس موقعے پر خون بہانے سے مسلمان کم زور ہو جائیں گے، جو، اُن کے خیال کے مطابق دہلی اور اودھ پر اُن کی حکمرانی کے سخت مخالف تھے اور یہ بہترین موقع تھا کہ ان کو اس قدر کم زور کر دیا جائے کہ وہ پھر سر نہ اُٹھا سکیں۔ دہلی اور اس کے اطراف ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے مارے جانے کے علاوہ، جن میں کئی مغل شہزادے بھی شامل تھے، مسلمانوں کو معاشی طور پر کم زور کرنے کی غرض سے ان کو ان کی جائیداد سے بھی محروم کر دیا گیا۔ فوج میں بھی مسلمانوں کی بھرتی ممنوع کر دی گئی، اور جائیداد کے علاوہ جو ان کا بڑا ذریعۂ آمدنی تھا، وہ بھی مسدود کر دیا گیا۔ ایک سو سال کے عرصے کے دوران پوری کایا پلٹ چکی تھی۔ انگریزوں کی جانب سے اچھی ملازمتیں، مسلمانوں سے چھینی ہوئی جائیداد اور رسوخ کی عنایات کے صلے میں ہندو انگریزوں کے یارانِ وفادار ہو چکے تھے جب کہ مسلمانوں کو نچلے طبقے کے افراد کا کردار ادا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے علاوہ ''بغاوت'' کے جرم کی سزا کے طور پر مسلمانوں کے تعلیمی ادارے یا تو ضبط، یا بند کر دیے گئے تھے جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلیمی خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔

ہندوؤں کی نشاۃِ ثانیہ

ایک اور وجہ تھی جس نے اس سلسلے میں خرابی پیدا کی۔ ۱۸۵۷ء کے بدقسمت واقعات سے بہت پہلے مغل شہزادوں نے قدامت پسند مذہبی رہنماؤں کو قیادت کے فرائض سونپ دیے تھے۔ ان لوگوں نے شدت سے نہ صرف مغربی تہذیب کو بلکہ مغربی زبانوں، حتیٰ کہ سائنس تک کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ملک پر سے مغلوں کے اثرات ختم ہو جانے کے بعد ہندوؤں نے جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کے برعکس تھا۔ اپنی مشہورِ زمانہ کتاب Discovery of India میں جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کا شاید ادراک نہیں تھا کہ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد، اس کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا جس کا اس سے پہلے کے حملہ آوروں یا سیاسی اور معاشی ماحول سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان پہلے بھی فتح ہوا تھا مگر فرق یہ تھا کہ حملہ آوروں نے اس کی سرحدوں کے اندر ہی اپنے گھر بنا لیا تھا اور یہیں کے ہو رہے تھے۔ ہندوستان نے نہ کبھی اپنی آزادی گنوائی نہ کبھی غلام بنا۔ یعنی اس کو ایسے حالات میں گھسیٹا نہیں گیا، جن کے معاشی اور سیاسی مراکزِ ثقل اس کی دھرتی سے باہر رہے ہوں۔ نہ ایسے حکمراں طبقے کے زیرِ اثر رہا جو اپنی اصلیت اور کردار میں ہمیشہ کے لیے غیر ملکی رہے ہوں۔

ماضی کے ہر حکمران طبقے نے، خواہ وہ باہر سے آیا ہو یا مقامی رہا ہو، ہندوستان کی عمرانی اور معاشی زندگی کے ڈھانچے کو من وعن قبول کر لیا تھا اور اسی کے سانچے میں ڈھل جانے کی کوشش کی تھی۔ سب نے خود کو ''ہندوستانیا'' لیا تھا اور ان کی جڑیں اسی زمین سے سیراب ہو رہی تھیں۔ نئے حاکم بالکل مختلف تھے کہ ان کے اڈے کہیں اور تھے، ان میں اور عام ہندوستانی میں ایک وسیع اور ناقابلِ عبور خلیج حائل تھی۔ وہ روایات میں، اندازِ نظر میں، آمدنی میں اور رہن سہن میں بالکل مختلف تھے۔

مغربی طاقت کی ہندوستان میں آمد سے یہاں آزاد خیال لوگوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو یورپ کو اپنا فکری و عقلی گھر سمجھتا تھا۔ یہ لوگ اس معاشرے کی بیشتر کیفیات پر معترض ہوتے اور ان کے نزدیک نئے حالات میں جدیدیت اور ہم آہنگی کے لیے ہندوستان کی تہذیب کو مشرق اور مغرب کا ایک معتدل آمیزہ ہونا چاہیے۔ اس نوعیت کی یورپ کی نقالی کے خلاف ۱۸۷۰ء میں ایک نئی تحریک نے سر اُبھارا جو صدی کے آخری دنوں تک خاصا زور پکڑ گئی، جس کو بعد میں ہندو نشاۃِ ثانیہ یا ہندو مت کی بازیافت کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کے نزدیک

یورپی تہذیب مادّی اور بے روح تھی جب کہ ہندومت کے داعی مذہبی رجحانات رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے شروع کے ایک یورپی ہمعصر کے مطابق،'' یہ تحریک دراصل ہندوستانی قومیت کو ہندوقومیت میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے، لہٰذا مسلمان اور بودھ مت کے پیرو اس میں اس وقت تک شامل نہیں ہوں گے جب تک کہ ان کو ضروری تحفظات فراہم نہ کردیے جائیں۔'' نئی قومیت اور ہندومت کی بازیافت کے سرخیل سوامی دیانند سارس وتی سمجھے جاتے تھے۔ سوامی وویکانند ہندو تہذیب کی برتری کے مبلغ اور اصلاحی تحریک کے علمبردار کے طور پر اُبھرے جنھوں نے نہ صرف امریکا میں بلکہ ساری دنیا میں بڑی شہرت پائی اور تقریباً تین برس تک ان کا قیام مغربی ممالک میں رہا جہاں انھوں نے خطبے بھی دیے اور اپنی تحریک کے مراکز بھی قائم کیے۔ میرے نزدیک ہندومت کے پرچارکوں میں سوامی وویکانند سب سے سربرآوردہ کردار تھے جو ہندومت کی بازیافت پر اثر انداز ہوئے۔ سوامی جی ماضی پسندی اور ہندوستان کے ورثے پر فخر کرنے کے باوجود جدید ذہن کے مالک تھے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہندوستان کے ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے لکھا،'' میرا ایمان ہے کہ کوئی بھی فرد یا قوم دوسری اقوام سے بالکل الگ ہوکر زندہ نہیں رہ سکتی اور جب بھی برخود غلط عظمت، پالیسی، یا پاکیزگی کے نام پر ایسی کوئی کوشش کی گئی ہے وہ علیحدہ رہنے والے طبقے کے لیے تباہی کا باعث ہوئی ہے۔''

ایک اور سلسلے میں انھوں نے کہا تھا،'' میں ایک سوشلسٹ اس لیے نہیں ہوں کہ میں سوشلزم کو کامل اور بہترین جانتا ہوں، مگر بالکل روٹی نہ ہونے سے بہتر ہے کہ ہمیں آدھی روٹی ہی میسر ہو۔ دوسرے نظام پرکھے جاچکے ہیں اور ان میں کمزوریاں تھیں۔ کیوں نہ ہم اس نظام کو پرکھیں، کچھ نہیں تو منھ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے ہی سہی۔''

اور آخر میں لندن کے ایک ڈاکٹر کی بیٹی اینی بسنٹ کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ہندومت کی بازیافت کے سلسلے میں اسی زمانے میں ایک اہم شخصیت کے طور پر ابھری تھیں جب سوامی وویکانند یورپ اور امریکا میں ہندومت کی تبلیغ میں مشغول تھے۔ وہ ۱۸۹۸ء میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ترجمان بنی رہیں اور انھوں نے سینٹرل ہندو کالج کی بنیاد رکھی جو بعد میں بنارس ہندو یونی ورسٹی بنی۔ ہندوستان میں اپنے soujorn کی ابتدا ہی سے مسز بسنٹ ہندومت کی نشاۃ ثانیہ سے منسلک ہوگئی تھیں۔ انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھا تھا:

'' ہندوستان کے لیے سب سے پہلے ہمیں قدیم مذاہب کو تازہ کرنا، مضبوط کرنا اور ابھارنا ہوگا۔ یہ عمل ہمیں اپنی عزتِ نفس کو بحال کرنے، ماضی پر فخر اور مستقبل پر یقین کرنے میں مدد دے گا اور اس کے حتمی نتیجے میں ایک قسم کی وطنی زندگی کی ایک لہر وجود میں آئے گی اور ایک قوم کی دوبارہ تعمیر کی ابتدا ہوگی۔''

اس ہلچل کے برعکس جس نے تحریکِ آزادی کے بعد، جس کو انگریز ''غدر'' کہتے تھے، ہندو طبقوں کو فعال کیا تھا، مسلمان بالکل منجمد اور معطل ہوگئے تھے۔ مغل سلطنت کے فتح ہونے کے ساتھ ہی مسلمان طبقۂ امرا حکمرانی کے مرتبے سے معزول ہوگیا تھا۔ غدر کے بعد مسلمان طبقے پر مایوسی کے کالے بادل چھاگئے تھے اس لیے کہ ۱۸۵۷ء کی اتھل پتھل کا سارا الزام ان پر ڈال دیا گیا تھا۔ ایسے موقعے سے ہندوؤں نے وہ سارے تجارتی فوائد حاصل کیے جو ہندوستان میں تجارت کے فروغ کی وجہ سے سامنے آئے تھے جب کہ ان کے مسلمان بھائی معاشی طور پر پیچھے رہ گئے، اس لیے کہ انھوں نے کاروبار کے سلسلے میں کوئی خاص رغبت ظاہر نہیں کی تھی۔ اور جب نئے قائم ہونے والے اسکولوں میں مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہندوؤں کے بچے بھرے جارہے تھے، مسلمانوں نے خود کو اس سے بالکل الگ رکھا۔ نتیجے کے طور پر قانون، طب، تعلیم اور صحافت کے میدان مسلمانوں کے لیے بند ہوگئے اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں میں سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی تھی۔ جب کہ بنگالی، ہندو، مدراسی اور مرہٹے یورپ کے فنون اور سائنس سے بہرہ مند ہورہے تھے اور ان کی دانش اور اخلاقی نشاۃِ ثانیہ ہورہی تھی، سارے ہندوستان کے مسلمان مادی مفلوک الحالی اور عقلی پس ماندگی سے دوچار تھے۔

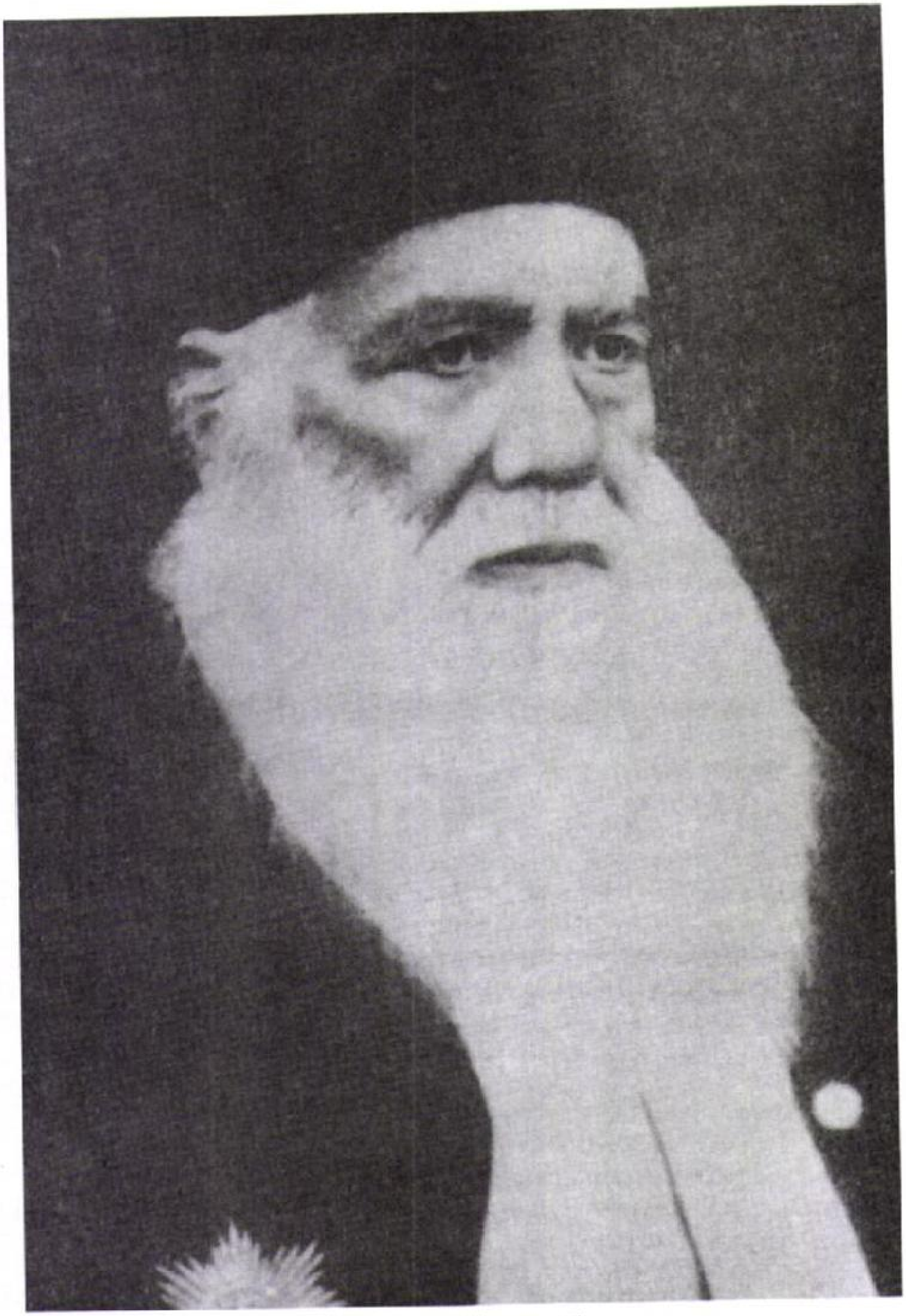

سر سیّد احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء)

سرسیّد کے رفقائے کار جنھوں نے ان کے مقصد کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کردیں (کھڑے ہوئے دائیں سے) پروفیسر آرنلڈ، مولانا شبلی (بیٹھے ہوئے دائیں سے) مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، محسن الملک اور وقار الملک

سر سیّد احمد خان

عظیم مصلح، بابائے علی گڑھ

ایسے ناگفتہ بہ حالات تھے جن میں وہ عظیم انسان ابھرا، مسلمانوں کا نجات دہندہ، رہبر اور رہنما جس کو سر سیّد احمد خان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ میرے نزدیک ہندوستان کی مٹی نے جتنے عظیم سپوت جنم دیے ہیں ان میں جناح، اقبال اور چند دوسرے لوگوں کے علاوہ، واقعتاً سر سیّد مسلمانوں کا نجات دہندہ نکلا جس کے بغیر بلا شبہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کسی اور راہ پر چلی گئی ہوتی۔

ہم نے دیکھا کہ غدر کے بعد، جس کو ہندوستانی جنگِ آزادی کہنا پسند کرتے ہیں، آنے والے برسوں میں مسلمانوں کی قسمت انتہائی تنزلی کے درجے پر تھی۔ چوں کہ وہ تحریکِ آزادی میں مرکزی کردار ادا کر رہے تھے اس لیے وہی انگریزوں کے ردِ عمل کا ہدف بنے۔ اس وقت دہلی نہ صرف آخری مغل بادشاہ کی قیام گاہ تھی، برصغیر کے مسلمانوں کے لیے یہی شہر معاشرتی، روحانی اور دانشوری کا مرکز تھا۔ اور یہی جگہ تھی جس کو سب سے زیادہ مصیبت جھیلنی پڑی تھی۔ برطانوی قبضے کے ساتھ ہی بلا کسی تمیز کے قتلِ عام، آتش زنی، اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا تھا۔ سرِ راہے چلتے ہوئے لوگوں کی بلا جواز گرفتاری، جائیداد کی ضبطی اور موت کی سزاؤں تے، جو روز کا معمول بن گئیں تھیں، مسلمانوں کی اشرافیہ کا تقریباً قلع قمع کر دیا تھا۔

اس قسم کے حالات کے لیے مسلمانوں کی قسمت کو قصوروار اس لیے نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ مسلمان خود اس کے ذمہ دار بن رہے تھے۔ مسلمانوں نے ہر اس شے کو جس کا انگریزوں سے دور کا بھی تعلق ہو، خواہ وہ اچھی ہو یا بُری، ناپسند کرنا شروع کر دیا تھا جس میں انگریزوں کا دیا ہوا نظامِ تعلیم بھی شامل تھا۔ اس طرح مسلمان ایسے چکر میں پھنس گئے تھے جس نے ان کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر زبوں کر دیا تھا۔

سر سیّد احمد خان کی وہ ہستی تھی جس کی رہنمائی میں مسلمانوں کو اپنی خود ساختہ علیحدگی اور دانشورانہ تنزلی سے نکلنا تھا۔ اور اسی شخصیت نے ایسے مشکل حالات سے نکلنے میں مسلمانوں کی کامیابی سے مدد کی۔ سر سیّد ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک مذہبی گوشہ نشین انسان تھے، اس لیے سر سیّد کے بچپن کا بیشتر وقت اپنے نانا کے گھر گزرا جو مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے وزیر تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے باپ اور نانا سے مذہب سے لگاؤ اور سیاسی دور اندیشی ورثے میں پائی۔ بڑے ہوتے کے بعد سر سیّد ایسٹ انڈیا کمپنی کے محکمۂ انصاف میں ملازم ہو گئے اور اپنا فالتو وقت کتابیں لکھنے اور تدوین میں صرف کرتے لگے جن میں بیشتر مذہبی معاملات، اور برصغیر کے مسلمانوں کے درخشندہ ماضی کے بارے میں ہوتیں۔ اپنی ملازمت کے نو برسوں میں سر سیّد نے ''سید الاخبار'' کے نام سے ایک اخبار نکالا، دینیات پر مختصر رسالے لکھے، اور اپنے عظیم کام '' آثار الصنادید'' پر کام کیا۔ انھوں نے ''آئینِ اکبری'' کے عنوان سے مغل شہنشاہ اکبر کے دور کی تاریخ بھی مرتب کی۔

۱۸۵۷ء کی ''بغاوت'' کے وقت تک تو سرسیّد کی دلچسپیاں تہذیبی مسائل تک محدود رہیں۔ ان کا مطالعہ ماضی کے بارے میں تھا اور ان کو مستقبل کے بارے میں کوئی تشویش نہ تھی۔ مگر ''بغاوت'' کے شروع ہوتے ہی یہ سب اچانک تبدیل ہو گیا۔ انھوں نے اس تحریک کے دوران ہونے والے واقعات اور حالات کا روزنامچہ تیار کرنا شروع کر دیا اور یہی مسئلہ ان کے ذہن پر مسلط ہو گیا۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ اس تحریک کے نتیجے میں ملک میں، اور بالخصوص مسلمانوں کے حالات میں ڈرامائی تبدیلیاں آئیں گی۔

جیسا کہ مہدی علی صدیقی نے ''ڈان'' اخبار کے شہ سرخی میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء ایک خونیں سال تھا: ''اس برس نے صرف مغل سلطنت کا ہی نہیں مسلمانوں کے معاشرتی اور سیاسی نظام کا بھی زوال دیکھا۔ نام نہاد بغاوت دراصل مرتی ہوئی معاشرت کی آخری جدوجہد تھی۔ اس کے بعد سے علم اور زیادہ علم ہی (مسلمانوں کی) زندگی کا رہنما اصول ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو بغاوت کے دوران ہونے والی جدوجہد کے پسِ پردہ ہونے کی پاداش میں بے رحمی سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس میں سپاہی، شاہی خاندان، اشرافیہ اور اوسط درجے کے لوگ شامل تھے۔''

صاف ظاہر ہے کہ ''غدر'' نے سرسیّد کے نظریات اور خیالات پر گہرا اثر ڈالا تھا جس کی وجہ سے ان کے تناظر میں وسعت پیدا ہوئی۔ ان کو محسوس ہو گیا کہ انگلستان کے عوام کی نظر میں ہندوستان کے بارے میں باتیں بڑھا چڑھا کر پیش کی گئی ہوں گی۔ برطانوی ناول نگار ولیم تھیکرے کا، جو ۱۸۱۱ء میں ہندوستان ہی میں پیدا ہوا تھا اور برصغیر سے جس کے مضبوط خاندانی رشتے تھے، بھی کچھ یہی خیال تھا۔ برطانیہ کے عوام الناس کے ہندوستان کے بارے میں جو تین تصورات عام تھے ان کے حوالے سے تھیکرے نے ۱۸۴۱ء میں لکھا تھا۔ وہ لوگ جو رومانی مزاج رکھتے تھے، ہندوستان کو کہانیوں اور حیرتوں کا دیس (Gorgeous East) سمجھتے تھے۔ ایک پریوں کی سرزمین جہاں کے سلاطین مور کے پروں سے بنے پنکھوں کے سائے میں، سنگِ مرمر اور قیمتی جڑاؤ پتھروں سے مزین ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ عمومی ذہنیت کے لوگ ہندوستان کو کم زور اور جنگ و جدل میں بزدل لوگوں سے پُر اور ملّائیت کے پیروکار سمجھتے تھے۔ متوسط اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے نزدیک ہندوستان وہ سرزمین تھی جس میں چھوٹے بھائیوں کو قسمت آزمانے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔

سرسیّد نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مشکلات ہی مشکلات تھیں، اس لیے کہ، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، غدر کی ناکامی کے بعد ان ہی کو اس کا مجرم سمجھا جاتا تھا اور ان سے نہایت بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ چوں کہ برطانیہ کے عوام اصلیت سے نابلد تھے، جب ۲۷ر جون ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے شروع ہونے والی ''بغاوت'' اور دہلی پر قبضے کی خبریں برطانیہ پہنچیں تو فضا افسردہ سی ہو گئی۔ اخبار Saturday Review نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ فسادات کے پیچھے گہری سازش کارفرما معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی کہ یورپی باشندوں کے قتل اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ہندوستان اس قسم کی نسلی خانہ جنگی کے قریب ہے جیسی کہ ساٹھ برس قبل غلاموں اور ان کے آقاؤں کے درمیان ہیٹی میں ہوئی تھی۔

اور جیسا کہ اس قسم کے ابتر حالات میں ہوتا آیا ہے، برطانوی اس کو ''بغاوت'' کا نام دیتے تھے جب کہ ہندوستانی ''جنگِ آزادی'' کہتے تھے اور یہ دونوں مختلف اصطلاحیں طرفین کے نزدیک اپنے معانی میں وزن رکھتی تھیں۔ اس جدوجہد کے ختم ہونے سے پہلے ہی برطانوی اذہان اس کو خیر اور شر کے درمیان جنگ سمجھتے تھے، ایسی جنگ جس میں خیر اور عیسائی عقیدے کے داعی شر پسندوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے ہوں۔ اس نوع کے تصورات برطانوی ذہنوں کے لیے خطرناک ثابت ہوئے اور جن کی بنا پر صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ برطانوی راج کے دوسرے علاقوں میں بھی گہرے اثرات کا باعث ہوئے۔ 'بغاوت' سے ایک عشرہ قبل ہی ہندوستان میں نسلی سطح پر تکبر کے رویّے ابھرتے لگے تھے اور ہندوستانیوں کو نیگر یعنی کالا یا دیسی کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔ برطانیہ کے عوام کو اخباروں میں شائع ہونے والی کہانیوں کے ذریعے یہ تاثر ملنے لگا کہ وہی لوگ (ہندوستانی) جو 'بغاوت' سے قبل ترقیاتی کاموں میں ممد ہو سکتے تھے، اب اپنی مددگار قوتوں (برطانوی

راج) کے خلاف صف آرا ہو گئے ہیں۔ یعنی یہ صرف برطانوی راج ہی پر حملے نہیں تھے بلکہ ان تمام قدروں پر حملے تھے وکٹوریائی عہد کو جن پر ناز تھا۔ ایک عام انگریز کے نزدیک یہ 'جنگ' کچھ سپاہیوں کی 'بغاوت' کے سوا کچھ نہ تھی۔ تاریخ کے ایک طالب علم کی نظر میں ان واقعات کے تجزیے کچھ اور ہی منظر پیش کرتے تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک اس بات کے محکم شواہد موجود تھے کہ یہ سپاہیوں کی ایک معمولی بغاوت نہیں بلکہ ایک باقاعدہ جنگِ آزادی تھی جس کے ذریعے غیر ملکیوں کو دیس سے نکالنے کے بعد برصغیر کے قانونی حاکموں کو بحال کرنا مقصود تھا۔ میرے خیال میں، مسلمان یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ جدو جہدِ آزادی کی ناکامی ہی ان پر ڈھائے جانے والے مظالم کی بنیاد تھی۔ اس بات کے تاریخی ثبوت موجود ہیں کہ صرف شبہے کی بنا پر بھی بہت سے مسلمان سولی پر چڑھائے گئے اور ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اس نوع کی ظالمانہ سزاؤں سے بڑھ کر نقصان دہ تو یہ تھا کہ برطانوی راج کی حکومت نے تقریباً پچاس برس کے عرصے تک باقاعدہ زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کو نظر انداز کیا۔

اب سوال یہ تھا کہ ان لوگوں کا کیا کیا جائے؟ چوں کہ ہندوستانیوں کو 'مہذب' بنانے کے کام کو بہر حال آگے بڑھانا تھا اس لیے اس دور کے نظریہ سازوں کے نزدیک دو ہی طریقے تھے۔

پہلا طریقہ تو یہ تھا کہ اپنی ایشیائی رعایا پر اپنے مذہب کے خالص اصولوں، اپنی درشت قوتوں، اپنے لطیف علم، اپنی خلاقانہ صلاحیتوں، اپنی حاکمانہ اور ناقابلِ تسخیر قوتِ ارادی کے ساتھ سخت مگر منصفانہ، عقل مندی اور فیاضی کے ساتھ حکومت کی جائے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ہم کو اپنی رفعت کے تصور کو ترک کر دینا چاہیے اور ہندوستانیوں کو ملکہ معظمہ کی رعایا کا رُتبہ دے کے ان کو حکومت کرنے کے رموز سکھانے چاہییں تا کہ ان کو خود پر حکمرانی کے لیے تیار کیا جائے۔ یعنی ان کو برطانیہ کے عام لوگوں کی طرح آزاد بنایا جائے۔

رسالے ''نیشنل ریویو'' نے اپنے صفحات پر کچھ اس طرح کا خلاصہ پیش کیا تھا اور ظاہر ہے کہ سرسیّد احمد خاں، جو کہ اب اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ ان کے ملک کے لوگوں، بالخصوص مسلمانوں کو یورپی تہذیب کی اچھائیوں کو قبول کر لینا چاہیے، ان تمام باتوں سے خوب واقف رہے ہوں گے۔ اسی تناظر میں انھوں نے اردو زبان میں 'اسبابِ بغاوتِ ہند' کے نام سے ایک مجلّہ شائع کیا اور برطانیہ کی حکومت کو ارسال کیا۔ اپنے تجزیے کے مطابق 'بغاوت' کے اسباب کی بنیاد پر سرسیّد نے برطانیہ کی حکومت کو اپنی سفارشات پیش کی تھیں کہ مقامی آبادی کو سیاسی معاملات میں شامل کیا جانا چاہیے تا کہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ برطانیہ کی حکومت کے اربابِ اقتدار یقیناً قابلِ تعریف تھے کہ انھوں نے سرسیّد کی پیش کردہ تجاویز پر سنجیدگی سے غور کیا اور ۱۸۵۷ء کے بعد سے کی جانے والی تبدیلیوں میں سرسیّد کے خیالات کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

سرسیّد اب اپنے فاضل وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ مغربی تعلیم کے پرچار میں اور مرادآباد اور غازی پور میں اسکول قائم کرنے پر خرچ کر رہے تھے۔ انھوں نے سائنس، تواریخ اور ادب کی انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کی غرض سے ایک ادارہ ''ٹرانسلیشن سوسائٹی'' قائم کیا جس کو بعد میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' سے پکارا جانے لگا۔

شروع ہی سے سرسیّد کی کوشش تھی کہ اپنے ملک کے تمام لوگوں کی ترقی کے لیے تعلیم کے میدان میں کام کیے جائیں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب یا طبقے سے ہو۔ مگر جب ۱۸۶۷ء میں بنارس سے، جہاں سرسیّد ملازمت پر مامور تھے، اردو مخالف تحریک کا آغاز ہوا تو حالات نے پلٹا کھایا اور سرسیّد نے اپنا طریقِ کار تبدیل کر دیا۔ اس صورتِ حال سے سرسیّد اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ اگر ہندو اور مسلمان صرف ایک قومی زبان پر متفق نہیں ہو سکتے تو برصغیر میں ایک قومیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقام سے انھوں نے خود کو مکمل طور پر مسلمانوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا اور انگلستان سے واپسی کے بعد، جہاں وہ آکسفرڈ اور کیمبرج یونی ورسٹیوں کی کارکردگی کے مطالعے کے لیے گئے تھے، Society for Progress of Indian Muslims نامی ادارے کی بنیاد ڈالی جس نے علی گڑھ میں

Mohammaden Anglo-Oriental College قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔
۱۸۵۷ء میں ابتدائی تیاریوں کے لیے اسکول قائم کیا اور جب ۱۸۷۶ء میں سرسیّد سرکاری ملازمت سے فارغ ہو گئے تو علی گڑھ سے تعلیمی اصلاح کی تحریک کا بیڑا اٹھایا۔ ۸رجنوری ۱۸۷۷ء کو Mohammaden Anglo-Oriental College کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، سرسیّد جس کو قائدین کی پودگاہ بنانا چاہتے تھے۔

کالج کے قیام کے بعد ۹۰ء میں سرسیّد نے Mohammaden Education Conference کی بنیاد ڈالی۔ جگہ جگہ جس کے جلسے منعقد ہوئے اور علی گڑھ کا پیغام برصغیر کے ہر حصے تک پہنچ گیا۔ یہ کوشش تھی مسلمانوں کو، جو ابھی تک پس ماندہ تھے جنھیں جدید دنیا کی تعلیمی، معاشی، سماجی اور ادبی منطقوں کی ضروریات کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا۔

ملکہ برطانیہ سے سر کا خطاب پانے کے بعد سرسیّد کا مسلمانوں کے لیے یہ پیغام تھا کہ ان کو اپنے فرسودہ توہمات اور عصبیات کو دفن کر دینا چاہیے۔

ان کا استدلال یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندازِ زندگی کی تخلیقِ نو ہونی چاہیے اور یہ مغربی تعلیم کے حصول سے ہی ممکن ہوسکتی ہے۔ اور انھوں نے یہ بھی استدلال کیا کہ یہ طریقۂ کار اسلام کی تعلیمات کے منافی ہرگز نہیں ہے اور اس ضمن میں انھوں نے پیغمبرِ اسلام کی وہ حدیث یاد دلائی جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ اگر علم حاصل کرنے کے لیے چین بھی جانا پڑے تو جانا چاہیے۔ علی گڑھ کالج کے کوائف نامے میں، جو بعد میں یونی ورسٹی بن گیا تھا، اس کا اوّلین مقصد جو لکھا گیا تھا اس کا نچوڑ یہی تھا کہ ایسا کالج قائم کیا جانا چاہیے جہاں بغیر کسی روک ٹوک اور مذہبی تنگ نظری کے مسلمان مغربی تعلیم حاصل کرسکیں۔

ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے، ''میں ان چیزوں کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں جن میں، ہمارے ملک کے خصوصی حالات کی وجہ سے، ہم اور انگریز مختلف ہیں۔ میں صرف شائستگی، علم، صفائی، اعتبار، ہنرمند کارکردگی، کامیابیوں وغیرہ پر زور دینا چاہوں گا جو ان کی تعلیم اور تہذیب کا نتیجہ ہیں۔ مہربان قدرت نے ساری اچھائیاں، دنیاوی ہوں یا روحانی، جو انسان میں ہوسکتی ہیں، یورپ، اور بالخصوص انگلستان کو عطا کی ہیں۔''

میں نے بہت سمجھ بوجھ کر یہ اقتباس چنا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ ان تعریفی الفاظ سے جو سرسیّد نے استعمال کیے ہیں، پوری طرح اتفاق نہیں کریں گے۔ پھر بھی ہمیں سرسیّد کی ضرورت سے زیادہ پُرجوش بات سے اتفاق کرنا ہوگا جو انھوں نے مغرب اور بالخصوص برطانیہ کے حوالے سے، موجود حالات کے تناظر میں کہی ہے۔ انگلستان میں اپنے قیام کے دوران سرسیّد نے جو کچھ دیکھا وہ اتنا زیادہ مختلف نہیں تھا مگر ابتدائی جائزے کے دوران بہ ظاہر ہندوستان کے مقابلے میں ترقی یافتہ اور بہتر لگا ہوگا۔ تو کیا ان کا ضرورت سے زیادہ ردِعمل سمجھ میں آنے والا نہیں؟

کیا برطانیہ میں مقیم برصغیر کی تاریخ کے طالب علموں کے ساتھ یہی کچھ نہیں ہوا ہوگا جن کے اذہان کو ایک سو پچاس برس یا اس کے لگ بھگ عرصے اس قسم کی دانشورانہ، سیاسی اور سماجی ارتقا کی غذائیں ملتی رہی ہیں، اور انھوں نے وطن واپسی پر ان کو استعمال کرنے کی کوشش کی ہوگی؟ اس مرحلے پر ہمیں صرف گاندھی، نہرو اور جناح جیسی شخصیات ہی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

یہ یقیناً بالکل صحیح اور مناسب ہے کہ ان عظیم شخصیات کی قومی ہیرو کی طرح توقیر کی جانی چاہیے مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک اُن سیاسی اور دانشورانہ روایات کی پیداوار تھا جو برطانوی حکمرانوں نے اپنے ملک کو دی تھیں۔ یہ سب اور ان کے علاوہ بہتیرے اور بھی ان میں شامل ہوں گے جو، فرائض کی بجا آوری کے لیے اپنی مناسبت، حد سے زیادہ تعریف، مسئلہ پیدا کرنے والے اور انکسار وغیرہ کی بنا پر، جن سے سرسیّد بھی گزرے ہوں گے۔ ہمیں یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ سرسیّد جیسی ذہنی استعداد کی شخصیت پورے یورپ

میں اسی قسم کی عزت اور احترام کی حق دار ہوگی اس لیے کہ اس قسم کی شخصیت لندن، آکسفرڈ اور کیمبرج جیسے علمی مراکز میں بھی آسانی سے نہیں ملے گی۔ تو پھر ہمیں اس بات پر خوشی کیوں نہ ہو اگر سر سیّد کو ایسی توجہ ملی تھی۔ اس لیے ہم ان کو ان کی سادہ لوح رومانویت کے سلسلے میں معاف بھی کر سکتے ہیں اس لیے کہ ایسے 'گناہ' تو ان کے بہت سے ہم عصروں نے کیے ہوں گے۔ لہٰذا میں سر سیّد کے اخذ کردہ ان نتائج سے اتفاق کروں گا کہ جو انھوں نے مسلمانوں کے فائدے کے سلسلے میں کیے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے تو ان کی مندرجہ ذیل رائے بھی خاصی حد تک قابلِ قبول لگتی ہے۔

''سماجی اور سیاسی لحاظ سے پورے انگلستان کی آبادی ایک کمیونٹی کی مثال ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے بارے میں ایسا مفروضہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ ان ممالک میں جہاں کی آبادی نسل اور عقیدے کے اعتبار سے ایک ہو، وہاں ہونے والے انتخابات بلاشبہ اکثریت کے مفادات اور نظریات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مگر ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اب بھی ذات پات کے مسائل موجود ہیں، جہاں بسنے والی مختلف النوع نسلوں میں آپس میں ملاپ نہیں ہوا ہے، جہاں جدید معیار کے مطابق تعلیم کے فوائد تمام طبقات تک نہیں پہنچ سکے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ وہاں کے انتخابات کے نتائج پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں اکثریت کلی طور پر اقلیت کے مفادات پر اثر انداز ہوگی۔

اب فرض کر لیا جائے کی انگریز برادری اور اس کی فوج، اپنی تمام توپوں اور ہتھیاروں کے ساتھ ہندوستان چھوڑ دیتی ہے تو پھر ہندوستان پر کس کا حکم چلے گا۔ ایسی صورت میں کیا اس بات کا امکان ہوگا کہ مسلمان اور ہندو، دونوں قومیں ایک ہی تخت پر بیٹھ کر اقتدار میں شریک ہوسکیں؟ قطعی ناممکن! دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کو فتح کرنا ہوگا۔ یا اس بات کی امید رکھنا کہ دونوں قومیں برابری کے حقوق کی حامل ہوں گی، قرین قیاس نہیں ہوگا..... ساتھ ہی ساتھ آپ کو یہ بھی یاد رہے کہ اگر چہ تعداد کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کم ہیں، ان کے بہت کم لوگ انگریزی تعلیم حاصل کر سکے ہیں پھر بھی ان کو کم زور نہیں سمجھا جا سکتا..... یہ بات کہ..... انگریزوں کے جانے کے بعد فاتح کون ہوگا ..... خدا کی مرضی پر منحصر ہوگی۔ لیکن جب تک ایک قوم دوسری قوم کو فتح نہیں کر لے گی، اس سر زمین پر امن کی حکومت نہیں ہو سکے گی۔''

مندرجہ بالا اقتباس میں جس خوف کا اظہار کیا گیا ہے اس کو اکثر پہلا اشارہ یا ایک پیغام کے لحۂ القا کے طور پر دیکھا گیا اور چند برسوں بعد اسی کو مختلف صورتوں میں برصغیر ہی کے ایک اور عظیم مسلمان دانشور محمد اقبال نے پیش کیا۔ ایک پیغام جس کو مسلم لیگ نے باقاعدہ اپنا زادِ راہ سمجھا اور بعد میں اسی کو ''دو قومی نظریہ'' کا بہتر نام ملا اور یہی مسلم لیگ کا نعرہ بنا جس نے آخر کار برصغیر کی تقسیم کی۔

بہت سے تاریخ نگاروں کا یہی خیال تھا مگر شاید خود قائد اعظم کا، کافی عرصے تک، کوئی اور نقطۂ نظر تھا جس پر میں آگے چل کر اظہارِ خیال کروں گا۔ اور شاید بعینہٖ کچھ یہی الفاظ نہیں تھے، جو میں نے نقل کیے ہیں، جن سے اس مسئلے کی ابتدا ہوئی تھی۔ میرے نزدیک یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ سر سیّد نے مختلف موقعوں پر اسی نوع کے بیانات دیے تھے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی پریشانی کا سبب یہی تھا کہ نہ صرف ہمیشہ ہندو اکثریت ہی اس ملک پر چھائی رہے گی بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے مسلم اقلیت کو مغلوب رکھے گی۔

اس اقتباس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ عمومی تصور کہ اقبال برصغیر کے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے ''دو قومی نظریہ'' کا ذکر مسلم لیگ کے ۱۹۳۰ء کے الہ آباد کے جلسے میں اپنے صدارتی خطبے میں کیا تھا، صحیح نہیں۔ سر سیّد کی بہت سی اہم تقریروں میں سے ایک تھی جو انھوں نے میرٹھ میں مارچ ۱۸۸۸ء میں کی تھی جس میں انھوں نے ''ہماری مسلمان قوم'' کا ذکر کیا تھا جس کی بنا پر ملک ''مسلمان قوم'' اور ''ہندو قوم'' میں تقسیم ہو گیا تھا۔

اگر چہ بہت سے لکھنے والوں اور تاریخ نگاروں کا خیال تھا کہ سر سیّد کی تقریروں اور تحریروں میں ''دو قومی نظریہ'' کی پرچھائیاں نظر

آتی ہیں، کچھ یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر ان کے نزدیک لفظ ''قوم'' سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ ایک انگریز تاریخ نگار نے لکھا ہے، ''وہاں دو قومیتیں نہیں تھیں، وہاں ایک قوم نہیں تھی، بلکہ وہاں تو کوئی قوم ہی نہیں تھی۔'' صحیح معنوں میں یہ بالکل صحیح ہے۔ اس کے باوجود میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کی سرسیّد نے اس طرح نہیں سوچا ہوگا جیسا کی ان کے ہم عصر یورپ کے تاریخ دانوں نے ''قومی ریاست'' اور ''قومیت'' کی تعریف کی ہے۔

لہٰذا ہمیں پاکستان کے موجودہ سربرآوردہ تاریخ کے ماہروں سے اتفاق کرنا ہوگا جن کے نزدیک ''سرسیّد ایک علیٰحدگی پسند مسلمان تھے جو ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو ایک علیٰحدہ سیاسی دھڑے کے طور پر پیش کرنے کے پس منظر میں ہندوستان میں علیٰحدگی پسند مسلمان تحریک کی داغ بیل ڈال رہے تھے، ایک بنیاد جس پر آگے چل کر علامہ محمد اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم قومیت کی عمارت کھڑی کی اور پاکستان نام کی خودمختار ریاست کا مطالبہ کیا۔'' اور، میرے خیال میں، اس کے سنگِ بنیاد رکھنے کے بعد کے معاملات ہی اصل مسائل ہیں۔ یہی مرکزی اور فیصلہ کن مرحلہ تھا جس کے لیے تاریخ نگار سرسیّد کو مسلمانوں کے مفاد میں اہم ترین شخصیت گردانتے ہیں، جس کے بغیر شاید تاریخ نے کچھ اور ہی موڑ لیا ہوتا، جس کے بغیر شاید پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔

سرسیّد کی تعلیمات کو غائر نظر سے دیکھنے والے کو اس بات پر یقیناً کوئی حیرت نہیں ہوتی کہ انڈین نیشنل کانگریس کے ۱۸۸۵ء کے بمبئی میں منعقدہ اجلاس کے بارے میں ان کے اپنے کچھ نظریات تھے۔ سرسیّد کانگریس کی ابتدا ہی سے اس کو مسلمانوں کے مفادات کے لیے ممکنہ خطرہ محسوس کرتے تھے۔ وہ آبادی کی بنیاد پر کیے جانے والے فیصلوں کے سخت مخالف تھے اس لیے کہ ان کے نزدیک اس طرح مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے اقلیت گردانا جانے لگتا۔ اسی بنا پر یہ تعجب خیز نہیں لگتا کہ وہ مسلمان بھائیوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے منع کرتے تھے۔

اپنی تقریروں میں سے ایک میں انھوں نے کہا تھا:

''میرے خیال میں یہ ضروری ہے کہ میں سب سے پہلے آپ کو وجہ بتا دوں کہ آج کی شام کے موضوع پر میں کیوں بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، ایک عرصے سے ہمارے بنگالی دوست سیاسی معاملات پر جنگی نوعیت کے احساسات رکھتے ہیں۔ تین برس قبل انھوں نے ایک بڑی اسمبلی بنائی، مختلف مقامات پر اس کے اجلاس منعقد ہوئے ہیں اور انھوں اس ادارے کو نیشنل کانگریس کا نام دیا ہے۔ ہم نے اور ہماری قوم نے اس مسئلے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس طرح ہمارے بنگالی دوستوں نے ہمارے قومی معاملات میں ایک نہایت غیر منصفانہ اور ناقابلِ قبول دخل اندازی کی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم ان پر اچھی طرح واضح کر دیں کہ انھوں نے کیا غیر ضروری مداخلت کی ہے اور یہ بھی کہ ان کی اس طرح کی حرکتوں سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں جن سے ہم کو اپنی قوم کو بچانا ہوگا۔''

سرسیّد نے ہندوستان میں ہندو قوم کی موجودگی کو کبھی نظرانداز نہیں کیا، نہ ہی کبھی انھوں طبقاتی اثرات کے معاملے میں ان کو اوّلیت دینے انکار کیا۔ ان کو اس بات کا اعتراف تھا کہ ہندو اس ملک کی اکثریت ہیں اس لیے نہ صرف ان سے دوستی کی بلکہ ان سے اچھے تعلقات کی سرسیّد نے ہمیشہ وکالت کی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کو دلہن کی مثال قرار دیا ہندو اور مسلمان جس کی دو آنکھیں ہیں۔ مگر اکثر لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسی خوب صورت مثال سے انھوں نے یہ پیغام دیا تھا کہ ہندوستان کا حسن اس بات پر منحصر ہوگا کہ اس کی دونوں آنکھوں میں ایک جیسی چمک ہو۔

مگر دونوں طبقوں کے درمیان افہام تفہیم پر انھیں کبھی اعتبار نہیں رہا۔ ایک بار انھوں نے ہندوؤں کو تنبیہ کی تھی کہ اگر انھوں نے کبھی وہ راستہ اختیار کیا جو ہم کو نقصان پہنچائے گا یا ہماری قوم کو داغِ بدنامی دے گا تو پھر واقعتاً ہم کبھی دوست نہیں رہ سکیں گے، ہم اپنی تمام تر قوت سے اپنے لوگوں پر حملوں کا دفاع کریں گے۔ اور بدقسمتی سے ۱۸۶۷ء میں اس نوعیت کے واقعات ہو چکے تھے جب یوپی میں ہندوؤں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ صوبے کی سرکاری زبان کا رسم الخط فارسی سے ہندی میں بدل دیا جائے۔

یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا حل شیشے کے محلوں میں رہنے والے دانشوروں کے بس سے باہر تھا، اس لیے کہ پورے صوبے میں بسنے والے مسلمان اور ہندو دونوں کے درمیان بے اعتباری کی خلیج پیدا ہو رہی تھی۔ ہندو مسلم کے درمیان بھائی چارہ اور افہام وتفہیم کے سلسلے میں سرسیّد کی ناامیدی اور بے اعتباری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس تنازعے سے سرسیّد اس بات کے قائل ہوتے جارہے تھے کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کی بابت ہندو اور مسلمانوں کے نظریات مختلف ہوں گے۔

۱۸۵۰ء کے عشرے تک ہندو مسلمانوں کے تہذیبی ورثے کے شراکت دار تھے جو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں تشکیل پایا تھا۔ اردو صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوستان کے دونوں طبقوں کی مشترکہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر نے ایک بار کہا تھا کہ ہندوستان کی زبان کی حیثیت سے فارسی کے بجائے اردو کو قبول کر لینا ہی ہندوستانی قومیت کے لیے ایک رعایت تھی۔

تنازعے کی اس وجہ کے علاوہ ۱۸۵۰ء کے بعد سے دھیرے دھیرے ایک اور مسئلہ سر اُٹھا رہا تھا جو دونوں طبقوں کے درمیان گرما گرم بحث کی بنیاد بن رہا تھا: یعنی ذبیحہ گاؤ۔ اس سے قبل مسلمانوں کے اس 'حق' پر کوئی تنازعہ نہیں اُٹھا تھا۔

قائدِاعظم اکادمی کے مؤسس ڈائریکٹر پروفیسر شریف المجاہد نے ان دونوں تنازعات کے علاوہ تیسرے کا مندرجہ ذیل خلاصہ پیش کیا ہے:

''تجدیدیت اور گروہ بندی کے زیرِاثر، وہ ہندو ہی تھے جنھوں نے ہندوستان کے (۱) تہذیبی ورثے سے اشتراک، (۲) ذبیحہ گاؤ پر ایک طرح کے غیر رسمی سمجھوتے اور (۳) ایک مدت سے مسلمانوں کے تہواروں میں شرکت سے منھ موڑ لیا اور ہندوؤں کے اپنے تہواروں کو رواج دینا شروع کر دیا۔ ہندوؤں کے یہ تینوں اقدامات تفرقہ انگیز تھے۔ لہٰذا وہ ہندو ہی تھے جنھوں نے انیسویں صدی کی ہندوستانی کائنات کو درہم برہم کیا۔ اس اتھل پتھل کا سب سے دور رس نتیجہ یہ نکلا کہ مشترک تہذیبی ورثے کی بنا پر بجائے ایک قومیت کی تشکیل کے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ راستوں پر چل پڑے اور بالآخر مسلمانوں نے ۱۹۴۰ء کے ہزاروں پلیٹ فارموں سے اپنی الگ قومیت کا اعلان شروع کر دیا۔''

سرسیّد احمد خان کو اس بات کا احساس تھا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان عددی اقلیت تھے، تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ اور معاشی طور پر کم زور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ برطانوی اذہان میں ۱۸۵۷ء کی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ انھیں اس بات کا بھی پورا احساس تھا کہ کانگریس کی سیاسی سرگرمیاں یقیناً حکومت سے محاذ آرائی پر منتج ہوں گی۔ انھیں یاد تھا کہ مسلمان اور ان کی اشرافیہ کس طرح برباد ہوئی تھا اور یہی کچھ پھر ہوگا اگر مسلمانوں نے سیاسی مظاہروں میں حصہ لیا۔

سرسیّد نے بہت جلد اندازہ لگا لیا تھا کہ انیسویں صدی میں اُٹھنے والی ہندو مذہبیت کے احیا کی تحریک اپنے اصل کردار میں برطانیہ مخالف کم اور مسلمان مخالف زیادہ تھی۔ اس کی سب سے واضح مثال بنگالی زبان کے سب سے اہم اور مشہور ناول نگار بنکم چندر چٹرجی کے ناول Anandamath کی ۱۸۸۲ء میں اشاعت تھی۔ ''اس ناول میں صریحاً مسلمان مخالف راگ الاپا گیا تھا۔'' خالد بن سعید کے مطابق ''اس ناول کا قاری بچوں (کالی مائی کی اولاد) کے ایک ایسے طبقے سے دوچار ہوتا ہے جو کسی ذات پات پر یقین نہیں رکھتے اور جن کا اصل مقصد ہندوستان سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانا تھا۔۔۔ ناول کے بچوں کا یہ گروہ مسلمانوں کی آبادیوں کو جلاتا، لوٹ مار کرتا اور بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا خون بہاتا تھا۔ اور غور کرنے کے لائق دل چسپ بات یہ تھی کہ اس ناول کے ہندو لیڈر صاف صاف یہ کہتے ہیں کی برطانیہ ہندوستان کو غلام بنانے نہیں بلکہ اس کو مسلمانوں کے چنگل سے نجات دلانے کی غرض سے آیا ہے۔ ناول کے آخر میں، جب بچوں نے مسلمانوں پر فتح حاصل کر لی تو ناول کے روحانی پیشوا نے، جو تحریک کی رہنمائی کر رہا تھا، بچوں کے سردار کو حکم دیا کہ لڑائی روک دیں اور برطانوی اہل کاروں کا ہاتھ بٹائیں تاکہ خدا کی مدد سے برطانوی ملک کو نجاست سے پاک کر سکیں اور اس کی حکومت کو ہندوؤں کے حوالے کر سکیں۔ یہی ناول ہے جس میں پہلی بار بندے ماترم (ماں تجھے سلام) گانا پیش کیا گیا تھا۔ اس طرح اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

مسلمانوں نے بعد میں (۳۹-۱۹۳۷ء) کیوں کانگریس حکومت کے اس گیت کو قومی نغمہ بنانے پر شدید احتجاج کیا تھا۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، کانگریس کی تحریک کا پہلا سرکاری اجلاس ۱۸۸۵ء میں پونے میں ہوا تھا۔قومی جذبات کے احساس کی بڑھتی ہوئی لہروں اور انیسویں صدی کے اواخر میں ہندومت کے احیا کے پیشِ نظر قومی دھارے کے کچھ اہم لیڈر ایک مشترکہ پلیٹ فارم کا مطالبہ کر رہے تھے اور ۱۸۸۳ء میں کلکتے میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے تمام علاقوں سے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کے اگلے برس جب مدراس میں تھیوسافیکل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام جلسہ منعقد ہوا تو اس میں بھی قومی جذبات کی ترجمانی ہوئی تھی۔

اس دوران ایلن آکٹاوین ہیوم (Allan Octavian Hume) نامی ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر نے، ظاہر ہے کہ اس کو لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin) وائسرائے کی حمایت حاصل رہی ہوگی، اسی قسم کی مصروفیات کا آغاز کر دیا۔ تیس برس تک ہندوستان کی افسر شاہی کا حصہ ہونے کے بعد اس نے یہاں کے مسائل میں دل چسپی لینی شروع کر دی۔ اس کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ برطانوی راج نے اس ملک کو سیاسی استحکام بخشا ہے مگر اس کے باوجود عام لوگوں کے معیارِ زندگی کو اونچا کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ برطانوی افسر شاہی لوگوں کے حالات سے باخبر ہے اور یہ بے انتہا ضروری تھا کی واضح طور پر ایسے آئینی راستے اختیار کیے جائیں جس کی مدد سے مغربی خیالات اور تعلیم کی آمیزش سے پیدا ہونے والے ابال کو خارج کیا جا سکے۔

اپنے یقین پر عمل کرتے ہوئے ۱۸۸۳ء میں ہیوم نے کلکتہ یونی ورسٹی کے گریجویٹ لوگوں کو ایک خط ارسال کیا جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کی ذہنی، اخلاقی اور سیاسی باز آفرینی کی غرض سے ایک انجمن تشکیل دیں۔ کلکتے اور مدراس میں ان اجتماعات کے بعد دسمبر ۱۸۸۵ء میں پونے میں اجلاس منعقد ہوا جس کو آل انڈیا کانگریس کا پہلا اجلاس کہا گیا تھا۔ اس جلسے میں ۷۰/افراد شریک ہوئے جن میں بیشتر ہندو وکلا، ماہرینِ تعلیم اور صحافی تھے۔ اس کے بعد سے ہر سال دسمبر کے مہینے میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں کانگریس کے اجلاس منعقد ہونے لگے۔ ۱۸۹۴ء میں ہندوستان کے شہر مدراس میں ہونے والے اجلاس میں نمائندوں کی تعداد بڑھ کر پندرہ سو ہوگئی جب کہ اس میں تین ہزار مہمان بھی شریک ہوئے تھے۔ کانگریس کے اوّلین لیڈروں میں جی کے گوکھلے، سریندر ناتھ بنرجی، فیروز شاہ مہتا اور دادا بھائی نوروجی جیسے لوگوں نے مغرب کی اور آزاد خیالی کی وکالت کی۔ ان لوگوں نے برطانیہ عظمیٰ کو سراہا اور اس کے اشتراک کے حواری بنے۔

کانگریس کے ایک اور رہنما رمیش چندر دت تھے۔ انھوں نے کانگریس کے بارے میں ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا، ''انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی ملک کے دماغ اور ضمیر کی نمائندگی کرتے ہیں، اور یہی پڑھے لکھے عوام کے اصل ترجمان، ان کے مفادات کے نگہبان ہیں۔ اس لیے جو سوچ سکتے ہیں انھی لوگوں کو حکومت کرنی چاہیے۔''

لارنس جیمس (Lawrence James) نے لکھا، ''اندر سے کانگریس بنیادی طور پر وفادار ہے۔ اس کے سالانہ اجتماعات میں ملکہ عظمیٰ وکٹوریہ کو 'مادر' کے نام سے پکارا جاتا تھا اور اس کا نام آتے ہی تحسین کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ یہ پرخلوص مظاہرے دراصل ادارے کے بانی بزرگوں کی انگریز دوستی کی علامت تھے۔ اچھوت ستارن ساتھے (Achhut Sitaran Sathe) نے ۱۹۰۰ء کے اجلاس میں بڑے جذباتی انداز میں کہا تھا، ''پڑھا لکھا ہندوستانی جبلت میں وفادار اور مفاد کے معاملے میں قناعت پسند ہے۔ انگریزی پرچم اس کی جسمانی پناہ گاہ ہے اور انگریزی فلسفی اس کے لیے روحانی تسکین۔ انگریزی نشاۃ الثانیہ ہندوستانی تعلیم یافتہ شخص میں اس قدر سرایت کر گئی ہے کہ اس کو اپنے حاکم کی وفاداری کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ یہ نئی تہذیب کا وہ ہراول دستہ ہے جس کا جھنڈا ہے محبت، احسان اور برابری۔''

تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ روایت اور ترقی کے مابین اس قسم کا رومانی ہنی مون' دیر پا نہیں ہوتا۔ سماجی اور سیاسی نو ترتیبی کے تقاضے جلد یا بدیر شروع ہو جاتے ہیں اور اس نوع کے 'متاثر کن مظاہر' رفتہ رفتہ قومی دھنوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ اور بہت جلد ہی ہندو

نشاۃ الثانیہ کے بیان کیے ہوئے اثرات نے کانگریس تحریک کو جالیا اور وہی مغربی تہذیب کو بے جان اور مادّی کہنے لگے۔ سب سے بڑھ کر ہندو نشاۃ الثانیہ جو قومیت کا ایک نیا روپ بن رہی تھی، مذہبیت میں مدغم ہونے لگی اور بہت سے ہم عصروں کے نزدیک کانگریس ہندوازم کا پلیٹ فارم بن گئی۔

کوئی تعجب نہیں کہ کانگریس کے قیام کے بعد ہندوستان کے دو بڑے گروہوں کے بارے میں سرسید کا اندازِ نظر بالکل تبدیل ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ کانگریس کے رہبر مطالبہ کررہے تھے کہ حکومتی عہدوں پر تعیناتی کے امتحانات ہندوستان ہی میں ہوتے چاہییں۔ سرسیّد کو خوف تھا کہ مسابقتی امتحانات ایک گروہ یعنی بنگالی ہندوؤں کی حکمرانی پر منتج ہوں گے۔ سرسیّد نے ان کے اس مطالبے پر اعتراض کیا کہ ہندوستان کے نمائندہ اداروں کی ملک کی انتظامیہ میں زیادہ شمولیت ہونی چاہیے۔ اور بے شک، سرسیّد نے بڑے شدّ و مد سے ان کے اس دعوے کی تردید کی کہ ان کو ہی 'ہندوستانی قوم' کی طرف سے بولنے کا حق ہے۔

سرسیّد کو یہ سب ہرگز قبول نہیں تھا۔ انھوں نے لکھا تھا، ''انڈین نیشنل کانگریس کے اغراض و مقاصد تاریخ اور موجودہ دور کے حقائق سے ناواقفیت کی بنیاد پر رکھے گئے ہیں، وہ اس بات کا لحاظ نہیں کرتے کہ ہندوستان میں مختلف قومیت کے لوگ رہتے ہیں۔۔۔۔''

سرسیّد کے رسوخ کے نتیجے میں، جیسا کہ میں نے پہلے ہی اشارہ کیا ہے، مسلمان نیشنل کانگریس سے متاثر نہیں ہوئے۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے پہلے اجلاس میں دو مسلمان مندوب شریک ہوئے تھے، اس کے بعد ۴۴۰ میں سے صرف ۳۳ مسلمان تھے، ۱۸۹۰ء میں ۷۰۲ مندوبین میں ۱۵۶ مسلمان تھے اور اس کے بعد اس میں تیزی سے کمی ہونی شروع ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں ہونے والے اجلاس کے ۷۵۶ مندوبین میں صرف ۱۷ مسلمان تھے۔ میرے خیال میں ان اعداد وشمار کے بعد مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگرچہ سرسیّد ان آزاد خیال لوگوں کے پروگرام کے بارے میں تشویش میں تھے جنھوں نے کانگریس تحریک کا ڈول ڈالا تھا تو وہ اور ان کے ساتھی ہندوستان کی نئی قومیت میں ہندوؤں کی اکثریت کے حوالے سے جو ملک پر چھاتی جارہی تھی، جس میں بی جی تلک جیسے قوم پرست جنگجو شامل ہورہے تھے، چونکے تھے۔ وہ مسلمانوں کو غیر ملکی سمجھتے تھے اور مشہور ہندو قوم پرست شیواجی کی تقدیس کرتے تھے، جس نے سترہویں صدی عیسوی میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

ڈاکٹر سکندر حیات لکھتے ہیں کہ ''الغرض، سرسیّد نے مسلمانوں کو اس مشکل صورت حال سے نکالنے کے لیے، جس میں وہ ۱۸۵۷ء کے خروج کی بنا پر تھے، اپنے سیاسی مشغلے کا آغاز کردیا۔ ان کو بالخصوص اس بات پر رنج تھا کہ انگریزوں کے مقابلے میں مسلمان نہ صرف سیاسی قوت کھو چکے ہیں بلکہ ان کو ہندوستان کے موجودہ حالات کا پورا ادراک بھی نہیں تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ مسلمان انگریز راج سے معاملت کرلیں۔ ان کو ہندوؤں سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔ وہ ہندوازم کے تیزی سے ابھرتے ہوئے مذہبی، سیاسی تجربات اور ملک کے متنوع اور مختلف حقیقتوں پر برطانوی طرز کی نمائندہ حکومت کا زبردستی نفاذ تھا جس کی بنا پر سرسیّد نے آگے بڑھ کر کانگریس کی نام نہاد 'قومیت' کے اعتقادات کو چیلنج کیا۔''

اور ''دوقومی نظریے'' سے کانگریس کا کھلا انکار ہندوستان میں مسلمان علیحدگی پسند قوتوں کی تحریک کی ترتیب کا باعث ہوا۔ سرسیّد نے مسلمانوں کو یہ شعور دیا کہ ان کے سیاسی مفادات ویسے ہی نہیں جیسے کہ ہندوؤں کے ہیں اور یہ کہ مسلمان اور ہندو دو مختلف سیاسی گروہ ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو غفلت کے خواب سے جگانے اور برصغیر میں ان کو ایک سیاسی طاقت کے طور دوبارہ زندہ کرنے میں سرسیّد کا اتنا بڑا کردار ہے کہ اتنے مختصر سے خاکے میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کی کامیابیوں سے پورا انصاف ممکن نہیں۔ میں نے سرسیّد کے صرف ایک ہی پہلو، یعنی ایک عظیم ماہرِ تعلیم اور علی گڑھ تحریک کے مؤسس پر ارتکاز کیا ہے جو بالآخر مسلم لیگ کی بنیاد بنا اور جس کے اثرات پاکستان کی تخلیق پر منتج ہوئے۔ مگر ان تمام کاوشوں کے علاوہ مذہب کے میدان میں بھی ان کی کارکردگی اتنی ہی دم بخود کردینے

والی تھی۔ اگر چہ قرآن کریم کی تفسیر مکمل نہ ہو سکی پھر بھی انھوں نے سات جلدیں مکمل کر لی تھیں۔ انھوں نے مذہب پر اور بہت سی کتابیں، مختصر رسائل اور مضامین تصنیف کیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کی تعلیمات ہر حال میں جدید سائنسی نظریات سے ہم آہنگ رہی ہیں۔ شاید یہ کچھ تعجب کی بات نہ ہو گی کہ بہت سے مذہبی مسائل پر ان کے خیالات کو قدامت پسند لوگوں نے قبول نہیں کیا مگر ان کی سیاسی تحریریں اور سماجی نو تشکیل کے ضمن میں ان کی وکالت مسلمانوں کی نئی نسل کے شعور کی بلوغت پر بہت اثر انداز ہوئیں۔ اگر ہم ماضی میں جھانک کر دیکھیں کہ سر سیّد نے کیا کیا تو ہم حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک مختصر عرصۂ حیات میں ایک انسان کیا کیا کر سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ صرف ان کی عظمت کی وجہ ہی سے نہیں ہوا بلکہ اس لیے کہ وہ پیدائشی طور پر انسانوں کے لیڈر تھے۔

''مسلم حکومت کے خاتمے کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگیوں میں پیدا ہونے والے خلا کو سید احمد نے پُر کیا۔''

پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے اپنی مختصر تاریخ میں لکھا، ''انھوں نے دکھایا کہ ترقیات اور فلاح و بہبود کے میدان میں وہ ذمہ داریاں کس طرح پوری کی جا سکتی ہیں جو مسلم حکومتیں کیا کرتی تھیں۔ مگر سید احمد نے اس سے زیادہ کیا۔ ان کی لگ بھگ ایک صدی کے برابر کی زندگی نے برِ صغیر میں قرونِ وسطیٰ اور جدید اسلام کے مابین ایک پُل کا کردار ادا کیا۔ خود عظیم مغل عہدِ بہار کی یادگار ہوتے ہوئے بھی وہ ایک نئے دور میں داخل ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ایک نئی یک جہتی، ایک نئی سیاسی پالیسی، نئے تعلیمی خیالات، شخصی اور قومی مسائل میں نئی رسائی، ایک نیا اندازِ تحریر دیا اور انھوں ایک ایسا ادارہ بھی دیا جو اپنے کام خود چلانے کے قابل تھا۔ Dr. Spear اپنی کتاب ''انڈیا، پاکستان اور مغرب'' میں سر سیّد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے پورے طرزِ عمل میں پاکستان کا تصور مضمر تھا۔

نئی صدی کی آمد
آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل

جنوبی ایشیا کی سیاست کے بارے ایک جامع تجزیے میں لارنس زائرنگ (Lawrence Ziring) لکھتا ہے، ''بیسویں صدی کی ابتدا کچھ اسی طرح ہوئی جس طرح کہ انیسویں صدی کا اختتام ہوا تھا۔ برطانیۂ عظمیٰ، دنیا کا مانا ہوا لیڈر تھا، کرۂ ارض کے پانچویں حصے پر حکومت کا دعوے دار، بارہ ملین مربع میل پر پھیلی ہوئی وسیع نوآبادیات جس میں زمین کی ایک چوتھائی آبادی رہتی تھی۔ اس وسیع وعریض شہنشاہی کی مرکزی آرائش برصغیر ہندوستان سے تھی، جہاں ۱۹۰۳ء میں ملکہ وکٹوریا کے انتقال پر ایڈورڈ ہفتم تخت نشین ہوا، جس کو لارڈ کرزن کی صدارت میں منعقد ہونے والے ایک عظیم دربار میں ہندوستان کے شہنشاہ کا خطاب دیا گیا۔۔۔۔۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کرۂ ارض میں ہوتے والی تبدیلیوں کے پیشِ نظر ہندوستان کی انتظامیہ کاروباری فروغ کے خطے کے بجائے ایک سیاسی جغرافیائی اور جنگی اقدامات کے حوالے سے اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ یورپی طاقتوں میں سلطنت بنانے کی جو دوڑ لگی ہوئی تھی اس کے پیشِ نظر برطانیہ نے بحرِ ہند پر قابو پانے کے لیے ہندوستان کی انتظامیہ کی تنظیم نو کی اور اس میں خاطر خواہ اضافے کیے۔

اس ضمن میں جو اقدامات کیے گئے ان میں ایک تو اس قانون کا نفاذ تھا جس کو 'Indian Councils Act of 1892' کا نام دیا گیا۔ اس قانون کے ذریعے قائم شدہ کونسلوں کے ارکان کی تعداد بڑھائی گئی اور ان کو انتظامی معاملات میں زیادہ اختیارات بھی دیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی آزاد خیال اور آئینی رواداری کی قومی تحریک میں ایک بنیادی تبدیلی ہوئی اور قومیت کے دعوے داروں کے شدت پسند بازو نے یورپی خیالات کے بجائے قدیم ویدوں سے اثر لینا شروع کیا اور انھوں نے اپنے مقاصد کے حصول تک مارکاٹ پر اُتر آنے کا عزم کر لیا۔ قومی شدت پسندی کی نئی سوچ کا اصل محرک بال گنگا دھر تلک (۱۸۵۶ء۔۱۹۲۰ء) تھا جس کو برطانوی مورخین 'ہندوستانی بے چینی کا باپ' کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ۱۸۹۰ء کی دہائی میں قحط اور طاعون ہندوستانیوں کی پریشانی کا سبب بنے جن کی وجہ سے عام سطح پر بھی ہندوستانیوں کی شکایات بڑھتی چلی گئیں۔

ایسے واقعات سے ہندوستان سے باہر بھی قومیت کی تحریکوں کو تقویت ملی۔ اس مقام تک تو یورپ کی برتری کو کسی للکار کا سامنا نہیں تھا۔ صدی کے اختتامی زمانے میں کچھ ایسے واقعات ہوئے جن سے ایسا لگا گویا یورپ کی برتری کم ہوتی جارہی ہے۔ سونے پر سہاگا، روسی سلطنت پر ۱۹۰۵ء میں جاپان کی فتح نے ہندوستانی قوم پرستوں میں بجلی بھر دی اور 'ایشیائیوں کے لیے ایشیا' کا نعرہ بلند ہوا جو چین، برما، ولندیزی شرق الہند اور ہندوستان کے جوشیلے نوجوان قوم پرستوں کا نعرہ بن گیا۔

جو کچھ خالص انتظامی آسانیوں کے لیے سوچا گیا تھا کہ مغربی بنگال کی انتظامیہ کا بوجھ ہلکا ہو، مشرقی بنگال کو نظر انداز کیے جانے سے پیدا ہونے والی محرومیوں کا ازالہ ہو سکے، اور آسام کو اس کی شدید ضرورت کے لیے سمندری بندرگاہ تک رسائی دی جا سکے، ۱۹۰۵ء میں

بنگال کی تقسیم بہت جلد ہی سیاسی اتھل پتھل اور ہنگاموں پر منتج ہوئی۔ بنگال اب ایسی شدت پسندی کی تحریک کا مرکز بن چکا تھا جو اپنی مطلب براری کے لیے تشدد کا سہارا لینے کے لیے تیار تھی۔ ان تحریکوں کے پیشِ نظر ۱۹۱۲ء میں شہنشاہ جارج پنجم کی تاج پوشی کے موقعے پر منعقد ہونے والے دربار میں بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی گئی جو مشرقی بنگال کی مسلمان اکثریت کے لیے ایک دھچکا ثابت ہوئی۔ ہندو جذبات کی تشفی کے لیے ہندوستان کے دارالحکومت کی کلکتے سے مغل دارالحکومت دلّی کی منتقلی کی گئی مگر اس سے پیدا ہونے والے مسلم جذبات کے لیے کوئی رعایت نہیں دی گئی۔

بنگال کی تقسیم پر احتجاج اور اس کے نتیجے میں اس کی تنسیخ اور بہت سے سیاسی عناصر مسلمانوں کی سیاسی رائے عامہ پر شدت سے اثر انداز ہوئے۔ مخلوط انتخاب کے بدلے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ ہوا جس کے ذریعے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ اور مسلمانوں کی نوزائیدہ تحریک کے لیے یہ ایک پُرکشش نعرہ بن گیا۔ یہ جداگانہ انتخابات کا مطالبہ ہی تھا جس کی بنا پر نواب وقار الملک اور نواب ڈھاکا نے مشرقی بنگال کے شہر ڈھاکا میں ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس طلب کیا، جس کی بنیاد سر سید احمد خان نے ۱۸۸۶ء میں رکھی تھی۔ علی گڑھ تحریک کے سرخیلوں کے اس اجلاس میں ہونے والے تبادلۂ خیالات اور اس کے منطقی نتیجے کے طور پر آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ آغا خان، اور علی برادران محمد علی اور شوکت علی کے ہاتھوں جو سرسیّد کے انتقال کے بعد سے علی گڑھ تحریک کے روحِ رواں تھے، مسلم لیگ کے قیام کا باقاعدہ اعلان ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ لیگ کا پہلا اجلاس ڈھاکے میں ہوا تھا پھر ۱۹۰۷ء میں کراچی میں اور ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوا۔

ڈھاکے میں منعقد ہونے والے ۱۹۰۶ء کے افتتاحی اجلاس میں زیادہ تر وہی لوگ تھے جو عرصۂ دراز سے سیاست کے میدان میں تھے اور جنھوں نے اپنے تجربات کی بنا پر یہ رائے قائم کی تھی کہ کانگریس مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتی اور قومی مفاد کی پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی اپنی کوئی باقاعدہ تنظیم ہونی چاہیے۔ بہت سے مسلم لیگی رہنما اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ایسے ادارے کی رکنیت رکھنا بے کار تھا جو کھلم کھلا فرقہ پرستی کی راہ پر گامزن ہو گیا ہو۔ اس طرح مسلم لیگ کا قیام تاریخی اعتبار سے پہلا قدم ثابت ہوا جس نے برصغیر کے مسلمانوں میں نئی روح پھونکنے میں مدد دی۔

خود برطانیہ کے اربابِ اختیار نے مصنوعی ہندو مسلم تقسیم کی بنیاد رکھی تھی اور اس کے بارے میں تاریخ نویس بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ جب اس مسئلے کے وجود کو برطانوی اربابِ اختیار کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے بخوشی یہ بات قبول کر لی کہ کانگریس کو متوازن کرنے میں مسلم لیگ کا وزن اہم ثابت ہو گا۔ مگر ہندو مسلم تعلقات کے اس مرحلے پر برطانوی حکومت کا رسوخ نہیں بلکہ کانگریس کا ہندوؤں کی طرف جھکاؤ اصل مشکل تھی۔ یا جیسا کہ ایک مشہور ہندو مورّخ نے کہا تھا کہ ''دراصل یہ ہندوؤں کے شدت پسند قومی رہبر تھے جنھوں نے ہندو مذہب کی بنیاد پر اپنے احتجاج کو آگے بڑھایا اور ہندوستانی قوم کی بیداری کو ہندومت کی شناخت دینے کی کوشش کی۔ اس عمل سے انھوں نے مسلمانوں کو قومی تحریک سے الگ تھلگ کر دیا اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ تشکیل کا راستہ ہموار کیا۔''

بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندوستان کی قومی تحریک میں خوف ناک حد تک بڑھتی ہوئی شدت پسندی اور دہشت گردی کے واقعات میں تیزی آنے کی وجہ سے اور انڈین نیشنل کانگریس کے اعتدال پسند حلقوں کی طرف سے عدم اطمینان کے اظہار کی وجہ سے برطانوی حکومت اس نتیجے پر پہنچی کہ ہندوستانی قوم کی توقعات پوری کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ قدم اُٹھانے ہوں گے۔ حالات بھی کچھ سازگار ہو گئے تھے اس لیے کہ ۱۹۰۵ء میں برطانیہ کی قدامت پسند (ٹوری) پارٹی کی شکست کے بعد ملک میں ایک آزاد خیال حکومت قائم ہو چکی تھی جو ہندوستان کی تنظیمِ نو کی طرف مائل تھی۔ ہندوستان کے قوم پرستوں کی برطانوی حکومت میں ہندوستانی امور کے وزیر لارڈ مورلے (Lory Morley) سے توقعات بھی کچھ زیادہ ہو چکی تھیں۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم ولیم گلیڈسٹن (William Gladstone) کے سوانح نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے والے اور زندگی بھر آزادی اور روشن خیالی کے سرخیل ہونے کے ناتے ہندوستان برطانوی حکومت کے ایک ذمہ دار افسر

لارڈ مورلے کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا جس سے اس بات کی توقع کی جا رہی تھی کہ وہ فراخ دلانہ انداز میں ہندوستان میں ایک خود مختار حکومت کی تشکیل کی ہمت افزائی کرے گا۔

۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۹ء کے درمیان لارڈ مورلے اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ منٹو (Lord Minto) نے ہندوستان میں بڑھتی ہوئی قومیت کے مطالبات کے پیشِ نظر ہندوستان کی انگریز حکومت کو جو مکمل طور پر افسر شاہی کی جکڑ بندی میں تھی، آزاد کرنے کی ابتدا کی۔ تاجِ برطانیہ کی ہندوستان کی حکومت کی براہِ راست ذمہ داری لینے کی پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر ہندوستان کی رعایا کے نام ایک فرمان کے ذریعے شہنشاہ نے نمائندہ حکومت کے قیام کا اعلان کیا، جس کو ۱۹۰۹ء کے مورلے منٹو اصلاحات کا نام دیا گیا۔

ان اصلاحات کی سب سے متنازعہ خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مسلمان آبادی کے لیے گروہی انتخاب کنندگان (Communal Electorates) کی سہولت دی گئی تھی۔ اس سہولت پر عمل درآمد کے لیے، منتخب ہونے والی کونسلوں میں مسلمان آبادی کی یقینی طور پر نمائندگی کے لیے نشستیں متعین کردی گئی تھیں اور ان نشستوں پر فائز ہونے والے نمائندگان کا انتخاب مسلم گروہی انتخاب کنندگان کے ذریعے عمل میں آنے والا تھا۔ مزید برآں، مسلمانوں کی نمائندگی کی اہمیت بڑھانے کے لیے ان کو آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی جانی تھیں۔ ظاہر ہے کہ، مسلمانوں کے رہبر اس بات پر بہت خوش تھے اس لیے کہ ان کو خطرہ تھا کہ عام نمائندگی کے اصول کے مطابق انتخابات ہوئے تو یقیناً ان کی آبادی ہمیشہ کے لیے غیر مؤثر اقلیت بن کر رہ جائے گی۔ یاد رہے کہ کانگریس نے کونسل ایکٹ ۱۹۰۹ء میں جداگانہ انتخابات کے اصول کو قبول کرلیا تھا۔ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کے ممتاز رہنماؤں میں سے ایک، گوکھلے، نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے دعوے کی حمایت بھی کی تھی۔ محمد علی جناح کے مطابق گوکھلے نے ۱۹۰۷ء میں عام اعلان کیا تھا:

''ہندوؤں کی غالب اکثریت کے مقابل مسلمان قدرتی طور پر خائف ہیں کہ ان کے معاملے میں برطانوی تسلط سے آزادی سے مراد ہندو کی غلامی بھی ہوسکتی ہے۔ اگر ہندو اسی نوع کی کیفیت میں ہوتے جیسے کہ آج مسلمان ہیں تو بلا شبہ ہم سب بھی اسی طرح کے خطرے سے دوچار ہوتے اور ہم نے بھی اسی قسم کی پالیسی اختیار کی ہوتی جیسی کہ آج مسلمانوں نے کر رکھی ہے۔''

میں اس کتاب کی وسعت اور اس کے متعینہ مرکزی مقاصد سے تجاوز کر جاؤں گا اگر اس موقعے پر اگلے چالیس برسوں میں ہونے والے واقعات کا ایک مختصر خاکہ بھی پیش کرنے کی کوشش کروں جس کی بنا پر ہندوستان کی آزادی عمل میں آئی اور بالآخر اس کا بٹوارہ ہوا۔ جیسا کہ میں نے اس کتاب کی ابتدا میں لکھا ہے، میں اور میرے دوست روشن علی بھیم جی صرف یہ چاہتے تھے کہ اس کتاب میں ہم کچھ بنیادی حقائق اور واقعات پیش کردیں جو، بادی النظر میں، بتاسکیں کہ ہندوستان کی تقسیم کیوں ہوئی۔ سلسلے وار ہونے والے واقعات کے نتیجے میں منطقی طور پر پاکستان کی تشکیل ہوئی جس کو نہ اس وقت کی سرگرمِ عمل تمام سیاسی قوتیں روک سکتی تھیں اور نہ ہی اپنی کوششوں کے باوجود، واقعات کے ریلے کو کسی نئی نہج پر ڈال سکتی تھیں۔

برطانوی راج سے 'آزادی' کا حصول اور بالآخر دو آزاد ملکوں کا قیام بہت سے عوامل کے وقوع پذیر ہونے کی وجہ سے ممکن ہوا۔ بلا شبہ یہ نتیجہ تھا بہت ساری بنیادی، ایک جیسی، کوششوں کا جو بالواسطہ اور براہِ راست ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے بیشتر محبوب مسلم اور ہندو رہنماؤں نے کیں۔

اس میں ایک اور اہم پہلو تھا ہندوستان سے باہر واقعات کے ظہور پذیر ہونے کا۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا گیا ہے، ایشیا میں بلکہ تمام دنیا میں یورپ کی برتری زوال پذیر تھی جو برطانیہ عظمیٰ کے ایوانِ اقتدار 'وہائٹ ہال' اور دوسرے طاقت کے مراکز کے روشن خیال سیاست دانوں کے ذہنوں پر اثر انداز ہوئی اور انھوں نے ہندوستان کے سلسلے میں نئے انداز سے سوچنا شروع کردیا۔ یہ سب کچھ ایک دم تو نہیں ہوا تھا۔ برِصغیر کی آئینی جد و جہد اور اس کے نتیجے میں بالآخر برطانوی حکومت کے بہت سارے اقدامات جن کے نتیجے میں 'گورنمنٹ

آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء منظور ہوا، اس بات کے بیّن ثبوت ہیں کہ یہ سب کچھ ایک طویل تکلیف دہ اور ارتقائی عمل کے ذریعے ہوا۔ ان کے علاوہ یہ سب مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح جیسے عظیم رہنماؤں کے خود کو وقف کر دینے، ان کی القائی رہبری اور ان کی پیش بینی کا القائی نتیجہ تھا جنھوں نے بہت اور سر برآوردہ رہنماؤں کی مدد سے برطانوی آقاؤں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب کم از کم وہ وقت آ گیا ہے کہ ان کو تاجِ برطانیہ کے سب سے چمک دار نگینے سے اپنے روابط میں تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ یہ ان لوگوں کے لیے تکلیف دہ اور بدمزہ صورتِ حال رہی ہوگی جن کو آخر کار ان تمام اعمال کی ذمہ داری اُٹھانی تھی، برطانوی شہریوں کی نظر میں جو برطانیہ کے راج کی تقدیر کے بارے میں آخری فیصلے کر رہے تھے۔

ان لوگوں کے کارہائے نمایاں اور ان کے حصے کی کوششوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے سفر کی ابتدا اور اس کے خوش آئند اور کامیاب اختتام کے لیے اپنا تن، من، دھن، سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس تحریر کے ان قاریوں کو بھی جو خود اپنے ملک کی جدید تاریخ میں زیادہ دل چسپی نہیں رکھتے، تحریک میں شامل قد آور شخصیات کے حالات زندگی کا علم ہے۔ مہاتما گاندھی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے حالاتِ زندگی نہ صرف تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں بلکہ درجنوں سوانح حیات، تاریخی اور سیاسی وقائع نگاری کی تصنیفات میں ان کی، جیسا کہ ان کا حق تھا، تحسین بھی ہو چکی ہے جو بھارت اور پاکستان کی ابتدائی تعلیم کی درسی کتب میں بھی موجود ہیں۔ اور اگرچہ یہ تحریر ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کے کردار تک محدود ہوگی، ۹رجنوری ۱۹۱۵ء کے دن ہندوستان کے آسمانِ سیاست پر مہاتما گاندھی کے طلوع پر میں خود کو ایک نظر ڈالنے پر مجبور پاتا ہوں جب بمبئی میں اپالو بندر کے مقام پر ان کو خوش آمدید کہنے کی غرض سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا تھا۔ گاندھی، کے عظیم گُرو گوکھلے نے ۱۹۱۲ء میں جنوبی افریقا کے سفر کے دوران پیشین گوئی کر دی تھی اور اپنے ہم وطنوں سے کہا تھا کہ گاندھی، ''بلاشبہ اس مٹی سے بنا ہے جس سے نابغۂ روزگار اور شہدا تخلیق ہوتے ہیں۔ نہیں نہیں، اس شخص میں اس سے بھی کہیں زیادہ ایسی حیرت انگیز روحانی طاقت ہے جو عام انسانوں کو ہیرو اور شہدا میں تبدیل کر دیتی ہے۔''

اسی طرح، باپ اور بیٹے، دونوں نہروؤں کے کم از کم مختصر تذکرے ہی دل چسپی کا باعث ہوں گے تاکہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں تمام زندگی کی جانے والی ان کی کوششوں اور ذاتی قربانیوں کا اعتراف ہو سکے۔ شاید ان کے بڑے سے بڑے مخالف بھی ان کے تاریخی کردار اور ان کے قابلِ تعریف اعمال کو جھٹلانے میں خود کو مشکل میں پائیں گے۔ ایک کردار مہاتما گاندھی اور ان کے وفادار ساتھی، موتی لال اور جواہر کا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ قائدِ اعظم وہ پہلے شخص ہوتے جو برملا اعتراف کرتے اگر آزادی کے سفر میں ایک دوسرے کے سب سے بڑے مخالف کا کردار دونوں کا مقدر نہ ہو گیا ہوتا، جیسا کہ طرفین ایک دوسرے کو دھرتی ماتا کی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہراتے رہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میں خود کو قومی آزادی کی اس عظیم جدوجہد میں مسلمانوں کے کردار تک محدود رکھوں گا جو، ان کے لیے ذو محاذی جنگ کے مترادف ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے لیے پہلا محاذ تو ہندوؤں کے شانہ بہ شانہ مل کر برطانوی راج کے خلاف جدوجہد تھا۔ اور دوسرا محاذ، جو حقیقتاً زیادہ بڑا محاذ تھا، وہ اس ہندو راج کے خلاف تھا جو برطانوی راج کی جگہ ان پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔

اس سلسلے میں سرسید نے جو کردار ادا کیا تھا اس کا ذکر اس باب کے اوائل میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ ان کے ذریعے ہندوستان میں مسلمانوں کا 'نیا جنم' ایک سیاسی قوت کے طور پر شروع ہوا تھا جو آل انڈیا مسلم لیگ کی صورت میں ۱۹۰۶ء میں عمل میں آیا، جس کو بالآخر ہندو قومیت کے تسلط سے آزادی کے خلاف متحرک ہونا تھا جو ہندوستان میں برطانوی راج کا ممکنہ وارث بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ لہٰذا ہندو مبصروں نے مسلم لیگ کے قیام کو مسلم علیحدگی کی تحریک کا پہلا قدم قرار دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ اس کی بنیاد رکھنے والوں میں آغا خان جیسے لوگ تھے جن میں ایسی سر برآوردہ شخصیتیں بھی شامل تھیں جو اس وفد میں جو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ منٹو سے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملے میں ملا تھا، اور جس نے ملک کی اشرافیہ، ریاستوں کے وزرا، جاگیردار، وکلا، تجار اور جلالت مآب کی مسلمان رعایا کا دستخط شدہ

ایک خطاب پیش کیا تھا جس میں حکومت کے ہر طبقے میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے علیحدہ نمائندگی دیے جانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان کے نزدیک جداگانہ انتخاب کا حق، جو بالآخر ہندوستان کے مسلمانوں کو دیا گیا تھا، ہندوستان کے قومی دھارے سے ان کی علیحدگی پر منتج ہونا تھا۔

تاریخ دان آج بھی اس بات پر مختلف خیالات رکھتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ایک سوچا سمجھا 'کانگریس مخالف' اتحاد تھا جس کی ابتدا کے نتیجے میں آزاد ہندوستان کو دو خود مختار مملکتوں میں تقسیم ہو جانا تھا، یا پھر یہ قدرتی طور پر آل انڈیا کانگریس کے قیام کا منطقی ردِ عمل تھا جو مسلمانوں کی جانب سے ان کے جواب کے طور پر دیا گیا تھا۔ یہ اکثر کہا گیا ہے کہ برطانوی حکومت اور اس کے عمال کی جانب سے کانگریس اور لیگ دونوں کے قیام کے سلسلے میں، بالواسطہ یا بلا واسطہ، جو امداد دی گئی تھی وہ برطانوی سیاست کی مکار چالوں کی ایک اور مثال تھی جس کو اگر ایجاز کا لباس دیا جائے تو 'لڑاؤ اور حکومت کرو' سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مسلم ہندو رقابت کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں تو زیادہ تر ہندو صحافیوں نے اس خلیج کو برطانوی سیاست کا نتیجہ قرار دیا اور اس مسئلے پر خلافت تحریک کے مشہور علی برادران کا وہ مشہور تبصرہ جو انھوں نے ۱۹۳۰ء لندن میں منعقد ہونے والی 'گول میز کانفرنس' کے موقعے پر کیا تھا'' ایک پرانی کہاوت تھی 'لڑاؤ اور حکومت کرو' مگر یہاں تو محنت کی تقسیم اس طرح ہو رہی ہے کہ ہم لڑیں اور تم حکومت کرو۔''

ہم عصر تاریخ داں برطانویوں کے شاطرانہ کردار کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں جو انھوں نے دونوں سیاسی پارٹیوں، مسلم لیگ اور کانگریس، سے معاملت میں ادا کیا تھا۔ پاکستان کے سب سے سربرآوردہ تاریخ داں اور سیاسی مبصر پروفیسر خالد سعید نے ایک موقعے پر کہا تھا،'' جب لارڈ ڈفرن انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کی ہمت افزائی کر رہے تھے، ان کو معلوم تھا کہ کانگریس زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل جماعت ہوگی اس لیے کہ اس وقت ابھرتے ہوئے سیاسی منظر میں کہیں بھی مسلمانوں کا وجود نظر نہیں آرہا تھا۔ لہٰذا اگر برطانیہ ہندوؤں کی اکثریت پر مبنی جماعت کی تشکیل کی ہمت افزائی کر سکتا ہے تو وہ مسلمانوں کو اسی قسم کے سیاسی کردار کے لیے کیوں نہیں اُبھار سکتا؟ شاید برطانوی حکومت کو احساسِ گناہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے غیر ضروری طور پر متنفر رہے ہیں اور یہ کہ اب وقت آچکا تھا کہ، ہندو اور مسلمان، دونوں گروہوں کی نشوونما میں ایک قسم کا توازن لانا ہوگا۔

ایک غیر جانب دار مغربی مبصر کے نقطۂ نگاہ سے میرے نزدیک اس مسئلے پر نزاع کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہیے۔ اور محمد علی جناح جیسے سربرآوردہ سیاسی رہنما نے بھی بہ ظاہر ایک مصنوعی اور نظریاتی مسئلے پر بحث میں اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ جب جناح صاحب نے قومی سیاست میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا اور وہ فوراً ہی پرچم برداروں میں شامل ہو گئے تو، دوسروں کی طرح انھیں بھی یہ ممکن معلوم ہوا کہ وہ دونوں تنظیموں سے روابط رکھ سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانی پہلے تھے اور اس طرح ان کے لیے ممکن ہوا کہ وہ، تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کے چیمپئن کے طور پر جانے گئے۔ وہ ۱۹۱۶ء کے'' معاہدۂ لکھنؤ'' کے معمار تھے اور اس کے اہم ترین سفیر گردانے گئے۔ جناح صاحبؒ اس وقت صدر نشین تھے جب، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنے سالانہ اجلاس اس برس دسمبر کے مہینے میں لکھنؤ میں منعقد کیے۔ اور یہ وہیں کا واقعہ ہے جب انھوں نے فرمایا تھا،'' ہندوؤں کی جانب ہمارا رویہ دوستانہ اور برادرانہ جذبات کا ہونا چاہیے۔ اپنی دھرتی ماں کے مفاد کی خاطر ہمارا رہنما اصول 'امدادِ باہمی' ہونا چاہیے۔ ہندوستان کی حقیقی ترقی دونوں گروہوں میں سچی مفاہمت اور ہم آہنگ رشتوں ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اپنے معاملات ہم میں کسی اور پر نہیں صرف خود پر انحصار کر سکتے ہیں۔''

پروفیسر خالد بن سعید لکھتے ہیں'' میثاقِ لکھنؤ، ہندو مسلم اتحاد کا بلند نقشاب (watermark) تھا۔۔۔ یہ سب کچھ اس سیلاب کے ریلے میں بہہ گیا جو امرتسر کے سانحے اور خلافت کی تحریک کی وجہ سے اُٹھا تھا۔''

جناح صاحب نے ۱۸۹۷ء میں کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور اپنے سیاسی کردار کی ابتدا ہی سے وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں تھے۔ ۱۹۱۳ء میں جب وہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے پسندیدہ اور مؤثر رہنما تھے، جب وہ ایسی شخصیت بن چکے تھے جو ہندو

اور مسلمانوں دونوں سے اچھی رسم وراہ رکھتے تھے، انھوں نے باقاعدہ طور پر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔ ایسے بہت سے لوگ جن سے راقم کو ذرا قربت رہی ہے، جیسے کہ میرے پیارے دوست روشن علی بھیم جی تھے، جو ایسی ہی تبدیلی سے دوچار ہوئے، یعنی برطانیہ کے خلاف لڑائی میں کانگریس کے مددگار تھے، ذرا دیر سے قائدِاعظم کے مداح ہوئے، اور انھوں نے بھی اک ذرا تامل کے ساتھ اپنے قائد کی طرح، ملک کی تقسیم کو ضروری سمجھا۔

سر سید نے جب پہلی بار ہندوستان میں دو قوموں کے بارے میں اپنا خیال پیش کیا تھا، اس وقت شاید انھوں نے سیاسی طور پر اور بین الاقوامی قانون کے مطابق یہ نہیں سوچا تھا۔ شاید انھوں نے ہندوستان کی وسیع ہندو اکثریت کے تناظر میں بنیادی طور پر مسلمانوں کی شناخت کو اجاگر کرنے کے لیے اس قسم کی بات کی تھی۔

ایک اور عظیم مسلمان کے گونج دار خیالات ہندوستان میں مسلم اتحاد کے احیا پر اثر انداز ہوئے اور انھوں نے اپنے گروہ کی شناخت کو کامیابی سے حاصل ہونے والے آزادی کے بعد اقتدار میں شامل ہونے کے لیے ضروری جانا۔ سر سید اور قائدِاعظم کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے حاصل ہونے والے خود مختار ملک پاکستان کے معماروں میں اہم اور مرکزی کرداروں میں ایک بڑا نام جو 'پاک سرزمین' کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں درج ہوا اور بہت بلند نظر آتا ہے وہ بلاشبہ عالمِ اسلام کے عظیم شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ہے۔

شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

علّامہ ڈاکٹر محمد اقبال

شاعرِ مشرق

''اقبال کی موت سے ادب کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے جو ایک جان لیوا زخم کی طرح اچھا ہونے اور پوری طرح بھرنے میں بہت وقت لے گا۔'' یہ تھے وہ الفاظ جو ایک اور عظیم الشّان شاعر، ان کے ہندوستانی ہم عصر اور ہم رُتبہ نوبیل انعام یافتہ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے ڈاکٹر محمد اقبال کے بارے میں اس وقت کہے تھے جب ۱۹۳۸ء میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ یہ بہت بڑے الفاظ تھے ایسے انسان کے لیے جس کو اپنی زندگی میں ہی بامِ شہرت مل گیا تھا اور جس کو ایشیا کے اور بالخصوص ہند اسلامی فارسی کے روحانی گنبدِ افلاک کے ایک بڑے ستارے کا مقام حاصل ہوگیا تھا۔ ان کے ایک جرمن دوست اور مستشرق نے اقبال کو ''ایک فلسفی اور ماورائی اہمیت کا شاعر'' کے الفاظ سے یاد کیا تھا۔ اور اس کے باوجود کہ ساری دنیا کے لوگ آج بھی اس کو شاعرِ مشرق کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جس کو تمام پاکستانی ملک کا ''روحانی بانی'' سمجھتے ہیں اقبال نے 'ظاہری زندگی ایسی گزاری جس کے بارے میں بہت کم کہا جاسکتا ہے اور باطنی زندگی ایسی جس کے بارے میں لوگوں کو بہت کم علم ہے۔' ان کی پیدائش غالباً ۲۲رفروری ۱۸۷۳ء کو ایک درمیانہ درجے کے خدا ترس خاندان میں، پنجاب کے قدیم شہر سیالکوٹ میں ہوئی جو آج کل کھیلوں میں استعمال ہونے والی اشیا کے لیے، اور بلاشبہ اقبال کے حوالے سے، دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ان کے اجداد کشمیر سے آئے تھے۔ وہ اونچی ذات کے برہمن تھے اور ان کے بزرگوں نے اس وقت اسلام قبول کر لیا تھا جب وہ کشمیر ہی میں مقیم تھے۔ بدقسمتی سے ایسے ہی تلخ اور بہت سے سیاسی حالات کی بنا پر جیسے آج بھی اس بدقسمت خطے میں ہو رہے ہیں، بہت سے کشمیری خاندانوں نے اپنے وطن کو اس وقت چھوڑا تھا جب ۱۸۴۶ء میں میثاقِ امرتسر پر دستخط ہوئے تھے۔ ان میں اقبال کے دادا شیخ رفیق بھی شامل تھے جنھوں نے، تین بھائیوں سمیت، اپنے آبائی گاؤں کو ۱۸۵۷ء میں خیر باد کہا اور سیالکوٹ، پنجاب میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

''پنجاب کے قابلِ فخر بیٹوں میں سے جنھوں نے اپنے مولد کی مٹی کا نام روشن کیا اور اس کو اپنے خیالات اور اپنی تہذیب سے زرخیز کیا، ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نام ایسا ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے والد (شیخ نور محمد) اگر چہ خود جدید تعلیم یافتہ نہ تھے، اپنے بچوں کو تعلیم دلانے میں یقین رکھتے تھے۔ ان کے دو بیٹے عطا محمد اور محمد اقبال تھے۔ بڑا بیٹا اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد انجینئر بنا۔ چھوٹے بیٹے نے جو زیادہ ذہین تھا فنون کے شعبے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سیالکوٹ میں مرے کالج نام کا ایک کالج تھا جو عیسائی مشن والے چلاتے تھے، محمد اقبال میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے بعد اسی کالج میں داخل کیے گئے۔ اس زمانے میں اس کالج میں عربی اور فارسی پڑھانے کے لیے ایک عظیم عالم مولوی سید میر حسن کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ مولوی صاحب اپنے شاگردوں میں علم کے حصول اور ان میں ادب کا ذوق پیدا کرنے میں خاص دل چسپی لیتے تھے۔ ایک عظیم معلّم سے ربط نے محمد اقبال کو فارسی اور عربی میں وہ بنیاد فراہم کی جو تمام زندگی ان کے کام آئی۔''

یہ تھے وہ الفاظ جن سے سابق وزیر خارجہ اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس منظور قادر مرحوم نے اقبال کے بارے اپنے مضمون

کی ابتدا کی تھی جو شائع نہیں ہوسکا۔ یہ مضمون اقبال کی سوانح حیات کے ایڈیٹر کو فراہم کیا گیا تھا جو منظور قادر مرحوم کے والد اور عظیم شاعر کے دیرینہ دوست، شیخ عبدالقادر نے شروع کی تھی، سر کا خطاب پانے کے بعد سر عبدالقادر، وکیل، پنجاب ہائی کورٹ کے جج، وزیرِ تعلیم، وزیرِ ہند کی کونسل کے رُکن اور اخبار ''آبزور'' کے مدیر ہوئے۔

اقبال کی تعلیم مشرقی اور مغربی دونوں تہذیب میں ہوئی اور ۱۸۹۹ء میں انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ فلسفے میں ایم اے کرنے کے بعد اقبال نے کچھ عرصے پنجاب کے دارلحکومت لاہور کے اورینٹل کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔

مرے کالج میں اپنی تعلیم کے دوران اقبال کو احساس ہوا کہ اُن میں اپنے احساسات کو اردو زبان کے شعری قالب میں پیش کرنے کا فن پیدا ہوگیا ہے۔ اور پھر انھوں نے مشاعروں میں شرکت شروع کردی۔ پنجاب کا شہر لاہور جو برطانوی حکومت کے دور میں ہندوستان کے فن اور ثقافت کے مرکزوں میں سے ایک تھا، وہاں اعلیٰ پائے کے مشاعرے منعقد ہوتے تھے جن میں شعرا اپنے شعر تحت اللفظ یا ترنم سے پڑھتے تھے۔ لکھا ہے کہ ایسے ہی ایک موقعے پر اقبال کسی مجبوری کی وجہ سے مشاعرے میں شامل نہ ہوسکے تو ان کی جگہ مسز سروجنی نائیڈو نے، جو بذاتِ خود بہت اچھی شاعرہ تھیں، نہ صرف اپنا کلام پیش کیا بلکہ اقبال کی ایک نظم کا (انگریزی میں) ترجمہ پیش کیا جس پر بے حد داد ملی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مسز نائیڈو، جنھوں نے بعد میں ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا، اقبال کی تحریروں سے بہت متاثر تھیں اور انھوں نے اقبال کی یہ راہ اختیار کرنے پر بہت ہمت افزائی کی تھی۔

شیخ عبدالقادر بھی جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، جو اقبال کو ایام طالب علمی کے زمانے سے جانتے تھے، ادب کے افق پر اپنے دوست کا ستارہ چمکتا دیکھ رہے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں انھوں نے اردو زبان کی ترویج کی کوشش میں ایک رسالہ ''مخزن'' جاری کیا تھا جس میں اقبال کا ابتدائی کلام شائع ہوتا تھا۔ دراصل وہی تھے جنھوں نے ادب کی دنیا سے اقبال کا تعارف کرایا تھا اور اقبال کی اولین نظمیں ''مخزن'' میں پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔

لاہور کالج میں تعلیم کے دوران اُن (اقبال) کے اساتذہ میں Mr T. W. Arnold تھے جو بعد میں Sir Thomas Arnold کہلائے فلسفے کے پروفیسر رہے تھے۔ اس ممتاز ماہرِ تعلیم نے جلد ہی بھانپ لیا تھا کہ اقبال نہایت ہونہار اور ذہین طالب علم تھے جن کو فلسفے کی تعلیم کا شوق تھا۔ انھوں نے اپنے شاگرد کی تعلیمی ترقی میں خصوصی دل چسپی لینا شروع کردی۔ سر ٹامس آرنلڈ اسلام اور جدید فلسفے کے بلند پایہ عالم تھے۔ انھوں نے دس برس علی گڑھ میں تدریس کی اور ۱۸۹۸ء میں، جب ان کی عمر چونتیس برس تھی، لاہور کالج سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اقبال کی دانش کی مزید نشو نما میں سر ٹامس آرنلڈ کا بڑا اثر تھا، جو اسلام اور فنونِ لطیفہ پر کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، شاعر کی حیثیت سے اقبال اپنے ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی سے متعارف ہوچکے تھے اور ترک فارسی صوفیا میں اور اسلامی تعلیمات میں ان کی دل چسپیوں نے ان کو اس راہ سے کبھی بھٹکنے نہیں دیا۔ ایم اے میں عربی کی تعلیم کی تکمیل کے بعد اقبال نے کچھ عرصے اورینٹل کالج اور اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دیے جس سے وہ اکتائے رہتے تھے، اس لیے ان کا بیشتر وقت مشاعروں اور دوسری نوع کی ادبی نشستوں میں گزرا کرتا تھا۔ اوّل الذکر میں وہ اپنے غزلیں پڑھتے تھے جو بہت پسند کی جاتی تھیں جب کہ دوسری نشستوں میں وہ مختلف موضوعات پر اپنی نسبتاً طویل نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ روایتی طور پر غزلیں ہلکی رومانوی شاعری کے لیے مخصوص ہوتی تھیں مگر، دوسرے شعرا کے مقابلے میں اقبال ان کو اپنے سنجیدہ مسائل کے بیان کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ بقول مشہور تاریخ داں، پروفیسر کیرنن (Professor Kiernan) جنھوں نے ہندوستانی، ایشیائی اور یورپ کی تاریخ پر کئی کتابیں تصنیف کی تھیں اور اقبال کی کئی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے، ''اس (غزل) کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دو مصرعوں پر مشتمل ہم وزن قافیوں والے اشعار آپس میں تسبیح کے دانوں کی طرح ہم رشتہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے معنوی طور پر الگ الگ ہوسکتے ہیں اور

بظاہر الگ الگ ہونے کے باوجود آپس میں خیال کی وحدت بھی ہو سکتی ہے۔

۱۹۳۸ء میں اقبال کے انتقال کے چند دنوں بعد بی بی سی پر ایک نشریے میں سر عبد القادر کے مطابق اقبال کو'' سننے کے لیے بہت لوگ جمع ہو جاتے تھے، سننے والے بہت دل چسپی سے سنتے بھی تھے اور ان جلسوں کے منعقد کرنے والے اداروں کی تعلیمی سرگرمیوں کے لیے مالی فائدے کا باعث بھی ہوتے تھے۔ ان کی سریلی اور پُر اثر آواز ان کے خیالات اور زبان کو چار چاند لگا دیتی تھی۔''

اپنے عظیم استاد سر ٹامس آرنلڈ کی، جو برطانیہ واپس پہنچ چکے تھے، ہمت افزائی پر اقبال نے لاہور چھوڑا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار کا سفر اختیار کیا۔ یہ ۱۹۰۵ء کا واقعہ ہے جب ان (اقبال) کے عزیز دوست سر عبدالقادر، ایک سال قبل، انگلستان جا چکے تھے۔

عبدالقادر کے مطابق'' شاعر (اقبال) کا برطانیہ میں قیام ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک رہا۔ جہاں، بیرسٹری کی تکمیل کے علاوہ، کیمبرج جیسے تعلیم کے اعلیٰ مرکز میں تعلیم کے دوران بڑے بڑے جید دانشوروں سے ملنے اور استفادہ کرنے کے مواقع بھی ملے ۔۔۔۔ جب میں ایک صحافی تھا اور اورینٹل کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ہم نے ہندوستان میں ایک دوسرے کی معاونت کی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ اتنا وقت گزارتے تھے کہ جب میں نے ان کو بتایا کہ میں نے انگلستان جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے تو انھوں (اقبال) نے کہا کہ اپنے بڑے بھائی سے اخراجات کے سلسلے میں بات کرنے کے بعد وہ بھی اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اس میں کچھ وقت لگا اسی لیے ان کی روانگی ایک برس بعد ہوئی۔ ان (اقبال) کے لیے پروفیسر آرنلڈ کا انگلستان میں ہونا سب سے بڑی دل چسپی کا باعث تھا، جو لاہور میں ان کے فلسفے کی تعلیم کے دوران پڑھنے کے معاملے میں ان کے رہبر بھی تھے اور دوست بھی اور انھوں نے انگلستان (اور دوسرے یورپی ممالک) میں بھی اسی ہم دردی کے جذبے میں ان (اقبال) کی رہنمائی کی۔''

یہ دراصل پروفیسر آرنلڈ ہی تھے، جو اس زمانے میں انڈیا آفس لائبریری میں لائبریرین کے عہدے پر فائز تھے، جنھوں نے اقبال کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کیمبرج میں ترقی یافتہ طالب علم کے طور پر داخلہ لے کر مقالہ لکھیں اور ڈگری حاصل کریں۔ اقبال نے ان کے مشورے پر عمل کیا۔ انھوں (اقبال) نے بیرسٹر بننے کے لیے لنکنز اِن (Linclon's Inn) میں داخلہ لے لیا۔ تین برس کی محنتِ شاقہ کے بعد ان (اقبال) کو کیمبرج سے ڈگری بھی مل گئی اور ان کو بیرسٹری کی اجازت بھی مل گئی۔ پروفیسر آرنلڈ فارسی تصوف پر ان (اقبال) کے مقالے سے اتنے خوش ہوئے کہ ان کو مشورہ دیا کہ جرمنی کی ایک یونی ورسٹی میں اسی مقالے کا جرمن زبان میں ترجمہ داخل کریں، جس پر انھوں نے عمل کیا۔ ان کی اور اقبال کی توقعات کے مطابق میونخ یونی ورسٹی نے مقالہ منظور کر لیا گیا مگر شرط عائد کی کہ اس مقالے کے مصنف کو جرمنی میں کم از کم تین برس تک قیام کرنا اور ان کو جرمن زبان میں لکھنے پڑھنے کے قابل ہونے کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ لہٰذا اقبال جرمنی چلے گئے اور اس ملک کے مختصر قیام کے دوران نہ صرف جرمن زبان کے علوم سے واقفیت ہوئی بلکہ جرمنی کے رہن سہن سے متعارف ہونے کی وجہ سے ان کی وسعتِ نظر میں بھی اضافہ ہوا۔ اور پھر، بالآخر، میونخ یونی ورسٹی نے اپنے وعدے کے مطابق ان (اقبال) کو ڈاکٹر کی ڈگری (Ph.D) عطا کی۔

بلا شبہ ہندوستان کے ایک عظیم سپوت، شاعرِ مشرق کے اتنے مختصر سے خاکے میں ان کی ادبی کارگزاریوں سے انصاف نہیں کیا جاسکتا، نہ ہی میں ان کی شاعری اور ان کے فلسفیانہ خیالات کے بارے میں اپنی رائے دینے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ میں تو صرف اس دیو ہیکل شخصیت کے بارے میں قابلِ قدر اور عظیم دانشور علما اور مبصرین کے ارشادات کے ٹکڑوں سے ایک خاکہ ہی تیار کر سکتا ہوں۔

اس منصوبے پر عمل کرنا میرے لیے اس قاری کے نکتۂ نظر سے ہے جس کا پیار ۱۹۵۹ء میں اس وقت شروع ہوا جب مجھے ایک 'ان جانے کا سفر' در پیش تھا۔ پاکستان کے لیے، ایک نوزائیدہ ملک کے لیے جس کو اس وقت تک جرمنی میں، میونخ میں، بہت کم لوگ جانتے تھے جہاں سے اقبال نے بڑے فخریہ انداز میں اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری وصول کی تھی۔ اسی وقت میں ڈاکٹر محمد اقبال سے متعارف ہوا تھا اور پھر مجھے وہ یادگار دکھائی دی جو میونخ کے شہریوں نے جنوبی جرمنی کے شہر Schwabing کے مرکزی علاقے کے ایک باغیچے میں شاعرِ مشرق

کے اعزاز میں تعمیر کی تھی۔ اور یہ بھی میری خوش قسمتی ہی تھی کی میری ملاقات اقبال اور اُن کے کام کے ایک چاہنے والے ممتاز اور نہایت وفادار سرکاری افسر جناب ممتاز حسن سے ہوگئی۔ ان سے میری پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی جہاں وہ نیشنل بینک آف پاکستان کے افسر اعلیٰ بھی تھے اور جرمنی کی حکومت کے بنائے ہوئے ادارے پاک جرمن فورم کے صدر بھی، جو پاکستان اور جرمنی کے درمیان دوستی کے لیے بہت کام کر رہا تھا۔ اس ادارے کے خزانچی کے فرائض مجھ سے قبل ایسٹرن فیڈرل میں متعین جرمن شخصیت سے مجھے ورثے میں ملے تھے اور اس کے ساتھ ہی میری ملاقات جناب ممتاز حسن، جناب رنگون والا، جناب عقیلی اور پروفیسر صدیقی ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیات سے ہوئی جو اس ادارے کے نہایت مخلص کارکن بھی تھے اور اس صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے کے کامیاب کاروباری اور دانشور بھی۔ جرمن زبان کے دیو قامت شاعر جان وولفگانگ گوئٹے (Johann Wolfgang Goethe) سے اقبال کی پسندیدگی اور ہیگل (Hegel)، نطشے (Nietzsche) اور کارل مارکس (Karl Marx) جیسے مفکرین اور مشاہیر کے اثرات ہمارے درمیان مضبوط رشتے بن گئے اور ان سب نے مل کر کے ان چند برسوں پر محیط میری ذاتی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ممتاز حسن اور ان جیسی ثقہ شخصیات ان مذہبی اور تہذیبی نظریات کی پاسبانی میں پیش پیش تھے جو سر سید احمد خان اور اقبال جیسے روحانی پیشواؤں نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی غرض سے پیش کیے تھے اور ان پر عمل درآمد بھی کیا تھا۔ اور اس بات کو میں نے اسے ہمیشہ اپنی ذاتی خوش قسمتی پر محمول کیا تھا کہ میرے پاکستان کے قیام کی ابتدا ہی سے مجھے ممتاز حسن اور ان کے ساتھیوں جیسے قد آور لوگوں کی صحبت نصیب ہوئی جس کے طفیل میں نے پاکستان کی تہذیبی اور روحانی کیفیات کی جھلکیاں بھی دیکھیں اور پاکستان کی تاریخ سے متعلق میری تربیت بھی ہوئی۔ ان حضرات کی شخصیات کی فنی ترکیب نے، مجھ جیسے نو وارد کی جھولی میں معاشیاتی اور کاروباری اطلاعات سے معمور اور ایک معتدل اور متوازن خزانہ ڈال دیا تھا جس سے مجھے اپنی آئندہ زندگی میں بہت مدد ملی۔

اس طرح مجھے پتا چلا کہ اقبال صرف ایک عالمی درجے کے معروف شاعر اور فلسفی ہی نہیں تھے۔ وہ اس تحریک کے روحانی پیشوا بھی تھے جو بعد میں تحریکِ پاکستان کہلائی۔ سمندر پار سے کامیاب واپسی کے باوجود وہ لاہور میں ایک عام قسم کے انسان رہے تھے۔ میں اب سمجھا کہ یورپ کے سفر سے پہلے اقبال ایک قوم پرست تھے۔ مگر وہاں کے قیام کے دوران ان کو جدید قوم پرستی کی مختلف صورتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس طرح ان کو تنگ نظر نسلی اور جغرافیائی وفاداری اور وسیع النظر اسلام میں فرق کا اندازہ ہوا۔ اس سے زندگی کے بارے میں ان کے نظریے میں انقلابی تبدیلیاں ہوئیں۔ اب وہ کسی ایک گروہ کے شاعر نہیں رہے، وہ پوری انسانیت کے شاعر ہو چکے تھے۔ ممتاز حسن کے الفاظ میں وہ ''اُس جذباتی اور نظریاتی ارتقا کی سب سے بڑی علامت تھے جس سے برصغیر میں اسلامی تہذیب کی نشاۃ الثانیہ ہوئی اور بالآخر ایک خود مختار حیثیت میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ وہ مشرق سے اُٹھنے والے پہلے شخص تھے جس نے جدید فلسفے کے تناظر میں اسلام کا مطالعہ کیا اور بنیادی اسلامی قدروں میں اہم اور کبھی نہ ختم ہونے والے اثرات کو اُجاگر کیا۔ پاکستان میں مقیم لوگوں کے لیے وہ دنیا کی تہذیب کی جانب کھلنے والے دریچے کی مانند تھے۔ وہ بالخصوص جرمنی اور پاکستان کے درمیان ایک تہذیبی پُل کی صورت تھے۔ پاکستان اور ہندوستان میں محمد اقبال جیسا کوئی اور نہیں جو ہم کو جرمن خیالات اور جرمن تہذیب سے اتنا قریب لے گیا ہو۔'' اس میں کوئی کلام نہیں کہ ۱۸۹۸ء میں سر سید احمد خان کے انتقال کے بعد اقبال ہی ہند مسلم جدیدیت کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جب وہ یورپ آئے تھے تو مغربی خیالات میں عظیم تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ فلسفے کے میدان میں وہ جدید مفکرین مشہور اور فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں (Henry Bergson) کے خیالات سے بے انتہا متاثر تھے۔ نفسیات میں سگمنڈ فرائیڈ (Sigmund Freud) نے شعوری اور لاشعوری دماغ انسانی میں ان پوشیدہ قوتوں کو ظاہر کرنے کا دعویٰ کیا تھا اس سے پہلے جن کا استدلالی تجزیہ نہیں ہوا تھا۔ اور طبعیاتی سائنس میں البرٹ آئن اسٹائن (Albert Einstein) نے نظریۂ اضافیت (Thoery of Relativity) پیش کر کے جس کے مطابق کمیت اور اور توانائی کو

برابر تصور کیا گیا ہے، ایک انقلاب بر پا کر دیا تھا۔

اقبال نے ان سارے نظریات اور افکار کا بغور مطالعہ کیا تھا جنھوں نے ان کے ذاتی اندازِ فکر پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔ اقبال نے اپنے مسلسل غور وفکر کے انعکاس کو معروضی انداز میں اپنے چھ عدد خطبات میں پیش کیا جو انھوں نے مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ میں دیے تھے اور بعد میں Reconstruction of Religious Thought in Islam کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان خطبات میں انھوں نے اپنے اس یقین کا خاکہ پیش کیا تھا کہ پہلی جنگِ عظیم کے ساتھ اسلام میں در آنے والی پانچ سو برس کے طویل عرصے کی سیاسی کم زوریوں اور روحانی اضمحلال کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اقبال کے خیال میں مغرب کی بالادستی کی اصل وجہ یہ تھی مسلمانوں کے مقابلے میں یورپی قوموں نے ان سائنسی ایجادات سے استفادہ کر لیا تھا جو خود مسلمانوں ہی کی طرف سے آئیں تھیں۔ بیسویں صدی میں اسلامی دنیا میں پائے جانے والے روحانی اضطراب ہی میں اقبال اسلام کی نشاۃ الثانیہ کو دیکھ رہے تھے۔ اقبال کا تصور تھا کہ مختلف مسلم ممالک رضا کارانہ طور پر مل کر ایک وفاق ترتیب دیں اور اس سلسلے میں انھوں نے مغرب کے فلسفے کی روشنی میں اسلامی تصورات کی نئی تجسیم کی کوشش کی تھی۔ وہ قائل تھے کہ اسلامی قانون کی نئے سرے سے ترتیب ضروری ہو گئی ہے اور یہ بھی کہ قدیم راسخ العقیدہ دبستانِ قانون کو تبدیل کرنا ہوگا جس میں افراد کے انتخاب کی گنجائش بھی ہو اور لوگ ذاتی نقطہ نظر رکھنے میں آزاد ہوں۔

یورپ سے واپسی پر انھوں نے پھر تدریس کی طرف دھیان دیا مگر صرف دو برس بعد ہی حکومت کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اس لیے کہ وہ حکومت پر کھل کر تنقید کر رہے تھے۔ ان کا قیام لاہور ہی میں رہا، ان کی آمدنی ان کے سادہ طرزِ زندگی کے لیے کافی تھی اور ان کا بیشتر وقت مطالعے اور شاعری میں گزرتا۔

اقبال کے زندگی بھر کے خدمت گزار میاں اللہ بخش نے ۱۹۵۷ء میں جناب ممتاز حسن کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں ان سے پوچھا گیا تھا کہ قانونی معاملات میں کیا اقبال کو بہت وقت صرف کرنا ہوتا تھا۔ اس سوال کے جواب سے دنیاوی معاملات میں اقبال کے طرزِ عمل پر دل چسپ روشنی پڑتی ہے۔ اللہ بخش نے کہا، ''اپنے قانونی ذریعۂ معاش کے سلسلے میں وہ ایک حد سے آگے نہیں جاتے تھے۔ عام طور جب ان کو ایسا مقدمہ مل جاتا تھا جس سے ۵۰۰ روپے کی آمدنی متوقع ہوتی تو وہ مزید مقدمہ لینے سے انکار کر دیتے اور موکلوں کو اگلے ماہ آنے کا مشورہ دیتے تھے۔ اگر مذکورہ رقم کا مہینے کے شروع کے چار یا پانچ دنوں میں ہی ملنا ممکن ہو جاتا تو وہ اس مہینے میں کوئی اور مقدمہ لینے سے انکار کر دیتے ان کے اندازے کے مطابق اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لیے اس رقم سے زیادہ کے طلبگار نہ ہوتے۔ پرانے زمانے میں اس رقم میں گھر کے کرائے، ملازموں کی اور منشی کی تنخواہ کے علاوہ گھر کے دوسرے اخراجات بھی بہ آسانی ادا ہو جایا کرتے تھے۔''

ان کے حالاتِ زندگی کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جوانی کے زمانے سے ہی اقبال دنیا کو اس نظر سے دیکھتے جو ایک ہندوستان کے متوسط مسلم طبقے کے انسان کے لیے ممکن ہوتا تھا۔ پروفیسر کیرنن کے مطابق، ''وہ اپنے آپ کو جاگیر دار اور کسان کے تعلق سے الگ تھلگ رکھ کر ہندوستان کے مسلمان معاشرے کی تجدید کی رہبری کرنا چاہتے تھے۔ برطانوی استعمار کی ہندوستان پر فتح، مغل سلطنت کے زوال اور ''غدر'' کی ناکامی کے بعد پس منظر میں پھینک دیے جانے والے مسلمان نہ صرف چکرائے ہوئے تھے بلکہ اپنے معاشرے کے موجودہ حالات سے ناخوش بھی تھے۔ اس دوران، ہندو، جو اپنی تجارتی عادتوں کی وجہ سے خود کو حالات میں آسانی سے ڈھال لینے کے عادی تھے، آگے بڑھتے رہے۔ سرسید احمد اور علی گڑھ تحریک نے جب مسلمانوں کو نئے دور کی حقیقتوں کو گرفت میں لینے کے لیے آمادہ کیا تو قدرتی طور پر وہ کانگریس کی ہندو قومیت تحریک کے پیچھے ہو لیے۔ لہٰذا اقبال کی ابتدائی شاعری میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بھائیوں کی طرح شانہ بہ شانہ ایک آزاد اور متحد ہندوستان کے لیے جد و جہد کا تصور ملتا ہے، (مگر) یہ زیادہ دن نہیں چلا۔ برطانوی حکومت سے نہیں بلکہ ہندوؤں کی مالی برتری اور تنظیم کے احساس سے، باوجود مختلف تبدیلیوں کے، مسلمان درمیانہ طبقہ کانگریس کو چھوڑ کر مسلم لیگ کے دکھائے ہوئے راستے پر

چل پڑا۔

متوسط طبقے کا فرد اقبال، جاگیرداروں اور شہزادوں سے بھی قریب تھا، ان کے نیچے کے کسانوں اور مزدوروں سے بھی، اور اس طرح وہ ان سب کی نظر سے زندگی کو دیکھ سکتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اقبال، وسیع معنوں میں، ایک سیاسی شاعر تھے، جو انسان کی سماجی حالت کے بارے میں متفکر رہتے تھے۔ مگر صدی کے دوسرے عشرے سے ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے انتقال تک وہ سیاست میں بھی عملی طور پر حصہ لیتے رہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری سے استعفیٰ دینے کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت کی ملازمت کی وجہ سے وہ اپنے ضمیر کے مطابق آزادی سے بول نہیں سکتے تھے۔ اور باوجود مالی حالات کی تنگی کے انھوں نے برطانوی راج کی ملازمت سے پرہیز کیا حالانکہ ان جیسے پڑھے لکھے اور قابل انسان کا اس 'نظام' میں کھپ جانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ان کے فرزند، ڈاکٹر جاوید اقبال کے قول کے مطابق وہ کسی مسلمان ریاست میں کسی ایسے کام کی خواہش رکھتے تھے جس میں وہ اپنے ضمیر کے مطابق آزادانہ بول یا لکھ سکتے۔ وہ ریاست حیدرآباد بھی گئے جہاں ان کی ملاقات ان کے استادِ محترم نواب مرزا داغ سے بھی ہوئی، جو بلاشبہ اردو ادب کے عظیم شاعر اور اپنے وقت کے شہنشاہِ غزل تھے اور نظام حیدرآباد کے 'استادِ شہ' بھی تھے۔ مگر وہ حیدرآباد کے 'مردہ' ماحول اور نظام کی انگریزوں سے چاپلوسی کے باعث نہایت دلبرداشتہ لاہور واپس ہوئے۔ ان کے پائے کے ادیب اور شاعر پر تخلیقات کے معاملے میں اپنے لوگوں کی طرف سے تہذیبی اور سماجی دباؤ کی بنا پر اس زمانے میں دوستوں کو لکھے ہوئے خطوط میں اقبال ایک تلخ نوا اور مایوس انسان دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے خطوط ان لوگوں کی کلبیت، منافقت، تنگ نظری اور خود غرضی کے حوالوں سے پُر ہیں جن کے درمیان وہ پیدا ہوئے تھے۔

یورپ میں تین برس کی مشقت آمیز تعلیم ہی ان کے سیاسی شاعر بننے کا سبب تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، انھوں نے 'وحدت الوجود' کے معتقد فارسی کے عظیم شاعر حافظ کے زیرِ اثر اپنا ادبی مشغلہ 'ہمہ اوست' کے عقیدے کی بنیاد پر شروع کیا تھا۔ اقبال کے فرزند جاوید لکھتے ہیں، ''انھوں نے رومانوی شاعر کی حیثیت سے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے سیاسی خیالات کی بنیاد عقیدۂ وحدت الوجود پر رکھی۔ لہٰذا انھوں نے ہندوستان کی قومیت کی پاسداری میں نظمیں لکھیں۔ مگر یہ ایک دورِ گزراں تھا۔ یورپ میں تین برس کے قیام نے ان کے ذہن میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ وحدت الوجود کے فلسفے کو غیر تسلی بخش قرار دے کر اسلامی یک جہتی کی طرف مائل ہو گئے۔''

''یہ مسلم قومیت کا ارتقا ہی تھا جس نے ہندوستانی قومیت کی تحریک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور بالآخر اسلام کی ہندوستان سے علیحدگی پر منتج ہوئی۔'' اقبال کے ذہن کی تبدیلی ان کے ۱۹۰۹ء میں لکھے ہوئے خطوط میں سے ایک میں واضح طور پر جھلکتی ہے۔ ''میں خود بھی اس خیال کا حامی ہوں کہ اس ملک (ہندوستان) سے مذہبی تفرقہ ختم ہونا چاہیے اور میں تو اپنی نجی زندگی میں بھی اسی پر عمل پیرا ہوں۔ مگر میرے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی قوموں کی حیثیت سے الگ الگ پہچان کو برقرار رہنا چاہیے۔ ہندوستان کے لیے ایک مشترک قومیت ایک سہانا تصور ہے اور اس میں شاعرانہ حسن بھی ہے مگر موجودہ حالات کے اور دونوں قوموں کے لاشعوری رجحانات کے پیشِ نظر یہ قابلِ حصول نظر نہیں آتا۔'' تو یہ تھا وہ آزاد، خود مختار اسلامی مملکت کا نقیب جس نے کئی عشروں بعد، آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر کی حیثیت سے، جو ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں منعقد ہوا تھا، اپنے مشہور خطبے میں مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا تھا جو مسلمانوں کے لیے ایک مترنم صدا تھی۔

''فرقہ وارانہ گروہوں کی شناخت کے فیصلے کے بغیر یورپ کی جمہوریت کے اصول ہندوستان میں لاگو نہیں ہوتے۔'' اقبال نے فرمایا، ''لہٰذا مسلمانوں کا 'ایک مسلم ہندوستان' کا مطالبہ بالکل برحق ہے۔''

انھوں نے تحیر میں ڈوبے ہوئے شرکاء سے کہا، ''ذاتی طور پر میں پنجاب، شمالی صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک اور خود مختار

مملکت کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں، خواہ وہ برطانوی راج میں ہو یا اس سے باہر۔ اور کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے شمال مغربی ہندوستان میں ایک مسلم مملکت کا قیام میرے نزدیک حتمی طور پر مقسوم ہے۔''

اس کو اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۰ء کے نومبر دسمبر سے کچھ عرصہ قبل پہلی گول میز کانفرنس کے دوران چودھری رحمت علی نامی ایک صاحب لندن میں مقیم مسلمان زعما سے ملے تھے اور انھوں نے پہلی بار ہندوستان کی تقسیم کی تجویز پیش کی تھی جس میں پاکستان کا نام پیش کیا گیا تھا۔ P سے مراد پنجاب، A سے مراد افغانیہ (یعنی شمال ۔ مغربی سرحدی صوبہ)، K سے مراد کشمیر، I سے مراد ایران، S سے مراد سندھ اور tan سے مراد تھا بلوچستان۔ وہ اقبال جیسے ایک نوجوان پنجابی طالب علم تھے جو اپنے دوستوں کے ہمراہ سیاسی حلقوں میں، جو ساتھی طالب علموں پر مشتمل ہوتے تھے، اس نوعیت کی ایک 'تجویز' پر بحثیں کیا کرتے تھے۔ یہ لفظ (پاکستان) پہلی بار جنوری ۱۹۳۳ء میں شائع ہونے والے ایک چہار ورقی کتابچے میں نظر آیا جس کا عنوان تھا Now or Never جس پر چودھری رحمت علی اور ان کے تین دوستوں کے دستخط تھے۔

اقبال نے جب آل انڈیا مسلم لیگ کے مندوبین پر اپنے منصوبے کو افشا کیا تو وہ سب حیران رہ گئے ہوں گے اس لیے کہ، جیسا کہ چودھری خلیق الزماں نے اپنی سوانح حیات میں رقم کیا ہے، ''تعجب کی بات ہے کہ نہ مسلم لیگ کی کاؤنسل نے صدر کے خطبے پر کسی قسم کا ردِ عمل ظاہر کیا نہ ہی ان کے منصوبے کے بارے میں کوئی ٹھوس تجویز پیش کی۔'' جیسا کہ شریف الدین پیرزادہ نے بعد میں اپنی روداد میں لکھا تھا کہ اقبال کے خطبے کے بعد گرما گرم بحث کے دوران مندوبین کی رائے میں شدید اختلافات ظاہر ہوئے۔ 'اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ اقبال اجلاس چھوڑ کر چلے گئے۔' اس کے باوجود اس میں کوئی کلام نہیں ان کا خطبہ مسلم لیگ کی جد و جہدِ آزادی میں ایک تاریخی سنگِ میل کی حیثیت اختیار کر گیا۔

اقبال ۱۹۲۶ء میں باقاعدہ سیاست میں اس وقت داخل ہوئے جب ان کے دوستوں اور مداحوں نے ان کو پنجاب کی قانون ساز کونسل کی رکنیت کے لیے انتخاب لڑنے پر تقریباً مجبور کر دیا تھا۔ انھوں نے لاہور کی مسلمان آبادی سے انتخاب میں بے مثال کامیابی حاصل کی اور پارٹی کی باقاعدہ رکنیت کے بغیر وہ مقامی سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور انھوں نے کونسل کی رکنیت کی پوری مدت مکمل کی۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان کی شہرت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ آغا خان اور محمد علی جناح کے ہمراہ، مسلم مندوب کی حیثیت سے ۱۹۳۱ء میں انھوں نے لندن میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ مندوب کی حیثیت سے انھوں نے ''مسلمانوں کے حقوق کی وکالت اور ہندوستان کی طرف سے آئینی ترتیب نو کے مطالبے، دونوں معاملات میں ایک اہم کردار ادا کیا۔''

آزادی کی جنگ لڑنے والے عظیم لوگوں کی زندگی کے موضوع پر جناب جی الانا کی معرکتہ الآرا کتاب کے مطابق، ''۱۹۳۲ء میں علامہ اقبال ایک بار پھر مندوب کی حیثیت سے تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن آئے۔ اس وقت قائدِ اعظم انگلستان ہی میں تھے اور انھوں نے ہندوستان کی باقاعدہ سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ یہ دونوں حضرات اکثر ملتے تھے اور کانفرنس میں پیش آنے والے واقعات اور بحثوں کی بظاہر ناکامی سے دلبرداشتہ تھے۔''

''ہندوستان واپسی پر علامہ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں منعقد ہونے والی آل انڈیا مسلم لیگ کی کانفرنس کی صدارت کی اور اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے فرمایا کہ وہ اس نوعیت کی قومیت کے خلاف ہیں جیسی کہ یورپ والے سمجھ رہے ہیں، اس لیے کہ اس میں لامذہب مادّہ پرستی کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ جو چیزیں حقیقتاً اہم ہوتی ہیں وہ انسان کا عقیدہ، اس کی تہذیب اور اس کی تاریخی روایات ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ ''میری نظر میں یہی وہ باتیں ہیں جن کے لیے جیا اور مرا بھی جا سکتا ہے، نہ کہ کسی خطۂ زمین کے لیے جس سے انسان کا جذباتی لگاؤ عارضی ہوا کرتا ہے۔''

اقبال نے اپنی وفات تک سیاست میں حصہ لیا۔ کچھ عرصے کے لیے وہ پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے صدر رہے اور قائدِ اعظم کی

ہندوستان واپسی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلمہ رہبر بننے تک دونوں ایک دوسرے سے قریبی رابطے میں رہے۔ اقبال خطوط کے ذریعے جناح صاحب کو پنجاب کے حالات سے اور کُل ہندنوعیت کے مسائل پر اپنے ذاتی خیالات سے آگاہ کرتے رہے۔ الانا صاحب کے مطابق، ''ان خطوط سے پتا چلتا ہے کہ یہ دونوں رہبر کس طرح ایک دوسرے کے شانہ بشانہ رہے اور یہ بھی کہ ان دونوں میں برصغیر کے مسلمانوں کے حتمی ہدف اور ان کے مقدّر کے بارے میں کس قدر ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔''

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے شخصی خاکے میں اس نوعیت کے بہت سارے 'ٹکڑے' شامل کیے جا سکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ سب اس شخص کی تصویر میں نہ صرف رنگ بھریں گے بلکہ قاری کے ذہن کے لیے بہت کچھ مہیا کریں گے۔ وہ سب ٹکڑے دراصل ایک ایسے حیرت افزا سفر کی جزئیات ہوں گے جس کا بیان دل چسپی کا حامل ہوگا۔ ان سے ایک انسان کی ایسی تصویر بنے گی جو بلاشبہ ہر شے پر حاوی رہا اور جو بین الاقوامی سطح پر 'شاعرِ مشرق' معروف ہوا، اس کو ۱۹۲۲ء میں انگلستان کے بادشاہ کی جانب سے 'سر' کا خطاب عطا ہوا اور وہ برِصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا مسلمہ اور ہردلعزیز رہبر بنا۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ باوجود اتنی محبت اور اتنے سارے اعزازات کے اپنی زندگی کے اختتام تک اقبال نے نہایت سادہ زندگی گزاری۔ ان کی زندگی کے آخری ایام ایسے غم کے سائے میں بسر ہوئے جوان کی رفیقِ حیات کی موت نے ان کے سر پر تان دیا تھا، اور اس پر مستزاد ایک طویل عرصے تک ان کی صحت خراب رہی۔ ان کے زندگی بھر کے خادم کے مطابق وہ ایک ایسے نرم دل انسان تھے جو اپنے ہر عمل میں بہت مضبوط کردار رکھتے تھے اور شاید ہی کبھی غصے میں آتے تھے۔ وہ اپنے دونوں بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی بیٹی اور بیٹے دونوں نے اہلیہ کی وفات کے بعد ان کا بہت خیال رکھا۔

ان کی نظریاتی صلابت اور قوتِ ارادی آخر دم تک ناقابلِ شکست رہی بلکہ اپنے لوگوں کی خدمت کے سلسلے میں ان کے ارادے روز بروز مستحکم ہوتے رہے حالانکہ ان کی جسماتی قوت تیزی سے زوال پذیر تھی۔ ان کی نظر اچانک اتنی کم زور ہوگئی تھی کہ خطوط لکھنے کے لیے انھیں اپنے دوستوں سے مدد لینی پڑتی تھی۔

۲۰راپریل ۱۹۳۸ء کو ان کا آخری ملاقاتی اتفاق سے ایک جرمن شخص، ایک مشہور مسافر، مستشرق اور فلسفی Hans-Hasso von Veltheim Ostrau تھا۔ اپنی یادداشت میں جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد شائع ہوئی اس نے لکھا:

''دوپہر کے وقت میں مشہور شاعر اور فلسفی سر محمد اقبال سے ملاقات کو گیا۔ وہ کئی ماہ کی علالت کے سبب صاحبِ فراش تھے۔ انھیں دمے کا اور سینے کے درد کا عارضہ لاحق تھا، موتیابند کہ وجہ سے وہ تقریباً نابینا سے ہو چکے تھے۔ ہم نے گھنٹوں فلسفے اور مصوری پر تبادلۂ خیال کیا اور عالمی سیاسی حالات پر باتیں کیں۔ جرمنی میں قیام اور سفر کی وجہ سے اقبال جرمنی کو پسند کرتے تھے اور جرمن شاعر گوئٹے سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے کچھ عرصہ قبل مجھ سے اتفاق کیا تھا کہ وقت کی ضرورت کے پیشِ نظر اب ہندوستانیوں اور جرمنوں کے درمیان قریبی روحانی رشتے استوار ہونے چاہییں۔ میں نے اپنے لاہور کے دوستوں سے کہا تھا کہ میرے نزدیک اب اقبال کا وقتِ آخر دور نہیں، تاہم مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں اقبال سے ملنے والا آخری آدمی ہوں گا۔ دوسرے دن صبح ہندوستان کے اخبارات کے ضمیمے شائع ہوئے جن میں ۲۱راپریل علی الصباح اقبال کے انتقال کی خبر تھی، یعنی ان سے میری ملاقات کے چند گھنٹوں بعد اقبال کا انتقال ہو گیا۔ ہندوستان بھر کے اسکول، یونی ورسٹیاں، عدالتیں اور بازار سب اقبال کے انتقال کے سوگ میں بند ہو گئے اور ہندوستان کے مسلمانوں نے اقبال کے موت پر کئی دن سوگ منایا۔ اخباروں نے لکھا،'' بدھ کی رات سر محمد اقبال ہشاش بشاش تھے اور انھوں نے کافی دیر تک اپنے جرمن دوست Baron von Veltheim سے باتیں کیں۔ دونوں نے کافی دیر تک فلسفے اور سیاست پر تبادلۂ خیال کیا۔ جرمن دوست کی روانگی کے بعد اقبال دو بجے رات تک سوئے رہے اور صبح کے قریب سینے میں اٹھنے والے درد نے ان کو بیدار کر دیا۔ اقبال کو اندازہ ہوگیا تھا کہ موت قریب ہے ،انھوں نے فارسی کے کچھ تازہ اشعار لکھوائے۔ ان کے آخری الفاظ تھے: میں مسلمان ہوں، موت سے نہیں ڈرتا۔ میں اس کو مسکراتے ہوئے

خوش آمدید کہوں گا۔'' ایک بڑا مسلمان، شاعر، فلسفی اور مسلمانوں کے حقوق کا علمبردار رخصت ہوگیا۔ سر عبدالقادر کے قول کے مطابق اس کا جنازہ ایسی دھوم سے اُٹھا تھا شاید کہ شہزادے اس کی تمنا کرتے۔ ان کی آخری آرام گاہ لاہور میں بادشاہی مسجد کے قریب واقع ہے جہاں روزانہ لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آتے ہیں اور اپنے جذبات کے تشکر کی علامت کے طور پر قبر کی پائنتی پھول چڑھاتے ہیں۔

''افکارِ پریشاں'' کے عنوان کی ایک نوٹ بک میں جو ۱۹۲۱ء میں تحریر کی گئی تھی، اقبال نے ایک جگہ لکھا تھا، ''قومیں افراد کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں، سیاست دانوں کے ہاتھوں پھلتی پھولتی اور مرجاتی ہیں۔''

کم از کم، محمد اقبال کے تصورِ اسلامی مملکت پاکستان کے معمار اپنے عہد کے قابلِ فخر رہنما قائداعظم محمد علی جناح تھے جو اس قول کے تخلیقی اور نشوونمائی پہلوؤں کے مصداق نظر آتے ہیں۔ قائد کی قبل از موت نے مسائل کے بہت سے دروازے وا کردیے ہیں، بدقسمتی سے جو آج بھی کھلے ہوئے ہیں۔

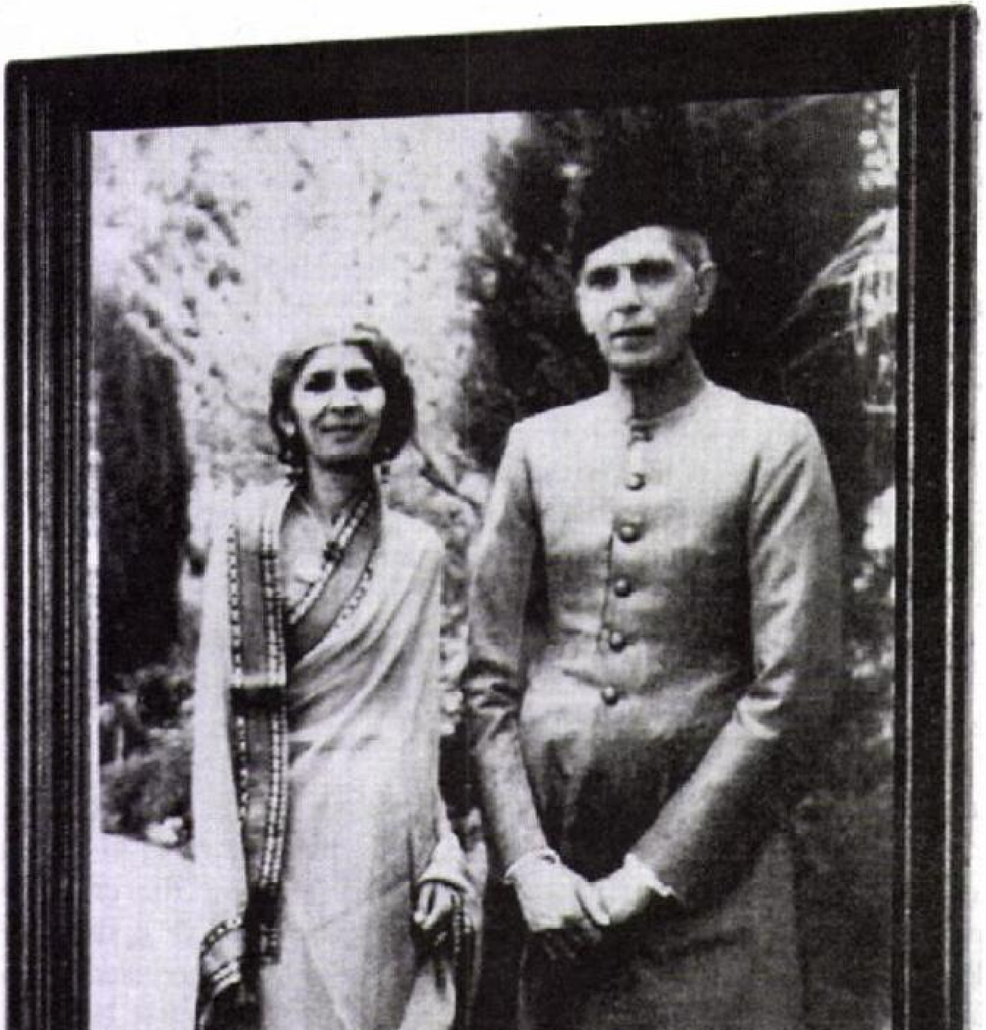

قائداعظم اور محترمہ فاطمہ جناح بمبئی مالابار ہل پر (اندازاً ۱۹۴۳ء)

مسٹر محمد علی جناح ایک کامیاب بیرسٹر (انداز اً ۱۹۱۲ء)

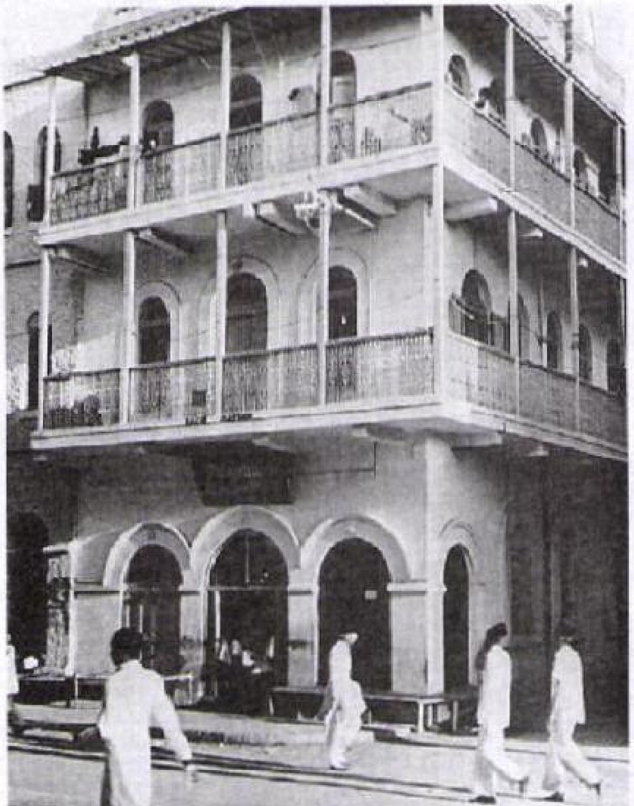

جناح صاحب کی جائے پیدائش

جناح صاحب بحیثیت گورنر جنرل آف پاکستان محترمہ فاطمہ جناح، وزیرِاعظم لیاقت علی خان
اوران کی اہلیہ کے ہمراہ

قائداعظم محمد علی جناح، روشن علی بھیم جی صاحب سے محوِ گفتگو (بمبئی اندازاً ۱۹۴۴ء)

قائدِاعظم محمد علی جناح

بانیِ پاکستان

پاکستان کی تخلیق نے ادب کا ایک بڑا اور متنوع ذخیرہ پیدا کیا ہے جس کی تخلیق مشہور صاحبانِ علم، ادیبوں اور تاریخ نگاروں کے ہاتھوں ہوئی ہے جو اس 'عظیم تقسیم' کے دونوں جانب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر کچھ بے حد اہم اور قابلِ تعظیم تخلیقات ایسی بھی ہیں جو برِصغیر سے باہر، یعنی انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکا سے آئی ہیں۔

ایسی بے شمار شخصیتوں کی سوانح حیات تحریر کی گئی ہیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے سفر میں قابلِ تعریف کردار ادا کیے تھے۔ ان میں سے کچھ، بشمول مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو، ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنی سوانح حیات خود تحریر کیں اور کئی اور کتابیں تصنیف کیں جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔

پاکستان کے بانی محمد علی جناح نے، جن کو غیر منقسم ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کا ایک غیر متنازعہ رہنما ہونا تھا، بلا شبہ گاندھی اور نہرو کے برابر آزادی کی تحریک میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ انھوں نے نہ اپنی کوئی سوانح حیات لکھی، نہ کسی قسم کی کوئی 'سیاسی دستاویز' چھوڑی۔ امکان اس بات کا ہے کہ عمر کے آخری برسوں میں تیزی سے گرتی ہوئی صحت اور کام کے بے حد دباؤ کے باعث ان کو وقت ہی نہیں ملا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اپنے پورے عرصۂ حیات میں ان کو خوب صورت نثر لکھنے کا کوئی شوق نہیں رہا۔ مگر ان کی سوانح حیات لکھنے والوں میں سے تاریخ کے مشہور پروفیسر اسٹینلے والپرٹ (Stanley Wolpert) کہتے ہیں: ''کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ کے دھارے کو بدلتے ہیں۔ ان میں سے اور بھی کم لوگ دنیا کی جغرافیہ تبدیل کرتے ہیں۔ مشکل سے کوئی ایک آدھ ہی ایسا ہو جس کو ایک قوم کو تشکیل دینے کا اعزاز دیا جا سکے۔ محمد علی جناح نے یہ تینوں کارنامے سرانجام دیے۔''

لہٰذا پاکستان کی تخلیق ان کا چھوڑا ہوا ورثہ تھا جو مسرت کا، ستائش کا، محبت کا اور شدید نفرت کا باعث تھا۔ کس کے جذبات کس نوعیت کے تھے اس کا انحصار اس بات پر تھا کہ کس کا وطن اس ''عظیم تقسیم'' کی کس جانب تھا۔

جناح صاحب کی بہت سے سوانح حیات لکھی جا چکی ہیں، زیادہ تر واقعی پڑھنے کے قابل ہیں، اور سب اس شخص کی تعریفوں سے لبریز ہیں جس کا پاکستان میں 'بابائے پاکستان' کے نام سے احترام کیا جاتا ہے، جس کی بے مثال صلاحیتوں کا لوہا اس کے دوست اور دشمن دونوں ہی مانتے تھے۔

آغا خان، جو ہندوستان کی سیاست میں جناح صاحب کے ہمراہ شریک رہے تھے اور جو ہر بات میں ان سے اتفاق بھی نہیں کرتے تھے، اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

'' قائدِ اعظم کا شان دار اور تاریخ ساز کردار، جو ناوقت ختم ہوگیا، ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں اپنے عروج پر تھا۔ اب وہ تاریخ کا حصہ

بن چکے ہیں ان کی یادیں لازوال ہیں۔ ان تمام مشاہیر میں سے میں جن سے واقف رہا ہوں فرانسیسی وزیرِاعظم Clemenceau، لائڈ جارج، چرچل، کرزن، مسولینی، مہاتما گاندھی ان میں جناح سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہیں اور ان کے کردار میں ایک ناقابلِ مثال امتزاج تھا مافبل سائنس علوم اور اس ہمت آمیز جذبے کا جس کو ریاستی انتظام کار کہتے ہیں۔

میں غیر ضروری تفصیلات بیان کر کے ''الٹے بانس بریلی'' لے جانے کی کوشش نہیں کروں گا اس لیے کہ ایسا کرنا قائد کے سوانح سے متعلق خالی صفحات کو بلا وجہ بھرنے کے مترادف ہوگا۔ جب میں نے اور میرے دوست روشن علی بھیم جی نے اس کتاب کے خاکے اور اس کے مواد پر تبادلۂ خیالات کیا تھا تو ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس کتاب میں ہندوستانی مسلمانوں کی جد و جہدِ آزادی کے سلسلے میں سفر اور بالآخر آزادی حاصل کرنے کا تاریخی تجزیہ ہونا چاہیے نہ کہ یہ ڈیڑھ سو برس پر محیط ایک تاریخی نصاب ہو یا برصغیر کی آزادی کی تاریخ اور اس میں حصہ لینے والے تمام سر برآوردہ اور مشہور کرداروں کی سوانح حیات بن کر رہ جائے۔ بلا شبہ ہمیں اس بات کا اعتراف تھا کہ ہم، بعض وجوہ کی بنا پر، ایسا کرنے کے اہل نہیں، نہ ہی اس سے ہمارا اصل مقصد پورا ہوتا، نہ ہمارے ارادوں کی تکمیل ہوتی۔ جیسا کہ میں نے بار بار کہا ہے، اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس میں ہمارے ادارے کے اہم کارکنوں اور ان کے اہلِ خانہ کے حالات درج ہوں۔ اس کے علاوہ یہ مقصد بھی تھا کہ اس کے ذریعے ہم اپنے گاہکوں، ان کے اہلِ خاندان اور ان کے دوستوں کی شکر گزاری کا حق بھی ادا کر سکیں۔ جیسے جیسے اس کے خد و خال ابھرتے گئے، ہمیں یقین ہوتا گیا کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے اور ساتھ ہی یہ سوال بھی ابھرنے لگا کہ کیا ہم اس کے قارئین کی دل چسپی کے لیے اس کے مواد میں اضافہ کریں۔ مثال کے طور پر، صحافی حضرات اور اس کاروبار میں شریک ملک کے دوسرے اداروں کے اہلکار اور افسران، تاریخ اور معاشیات کے طلبہ اور عام طور پر اس موضوع دل چسپی رکھنے والے عملی سیاست دانوں اور مخیّر حضرات کے لیے بھی اس کتاب میں دل چسپی کے لیے کچھ ہو۔ ہمارا ہرگز ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ ہم ان صاحبانِ علم سے مقابلے کی کوشش کرتے نظر آئیں جنھوں نے اس موضوع پر نہایت عمدہ تصنیفات پیش کی ہیں۔ اس کے برعکس، جیسا کہ ہمارے قارئین نے دیکھا ہوگا، میں نے ایسے اہم اہلِ علم سے استفادہ کیا ہے اور میں صمیمِ قلب سے ان کا شکر گزار بھی ہوں۔ یہ سب صرف اس تاریخی تناظر ہی کے لیے نہیں جو میں اس باب میں پیش کر رہا ہوں بلکہ ان تمام خاکوں اور شخصی تفصیلات کے بارے میں ہے جو ان لوگوں کے ضمن میں پیش کیے گئے ہیں جنھوں نے اس ادارے EFU Group of Companies کی بنیاد گزاری اور اس کے ارتقا میں حصہ لیا ہے۔ ان میں سے کئی ایسے بھی ہیں جنھیں پاکستان کی تاریخ میں مقام حاصل ہے اور جو اس کی تحریر میں عملی طور پر معاون رہے ہیں۔ یہ اشارے بالخصوص قائدِاعظم کی طرف ہیں جن کی کارگزاریوں کے ذکر سے کتابیں ہی نہیں کتب خانے بھرے جا سکتے ہیں، اور جن کی زندگی کی تفصیلات سے اس ملک کے نہ صرف تمام اہم لوگ بلکہ اسکول کے ابتدائی درجوں کے طلبہ بھی واقف ہیں۔

پھر بھی، ہمارا خیال یہ تھا کہ ہمارے لیے اس اہم شخصیت کی کارگزاریوں اور اس کے حالاتِ زندگی کو یاد کر لینا ہی کافی نہ ہوگا جو، وولپرٹ (Wolpert) کے بقول ان کمیاب شخصیتوں میں سے تھا جو دنیا کا نقشہ بدل دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اور اس کی زندگی کے بارے میں بہت سی عمدہ لکھی ہوئی دل چسپ کتابوں کے مطالعے کے بعد اچانک مجھ پر دو نکتے عیاں ہوئے۔

سب سے پہلے تو میں حیران ہوا کہ اس قائد اور عظیم رہنما پر لکھے جانے والے ہزاروں لاکھوں صفحات کے باوجود ہم جیسے قاری اور تاریخ کے طالب علم کو محمد علی جناح نام کے ایک انسان، ایک جوان ہوتے ہوئے لڑکے، اور اس کے اہلِ خانہ، اس کے دوستوں اور مدرسے کے ساتھیوں کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ نہ ہی ہم کو ان کے ذہنی جھکاؤ، ان کی تفریحات اور مہم جوئی کی تفصیلات ملتی ہیں نہ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات کی۔ ان کی اصل سوانح حیات جو عام لوگوں کو مہیا ہے، اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ان کی عمر سترہ سال تھی اور وہ انگلستان کی مشہورِ زمانہ Lincoln's Inn میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے سمندری سفر پر روانہ ہو رہے تھے، اور وہ ہندوستان کے

سب سے کم عمر طالب علم تھے جن کو بیرسٹری کی تعلیم کے لیے داخلہ دیا گیا تھا۔

بے شک، جناح صاحب کے خاندانی حالات اور پیدائش کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ میں جناب جی الانا کی لکھی ہوئی کتاب سے بہت متاثر ہوا ہوں۔

سرکاری ملازمت کی بہترین اور قابل ذکر روایات کے علاوہ الانا صاحب ایک مصنف اور بین الاقوامی شہرت کے حامل شاعر تھے۔ تاریخ، ادب اور شاعری میں ان کا ایک اعلیٰ کارکردگی کے باعث منفرد مقام ہے۔ان کی نظمیں بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں جب کہ تاریخی تناظر میں ان کی کتابیں معیار کا درجہ رکھتی ہیں۔

آیئے دیکھیں کہ وہ (جناب الانا) قائد کی سوانحِ حیات میں اس بارے میں کیا کہتے ہیں:

''ایک طرف تو ہندوستان بھر میں ۱۸۵۷ء کے ''غدر'' کی بھیانک تباہ کاریاں اپنے عروج پر تھیں، دوسری طرف کاٹھیاواڑ کے علاقے کی ایک چھوٹی سی ریاست ''گوندل'' میں بغیر کسی سیاست آمیزی کے ریاست کے حاکم ٹھاکر صاحب کی سربراہی میں زندگی اپنی معمول کی رفتار سے چل رہی تھی۔ ریاست کا دارالحکومت گوندل اگر چہ ریاست کا سب سے بڑا شہر تھا مگر اس کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی۔ ان دیہاتوں میں ''پنیلی'' نام کا ایک گاؤں تھا جس کی آبادی، غدر کی پہلی لہر کے وقت، ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ اس خاموش گاؤں میں ایک محنتی بوڑھا انسان، ایک اسماعیلی خوجہ، جس کا نام پونجا بھائی تھا، رہتا تھا۔ اس کے آبا واجداد سب اسی گاؤں میں رہے، کام کیا اور مرگئے۔ پنیلی کے رہنے والوں کا ذریعہ معاش کاشت کاری ہی تھا مگر پونجا بھائی اُن لوگوں سے اس طرح مختلف تھے کہ انھوں نے ہاتھ سے چلنے والی کچھ کھڈی کی مشینیں لگا رکھی تھیں جن پر وہ سارا دن کپڑے بُنا کرتے تھے۔ اس کاروبار سے وہ اتنی رقم کما لیتے تھے کہ وہ اور ان کے اہلِ خانہ قناعت اور سکون سے زندگی گزار رہے تھے۔

پونجا بھائی کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا جناح بھائی جو ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا، اپنے دو بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور چوکس انسان تھا۔ اس کے نوجوان اور آگے بڑھنے والے ذہن کے لیے پنیلی ایک چھوٹی سی جگہ تھی جہاں اس کے سامنے آگے بڑھنے کے سارے راستے مسدود تھے سوائے چند کھڈیوں کی مشینوں کے جن کے ذریعے عسرت بھری زندگی ہی ممکن تھی۔ اس کو بہت جلد اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ اس گاؤں میں وہ زندگی نصیب نہیں ہوگی جس کی تمنا اس کے دل میں ہے۔ بڑا شہر گوندل نوجوان کی امنگوں کو پورا کرسکتا تھا اس لیے جناح بھائی خاموشی سے پنیلی چھوڑ کر گوندل چلا گیا۔''

الانا ہمیں بتاتے ہیں کہ کس طرح نوجوان جناح بھائی ایک کامیاب تاجر بنا اور یہ بھی کہ گاؤں واپسی پر 'دھرافہ' نامی گاؤں کے ایک باعزت خوجہ خاندان کی مٹھی بائی نامی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ شادی شدہ جوڑا گاؤں سے نقل مکانی کر کے گوندل چلا گیا جہاں جناح بھائی کا کاروبار اس کی توقعات سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ جلد ہی یہ 'بڑا شہر' بھی اس نوجوان کے لیے چھوٹا پڑ گیا اور جناح بھائی نے یا تو چکا چوند پیدا کردینے والے کاروباری شہر بمبئی یا کراچی منتقل ہونے کی ٹھانی۔ اس زمانے میں کراچی کی آبادی پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل تھی مگر نوجوان کے کاروبار کے نقطۂ نظر سے وہاں امکانات بہت تھے۔ جناح بھائی نے کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا اور کھارادر کے علاقے میں نیونہام روڈ پر واقع ایک عمارت میں ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا اور قریب ہی ایک جگہ اپنا دفتر قائم کرلیا۔

یہاں بھی جناح بھائی کا کاروبار چمکا اور ان کا شمار کراچی کے سربرآوردہ تاجروں میں ہونے لگا جس کے تجارتی روابط سمندر پار کے ملکوں سے ہوگئے تھے۔ جناح بھائی جن اشیا کی تجارت کرتے تھے ان میں دو اشیا isinglass مچھلیوں سے حاصل ہونے والی gelatin اور Acacia gum-arabic درختوں سے حاصل ہونے والی گوند تھیں۔

اتوار کا دن تھا اور ۲۵ دسمبر کی تاریخ جب ۱۸۷۶ء میں کھارادر کی ایک دائی کی مدد سے مٹھی بائی نے اپنے پہلے بیٹے کو جنم دیا جس کا

نام محمد علی رکھا گیا۔ محمد علی کے علاوہ مِتھی بائی نے چار بیٹیاں اور دو بیٹے جنم دیے۔ محمد علی سب میں لاڈلا تھا۔ اس کی ایک بہن جس کا نام فاطمہ تھا بعد کو محمد علی کی سیاسی جدو جہد میں اس کی دستِ راست بنی۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق محمد علی جناح کی (جن کو اب ہم صرف جناح کہیں گے) تاریخ پیدائش کے بارے میں حتمی اطلاع نہیں۔ اگر چہ محمد علی کے پہلے اسکول کے مطابق اس سے پہلے کی کچھ اور تاریخ ملتی ہے تاہم جناح کے اصرار پر وہی تاریخ اصل مانی گئی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا وہ صرف سات دن کا تھا جب انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ قیصرِ ہند بنیں اور اسی برس ان کی تاج پوشی ہوئی اور جب سلطنتِ برطانیہ وجود میں آئی تو ہندوستان تاجِ برطانیہ کے کا سب سے چمک دار ہیرا بن گیا۔ جناح کے پہلے سوانح نگار ہکٹر بولیتھو (Hector Bolitho) لکھتے ہیں ''اور اسی بچے نے ملکہ برطانیہ کے پڑپوتے سے ہندوستان کی تقسیم اور برطانوی تسلط سے آزادی کے معاملے پر لین دین کیا''

جناح کا بچپن کراچی میں گزرا اور چھ برس کی عمر سے شروع ہونے والی ان کی ابتدائی تعلیم بھی یہیں ہوئی۔ دس برس کا سن تھا جب جناح بمبئی بھیج دیے گئے جہاں وہ اپنے ایک قریبی رشتے دار کے ہاں مقیم ہوئے، مگر صرف ایک برس بعد وہ اپنی جائے پیدائش کراچی واپس آگئے۔ معلوم نہیں کراچی کو واپسی بیمار والدہ کی خواہش پر ہوئی تھی یا جناح کی خاندان سے دوری اس کا سبب بنی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا داخلہ سندھ مدرسۃ الاسلام میں ہو گیا تھا۔ یہ مدرسہ اب بھی قائم ہے اور اس کے پھاٹک پر "Enter to Learn -- and Go Forth to Serve" کی عبارت آج بھی لکھی ہوئی ہے اور شاید کم سن جناح نے اس عبارت کو اپنی گرہ میں باندھ لیا تھا اس لیے کہ دیکھا جائے تو ان کی پوری زندگی اسی عبارت سے عبارت ہے۔

پندرہ برس کی عمر میں جناح کرسچین مشنری سوسائٹی ہائی اسکول میں داخل کر دیے گئے اور ایک برس بعد جب وہ وہیں طالب علم ہی تھے، جیسا کہ اس دور کا رواج تھا، بارہ برس کی ایک کاٹھیاواری خوجہ لڑکی سے ان کی شادی کر دی گئی۔ تھوڑے دنوں بعد ہی وہ قانون پڑھنے انگلستان چلے گئے۔ اسی دوران نہ صرف ان کی نوجوان بیوی کا انتقال ہو گیا بلکہ ان کی ماں بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں اور ایسا لگتا ہے کہ ان سانحوں اور مالی مشکلات کی وجہ سے ان کے والد پریشانیوں کا شکار ہو گئے۔

جیسا کہ میں کہیں لکھ چکا ہوں، چوں کہ وہ روزنامچہ لکھنے کے عادی نہیں تھے، جناح نے خود اپنے بچپن اور نوجوانی کے ایام کی تفصیلات کبھی بیان نہیں کیں، سوائے چند جملوں کے جو انھوں نے پاکستان کے قیام سے چند دن قبل کراچی کی ایک دعوت میں کہے تھے، ''ہاں، میں کراچی میں پیدا ہوا تھا، اور بچپنے میں کراچی ہی کی ریتیلی زمین پر میں گولیاں کھیلتا تھا۔'' بس اس زیادہ اور کچھ نہیں کہا۔

چند دنوں بعد ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو جب انھیں پاکستان کا گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا تھا، کراچی کارپوریشن کے دیے ہوئے ایک استقبالیے میں انھوں نے اپنے مولد کراچی کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

''کراچی کوئی معمولی شہر نہیں۔ قدرت نے اس کو غیر معمولی فوائد سے نوازا ہے جو وقت کی جدید ضرورتوں سے میل کھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک معمولی سی بستی سے آج یہ اتنا بڑا شہر بن چکا ہے اور وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اس کا شمار دنیا کے بڑے شہروں میں ہوگا۔ مجھے کراچی کا شان دار مستقبل نظر آرہا ہے، اس میں ہمیشہ سے لامحدود امکانات رہے ہیں، لہٰذا آیئے ہم سب مل کر اس خوب صورت اور عظیم شہر کو لین دین، تجارت اور صنعت، اور تعلیم و تہذیب کے گہوارے میں تبدیل کر دیں۔''

جناح کی زندگی کا قصہ اور بہت سے واقعات سوانح نگار ہکٹر بولیتھو نے خوب لکھے ہیں۔ اپنی تفتیش کے دوران بولیتھو کی دو بزرگوں سے ملاقات ہوئی جو جناح بھائی کے پڑوسی رہے تھے۔ ایک خاتون اور ایک صاحب، دونوں اسّی کے پیٹے میں تھے۔ مرد بزرگ محمد علی جناح کے ہم مکتب تھے اور اپنے ذہن پر زور ڈال کر وہ اتنا یاد کر سکے تھے کہ ''ہم دونوں گلیوں میں ساتھ گولیاں کھیلا کرتے تھے۔'' بولیتھو صرف اتنی

بات سے کچھ مطمئن نہیں ہوئے اور انھوں نے اصرار کیا اور مردِ بزرگ سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے ان شیشے سے بنی گولیوں پر توجہ مرکوز کریں۔ ان صاحب نے اپنی آنکھیں بند کیں اور اپنے ذہن کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی یادداشت میں اتنا اور بھی ہے کہ جب جناح ۱۴ر۱۳ برس کے تھے اور ہم دونوں حسبِ معمول گولی کھیل رہے تھے کہ اچانک جناح نے مجھ سے کہا، ''مٹی میں گولیاں مت کھیلو، اس سے کپڑے بھی گندے ہوتے ہیں اور تمھارے ہاتھ بھی۔ ہمیں کھڑے ہو کر کرکٹ کھیلنا چاہیے۔''

بولیتھو کے مطابق نیونہام روڈ کے لڑکے فرمانبردار تھے: انھوں نے گولیاں کھیلنا ترک کر دیں اور جناح کی سرکردگی میں جناح کے بیٹ اور اسٹمپس سے گرد آلود گلیوں کو چھوڑ کر صاف ستھرے میدان میں کرکٹ کھیلنا شروع کر دیا۔ جب جناح انگلستان جانے لگے تو انھوں نے اپنا بیٹ اپنے دوست کو دے کر کہا، ''میری غیر موجودگی میں تم دوستوں کو کرکٹ کھیلنا سکھاتے رہنا'' کتنا خوب صورت واقعہ ہے۔ اگر یہ سچ نہیں اور بولیتھو ربیان نہ کرتے تو بھی ایسے واقعات گھڑ لیے جانے چاہییں۔ شاید جناح کی زندگی کا یہ واقعہ ہی سب کچھ ہے جس کا نچوڑ ان الفاظ میں ملتا ہے ''گرد آلود جگہ چھوڑ دو تا کہ تمھارے کپڑے گندے نہ ہوں اور تمھارے ہاتھ ان کاموں کے لیے صاف رہیں جو انھیں کرنے ہوتے ہیں۔''

دوسری بات جو مجھے اس وقت سے الجھن اور حیرانی میں ڈالے ہوئے ہے، وہ یہ ہے کہ جب سے میں نے پاکستان کی تاریخ میں دل چسپی لینی شروع کی اگر چہ مجھے جلد ہی اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی جد و جہدِ آزادی میں محمد علی جناح کا کم و بیش ویسا ہی کردار تھا جیسا کہ نہرو اور گاندھی مگر، ہندو پاک سے باہر، ساری دنیا کے لوگوں کو آج بھی اس بات کی خبر نہیں۔ جب میں ساری دنیا کے لوگوں کی بات کرتا ہوں تو اس میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ صاحبانِ علم، مشہور تاریخ دان اور اہلکارانِ حکومت بھی اس زمرے میں آتے ہیں بلکہ ان میں بہتیرے تو ایسے بھی تھے جنھوں نے جناح کی تعریف کی ہے اور ہندوستان کی سیاست میں ان کے اہم کردار کو سراہا بھی ہے۔

مثال کے طور پر برطانوی حکومت میں امورِ ہندوستان کے وزیر مونٹا گو (Monatgue) نے پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے زمانے میں جناح کو'' کامل طور پر مہذب، پُر اثر شخصیت کا حامل اور زبان اور متاثر کُن لہجے سے پوری طرح لیس'' قرار دیا ان کے نزدیک، '' جناح ایک نہایت زیرک انسان ہے اور یہ سراسر زیادتی ہوگی اگر اس کو اپنے ملک کے امورِ کا مملکت چلانے کو موقع نہ ملے۔'' تو پھر ایسا کیوں ہے کہ دنیا والے اس کا ایسا دھندلا خاکہ دیکھ سکے جو ایک وقت ہندوستان کی ایسی سربرآوردہ شخصیات میں سے سمجھا جاتا تھا جنھیں چشمِ فلک نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کا سفیر، ایک عظیم آئینی ماہر، ایک ممتاز پارلیمانی مدبر، تیز دھار رکھنے والے دماغ کا مالک ایک بلند مرتبہ سیاست دان بیرسٹر، ہندوستانی انگریزی اشرافیہ کی جیتی جاگتی تصویر، مہذب، اپنے آپ میں مست، ہمیشہ بہترین لباس میں ملبوس، ایک آنکھ کے چشمے سے ہاتھوں کی لمبی لمبی ستواں انگلیوں سے کھیلتے رہنے والا، بانکی شخصیت کا انسان جو اگر چہ بے مثال انگریزی بولتا تھا مگر اپنے ملک کے لوگوں کی زبان سے نابلد جن کی بھلائی کے لیے جد و جہد اس کا شعار تھا، ایک چمک دمک سے عاری ماہرِ فن، بد مزہ ازدواجی زندگی کا مارا ہوا جس کی خوب صورت بیوی اوائل عمری ہی میں داغِ مفارقت دے گئی تھی، ہمیشہ ایک دبلی پتلی کنواری لڑکی، جی جان سے اس کی ہم درد بہن، کے ہمراہ نظر آتا تھا۔ مختصراً، ہم درد اور رحم دل بزرگ کے بجائے، جذبات سے عاری، خشک مزاج افسر نما انسان یا یوں کہیے کہ طاقت استعمال کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کا ماہر انسان۔

صرف یہی نہیں، مشہورِ زمانہ فلم ''گاندھی'' میں۔ جسے دنیا کے لاکھوں انسانوں نے دیکھا ہے اس سے بھی بُرے خد و خال میں پیش کیا جانے والا خاکہ جس میں کوشش کی گئی ہے کہ دیکھنے والا ''اس مسٹر جناح'' کے بارے میں اچھی رائے قائم نہ کر سکے، ایسا کیوں ہے؟

نہ صرف یہ کہ جناح اسکینڈلوں کے معاملے میں کوری زندگی رکھتے تھے، وہ کوئی زیادہ مجلسی انسان بھی نہیں تھے۔ تو کیا بین الاقوامی سطح پر اس قسم کی دھندلی تصویر اس وجہ سے بنی ہے کہ وہ اپنے ہم عصر سیاست دانوں، اور بعد میں آنے والی نسلوں کو اپنی زندگی کی کسی ڈرامائی

پیش کش سے متاثر نہیں کر سکے؟

جناح کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں سعد خیری لکھتے ہیں، ''ایک عام انسان، حقیقی کامیابیوں سے نہیں، فوجی نوعیت کی فتوحات، حیران کُن مہمات اور افسانوی کامیابیوں سے متاثر ہوتا ہے عام طور پر لوگ عشروں پر محیط دورِ امن کو تو بھول جاتے ہیں مگر چند برسوں کی جنگیں اور تباہ کاریاں یاد رہتی ہیں، بندوں کی تعمیر نہیں یاد رہتی، سیلاب اور قحط کا ذکر نہیں بھولتے۔ ان کو مسولینی اور Garibaldi یاد رہتے ہیں Cavour ذہن سے محو ہو جاتا ہے حتیٰ کہ آئن اسٹائن ایٹم بم کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے، طبیعات میں اس کے کارناموں سے نہیں۔

جناح نے کسی فوج کی سالاری نہیں کی، فوجی جنگیں نہیں لڑیں نہ ہی وہ کسی ڈرامائی مہم میں شریک رہے جن سے قاری متاثر ہو سکتا۔ نہ انھوں نے مہاتما گاندھی جیسا کوئی اہنسا یا عدم تعاون جیسا کوئی نیا فلسفہ پیش کیا یا ایسے کام کیے جیسے کہ بکری کے دودھ پر گزارا کرنا، صرف دھوتی میں رہنا، چرخا کاتنا وغیرہ جس کو دیکھنے والا ان کی طرف راغب ہو۔ انھوں نے ایک سیدھی سادی زندگی اپنائی، اپنے لیے سیدھا راستہ متعین کیا، قول اور فعل دونوں میں راست بازی سے کام لیا۔ اس قسم کے کردار لوگوں کو اپنی جانب متوجہ نہیں کرتے۔ سادہ سچائیاں پرکشش نہیں ہوتیں، حقائق اکتا دینے والے ہوتے ہیں، افسانوی طریقے رنگ برنگے، دل چسپ اور جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔

'' ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے تو جناح کی زندگی ایک ایسے عام آدمی کے لیے سپاٹ تھی جو بار بار دہرائی جانے والے پروپیگنڈے پر اعتبار کر لیتا۔''

کچھ بھی ہو مجھے اس بات سے بہت چڑ اور شرمندگی بھی ہوتی ہے جب یورپ اور امریکا کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں کے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان سے میں یہ سنتا ہوں کہ ہندوستان کی جنگِ آزادی اور اس کی آخر کار کامیابی کا دارو مدار دھوتی میں ملبوس ایک شخص کی ذات پر تھا، یعنی مہاتما گاندھی، جس میں تیسری دنیا کا ایک محبوب لیڈر پچاس سالہ انسان بھی شریک تھا جس کو لوگ جواہر لال نہرو کے نام سے جانتے ہیں۔

میرے خیال میں جناح کے انتقال پر لکھتے ہوئے ''ٹائمز'' اخبار نے مندرجہ الفاظ میں خوب لکھا تھا: ''مہاتما گاندھی کے مقابلے میں جناح کی شخصیت عجیب منظر پیش کرتی تھی۔ شاہانہ محلوں میں رہنے والے جناح، بلند قامت، نفیس لباس میں ملبوس ایک ممتاز اور نازک طبع انسان تھے۔ تیزی سے سفید ہوتے ہوئے بالوں سے ابھرتا ہوا ایک گچھا کلغی جیسا دکھائی دیتا تھا۔ اپنی نوابانہ ہیئت کی بنا پر ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسائل پر تحقیق کرنے والے مغرب کے محققین پر جناح اچھا تاثر چھوڑتے تھے، اس لیے کہ ان کی اپنی شخصیت کے رکھ رکھاؤ سے نظر آتا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم تھے۔ ان میں سوچ کی وہ خفیف سے بھی لچک نہیں تھی، انگریز کے نزدیک جو ہندوؤں کا خاصہ تھی۔ ان کے خیالات ہیرے کے مانند سخت اور ترشے ہوئے اور تقریباً دل چھو لینے والے محسوس ہوتے تھے۔ ان کا استدلال ہندوؤں جیسا گنجلک اور بل کھاتا ہوا نہیں بلکہ ایک خنجر جیسا کاٹ دار اور مخصوص مقام پر زخم لگانے والا انداز تھا۔''

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، کوئی بھی، اور اس میں پاکستان کی اکثریت شامل ہے، ہندوستان کی آزادی کے حصول کے ضمن میں گاندھی اور نہرو کی کوششوں کا منکر نہیں، اور ظاہر ہے کہ اس میں کانگریس کے ہندو لیڈر بھی شامل ہیں۔ مگر مجھے ذاتی طور پر اس بات سے بہت دکھ ہوتا ہے کہ دنیا والوں نے، نہ صرف مسلمانوں کے حقوق اور ان کے لیے ایک خود مختار ملک کے حصول بلکہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں قائدِاعظم محمد علی جناح کی ہمالیائی کوششوں کی اتنی پذیرائی نہیں کی جس کی وہ حق دار ٹھہرتی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا اس ملت کے بابائے قوم کی ناقدر شناسی اور اس کی مسخ شدہ تصویر ہی بنیادی وجہ تو نہیں جس کی بنا پر یہاں کے بہت سارے صاحبانِ عقل باسی آج بھی اس ملک کو اپنا وطن تسلیم کرنے اور اس سے منسلک اپنے تشخص کے بارے میں تامل کرتے ہیں۔ ہر شخص جناح کو قائدِاعظم تسلیم کرتا ہے اور مانتا ہے کہ یہی وہ انسان ہے جس نے تقریباً تنِ تنہا ایک نئی قوم کی تشکیل کی تھی۔ وہ

لوگ بھی جو اس سے کلّی طور پر اتفاق نہیں کرتے تھے کم از کم بہ ظاہر اس پر معترض نہیں ہوتے۔ اگرچہ سرکاری ذرائعِ ابلاغ صبح سے شام تک اس کی شخصیت کے گُن گاتے رہتے ہیں مگر اس محمد علی جناح کے نہیں جس کو میں نے ان کتابوں میں پایا جس کو بڑے بڑے صاحبانِ علم نے تصنیف کیا ہے، یا جو اپنی تقریروں اور اپنے خطوط میں نظر آتا ہے۔ ممکن ہے میں غلط ہوں مگر خود پاکستان میں بھی ان کے سپوتوں کی شخصیات اور ان کی کارگزاریوں کے دو چہرے دکھائی دیتے ہیں، ایک تو سرکاری چہرہ ہوتا ہے اور دوسرا شبہات کے بادلوں سے جھانکتا ہوا، بالکل کسی مصور کی نہایت اعلیٰ اور قیمتی تخلیق کی طرح جس کو سورج کی کرنوں یا ضرورت سے زیادہ روشنی سے بچایا جا رہا ہو۔ ایک ایسی تصویر جو بین الاقوامی نظروں کے لیے نہ پوری طرح واضح ہے نہ صاف۔

کیا یہی وجہ تو نہیں کہ بہ حیثیت ایک قوم کے پاکستانی اپنے ہمسایہ ملک ہندوستان سے مسابقت کے موقعے پر دنیا کی رائے عامہ کے سامنے خود کو منوانے کی صلاحیت نہیں رکھتے؟

افسوس کہ بے شمار سوالات ہیں جن کے جوابات نہیں ملتے اور میں اپنے قارئین سے شرمسار ہوں کہ میں ایسے مسائل میں الجھتا چلا گیا ہوں جو میرے نزدیک قائدِ اعظم کی سوانحِ حیات اور اس سے بننے والے ان کی شخصیت کے خاکے سے مختلف ہیں۔ یہ افسوس کا مقام ہو گا مگر جناح کی بے پناہ خود تہذیبی اور فرائض کی بجا آوری کے جذبات میں مجھے کانٹ کی اصطلاح میں ضمیر کی آواز (بنیادی اخلاقی اصول) 'Categorical imperative' جناح کی صورت میں گوشت و پوست میں نظر آتی ہے گویا انھوں نے اپنے اصل کو دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے یہ انداز اپنایا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ بہ ظاہر نظر آتا تھا حقیقت اس کے برعکس رہی ہوگی۔ اس لیے کہ میری نظر سے ایسے شخص کے خیالات گزرے ہیں جو تقسیمِ ہند سے بہت پہلے سے قائدِ اعظم سے قریب تھا اور جس کو ان کے سیاسی نظریات اور سوچنے کے طریقے سے کافی واقفیت تھی، میری مراد یہاں لارڈ ولیم فرانسس لسٹوویل سے ہے کہ جو برطانوی سرکار کے پرانے اور منجھے ہوئے سرکاری افسر اور سیاست داں رہے ہیں۔ انھیں برطانیہ کی سرکار میں ہندوستان اور برما کی وزارت کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔ جناح کے بارے یہ باتیں انھوں نے اس وقت کہیں تھیں جب اپریل ۱۹۴۸ء میں وہ لندن میں جناح مرحوم کے سلسلے میں منعقد ہونے والے ایک جلسے سے خطاب کر رہے تھے۔

''یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جب میں برطانوی حکومت میں وزیر تھا، کئی بار میری ملاقات قائدِ اعظم محمد علی جناح سے ہوئی۔ پہلی بار سرکاری نوعیت کی تھی جب وہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں مذاکرات کے لیے مسلم لیگ کے نمائندے کے طور پر لندن آئے ہوئے تھے۔ پھر آزادی کے بعد میں ان سے ان کی قیام گاہ پر ملا تھا جہاں ان کی بہن گھرداری کی ذمہ داری نباہ رہی تھیں۔ انھوں نے میرے قیام کو بہت پرسکون بنایا تھا۔ یہ ملاقات اگرچہ بہت مختصر مگر دل خوش کن تھی۔ محمد علی جناح سے گھریلو ماحول میں ملاقات تھی اس لیے کہ وہ مسلم لیگ کے نمائندے کے طور پر نہایت سخت اور نہ جھکنے والے انسان تھے مگر یہاں ایک مختلف انسان اور نہایت مہربان میزبان نظر آئے۔''

جناح کی سوانحِ حیات کے باقی ماندہ حصے میں یوں ہی قائدِ اعظم کو آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ ان کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں اس شخص کو اچھی طرح معلوم ہو گا جس نے ان کے ملک کے معاملات میں ذرا بھی دل چسپی لی ہو گی۔

اس سے قبل ہم نوجوان مسٹر جناح کے اس دور کے بارے میں بات کر رہے تھے جب وہ بیرسٹری کی تعلیم کے لیے لندن گئے تھے اور ۱۸۹۶ء میں ہندوستان کے سب سے کم عمر بیرسٹر قرار پائے تھے۔ اسی برس وہ بحری جہاز سے کراچی واپس پہنچے جہاں کے حالات دگرگوں تھے۔ جب وہ انگلستان میں تھے تو ان کی بنیادی زبان انگریزی ہو گئی اور ان کی پوری زندگی میں یہی ان کی زبان رہی۔ اپنے مولد میں جو ایک صوبائی شہر تھا وہ خود کو اجنبی محسوس کرتے رہے اس لیے کہ وہاں کی تمدنی زندگی ان کی دانشورانہ مشاغل کے لیے ناکافی تھی۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور باپ قلاش۔ تو پھر ان کے لیے اس شہر میں کیا رہ گیا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں وہ بمبئی چلے گئے جہاں مزید تین برس کی مالی مشکلات اور

دوسری الجھنوں کا سامنا رہا تا آنکہ ان کی قسمت نے یاوری کی اور بمبئی پریزیڈنسی میں بحیثیت مجسٹریٹ ان کا تقرر ہوگیا۔ ان کی پریشانیاں دور ہوگئیں اور خوش و خرم محمد علی جناح پر کامیابی کے آفتاب کی کرنیں پڑنے لگیں۔ انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی بہن فاطمہ جناح کو کراچی سے بمبئی بلا بھیجا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کو کیتھولک کالج میں داخل کرا دیا۔ ان کا یہ قدم اس زمانے کے لحاظ سے عجیب مگر بہادری کا حامل تھا، جو سیاست داں محمد علی جناح کی پہچان بنا اور اس کو ہم اس روشنی میں ہی بہتر جانتے ہیں۔

جناح کو شہرت ملی اور مالی اعتبار سے ان کا شمار بمبئی کے کامیاب وکیلوں میں ہونے لگا۔

جناح نے آل انڈیا کانگریس کے رُکن کی حیثیت سے سیاست میں پہلا قدم رکھا، جیسا کہ اس زمانے کے ذہین اور دانشور نوجوان، ہندو ہوں یا مسلمان، کرتے تھے۔ یہ ۱۹۰۵ء تھا، جب بنگال کی تقسیم ہوئی تھی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام سے ایک برس پہلے کا واقعہ تھا۔ کانگریس کے عظیم اور اعتدال پسند رہنماؤں میں سے ایک گوپال کرشنا گوکھلے کے ہمراہ مستقبل میں مقامی حکومت کے لیے مشاورت کے لیے جانے والے ایک وفد میں شامل ہو کر جناح انگلستان گئے۔ اپنے انگلستان کے قیام کے دوران جناح جن کے بڑے مداح تھے اُن ہی دادا بھائی نوروجی کے معتمد ہوگئے اور نوروجی کے برطانوی پارلیمنٹ کے پہلے ہندوستانی رُکن بننے میں کام کرنے کے دوران ان کو سیاست کا عملی تجربہ ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں کلکتے میں کانگریس کے اجلاس میں انھیں پہلی بار عوام کے سامنے آنے کا موقع مل چکا تھا اور وہ امپیریل لے جسلیٹو کاؤنسل کے رُکن منتخب ہو چکے تھے۔ ہندوستان کے سیاسی پلیٹ فارم سے ان کی سب سے بڑی کامیابی ۱۹۱۶ء میں کانگریس۔ لیگ معاہدہ تھا جس کو لکھنؤ معاہدے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ واحد معاہدہ تھا جو ان دو بڑے سیاسی اداروں کے درمیان، دو بڑی قوموں کی صورت میں ہوا تھا اور جناح کی ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کے نام سے تعریف ہوئی تھی۔ اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں جناح کو ہندوستان کے بڑے رہنماؤں میں سے ایک گردانے لگے۔ اور انگریزوں نے پہلی بار ان کی آواز کی توانائی کو محسوس کیا۔

ہندوستان کی سیاست میں مہاتما گاندھی اور ان کی ستیہ گرہ کے ظہور نے، جناح جس سے سمجھوتا کرنے میں خود کو تیار نہیں پاتے تھے، دونوں قوموں کے درمیان خلیج پیدا کر دی۔ اس کے باوجود ۱۹۲۸ء کے قومی اجتماع میں جناح نے کہا تھا، ''ہمیں چاہیے کہ ہندو اور مسلمان اس وقت تک ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھیں جب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ دونوں قوموں کو اپنے اختلافات پسِ پشت ڈال کر متحد ہو جانا چاہیے کہ ہم دونوں کے مفادات ایک ہی نوعیت کے ہیں۔''

نہ صرف اس اجتماع نے ان کی تجویز اور ان کے مطالبے کو یکسر رد کر دیا بلکہ پہلی گول میز کانفرنس میں بھی، جس میں جناح شریک تھے، ہندوستان کے دو مخالف گروہ متفق نہیں ہوئے۔ دل برداشتہ اور بے کیف جناح نے خود کو ہندوستان کے موجودہ حالات کے لیے ناموزوں پاتے ہوئے، اخبار ٹائمز کے مطابق، ''اپنے دوستوں سے کہا کہ ان کے نزدیک ہندوستان کی سیاست میں کوئی مناسب جگہ نظر نہیں آتی اس لیے انھوں نے لندن میں مقیم ہو کر پریوی کاؤنسل میں اس امید پر بیرسٹری کی پریکٹس شروع کرنے کا فیصلہ کیا کہ شاید ہندوستان کی آزادی کی جنگ کے لیے ان کی برطانوی پارلیمنٹ تک رسائی ہو جائے۔''

مسلمانوں کو جلد ہی گاندھی کے برابر بلند قامت رہنما کی کمی کا احساس ہوگیا۔ عمر میں جناح سے بیس برس چھوٹے، لیاقت علی خان نے، جو بعد میں پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم بنے، اور ان کی اہلیہ نے جناح کو ہندوستان واپسی اور مسلمانوں کی قیادت کے سنبھالنے پر بہ مشکل راضی کر لیا اور بالآخر کئی بار ہندوستان اور انگلستان کے سفر کے بعد ۱۹۳۵ء کے اواخر تک انھوں نے حتمی فیصلہ کر لیا۔ جناح ہندوستان واپس آگئے اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے ان کی جدوجہدِ آزادی کی قیادت سنبھال لی۔

ان کا سب سے پہلا مسئلہ مسلمانوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنا اور ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ذیل میں ۱۹۳۷ء میں ہونے والے انتخابات کی تیاری تھا۔ مسلم لیگ کی تاریخ میں پہلی بار انتخابات میں حصہ لینے کے لیے ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ کا قیام عمل میں

آیا تھا۔ کانگریس نے نمایاں کامیابی حاصل کی اور گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں مکمل اکثریت حاصل کر لی۔ لیگ نے ۴۸۴ میں سے ۱۰۸ نشستیں حاصل کیں۔ تعجب نہیں کہ کانگریس کے رہنما اس کامیابی کے نشے سے سرشار تھے، بالخصوص جواہر لال نہرو جنھوں نے لیگ کو جاگیرداروں اور وکیلوں کا جتھا قرار دے کر کہا تھا کہ ان کے دلوں میں غریب مسلمانوں کے لیے کوئی جذبات نہیں اور صحیح معنوں میں ان غریب عوام کا اگر کوئی مددگار ہے تو وہ صرف کانگریس کے رہنما ہیں۔

آہستہ آہستہ جناح کی ولولہ انگیز قیادت نے علی گڑھ کے علاوہ دوسرے شہروں کے طلبہ کو متحرک کرنا شروع کیا اور پارٹی کا ایک ڈھانچا بن گیا اور اس کی طاقت میں روز بہ روز ترقی ہونے لگی جس کے نتیجے میں پارٹی نے تین ضمنی انتخابات میں کامیابی حاصل کر لی۔ مشتعل نہرو بار بار مسلمانوں کے ''دو قومی نظریے'' پر حملے کرتے اور کہتے، ''اس ملک میں صرف دو پارٹیاں ہیں: کانگریس اور برطانیہ'' احتجاجی جواب میں جناح دہاڑتے، ''نہیں، یہاں ایک اور پارٹی ہے — مسلمان!'' جناح نے محسوس کیا کہ ان کو عوام کی حمایت حاصل کرنی چاہیے اور اقبال کی عملی مدد سے یہ ممکن ہوا۔ انھوں نے نہ صرف عوام کی حمایت حاصل کی بلکہ ان کو راجا صاحب محمود آباد، ابوالحسن اصفہانی، لیاقت علی خان جیسے ہمت والے مددگار بھی میسر آ گئے جن کی متحدہ کوششوں سے لیگ کو کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ باوجود اس کے کہ مسلم لیگ کی باگ ڈور ایسے انسان کے ہاتھ میں تھی جو عوام کی زبان بھی نہیں بول سکتا تھا، مسلم لیگ ایک منظم اور عوامی طاقت سے لیس جماعت بن چکی تھی اور اپنی راست بازی اور کرشماتی شخصیت کی وجہ سے جناح ایک ایسے رہنما کے طور پر ابھرے جن کا مدِ مقابل کوئی نہ تھا۔

لاہور میں ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے اجلاس میں مشہور قراردادِ پاکستان بلا کسی اعتراض کے منظور ہوگئی۔ اجلاس کے اختتام پر جناح نے اپنے معتمد سے کہا، ''اقبال آج ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کو یہ جان کر خوشی ہوتی کہ ہم نے بعینہٖ وہی کچھ کیا جو اُن کی خواہش تھی۔''

اب مسلمانوں نے اپنی قوم کے لیے باقاعدہ پاکستان کا مطالبہ کر دیا، کانگریس نے جس کا شدّت سے انکار کیا اس لیے کہ اس کے رہنماؤں کو انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندو سلطنت کا خواب چکنا چور ہوتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ واقعہ دراصل ہندوستان میں مسلم نشاۃ الثانیہ کا ایک واضح اشارہ بھی تھا اور اس بات کا اعلان بھی کہ اب وہ ہندوستان کی آزادی کی جدو جہد میں برابر کی شراکت داری کے ساتھ آگے بڑھیں گے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے اور عام طور پر سب ہی ان واقعات سے واقف ہیں، اس لیے کہ زیادہ تر ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا اور امید کی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے تجربات اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کر دیے ہوں گے۔ سر اسٹیفرڈ کرپس مشن ۱۹۴۲ء کے فسادات، ۱۹۴۴ء کے جناح گاندھی مذاکرات، اور ۱۹۴۶ء میں شروع ہونے والا ناکام کیبنٹ مشن وغیرہ وہ اہم اور فیصلہ کن واقعات تھے جو اس زمانے میں ظہور پذیر ہوئے۔

۲ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو برطانوی حکومت کی دعوت پر جناح، لیاقت علی خان، جواہر لال نہرو اور بلدیو سنگھ برطانوی وزیرِ ہند سے ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر مذاکرات کے لیے لندن پہنچے۔ مذاکرات ناکام رہے اور اس وقت کے برطانوی وزیرِ اعظم ایٹلی نے ایک بیان جاری کر دیا جس میں کہا گیا تھا کہ جون ۱۹۴۸ء تک برطانیہ ''ذمے دار ہندوستانی ہاتھوں'' میں ہندوستان کی باگ ڈور تھما دے گا۔

اس کے بعد ہونے والی باتیں سب کو معلوم ہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن آخری وائسرائے کے فرائض انجام دینے مارچ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان پہنچے۔ برطانوی راج کے آخری دنوں کے سرسری جائزے سے پتا چل جائے گا کہ ماؤنٹ بیٹن کی دلّی آمد کے دو ہفتوں کے اندر یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے اس کا بٹوارا ہی آخری نتیجہ ہوگا۔ اس لیے وائسرائے نے اپنے مختصر قیام کی ابتدا ہی سے اس ارادے کی پردہ پوشی نہیں کی کہ ہندوستان کا بٹوارا ناگزیر ہو چکا ہے۔ وائسرائے لندن واپس گئے۔ حکومت سے تفصیلی مذاکرات کے بعد

برطانوی حکومت کا بیان ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو جاری ہوا جس میں انتقالِ اقتدار کے طریقے کا اعلان کیا گیا تھا۔

آخری لمحے تک ہندوستان کے بٹوارے کی کانگریس نے شدید مزاحمت کی اور گاندھی کا وہ مشہور جملہ "پاکستان میری لاش پر ہی بنے گا" اس بات کا ثبوت ہے۔ مگر جب ماؤنٹ بیٹن نے "مسلم لیگ کو ختم کر دینے کی پٹیل کی دیرینہ خواہش" کو استعمال کرتے ہوئے نہرو اور پٹیل کو بٹوارے پر راضی کر لیا تو گاندھی نے بھی اپنے ارادے بدل دیے۔

مسلم لیگ نے کسی سنجیدہ اعتراض کے بغیر جناح کو اختیار دے دیا کہ ۳ر جون کے سرکاری بیان کے مطابق "بطور ایک سمجھوتے کے" وہ ہندوستان کے بٹوارے کے منصوبے کو قبول کریں۔ آل انڈیا کانگریس نے منصوبے کو رد کرنے کی وکالت کی۔ یہ گاندھی کی مداخلت تھی کہ کانگریس نے آخر کار یہ قرارداد منظور کی کہ "آل انڈیا کانگریس کو یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات ٹھنڈے ہو جائیں گے تو ہندوستان کے مسائل صحیح تناظر میں دیکھے جا سکیں گے اور نا درست دو قومی نظریہ غیر معتبر ہو جائے گا اور لوگ اس کو مسترد کر دیں گے۔"

جیسا کہ پروفیسر خالد بن سعید نے لکھا ہے، "ایک دھماکے کے ساتھ نہیں بلکہ بسورتے ہوئے" بٹوارا ہو گیا۔

۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کے آخری وائسرائے ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے اور اگلے دن ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو قائدِ اعظم محمد علی جناح، اپنی بہن فاطمہ جناح کے ہمراہ جلوس کی صورت میں اسمبلی کی عمارت میں داخل ہوئے جہاں جلالتہ الملک کی حکومت کے نمائندے کے طور پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک علامتی تقریب میں زمامِ اقتدار نئے قائم شدہ ملک پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت میں جناب جناح کے حوالے کر دی۔

جی الانا لکھتے ہیں، "ہم پاکستانیوں کے لیے یہ ہماری آزادی کا دن تھا؛ قائدِ اعظم کے نزدیک یہ حصولِ کامیابی کا دن تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ منزلِ مقصود آ چکی تھی مگر جد و جہد کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔"

یہ جانتے ہوئے کہ وہ بہت علیل تھے، قائدِ اعظم کو جلدی تھی کہ نو زائیدہ ملک ان کے تصورات، منصوبوں اور معیار کے مطابق کام کرنے لگے۔ یہ ایک مشکل کام تھا، تفاوت کے خلاف جنگ تھی۔ جیسا کہ جناح نے کراچی کے گورنمنٹ ہاؤس میں ایک میٹنگ کے دوران لارڈ ازمے (Lord Ismay) سے کہا تھا کہ ہندوستان نے "پیدائش کے وقت ہی پاکستان کا گلا گھونٹ کر مار دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔" یہ ان کی غیر معمولی قوتِ ارادی اور ان کے بلند عزائم تھے جنھوں نے ان کو کچھ عرصے تک زندہ رکھا۔ مگر آخرِ کار ایک مکمل طور پر خستہ اور جسمانی طور پر لاغر جناح کو اگست ۱۹۴۸ء میں، ملک کے حصول کے ایک سال بعد ہی، ملک کے معمار کی حیثیت میں نئے انتظامی ڈھانچے اور حکومت کی حکمتِ عملی کی ترتیب کے سلسلے میں اپنے صبر آزما کام کو روکنا پڑا۔ معالجین کے مشورے کے برعکس وہ برطانوی حکومت سے مذاکرات کے لیے گئے جہاں سے آرام اور اپنی کھوئی ہوئی جسمانی توانائی کے حصول کی خاطر صحت افزا پہاڑی مقام زیارت چلے گئے۔

ان کی آخری سرکاری مصروفیت بینک دولتِ پاکستان کا افتتاح تھا جس کے لیے وہ خصوصی طور پر ہوائی جہاز سے کراچی گئے تھے۔ ان کی زندگی کے آخری چند ہفتے کوئٹہ کی پہاڑیوں میں اپنی زندگی کی آخری جنگ لڑتے گزرے۔ فاطمہ جناح نے جناح کے انتقال کے چند مہینوں بعد لکھا تھا، "وہ اپنے غموں میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے خاموشی سے، تنِ تنہا، آخرِ وقت تک تکلیف جھیلی، اور افسوس کہ ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی ان کی خواہش یہی تھی کہ وہ اپنی جنگ خود لڑیں۔ اپنی خوف ناک بیماری کی اطلاع کے بعد بھی وہ مکمل طور پر پُر سکون اور پریشانی سے مبرّا رہے۔ جس وقت ان کا انتقال ہوا، ان کے سرہانے سوائے میرے اور ان کے معالج کے اور کوئی موجود نہ تھا۔"

ان کا انتقال ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ سے واپسی پر کراچی میں ہوا۔ انہوں نے تقریباً ۱۰ر بجے شب، جب وہ گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں سو رہے تھے، اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں تھیں۔

جی الانا پہلے شخص تھے جو وہاں پہنچے۔ انھوں نے لکھا ہے، ''جوں ہی میں نے سپید چادر کو دیکھا جس نے ان کے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا، میں سمجھ گیا کہ اس دن، جب قوم کی عمر مشکل سے ایک برس کی تھی، قوم یتیم ہوگئی ہے۔ مجھے احساس ہوگیا کہ برصغیر نے مسلمانوں کے جس عظیم رہنما کو جنم دیا تھا، وہ داغِ مفارقت دے گیا ہے۔ انھوں نے ہم کو ایسے وقت خیر باد کہا جب ہمیں ان کی زیادہ ضرورت تھی۔

۱۴راگست ۱۹۴۸ء کو قوم کے نام اپنے آخری پیغام میں انھوں نے فرمایا تھا، ''آپ کی مملکت کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور اب یہ آپ کو چاہیے کہ جتنی جلد ہو سکے اس کی تعمیر کریں۔''

جناح آخری وقت تک کام کرتے رہے۔ برطانیہ کے سابقہ وزیر برائے ہندوستان لارڈ پیتھک لارنس (Lord Pethik Lawrence) کے الفاظ میں، ''گاندھی ایک قاتل ہاتھوں ہلاک ہوئے، جناح پاکستان کی وفاداری میں مرے۔'' دنیا نے مرحوم قائدِاعظم کی بہت خوب صورت الفاظ میں تحسین کی اور خراجِ عقیدت پیش کیے، خلوص آمیز بھی اور ایسے بھی جو مگر مچھ کے آنسو تھے مگر خوصورت الفاظ سے سجائے گئے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک دھڑے کے رہنما سورت چندر بوس نے ان کی ذاتی اور سیاسی کامیابیوں کے بارے میں نہایت جامع اور دل کو چھو لینے والے الفاظ میں کہا تھا، ''مسٹر جناح قانون داں کی حیثیت میں عظیم، ایک زمانے میں کانگریس کے رُکن کی حیثیت میں عظیم، مسلمانوں کی رہنمائی میں عظیم، بین الاقوامی سطح پر سیاست اور سفارت کاری میں عظیم، اور باعمل انسان کے طور پر سب سے عظیم تھے۔ مسٹر جناح کے انتقال میں دنیا نے ایک عظیم ترین مدبر کھویا، اور پاکستان نے اس کو زندگی بخشنے والا، فلسفی اور رہنما۔'' صدی کی چالیسویں دہائی کے فیصلہ کن برسوں میں ہندوستان کی سیاست میں عملی طور پر خود حصہ لینے والے شخص ایچ وی ہوڈسن نے The Great Divide کے عنوان سے ایک بہت اہم اور لاجواب کتاب لکھی ہے۔ انتقالِ اقتدار کے تاریخی عمل کا ذکر کرتے ہوئے جس میں جناح نے کردار ادا کیا، انھوں نے لکھا ہے:

''ہندوستان کی آزادی کے عظیم کھیل میں حصہ لینے والی تمام شخصیتوں میں محمد علی جناح سب سے اہم اور متحیر کردینے والی شخصیت تھے۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ تمام اہم اداکاروں میں (مہاتما گاندھی کے علاوہ جو وقفے وقفے سے اور غیر فیصلہ کن انداز میں ظہور کرتے رہے) کوئی دوسرا بھی یہ کردار ادا کرسکتا تھا، ایک مختلف کانگریسی رہنما، ایک مختلف وزیرِ مملکتِ برطانیہ، قوموں کے مختلف مفادات کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ان کے نمائندے، حتیٰ کہ ایک مختلف وائسرائے بھی، تب بھی کھیل کا انجام کچھ مختلف نہ ہوتا۔ لیکن ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حالات اسی نہج پر جارہے ہوتے، آخری جدو جہد کے کردار تین ہی ہوتے دو متوازن حریف نہیں اور یہ کہ ایک نئی مملکتِ پاکستان وجود میں آجاتی، اگر مسٹر جناح کی شخصیت اور رہنمائی شاملِ حال نہ ہوتی۔''

ایک نئی مملکت کا ظہور

کامیابی یا غیر فیصلہ کن برابری؟

تقریباً تین برس قبل اس ملک نے اپنی پچاسویں سالگرہ منائی ہے۔ بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں اور پاکستان کے تمام اہم اخباروں نے موقعے کی مناسبت سے ضمیمے شائع کیے ہیں۔ یہاں وہاں سے تاریخ دانوں کے تذکرے، ماضی کے عظیم دانشور بزرگ افراد کے اقوال اور کھردرے مزاج کے نوجوانوں کی آنکھیں کھول دینے والے، محرومی اور استہزا سے پُر مضامین بھی شائع ہوئے ہیں۔

جیسا کہ جناب محمود ہارون نے لکھا ہے، ''اب وقت ہے کہ ہم ماضی اور مستقبل دونوں میں جھانکیں۔'' جلی سرخیاں، جو ہر ایک کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہوں، فضا میں ایک خفیف سی افسردگی مگر زیادہ اطمینان بھی نہیں ہونا چاہیے۔ جب جوش وخروش کی ضرورت ہو اس وقت یک گونہ اُداسی یا غمگینی کے ساتھ طنز بھی شامل ہو جاتا ہے، جیسے پروانے جلتی ہوئی شمع کی طرف اس طرح جاتے ہیں گویا جل جانے میں ہی ان کی نجات مضمر ہو۔

''اسلام آباد ڈائریز'' کے عنوان سے لکھنے والے صحافی ایاز امیر اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں، ''کیا ہم ایک دن کے لیے کراہنا اور شکایت کرنا بند نہیں کر سکتے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایسی اولاد سے جو اپنے چہیتے بزرگوں کا یومِ پیدائش بڑے اہتمام سے منا رہی ہو، تقابل کرتے ہیں کہ ہم بحیثیت ایک قوم کے اپنے عظیم دن کو کس طرح منا رہے ہیں۔ وہ کیا خوب لکھتے ہیں، ''شاید سالگرہیں جذباتی ہونے ہی کے لیے ہوتی ہیں، اور اگر ممکن ہو تو خوشی کے لیے۔ یہ ایسے مواقع نہیں ہوتے جب ہم نفع ونقصان کا میزانیہ بنانے لگیں۔''

اور خوشی کے لیے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ بہت کم ملک ایسے ہوں گے جنھوں نے اتنے لا متناہی، اندرونی اور بیرونی مسائل بھگتے ہوں گے جتنے کہ پچاس برسوں میں پاکستان کو درپیش رہے ہیں۔ اس کی پیدائش خوں ریزی میں ہوئی جو 'عظیم تقسیم' کے فوراً بعد شروع ہوگئی تھی، جب اس کے لیے قابلِ ذکر مالی وسائل بھی نہیں تھے، اور بحیثیت ایک خود مختار ملک کے اس کی تمام عمر بے تحفظی، مخالفت اور ٹکراؤ ہی میں گزری ہے۔ اس کے وجود میں بہت پہلے ہی سے تماشائیوں، تبصرہ نگاروں، بھلائی چاہنے والوں اور دوسرے لوگوں کو نہ صرف یہ شک تھا کہ یہ مملکت باقی بھی رہے گی یا نہیں بلکہ کچھ تو اس کی جلد ''موت'' کی پیشین گوئی بھی کر چکے تھے۔ پروفیسر رِشتر (Prof. Richter) کے الفاظ میں ''اتنے سارے مسائل اور پیشین گوئیوں کے باوجود اس ملک کا باقی رہنا ہی خوشی منانے کا کافی جواز پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان اس درجے کے معاشی اور سیاسی مسائل سے دوچار رہا ہے جو بڑے بڑے سوالات کو جنم دیتے ہیں۔ پچھلے ایک برس میں پاکستان دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ سماجی افراتفری، تشدد، بددیانتی اور تحفظ کے مسائل کا شکار رہا ہے۔ میرے خیال میں بار بار ایسے مسائل کے سر اُٹھانے کی وجہ ہی تھی کہ اخبار ڈان کے اداریے لکھنے والوں نے سوال اُٹھایا تھا کہ ''کیا پاکستان ایک ناکام ریاست ہے؟''

میں پروفیسر رِشتر سے کلّی اتفاق کرتا ہوں جب وہ اس سوال کی مناسبت کا سوال اُٹھاتے ہیں جس کے بارے میں ان کا خیال تھا

کہ اگر وہ خود اس نوعیت کا سوال اُٹھاتے تو اس کے لیے دوسرے الفاظ استعمال کرتے۔ اس لیے کہ 'ناکام ریاست' 'نرم ریاست' 'از کار رفتہ' وغیرہ بہت آسانی سے مبہم جملوں کے زمرے میں آجاتے ہیں بالخصوص اس وقت جب باہر کے مبصرین، جیسے کہ اس کتاب کے مصنف، ان کو استعمال کرنے لگیں۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان اور ہندوستان اپنی ''تقدیر سے ہم آغوش'' ہوئے، انسانوں کی بنائی ہوئی سرحدوں کے دونوں جانب کے محبانِ وطن نے نو یافتہ آزادی پر خوشیاں منائیں۔لوگوں کے دلوں میں ایک قسم کی سرفرازی جاگزیں ہوگئی جب ان کے رہنماؤں نے قومی عظمت اور مستقبل کے امیدوں بھرے سہانے خواب دکھائے۔

ان دنوں سب سے اہم اور قابلِ ذکر جناح کی وہ تقریر تھی جو انھوں نے مجلسِ دستور ساز کے پہلے صدر منتخب ہونے پر ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو کی تھی۔ وہ تقریر اس تاریخی دن ہی نہیں بلکہ آج بھی سننے والوں کے دلوں کو گرما بھی دیتی ہے اور اس پر گرما گرم نا قابلِ تصور بحثیں بھی ہوئیں اور سیاسی جوڑ توڑ بھی۔

''آپ جانتے ہیں کہ صرف ہم لوگ ہی نہیں بلکہ میرے خیال میں، پوری دنیا اس بے نظیر طوفانی انقلاب پر انگشت بدنداں ہے جس نے برِصغیر میں دو مطلق العنان مملکتوں کے قیام کو ممکن بنا دیا ہے۔ جو کچھ ہوا، تاریخ میں اس کے متوازی مثال نہیں ملتی۔ یہ طاقتور برصغیر، اپنے تمام باسیوں سمیت ایک ایسے منصوبے کے تحت ہے جو دیو پیکر بھی ہے اور بے نظیر بھی۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ منصوبہ پُرامن اور عظیم ترین عملِ ارتقا کے ذریعے انجام کو پہنچ گیا۔''

''اس ایوان کے سب سے پہلے اجلاس کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں ایسے موقعے پر کوئی بڑا اعلان نہیں کر سکتا مگر میں اپنے ذہن میں آنے والی چند باتیں ضرور کہنا چاہوں گا۔''

''سب سے بڑی لعنت ہے رشوت اور بدعنوانی۔ یہ سچ مچ زہر ہے۔ ہمیں اس کو آہنی پنجوں سے زیر کرنا ہوگا اور مجھے امید ہے کہ جتنی جلد ہو سکے آپ اس ضمن میں ضروری اقدامات کریں گے۔ چور بازاری بھی ایک لعنت ہے۔ جو دوسری بات مجھے نظر آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ بھی ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ دوسری چیزوں کے ہمراہ، اچھی اور بُری، جو بڑا فتنہ ہمیں ملا ہے وہ اقربا پروری اور بے ایمانی ہے۔ ہمیں اس کو بے دردی سے کچل دینا ہوگا۔

میں یہ پوری طرح واضح کر دینا چاہوں گا کہ میں کسی قسم کی بے ایمانی، اقربا پروری یا براہ راست یا بلا واسطہ مجھ تک آنے والی سفارش کو کبھی برداشت نہیں کروں گا۔ میں جہاں بھی اس رواج کی شروعات دیکھوں گا، یا جہاں یہ پہلے سے رائج ہو، اونچے طبقے میں ہو یا نچلے طبقے میں، میں ہرگز اس کی حمایت یا طرف داری نہیں کروں گا.....''

''اب اگر ہم اس عظیم مملکتِ پاکستان کو خوش حال اور پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو لوگوں کی بہتری پر پوری توجہ دینی ہوگی، بالخصوص عوام اور غریبوں کی۔ اگر آپ نے، ماضی کو پسِ پشت ڈال کر، ہتھیار پھینک کر ہاتھ بٹایا تو آپ کی کامیابی یقینی ہوگی۔ اگر آپ اپنے ماضی کو بدل دیں اور آپ سب مل کر اس جذبے کے ساتھ کام کریں کہ ہر شخص، اس سے قطعِ نظر کہ وہ کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے، ماضی میں اس سے آپ کے کیا رشتے تھے، وہ کسی رنگ کا ہو، کسی ذات یا نسل کا ہو، پہلا، دوسرا یا آخری ہو، مملکت کا باشندہ ہے جس کے برابر کے حقوق، استحقاق اور فرائض ہیں تو آپ کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ میں اس سے زیادہ زور نہیں دے سکتا۔ ہمیں اس طریقے پر عمل شروع کر دینا چاہیے اور وقت آئے گا جب اکثریت اور اقلیت کی ساری پہلو داریاں غائب ہو جائیں گی۔''

''لہٰذا ہم کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آپ آزاد ہیں، آپ کو اپنے مندروں میں جانے کی آزادی ہے، اس مملکتِ پاکستان میں آپ اپنی مسجدوں میں یا کسی اور عبادت گاہ میں جانے میں آزاد ہیں۔ آپ کسی مذہب سے ہوں، کسی ذات سے ہوں یا کسی نسل سے،

سرکاری کاروبار کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ اب ہمیں اسی بات کو اپنے معیار کے طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہیے، اور آپ دیکھیں گے کہ ایک وقت وہ آئے گا جب مذہبی معنوں میں، نہ ہندو ہندو رہیں گے نہ مسلمان مسلمان، اس لیے کہ یہ ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہوتا ہے، مگر سیاسی اعتبار سے سب اس مملک کے باشندے ہوں گے۔''

جس وقت جناح صاحب نے طاقتور اور مستقبل نما تقریر کی تھی وہ خوب جانتے تھے کہ انھوں نے اور ان کے لوگوں نے اپنی قوم کے لیے زمین کا ایک وسیع رقبہ تو حاصل کر لیا ہے مگر ضروری حکومتی ڈھانچا نہیں ملا ہے اور راتوں رات اس کو بنانا ہوگا۔ برطانوی ہندوستان کا پرانا دارالحکومت نئی دلّی، اپنی تمام عوامی عمارتوں اور سرکاری افسران و کارکنان سمیت سب ہندوستان کو مل گیا ہے۔ پاکستان کے منتخب دارالحکومت کراچی میں، جو سندھ کا مرکزی شہر اور بندرگاہ تھا، فوجی بیرکوں اور شامیانوں میں دفاتر بنانے پڑے تھے۔ اس پر مستزاد یہ بھی کہ نئی قوم کے خزانے خالی تھے اس لیے کہ ہندوستان کے اثاثوں کے بٹوارے کا فیصلہ دسمبر ۱۹۴۷ء تک ہوا تھا جس میں پاکستان کو زرِ مبادلہ کا سترہ اعشاریہ پانچ فی صد ملنا تھا جو ہندوستان کے پاس تھا۔ اسی طرح غیر منقسم ہندوستان کے پاس جو نقد رقم تھی اس کا بھی اتنا ہی فی صد پاکستان کو ملنا تھا اور اسی تناسب سے سارے اثاثے بٹنے تھے۔ اس فیصلے کے باوجود نقد رقم اس وقت تک نہیں ملی تھی جب تک کہ مہاتما گاندھی نے ''مرن برت'' رکھنے کی دھمکی نہیں دے دی تھی۔ اس دھمکی نے کانگریس کے رہنماؤں کے مزاحمتی انداز کو تبدیل ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ نظام حیدر آباد کی فیاضی تھی جس نے ملک کو مالی بحران سے نکالا اور قبل از وقت انہدام سے بچایا، افسوس کہ بہت سے اہم کانگریس کے رہنما جس کے انتظار میں تھے۔

ان دو حکومتوں کو جن بڑے مسائل کا سامنا تھا ان میں سے ایک قتل و غارت گری کو روکنا تھا جو تیزی سے ہندوستان کے کئی حصوں میں پھیلتی جا رہی تھی اور تقسیم ہند کے بعد ایک حقیقت بن کر سامنے آئی تھی۔ نتیجے کے طور پر ایک اندازے کے مطابق ۱۰ سے ۱۴ ملین لوگ اُجڑ گئے۔ انھوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر نئی سرحدوں کے پار پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ پا پیادہ، بیل گاڑیوں میں، ریل گاڑیوں کے ذریعے، ہوائی جہاز، بحری جہاز اور کاروں کے ذریعے بھاگ رہے تھے۔ ان میں سے بے شمار مارے گئے، ذبح ہوئے، زنا بالجبر اور تشدد کا شکار ہوئے۔ یہ شاید کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا کہ حقیقتاً کتنے لوگ اپنی جانوں سے گئے، کچھ لوگ اندازہ لگاتے ہیں کہ دس لاکھ کے لگ بھگ رہے ہوں گے۔

یہ تھے واقعات وہ جنھوں نے شدت کے اعتبار سے غیر متوقع طور پر دونوں حکومتوں کو متاثر کیا تھا، مگر پاکستان کے کم زور معاشی اور سماجی حالات کو تو گویا ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بادی النظر میں یہ ایک معجزے سے کم نہیں کہ یہ قوم اور اس کے رہنما کس طرح نہ صرف لوگوں کی دیکھ بھال کر سکے ان کو غذا فراہم کر سکے بلکہ لاکھوں بے گھر لوگوں کو سایہ فراہم کر سکے جو اپنی زندگی کی ضروریات کو اپنا حق سمجھ کر اس ملک میں پناہ گزین ہوئے تھے۔

نہ صرف اس ملک کے اندر کا بلکہ باہر کا بڑے سے بڑا خوش فہم اتفاق کرے گا کہ یہاں سب کچھ اچھا نہیں تھا، پھر بھی سب کچھ بُرا بھی نہیں تھا۔ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان نے آزادی حاصل کی، ایسا لگتا تھا جیسے اس کے معاشی حالات بہت دگرگوں ہوں گے جن کا کوئی حل نہ ہوگا۔ اب، اس کی پچاس برس سے زیادہ کی خود مختار تاریخی عمر میں شاید سب سے کامیاب واقعہ سیاسی نہیں بلکہ معاشی میدان میں کامیابی ہے ہندوستان کے برعکس جو استقلال کے ساتھ حکومت کے زیرِ نگرانی سوشلسٹ طرز کی معیشت کی طرف پیش قدمی کرتا رہا ہے، پاکستان ۱۹۴۸ء میں متعین کی ہوئی اپنی پالیسی کو تبدیل کرتا رہا ہے اور یہاں ملی جلی معیشت نے جڑیں پکڑی ہیں جس میں نجی ملکیت زیادہ طاقتور ہو کر ابھری ہے اور غیر ملکی سرمایہ کاری کو زیادہ فروغ ملا ہے۔ ساتویں عشرے میں اس طرزِ معیشت کو ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں دھچکا پہنچا جب بڑی بڑی نجی صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ اب، نئی صدی کی ابتدا میں، پاکستان کے منصوبہ بندی کرنے والوں اور صاحبانِ اقتدار

کو اس بات کا احساس ہوا ہے کہ جو لوگ پانچویں اور چھٹی دہائی میں پاکستان کی کامیابی کے ہراول دستے سے تعلق رکھتے تھے جن کو ساری دنیا میں سراہا گیا تھا، ان کی کامیابیوں کے راز کیا تھے۔

جب پاکستان وجود میں آیا اس وقت فضا امیدوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی اور تباہی کی پیشین گوئی کرنے والوں کو اپنے الفاظ واپس لینے پڑے تھے جب ان کی توقعات کے مطابق بجائے تباہی کے پاکستان میں باقی رہنے کی صلاحیت اور امنگ موجود نظر آتی تھی۔ اس کوشش میں بہت سی عظیم شخصیات نے ہاتھ بٹایا ہے اور جیسا کہ اس کتاب کے قارئین کو جلد ہی احساس ہو جائے گا، میں نے آنے والے ابواب میں بہت سے لوگوں کے خاکے شامل کیے ہیں جو نہ صرف پاکستان کی تخلیق، اس کی معاشی ترقیات میں شامل رہے ہیں بلکہ ''ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس'' کی تاریخ میں بھی حصے دار رہے ہیں۔

افسوس کا مقام ہے کہ جب ہم پاکستان کے سیاسی، عمرانی اور معاشیاتی مستقبل میں دیکھنے کو کوشش کرتے ہیں تو ہمیں وہ پرانی پاکستانی روح، وہ متحرک جذبے، خوش گمانیاں اور بنیادی امنگیں نظر نہیں آتیں جو شروع میں ہر طرف دکھائی دیتی تھیں۔ میرا ذاتی تجربہ مجھے کچھ اور ہی بتاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس ملک کے نوجوان طبقے میں بد دیانتی، نالائقی، اور جاگیرداری یا اقربا پروری کے ذریعے استحصال کے معاملے میں صبر کی بہت کمی ہے۔ مگر ان کو یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ اس ملک نے پچھلے پچاس برسوں میں ترقی بھی کی ہے اور اس کے حالات بہتری کی طرف گامزن رہے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف معترض ہیں بلکہ اپنے رہنماؤں سے اپنے مطالبات کے معاملے میں شدت پسند بھی ہیں، اس لیے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کو مستقبل میں ملک کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا چاہیے بجائے اس کے کہ وہ بد دیانتی کے بہانے حکومتوں کو گرانے میں اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں لگے رہیں یا شکست خوردہ لوگوں کو عوامی نفرت کے چوکھٹے میں سجائے رہیں۔ یہ لوگ (یعنی نئی نسل) مزید معاشی ترقی، معاشرتی انصاف چاہتے ہیں اور معاشرے کی سب سے بڑی خرابی جہالت، کا معتدبہ علاج مانگتے ہیں۔ یہ ایسے سیاسی رہنماؤں کے تمنائی بھی ہیں جو ہنرمند ہوں، دیانت دار ہوں، دور اندیش ہوں اور جن کا بنیادی ہدف اپنے قبیلے کا مفاد نہ ہو، جو اپنے سیاسی مدِمقابل پر کیچڑ اچھالنا ہی اپنی فرض نہ جانتے ہوں اور اپنے ملک کی خرابیوں کے لیے دوسروں اور باہر والوں کو موردِ الزام ٹھہرانے والے نہ ہوں، ایسے لوگ ہوں جو مستقبل کے پاکستان کے لیے ایک واضح تصور رکھتے ہوں۔ ایسے ملک کا تصور جس پر فخر کیا جا سکے، جہاں انسان باعزت طور پر کام کاج کر سکے، اور جیسا کہ غیر منقسم ہندوستان کے بڑے سرکاری افسران میں سے ایک جناب عباس خلیلی نے مسلمانوں کے نئے وطن پاکستان ہجرت کا فیصلہ کرنے سے قبل ایک بار کہا تھا:

''ہندوستان کی تقسیم کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو'' لارڈ ڈسٹوویل نے اپنے دوست ایچ وی ہوڈسن کو دہراتے ہوئے کہا تھا، ''اکثر ہم ایسے سوال کے نرغے میں ہوتے ہیں جس کا کوئی حتمی جواب نہیں ہوتا، اس لیے کہ تاریخ میں دیے گئے تمام امکانات فرضی اور سراسر ناقابلِ پیشین گوئی ہوتے ہیں۔ کیا برطانوی راج کے بعد ہندوستان کے باسیوں کے مستقبل کے لیے تقسیم ہی بہترین حل تھا؟ برطانوی راج کے آخری لمحے تک، جب ماؤنٹ بیٹن اور ایٹلی نے برِصغیر کو تقسیم کر دینے کا ناگزیر فیصلہ کیا تھا، برطانیہ کے زیادہ تر لوگوں کے نزدیک تقسیم ایک ایسی خرابی تھی جس کو ہر قیمت پر روکا جانا چاہیے تھا۔ لیکن اگر ہم فاصلے سے دیکھیں تو اس کو ایک کم نظر فیصلہ کہہ سکتے ہیں لیکن یہ ایک خود پسند سیاسی منظر ہوگا۔ ہم اب بادی النظر میں صاف دیکھ سکتے ہیں کہ معاشی وسائل کی کمی، سیاسی تجربے یا قومی یک جہتی کی کمی کے پیشِ نظر پاکستان کی تباہی کی پیشین گوئی کرنے والے غلط تھے۔ تباہی کے پیغمبروں نے مسلمانوں کے جذبات کو کمتر سمجھا تھا جو مسلم علیحدگی کی تحریک کے دوران ابھرے تھے، بالخصوص اس بڑھتے ہوئے قومی احساسِ تفاخر اور شناخت کو جو تحریک کے آگے بڑھنے کے ساتھ بڑھتا گیا تھا۔''

جناح نے اپنی ۱۱راگست ۱۹۴۷ء کی تقریر میں یہ سوال خود بھی اُٹھایا تھا جس کو میں نے پچھلے صفحات میں نقل کیا ہے۔ اور پاکستان کی تاریخ سے پُر کتب خانوں کی خاک چھاننے کے بعد میں صدقِ دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں اُس جواب سے بہتر جواب نہیں دے سکتا جو

قائدِ اعظم نے دیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ہندوستان کی تقسیم سے اتفاق نہیں کرتے۔ دو گروہوں کے، جن میں ایک اکثریت ہے دوسرا اقلیت، مختلف احساسات کو سمجھا جا سکتا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن تھا کہ جو کچھ ہوا اس سے مختلف کچھ ہوسکتا؟ تقسیم تو ہونی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان، دونوں جانب ایسے حلقے بھی تھے جو اس سے متفق نہیں تھے، جو اس کو (تقسیم کو) پسند نہیں کرتے تھے، مگر میری دانست میں اس کے علاوہ کوئی اور حل تھا ہی نہیں اور مجھے یقین ہے کہ تاریخ اس کے حق میں اپنا فیصلہ سنا دے گی۔ متحد ہندوستان کا کوئی بھی تصور کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا تھا اور میری دانست میں ایسا حل ہمیں بڑی تباہی کی طرف لے جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اندازِ نظر صحیح ہو، ہوسکتا ہے صحیح نہ ہو، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ ہاں! اس تقسیم کی وجہ سے اس سوال سے اجتناب ممکن نہیں ہوا کہ اقلیت اس عملداری میں رہے یا اُس عملداری میں۔ اب تو اس سے اجتناب ممکن نہیں رہا۔ اس کا اور کوئی حل نہیں ہے۔''

میرے خیال میں، پاکستان کے حصول، اس کی بقا اور اس کی ترقی کے لیے کی جانے والی جنگ، برابری پر ختم نہیں ہوئی ہے، مگر اس میں ابھی کسی کی جیت بھی نہیں ہوئی ہے، جنگ ابھی جاری ہے۔ امکانات اس کے حق میں ہیں، اور میں قائل ہوں کہ ابھی جیت کے لیے بنانے والے ''رنز'' کے لیے کافی ''اوور'' باقی ہیں۔

دوسرا باب

ای ایف یو
اور پاکستان میں اُبھرتی ہوئی انشورنس کی صنعت کاری

اگر ہم پچھلی پانچ دہائیوں پر نظر ڈالیں تو ہمارے لیے اس دور میں ہونے والی پاکستان کی صنعتی ترقی سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ پاکستان کی جسامت اور اسے ملنے والی انسانی دولت کے پیشِ نظر بلاشبہ ہمیں کچھ زیادہ خوش بھی نہیں ہونا چاہیے۔ پھر بھی، اگر ہم تقسیم کے وقت پاکستان کو ورثے میں ملنے والی کم زور معیشت کو سامنے رکھیں تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ نصف صدی کے قلیل عرصے میں پاکستان بہت آگے بڑھا ہے۔ ملک کی پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر مختلف مصنفین نے جتنے مضامین اور تذکرے لکھے ہیں، متفقہ طور پر سب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔

پاکستان کی تحریک کے دوران جو سب سے بڑا اعتراض کیا جاتا تھا، وہ یہ تھا کہ یہ نیا ملک معاشی اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ملک کی معاشی ترقی کی راہ میں بہت مشکلات آئیں۔

جیسا کہ جناح صاحب نے اپنے ۱۴ر اگست ۱۹۴۸ء کے پیغام میں کہا تھا، ''مختلف طریقوں سے نئی مملکت کے پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد بھی ہمارے دشمن اس تاک میں تھے کہ وہ معاشی داؤ پیچ سے اپنے ہدف کو حاصل کرلیں گے۔ اپنے تمام تر مذموم حربوں کی مدد سے ان لوگوں نے یہ پیشین گوئیاں کر رکھی تھیں کی پاکستان دیوالیہ ہو جائے گا۔ دشمن جو کچھ آگ اور تلوار کی مدد سے حاصل نہ کر سکا تھا، ملک کو مالی طور پر کھنڈر بنا کر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر ان بَدی کے پیمبروں کو منھ کی کھانی پڑی ہے۔''

عوام کی بلند توقعات کے مقابلے میں ملک کی بنیاد رکھنے والے رہبروں کے سامنے بڑے مشکل معاشیاتی مسائل تھے۔ ان کو قلیل اور کم درجے کے وسائل کی مدد سے ہی سے سب کچھ بنانا تھا۔ دراصل تقسیم سے قبل کے ہندوستان میں غیر منصفانہ معاشی مسائل ہی تو تھے، مسلمانوں نے اپنی زمین اور الگ مملکت کے حصول کے ذریعے جن کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔

جیسا کہ میں اس کتاب میں پہلے کہیں لکھ چکا ہوں، جناح کے سب سے قریبی مددگار مرزا ابوالحسن اصفہانی نے، جو ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رُکن رہے تھے، تقسیم ہند کے وقت کے معاشی حالات کے بارے میں لکھا تھا:

''تجارت اور صنعت کاری پر ہندو بنیا اور برطانوی صنعت کاروں اور تاجروں کا راج تھا۔ پٹ سَن، کپاس، چائے، کانکنی، انجینیرنگ وغیرہ جیسی بڑی صنعتوں میں برطانویوں کے حصص تھے۔ خام کپاس اور پارچہ بافی کی صنعت میں بھی ان کا حصہ بہت زیادہ تھا۔ قرض ادھار سے لے کر خام یا تیار شدہ اشیا، ہر قسم کی مصنوعات کی اندرونِ ملک تجارت اور زیادہ تر صنعتیں ہندوؤں کے قبضے میں تھیں۔ مسلمان کا گزارا تو ان اجارہ داروں کے دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں ہی پر تھا۔ یہ اجارہ دار، امیر صنعت کار اور بنیے، پٹ سَن، کپاس اور اناج کی فصلیں اونے پونے دام خرید لیتے اور اس طرح ہر سال ان کی تجوریاں بے پناہ منافع سے ابلنے لگتیں۔''

"ہر ماحول میں برائیوں کی طرح کچھ اچھائیاں بھی ہوتی ہیں، اس لیے برطانوی اور ہندو اجارہ داروں اور صنعت کاروں میں اچھے لوگ بھی تھے۔ اِکا دُکا صنعت مسلمانوں کی بھی تھی۔ کچھ میمن، خوجے اور بوہرے بھی تھے جو اناج، کپڑے اور مشینوں کے پرزہ جات کی خوردہ خرید و فروخت میں ہندو بنیوں کے مقابل تھے اور انھوں نے کامیابیاں بھی حاصل کی تھیں مگر یہ کیفیت اتفاقی ہی تھی اور ایسی مسابقتوں سے ہندوستان کی معاشی بساط پر قابلِ ذکر اثرات مرتب نہیں ہو سکتے تھے۔ عام طور پر مسلمان مفلس ہی تھے اور ان کے لیے ترقی اور حالات کے سدھار کی راہیں مسدود کر دی گئی تھیں۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں ان لوگوں کے لیے لکڑیاں کاٹنے، پانی بھرنے یا پھر چھوٹی موٹی سرکاری ملازمتوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔"

"پنجاب میں (مثال کے طور پر) زیادہ تر تجارت، صنعت اور بنکاری پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ ان میں سے کسی میں بھی کوئی مسلمان نہیں ملتا تھا، سوائے کمتر درجے کی ملازمت کے۔

اچھی تنخواہوں والی ملازمتیں اور مالی منفعت کی جگہیں، ہندو سوسائٹی کی روایات کے مطابق، باہر والوں کے لیے نہیں صرف اہلِ خاندان، اپنی ذات برادری یا اسی قسم کے سلسلے والوں کے لیے ہی ہوتی تھیں۔"

"کچھ آنکھیں کھول دینے والے حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔ تقسیم کے وقت ہندوستان میں پٹ سَن کے ایک سو گیارہ کارخانے تھے جن میں انہتر ہزار کھڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے صرف ایک ۵۰۰ کھڈی والا اور ایک ۱۵۰ کھڈی والے کارخانے آدمجی اور اصفہانی نام کے مسلمانوں کے تھے۔ سارے کارخانے کلکتے کے اطراف لگے ہوئے تھے، جب کہ اس علاقے میں ایک بھی کارخانہ نہیں تھا جو مشرقی پاکستان ہے۔ یہ علاقہ تو زراعت کے لحاظ سے بھی ابتر تھا۔"

"مغربی علاقے میں، جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے، جہاں تک کپاس کا تعلق ہے تو یہاں ایک دوسرا معاملہ ہے۔ اس علاقے میں پارچہ بافی کے صرف دو کارخانے تھے، جب کہ ہمسائے ملک ہندوستان میں ۴۰۰ کارخانے تھے۔"

تقسیم سے قبل کے ہندوستان میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ مسلمان بینکاری اور بیمے کے معاملات کے قابل نہیں تھے۔ ایک طرف تو مسلمانوں کو ان دو صنعتوں میں موقعے نہیں دیے جاتے تھے اور دوسری طرف ان کو نا اہل گردانا جاتا تھا، اس طرح ہندوؤں کی اجارہ داری جاری رہی۔ تقسیم سے قبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا صرف ایک ہی بینک تھا — حبیب بینک جو ہندوؤں اور غیر ملکی بینکوں کے مقابلے میں معمولی سا تھا۔ تقسیم سے پہلے کے ہندوستان میں بیمے کی صنعت میں بھی حالات کچھ بہتر نہ تھے۔"

کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں بیمے کے صنعت کی کہانی پھولوں اور کانٹوں، امیدوں اور مایوسیوں سے عبارت رہی ہے۔ ملک کی پیدائش کے وقت یہاں مقامی پانچ اور غیر ملکی ۷۷ انشورنس کمپنیاں کاروبار کر رہی تھیں۔ چند برسوں بعد دو کمپنیوں، ایسٹرن فیڈرل یونین (ای ایف یو) اور حبیب انشورنس نے اپنے مرکزی دفاتر ہندوستان سے کراچی منتقل کر لیے۔ ای ایف یو نے کلکتے سے اور حبیب نے بمبئی سے۔

یہی وجہ ہے کہ بیمے کا بیشتر کاروبار تجربہ کار اور جدید غیر ملکی کمپنیوں کے پاس تھا جو اس ملک میں اپنی چیف ایجنسیوں اور شاخوں کے ذریعے کام کر رہی تھیں۔ نرخ نامہ اور اصولِ کار مِن وعَن وہی تھے جو تقسیم سے پہلے رائج تھے جن کی دیکھ بھال باہمی انشورنس ایسوسی ایشن کرتی تھی۔ فروری ۱۹۴۸ء میں ۹۷ کمپنیوں نے مل کر Insurance Association of Pakistan (IAP) کی داغ بیل ڈالی۔ ان میں سے صرف دو یعنی ای ایف یو اور حبیب، 'قومی' کمپنیاں تھیں۔

سارا کاروبار نرخ نامے پر مبنی ہوتا تھا اور منافع بخش ہوتا تھا اس لیے کہ یہ سب چیف ایجنسیوں کی چھان پھٹک کے بعد لیا جاتا تھا اور اس میں کوئی اور حصے دار نہیں ہوتا تھا، اس طرح غیر ملکی کمپنیاں منافعے اور ری انشورنس پریمیم کی صورت میں خطیر رقمیں ملک سے باہر اپنے مرکزی دفاتر کو ارسال کر دیا کرتی تھیں۔ ملکی زرِ مبادلہ کے محدود وسائل کی قانونی مگر بے دریغ برآمد کو روکنے کے لیے حکومت نے ۱۹۵۰ء

میں سرکاری شعبے کے زیرِ انتظام ری انشورنس کا ایک منصوبہ بنایا اور ۱۹۵۲ء میں اس ادارے نے کام شروع کر دیا۔ اس ادارے کے پہلے سربراہ آسٹریلیا نژاد مسٹر پرنل (Purnell) بنے جو آسٹریلیا کی کمپنی کوینز لینڈ انشورنس کے پاکستان میں نمائندہ سربراہ تھے۔ پرنل نے PIC کو کامیابی سے چلایا اور بعد کو ان ہی نے آدمجی انشورنس کمپنی کی بنیاد رکھی جس کے بارے میں آگے چل کر بات کی جائے گی۔ PIC کے اغراض و مقاصد کے پس منظر میں دو اہم نکتے کارفرما تھے: مقامی کمپنیوں کی مدد اور نئی کمپنیوں کی بنیاد رکھنے کی ہمت افزائی۔ اس کے عوض جنرل انشورنس کے تمام کاروبار میں سے PIC کو ری انشورنس کی صورت میں دس فی صد حصہ ملنا تھا۔ زرِ مبادلہ اور 'سیاسی' زاویے سے حکومت کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اس ری انشورنس کے طریقے کا انتظام کرے۔ ۱۹۴۹ء میں کراچی کے بدنام زمانہ Thole Produce Yard میں جو کوئنس روڈ (موجودہ مولوی تمیز الدین خان روڈ) پر واقع تھا خوف ناک اور تباہ کن آتشزدگی کا واقعہ پیش آیا۔ یہاں برآمد کے لیے کپاس کی گانٹھوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ اس آگ میں کئی کروڑ روپے کا مال جل کر راکھ ہو گیا جو اس زمانے کی اعتبار سے ایک بہت بڑی رقم کے مساوی تھا۔ ایسی صورتِ حال کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ غیر ملکی کمپنیوں نے، جن میں زیادہ تر برطانوی، آسٹریلوی، امریکی اور ہندوستانی تھیں، اس نوعیت کے خطرے کے بڑے حصے کی ذمے داری لینے سے احتراز شروع کر دیا جب کہ چند مقامی کمپنیاں خود میں اتنی بڑی ذمے داری اٹھانے کی سکت نہیں پاتی تھیں نہ ہی وہ اپنے ملک اور دوسرے سمندر پار ملکوں میں اس خطرے کی حصے داری کے لیے انتظام کر سکتی تھیں۔ اس بارے میں یہ بیان کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ اس زمانے (یعنی پانچویں عشرے) کی مقامی کمپنیوں میں سب سے بڑی کمپنی ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی تھی مگر دوسری کمپنیوں کی طرح وہ بھی کپاس کی آتشزدگی سے ہونے والے نقصان کے صدمے سے دوچار تھی اور اس کو خود بھی مالی بحران کا سامنا تھا۔ اس زمانے میں ای ایف یو کے سربراہ نیوزی لینڈ کے باشندے Mr T Baxter تھے اور ان کے نائب ایک جرمن نژاد Mr E C Iven تھے جن کے خاکے پر مشتمل ایک باب اس کتاب کا حصہ ہے۔ Mr Baxter جنگِ عظیم دوئم سے قبل برما میں الیانز (Allianz) کے سربراہ تھے اور اتفاق سے اصفہانی خاندان سے ان کے قریبی مراسم تھے، جو ای ایف یو کے ایک بڑے حصے کے مالک تھے۔ میونخ ری (Munichre) کے ایک ڈائریکٹر جنگِ عظیم کے بعد کے زمانے میں ایشیا کے اپنے پہلے دورے پر کراچی آئے ہوئے تھے، جو اتفاق سے پہلے الیانز میں رہ چکے تھے اور Mr Baxter کے پرانے ساتھی تھے۔ دونوں نے نہ صرف پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے ایک شام ساتھ گزاری بلکہ اس بات کے امکانات پر بھی تبادلۂ خیالات کیا کہ دونوں کمپنیاں، ای ایف یو اور میونخ ری ایک دوسرے سے کاروبار میں اشتراک کریں۔ المختصر میونخ ری نے ای ایف یو کی کاروباری امداد کی ہامی بھر لی اور اس طرح ایک مخصوص نوعیت کی باہمی طویل دوستی اور شراکت کی ابتدا ہوئی جس کو پچاس سال کا عرصہ ہو چکا ہے، جس کے بارے میں ہم آگے چل کر بات کریں گے۔

صدی کے پانچویں عشرے تک پاکستان کے بیمے کی صنعت پر غیر ملکی ادارے حاوی تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک کے بیمے کے کاروبار کا اسی فی صد ان ہی کے پاس تھا۔ انشورنس ایسوسی ایشن آف پاکستان میں بھی ان ہی کی اکثریت تھی، جس کے معتمد ایک غیر ملکی مسٹر اسٹیفورڈ تھے جن کا تعلق انگلستان سے تھا۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اندازِ کار تبدیل ہوتا گیا، پہلے آہستہ پھر تیز رفتاری سے۔ اس کی ابتدا PIC کے قیام سے ہوئی تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، قانونی اعتبار سے پاکستان میں ہونے والے تمام جنرل انشورنس کے کاروبار میں PIC کو دس فی صد حصہ ملتا تھا مگر بعد میں اس کو بڑھا کر ۱۹۵۸ء میں تیس فی صد کر دیا گیا۔ اس کا ایک بڑا حصہ ایک پولنگ اسکیم (Pooling Scheme) کے تحت واپس پاکستان کمپنیوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ اس طرح مقامی کمپنیاں انفرادی طور پر بھی مضبوط ہوئیں۔

ایک اور اہم قدم نیشنل کو انشورنس (National Co Insurance) اسکیم کا قیام تھا۔ یہ مقامی کمپنیوں کا ایک اشتراک تھا، ابتدا میں جس کے صرف چھ ارکان تھے، ای ایف یو جس کی سربراہ تھی اور اس میں آنے والے کاروبار کا ایک بڑا حصہ ای ایف یو کا تھا۔

PIC اس کی معتمد تھی حالاں کہ اس کا سارا کام ای ایف یو ہی کے ذمے تھا۔ دراصل یہ انتظام اور اس کے نتیجے میں کاروبار میں ملنے والی حصے داری ہی تھی جس نے مقامی کمپنیوں کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے میں مدد کی۔ اس انتظام کو مقامی کمپنیوں نے سراہا بھی اور کہیں کہیں سے اس پر تلخ اعتراضات بھی ہوئے۔ اس انتظام میں شامل بہت ساری چھوٹی چھوٹی کمپنیاں دراصل غیر ملکی ری انشورنس کمپنیوں کی شاخوں کے مماثل تھیں، لہٰذا ملکی بیمے کے صنعت کے لیے کوئی خاص فائدہ فراہم نہیں کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان ہی ''چھوٹی چھوٹی'' کمپنیوں کی ٹوٹ پھوٹ نے، جو دراصل پاکستان کی بیمے کی صنعت کے لیے 'برطانوی آقاؤں' کی چھوڑی ہوئی وراثت تھیں اور جو پاکستان میں ابھرنے والے بیمہ کاری کی صنعت کی ریڑھ کی ہڈی بنیں، اس کے معیار کو متاثر کیا اور کسی حد تک نقصان پہنچایا۔

اس کے باوجود پاکستان کی بیمے کی صنعت کے لیے یہ زمانہ مہم جویانہ اور ولولہ انگیز اور تھا اس لیے کہ اسی دور میں ملک میں معاشیاتی اور صنعتی ترقی تیز رفتاری سے ہورہی تھی جس کو اطراف کے ممالک رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ پاکستان کی حکومت کو شروع دن ہی سے اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ ملک کی ترقی کے لیے ترقیاتی منصوبے بنانے ہوں گے اور اس پر سنجیدگی سے عمل کیا گیا تھا، جو ایک قابلِ تعریف اقدام تھا۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۵۱ء میں ایک چھ سالہ ترقیاتی منصوبے کا اعلان کیا گیا (جس کو عام طور پر کولمبو پلان کہا جاتا تھا)۔ یہ ایک نہایت لچک دار منصوبہ تھا جس کو آنے والے برسوں میں پھیلایا بھی گیا اور اس میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ اس لیے کہ اس کے پہلے نسخے میں معتبر شماریات کی غیر موجودگی میں کچھ قیاسات کیے گئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ اس دور کے سرکاری افسران کا ایک دور رس اور اچھا کام تھا۔ ملک میں باقاعدہ اور مربوط ترقیاتی منصوبہ بندی کی ضرورت کے پیشِ نظر حکومت نے جولائی ۱۹۵۳ء میں منصوبہ بندی بورڈ کی بنیاد رکھ کر ایک اور دور رس قدم اُٹھایا۔ اس ادارے نے ہاورڈ مشاورتی گروپ کی مدد سے ۶۰-۱۹۵۵ء کے عرصے پر محیط ایک پانچ سال کا ترقیاتی منصوبہ ترتیب دیا۔ اس منصوبے کی ترتیب سے بہت کامیاب منصوبوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو ۱۹۷۱ء تک جاری رہا مگر مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کے بعد اچانک بند ہوگیا۔

ان منصوبوں کا پہلا منصوبہ شاید نہایت اہم اور دور رس نتائج کا باعث ہوا تھا جس کی نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی منصوبہ بندی کے ماہرینِ معاشیات نے تعریف کی تھی۔ پہلا پانچ سالہ منصوبہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے آج بھی بہترین منصوبوں میں شمار کیا جاتا ہے جس کی نقل کوریا میں کی گئی اور نہایت کامیاب رہی۔ اتنی کامیاب شروعات اور اگلے چند برسوں کی زبردست معاشی ترقی کے بعد اس منصوبے کی تکمیل میں کیا رخنے پڑے، یہ ایک ایسا معما ہے جو سربرآوردہ ماہرینِ معاشیات، سیاست داں، سرکاری افسران اور تاجروں کے درمیان آج بھی موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ یقیناً ورلڈ بینک، انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ، پاکستان ڈیولپمنٹ کنسورشیم کے ممالک وغیرہ کو بھی اس بات پر حیرت ہوئی ہوگی اس لیے کہ بہ ظاہر یہ سب ادارے بھی پاکستان کی ابتدائی کامیابی سے متاثر ہوئے تھے جس سے اس ملک کے لیے ممکنہ طور پر 'ایشین ٹائیگر' بننے والے ممالک کی پہلی صف میں شامل ہونے کے امکانات دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے باوجود پچھلی صدی کے پانچویں عشرے میں بلکہ چھٹے عشرے میں بھی ہونے والی تیز صنعتی ترقی نے، جس میں پارچہ بافی، چینی، بناسپتی گھی، سیمنٹ وغیرہ کے کارخانے شامل ہیں، ملک کی بیمے کی صنعت پر مثبت اثرات مرتب کیے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ۱۹۵۰ء کے آس پاس ۸۱ بیمہ کمپنیوں میں سے صرف تین ایسی تھیں جن کے مالک پاکستان کے باشندے تھے۔ ای ایف یو جس کی بنیاد ۱۹۳۲ء میں کلکتے میں رکھی گئی تھی، 'حبیب' جو ۱۹۴۲ء میں بمبئی میں بنی، اور 'مسلم' جوان دونوں سے قبل لاہور میں بنائی گئی تھی۔ ۱۹۶۱ء تک یہ صورتِ حال کافی حد تک تبدیل ہو چکی تھی۔ بیمہ کمپنیوں کی تعداد گھٹ کر ۶۳ ہوگئی تھی جس میں سے ۱۹ پاکستانیوں کی ملکیت، جب کہ ۴۴ غیر ملکی کمپنیاں تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کاروبار کا توازن بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ NCS کے قیام کے بعد پاکستانی اداروں کو کُل کاروبار کا تقریباً ایک تہائی حصہ ملنے لگا تھا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آخرِ کار صورتِ حال مقامی اداروں کے حق

میں تبدیل ہوگئی۔ پچھلے سال، ۱۹۹۹ء، کے آخر تک کُل ۵۱ اداروں میں سے ۴۶ ادارے پاکستانیوں کی ملکیت ہوگئے تھے، یعنی صرف پانچ اداروں کی ملکیت سمندر پار کے مالکوں کی رہ گئی تھی۔

میں اس مسئلے کی مزید گہرائیوں میں جانا پسند نہیں کروں گا اس لیے کہ نہ تو میرے نزدیک یہ شماریات قابلِ اعتبار ہیں نہ میں پاکستان کی قابلِ فخر بیمے کی صنعت کے بارے میں ایسے کوتاہ بین اور ایسے متعصبانہ نقطۂ نظر سے اتفاق کرتا ہوں۔ اُس وقت کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی کے ایک افسرِ اعلیٰ، پاسپورٹ کے اعتبار سے ایک 'غیر ملکی' اور دلی اعتبار سے 'مقامی باشندے' کی حیثیت سے میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسے وقت میں بھی جب مقامی کمپنیاں، روایتی طریقوں سے کام کرنے والے اداروں کے مقابلے میں جن کی جڑیں گہری ہوچکی تھیں، کاروبار کے بڑے حصے کے حصول کے لیے جدوجہد کررہی تھیں، بیمے کا کاروبار چلانے والی اہم شخصیات کے آپس کے تعلقات قابلِ فخر حد تک اچھے رہے تھے۔ اس کے برعکس صنعت کے اعلیٰ افسران کے، خواہ وہ کسی قومیت کے رہے ہوں، آپس میں کاروباری روابط، صارفین کی خدمت کو اولیت وغیرہ میں اشتراک قابلِ فخر رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ہوش مند شخص اس بات سے واقف تھا کہ پاکستانی مالکان کے اداروں کا یہ پیدائشی اور قومی حق ہے کہ وہ ابھرتی ہوئی صنعت کے پھیلاؤ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اور بیمے کے وہ تمام ماہر اور تجربے کار افسران جو پاکستان میں کام کرنے والے کثیر المملکتی اداروں سے تعلق رکھتے تھے اور جن سے میری واقفیت تھی، وہ بھی خوب جانتے تھے کہ ان ترقیاتی کوششوں کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جدوجہد کو طویل کرنے کی تمام تر کوششیں کیں مگر یہ سب سیاست کے جوڑ توڑ سے مبرّا تھا۔ یہ سب، کسی قسم کی ناخوشگواری کے بغیر، نہایت دوستانہ ماحول میں ہورہا تھا، ایسے ماحول میں جہاں ایک اقلیت آہستہ آہستہ اکثریت میں بدل جانے کو کوشش کررہی تھی۔

۱۹۶۰ء میں جب میں نے اس مقامی ماحول میں قدم رکھا تھا اس وقت حالات تبدیلی کی موڑ پر تھے۔ اگرچہ اس وقت بیمے کے کاروبار کا بیشتر حصہ غیر ملکی اداروں کے پاس تھا مگر تبدیلی کی ہوا پاکستانی اداروں میں بھی پہنچ رہی تھی۔ انشورنس ایسوسی ایشن آف پاکستان کی مرکزی انتظامیہ کے صدر ایک مقامی انشورنس کے ادارے کے سب سے بڑے افسر بن چکے تھے اور اس کے معتمد ایک پاکستانی جناب معروف منتخب ہوچکے تھے۔ اور NCS کی معرفت سرکاری، نیم سرکاری اور دوسرے اداروں کے بیمے کا تقریباً تمام کاروبار اب مقامی اداروں کے ہاتھ آچکا تھا۔ اور اس وقت بھی جب بڑے بڑے صنعتی ادارے غیر ملکی قرض سے لگائے جارہے تھے اور قرض کی شرائط میں عام طور پر ایک شرط یہ بھی ہوتی تھی کہ کارخانے کا بیمہ پاکستان سے باہر سے ہونا تھا، بیمے کا خاصا بڑا حصہ قومی اداروں کو جاتا تھا پھر بھی بیمے کا بڑا حصہ ری انشورنس کمپنیوں کے ذریعے قرض دینے والے ملکوں کے 'بازاروں' میں پہنچ جاتا تھا۔ ایسی صورت میں بھی قومی اداروں کو کاروبار میں اچھا خاصا کمیشن مل جایا کرتا تھا۔

کم از کم سرکردہ مقامی بیمہ کمپنیوں کے درمیان کچھ اسی نوعیت کے دوستی کے جذبات پائے جاتے تھے۔ میرے ذاتی تجربات اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بارے میں نہ صرف پاکستانی بلکہ 'دوست غیر ملکی مبصرین' کا بھی خیال تھا کہ پاکستان کے ترقیاتی دور میں صنعتی ترقی کے اعتبار سے نہایت سرگرم اور بارآور زمانہ تھا۔ میری مراد پچھلی صدی کے چھٹے عشرے سے ہے۔ ای ایف یو سے قطع نظر جو اس زمانے ہی میں سب سے بڑا بیمے کا ادارہ بن چکی تھی، پریمئر، حبیب، نیو جوبلی اور کسی حد تک اس کاروبار میں داخل ہونے والی کمپنیاں آدمجی، سنٹرل، حتیٰ کہ نہایت فعال شخصیت مرحوم ملک صاحب کی سربراہی میں یونائیٹڈ انشورنس نے بھی خاصی کامیابیاں حاصل کرلی تھیں۔ اہم شخصیتوں میں نیو جوبلی کے سربراہ ماموں سجالی، حبیب کے سربراہ جناب محمد اور روی ڈُباش، پریمئر کے اختر آزاد اور محمد چودھری وغیرہ تھے جو اس دور کی بیمے کی صنعت کے اہم ارکان اور آبرو تھے۔ مسٹر پُرنل اور حمید سجالی نئی ابھرتی ہوئی طاقت 'آدمجی' کے اہم ترین کرتا دھرتا تھے، بعد میں پرنل کی جگہ محمد چودھری نے لے لی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو بیمے کی صنعت میں اعلیٰ درجے کی کاروباری مہارت اور معیار کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ میرا اور ان

لوگوں کا بے شمار ملاقاتوں، بحث مباحثے اور چھوٹے بڑے اہم اور غیر اہم کاروباری معاملات میں رابطہ رہا تھا۔ اگر چہ ہماری کاروباری ملاقاتیں اکثر اختلاف پر بھی ختم ہوتی تھیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم بدمزگی اور غیر دوستانہ احساس کے ساتھ اُٹھے ہوں۔ مختلف رنگوں کی جلد رکھنے کے باوجود ہم سب ایک کلب کے ارکان کی مانند رہے تھے۔

ایک اور عظیم بیمہ کار شخصیت ایم اے چشتی کی تھی جس نے بیمے کی صنعت میں کاروباری مہارت کے لیے بہت جدو جہد کی اور بیمے کے مختلف ابعاد — تکنیکی اور انتظامی امور پر بہت کچھ لکھا ہے۔ بہتوں کی طرح انھوں نے بھی بیمے کی صنعت میں اپنا پیشہ ورانہ سفر ایسٹرن فیڈرل ہی سے شروع کیا تھا اگر چہ بعد میں وہ ایک اعلیٰ عہدے پر نیو جوبلی چلے گئے تھے۔ بعد میں انھوں نے کئی درمیانے اور چھوٹے درجے کے اداروں کی سربراہی کی ہے، اور درحقیقت وہ آج بھی کم و بیش اسی نوعیت کے ایک ادارے کے سربراہ ہیں۔ چشتی صاحب ہی نے پاکستان میں بیمے کی صنعت کی کامیابی پر اپنے تاثرات تحریر کرتے ہوئے انگریزی زبان کو ایک خوب صورت محاورہ 'Roses and Ruses' عطا کیا ہے۔ جہاں انھوں نے Ruses کا لفظ استعمال کیا وہاں ان کی مراد حکومت کی اس غیر ضروری دخل اندازی سے تھی جس کے ذریعے نجی ملکیت کے بیمے کے اداروں کو کئی بار مشکلات سے گزرنا پڑا تھا۔

میرا اشارہ اس نوعیت کے واقعات کی جانب ہے جب ۱۹۵۸ء میں (PIC) پاکستان انشورنس کارپوریشن کے لیے جبری ری انشورنس کو دس فی صد سے بڑھا کر تیس فی صد کر دیا گیا تھا، اور ۱۹۷۶ء میں باقی ماندہ ستر فی صد کا ایک چوتھائی مزید جبری ری انشورنس اسی ادارے کو دیے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ یا جب بھٹو نے مارچ ۱۹۷۲ء میں زندگی کے بیمے کی پوری صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا حالاں کہ صرف ایک برس قبل ہی بنگلہ دیش کے قیام کے ساتھ پاکستان کی بیمے کی صنعت تقریباً اپنا آدھا کاروبار گنوا چکی تھی۔ یا یکم جولائی ۱۹۷۳ء کو جب (NCS) نیشنل کو انشورنس کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا اور نجی شعبے میں (NIF) نیشنل انشورنس فنڈ قائم کر دیا گیا تھا۔ اس کو بعد میں (NIC) نیشنل انشورنس کارپوریشن میں بدل دیا گیا اور اس کی وجہ سے نجی شعبے کی بیمہ کمپنیوں کو اس کاروبار بیمہ کے ایک بڑے حصے سے محروم کر دیا گیا تھا جو حکومتی اداروں کی بیمے کی ضروریات سے پیدا ہوتا تھا، اس لیے کہ سارا سرکاری بیمہ NIC کو دیا جانے لگا تھا۔ حکومت کے اس عمل پر نجی اداروں کی جانب سے کڑی تنقید ہوئی۔ NIC جو کہ اب کالعدم ہو چکی ہے، حکومتی اداروں کی اپنی اختراع تھی جس کے ذریعے بیمے کے زیادہ سے زیادہ کاروبار کو ملک ہی میں کھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس قدم اور دور اندیشی کا زور شور سے خیر مقدم کیا جائے گا۔ اس کے برعکس ان کو منھ کی کھانی پڑی اور ان کو وہ کچھ نہیں مل سکا جس کی منصوبہ بندی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ، جیسا کہ نڈر اور بے باک چشتی کہتا رہا ہے، حکومت نے نجی کمپنیوں پر مزید محصولات کی صورت میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر رکھا تھا، یا بیمے کے قوانین پر نظر ثانی اور تبدیلیاں کرتے وقت صنعتوں کی انجمنوں کے مشوروں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

جیسا کہ میرے قارئین جانتے ہیں، میں نجی شعبے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں نے اسی شعبے میں چالیس برس کے لگ بھگ کام کیا ہے جس کا بیشتر حصہ ان ایشیائی ملکوں میں بھی جو نجی شعبے پر یقین رکھتے ہیں اور ان ملکوں میں بھی جہاں بیمے اور بینکاری کی صنعتیں سرکاری انگوٹھے کے جبر تلے رکھی جاتی ہیں، گزارا ہے۔ لہٰذا میں ان نقطہ ہائے نظر سے ہم دردی کے جذبات رکھتا ہوں اور میں اس کے مخالف نظریے سے اتفاق کرنے کی کوشش بھی کروں تو میرا ضمیر اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا۔ عام انسانوں کی طرح حکومتیں بھی ماضی کی غلطیوں سے سیکھتی ہیں اور مستقبل کو سدھارنے کے لیے مختلف فیصلے کرتی ہیں۔ نجی شعبے میں زندگی کے بیمے کی اجازت دینا، خواہ وہ چھوٹے پیمانے ہی پر کیوں نہ ہو حکومتی پیش بینی ہے اور تعریف کی مستحق ہے۔ اور میں اس بات کا قائل ہوں کہ وہ وقت دور نہیں جب روشن خیال اور ترقی پسند سرکاری افسروں کو (جن کی ایک بڑی تعداد حکومتی شعبوں میں آج بھی موجود ہیں) احساس ہو جائے گا کہ پاکستان میں بیمے کی صنعت اتنی بالغ ہو چکی ہے کہ وہ یہاں کا مکمل کاروبار، سرکاری شعبے کا ہو یا نجی شعبے کا، خود سنبھال سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کا (ماضی کی غلطیوں کا) تدارک ڈرامائی انداز میں ایک دم ہو

جائے۔ نجی شعبے نے بھی پرانے ڈھرّے پر چلنے کے بجائے موجودحالات میں کام کرنے کا سبق سیکھ لیا ہے، جو دنیا کے دوسرے ممالک کے تجربے کے مطابق، اب مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ ماضی کے 'آہنی پردے' یا 'چلمن' کے پار ایک نظر ڈالنا یقیناً دیکھنے والوں کی آنکھیں پوری طرح کھول دے گا اور مجھے یقین ہے کہ بہت سے روشن خیال سرکاری افسران نہ صرف ان مناظر سے واقف ہو چکے ہیں بلکہ ان ہی خطوط پر سوچنے بھی لگے ہیں۔

پاکستان میں بیمے کی صنعت تجربے کار اور محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ وسیع پیمانے پر صنعت میں موجود منظم اداروں، پاکستان انشورنس انسٹی ٹیوٹ، انشورنس ایسوسی ایشن اور پہلی صف کی کمپنیوں کے تربیتی انتظامات کے طفیل دفتر کے ملازمین کے معیارِ کارکردگی میں نمایاں اضافہ ہو چکا ہے اور اس ترقی کا بین الاقوامی معیار سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اوّل درجے کی جامعات سے فارغ ہونے والے بہت سے اعلیٰ سند یافتہ افراد بھی اب بیمے کی صنعت کو اپنے مستقبل کے لیے اختیار کر رہے ہیں اور امید کی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ مستقبل میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوں گے۔ وہ سربرآوردہ شخصیتیں جن کا میں پچھلے صفحات میں نام لے کر تذکرہ کر چکا ہوں، اور وہ بے شمار افراد بھی، صفحات کے دامن کی کوتاہی کے باعث جن کا ذکر نہیں ہو سکا ہے، ان کارناموں کی روشن مثال ہیں جو بیمے کی صنعت نے ابھی تک کیے ہیں اور ان کی بھی جن کو وہ مستقبل میں انجام دینے کے صلاحیت رکھتی ہے بشرطے کہ اس کی راہ میں سرکاری سرخ فیتہ نہ آئے اور مصنوعی رکاوٹیں نہ کھڑی کی جائیں۔ مجھے پورا اعتماد ہے کہ اس صنعت کا مستقبل گلابوں کی مہکار سے معطر ہے، بس اپنی کارکردگی کی صلاحیتوں اور اپنی ہمت پر یقین ہونا شرط ہے۔ بس یہی وہ اجزائے ترکیبی ہیں، میں نے اس کتاب میں بڑے پیمانے پر جن کی خاکہ نگاری کرنے کی کوشش کی ہے۔

آیئے اب ہم مستقبل سے ہٹ کر ذرا ماضی کے کچھ مخصوص ابعاد پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

(لندن ۱۹۳۱ء میں) ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ کی پہلی میٹنگ (دائیں سے) ہائر ٹریڈنگ کمپنی کے شراکت دار عبدالرحمٰن صدیقی، بی ایم کولنز اینڈ کمپنی لمیٹڈ، لندن کے بی ایم کولنز، اٹلس انشورنس کمپنی کے جنرل منیجر سی ایچ فالون اور ہائر ٹریڈنگ کمپنی لندن کے شراکت دار کے ایف حیدر

ہمارے پہلے جنرل منیجر مسٹر ایڈورڈ تورمن مینی نگ
جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک اپنے عہدے پر فائز رہے

اسٹینڈرڈ لائف بلڈنگ، ۳۲۔ ڈلہوزی اسکوائر، جنوبی کلکتہ میں ۱۹۴۵ء سے ای ایف یو کا مرکزی دفتر

ای ایف یو کی تخلیق

جیسا کہ اکثر کہا گیا ہے، ای ایف یو ہندوستانی مسلمانوں کی بیمے کی صنعت کا گہوارہ رہی ہے، اسی طرح جیسے کہ بینکاری کے شعبے میں حبیب بینک۔ دور رس نگاہوں والے نوجوانوں کا ایک گروہ، جو علی گڑھ، لندن، آکسفرڈ یا کیمبرج کے ایامِ تعلیم کی دوستیوں پر مبنی تھا، مل بیٹھ کر علی گڑھ تحریک کی بنیاد پر مسلمانوں کی سیاست پر غور کرتا ہے اور تجارت اور صنعت کے میدان میں اقلیتی گروہ کی کوتاہیوں پر ماتم کرتا ہے۔ اور ان میں سے کچھ مسلم لیگ میں فعال ہو کے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں جد و جہد کرتے ہیں، یا کم از کم بالواسطہ اس سے تعاون کرتے ہیں۔ یعنی عبدالرحمٰن صدیقی، کے ایف حیدر، شعیب قریشی، غلام محمد، شہزادہ حمید اللہ خان (جو بعد میں ریاست بھوپال کے نواب بنے) تحریکِ خلافت کے زمانے میں ترکی جانے والے میڈیکل مشن والے ڈاکٹر ایم اے انصاری، اور ان ہی کے بھتیجے عبدالعزیز انصاری۔

ان نوجوانوں میں سے دو، صدیقی اور حیدر، نے مل کر ۱۹۲۰ء میں لندن میں ایک تجارتی ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور حیدر اس کے منیجر بنے۔ لندن میں ان کے بیمے کے بروکر بی ایم کولنز کا زبردست خیال تھا کہ ہندوستان میں ایک بیمہ کمپنی کی بنیاد رکھی جائے اور نہ صرف ایک مستقل ربط کا سلسلہ ہو بلکہ آمدنی اور منافع کا بھی ذریعہ بنے۔ دونوں نے آپس میں صلاح مشورے کیے اور ان کا جواب 'ہاں' ہی تھا مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ ادارہ مسلمانوں کی ملکیت ہوگا اور وہی اس کو چلائیں گے بھی۔

اس دل چسپ کہانی کے پس منظر کو میں نے اس کتاب کے صفحات میں اور جناب روشن علی بھیم جی کی سوانح حیات میں بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس لیے میں اس کے دوبارہ بیان سے اپنے قاری کو بلا وجہ زیرِ بار نہیں کرنا چاہتا، صرف اتنا کہنا چاہوں گا اس سے پاکستان میں بیمے کی صنعت کے گہوارے ای ایف یو کی تخلیق کی ضرورت کو سمجھنے میں مدد ملے۔

عبدالرحمٰن صدیقی اور کے ایف حیدر نے ۱۹۳۱ء میں اٹلس نام کی ایک بڑی برطانوی بیمہ کمپنی اور بی ایم کولنز لائڈز بروکرز کے تعاون سے ایک معاہدے کی یادداشت تیار کی جس میں کلکتے (ہندوستان) میں ایک بیمہ کمپنی بنانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اٹلس کے ایک اہم عہدے دار ای این منہی نک (E.N. Minhinik) کو نئی کمپنی بنانے اور پہلے سربراہ کی حیثیت سے اس کو چلانے کا فرض سونپا گیا۔ جس گروہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس نے اس فیصلے کو سراہا اور دل و جان سے اس کی امداد کا وعدہ بھی کیا۔ اس حقیقت نے، کہ آغا خان اور نواب بھوپال جیسی بڑی اور جانی پہچانی شخصیتوں نے اس کی سرپرستی قبول کی اس ادارے کو وقار بخشا۔ اور جیسا کہ میں نے جناب عبدالرحمٰن صدیقی کے خاکے میں تذکرہ کیا ہے، کمپنی کے حصص کی فروخت میں مشکلیں پیش آئیں۔ مگر سیاسی طور نہایت فعال گروہ کی انتھک محنت اور اثر و رسوخ رائگاں نہیں گئے۔ جناب غلام محمد کی ذاتی کوششوں سے حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں نے بہت سے حصص خرید لیے۔ سر وکٹر ساسون سب سے بڑے غیر ملکی حصے دار بنے اور باقی بیچنے والے حصص اصفہانی خاندان نے خرید لیے۔

بالآخر، بڑی مشکلوں کے بعد بنگال کے سب سے بڑے کاروباری اور صنعتی مرکز کلکتے میں ۲ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ایسٹرن فیڈرل یونین جنرل انشورنس کمپنی لمیٹڈ کا وجود عمل میں آیا۔ اس کے ڈائریکٹروں میں نظام حیدرآباد کے حصص کے نگاہ دار کی حیثیت سے ریاست حیدرآباد کے وزیرِ مالیات راجا اودھ نرائن بسار یا، ریاست بھوپال کے وزیرِاعظم سر اکبر حیدری اور عبدالرحمٰن صدیقی شامل تھے جو بورڈ کے صدر نشین کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے تھے، اگر چہ ان کو باقاعدہ یہ منصب سونپا نہیں گیا تھا۔ ایک دل چسپ نکتہ قابلِ ذکر یہ ہے کہ اس دور میں ایسے بڑے جاگیرداروں کا بڑا احترام اور ان پر اعتبار کیا جاتا تھا۔

اس طرح ہندوستان کی پہلی بیمہ کمپنی کی بنیاد پڑی جو نہ صرف مسلمانوں کی ملکیت تھی بلکہ اس کا انتظام و انصرام بھی مسلمانوں ہی کے ذمے تھا اور ای ایف یو کی بے مثال داستان کا (جس کو ہم ای ایف یو ساگا کے نام سے پکاریں گے۔ مترجم) آغاز ممکنہ خطرات، خوش امیدوں اور نیک جذبوں کے ساتھ ہوا۔ اس داستان کی تاریخی اہمیت اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ اس کی شروعات میں جو ہستیاں، بالواسطہ یا بلاواسطہ، شامل تھیں وہ پاکستان کی تحریک میں بھی عملی طور پر شریک تھیں اور اس حوالے سے ان کا شمار پاکستان کی بنیاد رکھنے والوں میں بھی ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان شخصیتوں کے تذکرے کے ذریعے میں ای ایف یو کے معماروں کے گروہ کی انفرادی اور مشترکہ کوششوں پر روشنی ڈالنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ جیسا کہ کچھ شخصیتوں کے خاکوں کے ذریعے میں نے بیان کیا ہے، ای ایف یو کی تخلیق ایک مخصوص لوگوں کے گروہ کی مشترکہ کوششوں سے ممکن ہوئی۔ اور ان سب ہی نے اس میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ بنیادی خیال تو لندن کے بروکر دوستوں نے کے ایف حیدر کو دیا تھا جب کہ اس قسم کے معاملات میں زیادہ تجربے کار عبدالرحمٰن صدیقی نے اس کو آگے بڑھایا اور دوسرے دوستوں سے تبادلۂ خیالات کے بعد اس کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔

کمپنی نے جنرل انشورنس کے کاروبار کی انڈر رائٹنگ شروع کی اور ۱۹۳۶ء میں بیمۂ زندگی کا کاروبار شروع کیا۔ تقسیمِ ہند سے پورے ایک سال قبل ہی اچھی خاصی کامیابی حاصل ہو چکی تھی۔ اس ادارے کو ہندوستان کے بیمے کی صنعت میں ایک مناسب اور قابلِ احترام مقام حاصل ہو گیا تھا۔ چیف ایگزیکٹیو کی حیثیت کے علاوہ ملازموں میں ہندوستان کی تمام قومیتوں، مسلمان، پارسی، ہندو وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ کمپنی کے پہلے جنرل منیجر منی تک ۱۹۳۸ء میں ریٹائر ہو گئے اور ان کی جگہ ٹی این بیکسٹر نے لے لی جس پر وہ ۱۹۵۱ء تک فائز رہے۔ ان کی جگہ جناب کے ایف حیدر نے زمامِ انتظام سنبھال لی۔

جناب صدیقی نے ۱۹۵۰ء میں ریٹائرمنٹ لے لی جب وہ مشرقی پاکستان کے گورنر کے عہدے پر فائز ہوئے اور جناب مرزا احمد اصفہانی ۱۹۶۰ء تک کمپنی کے چیئر مین رہے۔ حکومت کے اعلیٰ کار پردازوں کے اہم رُکن ہونے کے باعث اصفہانی اتنے مصروف رہنے لگے تھے کہ انھوں نے چیئر مین کا عہدہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی جگہ جناب کے ایچ شیرازی کا تقرر کروادیا۔ اصفہانی صاحب نے ایک جرمن نژاد Mr E C Iven کا بھی ڈپٹی جنرل میجر کے عہدے پر تقرر کروادیا۔ یہ وہ شخص تھے جنھوں نے ای ایف یو کے بورڈ کو اس بات کا یقین دلادیا تھا کہ اس کمپنی کا مستقبل پاکستان میں ہے اور اس باعث (کمپنی کو پاکستان منتقل کرنے کا) فیصلہ کیا گیا تھا۔ لہٰذا ای ایف یو نے پاکستان ہجرت کی اور اس کا صدر مقام مشرقی پاکستان کے شہر چاٹگام میں قائم کیا گیا جب کہ کاروبار کے لیے مرکزی دفتر کراچی میں بنایا گیا۔ کچھ ملازمین کو ڈھاکے میں متعین کیا گیا، جو مشرقی پاکستان کا دارالحکومت تھا، تا کہ نئی اور ابھرتی ہوئی قوم کے مسائل کو حل کرنے کے لیے مقامی طور پر انتظام بھی ہو۔

ان ساری تبدیلیوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ کمپنی نے ہندوستان میں اپنا کاروبار بالکل بند کر دیا تھا۔ جناب عبدالعزیز انصاری کا، ہندوستانی حکومت کے انشورنس ڈپارٹمنٹ کی سربراہی سے فراغت کے بعد، عبدالرحمٰن صدیقی نے ای ایف یو کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے ۱۹۳۴ء میں ہی تقرر کر دیا تھا اور ۱۹۵۰ء میں وہی کمپنی کے منیجر برائے ہندوستان اور سیلون (سری لنکا) بنائے گئے۔ یہ ۱۹۵۷ء کی

بات ہے جب برصغیر کے ان علاقوں سے ای ایف یو کے رابطے منقطع ہوئے اس لیے کہ آخری بار ۱۹۵۶ء کی بیلنس شیٹ میں کلکتے اور مدراس کا نام شامل کیا گیا تھا۔

نیوزی لینڈ کے باشندے ٹام بیکسٹر اور قد آور جرمن اِروِن سی آئیون دونوں انتظامیہ کی ایک مضبوط اور ماہر جماعت کے اچھے سربراہ تھے جنھوں نے ایک بالکل نئے ماحول میں ادارے کی بنیاد رکھی اور اس کو کامیابی سے چلایا۔ یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے جب کمپنی کا دفتر میکلوڈ روڈ (حال چندریگر روڈ) پر واقع لائنز بلڈنگ میں تھا جو اب بھی موجود ہے اور اس میں امارات بینک کا دفتر ہے۔ جہاں ایک چھوٹی سی شاخ کام کر رہی تھی وہیں کمپنی کے وسیع دائرۂ کار کے لیے ایک بڑا دفتر قائم ہو گیا۔ جناب اختر آزاد آتشزدگی کے بیمے کے کرتا دھرتا تھے اور جناب آغا رضا چیف اکاؤنٹنٹ، جو بعد میں PIDC کے اہم رُکن بنے، جناب ایس ایم معین الدین ایجنسی سیکشن کے انچارج، جناب ہاشمی میرین انشورنس کے منیجر، جناب تحسین احمد حادثاتی اور موٹر کے بیمے کے منیجر اور زندگی کے بیمے کے کار پرداز مشہور وصال الدین برادران کے سربراہ سب سے بڑے بھائی محمد وصال الدین تھے جن کی معاونت ان کے والد کرتے تھے، جو ایک طرح کے بزرگ رہنما تھے۔ ایک اور جرمن ہائنز ڈبلیو شوارز ۱۹۵۱ء میں ٹیم میں شامل ہوئے اور ان سب کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ کمپنی کامیابی کی راہ پر گامزن ہو چکی ہے۔ پاکستان میں کمپنی کا کاروبار ترقی کرنے لگا اور منافع بھی ہونے لگا۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے یکم جنوری ۱۹۵۲ء سے جناب کے ایف حیدر کمپنی کے سربراہ بن گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ نئی بیمہ کمپنیاں وجود میں آ رہی تھیں اور بیمے کے دفتری ملازمین کے لیے 'موج میلے' کا سماں تھا۔ جناب اختر آزاد کو اسٹیٹ بینک کے گورنر جناب زاہد حسین نے پریمئر انشورنس میں شمولیت پر راضی کر لیا، ای ایف یو کے لیے کام کرنے والے تین بھائیوں میں سب سے بڑے جناب وصال الدین امریکن لائف انشورنس کے سربراہ بن گئے اور وہ ای ایف یو میں اپنے پرانے ساتھیوں کے لیے سب سے طاقتور حریف بن کر ابھرے۔ جناب آغا رضا PIDC میں چلے گئے اور کئی دوسرے لوگ بھی نئی بننے والی کمپنیوں میں بہتر مواقع کے لیے قسمت آزمائی کرنے لگے۔ جناب کے ایف حیدر کے نائب اروِن آئیون ۱۹۵۵ء میں جرمنی کی سب سے بڑی ری انشورنس کمپنی میونخ ری میں سینئر ڈائریکٹر کی حیثیت سے شمولیت کے لیے جرمنی چلے گئے۔ کسے خبر تھی کی ان سب تبدیلیوں کے پسِ پردہ بڑی کامیابیاں منتظر تھیں، خاص کر اس وقت جب ای ایف یو کے اپنے وجود کو خطرات لاحق نظر آتے تھے۔

کمپنی کے ان مشکل لمحات کے بارے میں اس کتاب میں تفصیل سے لکھا گیا ہے اور مزید سوالات کے جواب اپنے مرحوم دوست روشن علی بھیم جی کی سوانح حیات میں دیے ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

کاروبار کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کے لیے ای ایف یو کی انتظامیہ نے اپنے لندن کے ایجنٹ پی ایم کولنز کو کمپنی کی جانب سے لندن کی مارکیٹ میں کاروبار کرنے کا حکم دیا۔ کاروبار کے نتائج بھیانک نکلے مگر کراچی میں کسی کو اس کا فوراً علم نہیں ہوا۔ بعض وجوہات کی بنا پر لندن کے ایجنٹ نے تفصیلی حسابات بھی نہیں بھیجے تھے اور کمپنی نے بھی اس لیے خاموشی اختیار کر رکھی کہ نتائج کا کچھ حسابیاتی توڑ نکالا جا سکے۔ قصہ مختصر، ۱۹۵۰ء کے عشرے کے آخر تک یہ عیاں ہو گیا کہ لندن میں ہونے والے نقصانات کمپنی کی مالی استطاعت سے کہیں زیادہ تھے۔ اس لیے کچھ مشکل قدم اُٹھانے ناگزیر ہو گئے تھے۔ سب سے بڑے حصے دار ہونے کے ناتے اصفہانی خاندان کسی 'نجات دہندہ' کی تلاش میں تھا اور اس وقت عباس خلیلی جیسے پرانے تعلقات والے مشہور زمانہ سابق سرکاری افسر کام آئے۔ ان کے پرانے دوست راجا صاحب محمود آباد اور ایک اور سابق اعلیٰ سرکاری افسر جناب عثمان علی دونوں نے مل کر جناب روشن علی بھیم جی، انشورنس کی صنعت کے ایک تجربے کار ماہر اور پختہ کار سیاست داں کو، جیسا کہ میں پہلے کئی بار لکھ چکا ہوں، بیمے کی صنعت کے گھوارے ای ایف یو کی پتوار سنبھالنے پر راضی کر لیا تا کہ اس ادارے کو ممکنہ غرقابی سے بچایا جا سکے۔ ان لوگوں نے سب سے پہلے تو ادارے کے حصص کی ملکیت میں تبدیلیاں کیں۔

اصفہانی خاندان نے اپنے حصص کا ایک بڑا حصہ حبیب خاندان (ARAG Ltd) کو فروخت کردیا۔ اس تبدیلی کے بعد خلیلی اور بھیم جی کسی معجزے کی تلاش میں عازم لندن و میونخ ہوئے۔

اور معجزہ رونما ہوگیا۔ ای ایف یو کے سابقہ جرمن افسران آئیون اور شوارز کام آئے، جو میری طرح میونخ ری کے اعلیٰ افسر ہو چکے تھے، اور روشن علی بھیم جی نے مل کر میونخ ری کے چیئرمین Dr. Alois Alzheimer اور ان کے معتمد Horts K Jannott کو، جو بعد میں ان کے عہدے پر فائز ہوئے، قائل کرلیا کہ اگر لندن کے مسئلے کو بخوبی حل کرلیا جائے تو ای ایف یو کی نئی انتظامیہ اس طوفان سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ Dr. Alzheimer نے فیصلہ کیا کہ ماضی میں ای ایف یو سے ری انشورنس سے کاروبار میں جتنا منافع میونخ ری نے کمایا ہے اس کا پچاس فی صد ان کو واپس کردیا جائے۔ اس کے علاوہ بغیر سود کے ایک بڑی رقم عاریتاً روشن علی بھیم جی کے لیے مختص کردی جائے۔ اس سہولت کی موجودگی میں بھیم جی اور خلیلی لندن کنسورشیم کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ اس مسئلے کا ایک منصفانہ حل ہی ان کے حق میں ہوگا۔ Lloyds Brokers - Robert Bradfords کے سینئر ڈائریکٹر مسٹر ڈیوڈ ڈولن بالخصوص معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے اور یہ ان کی انتھک محنت اور معاملہ فہمی تھی جس کی وجہ سے کنسورشیم کے دوسرے ارکان ای ایف یو کی پیشکش پر راضی ہوگئے اور اچانک کمپنی کے افق پر چھائے ہوئے گہرے بادل چھٹ گئے۔ جو کچھ ایک قیامت اور تباہی کے مترادف نظر آرہا تھا اب ایک بھیانک خواب میں تبدیل ہوگیا۔ اور یہ سب کچھ نسبتاً ایک قلیل عرصے میں ہوگیا۔ خلیلی اور بھیم جی نے کمپنی کی باگ ڈور یکم جنوری ۱۹۶۱ء میں سنبھالی تھی اور سال کے اختتام سے قبل ہی کمپنی کو منجدھار سے نکالنے کا کام انجام پا گیا۔

کمپنی کی نئی انتظامیہ نے وہ تاریخ رقم کرنا شروع کردی جس کو اب عام طور پر ای ایف یو کی کامیابی کی داستان کہا جاتا ہے۔ ۱۹۷۲ء تک، جب بھٹو حکومت نے زندگی کے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا، ''عافیت کا نشان، ای ایف یو'' کا نعرہ ملک کے گھر گھر پہنچ گیا تھا۔ ای ایف یو کے بیمۂ زندگی کے کاروبار کی کامیابی نے اس کو، جاپان کے علاوہ، افریقی ایشیائی علاقے میں سب سے بڑا انشورنس کا ادارہ بنادیا تھا۔

دو برس کے قلیل عرصے میں نجی ملکیت کی بیمہ کمپنیوں کی قامت اتنی کم ہوچکی تھی کہ یہ سوال کیا جانے لگا تھا کہ یہ ادارے باقی بھی رہیں گے یا نہیں۔ سب سے پہلے تو مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے وہاں کے کاروبار کا نقصان، پھر NIC کی تشکیل، اور اس پر مستزاد بیمۂ زندگی کو قومی ملکیت میں لینے کا حادثہ۔ ان سب نے مل کر بیمے کی صنعت کو نقصان پہنچایا مگر سب سے زیادہ نقصان ای ایف یو کو ہوا۔ جس طرح ہندوستان میں جنرل انشورنس کو بھی قومی ملکیت میں لیا گیا تھا، پاکستان میں کسی وقت ہوسکتا تھا۔ تعجب نہیں کہ ان وجوہات کی بنا پر اعلیٰ عہدے پر متعین کارکنان نے ملک چھوڑ کر باہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان نے صلاحیت کے میدان میں سب سے زیادہ نقصان اٹھایا مگر عجیب بات ہے کہ لوگوں نے اس میں بھی خیر کا پہلو تلاش کرلیا کہ اس طرح ملک چھوڑتے والے غیر ممالک میں جو زرِ مبادلہ کماتے تھے وہ اپنے ملک بھیجتے ہیں اور اس طرح ملکی معیشت مستحکم ہورہی ہے۔

ایک بار پھر ای 'ایف یو ساگا' جیسی بنیاد پڑتی نظر آنے لگی۔ روشن علی بھیم جی ایک یقینی خطرے کی نشاندہی کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بیمۂ زندگی کی طرح جنرل انشورنس کی صورت میں بچے کھچے کاروبار کو بھی، جو نجی ملکیت میں باقی رہ گیا تھا، جلد یا بدیر کسی وقت بھی قومی ملکیت میں لیا جاسکتا ہے۔ وہ قومی ملکیت میں لیے جانے والی صنعتوں کی حالت اور ملک کی دوسری تجارتی پالیسیوں سے بھی نالاں تھے۔ اس لیے انھوں نے بھی اپنے پرانے کاروباری دوست جناب آغا حسن عابدی کے نقشِ قدم پر چلنے کی ٹھانی، جنھوں نے اپنے عرب دوستوں کی مالیاتی معاونت سے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کی بنیاد رکھ دی تھی جو بہت جلد ہی دنیا کے بڑے مالیاتی اداروں کی صف میں شامل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ جناب بھیم جی نے عابدی صاحب کی تجویز قبول کرتے ہوئے برطانیہ، دبئی اور سعودی عرب میں بیمہ کمپنیوں کی بنیاد رکھ

دی۔ میں نے اس منصوبے کا تذکرہ جناب بھیم جی کی سوانح حیات میں تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے بدقسمت اختتام کی کہانی کا سب کو علم ہے اس لیے اس کی تفصیل میں جانے سے گریز کیا جاتا ہے۔ بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کی اچانک تباہی کی وجہ سے ان انشورنس کمپنیوں کو بھاری نقصان اُٹھانا پڑا اس لیے کہ ان کی رقوم عابدی صاحب کے بینک میں جمع تھیں۔ اس سانحے کی اور بھی وجوہات تھیں جن کو میں نے مناسب مقامات پر بیان کیا ہے۔

اس سانحے سے جو بچ رہا تھا وہ اس گروپ کے چیئرمین کی زبردست قوتِ ارادی تھی جو ای ایف یو کو دوبارہ ان بنیادوں پر استوار کرنے پر مصر تھی۔ لہٰذا نئے سرے سے ایک حوصلہ مند انتظامیہ منظم دی گئی اور جناب سیف الدین زومکا والا کو، جو پندرہ برسوں سے عرب امارت میں قائم گروپ کے اداروں میں منہمک تھے، کراچی واپس لا کر مینیجنگ ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ یہ ایک بڑا چیلنج تھا اس لیے ایک بڑے حصے کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد ای ایف یو جنرل کے نام سے باقی ماندہ کمپنی تنزل کا شکار تھی اور کاروباری معاملات میں آدمجی اوّل درجے کی کمپنی بن چکی تھی۔ پاکستان میں بیمے کی صنعت کے ایک طباع، ماہر اور تجربے کار شخصیت جناب محمد چودھری نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا جب ای ایف یو کے سربرآوردہ اعلیٰ افسران ملک سے باہر جا چکے تھے۔ انھوں نے کاروبار کے حالات کا غائر نظر سے تجزیہ کیا، اس کی کمزوریوں اور توانائیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنی بصیرت اور اپنی کمپنی کی ضروریات کے پیشِ نظر ایک دوررس حکمتِ عملی ترتیب دی۔ انھوں نے وہی کچھ کیا جو ۱۹۶۰ء سے ان کا شدید کاروباری حریف ادارہ ای ایف یو کرتا آ رہا تھا یعنی اپنے افسران اور کارکنان کو کامیابی سے تربیت یافتہ بنایا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے اداروں، بالخصوص ای ایف یو، سے تربیت یافتہ اور ماہر کارکنوں کو اپنے ادارے میں بھرتی کیا اور اس طرح انھوں نے اپنے ادارے کو ایک نہایت فعّال اور اوّل درجے کا ادارہ بنا دیا تھا۔ آدمجی انشورنس نے ای ایف یو کی جگہ لے لی تھی اور بلا شرکتِ غیرے بیمے کے کاروبار میں اوّل درجے کی کمپنی بن چکی تھی۔ سال بہ سال دونوں اداروں کے درمیان، محمد چودھری اور ان کے 'سپاہیوں' کے حق میں، خلیج بڑھتی جا رہی تھی اور ای ایف یو سمیت پوری صنعت کو اعتراف کرنا پڑا کہ ان کو انشورنس کے ایک بنگالی فسوں گر نے چاروں شانے چت کر دیا ہے۔

سیف الدین زومکا والا اور روشن علی بھیم جی کی پاکستان واپسی کے بعد ہوا کا رُخ بدلنا شروع ہو گیا۔ ای ایف یو کے ڈھانچے میں تبدیلیاں کی گئیں اور کارکنوں کو جدید تربیت فراہم کرنے کی غرض سے پاکستان انسٹی ٹیوٹ کے صدر اور تربیت کے فن میں ماہر ملک کے نامور افسر جناب ارشد عبداللہ کو ایگزیکٹیو ڈائریکٹر بنایا گیا اور کمپنی کے سارے از کار رفتہ اور پرانے طریقوں کو دریا بُرد کر دیا گیا۔ نوجوان اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں رکھنے والے کارکنوں کو حوصلہ آزما عہدوں پر فائز کیا گیا اور ان کو جد و جہد سے پُر ذِمّے داریاں سونپی گئیں۔ اس کی ایک بہترین مثال ڈپٹی ایگزیکٹیو ڈائریکٹر اور شمالی زون کے سربراہ قنبر حمید کی ترقی سے دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جو سب سے اہم بات ہوئی وہ یہ کہ اپنے باپ دادا کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نئی نسل نے اس ادارے سے اپنا مستقبل جوڑے رکھا اور اپنے بزرگوں کی طرح اس ادارے کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس کو ایک عظیم ادارے میں بدلنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

قنبر حمید ۱۹۵۱ء میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ان کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی۔ انھوں نے سینٹ انتھونی ہائی اسکول سے او لیول کیا، گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے وہاں سے گریجویشن کیا۔ قانون داں بننے کا فیصلہ کیا اور پنجاب یونی ورسٹی سے ۱۹۷۲ء میں LLB کیا۔ ای ایف یو سے متعلق ان کی اوّلین یادوں میں وہ زمانہ ہے جب وہ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور لاہور میں مال روڈ پر 'کوآپریٹو انشورنش بلڈنگ' میں واقع کمپنی کے دفتر جایا کرتے تھے۔ قنبر کے دادا شیخ عبدالحق اس زمانے میں لائف منیجر فار پاکستان کے عہدے پر فائز تھے۔ قنبر حمید کہتے ہیں، ''اسکول کے بعد میں کمپنی کے دفتر چلا جایا کرتا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں میرے دادا کی ملازمت سے فراغت سے قبل ہی میرے والد کمپنی کے اکاونٹس ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہو چکے تھے اور ۱۹۸۴ء میں ملازمت سے فراغت کے وقت وہ زونل اکاونٹنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔''

پنجاب یونی ورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد قنبر حمید نے ایک امریکی بین الاقوامی کمپنی میں ملازمت کرلی جو پاکستان میں تیل کی تلاش میں تھی۔ قانون میں مزید علم حاصل کرنے کی غرض سے لندن گئے جہاں انھوں نے یونی ورسٹی کالج لندن میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۸ء میں (Master of Laws) LLM کی ڈگری لی جس میں Majors in Insurance Law, Company Law, Civil Law, Anti Trust Laws شامل تھے۔ پاکستان واپسی پر انھوں نے کراچی اور لاہور کی اعلیٰ عدالتوں میں وکالت شروع کردی۔ ای ایف یو سے اپنے پرانے رشتوں کی بنا پر وہ اس وقت کے منیجنگ ڈائریکٹر جناب سلطان احمد سے کراچی میں گاہے گاہے ملاقات کیا کرتے تھے جن سے ان کے والد کے قریبی تعلقات تھے۔ ان ملاقاتوں کے دوران سلطان احمد بار بار قنبر حمید کو یاد دلایا کرتے تھے کہ ان کے خون میں انشورنس ہے اور ان کو اپنے 'خاندان' میں جلد سے جلد شامل ہو جانا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جناب روشن علی بھیم جی نے بھی قنبر حمید سے اس موضوع پر بات کی تھی اور بالآخر انھوں نے ۱۹۸۵ء میں لاہور میں ای ایف یو کے برانچ منیجر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کرلی۔ قنبر حمید نے مجھ سے بات کرتے ہوئے کہا، ''یہ ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ نہیں کہ آج میں اسی کمرے میں بیٹھتا ہوں جس میں ای ایف یو میں اپنے طویل عرصۂ ملازمت میں میرے دادا بیٹھا کرتے تھے۔ میرے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا بڑا بوجھ ہے۔ مجھ کو اپنے منیجنگ ڈائریکٹر کے اس اعتماد کی لاج بھی رکھنی ہے جو انھوں نے مجھ پر کیا ہے اس لیے مجھے دُگنی محنت کرنی پڑتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ میری کارکردگی کا میرے عظیم بزرگ کی کارکردگی سے مقابلہ بھی کیا جائے گا۔''

شمالی زون کے سربراہ کی حیثیت میں قنبر حمید اچھا کام کررہے ہیں۔ کاروباری تعلق رکھنے والے اور دفتر کے کارکنان سب ہی ان کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے دادا اور والد دونوں نے جو اعتماد حاصل کیا تھا وہی ان کے لیے ہمت افزائی کرتا ہے اور یہی بوجھ ہے جو ان کے کاندھوں پر رہتا ہے۔ ایسی ہی ایک اور مثال قنبر حمید کے عزیز ترین ساتھی شوکت سعید احمد کی ہے۔ شوکت بھی کمپنی کے ایک مشہور اعلیٰ افسر میاں سعید احمد کے صاحبزادے ہیں۔ اس قسم کی بہت سے مثالیں ہیں جہاں مشہور افسران کے بیٹے کمپنی میں شامل ہیں اور اگر کمپنی کی نظامِ مراتب کے معیار سے پرکھا جائے تو قنبر حمید ان سب میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی اور ایسی ہی بہت سی مثالوں ہی کی بدولت کمپنی تیزی سے ترقی کرتے ہوئے آج صنعت کی بلندیوں پر دوبارہ فائز ہوگئی ہے۔

زندگی کے بیمے کی صنعت میں نجی ملکیت کے اداروں کو کام کرنے کی اجازت ای ایف یو کی اپنے معیار پر واپسی کا ایک اور اہم سنگِ میل ہے۔ وہ ای ایف یو کے اس وقت کے چیرمین جناب روشن علی بھیم جی کی زندگی کا ایک اور خوشگوار دن تھا اس لیے کہ ایک مدت سے وہ حکومت کے مقتدر حلقوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کررہے تھے کہ قومی ملکیت میں کام کرنے والے ادارے اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن آف پاکستان اور نجی ملکیت میں کام کرنے والے بیمے کے اداروں کے درمیان صحت مند مسابقت ہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے اس صنعت میں تیزی سے ترقی ہوگی اور یہ صنعت ویسی 'سماجی خدمت' کرسکے گی جس کی قوم کو ضرورت ہے۔ آخر کار کچھ دور رس اہلِ کارانِ حکومت نے ان کی تجویز کی حمایت کی۔

۸ر نومبر ۱۹۹۲ء کو ای ایف یو لائف پہلی لائف انشورنش کمپنی تھی جس کو کاروبار شروع کرنے کی اجازت دی گئی، جس کے بعد چار دوسری کمپنیوں کو بھی اجازت نامے جاری ہوئے۔ دو پاکستانی کمپنیوں، ''نیو جوبلی'' اور ''میٹروپولیٹن'' کو اور دو غیر ملکی اداروں ''امریکن لائف'' اور ''کمرشیل یونین'' کو۔ ای ایف یو لائف نے اپنا کاروبار ''گروپ لائف انشورنس'' پالیسیوں سے ۱۹۹۳ء میں شروع کردیا۔

اس کمپنی کے سربراہ لائف انشورنس کے تجربے کار اور ماہر کارکن جناب طاہر جی ساچک اور ان کے چند قریبی ساتھی ہیں جنھیں انگلستان میں لائف انشورنس کا نہایت وسیع تجربہ ہے۔ نجی ملکیت کی بیمہ کمپنیوں میں کامیابی کے اعتبار سے ای ایف یو لائف سرِفہرست ہے۔ ڈاکٹر تاج الدین مانجی، میڈیکل ڈائریکٹر، عمر مرشد، کنسلٹنگ ایکچویری، بین الاقوامی شہرت کے حامل کنسلٹنٹ ایکچویری Michael Bell

جیسے نہات تجربے کار ماہرین کی معاونت کی بدولت ای ایف یو لائف نے ترقی کی ابتدائی منزلیں طے کر لی ہیں۔
'ای ایف یو جنرل' اور 'ای ایف یو لائف' دونوں مل کر اس پرانے، عظیم اور دور رس نگاہیں رکھنے والے ادارے کی نمائندگی کرتی ہیں ،۱۹۷۲ء میں حکومت کی 'مداخلت' نے جس کو عارضی طور پر آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ یہ وہی حالات سے لڑنے کا جذبہ ہے، انشورنس کے تجربے اور، نئے زمانے کے تناظر میں، سارے پاکستان میں موجود گاہکوں کے مفاد کی پاسداری ہے جو ایک نئے نکھرتے ہوئے روپ میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔

نئی صدی کے آغاز سے ای ایف یو خاندان میں ایک نئے ادارے کا اضافہ ہوا ہے۔ انشورنس کے عالمی تناظر میں بڑے اداروں میں سے ایک، پانچوں برّاعظموں کے ستر ملکوں میں انشورنس کے کاروبار میں مشہور جرمنی کا سب سے بڑا ادارہ Allianz Insurance Company کے اشتراک سے پاکستان کے عوام کو صحت کے بیمے کے فوائد مہیا کرنے کی غرض سے ایک ادارہ تشکیل کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ ۲۹/مارچ ۲۰۰۰ء کو معاہدہ ہو چکا ہے جس کے مطابق Allianz-EFU Health Insurance Company وجود میں آجائے گی۔ پاکستان میں بیمے کی صنعت کی تاریخ میں یہ بذاتِ خود پہلا واقعہ ہوگا کہ ایک مقامی کمپنی دنیا کے ایک بہت بڑے بیمے کے ادارے کے ساتھ اشتراک میں شامل ہو رہی ہے۔ اور بلا شبہ ای ایف یو کی ۶۸ سالہ تاریخ میں ایک اور اہم سنگِ میل کا اضافہ ہوگا۔ دونوں اداروں کے درمیان معاہدے اس وقت طے پا چکے تھے جب ای ایف یو گروپ کے چیئرمین جناب روشن علی بھیم جی بقیدِ حیات تھے۔ یہ نئی تخلیق بھی اُسی فلسفے پر عمل پیرا ہوگی، کسی سمجھوتے کے بغیر جناب روشن علی بھیم جی تمام عمر جس پر کاربند رہے۔
۱۰/دسمبر ۱۹۹۸ء کو جب ان کا انتقال ہوا، انھوں نے کامیاب بیمہ کمپنیوں کا ایک گروپ ورثے میں چھوڑا۔ مجھے پورا یقین ہے جس کے کارپردازان کے پیشِ نظر وہی جذبہ ہے جو مرحوم کا نصب العین تھا۔ روشن علی بھیم جی اپنے ساتھیوں کی کارکردگی پر فخر کیا کرتے تھے اور انھیں یک گونہ انبساط کا احساس ہوتا تھا۔ ان سے میری تقریباً چالیس سالہ رفاقت اور ان کے ساتھیوں سے میرے تعلقات کی بنا پر، جو ای ایف یو کے پرچم کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں، مجھے پورا یقین ہے کہ وہ سب جناب بھیم جی کی خواہشات کی برآوری احترام اور تشکّر کے جذبے کے ساتھ کریں گے۔

روشن علی بھیم جی صاحب ای ایف یو کے زیرِ تربیت افراد کا سعید احمد صاحب سے تعارف کرا رہے ہیں

روشن علی بھیم جی صاحب غور و فکر کی کیفیت میں

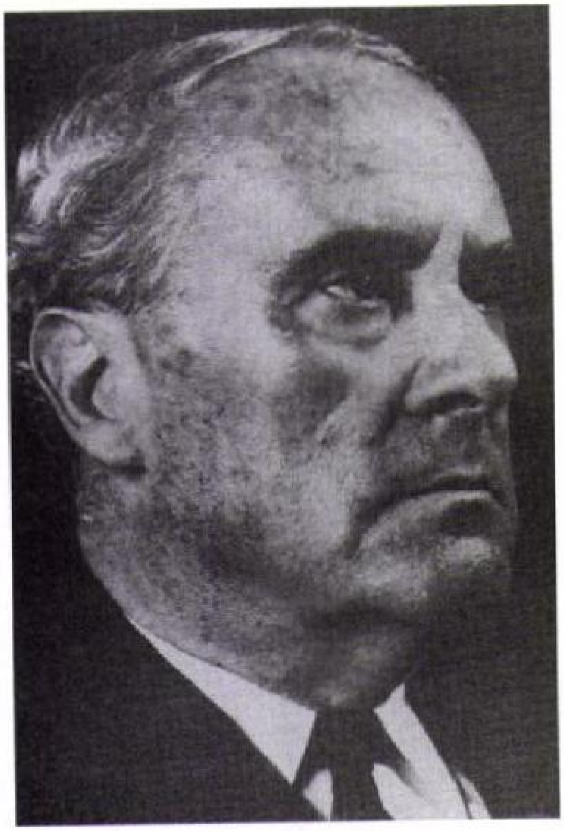

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۹ء تک میونخ ری انشورنس کمپنی کے
بورڈ آف مینجمنٹ کے چیئرمین ڈاکٹر الوس الزائمر

دو اچھے دوست اور رفقائے کار، روشن علی بھیم جی ۱۹۶۵ء میں مصنف کے ساتھ

روشن علی بھیم جی ۱۹۶۳ء کے ای ایف یو کنونش میں کامرس منسٹر وحید الزماں صاحب کا استقبال کرر ہے ہیں
یہ تقریب بیچ لگژری ہوٹل کراچی میں منعقد ہوئی تھی

روشن علی بھیم جی ۱۹۶۶ء میں صدر ایوب سے ستارۂ قائد اعظم کا اعزاز وصول کرتے ہوئے

پاکستان میں بیمے کی صنعت کے پہل کار

این اے قاضی

جیسا کہ ہم نے دیکھا ، ای ایف یو پاکستان کی سب سے پُرانی بیمہ کمپنی ہے ، ایک درمیانے درجے کی کمپنی جو اس وقت بھی مسلمانوں کی ملکیت تھی جب برِصغیر کی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے ای ایف یو یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہو گی کہ اس ادارے نے پاکستان میں بیمے کی قومی صنعت کے لیے گہوارے کے فرائض انجام دیے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں جب ای ایف یو اپنی 'گولڈن جوبلی' منارہی تھی، جناب این اے قاضی نے ، جو نہ صرف ایک طویل عرصے تک ای ایف یو سے منسلک رہ چکے تھے بلکہ متفرق پاکستانی بیمہ کمپنیوں میں کام بھی کر چکے تھے اور انھی دنوں نیشنل انشورنس کارپوریشن کے چیئرمین کے عہدے سے فارغ ہوئے تھے، ای ایف یو میں اپنے پرانے ساتھیوں کو مبارک باد پیش کی تھی۔ انھوں نے اپنے پیغام میں جہاں بہت سے باتیں کہی تھیں یہ بھی فرمایا تھا کہ '' ای ایف یو کی ایک اور بڑی کامیابی، جس پر یہ ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے ، یہ بھی کہ اس نے اتنے سارے تجربہ کار افراد تیار کیے ہیں جو مقامی اور بین الاقوامی اداروں کے کام آئے ہیں۔ ایک وقت وہ بھی آیا تھا جب پاکستان کی بہت سی بیمہ کمپنیوں کے سربراہ ماضی میں ای ایف یو کے کارکن رہے تھے۔ صرف یہی ایک بات اس ادارے کے لیے ہمیشہ سر اُٹھا کے چلنے کے لیے کافی ہوگی۔ میرے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ میری بیمے کی صنعت میں کاروباری زندگی کا ایک بڑا عرصہ ای ایف یو میں گزرا تھا اور یقیناً وہ عرصہ میری زندگی کا شان دار زمانہ تھا۔ میں آج بھی ایسٹرن فیڈرل خاندان سے قربت محسوس کرتا ہوں۔''

قاضی صاحب راجستھان کے شہر اُدے پور میں پیدا ہوئے اور ای ایف یو میں شمولیت سے پہلے ہی بیمے کی صنعت سے منسلک تھے۔ اپنے مولد میں ابتدائی تعلیم کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے جے پور چلے گئے تھے مگر اپنے والد کی ناوقت موت کی وجہ سے ان پر اپنے خاندان کی کفالت کا بوجھ آ پڑا تھا اور ان کو ملازمت کرنا پڑی۔ ان کے ایک دوست ایک بیمہ کمپنی میں جس کا نام فری انڈیا جنرل انشورنس کمپنی تھا اور جس کا صدر دفتر خان پور میں تھا، برانچ منیجر تھے۔ انھوں نے قاضی صاحب کو اس کمپنی میں اپنی قسمت آزمانے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے اپنے دوست کا مشورہ قبول تو کر لیا مگر ان کے اہلِ خاندان اس ملازمت کے خلاف تھے اس لیے کہ ان کے ہاں کے تقریباً سارے مرد سرکاری ملازمت کو پسند کرتے تھے، یا تو پولیس کے محکمے میں یا پھر کسی اور سرکاری ادارے میں۔ بہر حال، اہلِ خاندان نے آخرِ کار ہتھیار ڈال دیے اور این ای قاضی ایک انشورنس کلرک بن گئے۔

جب ہم ان سے کاروباری مصروفیات کی بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں:

''صرف تین برس کے عرصے میں مجھے کافی ترقی ملی اور میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہو گیا، بلا شبہ اس کامیابی میں میرے دوست کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہاں سچ مچ سب کچھ مجھے بالکل ابتدا سے کرنا پڑا، یہ ایک جامع نوعیت کا دفتر تھا یعنی یہاں جنرل کے علاوہ زندگی کے بیمے کا بھی کاروبار ہوتا تھا۔ لہٰذا مجھے انشورنس کی تمام اقسام کے تجربے کا ایک اچھا موقع ملا تھا۔ میں ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند تک اس ادارے میں بہت خوش تھا۔ میرے تمام اعزہ و اقارب نے ہجرت کا فیصلہ کیا اور سب کراچی میں جا آباد ہوئے۔ میں اجمیر سے ۱۶ ارمیل کے فاصلے پر مقیم رہا اور چوں کہ میرے دوست مجھ پر بہت مہربان تھے اس لیے مجھے ہمت نہیں ہوئی کہ میں ان سے جدا ہوتا اور ایک اَن دیکھے مستقبل کی طرف کوچ کرتا۔ مگر میرے بھائی جو کراچی میں مقیم تھے مجھے تار پر تار بھیجتے کہ میں کراچی آجاؤں اور آخر کار مجھے مجبور ہونا ہی پڑا۔ میں ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچا اور حیدرآباد میں اپنے سسرال میں مقیم ہوا۔ چند دنوں بعد ہی اپنے بھائی اور دوسرے اقربا سے ملاقات کے لیے میرا کراچی جانا ہوا اور مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں ای ایف یو کے دفتر جاؤں۔ ان کے خیال کے مطابق، چوں کہ اس کا دفتر حال ہی میں کلکتے سے کراچی منتقل ہوا تھا اس لیے امکان تھا کہ وہاں ملازمت کے مواقع ہوں۔ ان دنوں ای ایف یو کا دفتر لائڈز بینک بلڈنگ میں تھا اور میں انتظار گاہ میں بیٹھا تھا کہ میرے عم زاد اوپر گئے تاکہ معلومات حاصل کریں۔ قصہ مختصر، تھوڑی ہی دیر میں مجھے اوپری منزل میں طلب کیا گیا اور میری ملاقات جناب اختر آزاد اور مسٹر بیکسٹر سے ہوئی جو اس وقت جنرل منیجر تھے۔ صرف آدھے گھنٹے کے اندر مجھے سینئر کلرک کی ملازمت مل گئی اور اس بات کا امکان بتایا گیا کہ تین ماہ کے عرصے تک میری کارکردگی کو پرکھا جائے گا اور اگر میں ان کی توقعات پر پورا اُترا تو جونیئر افسر کے عہدے پر ترقی مل جائے گی۔ میرے پاس نہ کوئی مدد تھی نہ سفارش پھر بھی وہ سب بہت مہربان تھے، بالخصوص جناب اختر آزاد نے میرے لیے بہت کچھ کیا۔ انھیں مجھ پر بہت اعتماد تھا اور انھوں نے مجھے مختلف قسم کے کام دیے اور سب بڑھ کر بات یہ تھی کہ انھوں نے مجھے ذمے داریاں بھی سونپیں۔ ظاہر ہے کہ وہ میرے کام سے بہت مطمئن تھے اس لیے کہ ملازمت کے ایک سال بعد ہی مجھ کو سینئر آفیسر بنا دیا گیا۔''

جب میں نے ای ایف یو میں ملازمت شروع کی اسی زمانے میں قاضی صاحب ای ایف یو چھوڑ کر مشرقی پاکستان کی بڑی کمپنیوں میں سے ایک، ایسٹرن انشورنس کمپنی میں چلے گئے، جہاں وہ بہت کامیاب رہے۔ پہلے تو وہ کراچی کے دفتر میں منیجر ہوئے اور رفتہ رفتہ مغربی پاکستان کی تمام شاخوں کی نگہداشت کرتے رہے۔ بعد میں وہ جنرل منیجر ہو کر چاٹگام چلے گئے۔ اس کمپنی کے مالکان بہت رسوخ والے تھے اور تقسیم سے قبل بھی سیاست میں نہ صرف عملی حصہ لیتے تھے بلکہ انھیں وزارتیں بھی ملی تھیں۔

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد قاضی صاحب کراچی واپس آگئے اور انھوں نے PIC میں جناب محمد صادق صاحب کی جگہ سنبھال لی جن کا تبادلہ سوڈان ہو گیا تھا۔ بعد میں قاضی صاحب PIC کے چیئرمین کے عہدے پر فائز ہوئے جو اس زمانے کا انشورنس کا سب سے بڑا عہدہ تصور کیا جاتا تھا۔ اپنی تحقیق کے دوران میں نے قاضی صاحب سے بھی رابطہ کیا تھا اور از راہِ مہربانی وہ خود چل کر ہوٹل میں مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے اپنے ای ایف یو کے دوستوں کی بہت تعریف کی۔ ان سے بات کے دوران مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں گوشت پوست میں مجسم انشورنس کی کسی لغت سے مخاطب ہوں۔ جہاں انھوں نے اور باتیں بتائیں، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جب ایک کے بعد دوسرا افسر استعفیٰ دے کر نئی بننے والی کمپنیوں میں بڑے عہدوں پر جا رہا تھا اس وقت کے جنرل منیجر جناب کے ایف حیدر کا ردِعمل کیا ہوتا تھا۔ قاضی صاحب کے مطابق، ''ان دنوں پاکستان میں ای ایف یو ہی سب سے بڑی بیمہ کمپنی تھی اور سارے قابلِ فخر تجربہ کار افسر اسی میں کام کرتے تھے۔ اختر آزاد، ہاشم، تحسین احمد، آغا رضا وغیرہ جن کا سچ مچ انشورنس کی صنعت میں کوئی مقام تھا، ای ایف یو ہی میں تھے اور بالآخر سب ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ اور ایسا لگتا تھا کہ کے ایف حیدر کو کسی کی پروا ہی نہیں۔ انھوں نے کسی کو بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے سب کو کامیابی کی دعائیں دیں۔ ان کے نزدیک پاکستان میں بیمے کی صنعت کی بڑی اہمیت تھی، ای ایف یو سے بھی زیادہ۔ یہ بہت بڑی بات تھی حالاں کہ انھیں معلوم تھا کہ لوگ ان پر اس کمپنی کے مفاد کو نظر انداز کرنے کا الزام دھرتے تھے جس کی بنیاد بھی انھیں کے ہاتھوں رکھی گئی

تھی اور جس کا مفاد ان کے دل سے بھی زیادہ قریب تھا۔ میں نے کبھی اس نوع کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا اس لیے کہ وہ دور اندیشی اور فراخ دلی کے رویّے سے کام لیتے تھے۔ پاکستان میں بیمے کی صنعت پر ان کا بڑا احسان ہے۔ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی تھی کہ ہمارے پاس پاکستان میں بیمے کی صنعت کے اعلیٰ اور بہت اچھے اور تجربے کار افسران تھے۔ مثال کے طور پر 'نیو جوبلی' (اب مسلم) کے سجالی۔ حبیب کے ڈباش، 'پریمئر' کے نورانی اور اے یو صدیقی کے نام میرے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ چودھری نے بھی ای ایف یو سے آغاز کیا تھا۔ اختر آزاد اور ہاشم، جو بعد میں 'مسلم' میں چلے گئے تھے، یہ سب کے سب اپنی کاروباری نشو ونما کے لیے ای ایف یو کے احسان مند تھے۔ صنعت کے زیادہ تر تجربے کار اور اعلیٰ افسران پہلے ایسٹرن فیڈرل میں تھے اور بعد میں نئی بننے والی کمپنیوں میں چلے گئے تھے۔ ہر وہ شخص بیمے کی صنعت پر جس کی گہری نظر ہے بغیر کسی تامل اور تذبذب کے اس بات سے اتفاق کرے گا کہ وہ ایسٹرن فیڈرل ہی تھی جس نے ملک میں بیمے کی صنعت کی تعمیر کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تقسیم کے وقت لاہور کی مسلم انشورنس کمپنی اور ایک چھوٹی سی کمپنی 'کوآپریٹو' بھی تھی مگر اس وقت ایسٹرن فیڈرل ہی حقیقی معنوں میں بڑا اور محکم ادارہ تھا۔ اس لیے کہ ان کی پشت پر نواب بھوپال، آغا خان، حتیٰ کہ نظام حیدرآباد جیسی بڑی رسوخ والی شخصیات تھیں۔ ای ایف یو ہی مسلمانوں کا اصل اور سرخیل ادارہ تھا۔ اور جیسا میں نے ہمیشہ کہا ہے، یہی لوگ بنیاد کار تھے۔

ان میں سے ایک این اے قاضی تھے۔ ایسٹرن انشورنس کمپنی کے سربراہ، PIC کے ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر، NIC کے سربراہ اور پھر انھوں نے ریلائنس کی بنیاد رکھنے میں مدد کی۔ قاضی صاحب ایسے اعلیٰ درجے کے مستعد اور ذمے دار انسان ہیں جس کے پیشِ نظر معیار سب سے پہلی چیز ہوتا ہے۔ اور ان کی یہ بھی خوبی ہے کہ وہ دوسروں کے نکتہ ہائے نظر کا احترام بھی کرتے ہیں بشرطے کہ وہ بنیادی طور پر حقیقت اور اعداد و شمار پر مبنی ہوں۔

جب میں بیمے کی صنعت کے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں، اور پانچویں عشرے اور چھٹے عشرے میں قائم ہونے والی نئی کمپنیاں جیسے 'نیو جوبلی'، 'پریمئر'، 'آدمجی'، 'سینٹرل'، 'ایسٹرن' اور 'یونائیٹڈ' وغیرہ کا خیال آتا ہے تو انھوں نے جن جن افراد کا تذکرہ کیا، تقریباً سب ہی میرے ذہن کے پردے پر ابھرتے آتے ہیں۔ ان ساری کمپنیوں اور افراد ہی نے مل جُل کر پاکستان میں بیمے کی صنعت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا ہے۔

ان ناموں میں سے کچھ کی شخصیتوں، کردار اور کارکردگی پر میں آگے چل کر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ میں ان لوگوں سے تہِ دل سے معذرت چاہوں گا جن کے تذکرے رہ جائیں اس لیے کہ اگر سب کا تذکرہ کیا جائے تو خود اس کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی۔

محمد چودھری

محمد چودھری کی منفرد کارکردگی کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی وہ پریمئر کے منیجر تھے اور ان کو بیمے کی دنیا میں Marine اور Hull کا سب سے ماہر انڈر رائٹر مانا جاتا تھا۔ اب تو وہ بہت آگے جا چکے ہیں اور جس طرح انھوں نے 'اپنی' آدمجی انشورنس کو بامِ عروج پر پہنچایا ہے اس کی مثال نہیں ملتی اور یہ بڑا کارنامہ ہے، اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ان کے مخالفین نے بھی ان کی کامیابی کا اعتراف کیا ہے۔

محمد چودھری آسام میں پیدا ہوئے، کلکتہ یونی ورسٹی میں فلسفہ پڑھا، تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل ۱۹۴۷ء میں انھوں نے بی اے آنرز کیا۔ میں جب اگست ۱۹۹۷ء میں ان کے دفتر میں ملاقات کے لیے پہنچا تو انھوں نے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بتایا، ''میں نے ایسٹرن فیڈرل میں یکم ستمبر ۱۹۴۷ء سے فروری ۱۹۴۹ء تک ملازمت کی تھی۔'' میں ان سے درجنوں بار مل چکا ہوں مگر یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ان سے خصوصی طور پر ای ایف یو سے رشتے اور اس سے منسلک یادوں کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ انھوں نے بڑی فراخ دلی اور گرمجوشی سے جواب دیے تھے اور اس گرمجوشی میں شاید ہمارے چالیس برس کے ذاتی تعلقات اور سلام دعا کا بھی دخل رہا۔ انھوں نے کہا، ''میرے ایک چچا

ایسٹرن فیڈرل میں سیلز آفیسر کے طور کام کرتے تھے اور انھیں نے مجھے اس ادارے سے متعارف کرایا۔ تھا۔ انھوں نے کمپنی کو ایک درخواست لکھ کر بھیجی اور فوراً مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ ان دنوں کمپنی کا دفتر ایک عمدہ عمارت، اسٹینڈرڈ بلڈنگ، کلکتے میں ڈلہوزی اسکوائر، دوسری، منزل پر واقع تھا۔ میرا تعارف جناب ایم اے ہاشم سے کرایا گیا جو میرین کے سپرنٹنڈنٹ تھے، اور جناب مقبول انصاری سے جو فائر ڈپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انھوں نے مجھے کمپنی کے ڈپٹی جنرل منیجر Mr Spooner کے پاس بھیجا۔ انھوں نے مجھ سے کچھ مشکل نوعیت کے سوالات کیے جواب مجھے یاد نہیں اور چند لمحوں بعد انھوں نے فرمایا کہ مجھے ملازمت دی جا رہی ہے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بجے تھے۔ ہندوستان کے بٹوارے کی خبر آ چکی تھی۔ میرے والدین اس وقت آسام میں تھے اور میں نے ان کو بتایا کہ میں اس وقت ایک افراتفری کی کیفیت میں تھا۔ یہ سن کے مجھے بڑی حیرت ہوئی جب انھوں نے کہا کہ میں یہ ملازمت فوراً شروع کر سکتا ہوں۔ اس طرح ساڑھے دس بجے میں ملازمت شروع کر چکا تھا۔ وہاں کام کرنے والے بڑے ملنسار تھے۔ کچھ نے تو مجھے ایسی نظروں سے دیکھا گویا وہ میری تعلیمی قابلیت سے کچھ مرعوب نہ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روایتی طور پر ان جیسے، یعنی دفتری کلرک، لوگوں کے نزدیک اعلیٰ تعلیم سے زیادہ تجربہ اہم ہوتا تھا۔ جب میں نے چیف کلرک کو، جنھیں اِندو بابو کے نام سے پکارا جاتا تھا، بتایا کہ میں فلسفے میں بی اے کا امتحان دے کر فارغ ہوا ہوں، انھوں نے فوراً کہا، ''تم فلسفے میں بی اے آنرز کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' میں نے جواب دیا، میں نے کمپنی کی ملازمت اختیار کر ہی لی ہے، لہٰذا مجھے بتایئے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں نے انشورنس کا آدمی بننے کا ارادہ کر لیا ہے اور میرے خیال میں یہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔ اور جہاں تک میری تعلیمی قابلیت کا سوال ہے تو میں اسے عقل مندی سے استعمال کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہمارے آپس کے تعلقات بہتر ہو گئے، حالاں کہ سب ہمہ وقت بنگالی زبان میں بات کرتے اور میں اس میں اتنا ماہر نہیں تھا۔ پہلے تو مجھے ری انشورنس ڈپارٹمنٹ میں پھر فائر ڈپارٹمنٹ میں تعینات کیا گیا۔ اور جب انھیں معلوم ہوا کہ میری انگریزی کچھ زیادہ ہی اچھی ہے تو مجھے خط کتابت پر لگا دیا گیا۔ مختلف نوعیت کے کام کرنے کی وجہ سے میری تربیت اچھی ہوگئی اور مجھے ہر طرح کے کام دیے جانے میں اپنا فائدہ ہی نظر آیا۔ اس کو پڑھنے والے لوگوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ طرح طرح کے کام دیے جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے کہ اس طرح میں بہت کچھ سیکھ سکوں گا۔ میری سب سے بڑی ذمے داری یہ تھی کہ مجھے کمپنی کے کھاتے داروں سے معاملت کرنا تھی۔ میرے سینئر ساتھی مجھ کو بنگالی زبان میں بتاتے کہ وہ کھاتے داروں سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں، اور میرا کام یہ تھا کہ میں کمپنی کا مدعا انگریزی میں لکھ دوں۔ اگر کھاتے دار کی جانب سے منفی جواب آتا تو مجھے ڈانٹا جاتا کہ میں نے کھاتے داروں کو ای ایف یو کی تجاویز کو بہتر طور پر سمجھایا نہیں۔ تو میں بیٹھ کر غور کرتا، دوبارہ لکھتا اور بالآخر مطلوبہ نتائج نکل آتے۔ ایک اور بات تھی جس کا مجھے جلد احساس ہو گیا تھا کہ وہ لوگ جو میرے استاد تھے وہ انشورنس کے عملی پہلو سے بخوبی واقف تھے مگر ان کو تھیوری کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ فائر انشورنس کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ انھیں معلوم تھا کہ پٹ سن کے گوداموں کو فائر انشورنس کی ضرورت ہوتی ہے مگر وہ اس سے منسلک دوسرے خطرات کا ادراک نہیں کر پاتے تھے۔ ان دنوں کلکتے میں فسادات ہو رہے تھے مگر فسادات کی صورت میں ہونے والے نقصانات کا بیمہ نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر میرا کھوجی ذہن مجھ سے سوال کرتا کہ ہماری کمپنی فسادات میں ہونے والے نقصانات کا بیمہ کیوں نہیں کرتی۔ سیلاب آتے تھے تو پھر سیلابی نقصانات کا بیمہ کیوں نہیں کیا جاتا۔ ری انشورنس کے بہی کھاتوں پر کام کے دوران میں نے دیکھا کہ خال خال موقعوں پر اس قسم کے بیمے دیے جاتے رہے ہیں، تو بڑے پیمانے پر ایسا کیوں نہیں کیا جاتا؟ میں نے اس بات کا تذکرہ اپنے سینئر لوگوں سے کیا اور بالآخر انصاری صاحب سے بھی بات کی۔ انھوں نے میری بات کو بہت سراہا اور شکایتاً کہا کہ کسی نے پہلے اس طرح کیوں نہیں سوچا۔ انھوں نے بلند آواز میں کہا، ''مجھ سمیت ہم سب کو شرم آنی چاہیے۔ اس نوجوان کو کمپنی میں آئے ہوئے ابھی صرف دو ماہ ہوئے ہیں اور یہ ہم سب کو بتا رہا ہے کہ ہمیں پانچ دس برس پہلے سے کیا کچھ کرنا چاہیے تھا۔''

جب محمد چودھری نے یہ واقعہ بیان کیا تو ان کی آنکھوں سے جذبات کے شعلے نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کو یہ کہتے ہوئے بہت مسرت ہو رہی تھی کہ اپنے پیشے کی ابتدا ہی سے وہ دوسروں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں سے چند قدم آگے ہی رہیں گے۔ انھوں نے ای ایف یو کے چیئر مین سے اپنی پہلی ملاقات کی خوب صورت کہانی بھی سنائی جس کو میں نے ان کے خاکے میں درج کیا ہے۔ اور انھوں نے کمپنی میں کام کرنے والے افسران کے لیے توصیفی کلمات بھی کہے۔ ''ایسٹرن فیڈرل کے پاس عمدہ افسروں پر مشتمل جماعت تھی۔'' انھوں نے کہا، ''ایک نوجوان کی حیثیت سے ان میں سے کئی سے میں بہت متاثر تھا۔ لیکن جس بات نے مجھے زیادہ متاثر کیا تھا وہ یہ تھی کہ کمپنی کو تمام بڑی انگریزی کمپنیوں کے نمونے پر استوار کیا گیا تھا۔ ان کے بورڈ کے ڈائریکٹروں میں بہت معروف وممتاز لوگ شامل تھے۔ کمپنی مقبول تھی۔ بہت مقبول۔ مجھے زندگی کے بیمے کی بابت زیادہ معلومات نہیں تھیں مگر کم از کم جنرل بیمے کے لیے وہ بہت ہی مقبول کمپنی تھی۔ مگر جو بات مجھے پسند نہیں آئی وہ اس کے رجسٹرڈ دفتر کی چاٹگام منتقلی اور کمپنی کا پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ تھا۔ اس میں مجھے کوئی عقل مندی دکھائی نہیں دی، کم از کم اس زمانے میں۔ ذاتی طور پر میں یہی پسند کرتا کہ کمپنی کلکتے ہی میں رہتی، ایک ہندوستانی کمپنی کی حیثیت میں اس لیے کہ جنھوں نے اس کی تشکیل کی وہ سب ہندوستان ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ جن لوگوں نے اس میں بڑی مالی شمولیت کی، جیسے نواب بھوپال، وہ ہندوستان ہی میں رہے، یا نظام حیدر آباد۔ میرے اپنے خیال کے مطابق کمپنی موقعے سے بھاگ رہی تھی، اس میں شک نہیں کہ چند برسوں بعد اس کو قومی ملکیت میں لے لیا جاتا مگر اس وقت تک تو کسی کو اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ میرا تبادلہ ڈھاکا یا چاٹگام کر دیا جائے گا۔ میں اس کے خلاف تھا۔ میں کراچی جانا چاہتا تھا مگر انھوں نے اصرار کیا کہ میں بنگال ہی میں رہوں، چاٹگام یا ڈھاکے میں۔ مگر میں تو شہری آدمی ہوں۔ میں ای ایف یو میں کلکتے ہی میں رہتا۔ مگر چوں کہ میرے پاس کمپنی کو خیر باد کہنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ مجھے کمپنی کے کسی آدمی سے کوئی شکوہ نہ تھا، بس ان کے کلکتے سے نکل جانے کے فیصلے سے اتفاق نہیں تھا۔ اس وقت بہت سی باتوں کا مجھے ادراک نہیں تھا جو بعد میں میری سمجھ آئیں''۔

یہ تھا محمد چودھری کا ای ایف یو کے اسٹیج پر ظہور۔ انھوں نے کلکتے میں 'نارچ یونین' مین ملازمت کرلی، مزید تربیت کے لیے بمبئی بھیجے گئے اور پھر پاکستان کے نئے دارالحکومت میں کمپنی کی شاخ کھولنے کے لیے ان کو کراچی تبدیل کر دیا گیا۔ یہ مارچ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے، عین اس زمانے کا جب ان کے ای ایف یو کے پرانے ساتھی کلکتے سے کراچی پہنچے تھے۔ وہ ۱۹۵۲ء تک 'نارچ یونین' میں رہے۔ انھی دنوں اسٹیٹ بینک کے پہلے گورنر جناب زاہد حسین نے ان کو اپنے گھر بلایا اور 'پریمیئر انشورنس کمپنی' میں شمولیت پر اکسایا اور وہ راضی ہوگئے۔ انھوں نے اسسٹنٹ منیجر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی اور یہ ان کا پہلا منیجری کا عہدہ تھا۔ ''اس کے بعد سے'' مسکراتے ہوئے محمد چودھری نے کہا، جب میں اور وہ ان کے دفتر سے ملحق کھانے کے کمرے میں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے'' میں نے مرحلہ وار ترقی کی ہے، پہلے پریمیئر انشورنس کمپنی کا جنرل منیجر بنا اور اس کے بعد، جو کچھ آج میں ہوں۔''

ایم اے چشتی

میں نے جناب چشتی کا پہلے بھی تذکرہ کیا ہے، وہی ایم اے چشتی جو آج کل نسبتاً ایک چھوٹی پاکستانی کمپنی ڈیلٹا انشورنس کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ یہ پاکستان میں انشورنس کے ان بزرگ اعلیٰ افسروں میں سے ہیں جو اس صنعت کے اوّل وقت سے اہم رہے ہیں اور جن کو بہت احترام اور توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اجمیر کی پیدائش، آگرہ یونی ورسٹی کے گریجویٹ مشکور چشتی نے بھی اپنا پیشہ ورانہ سفر ایسٹرن فیڈرل میں ایک جونیئر آفیسر کی حیثیت سے ۱۹۴۷ء میں شروع کیا تھا۔ وہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کراچی آچکے تھے مگر، جیسا کہ انھوں مجھے بتایا، وہ اپنا شہر اجمیر چھوڑنے پر بالکل خوش نہیں تھے۔ ''یہ شہر سات سو برس سے زیادہ قدیم ہے۔'' انھوں نے کہا، جب پاکستان کی پچاسویں

سال گرہ کے دن، ۱۴ر اگست ۱۹۹۷ء کو ان سے ملنے گیا۔ قدرتی طور پر ہم نے تقسیم کے دنوں کے بارے میں اور ان کے اپنے مولد کو چھوڑ نے کے بارے میں باتیں کیں۔ ''میں نے اس شہر کو بہت یاد کیا، جو بہت مشہور ہے، جس کو سارے مسلمان جانتے ہیں جہاں ایک مشہور صوفی خواجہ معین الدین چشتی دفن ہیں اور میرے خاندان کے بزرگ جس سے وابستہ رہے ہیں۔ ۶ر رجب کو، صوفی صاحب کی برسی پر پورے ہندوستان، سری لنکا، برما اور دنیا کے بہت سے ملکوں سے لوگ ان کے مزار پر حاضری دینے کے لیے جوق در جوق آتے ہیں۔ میں بھی ذاتی طور پر اس مقام سے تقرب رکھتا ہوں۔ ہاں اجمیر اور اپنے خاندان کے ایک بڑے حصے کو چھوڑنا میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا اس لیے کہ میرے والد اور بڑے بھائی نے آگرہ نہیں چھوڑا۔ میرے ایک اور بھائی نے جو عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے، ہجرت کا فیصلہ کیا اور ان کے ہمراہ میں نے ہجرت کی۔ کراچی آ کر میں نے ملازمت کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا اور کامیاب ہوا۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں نے ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی میں جونیئر آفیسر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کر لی۔ اس وقت ای یف یو، حبیب انشورنس اور اسکاٹش یونین انشورنس کی مشترکہ شاخ ہوا کرتی تھی جس کے منتظم جناب اختر آزاد تھے۔ مجھے حادثاتی بیمے کی ذمے داری سونپی گئی، جو اس زمانے میں زیادہ تر موٹر کے بیمے پر مشتمل تھی۔ ۱۹۴۸ء تک Mr John Plump لندن سے اسکاٹش یونین انشورنس کے جنرل منیجر کے عہدے پر تعینات ہو کر آ گئے اس طرح میں نے کچھ دن تین افسروں کی ماتحتی میں کام کیا، ای ایف یو کے جناب اختر آزاد، مسٹر پلمپ اور حبیب انشورنس کے منتظم۔ یہ مرحلہ اس وقت اختتام کو پہنچا جب ۱۹۴۹ء میں ای یف یو کا صدر دفتر کلکتے سے کراچی منتقل ہو گیا اور ہم، یعنی کراچی شاخ کے تمام کارکنان کے ساتھ لائڈز بینک بلڈنگ، میکلوڈ روڈ، منتقل ہو گئے۔ یہ عمارت اب بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے، شاید اس میں موجود لفٹ بھی وہی ہے۔ سو وہ سب آ گئے، مسٹر بیکسٹر، مسٹر آئیون سمیت۔ ایک اور عظیم اور معروف شخصیت، جناب شعیب قریشی، کچھ دنوں کے لیے ای ایف یو کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر رہے۔ مجھے اپنے کام میں بہت مزہ آ رہا تھا اور یقین تھا کہ میرا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔ لیکن اچانک اصفہانی صاحب کے ایک رشتے دار اور شیرازی صاحب کے بھی ایک عزیز جونیئر آفیسر بنا دیے گئے اور جلد ہی دونوں کو سینئر آفیسر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی مگر دونوں میری ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ میں نے بارہا اس بے ضابطگی کے بارے میں، جو جاگیرداری کے دور کی یادگار لگتی تھی، انتظامیہ کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی مگر ایسا لگتا تھا کہ کوئی پرسانِ حال نہیں۔ میرے لیے کوئی اور راستہ نہیں تھا اور نہایت افسوس کے ساتھ ای ایف یو کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔''

اس کے بعد کچھ دنوں چشتی صاحب نے لندن لنکا شائر اور امریکن انٹرنیشنل انڈر رائٹرز میں کام کیا کہ جن کے دفاتر لاہور میں تھے۔ اس کے بعد ان کو ایمپلائرز لائبلیٹی انشورنس نے، جو ان دنوں بہت مشہور کمپنی ہوا کرتی تھی، ایک پُرکشش پیشکش کی جو قبول کر لی گئی۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں شروع ہونے والی انضمام کی سیلابی لہروں نے سب کچھ اتھل پتھل کر دیا اور ۱۹۶۳ء تک یہ سب برطانوی کمپنیاں نار درن کمرشل یونین گروپ میں ضم ہو کر یکجان ہو گئیں۔

چشتی صاحب اس کو اپنی خوش قسمتی گردانتے ہیں کہ اس وقت نیو جوبلی کے جنرل منیجر جناب ایس سی سجالی کو لاہور کے لیے ایک زونل منیجر کی تلاش ہوئی اس لیے کہ اس عہدے پر فائز جناب محمد اسحٰق خان کو اس وقت کے نہایت فعال اور طاقتور کنٹرولر آف انشورنس آنجہانی زال کانٹریکٹر نے مسلم انشورنس کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا تھا۔ تو جناب سجالی نے یہ عہدہ چشتی صاحب کو پیش کیا اور انھوں نے بخوشی قبول کر لیا۔ ۱۹۶۵ء میں ان کو کراچی طلب کیا گیا اور پورے مغربی پاکستان کے لیے منیجر بنا دیا گیا، جس عہدے پر ان کو بہت لطف آیا۔ ۱۹۶۸ء میں اسٹینڈرڈ بینک نے اپنی انشورنس کمپنی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چشتی صاحب بینک کے مالکان کے خاندان کے بہت قریب تھے اور ان کو نئی کمپنی کے منیجنگ ڈائریکٹر کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ زندگی کے بیمے اور بڑے بینکوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد چشتی صاحب نے اسٹینڈرڈ انشورنس میں رہنا مشکل پایا اور انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اپنی ملازمتوں کی دل چسپ اور رنگین تصویریں بناتے ہوئے چشتی صاحب نے

فرمایا، ''لہٰذا جناب سجالی کو میرے استعفے کی خبر ملی، انھوں نے فوراً مجھ سے رابطہ کیا اور میں نے ستمبر ۱۹۷۵ء میں دوبارہ نیو جوبلی میں شمولیت اختیار کر لی جو ۱۹۸۱ء تک چلی جب مجھے مسلم انشورنس میں جنرل منیجر بننے کی پیشکش ہوئی، جو میں نے قبول کر لی۔ ۱۹۸۷ء میں پرائم انشورنس کی باگ ڈور میرے ہاتھوں میں آ گئی جو اب ڈیلٹا انشورنس کے نام سے جانی جاتی ہے۔''

انشورنس کی صنعت کے لیے اور اس کو پاکستان کے عوام میں مقبول بنانے کے لیے چشتی صاحب ہمیشہ آگے آگے رہے ہیں۔ اور انھوں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ پاکستان کی مقامی بیمے کی صنعت کو مزید ترقی کرنا چاہیے تا کہ یہ بین الاقوامی معیار پر پہنچ سکے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے چار برس کے لیے پاکستان انشورنس انسٹی ٹیوٹ کا صدر بننا قبول کیا جس کے وہ بڑے پُر زور حامی رہے ہیں۔ اس دوران انھوں نے انسٹی ٹیوٹ کے لیے مالی امداد کے لیے بہت دوڑ بھاگ کی تا کہ ناکافی تعلیمی سہولیات میں بہتری پیدا کی جا سکے۔ پھر یوں ہوا کہ تعلیم کے میدان میں جد و جہد کرتے والی اور دور رس نگاہیں رکھنے والی شخصیت کے حامل مسٹر جسٹس میاں محبوب احمد نیشنل انشورنس ریفارمز کمیشن کے چیئر مین بنا دیے گئے اور انھوں نے انشورنس انسٹی ٹیوٹ کو مالی امداد فراہم کرنے میں چشتی صاحب کی مدد کی۔

ایم اے چشتی، انتھک محنت کرنے والے اور تنقیدی ذہن کے مالک انسان ہیں۔ اور صنعت کے میدان میں ایسی غیر پیشہ ورانہ حرکتوں کے سخت مخالف جن سے بیمے کی صنعت کا وقار مجروح ہو اور اس کی اخلاقیات پر حرف آئے۔ اس لیے کہ بالخصوص یہ صنعت صرف کاروبار ہی نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت بھی کرتی ہے اس لیے غیر پیشہ ورانہ کام کرنے والے عاملین کے سخت خلاف رہتے ہیں۔ اور ایسی شخصیتوں سے کبیدہ خاطر رہتے ہیں جو صرف اپنے ادارے کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ''میرا ضمیر مجھے کسی اور طرح کا کام کرنے پر ملامت کرتا ہے۔ ہماری صنعت کے بہت سے لوگ مجھ سے خفا رہتے ہیں اس لیے کہ میں صاف گو انسان ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ میں لگی لپٹی کے بغیر اپنی بات کہتا رہتا ہوں، لکھتا ہوں اور اسی طرح لکھتا رہوں گا۔ تا کہ یہ صنعت عوام کے ذہنوں میں پھلتی پھولتی رہے، اس کے گاہکوں کو صحیح قسم کے اشارات ملتے رہیں، اور حکومت کو معلوم ہو کہ یہاں بیمے کی ایسی صنعت ہے جو فعال بھی ہے اور اپنے فرائض بھی پورے کر رہی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اس صنعت میں مجھ سے زیادہ بزرگ شخصیتیں بھی، صرف عمر ہی میں بزرگ نہیں، موجود ہیں جیسے جناب روشن علی بھیم جی، محمد چودھری، روسی ڈُباش، اے یوصدیقی، اور ایس سی سجالی۔ مگر یہ سب نہ اتنی مصیبت اُٹھاتے ہیں نہ ان کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ عوام میں اور بیمے داروں میں، بیمے کی صنعت کو فروغ دینے اور اس کا وقار بڑھانے کے لیے کام کرتے رہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں سے کچھ نے ماضی میں اس نوع کے کام کیے ہیں۔''

ایم اے چشتی نے صنعت کی بڑی کمپنیوں کی سر براہی نہیں مگر یقیناً وہ اس کے سب سے طاقتور ترجمان رہے ہیں۔ انھوں نے کئی بار زخموں کو کُریدا ہے اور ممکن ہے کہ کبھی ان کے خیالات حقیقت پسندانہ بھی نہ رہے ہوں، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے بیمے کی صنعت کی طرف عوام کی توجہ دلانے کے لیے بڑے مصائب جھیلے ہیں، جن سے اس صنعت کو ترقی کے مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ صنعت ان کی مقروض ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس خیال سے اور لوگ بھی متفق ہوں گے۔

ایس سی سجالی

بیمے کی صنعت کی ان روایتی بلند قامت شخصیتوں میں سے، ایک 'ماموں' سجالی بھی ہیں جنھوں نے پچھلی صدی کے پانچویں عشرے میں پاکستانی بیمے کی صنعت کو ایک منفرد انداز فراہم کیے ہیں۔ سجالی نے بمبئی کے ایک تاجر گھرانے میں آنکھ کھولی اور وہیں تعلیم بھی پائی۔ اگست ۱۹۹۷ء میں ان سے ملاقات کے دوران انھوں نے بتایا کہ ان کے دادا ''برطانیہ کے خطاب یافتہ طبقۂ امرا میں سے ایک تھے، یعنی پہلے مسلم Baronet تھے۔ ان دنوں وہ کئی ٹیکسٹائل ملوں کے مالک تھے مگر اُسی وقت تک ہمارے اچھے دن تھے۔ جب میری عمر صرف چودہ برس

کی تھی، ان کا سارا کاروبار تباہ ہوگیا اور قرض خواہوں کی ادائیگی کے لیے انھیں اپنے تمام اثاثے فروخت کرنے پڑے۔ ۱۹۴۵ء تک میں اپنی تعلیم ختم کر چکا تھا، میں نے 'Higher Maths' میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور برٹش انڈیا اینڈ جنرل انشورنس میں ملازمت کر لی تھی۔ مجھے اچانک کالج سے نکال لیا گیا تھا۔ یہ بھی ایک دل چسپ قصہ ہے۔ میں اپنا ماسٹرز ختم کر چکا تھا اور بازاروں میں آوارہ گردی کر رہا تھا کہ اس کمپنی کے چیئر مین اور نہایت نفیس انسان جناب اسمتھ سے ملاقات ہوگئی، جو میرے والد کے ساتھ برج کھیلا کرتے تھے۔ اس طرح وہ مجھ سے واقف تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کالج سے نکلنے کے بعد کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے اس لیے کہ میں نتیجے کا انتظار کر رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے اپنی کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں یہ سمجھتے ہوئے بیٹھ گیا کہ وہ مجھ کو دوپہر کے کھانے کے لیے میرے گھر تک پہنچا دیں گے جو وہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ بجائے گھر چھوڑنے کے وہ مجھے سیدھے اپنے دفتر لے گئے اور ایک بزرگ پارسی مسٹر دستور سے متعارف کرایا جو BIG کے جنرل منیجر تھے۔ مسٹر اسمتھ نے دستور صاحب سے کہا، 'آپ اپنے لیے ایک معاون ڈھونڈ رہے تھے، یہ رہے میرے دوست سجالی کے بیٹے، ان کو رکھ لیجیے۔ میں اس کو جانتا ہوں، اچھا لڑکا ہے، میں اس کے باپ سے بھی واقف ہوں۔ بس اسی طرح میرے پیشے کی شروعات ہوئی، صرف اسی طرح۔''

یہ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ کمپنی نے پہلے میری تربیت بمبئی میں کی اور اس کے بعد مجھے زیرِ تربیت جونیئر آفیسر کی حیثیت سے دوسرے شہر کی ایک چھوٹی سی شاخ میں تعینات کر دیا۔ ایک دن اچانک مجھے جنرل منیجر کی جانب سے ایک ٹیلی گرام ملا، ۱۰/ اگست ۱۹۴۷ء کے آس پاس، جس میں مجھے فوراً بمبئی واپس پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ میں بمبئی پہنچا تو حکم ملا کہ میں سیدھے کراچی پہنچ جاؤں جہاں ہماری کمپنی کی ایک شاخ کام کر رہی تھی اور مجھے اس کا انتظام سنبھالنے کے لیے کہا گیا، اس لیے کہ کراچی تین چار دنوں کے اندر پاکستان کا دارالحکومت بننے والا تھا۔''

''ہماری کمپنی کے چیئر مین کپاس کے بیوپاری تھے۔'' ماموں نے اپنی یادداشت کو کھنگالتے ہوئے بتایا، ''ان کے جننگ کے بہت سے کارخانے تھے۔ اور وہی لوگ، برٹش انڈیا اینڈ جنرل انشورنس کمپنی کی، جس کو BIG کہا جاتا تھا بنیاد رکھنے میں پیش پیش تھے۔ سندھ میں بھی ان کے کافی مفادات تھے اس لیے کہ وہ بنیادی طور پر کپاس کے بیوپاری تھے۔ سو یوں ہوا کہ وہ سارے ہندو لوگ جو جننگ کے کارخانے چلاتے تھے، حتیٰ کہ وہ بھی جو اس کمپنی کے مقامی کرتا دھرتا بھی تھے اچانک بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ سب فسادات کی وجہ سے بھاگ گئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ میں اچانک بھیجا گیا تھا اور اس طرح میں نئی مملکت، پاکستان، کے دارالحکومت کراچی میں تھا۔ یہ بڑا دل چسپ زمانہ تھا۔ رہنے کی جگہ ایک مسئلہ تھی۔ لہٰذا میں ایک خیمے میں قیام پذیر ہوا، بیچ لگژری ہوٹل کے بالکل سامنے، جو اس وقت تعمیر کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ مجھے اتنا یاد نہیں کہ کتنے دن میری اس طرح گزری تھی۔ مسٹر ہاورڈ اسٹیفرڈ ان دنوں انشورنس ایسوسی ایشن کے سیکریٹری تھے اور وہ ایچ اے مہتا کمپنی کے منیجر کے فلیٹ میں مقیم تھے۔ جب وہ چلے گئے تو رہنے کے لیے یہ فلیٹ مجھ کو مل گیا۔ وہ فلیٹ سولجر بازار میں تھا۔ یہ تھی میری ہجرت کی داستان۔ اس وقت بھی ہم بمبئی کے دفتر کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ مگر پھر اچانک ایک نئے صاحب کلکتے سے آئے اور انھوں نے کمپنی کو non-tarrff کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ فیصلہ میرے مزاج کا نہیں تھا اس لیے میں نے کوئی اور ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہی وہ وقت تھا جب میری ملاقات امیر علی فینسی صاحب سے ہوئی۔ وہ بمبئی میں ہمارے پڑوسی تھے اور افریقا سے واپس آئے تھے۔ وہ ہز ہائینس آغا خان سے بہت قریب تھے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ جلد ہی وہ 'نیو جوبلی' نام کی ایک نئی پاکستانی کمپنی کھولنے والے ہیں اور انھوں نے مجھے اس کی سربراہی کی پیش کش کر دی۔ میں نے یہ پیش کش فوراً قبول کر لی اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں بہت دنوں تک اس میں رہا۔''

ہاں! جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی وہ نیو جوبلی کے چیف ایگزیکٹیو تھے۔ وہ میری ہی عمر کے تھے، ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء میں نئی نئی بننے والی کمپنیوں کے نوجوان، تیز طرار اور ابھرتے ہوئے ایگزیکٹیو کی طرح۔ اور اکثریت کی طرح وہ بہت متحرک اور کام میں لطف

اٹھانے والے تھے، جو جدید اندازِ انتظام کے قائل تھے جس کا انھیں اس وقت تجربہ ہوا جب وہ اعلیٰ انتظامی تربیت کے لیے برطانیہ اور ہارورڈ، امریکا گئے تھے۔ اچھے دنوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے ماموں اپنی یادوں کی وادیوں میں بھٹکتے رہے۔ جب بھٹو نے قومی ملکیت میں لینے والی عوامی تحریک شروع کی، دوسروں کی طرح ماموں بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ ان جیسے لوگوں کے لیے اب کوئی مستقبل نہیں اور وہ بھی اس زمانے ۱۹۷۰ء (ساتویں عشرے) میں ملک سے باہر' قابلیت کے بہاؤ' کے ریلے میں بہہ کر دبئی جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے کئی اہم ملازمتیں کیں اور جب ان کے بچے پڑھ لکھ کر دوسرے ملکوں میں مستقل قیام پذیر ہو چکے تو انھوں نے پاکستان واپس آنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب وہ مسلم انشورنس کے چیف ایگزیکیٹو ہیں اور ان کے اپنے الفاظ میں happy to be back home۔

وہ گھر واپس آ کے خوش ہیں مگر یک گونہ اُداس ہو جاتے ہیں جب میں ان سے انشورنس میں کام کرنے کے موجودہ حالات کے بارے میں سوال کرتا ہوں جو اس وقت کے مقابلے میں بہت بدل چکے ہیں جب وہ پاکستان سے امارات چلے گئے تھے۔ ماموں کے الفاظ میں ''اب مارکٹ بہت بدل چکی ہے، اس زمانے کے مقابلے میں جب ہم اور تم، چھٹے اور ساتویں عشرے میں، ایک ساتھ تھے۔ وولفرام، تمھیں تو یاد ہوگا نا، جب تم یہاں تھے تو ہم لوگ اکٹھے لنچ کیا کرتے تھے۔ تم، کبھی روشن علی بھیم جی کے ساتھ، حبیب کے لوگ وغیرہ اور میں۔ ہم سب گویا ایک کلب کے ممبر کی طرح تھے۔ اور کبھی دوستوں کی طرح۔ مگر آج اس طرح ہم، اعلیٰ سطح پر، بھلا کتنی بار ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ میں ایک اور مثال دوں گا جس کو سن کر تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ جب میں انشورنش ایسوسی ایشن کا چیئر مین تھا اور ہمیں وزارت کے افسروں سے ملاقات کے لیے جانا تھا، میں کے ایف حیدر کے پاس گیا اور ان سے ساتھ چلنے کے لیے کہا، اور وہ فوراً تیار ہو گئے۔ انھوں نے صرف اتنا کہا' ہاں، ماموں ضرور چلوں گا مگر خیال رکھنا وہ جگہ نچلی منزل ہی میں ہو۔ وہ آسانی سے طرح دے سکتے تھے۔ میں ان کے مقابلے میں کم عمر تھا۔ اگر قومی معاملات ہوتے، وزارت یا پی آئی سی، وہ ہمیشہ ساتھ جاتے۔ انھوں نے یا مسٹر ایوان نے کبھی معاملات کو صرف ای ایف یو کے پہلو سے نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ وسعتِ نظر سے دیکھا تھا۔ اور وہی طریقہ، بلکہ اس بھی زیادہ قوت والا انداز روشن علی بھیم جی نے اپنایا جب وہ ای ایف یو میں شامل ہوئے تھے۔ وہ اس صنعت کی بڑی توانا آواز بن کر ابھرے تھے۔ ہم لوگوں کا انداز متعصبانہ کبھی نہیں رہا تھا، اور ہم نے ہمیشہ پاکستانی کمپنیوں کو سہارا دینے کے بارے میں سوچا تا کہ مارکٹ کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے ان کو استحکام ملے، تم بھی تو اس میں شریک رہتے تھے۔ اس دور میں حکومت بھی ہمیں سہارا فراہم کرتی تھی۔ تمھیں تو یاد ہوگا غلام فاروق کا زمانہ، اور کس طرح آدمجی انشورنس کمپنی شروع ہوئی تھی؟ میں تمھیں یاد دلاتا ہوں۔ ہم سب، انشورنس کے افسران اور کچھ سر برآوردہ صنعتکار، غلام فاروق کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ غلام فاروق اس وقت ایوب خان کے ماتحت وزیرِ تجارت تھے۔ اور آدمجی خاندان سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ سو، انھوں نے دونوں آدمجی برادران سے کہا، جہاں تک میری معلومات ہیں آپ لوگ اپنا سارا بزنس 'رائل ایکس چینج' کو دیتے ہیں۔ آدمجی برادران نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا، وہ یہ تو پچھلے چالیس پچاس برسوں سے کر رہے ہیں، تو اچانک ہم اس کو کیسے بدل سکتے ہیں؟ مگر فاروق نے جواب دیا کہ وہ کوئی عذر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اور کہا، یا تو آپ لوگ اپنی کمپنی بنائیں یا پھر اپنا سارا بزنس کسی پاکستانی کمپنی کو دیں۔ اگر آپ نے یہ نہیں کیا تو میں آپ کے ادا کیے ہوئے پریمیم پر ٹیکس کی چھوٹ دینے کی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ اس کو جمہوری طریقہ نہیں کہہ سکتے مگر حقیقتاً اسی طرح آدمجی انشورنس کمپنی وجود میں آئی تھی۔ اور یہی کچھ طریقہ داؤد خاندان کے ساتھ ہوا اور ان کی سنٹرل انشورنس کمپنی وجود میں آئی۔ اسی طرح کام ہوتے تھے اور لوگوں کو آگے کی طرف ڈھکیلا جاتا تھا۔ حکومت کا اندازِ نظر ہی بالکل مختلف تھا۔ ہمارے ہاں آج بھی اچھے قسم کے سرکاری افسران ہیں اس کے باوجود وہ کتنے مختلف ہیں ان عظیم سرکاری افسروں سے جیسے کہ، ایس ایم یوسف، عباس خلیلی، عثمان علی، سعید احمد وغیرہ تھے۔ وہ لوگ حد درجہ ایمان دار اور محنت کرنے والے لوگ تھے، جرأت مند، اور ہمیشہ قوم کی بھلائی پر کمر بستہ۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار اور ایک ہی جانب کھینے والے لوگ تھے۔ کنٹرولر آف انشورنس، اسٹیٹ بینک۔ ایک اتصال

تھا حکومتی اور نجی اداروں کا جس نے مل کر ہماری صنعت کو اس مقام تک پہنچایا تھا جو ۱۹۷۲ء میں موجود تھا۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۷۲ء کا درمیانی زمانہ سب سے زیادہ پیداواری برسوں پر مشتمل تھا، جس کو ہم پاکستان کا 'سنہرا دور' کہہ سکتے ہیں، اور اس میں کوئی کلام نہیں۔ ابھی میں نے کچھ اعلیٰ سرکاری افسروں کے نام گنوائے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آج کے دور کی انتظامیہ میں اس قابلیت کے افسر نہیں۔ مگر دراصل پورا معاشرہ تبدیل ہو چکا ہے۔ پانچویں اور چھٹے عشرے میں لوگ صحیح معنوں میں اپنے ملک وقوم کی خدمت کرنے پر تیار رہتے تھے۔ ہم سب ایک مقصد کے لیے کام کرتے تھے، اور اسی لیے تو ہم لوگ یہاں آئے تھے۔ اب وہ 'ہم سب اکٹھے کر سکتے ہیں' والا جذبہ کہیں کھو گیا ہے۔ اور میں اس کا سارا الزام سرکاری افسروں پر نہیں دھر رہا ہوں، ہم سب ذمے دار ہیں، ہمارا معاشرہ تلپٹ ہو چکا ہے۔ میں نے ابھی ایس ایم یوسف کا ذکر کیا تھا۔ کتنی بار امیر علی فینسی نے انھیں ان کے گروہ میں شمولیت اختیار کرنے کی پیش کش کی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ کی طرح انکار کیا۔ جواب میں انھوں نے کہا تھا، 'دیکھیے، اگر میں نجی حلقے میں کام کرنا چاہتا تو بہت پہلے کر چکا ہوتا، میں حکومتی حلقے میں شامل ہی نہ ہوتا۔ بس مجھے اس میں کوئی دل چسپی نہیں، ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں، برج کے اچھے ساتھی ہیں، مگر بس مجھے آپ کی پیش کش میں کوئی دل چسپی نہیں' اور واقعی انھیں ایسی پیش کش میں کوئی دل چسپی نہیں تھی اس لیے کہ انھیں اپنی ملازمت پر فخر تھا کہ وہ ایک اعلیٰ اور طاقتور عہدے پر فائز ہیں اور یہ بھی کہ اس پر رہتے ہوئے وہ جو کچھ بھی کریں گے وہ اس نئی مملکت کے باشندوں کی خدمت کے لیے ہوگا۔''

''مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا، میں پاکستان واپس آنے پر بہت مسرور ہوں۔ دبئی کی ملازمت بہت اچھی تھی اور اچھا مشاہرہ ملتا تھا۔ مگر وہاں مستقل قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے کہ وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ سونیا اور میں چاہتے تو اپنے بچوں کے ساتھ انگلستان یا امریکا جا کر رہ سکتے تھے مگر اس عمر میں انسان کا ایک اپنا طریقۂ زندگی ہو جاتا ہے، اور ہم حالات کے مطابق اپنا اندازِ زندگی تبدیل کر لیتے ہیں۔ اور سچ پوچھو تو لندن میں مجھ پر بیزاری کا غلبہ ہو جاتا ہے، دبئی میں تو اور بھی زیادہ اس لیے کہ وہاں کچھ کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ دراصل میں ایسے ماحول کے لیے ناموضوں انسان ہوں۔ آپ کہیں بھی جا کر رہیں، آپ دوسرے درجے کے شہری گردانے جاتے ہیں، ہمیں یہ قبول کرنا پڑتا ہے، خواہ آپ کے اچھے دوست اس کے برخلاف کچھ بھی کہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے دبئی کو خیر باد کہہ دیا اور واپس یہاں آ گیا۔ ٹھیک ہے، آپ وہاں بہت کما سکتے ہیں، مالی پہلو سے وہ اعلیٰ درجے کی جگہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے بدلے میں آپ اپنی عزتِ نفس کھو دیتے ہیں۔ چاہے آپ کتنے بڑے عہدے پر ہوں اور بہت بڑی تنخواہ پاتے ہوں، ایک غیر ملکی کی حیثیت میں آپ دوسرے درجے کے شہری اور ملازم ہی کہلائیں گے۔ بس اتنی ہی آپ کی اوقات ہے۔ اسی وجہ سے میں وہاں سے چلا آیا۔ اور یہاں آ کر میں 'میں' ہو گیا ہوں، ایک اوّل درجے کا شہری، اور ملک کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار۔''

بگڑا بیٹا گھر واپس آ گیا ہے؟ یہ ایک بہت حساس اور الجھے ہوئے مسئلے کا آسان ترین بیان ہو سکتا۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ بہت سے کامیاب ترین تجار، صنعتکار اور ماہرین اس وقت ملک چھوڑ کر چلے گئے جب سیاست نے ان کے گلے دبانے شروع کر دیے تھے۔ ان میں سے بہت تو جس ملک میں ہیں ملازمت سے فراغت کی عمر کو پہنچ گئے ہیں اور ان کو اسی نوع کے مسائل درپیش ہیں جیسے کہ ماموں سجالی نے بیان کیے ہیں۔ اور میں یہاں ان کی واپسی پر بہت مسرور ہوں، جہاں کبھی ہم چالیس برس قبل پہلی بار ملے تھے۔ اور جیسا کہ انھوں نے کہا ہے، ہم سب ایک کلب کے ممبر جیسے تھے، ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، اور کچھ تو بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ ہمارے پیشہ ورانہ تعلقات زیادہ تر نیشنل کو انشورنس اسکیم کی وجہ سے استوار ہوئے تھے اس لیے کہ ای ایف یو اس کی لیڈر تھی۔ آدمجی اور سینٹرل کی ابتدا سے قبل نیو جوبلی، پریمیئر، حبیب اس کے دوسرے اہم ارکان تھے۔ میں اور ماموں سجالی ایک بہت بڑے، بلکہ اس وقت تک شاید سب سے بڑے، کلیم کی وجہ سے بہت قریب آ گئے تھے۔ وہ مشہور زمانہ 'ستلج ریور کراسنگ' کلیم تھا۔ سوئی گیس کی پائپ لائن سیلاب کی وجہ سے بہہ گئی تھی۔ یہ PIDC کا ایک منصوبہ تھا اور PIDC کے چیئرمین جنرل افتخار احمد اس وقت شدید غصے میں آ گئے تھے جب ان کے انشورنس افسر

نے ان کو بتایا کہ انشورنس کے پینل کے ارکان کو شبہ ہے کہ شاید پالیسی کی شرائط کے مطابق یہ کلیم پورا ادا نہ ہو سکے۔ انھوں نے اہم کمپنیوں کو اپنے دفتر میں طلب کیا، میں، سجالی اور دُباش نے اس ملاقات میں شرکت کی تھی۔ میں جو عمر میں ان سب سے کم تھا ان سب کا اس لیے ترجمان تھا کہ ای ایف یو کا اس میں سب سے بڑا حصہ تھا۔ انھوں نے بہت خوش گوار طریقے سے ہم سب کو خوش آمدید کہا، بلکہ زیادہ ہی مہربانی فرمائی۔ مگر ان کا رویہ اچانک درشت ہو گیا جب بہت ہی شرافت سے مگر اعتماد کے ساتھ ہم نے ان کو بتایا کہ یہ کلیم جس انداز میں پیش کیا گیا ہے شاید پورا ادا نہ ہو سکے گا۔ وہ اچانک بھڑک اُٹھے اور بلند آواز میں اپنے انشورنس آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''مسٹر احمد'' یہ ان کے انشورنس افسر کا نام تھا اور مجھے ایسا لگا گویا احمد صاحب کا قد سکڑ کر چھوٹا ہو گیا ہو، ''مسٹر احمد، ان حضرات کو بتا دیجیے کہ میرا حکم ہے کہ کل تک یہ پورا کلیم ادا ہو جانا چاہیے'' یہ کہنے کے بعد انھوں میری طرف گھور کر دیکھا۔ میرے ساتھیوں نے بھی میری طرف نظر کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیلڈ مارشل ایوب خان اور ان کی فوج ہی اس ملک میں اہمیت رکھتی تھی اور فیصلے کرتی تھی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ پاکستان میں میرے انشورنس کے پیشے کا یہ سب سے نازک وقت ہے اور مجھ سے زیادہ میرے ساتھی جنرل صاحب کے غیظ کا شکار ہیں۔ میں ایک لمحے کے لیے رُکا اور پھر آہستہ سے کہنا شروع کیا، ''جنابِ والا، تمام تر احترام کے ساتھ میں آپ سے اختلاف کی جرأت کرتا ہوں۔ بین الاقوامی انشورنس میں میری طویل اور شدید محنت پر مشتمل تربیت کے دوران میرے کسی بھی لائق استاد، جن کا میں شاگرد رہا ہوں، مجھے کبھی یہ نہیں پڑھایا کہ بین الاقوامی انشورنس والے کسی فوجی یونٹ کا حصہ ہوتے ہیں، میرے خیال میں دنیا میں کہیں بھی نہیں۔ ہم صرف اپنی پالیسی کی شرائط کا حکم مانتے ہیں یا پھر کسی عدالت کا، اگر ضروری ہو تو۔'' میرے ساتھی سب زرد پڑ گئے اور انھوں نے سمجھا ہو گا کہ بس اب وقت آ گیا ہے۔ مگر ہم سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اچانک جنرل نے زوردار قہقہہ لگانا شروع کیا اور چائے وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد دوستانہ ماحول میں کچھ باتیں ہوئیں اور یہ طے پایا کہ میں اور ماموں سجالی Topling & Harding سے، جو اس زمانے میں بہت بڑے انشورنس سرویئر تھے، بات چیت کے لیے لندن جائیں گے اور ان سے ایک غیر جانب دارانہ سروے کا انتظام کریں گے تاکہ بلا کسی تاخیر کے کلیم ادا ہو سکے۔ ماموں اور میں ایک ساتھ لندن گئے۔ جنوری فروری کے مہینے تھے، شدید سردی کا موسم تھا اور یہیں سے ہماری طویل دوستی شروع ہوئی تھی۔

ان جیسے ہی لوگ تھے میں جن کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہوں اس لیے کہ ان ہی کے ذریعے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے نزدیک پاکستان کتنی اہمیت رکھتا ہے۔

ان کے بوئے ہوئے بیج اُگ رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ بالآخر یہ ملک کامیاب ہو گا۔

اعجاز اللہ صدیقی

اعجاز اللہ صدیقی بھی ایس سی سجالی، محمد چودھری، چشتی اور دُباش کی عمر کے ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے پاکستان میں بیمے کی صنعت کی تاریخ کے صفحات پر اپنے نشان ثبت کیے ہیں۔ ایک نہایت مختلف کردار کے انسان، اگر ان کا تقابل بیمے کی صنعت کے دوسرے پہل کاروں سے کیا جائے۔ انھوں نے پریمیئر کے چیف جنرل منیجر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے چند ماہ بعد، نومبر ۱۹۹۸ء میں از راہِ مہربانی قمر ہاؤس (حال ای ایف یو ہاؤس) میں خود آ کر مجھ سے ملاقات کی اور لوگوں کی طرح ان سے میرے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ پچھلے تیس برسوں میں جب بھی میں پاکستان آتا محمدی ہاؤس میں ان سے ملاقات کے لیے ضرور جاتا۔ وہ بھی جب میونخ آتے، سال میں کئی بار، تو مجھ سے ملنے ضرور آتے۔ ان سے عام موضوعات پر اور بیمے کی صنعت کے مسائل پر بات چیت میں لطف آتا اس لیے کہ نہ صرف یہ کہ وہ ایک باخبر انسان ہیں بلکہ وہ ایک اچھے اور متوازن تنقید کرنے والے دماغ کے حامل بھی ہیں، آزاد خیال بھی جو اکثر طے شدہ نظریات سے ہٹ کر سوچتے بھی ہیں۔

وہ یو پی، ہندوستان کے شہر الہ آباد میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد مقامی سطح پر ایک مشہور وکیل تھے۔ الہ آباد میں ان کی تعلیم ہوئی اور انھوں نے ۱۹۴۶ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ جب میں نے صدیقی صاحب سے اپنی زندگی کے سب سے اہم حصے کے بارے میں دریافت کرنا چاہا تو انھوں نے کہا، ''وہ ایک خالص سیاسی کیفیت تھی جس کے زیرِ اثر میں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں ۱۷/اپریل ۱۹۴۸ء کو پاکستان پہنچا۔ اس کے لیے میں بمبئی گیا اور وہاں سے جہاز کے ذریعے سفر کیا تھا۔ یہاں میرا جاننے والا کوئی نہ تھا، بس چند دوست تھے۔ میں نے اپنے ایک دوست کے ہمراہ سفر کیا تھا، ایک سوٹ کیس ساتھ تھا، اس کے علاوہ کوئی اور سامان نہیں، بس کچھ رقم جیب میں تھی۔ یہاں پہنچ کر مجھے بنیادی فیصلہ کرنا تھا کہ میں وکالت شروع کروں یا کچھ اور۔ میں نے اپنے والد کو ایک کامیاب اور مشہور وکیل کی حیثیت میں دن رات کام کرتے دیکھا تھا۔ نہ ان کے پاس خود اپنے لیے وقت تھا اور نہ میرے لیے۔ لہٰذا میں نے اس کے برعکس کچھ اور کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ طے کیا کہ میں بیمے کے کاروبار کو اپنا پیشہ بناؤں گا۔ اس مرحلے تک پہنچنے میں کافی طویل عرصہ لگا۔ اس وقت بہت سی ملازمتیں مل رہی تھیں مگر مجھے کوئی خاص جلدی نہ تھی اس لیے کہ میری جیب میں اپنے والد کی طرف سے دی ہوئی کافی رقم موجود تھی۔ مگر ایک دن عجیب اور مضحکہ خیز بات ہوئی۔ میرا ایک دوست جس کے ساتھ میں کارڈ کھیلا کرتا تھا اسکاٹش یونین انشورنس میں ملازمت کرتا تھا۔ ایک شام اس نے اچانک مجھ سے کہا، ''صدیقی صاحب، آپ کچھ کرتے کیوں نہیں۔ آخر آپ کوئی فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔ میری دوستی کی خاطر ہی سہی آپ چل کر میرے باس سے ملیے تو سہی۔ بس میں نے دوستی کی خاطر وہی کیا۔ ان کے باس Mr Edward John Ashley Plumbe سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک نفیس دوستانہ شخصیت کے مالک تھے، شاید ان چند بہترین لوگوں میں سے تھے جن سے اپنے پیشے کے دوران میری ملاقات رہی ہے۔ وہ مجھے پسند آئے اور میں نے ان کے ہاں ملازمت کرنا قبول کرلیا۔ مسٹر پلمب نے مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ وہ جب بھی معائنے کے لیے کہیں جاتے مجھے ساتھ لے جاتے۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر مارکٹنگ کے آدمی تھے، اور ایک لاجواب آدمی، مگر ان کو بیمے کے کاروبار کے تکنیکی معاملات کا بھی اچھا ادراک تھا۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا دل چسپ لگا۔ وہ بہت زبردست انسان تھے۔ مگر ایک برس بعد ہی ان کا تبادلہ کلکتے ہوگیا۔ ان کی ترقی ہوگئی اور وہ کمپنی کے دوسرے سب سے بڑے افسر بن گئے جس کو پورے مشرق کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ نارچ یونین میں انضمام کے بعد ان کو لندن بلا لیا گیا اور وہ گروپ کے چیف انڈر رائٹر کے عہدے پر فائض ہو گئے۔ مگر میں بہت خوش قسمت تھا کہ ان کی جگہ پر تعینات ہونے والے Mr Tom Climie بھی بیمے کے ایک قابل انسان تھے۔ اور میں نے ان کے ساتھ دس بارہ برس تک کام کیا۔''

میں Mr Climie سے واقف رہا ہوں۔ ایک خاص اسکاٹ قسم کے آدمی تھے، جن (کی زبان) کو پہلی ملاقات پر سمجھنا ذرا مشکل ہوتا تھا۔ وہ کافی سخت انسان لگتے تھے مگر ذرا قریب سے دیکھیں تو وہ ایک ناتراشیدہ ہیرے کے مماثل تھے۔ وہ بیمے کے تکنیکی معاملات میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور انھوں نے انشورنس ایسوسی ایشن کی فائر سیکشنل کمیٹی کے معیار کو بلند رکھنے میں بڑا کام کیا تھا۔ جب پریمیئر انشورنس کمپنی کی بنیاد رکھی گئی تو وہ اس کے چیف منیجر بنے اور تین برس تک انھوں نے اس کمپنی میں قیام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان کے لیے نارچ یونین گروپ کے منیجر بھی رہے۔ دفتر کا آدھا وقت وہ اپنی 'مادر کمپنی' میں گزارتے اور باقی آدھا پریمیئر میں۔

میں نے صدیقی صاحب سے پوچھا کہ جب وہ برطانوی کمپنی میں ملازم تھے، کیا وہ پاکستانی کمپنی میں کام کرنا پسند کرتے۔ انھوں نے بالکل کسی تامّل کے بغیر جواب دیا، ''نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔ میں انسان پر یقین رکھتا ہوں اس کی قومیت پر نہیں۔ میں قومیاتی نظریات پر یقین ہی نہیں رکھتا، نہ تعصّبات پر۔ مجھے برطانوی کمپنی میں کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ مجھے کبھی اس بات کا گمان بھی نہیں ہوا کہ اس میں کوئی قباحت تھی۔ میں ایسے نظریات پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس میرے دل میں مسٹر پلمب اور مسٹر کلائی می کے لیے تشکر کے گہرے جذبات تھے۔ میں نے ان دونوں حضرات سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے مقام پر بیمے کے بڑے عظیم لوگ تھے۔

صدیقی نے اپنی کمپنی میں جونیئر افسر کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں عدالتِ عالیہ نے فیصلہ کیا کہ پنجاب کاٹن پول توڑ دیا جائے۔ نتیجے کے طور پر اُن کئی کمپنیوں نے لاہور میں اپنی شاخیں کھولنی شروع کر دیں جن کے نمائندے وہاں پہلے سے موجود نہ تھے۔ صدیقی صاحب نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا کہ ''میری اپنی کمپنی نے کچھ اشتہارات دیے، کچھ لوگوں کے انٹرویو بھی ہوئے مگر بالآخر 'قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند'۔ مجھے لاہور جانے کے لیے چُن لیا گیا، پنجاب کے بیچوں بیچ، جو مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے مسٹر کلائی می سے کہا کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے پنجاب کے لوگ مہذب نہیں ہیں۔ اور پھر میں نے لاہور جانے سے انکار کر دیا۔ مسٹر کلائی می نے اصرار کیا اور کہا کہ 'بہتر ہے کہ تم جاؤ اور اپنے ساتھ تہذیب بھی لیتے جاؤ'۔ مجھے مجبوراً جانے پر راضی ہونا پڑا اس لیے کہ مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر میں لاہور نہیں گیا تو میرا تبادلہ بمبئی کر دیا جائے گا۔ اور پھر مجھے سارے اختیارات کے ساتھ لاہور روانہ کر دیا گیا، اس وعدے کے ساتھ کہ وہاں مجھے صرف تین برس رہنا ہوگا۔ میں جولائی ۱۹۵۲ء میں لاہور پہنچا اور مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ تو بڑے مزے کی نوکری تھی۔ مزے کی اس لیے اور بھی کہ مجھے کار دی گئی، ایک ڈرائیور، کلب کی سہولتیں اور میرے اور میرے اہلِ خاندان کے لیے طبی سہولتیں۔ وہ سب کچھ جو زندگی کو آسان اور دل چسپ بنانے میں مدد دیتا ہے۔ جب تین برس بعد کراچی واپس آنے کے لیے مجھ سے پوچھا گیا تو میں صرف اتنا کہا 'جی نہیں، شکریہ، بس مجھے لاہور ہی میں رہنے دیجیے'۔''

اور پھر صدیقی صاحب ۱۹۶۲ء تک لاہور ہی میں رہے۔ اس دوران 'اسکاٹش یونین' کو 'نارچ یونین' نے خرید لیا اور ان کی خدمات ان کے حوالے کر دی گئیں۔ صدیقی صاحب نے کہا، 'میں اس انضمام سے خوش نہیں تھا، میرے ذاتی مددگار، میرے چپراسی وغیرہ سب کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ مجھے اس کا بہت افسوس تھا مگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اور پھر جوں ہی پریمیئر انشورنس کمپنی نے مجھے ملازمت کی پیش کش کی، میں نے قبول کر لی۔ مگر صرف اس شرط کے ساتھ کہ میں کراچی واپس جانا نہیں چاہتا۔ میں ان 'غیر مہذب' پنجابیوں سے اتنا پیار کرنے لگا تھا کہ میں انھیں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ انھوں نے میری شرط قبول کر لی۔ مجھے پریمیئر کا لاہور میں زونل منیجر بنا دیا گیا۔ مگر بالآخر مجھے کمپنی والوں کی حجت قبول کرنی پڑی اور ۱۹۶۹ء میں 'اٹارنی' کی حیثیت سے کراچی واپس جانا پڑا۔ اس وقت محمد چودھری 'سیکریٹری' تھے۔ اختر آزاد ہم سب میں سینئر تھے، اس لیے وہی منیجر، بلکہ شاید ڈپٹی جنرل منیجر رہے ہوں، میں اب پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ جب انھوں نے استعفیٰ دیا تو میں اور محمد چودھری دونوں جنرل منیجر بنا دیے گئے۔ یہ اگر چہ مضحکہ خیز صورتِ حال تھی مگر اس نے کام کیا۔ ہم دونوں کی جوڑی کامیاب رہی اور ہم دونوں اچھے دوستوں کی طرح رہے، بلکہ درحقیقت ہم دونوں اچھے دوست بن بھی گئے تھے، اچھے ساتھی بھی۔ پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے آدمجی انشورنس کمپنی میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے انھیں اس فیصلے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ ان سے دوستانہ ماحول میں گفتگو رہی، کافی طویل وقت تک، مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور پھر وہ ہمیں چھوڑ کر آدمجی میں چلے ہی گئے۔''

میں صدیقی صاحب کو ایک طویل عرصے سے جانتا ہوں اور کئی بار میں نے ان سے پوچھنا چاہا کہ آپ اور محمد چودھری کی (قدیم روما جیسی) 'دونفری حکومت'، جس میں دونوں مشترکہ اختیارات رکھتے تھے، بھلا کس طرح چل سکی ہوگی اس لیے کہ ہم سب بیمے والوں کے لیے یہ ایک عجیب صورت تھی اور ہمیں اس کے بارے میں شبہات بھی تھے۔ اور اب بغیر پوچھے ہی انھوں نے اس ناپرسیدہ سوال کا جواب از خود دے دیا۔ ''ہم دونوں میں اچھی نبھی، بس ہم اچھے دوستوں کی طرح کام کرتے رہے۔'' اور جس طرح انھوں نے یہ الفاظ ادا کیے مجھے پورا یقین ہوگیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہی ہوگا۔

چودھری کے چلے جانے کے بعد صدیقی صاحب من حیث الکل پریمیئر کے جنرل منیجر رہے، بلکہ ان کو چیف جنرل منیجر بھی بنا دیا گیا تھا، جس عہدے پر وہ ۱۹۹۸ء تک فائز رہے، جب عمر کے لحاظ سے انھیں ملازمت سے فراغت نصیب ہوئی۔ اب وہ پریمیئر سے 'مشیر' کے طور پر منسلک ہیں۔

ایک انسان جو پاکستان میں بیمے کی صنعت سے آدھی صدی تک منسلک رہا ہو، اس سے بات کرتے ہوئے مجھے بہت لطف آ رہا تھا۔ ایک زمانے میں وہ اپنی طنز نوائی، بلکہ ترش روئی اور چبھتے ہوئے تبصروں کے لیے مشہور تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کچھ دھیمے مزاج کے ہو گئے ہیں۔ وہ آج بھی بڑے بذلہ سنج انسان ہیں جو لوگوں پر جملے کسنے سے باز نہیں آتے مگر ان کے رازدارانہ مشاہدے سے ان کے مخلصانہ مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے، بہت پختہ کار، بہت پُرسکون اور خوش باش انسان۔ بیمے کی معروف شخصیتوں کے لیے وہ بہت اچھے اور خوش گمان خیالات رکھتے ہیں۔ صدیقی صاحب کے مطابق ''محمد چودھری آج بھی قریبی دوست ہیں، بڑے اچھے اور ذاتی دوست۔ مارکٹ میں شاید کسی کو یہ بات نہیں معلوم۔ میں یہ راز آپ پر اس لیے آشکار کر رہا ہوں کہ ایک طرح سے آپ کشتی کے پُرانے ملّاحوں میں سے ایک ہیں، اسی دور کے جب بیمے کی صنعت نے بہترین لوگ پیدا کیے تھے۔''

روسی دُباش، صدیقی کے الفاظ کے مطابق 'ایک روایتی شخصیت ہیں، مجھے نہیں معلوم کیوں مگر بیمے کے وسیع علم کے حوالے سے وہ بازار میں پہچانے جاتے تھے۔ وہ مثبت معنوں میں ایک ماہرِ فن افسر تھے۔ اور ماموں سجالی؟ وہ عجب کردار تھا۔ اس نے بیمے کی صنعت کو گہوارے کی عمر میں بہت کچھ دیا تھا۔ ہمیشہ مدد کے لیے تیار۔ اچھے 'ٹیم ورکر'۔ روشن علی بھیم جی؟ اس سنہرے دور میں وہ بہت بڑے قد کے انسان تھے۔ ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا، اور میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔

''ہماری صنعت میں کچھ بڑی مضحکہ خیز شخصیتیں بھی تھیں۔'' ہم دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش رہے اور یہ سوچتے رہے کہ ہم ایک دوسرے سے کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ پھر صدیقی بولے، '' آپ کے پیارے دوست معین الدین، وہ ایک بڑے کامیاب انڈر رائٹر تھے۔ وہ موسم کو دیکھ کر انڈر رائٹنگ کے فیصلے کرتے تھے۔ تھا نا مضحکہ خیز؟ آپ نے دیکھا کہ اس زمانے میں ہماری صنعت میں کیسے کیسے کردار موجود تھے۔ وہ مضحک تھے مگر اکثر وہ بیشتر کامیاب بھی رہتے۔ میں یہ بات مثبت انداز میں کہنے کی کوشش کر رہا ہوں اور واقعتاً میرا مطلب بالکل صاف ہے۔ ان جیسے لوگ 'شوربے میں نمک' کے مماثل تھے اور چند مضحکہ خیزیوں کے باوجود انھوں نے ہمارے ملک کی بیمے کی صنعت کی ترقی میں نمایاں کام کیے تھے۔ اور میرے خیال میں جناب معین الدین ویسے ہی کردار تھے۔ انھوں نے اپنے ادارے کے لیے بہت کچھ کیا تھا اور اس طرح مارکٹ کے لیے بھی۔''

میں مصنوعی ہنسی ہنسے بغیر نہ رہ سکا، اور وہ بھی فراخ دلی سے مسکرا دیے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ انھیں بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ درحقیقت وہ کیا پیش کرنا چاہ رہے ہیں، اپنے آپ کو اس طرح، باکمال اور رازدارانہ انداز میں پیش کرنا کہ دیکھنے والا سمجھے کہ وہ کسی اور کا تذکرہ کر رہے ہیں، جو اتفاق سے ان سے ملتا جلتا ہے، جسمانی معنوں میں نہیں، بلکہ شاید انداز کار میں جو ہماری جسمانی زندگی کا ایک الجھا ہوا پہلو بھی ہے۔

روسی دُباش

روسی دُباش، جنھیں اعجاز اللہ صدیقی بیمے کی صنعت کی تاریخ کی ایک روایتی شخصیت کہتے ہیں، ان 'تین سواروں' میں سے ہیں فوراً جن کی طرف میرا ذہن منعطف ہو گیا جب بھی میں نے کتاب کے موضوع پر سوچنا چاہا۔ وہ ہم لوگوں میں سب سے میں سینئر تھے، جن کو صدیقی صاحب 'ہمارے ملّاح' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

وہ ۱۹۱۹ء میں بمبئی کے ایک ڈاکٹر کے گھر پیدا ہوئے اور ان کی پہلی ملازمت حبیب بینک میں، جو انھی دنوں قائم ہوا تھا، اسی شہر سے شروع ہوئی جہاں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ اور وہ بینک ہی میں اس وقت تک کام کرتے رہے جب انھوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اس لیے کہ پورا حبیب گروپ نئی وجود میں آنے والی مملکت میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے۔ تمام ڈائریکٹر، ان کے

اہلِ خاندان اور ان سے منسلک سارے ادارے ایک ساتھ منتقل ہو گئے تھے۔

پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے ایک دن بعد، یعنی ۱۵/اگست ۱۹۹۷ء کو جب ہم اپنے ہوٹل کے کمرے میں انٹرویو کے لیے بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے روسی ڈُباش سے سوال کیا تھا کہ کیا وہ حبیب خاندان کے رشتے دار ہیں اس لیے کہ پچھلے چالیس برسوں میں جب بھی ہماری ملاقات ہوئی ہے حبیب خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان کا جواب تھا، ''نہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، وہ لوگ مسلمان ہیں اور میں زرتشتی ہوں۔ اس لیے میری ان سے کوئی رشتے داری نہیں۔ مگر آپ مجھے حبیب خاندان کا فرد ہی کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ میں نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے اس سے منسلک رہا ہوں، جو ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۹۷ء تک، چھپن طویل اور اطمینان بخش برس۔''

میں نے ان سے سوال کیا کہ تقسیم کے دنوں میں کیا ان کو کبھی اپنی جان کا خطرہ پیدا ہوا تھا؟ بہت آہستگی، ملائمت اور جذبات سے عاری چہرے سے، جیسے کہ وہ ہمیشہ ہوتے ہیں، انھوں نے ان دنوں کے حالات بتانا شروع کیے۔ ''میں اس وقت کم عمر تھا اور مجھے ان میں سے کچھ واقعات ہی یاد ہیں۔ تفصیلات کو یاد کرنا ذرا مشکل ہوگا۔ مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ ان دنوں سیاست زوروں پر تھی اور حبیب خاندان چوں کہ مسلمانوں کی تحریک سے منسلک تھا اس لیے ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے بنتے ہی ان کو اپنا بوریا بستر باندھ کر پاکستان منتقل ہونا ہوگا۔ لہٰذا پورا خاندان، بشمول میری ذات کے، کراچی آ گیا۔ ان دنوں بمبئی میں فسادات ہو رہے تھے۔ مگر ایک غیر مسلم ہونے کی وجہ سے مجھے ذاتی طور پر کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ بمبئی شہر میں مسلمانوں کو بھی کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے مگر ان علاقوں تک محدود رہتے جن میں دونوں قومیں اقلیت میں ہوتیں۔ جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں، چاقو زنی، سیاسی غیر یقینی وغیرہ تو تھی اور سچ مچ حالات خوشگوار نہیں تھے۔ اس لیے حبیب بینک نے اپنے دفاتر کے کچھ حصے بمبئی کے علاقے میرین ڈرائیو میں منتقل کر دیے۔ یہ ایک خوب صورت مقام تھا، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، سمندر کے کنارے۔ میرا دفتر بھی وہیں تھا اس لیے کہ میں مرکزی دفتر کا ایک رُکن تھا۔

اپنی سرگزشت کے اس حصے کے بیان کے دوران روسی اپنے مخصوص انداز میں پُرسکون تھے مگر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ 'اپنے' حبیب خاندان سے اپنی قربت پر نازاں تھے۔ ہونا بھی چاہیے تھا اس لیے کہ حبیب خاندان نے تقسیم کے دنوں میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

جہاں تک مجھے علم ہے، حبیب خاندان کی داستان ۱۸۴۱ء میں بمبئی سے شروع ہوئی تھی جب تیرہ برس کے ایک نوخیز لڑکے نے اپنے ایک جاننے والے کے کاروبار میں اِدھر اُدھر کے کام کرنا شروع کیے تھے۔ اس لڑکے کا نام حبیب اسمٰعیل تھا۔ وہ ایک مزدور کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ کا چند برس ہوئے انتقال ہو گیا تھا اور وہ اپنی ماں اور بہن کا واحد کفیل تھا۔ وہ کاروبار بس عام قسم ہی کا تھا جہاں بے کار لوہے لکڑی، غیر فولادی دھاتیں، مختلف اقسام کے برتن، کپاس اور ابرق وغیرہ کی خرید فروخت ہوتی تھی۔ بالآخر وہ مرچنٹ بینک کے کاروبار میں لگ گیا اور اس کی کمپنی کا نام حبیب اینڈ سنز تھا، بازار میں جس کو احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ حبیب کے چار بیٹے ہوئے اور بمبئی کے اہم لوگوں کی طرح وہ سب ویلنگڈن اسپورٹس کلب سے منسلک تھے۔ وہیں ان لوگوں کی قائدِ اعظم محمد علی جناح سے ملاقات ہوئی۔ تیسرے بیٹے محمد علی حبیب قائد سے زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ اور اس طرح یہ لوگ جناح صاحب کی سربراہی میں چلنے والی مسلم تحریک میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے بعد برطانوی اور ہندو بینکوں نے مسلمانوں کے بڑے کاروبار کے خلاف امتیاز برتنا شروع کر دیا تھا۔ لائڈز بینک نے حبیب اینڈ سنز کے قرض حاصل کرنے کی حد کی تجدید کرنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ بینکنگ اور مالیاتی سیکٹر اہم ہیں اور چوں کی اس سیکٹر میں مسلمان نہیں ہیں، اس لیے ان کی قومی تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا حبیب کا مرچنٹ بینکنگ کا سفینہ مالیات کے گہرے سمندروں میں اگست ۱۹۴۱ء میں رواں ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ منصوبہ دراصل قائد کا خیال تھا اور اس کو ان کی مکمل آشیرباد بھی حاصل تھی۔ پاکستان کی نئی مملکت کے لیے یہ ایک نعمت کے مترادف تھا۔ پاکستان بننے کے تین ماہ بعد جب نئی مملکت کو مالیاتی مشکلات درپیش ہوئیں اس لیے

کہ کانگریس کی حکومت نے برطانوی ہند سے پاکستان کو ملنے والا حصہ جاری نہیں کیا تو حبیب بینک نے اس کو پہلا بلا سود قرض فراہم کیا تھا۔

۱۹۴۱ء میں حبیب میں شامل ہونے کے بعد اس قسم کے حالات میں نوجوان روسی ڈُباش کی پرورش ہوئی تھی۔ روسی کہتے ہیں، ''میں نے بینک میں ۱۹۴۹ء تک ملازمت جاری رکھی۔ اس کے بعد محمد علی حبیب کی خواہش تھی اور انھوں نے مجھے بتایا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی کمپنی، 'نیو انڈیا' نے حبیب سے اشتراک کی کچھ تجویز بھیجی ہے اور بہت جلد ان کا ایک وفد ہم سے مذاکرات کے لیے کراچی آنے والا ہے۔ اور پھر انھوں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ تم میرے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ان معاملات پر نظر رکھو۔ آپ نے دیکھا، انھوں نے مجھ کو اپنے خاندان کا ایک فرد کہا۔ میں نے تجویز کو پڑھا، اگرچہ اس وقت تک میں بیمے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اور پھر ان کے ایک اعلیٰ افسر مسٹر ایڈوانی اپنے ایک ڈائریکٹر کے ہمراہ بات چیت کے لیے کراچی آئے۔ مگر تجویز کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ تجویز بالکل یک طرفہ تھی۔ اور پھر میں نے حبیب صاحب سے کہا کہ 'نیو انڈیا' ایسی بہت سی چیزوں پر اپنی اجارہ داری چاہتی ہے جسے ہم کرنا چاہ سکتے ہیں۔ بے شک وہ اس صنعت میں قدم رکھنے کے سلسلے میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کس حد تک خود مختار رہیں گے، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ اور پھر مذاکرات ناکام ہو گئے۔ مگر حبیب صاحب نے مجھ سے کہا کہ اگر تم چاہو تو انشورنس کو شروع کر سکتے ہو، اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اس لیے کہ میں انشورنس کے کام کو پسند کرنے لگا تھا۔ مجھے محمد علی حبیب صاحب کے ساتھ کام کرنا اچھا لگا جنھیں میں ہفتہ وار انشورنس کمپنی کی تفصیلات پیش کرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے مجھ سے پھر پوچھا کہ میں انشورنس میں ہی کام کرنا چاہوں گا یا بینک میں واپس آنا۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں انشورنس ہی میں کام کرنا چاہوں گا جو اس گروپ کا حصہ تھی۔ اور اس طرح میں کام کرتا رہا، آج تک، اور میں بہت خوش ہوں۔ اب میں کُل وقتی کام سے فارغ ہو چکا ہوں اور مشیر کی حیثیت میں اب بھی حبیب انشورنس ہی سے منسلک ہوں مگر سچ پوچھا جائے تو اب میرے مشورے کی ان کو چنداں ضرورت نہیں ہے۔ حبیب خاندان کی نئی نسل نے سب کچھ سنبھال لیا ہے۔ دراصل شروع ہی سے چاروں حبیب برادران کی بہن کی اولاد ہی انشورنس کمپنی کی کرتا دھرتا رہی ہے۔ جناب محمد، جن سے آپ اچھی طرح واقف رہے ہیں، طویل عرصے تک جنرل منیجر رہنے والے ہی ان کی بہن کے بیٹے تھے۔ ہم صحیح معنوں میں شریکِ کار تھے اور ہم نے درمیانی راستہ اختیار کیا تھا۔ ہم نے کبھی کاروبار کے لیے ضرورت سے زیادہ کوشش نہیں کی ہے۔ ہم نے صرف اپنے گروپ کے کاروبار اور بینک کے چنیدہ گاہکوں کے لیے کام کیا ہے۔ اب ہم نے اپنا طریقِ کار تبدیل کر دیا ہے۔ اب حبیب خاندان انشورنس کے کاروبار کو آہستہ آہستہ پھیلانا چاہتا ہے۔ انھوں نے نئے، تکنیکی اور ایم بی اے کی قابلیت والے لوگوں کو بھرتی کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، جو اس سے پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں وقت لگے گا مگر آہستہ آہستہ کمپنی متحرک ہوگی۔ انڈر رائٹنگ تو معیار کے اُصول پر ہی ہوگی مگر عام طور پر کمپنی ذرا زیادہ لچک کا مظاہرہ کرے گی۔''

زیادہ سرمائے کی بنیاد پر، اور حبیب بینک گروپ کی ساکھ کی وجہ سے ان کا انشورنس کا بازو اس وقت سے ایک محتاط رویے پر کاربند رہا ہے جب ۱۹۴۲ء میں اس کو قائم کیا گیا تھا۔ اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے یہ دو افراد جناب محمد اور روسی ڈُباش کی انتھک محنت اور یک جہتی ہی کا نتیجہ تھا کہ پچاس برس کے طویل عرصے سے حبیب انشورنس مستحکم بنیادوں پر کام کر رہی ہے۔ ان دونوں نے جب بھی اور جو کچھ بھی کہا وہ ہمیشہ حق تھا۔ ان کے الفاظ پر بلا کسی تردّد کے اعتبار کیا جاتا رہا ہے۔ حبیب انشورنس کمپنی میں چمک دمک کی کمی رہی ہوگی مگر وہ ہمیشہ پیشہ ورانہ مہارت اور صاف ستھرے انداز میں کام کرتی رہی ہے۔ بیمے کی مارکیٹ میں اس کی موجودگی نے مارکیٹ کو نہ صرف معیار پر عمل کرنے کا طریقہ سکھایا بلکہ اس صنعت کو وقار بھی بخشا ہے۔ جب سے پاکستان میں بیمے کی صنعت کی ابتدا ہوئی ہے حبیب اور ای ایف یو ہی کی بدولت معیار قائم ہوا ہے۔ پاکستان کے قیام کے ابتدائی کچھ دن، مگر مختصر عرصے، تک تو دونوں کمپنیوں نے ایک ہی چھت کے نیچے کام بھی کیا تھا۔ اس زمانے میں جب غیر ملکی کمپنیاں بیمے کی صنعت پر حاوی تھیں تب بھی ان کے خلاف کوئی نفرت یا دشمنی روا رکھی گئی، نہ ہی کسی نوع کے غیر

دوستانہ مسابقت کے کاروباری حربے استعمال کیے گئے۔ روسی ڈُباش کہتے ہیں، ''نہیں! نہ ہم حبیب والوں نے نہ ہمارے ای ایف یو کے دوستوں نے کبھی غیر ملکی کمپنیوں کے خلاف کاروباری جنگ کی تھی۔ ان کے اپنے گاہک تھے اور ہم کبھی کبھی ان کے حلقے میں داخل ہونے کی کوشش ضرور کرتے۔ اور یہ ہم اپنی برادری کے رسوخ اور سیاسی رسوخ کے ذریعے کرنے کی کوشش کرتے۔ ای ایف یو میں کے ایف حیدر تھے جن کے کافی تعلقات تھے اور حبیب بینک کے ساتھ، ہم اپنی میمن برادری کے رسوخ کو استعمال کرتے۔ رفتہ رفتہ ہم کامیاب ہوتے گئے۔ اگر کوئی مشکل درپیش ہوتی تو ہم کھلے دل سے اپنے غیر ملکی دوستوں سے تبادلۂ خیالات کرتے اس لیے کہ ہم ان کو اپنی برادری کا حصہ جانتے تھے جن سے ہم نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ہم پر حکومت کی جانب سے بڑھتا ہوا دباؤ پڑنے لگا، اور اس پر مستزاد PICاور NIC کی تشکیل۔ ان سب کی وجہ سے مارکٹ کا منظر بدلتا رہا اور پاکستانی بیمہ کمپنیوں کی آپس میں مسابقت بھی بڑھنے لگی۔ اس کے باوجود، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ہمارے مابین مسابقت دوستانہ قسم کی تھی۔ ہم لوگ ہفتے میں ایک بار ماموں سجالی یا روشن علی بھیم جی کے مکان پر دوپہر کا کھانا کھاتے اور ، بغیر کسی مروّت کے، ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ کرتے، مگر حقائق اور تفصیلات کے ساتھ۔ لیکن ہمارے درمیان کبھی کوئی تلخی یا اس نوع کا کوئی مسئلہ اٹھتا، نہ ہمارے درمیان کسی قسم کی اجارہ داری، قیمت بڑھانے کی بات، یا اپنے گاہکوں کے مفاد کے خلاف بیمے کی شرائط میں کسی قسم کی تبدیلی کا شائبہ بھی ہوتا۔ کبھی نہیں، اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ ایک دوستانہ برادری کی مانند تھا۔ ہم نے مل جُل کر کام کیا اور ہمیشہ اپنے ملک کے بیمے کی صنعت کی بہتری کے بارے میں سوچا اس لیے کہ ہمارے غیر ملکی دوستوں کی مالی استطاعت ہم سے کہیں زیادہ تھی اور ان کو عالمی سطح پر ماہرانہ امداد فراہم تھی۔ لہٰذا ہم اکٹھے ہوئے اور اس وجہ سے ہم طاقتور ہوتے گئے۔ ہاں! ہمارے اپنے درمیان کاروباری مسابقت تھی، مگر تلخی کے بغیر، اس میں کوئی کثافت نہیں تھی، اور دوستانہ ماحول تھا۔ غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ساری مشکلات اور رُکاوٹوں کے باوجود، NIC کی وجہ سے کاروبار میں کمی، اضافہ اور کبھی کبھی PIC کا غیر ضروری ری انشورنس کا جبر، چھوٹی چھوٹی کمپنیوں کا جگہ جگہ اُگ آنا، اور حکومت کی طرف سے معاملات میں دخل اندازی کے باوجود ہماری صنعت نے نہ صرف ترقی کی ہے بلکہ بڑے پیمانے پر ترقی کے مراحل طے کیے۔ میرا خیال ہے کہ، سوائے دو ایک بہت چھوٹی کمپنیوں، اور بہت چھوٹی رقم کے، کسی بھی پاکستانی کمپنی کی طرف سے کسی سنجیدہ قسم کی نادہندگی یا کوتاہی نہیں ہوئی۔ ہمیں اپنی کامیابی پر بجا طور پر فخر ہے۔''

اتنا کہنے کے بعد روسی ڈُباش نے اپنی آرام کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور وہ نہایت مطمئن انسان دکھائی دینے لگے۔ وہ 'اپنی' حبیب انشورنس کمپنی کی نوجوان انتظامیہ کو اب بھی چھوٹے موٹے مشورے دیتے رہتے ہیں اور پرانے ری انشورنس کے دوستوں سے رابطے میں رہتے ہیں خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔ زیادہ تر زیورخ میں رہنے والے دوستوں سے، کیوں کہ بیمے کے پیشے کے لیے زندگی بھر کے لیے خود کو وقف کر دینے والے اس عظیم انسان نے اپنے پیشے سے منسلک رہنے کی ایک اور صورت نکالی ہے اور وہ اس طرح کی اس نے اپنی بیٹی بیمے ہی کے ایک پیشہ ور انسان سے بیاہ دی ہے جو روسی ڈُباش کی مارکٹ میں بھی 'اس کی' کمپنی کے مفادات کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے۔

معین فدّا

قبل اس کے کہ ہم پاکستان کی معاشیاتی ترقی کے بارے میں اس اہم باب کے اختتام تک پہنچیں، میں چاہوں گا کہ میرے قاری ایک اور شخص سے متعارف ہوں جو اپنی عمر اور دوسری کسوٹیوں پر کسے جانے کی وجہ سے ان لوگوں میں شمولیت کا حق دار نظر نہیں آئے گا جن کو میں نے بیمے کی صنعت کے اس دور کے تذکرے کے لیے چنا ہے۔ اس کا شمار نہ بیمے کی صنعت کی بنیادی شخصیتوں میں ہوسکتا ہے نہ ہی کسی میدان کے پہلکاروں میں اس لیے کہ اس مقام پر جو موضوعِ سخن ہے اور جو کچھ اس وقت ہو رہا تھا، اس وقت تو یہ شخص شاید اسکول کے قدمچوں تک بھی نہیں پہنچا ہوگا۔ مگر جو کچھ یہ شخص آج کر رہا ہے، اور جس طرح کر رہا ہے، میرے خیال میں، وہ ماضی اور مستقبل کی نسل کے

منتظمین، کارکنان اور بیمے کی صنعت کی بہتری کے خواب دیکھنے والوں کے درمیان ایک کڑی کا کام کرے گا۔

یہاں میری مراد جناب معین فدا سے ہے جو اس وقت کمرشل یونین لائف کے چیف ایگزیکٹیو آفیسر ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب ۱۹۸۲ء میں انھوں نے ریلائنس انشورنس کی ملازمت کی تھی۔ میرے پرانے دوست اور ساتھی جناب عظیم رحیم ،اپنی کبر سنی کے باعث، ایسٹرن فیڈرل کے چیف ایگزیکٹیو کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے اور انھوں نے اس کمپنی کے مالکان سے اس کے قیام میں مدد کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور بزرگ جناب این اے قاضی، سابق چیئر مین NICاس کے کاروباری سربراہ تھے۔ معین فدا زیادہ دن اس کمپنی میں نہ رہ سکے اس لیے کہ ان کو PIC کی طرف سے ایک بڑی پیش کش ہوگئی اور وہ ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر بن چکے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب میری ان سے شناسائی ہوئی تھی اور میں ان کے تکنیکی پس منظر، کاروباری باریک بینی، سرعتِ ادراک اور سب سے اونچا مقام حاصل کرنے کی للک سے متاثر ہوا تھا۔

پاکستان انشورنس کارپوریشن کی عمارت سے قریب، کمرشل یونین کی اپنی عمارت میں واقع ،اپنے خوب صورت دفتر میں متمکن معین فدا نے اپنی ذاتی زندگی کی تفصیلات بیان کرنا شروع کیں۔ ان کی پیدائش کراچی میں ایک تاجر کے گھر ہوئی جو افریقا کے ملک موزنبیق سے پاکستان ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان کے والد کا زیادہ تر کاروبار پرتگال کے شہر لزبن میں تھا، لہٰذا وہ دراصل وہیں سے آئے تھے۔ ان کی والدہ نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی تھی۔ ان کے بزرگ کسی زمانے میں ٹھٹھہ، سندھ کے باسی تھے۔ یہ بات ان کو اور ان کے والد کو بعد میں معلوم ہوئی تھی۔ ان کی بنیادی اور کالج کی سطح تک کی تعلیم کراچی میں ہوئی تھی۔ مگر ان کی اعلیٰ تعلیم پہلے تہران میں ہوئی۔

معین فدا نے بتایا کہ ''میرے ایک چچا ای ایف یو میں کام کرتے تھے، بلکہ وہ اب بھی وہیں کام کر رہے ہیں اگرچہ وہ کسی بڑے عہدے پر نہیں ہیں مگر ان کو نہ صرف یہ کہ ملازمت پسند ہے بلکہ وہ اس کمپنی کے وفادار بھی ہیں۔ بیمے سے میری بس اتنی شناسائی ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔ میں اس وقت ایک طالب علم تھا۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ ملک سے باہر جا رہے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ مجھے سمندر پار کوئی موقع مل جائے۔ میں اخبار میں شائع ہونے والے اشتہارات دیکھتا رہتا تھا اور چانک میری نظر ایک وظیفے کے اشتہار پر پڑی جو RCD College of Insurance ایران کے بارے میں تھا۔ میں نے درخواست دے دی۔ اس برس پاکستان سے تین امیدوار لیے جانے والے تھے اور خوش قسمتی سے میں ان تینوں میں سے ایک تھا۔ اس طرح میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلا گیا مگر مجھے بیمے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ میری معلومات بہت تھوڑی تھیں وہ بھی صرف اپنے چچا کی ملازمت کے حوالے سے۔ میں نے انشورنس میں بی ایس سی کیا اور ساتھ ہی ساتھ لندن کے ایک ذرا بڑے بروکر Stewart Wrightson کے تہران میں واقع دفتر میں کام بھی کیا۔ اس طرح تعلیم کے ساتھ ساتھ انشورنس میں ملازمت مجھ کو اس پیشے میں لے آئی۔ مجھے اس طرح سیکھنے کا موقع ملا اور بی ایس سی کرنے کے بعد میں نے اور کچھ کرنے کا ارادہ کیا اس لیے کی شاید صرف بی ایس سی کر لینا کافی نہیں ہوگا۔ میں نے کچھ رقم پس انداز کر لی تھی اور میں امریکا چلا گیا اور نیو یارک کے کالج آف انشورنس میں داخلہ لے لیا۔ میں نے انشورنس میں ایم بی اے کر لیا، اس میں کافی لطف آیا اور مجھے AIG نے کالج ہی سے اٹھا لیا۔ مسٹر گرین برگ نے مجھے نہیں چنا تھا مگر ان سے ملاقات کے مواقع ضرور ملے تھے اس لیے کہ ان کے ادارے میں اس وقت صرف میں ہی ایک پاکستانی تھا۔ ایک آدھ بار مجھے پاکستان کی فائل بھی دی گئی تھی جو ان لوگوں کی پاکستان کی بیمے کی مارکٹ میں دوبارہ داخل ہونے کی خواہش کے بارے میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی تھی، The ALICO File۔ اس طرح کم از کم میں ان کے اس منصوبے سے منسلک رہا تھا۔

پاکستان واپسی پر معین فدا نے، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، ریلائنس انشورنس میں شمولیت اختیار کر لی چند برس وہاں کام کیا اور اس کے بعد انھوں نے عالمی سطح کے ادارے، کمرشل یونین گروپ میں ان کے جنرل انشورنس کے سربراہ کی حیثیت سے شمولیت اختیار کر لی،

جو CUGA کے نام سے موسوم ہے۔ شروع دن ہی سے انہوں نے اپنے صدر دفتر کو مشورہ دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ پاکستان میں زندگی کے بیمے کے کاروبار میں شرکت کے بارے میں سنجیدگی سے غور کریں۔ اور انھوں نے اپنا ہدف حاصل کرنے میں سب کچھ کیا۔ جب ای ایف یو اور ایک اور کمپنی کو بیمۂ زندگی کے کاروبار کی اجازت مل گئی تو AIG Group اپنے ادارے ALICO کے ذریعے پاکستانی منظر پر نمودار ہوئی۔ اس کے فوراً بعد کمرشل یونین بھی میدان میں آ گئی۔ اس کے بعد سے وہ کمرشل یونین لائف کے سربراہ ہیں اور پاکستانی مارکٹ کے ایک قابلِ قدر حصے کے حصول میں تن، من، دھن سے کوشاں ہیں۔

اس طرح معین فُدا ایک غیر پاکستانی ادارے کے نمائندے ہیں، حالاں کہ دل سے وہ خود کو تعصب سے مبرّا، کٹر قوم پرست کہتے ہیں۔ ان کو اس وقت شدید صدمہ ہوا جب نیشنل انشورنس ریفارم کمیشن کا قیام عمل میں آیا اور صنعت کے کچھ بزرگوں نے، جن سے ان کے اچھے ذاتی مراسم تھے، اس میں ان کی نمائندگی پر اس لیے اعتراض کیا تھا کہ ان کے خیال میں وہ غیر ملکی مفاد کو ملکی مفاد سے مقدم رکھیں گے اس لیے کہ وہ ایک کثیر القومیاتی ادارے کے لیے کام کر رہے ہیں۔

انھیں آج بھی اس بات کا صدمہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ہر شخص کو اپنی دال روٹی کے لیے کام کرنا ہوتا ہے مگر آپ قومی معاملات میں سمجھوتا نہیں کرتے خواہ وہ آپ کا 'مادر ادارہ' ہی کیوں نہ ہو۔ اور آج جب مجھے عالمی بینک سے بات کرنی ہوتی ہے تو، بہت سے لوگ گواہ ہیں کہ، میں اپنے ملک کی صنعت کے حوالے سے بات کرتا ہوں۔ پہلے میں قومی مفاد کو سامنے رکھتا ہوں پھر اپنی دال روٹی یا کچھ اور۔''

معین فُدا، بے شک، اپنی نوزائیدہ کمپنی کی بڑی کامیابی کے لیے کوشاں ہیں اور اس طرح وہ ای ایف یو لائف کے، جو پرانی اور نئی مارکٹ دونوں کی سب سے بڑی کمپنی رہی اور اب بھی ہے، سب سے بڑے حریف ہیں۔ وہ اس بات سے پوری طرح واقف ہیں اور محاذ پر موجود ان کے 'دوستانہ دشمن' بھی۔ ایسے معاملات میں شاید ہم کو اعجاز اللہ صدیقی اور روسی ڈباش جیسے لوگوں کے فرمودات سے سبق لینا ہوگا کہ پاکستان کے قیام کے بعد ہی سے وہ لوگ پچھلے چار پانچ عشروں میں ایسے ہی حالات سے دوچار رہے تھے۔ عالمی سطح کے اور بھی کھلاڑی پاکستان کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوں گے۔ ان میں سے کچھ مقامی کمپنیوں سے اشتراک کے خواہش مند ہوں گے۔ 'عالمگیریت' (globalisation) ایک دن ہمارے ملک کے مزید ترقیاتی معاملات پر اثر انداز ہوگی اور اس میں بیمے کی صنعت کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ اس کا ثبوت پاکستان کے سب سے پرانے بیمے کے ادارے، ایسٹرن فیڈرل اور بین الاقوامی سطح پر سب سے بڑی کمپنیوں میں سے ایک، یعنی جرمنی کی Allianz کے درمیان ہونے والا معاہدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں معین فُدا جیسے لوگوں کو اس قسم کی 'بین الاقومیت' کا نمائندہ سمجھتا ہوں۔ ملکوں میں معاشی اور سیاسی ترقیات لہروں کی صورت میں ہوتے ہیں۔ یہی کچھ بیمے کی صنعت میں بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے چند برسوں میں مشاہدہ کیا ہے، دنیا بھر میں گاہک بڑے اداروں کو فوقیت دیتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب حکومت کو کسی مقامی صنعت کی ترقی اور بقا کے لیے اس کی حفاظت کی ضمانت دینی پڑتی تھی۔ جہاں تک پاکستان کا سوال ہے، یہ سب کچھ بہت دھیرے دھیرے اور غیر جارحانہ انداز میں کیا گیا تھا مگر پھر مارکٹ کی طاقت نے یہ فیصلہ کرنا شروع کیا کہ بیمے کی صنعت کی صورت کیا بنے گی۔ کسی کو کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔ یہ سب اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس صنعت کے پچاس برسوں میں حاصل ہونے والے تجربے کی بنا پر مارکٹ میں روبہ عمل لوگوں کو یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ اس نوع کی آنے والی لہریں تباہ کُن لہروں کی صورت نہ اختیار کرلیں اور جو کچھ بھی ہو، وہ شریفانہ انداز میں ہو اور قابو سے باہر نہ ہونے پائے۔

مجھے اس بات پر مسرت ہے کہ معین فُدا جیسے لوگ بڑی پاکستانی کمپنیوں کے سربراہوں کے ہمراہ اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ جو کچھ بھی ہو اس صنعت کے وقار میں اضافے کے لیے ہو اور عوام کی بہتر اور مکمل انداز میں خدمت کا سامان ہو سکے۔

روشن علی بھیم جی امریکا کی شمال مغربی میچول لائف انشورنس کمپنی کے بورڈ کے چیئرمین رابرٹ ای ڈیلن
سے گفتگو کرتے ہوئے

تیسرا باب

ناقابلِ فراموش افراد

خاکے اور حالاتِ زندگی

تجارتی اور صنعتی مہم جوئی کے نقطۂ نظر سے قوموں کی تاریخ دراصل اس کے لوگوں کی تاریخ ہوتی ہے۔ یہ ایسے ممتاز لوگوں کی داستان ہوتی ہے جو قوموں کی بنیاد رکھنے یا ترقی کے میدان میں اس کی رہنمائی کے موجب ہوتے ہیں۔

جہاں تک قوموں کا معاملہ ہے، ذرا پہلے برطانوی ہند کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے تاریخی پس منظر میں ہم یہ سب بہت واضح انداز میں دیکھ چکے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سرسیّد، اقبال، جناح اور دوسری بلند و بالا مینار جیسی شخصیتیں نہ صرف اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ اپنے زمانے اور اپنے معاملات واسباب کے آسمانوں پر چھا جاتی ہیں۔

جیسا کہ میں ابتدایے میں عرض کر چکا ہوں، اس کتاب کا مقصد پاکستان کے قدیم تجارتی اداروں میں سے ایک اہم ادارے یعنی ای ایف یو گروپ کے تاریخی پس منظر سے قارئین کو متعارف کرانا ہے۔ اور اس سے بہتر اور کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ان افراد کی داستانِ زندگی بیان کروں جنھوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں اس عظیم اور ہراول ادارے کی ترقی میں کردار ادا کیا ہے۔ لہٰذا میں مندرجہ ذیل خاکوں کو اس کتاب کے بطن کے مماثل سمجھتا ہوں اور مجھے قوی امید ہے کہ میرے قارئین بھی ان کو پڑھنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ لوگ مجھ سے سوال کریں گے کہ آپ نے کس معیار کے پیمانے پر صرف ان لوگوں کا انتخاب کیا ہے جن کے حالاتِ زندگی اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں۔ اور مجھے اس بات پر ہرگز حیرت نہیں ہوگی، اگر میرے جوابات ہر ایک کی تشفی کے لیے کافی نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود میرے خیال میں جواب بالکل سیدھا سادہ ہی سا ہے۔ سب پہلے تو یہ عرض کرنا ہے کہ میں صرف ان لوگوں کے بارے میں لکھ سکتا تھا جن کو میں یا تو ذاتی سطح پر جانتا تھا، جانتا ہوں یا جن کے بارے میں ان کے اعزہ، اقربا اور دوستوں نے اپنے محسوسات کی بنیاد پر مجھے معلومات فراہم کی ہیں۔ یا پھر جن لوگوں کی بابت کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان کے نسخے اب بھی دستیاب ہیں۔ سچ تو یہ ہے کی اس کتاب کی تحریر کبھی کبھی 'ہمالیائی مہم' لگی اور میں ممنون ہوں ان سب افراد کا جنھوں نے اس کو سر کرنے میں میری معاونت فرمائی۔ اور جب میں پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یک گونہ سکون کا احساس ہوتا ہے کہ مخلصانہ اور بے غرض مددگاروں کی معاونت سے ان سب شخصیات کے بارے میں لکھنا میرے لیے ممکن ہوا۔ اور اگر ای یف یو کی بنیاد یا اس کی ترقی میں معاون ہونے والوں کے رنگا رنگ نگار خانے میں ایک آدھ نقش شامل ہونے سے رہ گیا ہے تو کلّی طور پر صرف مواد کی عدم فراہمی ہی اس کا باعث ہوئی ہے۔ بہر حال اس انتخاب کی پوری ذمے داری مجھ پر ہی عائد ہوتی ہے اور اگر کوتاہی یا نسیان کے سبب کچھ چھوٹ گیا ہے تو اس کے لیے میں صمیم قلب سے معذرت کا طلب گار ہوں۔

اور میں اپنے قارئین سے درخواست کروں گا کہ وہ صرف صفحات کی گنتی سے شخصیات کی اہمیت، احترام اور ان کے مقام کا تعین

کرنے کی غلطی نہ کریں جو میرے اور دوسرے حضرات وخواتین کے دلوں میں نقش ہیں۔ میں نے اس مواد ہی پر انحصار کیا ہے جو بہ دقتِ تمام مجھے حاصل ہوسکا ہے۔

پھر بھی ایک چیز ضرور تھی جو میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ شروع ہی سے میرا پختہ ارادہ تھا کہ میں نہ صرف ان لوگوں پر لکھوں گا جو تاریخی حیثیت کے حامل ہیں یا پھر وہ جو ملک میں اچھی طرح سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ میں نے یہ بھی چاہا ہے کہ میرے قارئین کم از کم ان چند لوگوں سے بھی متعارف ہوں جو ہر ادارے میں پردے کے پیچھے اہم، اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کرتے ہیں مگر کبھی روشنی میں نہیں آتے اور وقت آنے پر ملازمت سے فارغ ہوتے ہی بھلا دیے جاتے ہیں۔

اور ایک تیز نظر قاری یہ بھی سوچنا شروع کردے گا کہ کرشماتی اور سربرآوردہ شخصیتوں میں سے وہ جن کی زندگی اور جن کے کارنامے چالیس برس تک ای ایف یو کی نشو و نما پر اثر انداز ہوئے ہیں اس کتاب میں نظر نہیں آتے: یعنی جناب روشن علی بھیم جی، جو دسمبر ۱۹۹۸ء میں اپنے انتقال سے صرف چند دن قبل تک کمپنی کے بے حد محترم اور سرگرم چیئرمین رہے تھے۔

اس کا جواب بھی بہت آسان سا ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں کی فرمائش پر میں نے ان کی سوانح حیات علیحدہ تحریر کی ہے جو اس کتاب کے ساتھ ہی شائع کی جاچکی ہے۔

اس کے علاوہ قاری کو بہت جلد ہی احساس ہو جائے گا کہ وہ اس کتاب کی زنگار کے معشوق بھی ہیں اس لیے کہ ان کی حیات بیشتر داستانوں سے جو میں نے بیان کی ہیں، اس طرح مشتق ہیں کہ اس کو الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔

سرپرست

عالی مرتبت نوّاب بھوپال

عالی مرتبت آغا خان

عالی مرتبت نواب بھوپال (اندازاً ۱۹۳۲ء)

نواب بھوپال ۳۰ء کی دہائی کے اوائل میں

نواب بھوپال اپنے محل میں صاحبزادی، اپنی جانشین شہزادی عابدہ، اہلیہ اور دوسرے افراد کے ساتھ

عالی مرتبت نوّاب بھوپال

برطانیہ کے روایتی بادشاہ آرتھر کی سوانح حیات اور کیملاٹ کے دربار کی گول میز کے سورماؤں کے معرکوں پر قرونِ وسطیٰ اور جدید دور کے لکھنے والوں نے ایسی داستانیں تخلیق کی ہیں جو بہت سی روایتوں کا حصہ ہیں۔ اس کے برعکس بھوپال کے مرحوم نواب کی حیات، جو آغا خان کے ہمراہ ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے دوسرپرستوں میں سے ایک تھے جب ۱۹۳۲ء میں اس ادارے کی داغ بیل رکھی گئی تھی، حقیقت پر مبنی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی جدوجہدِ آزادی اور تقسیم ہند پر لکھے جانے والی تاریخ کا ایک درخشاں باب بھی ہے۔

آزادی سے قبل کے ہندوستان کا سیاسی نقشہ صوبوں اور رجواڑوں سے مزیّن سندھی رلّی کا منظر پیش کرتا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کی ابتدا کے وقت ۵۶۲ ریاستیں تھیں جن میں تقریباً دس کروڑ لوگ بستے تھے جو پورے ہندوستان کی آبادی کے بیس فی صد کے برابر تھے۔ ان میں کچھ ریاستیں بہت بڑی تھیں، جیسے حیدرآباد، میسور اور کشمیر جب کہ ان کی اکثریت چھوٹی، مخفف، اور ماضیِ قریب کی باقیات جیسی تھیں۔ ان میں سے تین سو کا مجموعی رقبہ مشکل سے ۶۰۰۰ مربع میل کے برابر تھا اور ان کی آبادی دس لاکھ سے کم تھی۔ کچھ ریاستیں صرف چند ایکڑ اور ان کی کُل 'آبادی' پچاس افراد پر مشتمل تھی۔

بڑی ہوں یا چھوٹی، ان کا سیاسی رُتبہ اُن کے حاکم اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ہونے والے معاہدے کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ ان کا قد، آبادی، مالیات اور دیے جاتے والے حقوق وغیرہ پر منحصر تھا۔ ایک بات سب میں مساوی تھی اور وہ یہ تھی کہ ان کا علاقہ برطانوی تسلط میں نہیں تھا اور ان کی رعایا تاجِ برطانیہ کے ماتحت نہ تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی ریاست میں بھی برطانوی ہند عدالتوں کے قوانین نافذ نہیں تھے اور ہندوستان کی مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین ان پر لاگو نہیں ہوتے تھے، سوائے ان لوگوں پر جو برطانوی قومیت رکھتے تھے۔ قانونی اعتبار سے وہ سب ہندوستان کے لیے غیر ملکی علاقے تھے۔

۱۸۵۷ء کے 'غدر' کے دوران زیادہ تر شہزادے تاجِ برطانیہ کے وفادار رہے جس کے عوض بہت سے مقامی حاکموں کو سندیں دی گئی تھیں کہ ان کے تخت برقرار رہیں گے اور، جہاں ضروری ہو، ان کو اپنے وارث بنانے کے پورے اختیارات ہوں گے۔ اگرچہ ساری ریاستیں 'غیر ملکی علاقے' تھیں اور ان کے حکمراں اپنے علاقے کے معاملات میں خودمختار تھے، اعلیٰ ترین فرماں روائی کا اختیار برطانیہ کے پاس تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان سب کے اختیار کے لیے کچھ حدود تھیں۔ مثال کے طور پر کوئی ریاست غیر ملکوں سے تعلقات استوار نہیں کرسکتی تھی اور ہندوستانی ریاستوں کے مابین مراسلت برطانوی حکومت کے مقرر کردہ وائسرائے کے معرفت کی جائے گی۔ ریاستی حکمرانوں کو بدنام کرنے کے لیے بہت کچھ لکھا گیا ہے جن کی ریاستوں کو 'جدید عہد کی برخود غلط مطلق العنانیت کے جوہڑ' سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود درحقیقت ان میں اچھے جو تھے وہ آمر تو تھے مگر مخیّر اور فیض رساں تھے اور ان کی ریاست اچھی اور ترقی پسندانہ شمار کی جاتی تھی۔ زیادہ تر بالکل انگریز

اشرافیہ کی طرح کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ غیر ملکوں کے سفر کرتے تھے،لندن، پیرس اور جنوبی فرانس کے ساحلی جزائر میں ان کے قیام کے لیے مکانات تھے۔ کچھ تو بڑے شکاری اور کھلاڑی بھی تھے، اپنے اصطبل اور شکارگاہوں پر خطیر رقمیں خرچ کرتے تھے، شیر چیتے اور دوسرے وحشی جانور پالتے تھے۔ اور ان میں سے کچھ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، روشن خیال بھی اور ترقی پسند سوچ رکھنے والے تھے۔

لہٰذا اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رجواڑے اور نوابیاں قرونِ وسطیٰ کے مُردآب جیسے نہیں تھے اور یہ باور کرنے کی بہت سی وجوہات موجود ہیں کہ بھوپال کی ریاست ان رسوخ والی ریاستوں میں سے ایک تھی جو بلا کسی تردّد کے تعلیم، صحتِ عامہ اور عورتوں کی ترقی کے معاملے میں برطانوی ہند سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔

اس کو بآسانی اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ بھوپال کی آخری نوّاب سے قبل، جن کے حق میں ان کی دادی ۱۹۲۶ء میں حکمرانی سے دست بردار ہوگئی تھیں، اس ریاست پر خواتین کی حکمرانی رہ چکی تھی۔ نوّاب سر محمد حمید اللہ خاں، بھوپال کے حکمران، تقسیم ہند سے قبل ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں میں سب سے ممتاز حاکم تھے۔ اس لیے یہ اور بھی حیرت کی بات ہے کہ کسی مؤرخ یا ادیب نے ابھی تک اس بے حد روشن خیال، ذہین، خوب صورت، شجاع اور دل چسپ آدمی کی سوانح عمری لکھنے کی کوشش نہیں کی، جس کو برطانیہ عظمیٰ کی حکومت کی جانب سے ہندوستان میں متعین آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، ہندوستان میں نہرو کے بعد دوسری بہترین اور مقرّب شخصیت گردانتے تھے۔ عوامی اطلاع کے مطابق جناح صاحب کی طرح نواب صاحب بھی یادداشتیں لکھنے والے آدمی نہیں تھے اور اس زمانے کے جو لوگ اپنی یادداشتیں چھوڑ گئے ہیں ان میں بھی نواب صاحب کے ذاتی زندگی کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں ملتیں۔ صرف چودھری خلیق الزماں وہ واحد شخصیت تھے جس نے اپنی تحریر 'Pathway to Pakistan' میں نواب صاحب سے اپنے روابط کی مختصر مگر بہت واضح تفصیلات چھوڑی ہیں جن سے آگے چل کر میں اپنے قارئین کو روشناس کراؤں گا۔

تحریری مواد اور اطلاعات کی کمیابی کے باوجود پاکستان کی دھرتی پر قدم رکھتے ہی مجھے مرحوم نواب صاحب کے زندگی اور شخصیت سے واقفیت ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس وقت میں ایسٹرن فیڈرل یونین سے منسلک ہوا اس وقت اتفاق سے کے ایف حیدر صاحب ادارے کے جنرل منیجر تھے جو تقسیم سے قبل نواب صاحب سے بہت قریب رہ چکے تھے۔ بھوپال کے وزیرِ خزانہ اور دوسری حیثیتوں میں ان کو نواب صاحب کی خدمت کے مواقع ملے تھے بلکہ تقسیم کے بعد بھی وہ سفر میں ان کے مستقل ہمراہ ہوا کرتے تھے۔ پہلے ہی دن سے جب حیدر صاحب سے میری ملاقات ان کے دفتر میں ای ایف یو کے چیف ایگزیکٹیو کی حیثیت سے ہوئی تھی، اکثر و بیشتر 'ہز ہائی نیس نواب' سے اُن کے واجب التحریم تعلقات کے واقعات میرے کانوں میں پڑتے رہے تھے۔ اور کچھ دنوں بعد تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا گویا نواب صاحب سے میرے بہت قریبی تعلقات رہ چکے تھے، حالاں کہ اس وقت (۱۹۶۰ء میں) جب مجھے کراچی آئے ہوئے چند مہینے ہی گزر رہے تھے، ان کا انتقال ہوچکا تھا۔

اسی طرح میرے ایک اور قریبی ساتھی اور دوست جناب معین الدین بھی، جو نواب صاحب کی ملازمت میں رہ چکے تھے، ان کی تعریف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس وقت مجھے اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ چالیس برس بعد میرا ان کی زندگی سے پھر سابقہ پڑے گا، اور اس بار کہیں زیادہ تفصیل میں اور بہت قربت کے انداز میں۔ یقیناً اس وقت میں اس انسان کی زندگی اور اس کے دل چسپ پہلوؤں کے بارے میں شذرے لکھ کر ڈال سکتا تھا، جو آج، اتنا وقت گزرنے کے بعد زیادہ تر میرے ذہن سے محو ہوچکے ہیں۔

بہرحال اس کے ازالے کے طور پر، میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے نواب صاحب کی سب سے بڑی بیٹی سے، جو ان کی ولی عہد تھیں، ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے اور نہ صرف یہ کہ بہ کمالِ مہربانی انھوں نے مجھے (کراچی کے مضافاتی علاقے) ملیر میں اپنی وسیع و عریض قیام گاہ پر ایک طویل ملاقات کا شرف بخشا تا کہ میں ان سے کسی قسم کے سوالات کرسکوں۔ حالاں کہ وہ اس وقت گر کر زخمی ہوجانے

کے باعث بستر سے اُٹھ بھی نہیں سکی تھیں پھر بھی بڑی خندہ پیشانی سے انھوں نے بے حد صبر اور خوش دلی سے میرے سوالات کے جوابات بھی دیے اور بہت سی خالص ذاتی باتیں بھی بتائیں۔

اس مسحور کن اور بے حد متحرک عالی شان عمر رسیدہ خاتون سے میری بے حد دل چسپ اور جذبات انگیز گفتگو کا وسیلہ تھیں جناب کے ایف حیدر کی صاحب زادی جو اب بھی شہزادی عابدہ سلطان سے رابطے میں تھیں۔ جن درجنوں سربرآوردہ شخصیتوں سے میری ملاقاتیں ہو چکی ہیں ان میں سب سے نمایاں ملاقات وہی تھی جو اس غیر معمولی خاتون سے ہوئی تھی۔ غیر معمولی صرف تاریخ کے اس آتشدان سے قربت اور ذاتی لگاؤ کی وجہ سے نہیں جس کے سلسلے میں یہ ملاقات ہو رہی تھی، بلکہ جس حقیقت پسندانہ اور فطری انداز میں انھوں نے برطانوی راج کے ایک اہم ستون اور دوسرے ہندوستانی شہزادوں کے بارے میں مجھے آگاہ کیا تھا۔ اس طرح مجھے ہندوستان کی تاریخ کے اس پہلو پر ایک حقیقی نظر ڈالنے، سمجھنے اور بہتر انداز میں دیکھنے کا اور ان غیر معمولی اور ترقی پسند شاہی شخصیتوں کو بہتر انداز میں سمجھنے کا موقع مل گیا، کے ایف حیدر جیسے لوگ جن کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔

بھوپال کی حکمرانی کی بنیاد ایک قسمت کے دھنی پٹھان یا افغان دوست محمد خاں نے رکھی تھی جس نے ۱۷۰۷ء میں شہنشاہ اورنگزیب کے انتقال کے بعد خود کو بھوپال کا خود مختار حکمراں ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ بھوپال کی پہلی خاتون حکمران نواب قدسیہ بیگم تھیں جو، شہزادی عابدہ سلطان کے مطابق پڑھی لکھی نہیں تھیں حتیٰ کہ وہ دستخط بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی عمر اس وقت اٹھارہ برس تھی جب ان کے حکمران شوہر کو قتل کر دیا گیا تھا، اور ان کی صرف دو برس کی ایک بیٹی تھی۔

غیر تعلیم یافتہ سہی مگر وہ بڑی دور رس نگاہیں رکھنے والی اور چالاک عورت رہی ہوں گی اس لیے کہ انھوں نے خاندان کے تمام مردوں کا ڈٹ کا مقابلہ کیا اور بالآخر اپنی بیٹی کو ریاست کا ولی عہد بنانے میں کامیاب رہیں۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو تمام فنونِ حرب کی تربیت دلوائی تا کہ وہ اندرونی اور بیرونی جنگ و جدل کے خطرات سے کامیابی سے نبرد آزما ہو سکے۔ ان کا ۱۸۳۷ء میں انتقال ہوا اور ان کے بعد ان کی بیٹی سکندر بیگم (۱۸۶۸ء۔ ۱۸۱۶ء) ریاست کی محبوب اور مؤثر حکمران بنیں۔ شہزادی عابدہ سلطان کی بلند مرتبت دادی سلطان جہاں بیگم (۱۹۳۰ء۔ ۱۸۵۸ء) ریاست میں خواتین حکمرانوں کے سلسلے کی آخری کڑی اور بہت کامیاب حکمران تھیں۔ ۱۸۷۴ء میں انھوں نے جلال آباد کے افغان اشرافیہ کے خاندان میں شادی کی اور ان کے ہاں دو بیٹیاں اور تین بیٹے تولد ہوئے، سب سے چھوٹے شہزادے محمد حمید اللہ خاں تھے جو ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے تھے، اور ۱۹۲۶ء میں 'ہمارے' نواب صاحب بھوپال کے حکمراں بنے۔

شہزادی عابدہ سلطان نے دسمبر ۱۹۹۷ء میں اپنی قیام گاہ پر مجھے خوش آمدید کرتے ہوئے بتایا کہ "میری دادی کے پانچ بچے تھے، اور میرے والد سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ دو بیٹیوں کا چودہ اور پندرہ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔ صرف تین بیٹے زندہ رہے تھے جن میں سب سے بڑے نواب نصر اللہ خان ولی عہد تھے اور میرے والد کے نواب بننے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا مگر دونوں بڑے بھائی پانچ مہینے کے فصل سے ۱۹۲۴ء میں انتقال کر گئے۔

مروّجہ قوانین کے مطابق ولی عہد کا بیٹا اپنے باپ کی جگہ لیتا تھا۔ میری دادی جو ابھی جوان تھیں، حکمران تھیں مگر ان سے اور ان کی اولاد سے اس لیے نالاں رہتی تھیں کہ انھوں نے اولاد کی صحیح تربیت نہیں کی تھی۔ وہ کبھی اسکول نہیں گئے، گھر پر ان کی تعلیم ہوئی جہاں امیر گھرانے کے ہندوستانیوں کی طرح ان کے ناز نخرے اُٹھائے جاتے تھے۔ میری دادی ان کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کے شوہر کا اس وقت انتقال ہو گیا تھا جب میرے والد، سب سے چھوٹی اولاد، صرف چھ برس کے تھے اور ان کی تربیت انھیں کے مزاج کے مطابق ہوئی تھی۔ وہ بہت روشن خیال اور ترقی پسند خاتون تھیں۔ وہ بچوں کے بہت زیادہ ناز نخرے اُٹھا کر ان کو خراب کر دینے کی قائل نہیں تھیں۔ انھوں نے ایک بہت ہمت والا قدم اُٹھایا اور میرے والد کو پڑھنے کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ میرے دادا اگر کچھ اور دن زندہ رہ جاتے تو میرے والد کو علی

گڑھ کی صورت دیکھنے کا کبھی موقع نہ ملتا، نہ ہی ان کو مولانا محمد علی، شوکت علی، جناح، نہرو، گاندھی تمام سربرآوردہ سیاست دانوں سے ملنا نصیب نہ ہوتا جو ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے سرخیل تھے۔ جب کہ ان کے دونوں بڑے بھائیوں کو ہندوستان کی سماجی اور سیاسی صورتِ حال کا ادراک نہ تھا۔ بھوپال کے اندر جو کچھ ہو رہا تھا وہ بس اس میں دل چسپی رکھتے تھے۔ میرے والد تعقل اور سیاست کے گمبھیر بھنور یعنی 'علی گڑھ تحریک' کے بیچوں بیچ تھے، اس لیے ان پر 'برطانیہ مخالف' کی چھاپ لگا دی گئی تھی۔ اور چوں کہ ولی عہدی اور نوابی سے ان کو بظاہر دور کا بھی واسطہ نہ تھا اس لیے جب تک وہ علی گڑھ میں تھے ان پر ہندوستان کے ان سیاسی لیڈروں سے ملنے جلنے پر کوئی قدغن نہ تھی۔ اس طرح انھوں نے علی گڑھ جیسی زندگی کو اپنایا اور واقعتاً وہ دل سے برطانیہ کے مخالف تھے۔

مسلم لیگ کے ایک اہم لیڈر چودھری خلیق الزماں ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۶ء تک علی گڑھ میں رہے تھے، اس لیے شہزادہ حمید اللہ خان سے ان کی ملاقات تھی۔ اپنی یادداشتوں میں نواب صاحب کے بارے میں انھوں لکھا ہے، ''۱۹۱۰ء میں شہزادہ حمید اللہ خاں اس ادارے میں داخل ہوئے، جو بھوپال کی بیگم کے تیسرے بیٹے تھے۔ سرسیّد کورٹ کا کمرہ نمبر ۳۳، جس میں میرے پیارے دوست اور ہاکی کے کپتان نورالدین، اسد علی کے بھائی سرور علی وغیرہ کی، جو ہاکی کے بے مثل کھلاڑی تھے، جولا نگاہ بن چکا تھا جس میں حمید اللہ خاں بھی شامل ہوتے تھے۔ اگر چہ حمید اللہ خان بورڈنگ ہاؤس کے احاطے کے باہر واقع ایک بنگلے میں رہتے تھے مگر وہ رات گئے تک ہم لوگوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ان میں وہ مریضانہ جھینپ اور شرمیلا پن نہیں تھا جو دنیا سے الگ، کاسہ لیسوں اور خوشامدی افراد سے بھری حرم جیسی زندگی میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے نہ ہی ان میں تکبر اور غرور کا دور دور شائبہ تھا۔ وہ صرف نام کے شہزادے تھے ورنہ ان کا رہن سہن، اوڑھنا پہننا، عادتیں اور انسانوں میں آپس کی برابری جیسے خیالات، آزاد خیالی اور عوام کی خدمت وغیرہ ویسے ہی تھے جیسے کہ ایک عام آدمی میں ہوتے ہیں۔ اس زمانے اور عمر میں بھی وہ بہت سمجھ دار انسان تھے مگر ان میں دل و دماغ کی جو خوبیاں مسلمانوں کی دوسری سب سے بڑی ریاست بھوپال کے نواب کی حیثیت میں نظر آئیں، وہ اس وقت کے بیشتر مسلمان سیاست دانوں سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ وہ بڑی مشکل میں تھے۔ اگر وہ ہندوستانی سیاست کے تمام الجھاؤ کی آگ میں تپ کر اپنی وسعتِ نظری، اور قومی نظریات کے ساتھ ملکی سیاست میں آتے تو شاید وہ ہندوستان کے گروہی مسائل کا حل پیش کر سکتے تھے۔ ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ایک نواب تھے۔''

اب وہ وقت آ گیا تھا کہ ہندوستان کی دوسری ریاستیں کھل کر مسلمانوں کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ اس وقت کے راجا صاحب محمود آباد یونی ورسٹی فنڈ کے نائب صدر تھے، وہ فنڈ جو آغا خان کی سرپرستی میں جمع کرنے کی مہم چلائی گئی تھی اور جنھوں نے مولانا محمد علی کے ہمراہ پورے ہندوستان کا سفر کیا تھا اور چندے کے لیے اپیل کی تھی۔ اسی زمانے میں طرابلس کے ترک باشندوں پر اطالیہ کے حملوں کے خلاف طالب علموں نے علی گڑھ میں شدید مظاہرے کیے تھے اور خلیق الزماں نے ہمیں بتایا کہ ''حمید اللہ خان اپنی حیثیت کے باوجود ہمارے ساتھ تھے'' اور ان کو ان برطانیہ مخالف قوتوں سے قربت محسوس ہوئی ہو گی اس لیے کہ بقول خلیق الزماں، جنھوں نے انھی دنوں لکھنؤ میں وکالت شروع کی تھی، وہ علی برادران کی طرف سے حمید اللہ خان کے نام ایک پیغام لے کر جا رہے تھے جس میں یہ اطلاع بھیجی جا رہی تھی کہ اگر کھلی بغاوت کی ضرورت پڑی تو بھوپال ان کا مرکزی مقام ہو گا۔ علی برادران اور دوسروں نے خلافت تحریک کے لیے جو کام کیے تھے، میں نے عبدالرحمٰن صدیقی کے خاکے میں ان کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ مولانا محمد علی دہلی سے جاری ہونے والے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار 'کامریڈ' کے بانی، ناشر اور اڈیٹر تھے، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے بہت طاقت ور صحافی تھے۔ 'The Choice of Turks' کے عنوان سے ۱۹۱۵ء میں اخبار 'کامریڈ' میں ایک سلسلے وار مضمون لکھنے اور شائع کرنے پر ان پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور سزا ہوئی۔ اس مضمون میں انھوں نے پہلی جنگِ عظیم میں برطانیہ کے خلاف ترکوں کی شمولیت کے فیصلے کو جائز قرار دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں رہائی کے بعد انھوں نے اردو زبان میں 'کامریڈ' کا اجرا کیا اور کئی برسوں تک وہ مسلم تحریک کا غیر سرکاری ترجمان رہا۔ تعجب نہیں کہ برطانوی حکومت شہزادہ حمید اللہ خاں کی

وراثتِ تخت کے تحت خلاف تھی، جس کے حق میں ان کی ماں بڑی تن دہی سے لڑتی رہی تھیں۔

ان (شہزادہ حمید اللہ خان) کے دو بڑے بھائی ۱۹۲۴ء میں انتقال کر گئے، اس لیے وراثت کا مسئلہ طے ہونا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کا وائسرائے لارڈ ریڈنگ تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ موجودہ ولی عہد کا بیٹا ہی وارث ہوگا۔ مگر شہزادی عابدہ سلطان کے مطابق ''دادی نے کہا نہیں'' ان کی اب بھی توانا آواز اور بھی مستحکم ہو جاتی جب وہ اپنی دادی کی داستان بیان کرتیں، جن کو وہ بہت چاہتی تھیں اور جنھوں نے برطانیہ سے اپنے بیٹے کی وراثت کی جنگ لڑی تھی۔ ''انھوں نے اسلامی قانون کا حوالہ دینا شروع کیا اور دعویٰ کیا کہ ان کا بچ رہنے والا سب سے چھوٹا بیٹا پوتے کے مقابلے میں وراثت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ مگر وائسرائے میرے والد کا مخالف تھا اور اس نے علی گڑھ کے معاملے کا سارا کچا چٹھا جمع کر رکھا تھا۔ اس کے برعکس حکومت کے کچھ ہم درد اعلیٰ افسران جانتے تھے کہ دوسرے نوجوان لڑکے حکمران بننے کے قابل نہیں تھے اس لیے کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں، بالکل وحشی تھے۔ حتمی فیصلے کے لیے مقدمہ جب لارڈ ریڈنگ کے روبرو پیش ہوا تو اس نے لکھا، 'ان کے برطانیہ مخالف رجحانات کی بنا پر کسی بھی حالت میں برطانوی حکومت حمید اللہ خان کو دوسری سب سے بڑی مسلم ریاست کے حکمران کی حیثیت سے برداشت نہیں کر سکتی۔' جب میری دادی کو احساس ہو گیا کہ وہ مقدمہ ہارنے والی ہیں تو انھوں نے فوراً انگلستان جانے اور پریوی کاؤنسل کو اپیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ ہم سب، یعنی دادی اماں، والد، والدہ، میری بہنیں اور میں اکٹھے لندن پہنچے اور ایک بہت اچھے مکان ۲۹ پورٹ مین اسکوائر میں مقیم ہوئے۔ اور یہ پہلا موقع تھا جب ہم سب کو حقیقی آزادی نصیب ہوئی تھی اس لیے کہ 'سرکار اماں' جیسا کہ ہم سب اپنی دادی کو پکارتے تھے، آج کل خود بہت مصروف تھیں۔ اب ہم چپکے چپکے سینما جا سکتے تھے۔ بھوپال میں ہمیں جس کی اجازت نہ تھی۔ بمبئی کے گورنر کی اہلیہ لیڈی ویلنگٹن نے تو سرکار اماں کو خود اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ چارلی چپلن کی فلم 'The Gold Rush' دیکھنے جائیں اس لیے کہ اس میں محبت وغیرہ کے ایسے مناظر نہیں جو ان کے مذہبی احساسات کے خلاف ہوں۔ ان کو وہ فلم پسند آئی اور یوں ایک بار ہی نہیں دوسری بار بھی دیکھی گئی۔

''جی ہاں! وہ لندن میں بہت مصروف رہیں، پریوی کاؤنسل کے ارکان سے بھی اور شہنشاہ جارج سے بھی ملیں۔ انھوں نے دلیلیں دیں، چلّائیں، روئیں، حتیٰ کہ شہنشاہ کے سامنے بے ہوش بھی ہو گئیں۔ وہ برابر بھوپال اور برطانوی ہند کے مابین معاہدے کی نویں شق کا حوالہ دیتی رہیں جس کے مطابق وہ بھوپال کے داخلی معاملات میں دخل نہیں دیں گے۔ اور وہ بار بار یہی دلیل دیتیں کہ برطانیہ کو بھوپال کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا حق نہیں ہے۔ بالآخر نتیجہ ہی سب کچھ ہوتا ہے کے مصداق، انھوں وہ کچھ مل گیا ہے جو وہ چاہتی تھیں، میرے والد کو ولی عہد مان لیا گیا۔ اس دوران، آٹھ دس ماہ کے وقفے میں، میرے چچازادوں نے بھوپال میں میرے والد کو قتل کرنے کی کئی کوششیں کیں۔ یہ ہندوستان کے حکمران خاندانوں میں بہت عام سی بات تھی۔ اس لیے جو کچھ سرکار اماں نے کیا یہ ویسی ہی دور اندیشی کا کام تھا جتنی کہ وہ زیرک تھیں۔ جوں ہی ان کو تحریری فیصلہ ملا کہ برطانوی حکومت نے حمید اللہ خاں کو ریاست بھوپال کا ولی عہد تسلیم کر لیا ہے، انھوں نے نوابی سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے رات کے تین بجے، یہیں لندن میں، نوابی سے دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ فوراً برطانوی حکومت کے نام ایک خط لکھا گیا تھا اور بھوپال اور ہندوستان میں برطانیہ کی حکومت کو تار ارسال کر دیے گئے تھے۔ انھوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اس لیے کہ اگر وہ یہ قدم نہ اٹھاتیں تو، انھیں پورا یقین تھا کہ میرے والد قتل کر دیے جاتے۔

''ہم سب بہت خوش تھے۔ میری عمر بارہ برس کی تھی اور میں بہت زیادہ پُر جوش نہیں تھی۔ ہم اس وقت تک ومبلڈن منتقل ہو گئے تھے اس لیے کہ پورٹ مین اسکوائر کی لیز ختم ہو گئی تھی۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے، ہم سب ایک ساتھ تھے اس لیے کہ میری دادی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اپنے مقدمہ ہار جاتیں تو وہ بھوپال واپس نہ جاتیں۔ بہر حال میرے والد ولی عہد بن چکے تھے اور چند ہی گھنٹوں بعد وہ حاکم بھی بن گئے اس لیے کہ میری دادی حکمرانی سے دست بردار ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے انگریز سرکار بہت ناخوش تھی۔ حکومت نے یہ الزام دھرا

کہ انھوں نے اپنے اصل ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا مگر ان کا کہنا یہ تھا وہ کسی بھی حالت میں ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی اولاد میں سے صرف ایک باقی رہ گئی تھی اور وہ کسی بھی حالت میں ان کی زندگی کی بازی نہیں لگا سکتی تھیں جو ان کے مطابق بہت خطرے میں تھی۔ بالآخر برطانویوں نے ہتھیار ڈال دیے مگر ان کا یہ اصرار تھا کہ پچھلے ولی عہد کے بیٹے، یعنی میرے عم زاد، کو میرے والد کا ولی عہد نامزد کیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ چوں کہ میرے والد کے کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی اس لیے ریاست کی بہتری کی خاطر ان کا بھتیجا ان کا ولی عہد بنے۔ میری دادی نے پھر ایک ماہر جنگجو کی طرح لڑائی لڑی اور کامیابی کے بعد ہی میدان سے ہٹیں۔ سرکاری طور پر میں ولی عہد بن چکی تھی۔"

ہشت پہلو خاتون شہزادی عابدہ سلطان مسکرائیں اور ان کی مسکراہٹ صاف کہہ رہی تھی کہ ان کو اپنی دادی کی، جنھوں نے انھیں بیٹی کی طرح پالا تھا، بہادری کی داستان سنانے میں بہت لطف آ رہا تھا۔ انھوں نے کہا، "میری والدہ کو مجھ سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میری دادی کی دو لڑکیاں وفات پا چکی تھیں اس لیے جب میں پیدا ہوئی تو انھوں نے مجھے گود میں اُٹھا لیا اور سیدھے اپنے کمرے میں لے گئیں اور میں وہاں سے سترہ برس بعد نکلی جب 'سرکار اماں' کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں ان کی چہیتی تھی۔ میرے اس طرح لے جانے سے مراد کوئی جبر یا ظلم نہیں تھا۔ ان کے دل میں ایک طرح کا ملال تھا کہ انھیں کسی لڑکی کو اپنی طرح ڈھالنے کا موقع نہیں ملا کہ وہ ایک معیاری مسلمان عورت کی مثال بن سکے۔ اور ان ہی کی طرح، مجھے پردہ کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا۔"

جب ہم سب ۱۹۶۲ء میں ہندوستان واپس پہنچے تو زندگی میں ایک طرح کی تبدیلی آ گئی تھی۔ چوں کہ شہزادی عابدہ کے والد نئے حاکم کے طور پر واپس آ رہے تھے، جن کے حق میں 'سرکار اماں' حکمرانی سے دست بردار ہو چکی تھیں، اس لیے حفظِ مراتب کا خیال رکھا جا رہا تھا اور بہت آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ "ہم تین لڑکیاں میری والدہ اور میری دادی، سب ایک قسم کے جلوس کی صورت میں چلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ اچانک میری دادی نے فیصلہ کیا کہ چوں کہ میں اب (تیرہ برس کی ہو کر) بالغ ہو چکی تھی اس لیے مجھے پردے میں جانا ہوگا۔ یہ سن کر مجھے دھچکا لگا مگر مجھے برداشت کرنا پڑا۔ مگر زیادہ دنوں تک مجھے پردے میں نہیں رکھا جا سکا۔ میں نے بغاوت شروع کی اور آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ جوں ہی میری دادی آنکھوں سے اوجھل ہوتیں، میں وہی کچھ کرنے کے لیے غائب ہو جاتی، جو میں ولی عہد بننے سے پہلے کیا کرتی تھی، یعنی، باہر نکلنا، پولو کھیلنا، گھڑ سواری کرنا وغیرہ۔ ایک دن میری دادی کہیں جا رہی تھیں کہ ان سے میری مڈبھیڑ ہو گئی، مجھے بغیر برقعے کے کار چلاتا دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گئیں۔ انھوں نے فوراً میرے والد کو، جو اب حاکم تھے، بُلا بھیجا اور اصرار کر کے انھیں اس بات پر راضی کر لیا کہ نہ صرف میں بلکہ خاندان کی تمام عورتیں پردہ کرنا چھوڑ دیں۔ ہم لوگ بہت خوش اور اپنے والد کے شکرگزار ہوئے۔"

شہزادی عابدہ نے جب از راہِ مہربانی مجھے گفتگو کے لیے بلایا تھا، جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، وہ اپنی ٹانگ کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے بستر پر دراز تھیں۔ میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا کہ وہ پہلی ہندوستانی عورت تھیں جنھیں ہوابازی کا لائسنس مل چکا تھا، وہ عورت جس کی کسی بھی کار کو کبھی کسی مستری نے ہاتھ نہیں لگایا تھا اس لیے کہ وہ آج بھی خود اپنے ہاتھوں ان کی مرمّت اور دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ یہ تھی وہ ماضیِ بعید کی نہایت شائستہ اور کمیاب نوع کی تجسیم، تاریخ کی ایک زندہ مثال، اور اس کے باوجود نہایت زیرک، بڑی باعمل اور اعلیٰ درجے کی آزاد خاتون۔ ان کی جانب نظر کرنے سے پہلے ہی جس چیز پر میری نظر پڑی تھی وہ دو عدد اعلیٰ درجے کی خوف ناک رائفلیں تھیں، ان میں سے ایک ان کے پاس تھی۔ ابتدائی آداب و تسلیمات کے بعد انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ بندوقیں، دکھاوے کے لیے نہیں، اصلی ہیں۔ یہ بھی کہ کچھ دن پہلے ہی انھوں نے ایک چور کو بھگانے کے لیے چلائی تھی جو ان کے گھر میں گھس آیا تھا۔

"ہم سب بندوقوں کے سائے میں پلے بڑھے تھے، یہ ہماری روایت تھی۔ جب میں اور میری بہنیں پیدا ہوئیں تھیں، پیدائش سے قبل ایک گھوڑا تیار کھڑا ہوتا تھا اور پیدائش کے فوراً بعد نوزائیدہ کو پالنے میں ڈال کر گھوڑے کی پشت پر رکھ دیا جاتا تھا۔ یہ ہمارے خاندان کی روایت تھی۔ اس سے مطلب نہیں کہ نوزائیدہ لڑکا تھا یا لڑکی۔ جنسی اعتبار سے کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ کیوں نہ ہو، ہماری ریاست پر چار

عورتوں نے ، ایک کے بعد ایک ، ۱۰۸ / برس حکمرانی کی تھی ۔"

بیٹی اور نوجوان شہزادی عابدہ کو اپنے والد پر بڑا فخر رہا ہوگا اور میرے خیال میں وہ اپنے باپ سے بہت قریب تھیں ۔ جس انداز میں وہ اپنے والد کا ذکر کرتی تھیں اس سے لگتا تھا کہ وہ بہت خیال کرنے والے باپ، خوب رو، ذہانت کی کشش رکھنے والے اور اعلیٰ درجے کے شکاری تھے ۔ وہ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی، ہندوستان میں پولو کے سب سے اچھے کھلاڑی اور اعلیٰ درجے کے نشانے باز بھی تھے ۔ ہندوستان کے دوسرے بہت سے شہزادوں کے برعکس ہندوستان کی سیاست میں وہ گہری دل چسپی لیتے تھے ۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں ہندوستان میں اس وقت کے بہترین دماغوں سے قربت کے مواقع حاصل رہے تھے ۔

حمید اللہ خان نے خود کو بہت خوش قسمت سمجھا ہوگا کہ ، اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں، انھیں چالیس برس تک ایک عام انسان جیسی زندگی نصیب ہوئی ۔ اگر ولی عہدی کا ذرا بھی شائبہ ہوتا تو انھیں علی گڑھ جانا کبھی نصیب نہیں ہوتا ۔ اور انھیں ایسے دوست بھی نصیب نہیں ہوتے جنھوں نے ، ان کے حاکم بن جانے کے بعد، نہ صرف ان کی زندگی میں بلکہ ریاست کے اہم مناصب پر رہ کر بھوپال کے لیے بہت کام کیے تھے ۔

بہت ممتاز لوگ، جنھوں نے پاکستان کے قیام کے بعد نئی مملکت اور اس کی ترقی کے لیے نمایاں کام کیے ۔ پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل ، غلام محمد کے طویل عرصے کے دوست اور ساتھی شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی، طویل عرصے تک رہنے والے پاکستان کے وزیرِ خارجہ اور اقوامِ متحدہ میں اس کے مندوب چودھری محمد ظفر اللہ خاں ان لوگوں میں سے تھے جو مل کر 'Round Table of the Nawab's Court at Camelot' بن گئے تھے ۔

ان میں سے زیادہ تر انگلستان میں اپنے قیام کے دوران قریبی دوست تھے ، جب کہ کچھ تو علی گڑھ ہی سے دوست بن گئے تھے ۔ وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ جتنی جلد ہو سکے برطانیہ کا راج ختم ہونا چاہیے حالاں کہ ان میں کسی کو بھی ان کے اندازِ زندگی سے اختلاف نہیں تھا ۔ اس کے برعکس، ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کی طرح وہ انگلستان کو اپنی عقلی و ذہنی پناہ گاہ سمجھتے تھے اور وہاں کے سیاسی اداروں اور معاشرتی نظام کو اپنے ملک میں رائج کرنے کے قابل سمجھتے تھے ۔ انگلستان میں نواب صاحب بھوپال اور ان کے دوستوں نے معاشی میدان میں مسلمانوں کے عملی طور پر شریک ہونے کے بارے میں تبادلہٴ خیال کیا ۔ اور جوں ہی مسلمانوں کی ملکیت میں ایک بیمہ کمپنی کی تشکیل کا خیال پیش کیا گیا تو انھوں نے فوراً اس کے لیے مالی مدد فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور جب ۱۹۳۲ء میں کلکتے میں ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کی بنیاد پڑی تو اس کا سرپرست ہونا قبول کر لیا جب کہ دوسرے سرپرست آغا خان بنے ۔

جن لوگوں کا ابھی تذکرہ کیا گیا ان کے، یا علی برادران کی طرح، ایک اور انسان ڈاکٹر انصاری تھے جو خلافت تحریک کے دوران مشہور طبّی وفد لے کر ترکی گئے تھے، عقلی اعتبار سے ایک نابغہٴ روزگار راجا صاحب محمود آباد، یا چودھری خلیق الزماں، یہ سب اپنے انداز میں نواب حمید اللہ خاں پر اثر انداز ہوئے ہوں گے جو گویا خود تار پر چلنے کے ماہر تھے ۔ تار پر چلنے کے ماہر اس لیے کہ وہ دو مختلف دنیاؤں کے درمیان چلتے رہتے اور ہر جگہ خوش آمدید کہے جاتے ، اور یہ کوئی آسان بات نہ تھی ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب صاحب بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے اور دونوں جانب سے اٹھنے والے بڑے سے بڑے مشکل حالات میں کامیاب رہتے تھے ۔ جب پرنس آف ویلز ہندوستان تشریف لائے تھے تو نواب صاحب ان کے اے ڈی سی کی حیثیت سے ان کے ساتھ ساتھ رہے ۔ ان کو اس بات پر بجا طور پر بڑا فخر تھا کہ انھوں نے مہمان برطانوی شہزادے کو پولو کے کھیل میں، ان کی ماں کی موجودگی میں اور حد درجہ شرمندگی کے باوجود، شکست دی ۔ وہ براہِ راست ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے فعّال کارکن رہے، چانسلر کی حیثیت سے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں ہندوستانی شہزادوں کے چیمبر کی نمائندگی کی اور ان کی جانب سے ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک مذاکرات اور معاملات طے کیے ۔ ان سب کے

لیے غیر معمولی ذہانت، لچک، ہمت اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے جو بہ ظاہر نواب صاحب میں وافر مقدار میں موجود تھی۔

شہزادی عابدہ کو گول میز کانفرنس کے سلسلے میں متعدد بار لندن کا سفر اچھی طرح یاد ہے۔ جناب عمر خان سے اپنی ایک گفتگو میں انھوں نے بتایا تھا کہ "ان دنوں امیدیں بہت تھیں اور در حقیقت لوگوں کو یقین نہیں تھا کہ انگریز کبھی ہندوستان کو چھوڑیں گے۔ پھر بھی ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کسی قسم کی نمائندگی دینے کا کوئی نسخہ نکالا جائے گے تا کہ لوگ مطمئن ہو جائیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں موتی لال نہرو سے، جب وہ بھی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن جا رہے تھے، ملی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں ان کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ وہ بہت نفیس انسان تھے۔"

یہ سب انھوں نے ہماری ملاقات کے دوران بتایا تھا، اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ مہاتما گاندھی کو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ بھی اس جہاز پر تھے جس پر ہندوستان کے دوسرے نمائندے، جناح، موتی لال نہرو اور ان کے بیٹے جواہر لال، آزاد اور گاندھی وغیرہ سفر کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کی وہ ان سب سے ملی تھیں۔ اور جب میں نے ان سے استفسار کیا کہ مہاتما ان کو کیوں پسند نہیں آئے، جن کو ہندوستان کی اکثریت پسند کرتی تھی تو انھوں نے کہا، "سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ میرے خیال میں وہ ریاکار انسان تھے۔ اس لیے کہ خود کو مسلمانوں کا ہم درد جتانے کے لیے روزانہ قرآن کی آیات پڑھتے تھے۔ پھر وہ سب کو برابر سمجھنے اور لوگوں میں کسی قسم کی تفریق نہ کرنے کا ڈھکوسلا کرتے تھے، کہ ان کی نظر میں سب برابر تھے۔ مگر ان کے بارے میں میرا پہلا تاثر ایک ایسے انسان کا تھا جس کے لیے اتنی ہنگامہ خیزی کی جاتی تھی، اور ان کے گرد اخبار والے اس بات پر ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے کہ وہ تیسرے درجے میں سفر کر رہے تھے۔ اور پھر مجھے احساس ہوا کہ اچھا وہ تیسرے درجے میں سفر کر رہے ہیں، مگر تیسرے درجے کا پورا عرشہ ان کے لیے خالی کرا لیا گیا تھا اور سارے مسافروں کو نیچے کے تہہ خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا جہاں وہ اپنا کھانا بھی پکاتے تھے۔ یہ سب کچھ بے پناہ گرمی کے عالم میں تھا کہ جہاں تازہ ہوا کا گزر نہ تھا۔ اور ان کو اوپری عرشے پر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اور وہاں وہ، جنابِ گاندھی، پورے عرشے پر تنِ تنہا براجمان رہتے۔ یہ سب کچھ آخر ڈراما نہیں تو اور کیا تھا۔ ان کا خدا اس بارے میں کیا سوچتا رہا ہو گا؟"

"پیٹرک فرنچ نے اپنی خوب صورت کتاب 'Liberty or Death' میں لکھا ہے کہ 'گاندھی کے اندازِ حیات میں بہت تضاد تھا۔ وہ غربت کے خلاف جنگ آزما تھے، جدید صنعت کاری کی مذمت کرتے تھے پھر بھی برلا، سہا والوں اور بجاج خاندان کے بڑے مسرف عطیات پر انحصار کرتے تھے جن کی تمام دولت اسی سے پیدا ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے چیلوں کے ہجوم کے ساتھ سفر کرتے تھے جو دوسروں سے بے حد نخوت اور سرد مہری سے پیش آنے کے لیے مشہور تھے۔ اس کے باوجود مہاتما خصوصی برتاؤ کے خلاف ہونے کے دعوے کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی دیہی آبادی کی طرح رہنا پسند کرتے تھے مگر وہ جہاں کہیں بھی جاتے، جڑی بوٹیوں، ترکاریوں اور خصی بکروں کا انبار لگا دیا جاتا، عمارتیں رگڑ رگڑ کر صاف کی جاتیں، سفیدی اور سجاوٹ کی جاتی، اور مٹی کو ریفریجریٹر میں رکھ کر ٹھنڈا کیا جاتا جس کو مہاتما 'فطری علاج' کی غرض سے اپنے پیٹ پر ملتے تھے۔ ان کے مخالف محمد علی جناح کہتے تھے کہ وہ اوّل درجے میں سفر کرنے کے باوجود ریل کے کرائے کی مد میں گاندھی سے کم رقم خرچ کرتے تھے، اس لیے کہ وہ صرف ایک ہی ٹکٹ خریدتے تھے۔"

نواب صاحب کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات مہیا نہیں۔ کے ایف حیدر جیسے ان کے قریبی دوستوں کے مطابق، جو اُن کے رازداں بھی تھے، وہ بہت سخی تھے اور خوش گوار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک ایسے انسان کہے جاتے ہیں جس کو اپنی رعایا کا بہت خیال رہتا تھا اور جو خوب جانتے تھے کہ ان کی ریاست کے عوام کے لیے تعلیم کی بہترین سہولت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اور یہ پڑھ کر کہ نواب صاحب کو 'Round Table at His Court of Camelot' کے اطراف ملک کی بہترین شخصیات کو اکٹھا کرنے میں ملکہ حاصل تھا، میرے قاری یہ جان کر حیران نہیں ہوں گے کہ سر سیّد احمد خاں کے فرزند سر سیّد راس مسعود، جو ایک مشہور ماہرِ تعلیم تھے، ان کی

ریاست میں تعلیم کے وزیر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔ اور جب وہ بھوپال میں تھے، انھوں نے ڈاکٹر سر اقبال کو وہاں آنے اور اپنے پاس کچھ دن قیام کرنے کی دعوت دی تھی اور اس عظیم فلسفی کے لیے پانچ سو روپے کی ماہانہ پنشن کا انتظام بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ نواب صاحب نے شاعر کے علاج کا خرچ بھی برداشت کیا تھا۔

نواب صاحب کے پاکستان موافق سیاسی نظریات سب کو معلوم تھے۔ بہت ابتدائی مرحلے پر ہی انھوں نے پاکستان کی تحریک کی حمایت کی تھی۔ اس کے باوجود 'چیمبر آف پرنسز' کی جانب سے ہندوستان کی آزادی کی صورت میں رجواڑوں اور نوابوں کے لیے زیادہ سے زیادہ خود مختاری کے لیے دلائل دیے تھے اور سائمن رپورٹ کے مطابق ایک 'پریوی کونسل' کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ وہ مرکز میں ایک ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن کے حق میں تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی حکومت کو 'برطانوی فرماں روائی' منتقل کی جائے۔

جوں ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جون ۱۹۴۷ء میں اقتدار کی منتقلی کے برطانوی منصوبے کا اعلان کیا، انھوں نے 'چیمبر آف پرنسز' کے چانسلر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ بھوپال کو خود مختار حیثیت ملے اور اندور کے مہاراجا کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک گروپ کی سربراہی کی جو ریاستوں کے الحاق کے خلاف تھا۔ انھوں نے ۲۵ر جولائی ۱۹۴۷ء کو سارے حکمرانوں کے اجتماع میں شرکت سے انکار کر دیا جس سے ان کے بچپنے کے دوست وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن خطاب کرنے والے تھے۔ انھوں نے کھلم کھلا شکایت کی کہ ریاستوں کے حکمرانوں کو Walrus اور Carpenter کی سیپیوں کی طرح دعوت دی جارہی ہے (یہاں ایک شاعر Lewis Carroll کی ایک نظم کنائے کے طور پر استعمال کی گئی ہے۔ یہ نظم ۱۸۷۱ء میں اس کے مجموعے Through the Looking Glass میں شائع ہوئی تھی جو بچوں کے ادب پر مشتمل تھی۔ اس نظم میں دو کردار والرس اور کارپینٹر ایک شب ساحل کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ ان کی چند سیپیوں سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے چار بڑی سیپیوں کو اپنے ساتھ تفریح کی دعوت دی۔ سب سے عمر رسیدہ سیپ کی مخالفت کے باوجود بہت سی سیپیاں ہمراہ ہو لیں۔ ساحل کے کنارے چلتے چلتے دونوں کرداروں Walrus اور Carpenter کو بھوک لگتی ہے اور وہ مل کر ساری سیپیوں کو چٹ کر جاتے ہیں۔ بعد میں Walrus کو اپنے کیے پر پچھتاوا ہوتا ہے اور وہ رونے لگتا ہے۔ مترجم) حالاں کہ نواب صاحب کو مختلف انتظامی طریقوں سے رام کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ اپنے بچپن کے دوست، وائسرائے کے ذاتی اصرار کے باوجود اپنے اقدام پر اڑے رہے۔

وائسرائے نے لکھا، ''میرے خیال کے مطابق میں نے مجموعی طور پر اوروں کے مقابلے میں بھوپال کے معاملے پر بہت وقت صرف کیا ہے کہ نواب بہت مسحور کن اور بلند اصولوں والی شخصیت ہیں اور یہ بڑا سانحہ ہوگا اگر اس وقت شرکت نہ کر کے وہ اپنی ریاست کو تباہ کر دیں گے۔''

کہا جاتا ہے کہ دو دن قبل ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نواب صاحب سے کافی طویل گفتگو ہوئی تھی جس میں انھوں نے اپنی بیٹی کے حق میں دست برداری کی دھمکی دی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن لکھتے ہیں کہ ''میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں اس کو ایک بزدلانہ عمل جانتا ہوں اور یہ ان کی بیٹی کے حق میں غیر منصفانہ ہوگا اور یہ بھی کہ ان کو کم از کم ایک برس تک ریاست کی حکمرانی کرنی چاہیے..... اگر اس کو ٹال سکا تو میں نہیں سمجھتا کہ میں انھیں حکمرانی سے دست برداری کی اجازت دوں گا، اس لیے کہ بادی النظر میں ایسا لگے گا گویا ان پر جبر کیا جارہا ہے، جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے، جس کا پہلے وہ خود اعتراف کر چکے ہیں۔''

یہ دیکھ کر کہ حکمرانوں کی اکثریت الحاق کر رہی ہے، نواب صاحب کے قدم ڈگمگا گئے۔ انھوں نے الحاق کیے بغیر ایک 'توقفی معاہدے' کے لیے کہا مگر ان کو نفی میں جواب ملا۔ پھر انھوں نے اپنے آئینی مشیر سر ظفر اللہ خان کو الحاق کی دستاویز پر بات چیت کے لیے بھیجا مگر ان کو بھی یہی جواب ملا کہ انھیں کوئی خصوصی شرائط نہیں ملیں گی۔ انھوں نے بالآخر دستاویز پر دستخط کر دیے اس شرط پر کہ انتقالِ اقتدار کے دس دن گزرنے تک اس کو خفیہ رکھا جائے گا۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں بھوپال میں ایک عبوری حکومت بنائی گئی اور جون ۱۹۴۹ء میں بھوپال کو چیف

کمشنری کا صوبہ بنادیا گیا۔ اس طرح مرکزی ایشیا کی دوسری سب سے بڑی مسلم ریاست کی خودمختاری اپنے انجام کو پہنچی۔ ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی تنظیم نو کے بعد ریاست بھوپال مدھیہ پردیش میں ضم ہوگئی اور بھوپال شہر صوبے کا صدر مقام بنادیا گیا۔

اس انضمام پر مجھے ۱۹۹۹ء کا ایک دل چسپ واقعہ یاد آیا، جب میں ہندوستان گیا ہوا تھا۔ ہندوستان کے ایک سابق صدر شنکر دیال شرما کا انھیں دنوں انتقال ہوا تھا اور ایک تعزیتی پیغام میں، جو میں نے انڈین ایئر لائنز کی پرواز پر ملنے والے کسی اخبار میں پڑھا تھا، لکھا ہوا تھا کہ آنجہانی بھوپال میں ایک سنسکرت کے عالم کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ شرما بہت قابل رہے ہوں گے اور انھوں نے شروع ہی سے اپنی تعلیمی زندگی میں محنت کی ہوگی۔ ان کی اعلیٰ تعلیم آگرے میں اور اس کے بعد الٰہ آباد یونی ورسٹی میں ہوئی تھی جہاں سے انھوں نے انگریزی میں ایم اے اور ایل ایل بی کیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد وہ کیمبرج گئے، ایک برس ہارورڈ میں پڑھے اور لنکنز ان سے بیرسٹر فارغ التحصیل ہوئے۔ اس برس ہندوستان واپسی پر شرما جی نے ایک مظاہرے میں حصہ لیا جو نواب بھوپال کے خلاف ہو رہا تھا جس میں بھوپال کو ہندوستان میں ضم کرنے کی مانگ کی جا رہی تھی۔ اس مظاہرے میں شرما جی نے نواب بھوپال پر غدّاری کا الزام لگایا اور جلسے کے اختتام پر ان کو گرفتار کر کے آٹھ ماہ کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ بھوپال کے ہندوستان میں انضمام کے بعد ان کو رہائی ملی اور وہ تدریس کی غرض سے لکھنؤ یونی ورسٹی سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۵۲ء میں ریاست کے سابقہ قیدی چیف منسٹر کی حیثیت سے اپنے گھر واپس ہوئے اور یہ عہدہ اُس وقت تک ان ہی کے پاس رہا جب بھوپال کو نئے بنائے جانے والے صوبے مدھیہ پردیش میں ضم کر دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ وقت کے گزر جانے کے باعث میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں مرحوم نواب صاحب سے اُن کی رعایا کے ایک فرد کی عالی شان ترقی کے بارے میں ان کے خیالات دریافت کرسکتا۔ مگر میں تصوّر کرسکتا ہوں کہ انھیں اس بات پر بہت فخر رہا ہوگا۔

بھوپال کے حکمران کی ولی عہد شہزادی عابدہ سلطان کے روبرو کراچی، پاکستان میں بیٹھے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ انھوں نے بڑے امتیاز سے اس ملک کے لیے سفارتی خدمات انجام دی ہیں، میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ نواب صاحب نے تقسیم اور ریاست کے ہندوستان سے الحاق کے بعد پاکستان ہجرت کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ بالخصوص اس لیے کہ اس ملک کی تخلیق میں اور اس کو ہندوستان کے مسلمانوں کا گھر بنانے میں انھوں نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

شہزادی نے کافی دیر سوچ کر جواب دیا کہ ''جہاں تک میری ذات کا سوال تھا میں ۱۹۴۷ء سے کافی پہلے ہی بیگم محمد علی (مولانا محمد علی کی اہلیہ) کے ساتھ پاکستانی بن چکی تھی جب اس کی تشکیل بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں بیگم محمد علی کے قصوں اور ان کے تصورات کے زیر اثر مکمل طور پر پاکستان کے لیے وقف ہو چکی تھی۔ ایک تو میں بہت مذہبی تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ میرے خیال میں پاکستان ایک بڑا بھوپال، مگر اس جیسا ہی ہوگا۔ یہ کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ اس ملک کے کچھ لوگ اس کو مذہبی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ بلا شبہ جناح صاحب نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔ اور میرے والد بچپن سے میرے لیے نمونہ تھے۔ انھوں نے پاکستان میں جائیدادیں خریدی تھیں اور وہ یہاں آنے والے تھے۔ پھر میرے شوہر نے پاکستان میں جائیدادیں خریدیں۔ وہ سب یہاں آنے والے تھے یا صرف آنے کا ارادہ ظاہر کر رہے تھے۔ مگر دونوں یہاں نہیں آئے۔ ہندوستان جاتے ہوئے میرے والد کچھ بار پاکستان سے ہو کر گزرے اور دو ایک دن قیام بھی کیا تھا۔ مگر وہ کبھی نہیں آئے، اس وقت بھی جب جناح صاحب کے انتقال کے بعد یہاں کے تمام اخباروں میں ان کے گورنر جنرل بننے کے بارے میں قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھیں کس بات نے یہاں آنے سے روکا تھا۔ مجھے کہانیاں گھڑنی نہیں آتیں، نہ مجھے اس قسم کی باتوں کی عادت ہے۔ اور جو جائیدادیں انھوں نے خریدیں تھیں وہ اب بھی موجود ہیں۔ اسی طرح میرے شوہر کی خریدی ہوئی جائیدادیں بھی موجود ہیں۔ مگر وہ لوگ آئے ہی نہیں۔ پھر انھوں نے یہ جائیدادیں کیوں خریدی تھیں؟ اس مکان سے متصل جس میں کبھی جناح صاحب نے قیام کیا تھا، بھوپال ہاؤس موجود ہے۔ ساری دنیا میں خبریں اڑی تھیں کہ وہ آئیں گے مگر انھوں نے نہ آنے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے

بالکل خبر نہیں، کیوں۔''

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ شہزادی نے اپنے شوہر کا ذکر کیا۔ ان کا بھی تعلق اسی خانوادے سے تھا جس سے بھوپال کے حکمراں منسلک تھے۔ یعنی قربائی کے نواب۔ شہزادی عابدہ کی دادی نے ان کی شادی کرائی تھی اور ان کی والدہ کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ ان کی باقاعدہ تعلیم اندور میں اور بعد میں Sandhurst میں ہو۔ ان دونوں کے ایک ہی فرزند ہیں، پاکستان کی وزارتِ خارجہ کے ایک بہت ہی محترم شخص۔ انھوں نے پاکستان کے لیے بہت سی سفارتی خدمات انجام دی ہیں۔ ان دنوں وہ پیرس میں پاکستان کے سفیر ہیں۔

شہزادی عابدہ نے مجھے بتایا کہ لڑکپن اور نوجوانی میں، ایک لڑکی ہوتے ہوئے کس طرح انھوں نے گھڑ سواری کی، پولو کھیلا، شیر چیتے شکار کیے اور صرف دس برس کی عمر میں وہ محل کے اطراف کے گڑھوں میں Daimler گاڑی کداتی پھرتی تھیں۔ اپنی دادی 'سرکار اماں' کا انھوں نے ایک بڑا محبت بھرا نقشہ کھینچا، اور اس شخصیت کا جو زندگی بھر ان کے لیے مشعلِ راہ رہی یعنی ان کے والد، بھوپال کے نواب کے بارے میں اس سادہ اور دل آویز انداز میں بیان کیا کہ ان سے رخصت ہونے کے بعد، ہوٹل جاتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں نواب صاحب سے مل چکا ہوں، اور وہ کتنی بلند و بالا اور مضبوط قوتِ ارادی کے مالک رہے ہوں گے۔

میں نے سوچا کہ نواب صاحب کے لیے خود یہ کتنے دکھ کی بات رہی ہوگی کہ، جو کچھ بھی وجہ رہی ہو، وہ اُسی ملک کی بنیاد گزاری میں ہاتھ نہ بٹا سکے جس کی تشکیل کے لیے انھوں نے جد و جہد کی تھی۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھا، ایک ضائع ہونے والا موقع، یا دونوں۔

لندن میں ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس کے افتتاح کے بعد آغا خان ہاؤس آف لارڈز سے
رخصت ہوتے ہوئے

عالی مرتبت آغا خان، انگلستان میں ۱۹۳۰ء کی ڈربی کے فاتحین کی قیادت کرتے ہوئے

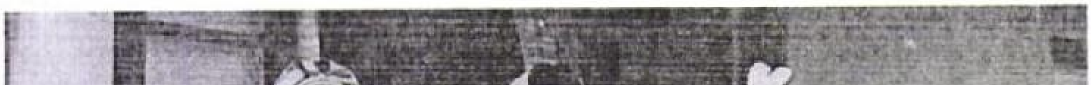

بمبئی ۱۹۴۶ء میں ڈائمنڈ جوبلی کی تقریبات کے موقع پر آغا خان، اہلیہ اور پرنس صدرالدین کے ساتھ

عالی مرتبت آغا خان

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے پہلے میزانیے (بیلنس شیٹ) میں جو ۱۹۳۲ء کے آخری تین مہینوں اور ۱۹۳۳ء کے پورے سال پر محیط تھا، ہندوستان کی دو شاہی شخصیتیں سرپرست کی حیثیت سے شامل تھیں: عالی مرتبت آغا خان اور عالی مرتبت نواب بھوپال۔ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ اس مقام پر سرپرست کے لفظ سے کیا مراد تھا مگر میں یہی تصور کر سکتا ہوں، یہ عوام کو ایک اشارہ دینے کی کوشش تھی۔ ان کو یہ بتانے کی کوشش کہ اب ایک انشورنس کمپنی قائم ہوئی ہے جس کو مسلمانوں میں سے دو مشہور اور صاحبِ رسوخ شخصیتوں کی حمایت حاصل ہے۔ اور دوسری مسلم شاہی شخصیت، جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ محترم اور سب سے زیادہ دولت مند تھی یعنی حضور نظام حیدر آباد کی شخصیت، جو کم از کم بالواسطہ اس میں شریک تھی۔ نظام کی حکومت کے ایک اعلیٰ افسر بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل تھے، اور بالائی سطور میں بیان کیے ہوئے دو سرپرستوں کے کارندے۔ ان تینوں نے کمپنی کے حصص بھی خریدے تھے اور اس طرح وہ اس نئے کاروبار پر اعتماد کرتے تھے جس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اس ادارے کو مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے، ہندوستان میں مسلم نشاۃ الثانیہ کی ایک عملی مثال۔

دوسری شاہی شخصیات کے برعکس نواب بھوپال ای ایف یو کی بنیاد گزاری میں براہِ راست شریک تھے۔ جب کہ دوسری دونوں شخصیتوں کو بھوپال کے برادرِ شاہی نے کمپنی میں حصہ لینے کے لیے مدعو کیا تھا۔

اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ڈائریکٹران میں ان دونوں کے نمائندوں کی شمولیت ای ایف یو کے لیے بہت خوش آئند بات تھی اور اس کو کم اہمیت کی بات نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ بیمے کی صنعت پر حاوی برطانوی اور دوسری غیر ملکی، اور ہندوؤں کی ملکیت چند ہندوستانی، کمپنیوں کے مقابلے میں ایک نئی مقامی کمپنی کو اس نوع کی مدد نے بہت سہارا دیا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ای ایف یو کے مؤسس بزرگ نہ صرف نواب صاحب بھوپال کی ذاتی دل چسپی اور شرکت پر بہت شکرگزار رہے ہوں گے بلکہ آغا خان اور نظام حیدر آباد کی سرپرستی اور حمایت پر بھی خواہ وہ بالواسطہ ہی کیوں نہ رہی ہو۔

آغا خان کی شمولیت اس لیے اور بھی اہم تھی کہ بیسویں صدی کی ابتدا سے ہندوستان کے مسلمانوں کے معاملات میں ان کا کردار نمایاں رہا تھا۔ بعد میں محمد علی جناح کی ہندوستان واپسی پر آل انڈیا مسلم کی تنظیم نو ہوئی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی جذباتی بیداری اور ان کی بھرپور امداد نے اس ادارے کو اتنا طاقت ور اور فعال بنا دیا کہ بالآخر اس نے پاکستان کے قیام کے خواب کو پورا کر دیا۔ آخر یہ آغا خان ہی تو تھے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں جن کی قیادت میں ستر مسلمانوں کے مشہور وفد سے شملے کے وائسرائے محل کی رقص گاہ میں لارڈ منٹو نے ملاقات کی تھی۔ یہ وفد اپنے ساتھ ایک سپاس نامہ لے کر گیا تھا جس پر شہنشاہِ معظم کی مسلمان رعایا کی اشرافیہ، ریاستوں کے وزرا، جاگیردار، وکلا، تجار وغیرہ نے دستخط کیے تھے۔ اس وفد کو بڑی کامیابی ہوئی تھی جس کی بنیاد پر ہی مستقبل کے انتخابات میں علیحدہ نمائندگی دی گئی تھی۔ اس طرح

آغا خان بیسویں صدی کے پہلے پچیس برسوں کے عرصے میں ہندوستان کے غیر متنازعہ فیہ رہبر کے طور پر ابھرے۔ برِصغیر کے کونے کونے میں ان کی بات سنی جاتی تھی۔ ای ایف یو کے لیے ان کی سرپرستی کی قبولیت بے پایاں اہمیت کی حامل تھی۔

اس وقت مجھے ایسی کوئی ہستی نہیں ملی، اس کتاب کے سلسلے میں جس سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتیں۔ نہ ہی میں نے موجودہ آغا خان کے اہلِ خاندان سے اس موضوع پر رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے کہ اگر کوئی ملا بھی اور اس نے وقت بھی دیا تو بھلا اس کو ایک انشورنس کمپنی کے بارے میں اپنے دادا، پردادا کے احساسات کا کیا علم ہوگا جنھوں نے اس کمپنی کی تشکیل میں مدد کی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ میں آغا خان مرحوم کا ہم عصر تھا۔ میرے ملک (جرمنی) میں وہ خاصے معروف تھے۔ جرمن اخباروں میں اکثر ان کی تصویریں چھپتی رہتی تھیں، بالخصوص ان کی آخری اہلیہ، بیگم صاحبہ کی جو میرے ملک میں بھی معروف تھیں۔ مگر جیسا کہ توقع کی جاتی تھی، ان کے اور ان کے اہلیہ کے بارے میں جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ، اگر چہ فضول قسم کے رسائل میں چھپتا تھا، یک طرفہ ہی ہوتا تھا۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات کی تمہید میں اس موضوع پر انھوں نے لکھا تھا، ''کسی انسان، ملک کے یا ادارے کے بارے میں افسانہ سازی، اسطور اور دروغ بیانی سے کہیں بہتر حقیقت بیانی ہوتی ہے۔ خود میرے بارے میں، میری زندگی ہی میں افسانہ سازی کی گئی ہے۔''

مجھے ان سے واقعی ہمدردی ہے۔ میرے ہم وطنوں کی نظروں میں ان کی جو تصویر بنی تھی وہ یہ کہ وہ ناقابلِ یقین حد تک دولت کے مالک ہیں، کہ ان جیسا ڈیل ڈول کا آدمی سونے اور ہیروں میں تولا جاتا تھا، کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ گھڑ دوڑ کے میدان میں گزرتا تھا، اور یہ کہ وہ اپنی بیگم کی خوشنودی کے لیے ہر سال کم از کم دو ہفتوں کے لیے طبقۂ امرا میں شامل ہونے کے لیے جرمنی میں واقع Bayreuth جایا کرتے تھے، تاکہ اہلِ ثروت کے حلقوں میں شامل ہوں، واگنر کی موسیقی اور 'اوپرا' سے محظوظ ہوں۔ سمرسٹ ماہم جیسے عظیم ادیب نے بھی آغا خان کی سوانح حیات کے دیباچے میں لکھا تھا: ''عام طور پر لوگ آغا خان کو بالخصوص گھڑ دوڑ کے میدان کا آدمی سمجھتے ہیں، اور یہ قطعی ناممکن نہیں ہوگا کہ جب اس کتاب کے قاری وہ صفحات سنجیدگی سے پڑھیں گے جن میں انھوں نے جانوروں کی نسل افزائی، اور بہت سے کلاسیکی مقابلوں کی جیت کے بارے میں اپنے تجربات بیان کیے ہیں تو ایک لمحے کے لیے حیران رہ جائیں گے۔ حیرانی کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ گھڑ دور ایرانی اشرافیہ کا اہم مشغلہ رہا ہے اور وہ ان کی اولاد میں سے ہیں۔ انھیں تو یہ سب ورثے میں ملا اور وہ اس نوع کے ماحول میں پلے بڑھے ہیں۔''

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، مجھے مرحوم آغا خان جیسے لوگوں سے ہمدردی ہے جن کی زندگی کسی جائیداد کی طرح 'زرد صحافت' کی نظر ہوئی ہو۔ مجھے بہت غصہ آتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ نام نہاد 'تاریخی' فلمیں بنانے والے اپنے تجارتی مقاصد کے حصول کے لیے حقائق کو اپنی مرضی سے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ مجھے ایسی باتوں نے ہمیشہ پریشان کیا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ تاریخی حقائق کا احترام کیا جانا چاہیے۔ اپنے قارئین کی اطلاع کے لیے جو آغا خان کی اصل زندگی سے کم کم واقف رہے ہوں، میں ان کی سوانح حیات سے، ان کے اپنے الفاظ میں، کچھ اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ میں پیش کروں وہ اس کا خلاصہ ہو جو وہ خود دنیا کو بتانا چاہتے تھے اور کچھ ان کے اپنے متن پر مشتمل ہوگا۔ اس کوشش میں، میں اپنے بیان کو ان کی زندگی کے اس حصے تک محدود رکھنا چاہوں گا جب وہ، صدی کے اختتام تک، ہندوستان کی سیاست اور تحریکِ آزادی میں اہم کردار ادا کر رہے تھے، جس کے بعد انھوں نے اس میں حصہ لینا ترک کر دیا تھا۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ آغا خان ۲/نومبر ۱۸۷۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے اور یہ بھی کہ ان کا لڑکپن اور نوجوانی کا دور بمبئی اور پونے میں گزرا تھا۔ ان کی عمر صرف آٹھ برس کی تھی جب انھیں اپنے دادا کی دولت ورثے میں ملی اور وہ ان کی روحانی رہبری اور اسماعیلی مسلمانوں کی امامت کے رُتبے پر فائز ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ ان کے دادا کے ایران کی اشرافیہ کے طبقے اور ایران کی حکمران شاہی سے قریبی تعلقات تھے، ان کی رگوں میں اسلامی دنیا کا شاہی خون بھی گردش کر رہا تھا۔ اس لیے کہ ان کے خاندان کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت محمدؐ، ان کی

صاحب زادی فاطمہ اور ان کے پیارے داماد علی کی اولاد میں سے ہیں۔
بمبئی میں آغا خان کی جائیداد، جس میں وہ بالغ ہوئے تھے، اس صنعتی علاقے میں تھی، جہاں اب بہت گھنی آبادی ہے۔ یہ جائیداد ایک بڑے احاطے پر مشتمل تھی جہاں رفیع الشان محلات، عام درجے کے گھر، خوب صورت باغات، ایک مختصر سا چڑیا گھر اور سیکڑوں گھوڑوں کے لیے اصطبل بنے ہوئے تھے۔ یہاں، یہ واحد وارث، اپنے ہزاروں رشتے داروں، زیرِ کفالت افراد اور حمایتی لوگوں درمیان قیام پذیر تھا۔

دس برس تک ان کو ایک شدید اور مرتکز نظامِ تعلیم سے گزارا گیا تا کہ ان کو اس متبرک مقام کے لیے تیار کیا جا سکے جس کے لیے وہ پیدا ہوئے تھے۔ آغا خان نے بڑے واضح الفاظ میں خود اس تعلیم کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعے ان کو ان ذمے داریوں کے لیے تیار کیا جاتا تھا جو انھیں ورثے میں ملی تھیں۔ اور یہ سب کچھ خاندان کی موسمی ہجرتوں کے جدول کے حساب سے ترتیب کیا جاتا تھا۔

انھوں نے لکھا ہے کہ ''ہر سال سردی کے موسم میں، نومبر سے اپریل تک ہم بمبئی میں رہتے، اپریل اور مئی میں مہابلیشور (پونے کے قریب ایک پہاڑی تفریح گاہ ہے۔ مترجم) جون سے اکتوبر تک ہم پونے میں قیام کرتے۔ اکتوبر میں ایک مختصر عرصے کے لیے ہم کسی ایک پہاڑی علاقے جاتے اور واپسی پر بمبئی۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۵ء، دس برس تک اس طے شدہ نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور اس میں، ایک ماہ، پندرہ دن یا صرف ایک ہفتے کے لیے بھی مجھے تعطیل میسر نہیں ہوتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ بس ایک دن۔ اور میں بے دردی کی زنجیروں میں جکڑا رہتا تھا۔

میرے دن رات کے معمولات بغیر کسی تبدیلی کے اسی طرح گزرتے تھے۔ علی الصباح، چھ اور ساڑھے چھ بجے کے درمیان اُٹھنا اور ہلکی چائے، ٹوسٹ، مکھن، جام اور کوئی ایک ایرانی شیرینی سے ناشتا کرنا۔ میں چاہوں یا نہ چاہوں، سات بجے صبح ایک گھنٹے، پونے کے علاقے میں یا ریس کورس میں، یا جب ہم بمبئی میں ہوتے تو ساحلِ سمندر پر سرپٹ دوڑ یا دُلکی چال میں گھڑ سواری کرنا، آٹھ سے ساڑھے گیارہ بجے تک مجھے انگریزی اور فرانسیسی کے اساتذہ سے سبق لینا ہوتا تھا۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا اور دو بجے دوپہر تک فراغت۔ اس کے بعد تین گھنٹے عربی کی پڑھائی۔ اس کے بعد سات بجے شام کے کھانے سے قبل، کار سواری، باغ میں ٹینس یا دوسرے قسم کی تفریحات کی اجازت تھی۔ رات کے کھانے کے بعد خوف ناک ترین دور شروع ہوتا تھا۔ دو گھنٹے تک مجھے مشکل ترین اور روح فنا کر دینے والی خطاطی کرنی پڑتی تھی۔ میری والدہ عربی اور فارسی کے علما کے اس مشورے سے، جو بعد میں احمقانہ ثابت ہوا، بہت متاثر تھیں کہ کلاسیکی عربی اور فارسی کی خطاطی سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ انھوں یہ بھی بتایا کہ میرے دو سوتیلے بھائیوں کی، جو انتقال کر چکے تھے، تحریر بہت خوب صورت تھی۔ میری والدہ، میرے عم، بلکہ سارے ہی گھر والے مجھ کو ڈراؤنی خطاطی سکھانے پر متحد تھے۔ دراصل میرے لیے یہ شہادت کے برابر تھا، اس لیے کہ کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں پیدائشی طور پر اتنا نزدیک بین تھا کہ لکھنے یا پڑھنے کے لیے مجھے کتاب یا کاغذ کو ناک سے دو انچ کے فاصلے پر رکھنا پڑتا تھا۔ چند انچ سے پرے فاصلے کی دنیا میرے لیے بالکل بے کار تھی۔ میرے لیے باغات، پہاڑیاں، سمندر اور جنگل سب بس ایک دھند کے مانند تھے۔ کئی برس تک میری اداسی اور میری اذیت کا کسی کو علم نہ تھا۔ میرے گرد بنائے ہوئے تربیتی حصار کی جکڑ بہت سخت تھی اور جتنا بھی وقت مجھے فرصت کا ملتا اس پر بھی اچانک حملے ہوتے رہتے تھے۔ اس لیے کہ، اگر چہ میں کم سن ہی تھا، پھر بھی مجھے ان عقیدت مندوں سے ملاقات ضروری ہوتی تھی جو بیعت کے لیے آیا کرتے تھے۔ سنیچر اور مذہبی ایام ایسی ملاقاتوں کے مخصوص ہوا کرتے تھے جب مجھ سے ملنے والے باغ میں انتظار کرتے، سلام کرتے، احتراماً جھکتے، تحفے اور نذریں گزارتے اور نیک تمناؤں کے طالب ہوتے۔ ان محفلوں میں میرا کردار روایتی طور پر معین تھا اور مجھے بارُعب رہنا پڑتا تھا مگر میرے اندر کا بچہ اسے پسند نہیں کرتا تھا کہ یہ سب کچھ چھٹی کے اوقات میں ہوتا، اور کبھی بھی پڑھائی کے اوقات میں نہیں۔''

اتنے سخت نظام الاوقات کے باوجود بھی آغا خان اپنے تین برطانوی اساتذہ سے، جن میں سے دو آئرش تھے، بہت خوش تھے جن

کو ان کی مغربی معاملات کی تربیت کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ آغا خان کے الفاظ میں، ''یہ سب بہت نفیس انسان تھے۔ ان کی دی ہوئی تعلیم کسی انداز میں بھی تنگ نظر یا محدود نہیں تھی۔ انھوں نے میرے ذہن کی سطح کو بلند کیا اور باہر کی دنیا کے لیے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ یہ ایسے دانشور تھے جن میں، خواہ وہ سائنس ہو، تاریخ ہو یا سیاست کے مسائل، علم دینے کی امنگ تھی۔ یہ عقل منداور کھلے ذہن کے مالک لوگ تھے۔ شاید سب سے اہم بات یہ تھی کہ انھوں نے مجھے خود پڑھنے پر اُکسایا، اور اس وقت جب میری عمر صرف دس سال کی تھی، میں اس قابل ہو چکا تھا کہ میں بڑی آسانی سے اپنے ضخیم کتب خانے کی انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور عربی کتابوں میں کھو جایا کرتا تھا۔ میرے تینوں اساتذہ نے مجھے علم کے قفل کو کھولنے کی صلاحیت عطا کی اور اس کے لیے میں ہمیشہ سے ان کا شکر گزار رہا ہوں۔

میں ان کے بارے میں اچھے الفاظ کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر افسوس کہ عربی اور فارسی پڑھانے والوں کے بارے میں میرے پاس سوائے بُرے الفاظ کے اور کچھ نہیں۔ وہ بہت پڑھے لکھے تھے، ایک جید عالم، جن کو عربی ادب پر اور اسلامی تاریخ پر کافی عبور تھا، مگر اس تعلیم نے ان کے دماغ کو فراخ کیا تھا نہ دل کو گرمی عطا کی تھی۔ وہ ایک کٹر فرقہ پرست آدمی تھے اور باوجود وسیع علمیت کے ان جیسا بے انتہا تاریک ذہن اور تنگ نظر انسان میری نظر سے آج تک نہیں گزرا۔ اگر اسلام وہی کچھ ہے جیسا کہ انھوں نے پڑھایا تھا تو پھر یقیناً خدا نے محمد (صلی اللہ وعلیہ وآلہ وسلّم) کو انسانیت کے لیے نعمت نہیں بلکہ (معاذ اللہ) مصیبت بنا کر بھیجا تھا۔

یہ افسوس کا مقام تھا اور ان کو بات کرتے سن کر خوف آتا تھا۔ ان کو سننے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا گویا خدا نے تمام انسانوں کو ابدی ملامت کا حق دار اور جہنّم کا کندا بنانے کے لیے خلق کیا تھا۔ ان کی تمام تر عمیق اور بلیغ علمیت کے شگوفے، اور میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ اس ضمن میں نادرِ روزگار تھے، تلخی اور نفرت کی ہواؤں کے سبب مرجھا گئے تھے۔ بعد میں وہ تہران واپس چلے گئے تھے جہاں پہنچ کر وہ اسلامیات کے عظیم اور معروف استاد ہو گئے تھے اور پورے ایران کے جید عالموں میں شمار کیے جانے لگے تھے، مگر میرا خیال ہے کہ آخر وقت تک وہ ویسے ہی کٹر ملّا رہے ہوں گے جیسا کہ میں نے ان کو پایا تھا۔

شاید میرا ابتدائی تجربہ ہی تھا جس نے مجھے پیشہ ور مذہبی افراد سے، خواہ وہ ملاّ، مولوی، چھوٹے پادری، یا بشپ ہوں، بدظن کر دیا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ان میں سے کئی مثالی شخصیتیں بھی تھیں۔ سیدھے سادے مذہبی لوگ۔ فرانس کے مقامی پیرش کے پادری، اٹلی کے دیہاتوں کے منکسر المزاج پادری، اور دنیا بھر کی حلیم الطبع، متقی اور مہربان نرسیں، جن سے واقفیت ہے، جن کو میں نے پسند کیا ہے اور جن کا میں نے احترام کیا ہے۔

ایران اور عراق میں اسلامی قوانین میں ملاوٹ کرنے والوں کا ایک طبقہ ابھرا ہے جن کا اندازِ نظر اور مزاج میرے پُرانے استاد جیسا تھا، عدم تحمّل، کٹر پن، روحانی جارحیت وغیرہ، جو سرگرمی اور نمائشی انداز میں مالکِ کائنات کے گن گاتے ہیں اور ان سب کو ابدی ملامت کا حق دار اور واصلِ جہنّم کرنے پر تلے رہتے ہیں سوائے ان کے جو اُن کے اپنے طے شدہ خیالات سے متفق ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ برسوں میں نے ایسے افراد کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ حیرت انگیز بھی اور مجھ جیسے لڑکے کے لیے نامناسب بھی تھا کہ اس کو، جس کی گھریلو نشوونما ہندوستان کے ماحول میں ہوئی ہو، بلوغت کے دور میں اس نوع کی تنگ نظر اور رسمی اسلامی تلقینِ عقیدہ سے دوچار کیا جائے۔ اس لیے کہ میرا ابتدائی ماحول بے حد برداشت کا تھا۔ ہمارے گھر میں ہندوؤں یا ہندوئیت کے خلاف کبھی کسی قسم کا تعصب نہیں کیا گیا۔''

جب ان کی سوانح حیات کا یہ حصہ میری نظر سے گزرا تو مجھے شدید جھٹکا لگا۔ اس کے باوجود میرے دل میں ان کے لیے تعریف کے جذبات ابھرے تھے۔ اسی وجہ سے میں نے فوراً اس کا مکمل اقتباس دینے کا فیصلہ کیا اس لیے کہ میرے خیال میں چند برسوں بعد جب وہ ہندوستان کی سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے لگے تو یہ چند سطریں ان کے اندازِ نظر کے تناظر کو نہایت صریح انداز میں پیش کرتے میں معاون

ہوں گی۔ قبل اس کے ہم اس طرف رجوع کریں، آیئے ہم ان کے پہلے سمندر پار سفر پر چلتے ہیں جو انھوں نے فروری ۱۸۹۸ء میں شروع کیا تھا۔ خود ان کے اپنے خیال میں یہ زمانہ ان کے نزدیک بھی اہم اور فیصلہ کن تھا۔

''میں ۱۸۹۵ء کے آخر اور ۱۸۹۶ء کے شروع میں بلوغت کے مراحل میں تھا۔ اور میرے فرائض کی باگ ڈور پوری طرح میرے ہاتھ میں تھی۔ میرے اساتذہ نے مجھے الوداع کہا اور میری زندگی سے نکل گئے۔ مشرقی رسم کے مطابق اپنی نوجوانی میں ہی میں نے شادی کے بارے میں سوچا'' اور ان کی شادی اپنی ایک خوب صورت عم زاد خاتون شہزادی بیگم سے ہوگئی جن کے والد، آغا جنگی شاہ، ان کے عم بھی اور اتالیق بھی تھے۔ آغا خان کے مطابق اگرچہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، پھر بھی شادی ناکامیاب رہی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ان کے عم اور خسر، اپنے ایک بیٹے کے ہمراہ اس وقت قتل کر دیے گئے جب وہ مکّے میں حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اس بھیانک سانحے نے ان پر گہرا اثر کیا، اس حد تک کہ وہ شدید علیل ہوگئے تھے۔ علالت سے صحت یاب ہونے کے بعد انھوں نے آگرے، دلّی، لاہور وغیرہ میں موجود ہندوستان کے عظیم لوگوں کے مزاروں اور مذہبی مراکز پر حاضری دینے کے لیے طویل سفر اختیار کیا۔ ان مقامات میں اسلامی تہذیب کے عظیم نشانات، تاج محل، دلّی کا لال قلعہ اور جامع مسجد، دلّی اور آگرے کی موتی مسجد وغیرہ بھی شامل تھے۔ وہ علی گڑھ بھی گئے جہاں ان کی ملاقات ہندوستان کے مسلمانوں کی عظیم شخصیات سر سیّد احمد اور نواب محسن الملک سے بھی ہوئی، جنھوں نے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے شعلے بھڑکائے تھے۔

بمبئی واپسی کے بعد ان کی خواہش تھی کہ وہ سمندر پار کا لمبا سفر اختیار کریں۔ انھوں نے لکھا ہے، ''مجھے اب سفر میں لطف آنے لگا ہے اور اس کو میں جاری رکھنا چاہتا ہوں۔'' ایک طرح سے اپنی باقاعدہ تعلیم کے اختتام پر وہ یورپ کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ یہ سفر ایک نوع کی اعلیٰ تعلیم کے مماثل تھا جو ۱۹۱۴ء سے قبل کی سماجی زندگی کو اس زندگی سے منسلک کرتا تھا جس میں اشرافیہ اور دولت شاہی، یورپ کے دارالحکومتوں، مونٹے کارلو، کانز، نیس اور سینٹ ماریٹز کے شاہی خاندانوں کے گرد گردش کرتی تھی۔ ان کی اس عمر کے بعد کی پرورش ایک طرح سے حکومتِ برطانیہ کے زیرِ سایہ ہوئی۔ مثلاً ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات، ایڈورڈ ہفتم کی رفاقت، ملکہ میری سے پچاس برس کی دوستی، شہنشاہ جارج پنجم سے متعدد ملاقاتیں وغیرہ۔ ونسٹن چرچل سے ان کی پہلی ملاقات ۱۸۹۶ء میں پونے میں ہوئی تھی اور اس کے بعد دوستی ہوگئی۔ اس رات جب انھوں نے رات کا کھانا ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ تناول کیا تھا اور ۱۹۵۳ء میں جب ملکہ ایلزبتھ دوئم سے ان کی ملاقات چائے کی میز پر ہوئی تھی ایک لمبا، نصف صدی کے برابر، عرصہ تھا کہ تقریباً تمام شاہی، سیاسی اور سماجی عظیم شخصیات سے ان کے رابطے رہے تھے۔

یورپ کے ان تمام مقامات سے جہاں وہ پہلی بار گئے تھے، انھیں لندن نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ اس میں حیرت کی بات اس لیے نہیں کہ ہندوستان کی شاہی شخصیات میں سے ایک اہم شخصیت ہونے کے ناتے برطانوی راج کے خاندان کے ایک فرد کی مثال ان کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا۔ لہٰذا ان کے لیے لندن سب سے اہم مقام تھا۔ اور انیسویں صدی کا لندن آج کے لندن سے بلاشبہ بہت مختلف تھا۔

وہ اپنے قارئین کو بتاتے ہیں کہ ''پچھلی اُنیسویں صدی کے نویں عشرے میں لندن کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر وکٹوریہ کے دور کی تاب ناکی میں اس کے شکوہ، فراہم آسانیوں، تحفظ، فراوانیوں اور خود اعتمادی وغیرہ سے مزیّن مقناطیسی کیفیت کو مزید بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ممکن نہیں۔ وہ شہر مہذب دنیا کے مالیات کا مرکز تھا، بے حد متموّل اور نہایت طاقتور۔ ویسٹ منسٹر سے ایک عظیم سلطنت پر حکمرانی ہوتی تھی مگر فیض رساں ضمانت اور یقین دہانی کے ساتھ۔ اگر دفترِ خارجہ بدہیئت، بھونڈا اور تکلیف دہ تھا، اگر برصغیر کے بارے میں انڈیا آفس کا اندازِ انتظام ظالمانہ اور دقیانوسی تھا تو اس میں حیرت کی بات کیا تھی اس لیے کہ چند ایکڑوں پر پھیلے ان مراکز کے میں کتنے ناقابلِ مزاحمت احساسِ اختیارات اکٹھے ہوگئے تھے۔ ان اختیارات کے مظاہرے بھی قابلِ دید ہوتے تھے۔ پاؤنڈ اسٹرلنگ سونے کا سکّہ ہوتا تھا، آج ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں تقریباً آٹھ گُنا زیادہ قیمتی۔ تنگ دست اور تونگر کے درمیان کے مدارج میں ناقابلِ یقین تفاوت، ایک انتہا سے دوسری انتہا

تنگ تھا۔ اس کے باوجود معاشرے کے بیش تر حصے میں ایک قسم کا دھندلا احساسِ آسودہ حالی پایا جاتا تھا۔ یہ کوئی خوشحال ریاست نہیں تھی، مگر ایک طرح کا صحت مندانہ احساس ضرور تھا کہ برطانیہ عظیم ہے، خوش مزاجی، دم خم اور لوگوں میں زندگی کے بارے میں مبہم جوئی عام تھی۔

اصل طاقت، سیاسی ہو یا معاشی، چند ہاتھوں میں مرتکز تھی۔ انگلستان اور سلطنت کے حکمراں ایک مخصوص حلقے میں محصور اشرافیہ اور اس دولت مند طبقے کے قبضے میں تھی جو خود کو اشرافیہ کا حصہ منوانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس طبقے سے میرا عہدہ اور میرے احترام انگیز تعلقات قائم ہو چکے تھے جن کے توسط سے میں ان میں براہِ راست داخل ہو سکتا تھا۔''

برسوں تک آغا خان عوامی معاملات میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے۔ دنیا کے بارے میں اپنے علم، وسیع سفر، ذاتی وقار اور بین الاقوامی تعلقات کی بنا پر وہ برطانوی حکومت کے لیے 'وزیرِ بے محکمہ' جیسے رُتبے کے قابل تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران اپنے رسوخ کی وجہ سے وہ مسلمان ملکوں کو اتحادیوں کی حمایت پر راضی کر چکے تھے۔ بعد میں ۱۹۳۰ء۔۱۹۳۱ء کے دوران گول میز کانفرنس میں جانے والے اس ہندوستانی وفد کے سربراہ تھے جس نے ہندوستان میں مقامی حکومت بنانے کے لیے راہیں ہموار کی تھیں۔ مقامی سیاست سے علیحدگی کے بعد انھوں نے لیگ آف نیشنز کے لیے بڑی محنت کی اور ۱۹۳۷ء میں اس کے صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

آغا خان لکھتے ہیں، '' میری زندگی کئی معنوں میں دو بہت مختلف ادوار کے درمیان پُل کی مثال رہی ہے۔ مغرب کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو میں نے وکٹوریائی عہد میں بھرپور زندگی گزاری ہے اور اب ایلزبتھ کے عہد میں بھی ویسی ہی زندگی گزار رہا ہوں۔

میں اس دور میں نہ صرف یہ کہ ایک تماشائی تھا، بلکہ اپنی پیدائش کے حادثے کی بدولت اس میں عملی حصہ بھی لیا ہے۔ میں نے جس قدر انقلاب دیکھا ہے ابھی اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکا ہے مگر انسانی تجربے کی بہت سی سطحوں پر اس کے اثرات نمایاں ہو رہے ہیں۔ پوری دنیا میں تمام تر اندازِ زندگی میں بنیادی اور دور رس تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں اس پرانی دنیا میں ایک بالغ انسان تھا۔ ایک وقت تھا جب مشرق کے وسیع علاقوں میں انگلستان حقیقی معنوں میں ایک غیر متازعہ فیہ طاقت تھا اور ہم عصر سیاسی اداروں کے مقابلے میں اس کی ہندوستانی سلطنت سب سے زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم تھی۔ لارڈ کرزن جیسا انسان ہی کیا، نوّے فی صد برطانیہ کی حکومت کے افراد ہندوستانی جمہوریت، یا اس جیسی کسی اور صورت، یا وسیع ہندوستانی سلطنت کی تقسیم، دو مختلف طاقت ور مملکتوں کے قیام اور تاریخی شخصیات کی حکمرانی کے خیال ہی سے خوف زدہ ہو جاتے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اختتام تک، جب ہندوستان کو ایک مقامی ریاست کا درجہ دینے کا فیصلہ ہو چکا تھا، اس وقت بھی صاحبانِ اقتدار اس بچکانہ خیال میں مست تھے کہ ہندوستان کی سلطنت کو اس طرح مقامی لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا جیسے کسی کی موت پر اس کے وارثوں کو جائیداد حوالے کر دی جاتی ہے، اس امید کے ساتھ کہ جائیداد کا بٹوارہ نہیں ہوگا۔ گویا ان کی روحانی اور عقلی بنیادوں میں یہی کچھ جاگزیں ہوگا۔

ان تبدیلیوں میں میرا بھی حصہ تھا۔ مگر میں اس بات پر زور دینا چاہوں گا کہ ہندوستان کے سیاسی اور عوامی معاملات میں میرا جو بھی کردار رہا ہے، وہ میرے بنیادی کام یا فرائض میں سے نہیں تھا۔ بچپن ہی سے میرے لیے جو بات اہم تھی اور میرے نزدیک سب سے بڑی ذمے داری تھی وہ مسلم شیعہ فرقے کی اسماعیلی شاخ کی امامت تھی۔''

لندن کی اپنی پہلی یاترا کے دوران آغا خان نے لندن کو ذرا دور سے دیکھا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ برطانوی ہند کی سیاست میں فعّال ہو گئے تھے۔ تمام یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر ممالک کے شہروں کے تفصیلی سفر کے بعد وہ ۱۹۰۲ء میں واپس ہندوستان پہنچے۔ واپسی پر لارڈ کرزن کا لکھا ہوا خط ان کے انتظار میں تھا جس میں ان کو مجلسِ مقننہ کا رُکن بننے کی دعوت دی گئی تھی۔ باوجود ان کے مذہبی عہدے کے، عمر کے تیسرے عشرے میں ایک نوجوان شخص کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی، اس لیے اور بھی کہ یہ مجلس ایک مختصر حلقے کے مماثل تھی جس میں چند صاحبانِ رسوخ ہی ہوتے تھے اور اس رُکنیت کو بڑا اعتبار بھی حاصل ہوتا تھا۔ اس تقرر کی وجہ سے ان کو کلکتے منتقل ہونا پڑا

، اس لیے کہ اس زمانے میں برطانوی اقتدار کا مرکز وہی شہر تھا، اور اس طرح ان کے معمولاتِ زندگی بہت متاثر ہوئے۔ زندگی میں پہلی بار انھیں بہت ذہانت اور لیاقت کے حامل لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور صحیح معنوں میں ان کو اپنا ذاتی گھر نصیب ہوا۔ بمبئی اور پونے جیسا محل نما ریاستی مکان نہیں جس کے اطراف ہمہ وقت لوگ منڈلاتے رہتے تھے۔ لارڈ کرزن، کمانڈر انچیف لارڈ کچنر جیسے لوگوں کو کام کرتا دیکھنے سے ان کے ذہن میں نئے دریچے وا ہوئے، جی کے گوکھلے جیسے قوم پرست سیاست داں سے رسم و راہ ہوئی بعد کو جن کی گہری دوستی کی بنا پر ان کو ہندوستان کی ان شخصیتوں سے بھی ملنے کے مواقع ملے، گوکھلے جن کے نمائندے تھے۔'' میں نے دیکھا ہندوستان کی حکومت کتنی الگ تھلگ تھی، صرف ہندوستان کے عوام ہی سے نہیں بلکہ بر جستہ گو طبقۂ دانشوراں سے بھی۔ میں نے بہت قریب سے یہ بھی دیکھا کہ ماحول اور جذباتی اعتبار سے حکومت کتنی اجنبی تھی۔ اس کے برعکس میں دیکھ رہا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی رہنما اپنے کمتر درجے کے مطالبات کے حصول میں ناکامیابی کے بعد اب صرف انتظامی اُمور کے حصول ہی پر اکتفا نہیں کر رہے تھے بلکہ اب تو وہ مکمل اقتدار اور اپنی سیاسی تقدیر خود لکھنے کے در پے ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ میں، ان دو فیصلہ کُن برسوں کے دوران مجھے شدت سے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ ہندوستان کی واحد اور ذمے دار سیاسی پارٹی، یعنی کانگریس پارٹی، ہندوستان کے مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کرنے کی اہل نہیں رہ گئی تھی، یا یوں کہہ لیجیے کہ کانگریس مسلمانوں کی جائز ضروریات اور توقعات سے کما حقہٗ انصاف کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اس پر ہندو انتہا پسندی کا دباؤ بہت شدید تھا۔''

یہ صاف ظاہر تھا کہ آغا خان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی معاملات میں بہ ظاہر اتحادِ عمل اور تعاون کے فقدان پر تشویش تھی اور وہ اپنے علی گڑھ کے دوستوں سے امداد کے طالب تھے، جن سے ان کے روابط ۱۸۹۷ء سے استوار ہوئے تھے جب وہ پہلی بار علی گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت سے وہ سرسیّد اور نواب محسن الملک کے گہرے معتقد ہو گئے تھے اور اس طرح وہ مسلمانوں کی طاقت اور دانش کی نشاۃِ الثانیہ کے سب سے مضبوط مددگار تھے۔ لہٰذا وہ محسن الملک کی طرف متوجہ ہوئے جو مسلمانوں کے ایک سربرآوردہ رہبر کی حیثیت سے سرسیّد کے جانشین تھے اور دوسروں کی طرح یہ دونوں بھی اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے طور پر ہی کچھ کرنا ہوگا۔ نتیجے میں آغا خان کی سربراہی میں مسلمانوں کے ستر رہنماؤں کا ایک وفد شملے گیا اور اور اس کی ملاقات لارڈ منٹو سے وائسرائے ہاؤس میں ہوئی۔ میں نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کے اس تاریخی واقعے کا ذکر کیا ہے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی کا حق ملا اور سارے ہندوستان میں اس پر واویلا مچ گیا۔ حالانکہ جنھوں نے اس سہولت کے لیے تگ و دو کی تھی ان کے نزدیک یہی ایک منطقی طریقہ تھا کہ اس کا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے ایک سیاسی ادارہ تشکیل دیا جائے۔ لہٰذا ۱۹۰۶ء میں ڈھاکا میں ہونے والے ایک اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی اور آغا خان کو، گو وہ اس وقت ذاتی طور پر وہاں موجود بھی نہ تھے، پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۱۲ء تک فائز رہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان کی مسلم امّہ اور اس کے رہنما ان کی کتنی عزت کرتے تھے۔

اس نوع کی دور رس مصروفیات کے علاوہ آغا خان کو سفر کرنے کا بہت شوق ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ اسماعیلی فرقے کے پیشوا ہونے کے ناتے اور ذاتی تعطیل و تفریح کے لیے ان کو تقریباً ہمیشہ ہی سفر درپیش رہتا تھا۔ ۱۹۰۷ء کے بعد سے ہر سال وہ یورپ کا سفر کرتے تھے۔ انھوں نے ایک بار پوری دنیا کا سفر بھی کیا تھا جس کے دوران ان کو پہلی بار ایشیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا بھی جانے کا موقع ملا تھا۔ ان کے اپنے الفاظ میں'' جمالیات کی دنیا میں میرا پہلا عشق موسیقی اور بیلے (ballet) سے تھا۔ زندگی گزرنے کے ساتھ مجھے موسیقی، بیلے، اوپیرا اور تھیٹر سے لگاؤ زیادہ سے زیادہ ہوتا گیا اس لیے کہ ان سے مجھے ذہنی تازگی اور سکون حاصل ہوتا تھا۔ فنون کے معاملے میں میرے نزدیک یہ سب سے اہم ہیں۔''

اس کے باوجود نہ صرف اپنے ماننے والوں کے لیے بلکہ ہندوستان کی سیاست کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت

ہندوستان ہی میں گزرتا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب 'منٹو — مورلے ریفارم' پر عمل شروع کیا جا رہا تھا۔ اور ان کا بہت وقت علی گڑھ کو ایک عظیم مسلم یونی ورسٹی بنانے کے منصوبے پر بھی صرف ہوتا تھا، برطانیہ جس کا سخت مخالف تھا۔ جب یہ ہدف حاصل ہوگیا تو آغا خان مطمئن ہو گئے۔ انھوں نے لکھا ہے، ''اب، جب کہ سب کچھ ہوگیا ہے، اور میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی چالیس برس کی کارکردگی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں ہوں تو خیال آتا ہے کہ بلاشبہ میری زندگی کے بہت سے اہم کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے جو میرے لیے حقیقی طمانیت کا باعث ہے۔ اس مرکز کی تشکیل میں جو کردار میں نے ادا کیا ہے اپنی زندگی کے آخری دور میں اس کا احساس ہی میرے لیے خوشی اور تسکینِ قلب کا باعث ہوگا۔''

جب پہلی جنگِ عظیم چھڑی اتفاق سے اس وقت آغا خان افریقا میں تھے۔ وہ بڑی کوششوں سے جتنی جلد ہو سکا لندن پہنچے اور اپنی خدمات برطانوی حکومت کو پیش کر دیں جن کو شکریے کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔ اور مصر کے شاہی خاندان سے قریبی تعلقات کی وجہ سے درحقیقت انھوں نے برطانوی حکومت کے لیے کچھ بہت اہم کام کیے۔

جنگِ عظیم کے بعد آغا خان نے عوامی معاملات میں بہت کم حصہ لیا۔ مگر ۱۹۲۸ء کے آخر تک اس میں تبدیلی آئی اور اس لیے اس وقت یہ فیصلہ کیا گیا تھا کی آل انڈیا مسلم لیگ کا دلی میں اجلاس بلایا جائے تاکہ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں مسلمانوں کی کوئی محکم رائے قائم کی جائے۔ آغا خان کو اس اجلاس کی صدارت کے فرائض سونپے گئے۔ ''خاص طور پر اس کانفرنس کی یکجہتی بہت اہم تھی اس لیے کہ بہت دیر سے سہی مگر، اسی کے دوران بغیر کسی عوامی اعلان کے، مسٹر محمد علی جناح نے اپنے مسلم بھائیوں کے شانہ بہ شانہ چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جناح صاحب نے کچھ عرصہ قبل ہی کلکتے میں منعقد ہونے والے آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی تھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ان کے لیے کانگریس میں، یا ایسے کسی بھی ادارے میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو، ملک گیر سطح پر، کوئی مستقبل نہیں تھا۔ آخرِ کار ہم نے ان کو اپنے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔''

اس کے بعد ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں آغا خان مسلمانوں کے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے شریک ہوئے، ان کے لیے جو بڑے اعزاز کی بات تھی، اس لیے کہ اس وفد کے ارکان میں محمد علی جناح، سر محمد ظفر اللہ خاں، مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک، سر محمد شفیع جیسے لوگ شامل تھے۔ مہاتما گاندھی جو اس وقت تک ہندوستان کی کی تحریکِ آزادی کے روحانی رہنما ہو چکے تھے، پہلی کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے تھے مگر ۱۹۳۱ء میں ہونے والی کانفرنس میں، مشہور ہندوستانی شاعرہ سروجنی نائیڈو کی معیت میں کانگریس کے واحد مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

اس وقت تک، آغا خان کا رابطہ مہاتما گاندھی سے طویل عرصے رہ چکا تھا۔ اس لیے کہ دونوں ہی ۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء سے جنوبی افریقا میں بسنے والے ہندوستانیوں کے مستقبل کے بارے میں عملی طور فکر مند رہتے تھے۔ اپنی یادداشتوں میں آغا خان نے مہاتما گاندھی کے فلسفیانہ نظریات کا بڑا دل چسپ اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کے خیال میں انھی کی بنیاد پر مہاتما اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان اور اس کے باسیوں کے لیے نجات اسی میں ہے کہ وہ اپنے عصر کی صنعتی اور مادی تہذیب سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ '' ان کی زندگی میں داخل ہونے والے روحانی اثرات میں عہد نامۂ جدید کے مطابق (حضرت) عیسیٰ، ٹالسٹائے، اور ترکِ دنیا کے پرچارک Thoreau اور دوسرے ہندو اثرات گہرے تھے۔۔۔ مگر گاندھی کا فلسفہ ترکِ دنیا نہیں بلکہ اس دُنیا کی تجدید تھا۔''

صاف ظاہر ہے کہ آغا خان اور مسلمانوں کے وفد کے دوسرے لوگ گول میز کانفرنس کے دوسرے دور میں رہنما گاندھی کی شرکت سے بڑی توقعات لگائے ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کی باقاعدہ ابتدا سے قبل ہوٹل رِٹز میں، جہاں آغا خان ٹھہرے ہوئے تھے، مسٹر گاندھی اور مسز نائیڈو سے آدھی رات کے وقت ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کی تفصیل آغا خان نے یوں بیان کی ہے:

'' پہلے کچھ وقت ہم نے تصویریں اتروانے کے لیے فوٹوگرافروں کے سامنے صرف کیا اور اس کے بعد بات چیت کے لیے جا بیٹھے۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے مہاتما جی سے کہا کہ اگر وہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے واقعی باپ جیسا کردار ادا کرنے پر تیار ہوں تو اس کے جواب میں وہ بھی ان کی ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں بھرپور طریقے سے شرکت پر تیار ہوں گے۔

مہاتما جی نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا، 'اگر سچ پوچھا جائے تو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے دل میں مسلمانوں کے لیے باپ جیسے محبت کے جذبات ہیں۔ مگر آپ کہتے ہیں تو میں سیاسی ضرورت کی بنا پر ہم دردی کے ساتھ اس پر گفتگو کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اور کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا۔'

مجھے ایسا لگا گویا مجھ پر ٹھنڈے پانی کا فوارہ چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس کے بعد پوری گفتگو کے دوران سرد مہری کا ماحول رہا۔ میں نے محسوس کر لیا کہ مہاتما جی کے دل میں میرے بدیہی اور دل کی گہرائیوں سے اُٹھنے والے برادرانہ جذبے کا ویسا ہی ردِ عمل نہیں ہوا تھا۔''

یہ ملاقات اگر چہ سرسری سے کچھ زیادہ اثر پذیر ہوئی تھی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ثبوت اس بات کا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد صرف ایک سیاسی کیفیت کے مترادف تھا اور اس میں ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن کے احترام اور برادری جیسے کسی قسم کے جذبات کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں دفن ہے اور میرا قاری ان سے اچھی طرح واقف ہے۔ گفتگو، سنجیدہ مباحث، مگر بلا نتیجہ۔ ان سب نے آغا خان کو فٹز جیرالڈ کی نظم کے اس ٹکڑے کی یاد دلائی ہوگی۔

Myself when young did eagerly frequent
Doctor and Saint, and heard great argument
About it and about: but evermore
Came out by the same door as in I went.

تیسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ اُسی سال موسمِ بہار میں نام نہاد جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کا اجلاس لندن میں ہوا۔ گاندھی اور جناح نے اس میں شرکت نہیں کی۔ مگر اجلاس کے آخر میں ایک مشترکہ دستاویز جاری کی گئی جس میں ہند۔ برطانیہ تعلقات کی تاریخ میں پہلی بار تمام طبقوں کا ایک متفقہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا، جس میں زیرِ بحث تقریباً تمام سیاسی نکات شامل کیے گئے تھے۔ مگر کانگریس کے طبقۂ اعلیٰ نے اس کو رد کر دیا، حالاں کہ اس کے نمائندوں نے اس دستاویز پر دستخط کیے تھے۔

اس مشترکہ دستاویز اور اس کو جاری کرنے والی کمیٹی کے کام کے اختتام پر ہندوستانی سیاست سے آغا خان کے ذاتی روابط ختم ہو گئے۔ اس کے بعد کام کے اعتبار سے سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں لیگ آف نیشنز میں کامیابی کے کئی سال گزرے، جہاں ان کے اہلِ خانہ نے دوسری جنگِ عظیم کے تکلیف دہ سال بھی گزارے۔

میں اس زمانے کے بارے میں کچھ نہیں لکھنا چاہوں گا نہ ہی میں ان کی ذاتی زندگی، ان کی شادیوں، بین الاقوامی گھڑ دوڑ میں ان کی کامیابیوں اور اس نوع کی باتوں پر وقت صرف کروں گا۔ اگر چہ یہ سب اس شخصیت کے بارے میں ہے جسے صحیح معنوں میں ان چند اوّلین لوگوں میں شامل کیا جا سکتا ہے جو 'عالمی قومیت'' کے حامل تھے اور جس کا صرف نام ہی نہایت کشش کا حامل تھا۔ ایسا شخص جس کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کے تئیں پوری دنیا بھی حاضر تھی اور وافر وقت بھی، اگر وہ اپنے مقام کا پورا اور صحیح ادراک کر سکتا۔ میرے خیال میں مرحوم آغا خان اس میں درجۂ کمال رکھتے تھے۔ میرے نزدیک ان کو ہندوستانی حریت پسندوں کے اُس زمرے میں شمار نہیں کیا جا سکتا جس میں مہاتما گاندھی، نہرو خاندان، محمد علی جناح، راجا صاحب محمود آباد، اصفہانی، علی برادران، گوکھلے، پٹیل اور دوسرے درجنوں افراد شامل تھے جنھوں نے عملی طور پر ہندوستان کی آزادی کے لیے جد و جہد کی تھی۔ شاید یہ آغا خان کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر ان کا تقابل، ایک مخصوص و

محدود نقطۂ نظر سے بھی، ایسے لوگوں سے کیا جائے۔ آخر وہ برطانیہ کے شاہی حلقے کے ایک بلند رُتبہ رُکن تھے، ایک شہزادے کے مانند جس پر برطانیہ کی حکومت بہت اعتماد کرتی تھی، اور جو، ریاست حیدرآباد کے وزیرِاعظم سر سالار جنگ کی طرح، کسی ایک محدود خطۂ ارض کے شہزادے نہیں تھے، جن کو گیارہ توپوں کی سلامی بھی دی گئی تھی۔ سر سالار جنگ کو اتنا بڑا اعزاز اس لیے بخشا گیا تھا کہ وہ تاجِ برطانیہ سے مرکزی ہندوستان اور دکن کی وفاداری کے ذمے دار تھے۔ اسی لیے برطانیہ کے اخبار ٹائمز نے اس رہنما کے بارے میں لکھا تھا کہ ''آغا خان پر سر سالار جنگ سے زیادہ وسیع ذمے داریاں تھیں اس لیے کہ انھوں نے مقامی اور صوبائی حدود سے کہیں زیادہ وسیع میدانوں میں خدمات انجام دی تھیں بالخصوص اس وقت جب برطانوی راج ۱۸۵۷ء کی اتھل پتھل سے زیادہ مشکل دور سے گزر رہا تھا۔

پھر بھی ہمیں جلد بازی میں غلط نتیجے نکالنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ تحریر ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی تھی جب آغا خان کو مسلم لیگ کی صدارت سے فارغ ہوئے چار برس گزر چکے تھے اور ہندوستان کے سیاسی میدان میں ان کا دوبارہ داخلہ نہیں ہوا تھا۔ سیاسی حیثیت میں وہ ہمیشہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کے وفادار تھے، جب کہ ہندوستان کی ساری آبادی کے حقوق اور خودمختاری کی وکالت کرتے رہے۔ وہ جناح صاحب کی کامیابیوں کی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے اس لیے کہ ہندوستان کے لوگوں اور دولتِ مشترکہ کے حکمرانوں کی ذہنیت کے پورے ادراک کے بغیر، جس میں ہندوستان بھی برابر کی سطح پر شریک ہونے والا تھا، یہ ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی، تاجِ برطانیہ سے اپنے قریبی روابط اور اس کی سرکاری نمائندگی کی وجہ سے وہ (آغا خان) ایک مناسب 'ایجنٹ'، وزیرِ بے محکمہ یا جہاں گرد سفیر کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ اور اس تمام تر احترام اور اعتبار کے باوجود جو میں اس خاکے میں مذکور شخصیات کو دیتا ہوں، میرا خیال ہے کہ آغا خان نے ان کو سونپے گئے کردار کو حیرت خیز انداز میں انجام دیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اور آخر میں ایک اندرونِ خانہ بات۔ اپنے کردار کے سبب ہندوستان کی آبادی کے دل میں ان کی حیثیت کے لیے احترام کے باعث، ایسٹرن فیڈرل یونین کی سرپرستی ایک ایسا مثبت واقعہ تھا جس کے دور رس اثرات اس پاک ہند ادارے کے لیے بہت فائدہ مند ہوئے، اور اس ادارے نے جو مشکل اور قابلِ ذکر ہدف حاصل کیے ہیں، بلا شبہ ان جیسے انسان کی معیت کے بغیر ممکن نہ تھا۔

عبدالرحمٰن صدیقی (اندازاً ۱۹۴۰ء)

بنیاد کار

عبدالرحمن صدیقی

خوند کر فضل حیدر

اے آر صدیقی خلافت تحریک کے بعد

(۱۹۱۲ء/۱۹۱۳ء) میں ترکی جانے والا میڈیکل مشن (دائیں سے) شعیب قریشی، اے آر صدیقی اور چودھری خلیق الزماں

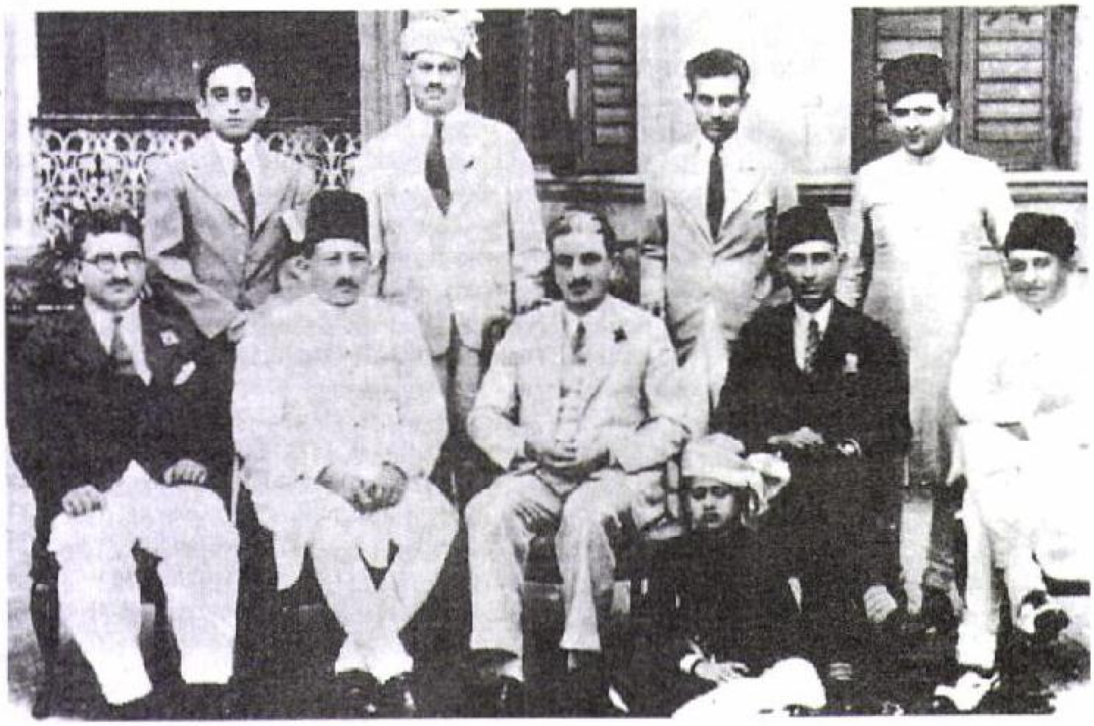

اے آر صدیقی کی جانب سے ترکی کی جنگ کے ہیرو رؤف بے کے اعزاز میں استقبالیہ، انتہائی بائیں جانب
کی نشست پر غلام محمد ہیں جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے

اے آر صدیقی کلکتہ میں ای ایف یو کے عملے کے ساتھ، ان کے دائیں جانب مسٹر اسپونر اور بائیں جانب عزیز انصاری ہیں

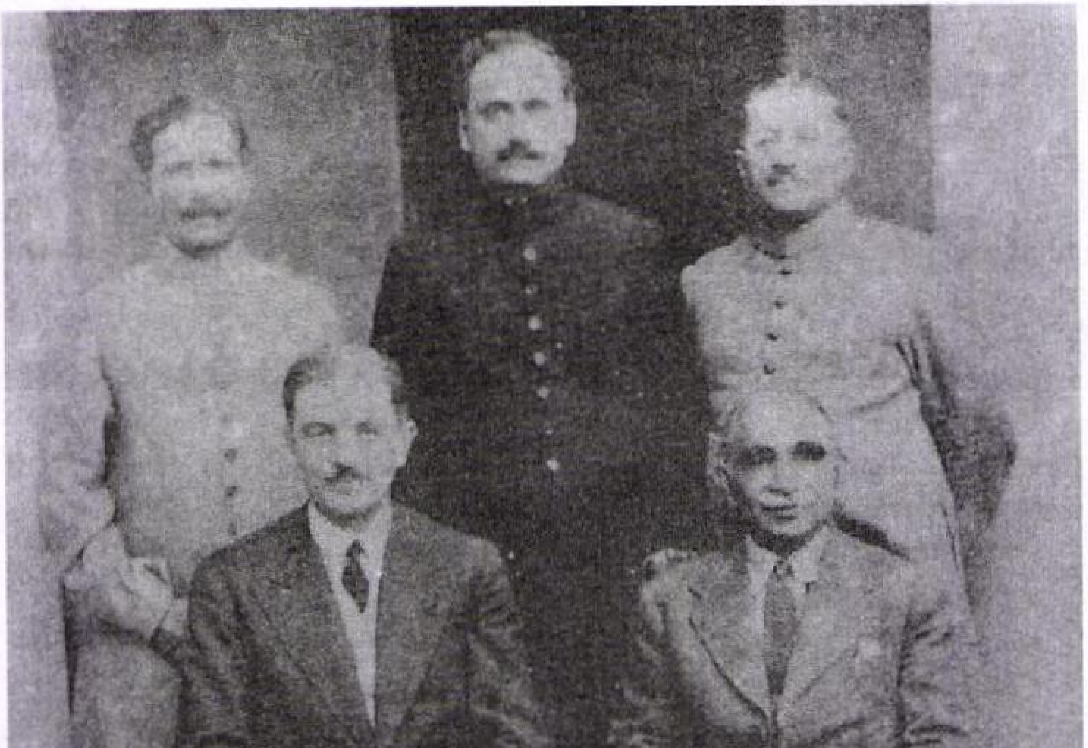

ترکی جانے والے خلافت تحریک کے میڈیکل مشن کے سربراہ کی جانب سے ترکی کی جنگ کے ہیرو رؤف بے
کے ہندوستان میں استقبالیہ کے موقع پر (دائیں سے بیٹھے ہوئے) ڈاکٹر انصاری، رؤف بے
اور دائیں طرف کھڑے ہوئے اے آر صدیقی

عبدالرحمن صدیقی

ایک نڈر، اور صاف گو مثالیت پسند

اس شخص نے اپنے لیے بہت سے عنوان تراش رکھے تھے: بین الاسلامی، وطن پرست، سیاست داں، تاجر، صحافی اور مقرر۔ عبدالرحمٰن صدیقی کی متحرک شخصیت فن کارانہ طور پر تراشے ہوئے کسی ہیرے کے بے شمار چمک دار پہلوؤں کا مجموعہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ صدی کے پہلے پچاس ہیجان خیز برسوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مادّی اور مالی طور پر بھلائی کرنے والوں میں کم ایسے ہوں گے جو اُن کی برابری کر سکیں گے۔ یقیناً وہ ایک عظیم الشان شخصیت تھے، زندگی کے ضمن میں ان کے بہت سے طے شدہ ہدف تھے اور خداوندِ عالم نے ان کو متنوع خصوصیات سے نوازا تھا۔

عبدالرحمٰن صدیقی سورت کے متوسط طبقے کے ایک خاندان میں ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے ماموں سر علی محمد خاں دہلوی نے، جو ایک مشہور قانون داں تھے اور کراچی میں وکالت کرتے تھے، ان کی تعلیم کی نگہداشت کی۔ انھوں نے کراچی سے میٹرک کا امتحان دیا اور ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ایم اے او کالج علی گڑھ گئے جہاں سے ۱۹۱۱ء میں انھوں نے تاریخ میں ایم اے کی ڈگری (اوّل بدرجہ اوّل حاصل کی۔

علی گڑھ میں گزرے ہوئے سال ان کے لیے فیصلہ کُن تھے جنھوں نے ان کی زندگی کے مستقبل کو سنوارا۔ اسی مشہور مسلم یونی ورسٹی میں ان کی ملاقاتیں ایسے بہت سے لوگوں سے ہوئیں جن کے اثرات ان کی ذاتی زندگی پر پڑے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا محمد علی تھے وہ جن کے زیرِ اثر آئے اور ان کے فلسفۂ مثالیت کے خوشہ چیں ہوئے۔ دوسرے شخص شعیب قریشی تھے جو ان کے ہمزاد جیسے قریبی دوست تھے۔ بہت سے لوگ جنھوں نے بعد میں شہرت حاصل کی ان میں سے اگر صرف چند کے نام لیے جائیں تو وہ خواجہ ناظم الدین، شہید سہروردی، عبدالرحمٰن پشاوری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر سید محمود تھے۔

علی گڑھ میں طالب علمی ہی کے زمانے میں وہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے اجلاس میں رضا کار کے طور پر کام کرنے کے لیے ڈھاکے گئے تھے اور سچ پوچھا جائے تو یہی ان کی سیاسی زندگی کا نقطۂ آغاز تھا۔ وہ پیدائشی مقرر تھے اور اس صفت نے ان کو طالب علموں میں مقبول بنایا، ان کو طالب علموں کی یونین کا نائب صدر منتخب کر لیا گیا۔ یونین کا صدر ہمیشہ کالج کا پرنسپل ہی ہوتا تھا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ نائب صدر ہی کیمپس کی سب سے بااثر شخصیت ہوتی تھی۔ طالب علموں کے نمائندے کی حیثیت ملنے سے ان کو وہ مقام ملا جس نے ان کو برصغیر ہندوستان کے ممتاز رہبروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ گریجویشن کے بعد انھوں نے نواب وقار الملک کے معتمد کی حیثیت سے کام کیا، جو اس زمانے میں کالج کے معتمد تھے۔ نواب وقار الملک سر سیّد کے وفادار شاگردوں اور مسلم لیگ کے بنیاد گزاروں میں سے ایک تھے۔ اور یہی حیثیت تھی جس میں عبدالرحمٰن صدیقی (ARS) کو ملکی سیاست، ہندوستان کے مسلمان باشندوں اور علی گڑھ تحریک کے، جس کا مرکز

علی گڑھ ہی تھا، تجربات ہوئے۔

سیاسی اعتبار سے یہ زمانہ بہت اہم اور پُرآشوب تھا۔ مغربی تہذیب اور تمدّن کے اثرات نے ایک ایسا بارسوخ مگر آزاد خیال طبقہ پیدا کر دیا تھا جو یورپ کو اپنا عقلی و ذہنی گھر جانتا تھا۔ وہ اپنے تہذیبی نقوش کے بہت سے اجزا پر تنقید کرتا تھا۔ اس کے نزدیک ہندوستان اور یورپ کی تہذیبوں کے باہمی ملاپ کے ذریعے ہندوستانی زندگی کو جدید خطوط پر استوار کیا جانا ہی اس کا پسندیدہ معیار تھا۔ یورپی تہذیب کے بارے میں اس قسم کی بے باک اور بلا تنقید اور اس قسم کی نقالی نے ہندوستان میں ایک مخالف طبقہ بھی پیدا کر دیا جو ۱۸۷۰ء کے عشرے میں شروع ہو کر صدی کے آخری برسوں میں اپنے پورے کمال پر پہنچ گیا تھا۔ اس کو ہندو نشاۃِ الثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو دراصل قومیت اور ہندو مذہب کے ملاپ کا ایک نیا ظہور تھا۔ مسلمانوں کا ہندو مذہب کے اس احیا کا جواب سر سیّد احمد خاں اور ان کی علی گڑھ تحریک تھی۔ پاکستان کے سب سے نمایاں مورخ خالد بن سعید لکھتے ہیں کہ "بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمانوں کی طرف سے سرسید کو ان کی دلیری پر بہت خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے اس لیے کہ انھوں نے ایسے زمانے میں اس نوع کے خیالات پیش کرنے کی جرأت کی جب ماحول کسی طرح بھی نہ آزاد خیال تھا اور نہ روادار۔ مگر جس بات پر زور نہیں دیا گیا وہ یہ حقیقت تھی کہ مذہب اور فکر کے ملاپ کی کوشش میں سر سیّد صرف مغربی تصورات ہی کے زیرِ اثر نہیں تھے۔ ان کا ذہن مغل تھا جو اپنے کمال پر بے تعصب بھی تھا اور انتخابی بھی۔ مغلوں نے وراثت میں صرف عالیشان تعمیرات ہی نہیں آزاد خیالی بھی چھوڑی ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں بات کرتے ہوئے ایک سر بر آوردہ برطانوی مؤرّخ نے لکھا تھا:

"سات برس کی تعلیم کے بعد ایک نوجوان مسلمان اپنے اس سر پر پگڑی باندھتا ہے جو ایسے خیالات سے مملو ہوتا ہے جو علم کی ان تین شاخوں سے متعلق ہوتے ہیں جیسے آکسفرڈ سے نکلنے والے تازہ دماغ میں ہوتے ہیں۔ وہ سقراط و ارسطو، افلاطون و بقراط اور Galeen ابی سینا پر فرفر باتیں کر سکتا ہے۔"

اور میرے خیال میں یہ صرف ستائش ہی نہیں تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغل دربار اور اعلیٰ تعلیم کے بارے میں اُن کی سمجھ بوجھ کو دور دراز تک احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور اس موضوع پر باتیں کرنے والے اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اس وقت تک علی گڑھ صرف ایک تعلیمی شہر سے آگے نکل چکا تھا۔ یہ شہر اب مسلم تجدید اور شناخت کا مرکز بن چکا تھا۔

چودھری خلیق الزماں جو اسی برس پیدا ہوئے تھے جب ARS کی پیدائش ہوئی تھی، یعنی ۱۸۸۹ء میں اور انھوں نے بھی علی گڑھ ہی میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ بھی ایک سر بر آوردہ مسلم رہبر بنے تھے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح حیات "Pathway to Pakistan" میں اس شہر کے بارے میں جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کتنا اہم تھا لکھا ہے:

"جغرافیائی اعتبار سے علی گڑھ ایک شہر کا نام ہے مگر مسلم سماج کی عام بول چال میں یہ لفظ تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی توقعات کی ایک نظریاتی علامت کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ان کے ذہنوں میں یہ نام قرطبہ اور بغداد کی دُہائی کے طور پر اُبھرتا تھا۔ یہ شہر عمل کے ہر میدان میں مسلم نشاۃ الثانیہ کا مرکز تھا۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ جب کالج کی احاطے میں ہوتے تو طالب علم ہوتے مگر احاطے سے باہر ہر ایک ہندوستان میں مسلم سماج کے مستقبل کے لیے امید کا پیام بر ہوتا۔ علی گڑھ کا نام ایک طلسماتی کشش رکھتا تھا اور یہ ہر شہر ہر گاؤں کے مسلم گھرانے میں جانا جاتا تھا۔ جہاں بھی اس کے طلبہ گئے، ان کا استقبال احترام اور ستائش کے جذبات کے ساتھ کیا جاتا، بالخصوص دوسرے اداروں کے مسلم طلبہ میں۔ کالا کوٹ اور ترکی ٹوپی صرف کالج کے اوقات کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ وہ جب بھی اپنے گھروں سے باہر نکلتے تو یہی لباس زیبِ تن ہوتا تھا۔ ان میں خود اعتمادی ایسی ہوتی کہ بس دیکھتے رہیے، اس لیے کہ عوام کی پژمردہ روح کو بلند کرنا، ان میں امید اور خود اعتمادی کو بحال کرنا، ان کو ترقی اور پیش قدمی کی طرف راغب کرنا ان کی زندگی کا اوّلین مقصد ہوتا تھا۔ ہندوستان میں صدیوں کی ملوکیت

اور جاگیرداری نے اسلام کے غیر طبقاتی اور مساوات کے جذبے کو ماند کر دیا تھا۔ اس دور میں طبقات کے درمیان بلندی اور پستی کے تعصبات، خاندانوں کے، قبیلہ جاتی برتری کے، فرقہ واریت کے احساسات نے مسلمانوں کو شیعہ اور سنی، وہابی اور غیر وہابی، شافعی، حنفی، وغیرہ میں تقسیم کر کے رکھ دیا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے یہ عملی خیالات کے حامل سپاہی میدان عمل میں آ گئے تھے، نہ صرف تعصبات اور تفرقوں کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جو زندگی کی سماجی اور علمی اقدار کو کھائے جا رہی تھیں بلکہ بھٹکے ہوئے گلّے کو باڑے میں واپس لانے کے لیے۔ یہ محض بلند نظریات کے پرچارک نہیں تھے، بلکہ وہ ان پر کالج کی اقامت گاہوں میں قیام کے دوران عمل بھی کرتے اور دوسروں کو ان پر چلنے کی دعوت بھی دیتے تھے۔''

۱۹۰۶ء میں مسلمانوں نے اپنی آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی جو ۱۸۸۵ء میں بنائی جانے والی انڈیا کانگریس کا دیر آید' جواب آں غزل' تھا۔ باوجود اس کے کہ کانگریس کے روحانی پیشوا تقسیم ہند کے وقت تک یہی ڈھول پیٹتے رہے کہ یہ ہندوستانیوں کی مشترکہ جماعت ہے، لیکن بنیادی طور پر یہ خالصتاً ایک ہندو جماعت تھی۔ یہی وہ سنگم تھا جس پر پہنچ کر نوجوان ARS نے سیاست سے اپنی محبت کو دریافت کیا اور کم از کم غیر شعوری طور پر نہ صرف یہ کہ اس کو اپنا پیشہ بلکہ اپنا مقدر بنالیا۔

ہندوستان سے باہر ہونے والے واقعات کے دھاروں نے بھی قومیت کے سیلاب کو تلاطم خیز کیا۔ اس وقت یورپ کی برتری کو للکارا نہیں گیا تھا۔ انیسویں سے بیسویں صدی کے موڑ پر ہونے والے کئی واقعات سے یہ اشارے ملتے تھے کہ یہ بلا مقابلہ قیادت انحطاط پذیر ہو رہی ہے۔ ۱۸۹۶ء میں اطالیہ کی فوج کو ابی سینیا میں افریقی جنگجوؤں کے بادشاہ مینیلک کے ہاتھوں شکستِ فاش ہو چکی تھی۔ اور چند برسوں بعد ہی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جنوبی افریقا میں بسے ہوئے ولندیزی کاشتکاروں نے برطانوی سامراج کے خلاف جنگ میں دشمن کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ اور سب سے زیادہ جاپان کے نیند سے اٹھ جانے سے ہندوستان کے قوم پرستوں کے انگ انگ میں بجلیاں بھر گئیں۔ انھوں نے ۱۹۰۵ء میں دیکھا کہ اس چھوٹی سی ایشیائی طاقت نے روسی سلطنت کے مہیب ریچھ کو شکست دے دی۔ برطانیہ کے ایک ہم عصر نے اس زمانے میں ہندوستان میں پھیلتے ہوئے احساسات کو یوں بیان کیا ہے:

''ہندوستان کے شمالی علاقوں میں ایک ہیجانی جھرجھری دوڑ گئی تھی۔ دور دراز کے گاؤں کی چوپالوں میں راتوں کو بیٹھ کے حقہ کشی کرنے والے بھی جاپان کی فتوحات پر تبادلۂ خیالات کرتے۔ طویل تجربے کے حامل ایک ترک سفارت کار نے مجھے بتایا کہ 'اندرونِ ملک ہر جگہ جاہل سے جاہل کسان بھی ان خبروں سے جھنجھناتا نظر آ رہا تھا' ایشیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل گیا تھا اور صدیوں کا خواب بالآخر ٹوٹ گیا تھا۔''

مسلمانوں میں خود اعتمادی کے نئے جنم کے ایسے جذباتی دور میں ARS کی ذہنی اور دانش ورانہ نشوونما ہوئی تھی اور یہ بھی کہ انھوں نے علی برادران، شعیب قریشی، شہزادہ حمید اللہ خان، بھوپال کی تیسری بیگم، جو بعد میں تخت نشین ہوئیں، راجا محمود آباد، خلیق الزماں، ڈاکٹر انصاری اور ان کے بھتیجے عزیر جیسے لوگوں سے زندگی بھر کی دوستیاں کیں۔ ARS کی حیات کا مطالعہ کرنے والوں کا ایسی بہت سی ہستیوں سے سامنا ہوتا ہے۔ یہ سب کے سب اپنے وقت کے منفرد و ممتاز شخصیتوں میں سے تھے اور یا تو جن کے سانچوں میں یہ خود ڈھل گئے تھے یا اُن کے لیے یہ مسلمانوں کے ایک نڈر ترجمان کی علامت بن گئے تھے۔

سیاست میں ان کی دل چسپیوں اور ان کے توانا اندازِ تحریر نے بہت جلد مولانا محمد علی کو ان کی جانب متوجہ کر لیا، جس سے ان کی پہلی ملاقات علی گڑھ میں ہو چکی تھی۔ مولانا نے ۱۹۱۲ء کے جنوری میں ARS کو اپنے مشہور اخبار 'کامریڈ' میں مہتمم کی حیثیت سے شمولیت کی دعوت دی جس کا اجرا ایک سال قبل کلکتے سے ہو چکا تھا۔ یہ بڑے وسیع حلقے میں پڑھا جاتا تھا اور ہفتے وار اس کی اندازاً بیس ہزار کاپیاں شائع ہوتی تھیں۔ صحیح معنوں میں صرف ان اعداد و شمار سے اس بات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ کتنے قاری اس اخبار کے لکھے سے متاثر ہوتے تھے اس

لیے کہ آج بھی ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے شہروں اور گاؤں کے اَن پڑھ باسیوں کے لیے اخبار با آواز بلند پڑھے جاتے ہیں۔

۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کے دربار میں بنگال کی تقسیم کا اعلان مسلمانوں کے مفادات کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا۔ اخبار 'کامریڈ' اور مولانا ابوالکلام آزاد کا ۱۹۱۲ء میں جاری کردہ اخبار 'الہلال' دونوں بڑھ چڑھ کر تمام دنیا کے مسلمانوں کو جگا رہے تھے۔ ان لوگوں کو اور بھی مشکلات درپیش تھیں۔ اطالیہ اور ترکی کے درمیان ہونے والی جنگ (۱۹۱۱ء) سے ان کو بہت مایوسی ہوئی اس لیے کہ ان کے نزدیک برطانیہ نے ترکوں کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ جنگِ بلقان (۱۹۱۲ء) نے تو مسلمانوں کی اور بھی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسیحی طاقتوں کا طے شدہ منصوبہ تھا کہ ترکی کو یورپ سے نکال باہر کیا جائے تا کہ یورپ میں اس کی طاقت زائل ہو جائے۔ ان حالات کے زیرِ اثر 'ہلالِ احمر مشن' کے نام سے مسلم طبی مشن ترکی بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا تا کہ طرابلس اور بلقان کی جنگ میں اس کی امداد کی جائے۔

ARS ان پُر جوش مسلم نوجوانوں میں سے تھے جن کو اس مشہور طبی مشن میں شامل کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ تقریباً ایک برس بعد وہ ایم اے کرنے اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کلکتے سے علی گڑھ واپس پہنچے۔ مولانا محمد علی اپنے اخبار 'کامریڈ' کو کلکتے سے علی گڑھ منتقل کر چکے تھے اور ان (ARS) کے علی گڑھ پہنچنے کے چند دن بعد ہی مولانا محمد علی نے مسلمانوں سے ایک فنڈ میں چندہ دینے کی اپیل کی جو اس طبی مشن کے اخراجات اُٹھانے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ دلّی کے ڈاکٹر انصاری جو لندن کے چیئرنگ کراس ہسپتال کے ہاؤس سرجن رہ چکے تھے، اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ معالج تھے، اس مشن کے سربراہی کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

چودھری خلیق الزماں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ "طلبہ کو طبی مشن بھیجنے کا خیال اچھا لگا اور ہم سب نے مشن فنڈ کے لیے چھوٹی چھوٹی رقمیں بھیجنا شروع کر دیا۔ ایک دن میں اپنے کمرے کے سامنے برہنہ پا اور برہنہ سر، بکھرے بالوں کے ساتھ ٹینس کھیلنے میں مصروف تھا کہ رحمٰن نے مجھے پکار کر اپنی طرف متوجہ کیا، جس کے پاس اعلیٰ درجے کے لباس میں ملبوس ایک وجیہ شخصیت کھڑی ہوئی تھی۔ رحمٰن نے اپنے کالج کی فٹ بال کی ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے طبی مشن لے جانے کی ذمے داری سنبھالنے پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ علی گڑھ اس لیے آئے ہیں کہ اپنی ذمے داریاں نبھانے میں معاونت کی خاطر کچھ نوجوانوں کو مدد کے لیے ساتھ لے جائیں۔ میں نے کہا کہ میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ انتظامی امور سنبھالنے کے ساتھ مریضوں کی دیکھ بھال کی کچھ ذمے داریاں تو نبھا سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مجھے معاملات پر غور کرتا چھوڑ گئے۔ شام ہوتے تک میں نے طبی مشن میں شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چند دنوں بعد رحمٰن، شعیب قریشی، (ڈاکٹر انصاری کے بھتیجے) عزیز انصاری، کالج سے میں اور اسکول سے منصور محمود اور عبدالرحمٰن پشاوری طبی مشن میں شمولیت کے لیے دلّی کے لیے روانہ ہو گئے، جہاں سے ہمیں بمبئی جانا تھا۔"

"مشن کی بمبئی روانگی سے قبل اس کے شرکاء کی ملاقات وائسرائے، لارڈ ہارڈنگ، سے کرائی گئی اور انھوں نے سب سے مصافحہ کیا۔ بمبئی سے طبی مشن ۶ نومبر ۱۹۱۲ء کو بذریعہ اطالوی بحری جہاز Sardinia روانہ ہو گیا۔ پانچ دن کے بحری سفر کے دوران ڈاکٹر انصاری نے ابتدائی طبی امداد پر کچھ لیکچر دیے۔ استنبول پہنچنے پر مشن کا ہلالِ احمر (Red Crescent) اور ترکی کی اہم شخصیات کی جانب سے پُر تپاک استقبال کیا گیا اور مشن نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ طبی مشن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور یہ دونوں میدانِ جنگ کے عقب میں اپنے ہسپتال قائم کرنے کے لیے استنبول سے روانہ ہو گئے۔ برف باری اور بارش کے درمیان دن رات زخمیوں کے استقبال کی تیاریوں اور ان کے معالجے کے سلسلے میں ان کے کام کو بہت سراہا گیا۔ ARS کو جنرل منیجر کی حیثیت سے استنبول ہی میں قیام کرنا تھا جہاں سے مشن کی ضروریات کی بجا آوری ان کا فریضہ تھا جس میں انھوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کو ثابت کر دیا اور ان کو ان کی صبر آزما اور دقت طلب کوششوں پر بہت داد دی گئی۔

مشن نے تین ماہ تک اپنے فرائض انجام دیے اور اس کو ہندوستان کے مسلمانوں کی جانب سے، ایسے وقت میں جب اسلامی

قدریں اور بنیادی اُصول خطرے میں تھے، ایک کامیاب پیش رفت قرار دیا گیا تھا۔ اپنے عم کے بارے میں مجھ سے بات کرتے ہوئے بیگم قاضی نے، جو شعیب قریشی کی بیٹی اور ARS کے بھتیجے ڈاکٹر زیڈ کے قاضی کی اہلیہ تھیں، بتایا کہ ''لوگ ہمیشہ یہی سمجھتے تھے کہ تحریکِ خلافت کے بانی صرف خلیفہ اور اس کے بدعنوان درباریوں کی جان بچانے کے لیے یہ تحریک چلا رہے تھے۔ مگر یہ صحیح نہیں تھا۔ اور صرف خلیفہ اور اس کے درباریوں کی جان بچانے کے لیے اپنی جانوں پر نہیں کھیل رہے تھے۔ انہیں اس بات کا خوف تھا کہ ترک سلطنت کی تباہی کے نتیجے میں مشرقِ وسطیٰ کے ٹکڑے ہو جائیں گے، مصنوعی طور پر ایسی نئی مملکتیں بنائی جائیں گی جن کا پہلے کبھی وجود بھی نہیں تھا اور یہ مملکتیں اطالوی، برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں کے زیرِ تحفظ بن جائیں گی۔ دوسرے لفظوں میں، جیسا کہ میرے والد اور چچا ہمیشہ کہا کرتے تھے، تحریکِ بنیادی طور پر خلافت کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ اسلامی اُخوت کے لیے چلائی جا رہی تھی۔''

مشن کی تکمیل کے بعد اس کے زیادہ تر ارکان سیدھے ہندوستان واپس ہو گئے۔ روانگی سے قبل سلطان سے ان کا تعارف کرایا گیا جو لوگوں کی کارکردگی کا معترف تھا۔ ARS اور ان کے قریب ترین ساتھی، شعیب قریشی، چودھری خلیق الزماں اور عزیز انصاری نے ترکی ہی میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ لوگ ترکی اور اس کے لوگوں کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا قیام بلا شبہ لُطف انگیز رہا۔ ترکی سے واپسی پر ان کے دل و دماغ نئے تصورات اور خیالات سے پُر تھے اور یہ لوگ اسلامی برادری کے لیے اپنی جد و جہد جاری رکھنے کے لیے ہمہ تن تیار تھے۔ ہندوستان واپسی کے سفر کے دوران یہ لوگ مصر بھی گئے اور جب یہ سب اسکندریہ پہنچے تو 'رؤف بے' کی کمان میں ترکی کے مشہور بحری تباہ کُن جہاز 'حمیدیہ' کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جنگِ بلقان کے دوران کپتان رؤف بے کی کارگزاریوں کے بارے میں دوستوں نے سُن رکھا تھا کہ وہ نہایت فن کاری سے اپنے جہاز کو آبنائے Dardanelles سے نکال لایا تھا جب کہ اس علاقے پر یونانی جنگی جہازوں کے کڑے پہرے لگے ہوئے تھے۔ کھلے سمندر میں پہنچ جانے کے بعد اس نے یونانی بحریہ کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ ان لوگوں نے جہاز پر جا کر 'رؤف بے' سے بھی ملاقات کی، جس کو زندگی سے بھرپور، توانائیوں اور مسکراہٹوں کی شخصیت پایا۔ ان لوگوں کی پسندیدگی یقیناً دوطرفہ رہی ہوگی اس لیے کہ اس وقت کی ایسی تصویروں میں ARS، خلیق الزماں قریشی اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ موجود تھے جب رؤف بے' ہندوستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے۔

علی گڑھ واپسی کے بعد سے سب دوستوں کا مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری سے سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیالات کے سلسلے میں دلّی برابر آنا جانا رہتا تھا۔ عالمی جنگِ اوّل کی شروعات کے بعد مولانا محمد علی نے اپنے اخبار 'کامریڈ' میں The Choice of Turks کے عنوان سے مضمون شائع کیا جس میں انھوں نے ان وجوہات پر بحث کی کوشش کی تھی جن کی بنا پر ان کے خیال میں ترکوں کو جرمنوں کا ساتھ دینا چاہیے تھا، اگرچہ برطانیہ اس کو پسند نہیں کرتا۔ مضمون کی اشاعت کے بعد ان کا اخبار ضبط کر لیا گیا اور علی برادران کو قید کر دیا گیا اور وہ جنگ کے دوران پوری مدّت قید ہی میں رہے۔ برطانیہ کے بارے میں تلخیاں جب کہ ترکی کے مستقبل کے بارے میں فکر بڑھتی رہی حتیٰ یہ مرض ان مسلم لیگی لوگوں پر بھی اثر انداز ہونے لگا جو مغرب زدہ سمجھے جاتے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں بمبئی میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے صدارتی خطبے میں فضل الحق نے اعلان کیا تھا کہ ''میرے نزدیک ہندوستان میں اسلام کا مستقبل افسردگی اور تشویش کے گہرے سایوں کی زد میں لگتا ہے۔ ہر مسلم طاقت کے زوال کا واقعہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اہمیت پر نحس اثرات کا باعث ہوگا۔'' انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوؤں سے اپنی روایتی دشمنی کو ترک کر دیں اور برطانوی افسر شاہی کے خلاف ان کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھائیں۔

اگرچہ یہ کچھ مستحسن نہیں تھا مگر اب یہ صاف نظر آنے لگا تھا کہ برطانیہ کی ترک مخالف پالیسی اور ہندوستان میں سرکاری جبر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے بازوؤں میں ڈھکیل رہا تھا۔ اس کا پہلا اشارہ ۱۹۱۶ء میں ہونے والا مشہور 'لکھنؤ معاہدہ' تھا جس کے اہم ترین معمار محمد علی جناح تھے۔ انھوں نے مسلم لیگ کے روشن خیال بازو کی سربراہی سنبھال لی تھی اور اور اب وہ ہندو۔ مسلم اتحاد کے سفیر کے طور پر

جانے جاتے تھے۔ یہ معاہدہ دونوں جانب سے دی جانے والی رعایات کا ماحصل تھا۔ اور اسی جذبے کے تحت مہاتما گاندھی آگے آئے اور خود تحریکِ خلافت کا حصہ بن گئے۔ اور جہاں لکھنؤ معاہدے سے ظاہر ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے درمیانہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اپنے مذہبی اختلافات بھلا کر قریب آسکتے ہیں وہیں تحریکِ خلافت سے یہ بھی اظہر من الشمس ہوا کہ اگر سیاست اور اس کی عوامی تحریکات میں مذہبی عناصر شامل کیے گئے تو بہت ہی مختصر عرصے میں آپس کے سمجھوتے کی فضا ہوا ہو جائے گی۔ ہندوستان کی تاریخ کے اس مخصوص واقعے کے تجزیے سے اس دور کے کے تاریخ دان یہی کچھ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاید گاندھی نے محسوس کر لیا تھا کہ اس تحریک کی حمایت سے نہ صرف وہ برطانوی استعمار پر کاری ضرب لگا سکیں گے بلکہ وہ یہ بھی اچھی طرح واضح کر دیں گے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کی خلیج کو پاٹنا کتنا ضروری ہے اور اس قسم کی باتوں سے وہ مسلمانوں کو مسلم لیگ سے دور کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کے خاص الخاص معاملے میں گاندھی کی یہ دخل اندازی ایک انوکھا عمل تھا۔ اور مولانا محمد علی جیسے تنقیدی ذہن نے بھی مہاتما کو صاحبِ کشف اور 'بڑے دل کا آدمی' کہا اور اُن کے گُن گانے پر مجبور ہو گیا۔ صرف علی گڑھ نے مہاتما کی ترغیبات سے صرفِ نظر کیا اور اپنے انداز میں لڑتا رہا۔ مگر وہ ترک ہی تھے جنھوں نے تحریکِ خلافت کو ختم کر دیا، نہ تو یورپ ہی کچھ کر سکے نہ ہی گاندھی کی نافرمانی کی پالیسی اثر انداز ہوئی۔ مصطفیٰ کمال اتاتُرک کے اقتدار پر قبضے نے سلطنتِ عثمانیہ کو درہم برہم کر دیا اور ترکی ایک جدید جمہوریہ بن کر ابھرا۔ لٰہذا مصطفیٰ کمال نے خلافت کو از کار رفتہ ادارہ سمجھ کر ختم کر دیا۔ ہندوستان کے مسلمان ایک گہرے تذبذب میں غرق ہو گئے۔ اس طرح جہاں ہندو انتہا پسندی کو ایسی توانائی مل گئی جیسی پہلے کبھی نہ تھی، وہیں مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ ہندوستان کی مسلمان آبادی کو سُرعت سے بدلتے ہوئے ہندوستان میں اپنے مستقبل کے لیے اپنی کارکردگی کا تجزیہ کرنا پڑا۔

ترکی سے واپسی کے بعد ARS نے تحریکِ خلافت میں عملی طور پر بھر پور حصہ لیا تھا۔ اپنے دوستوں، قریشی اور خلیق الزمان کے ساتھ انھوں نے اسلحے اور گولہ بارود کے حصول کی غرض سے سرحدی علاقوں کے دورے بھی کیے تھے، اس لیے وہ سمجھ رہے تھے کہ جنگ میں ترکوں اور جرمنوں کی امداد ان کی اپنی جدوجہد، یعنی اپنی آزادی، میں معاون ہوگی۔ انھوں نے افغانستان کے امیر حبیب اللہ خان تک کو ترکی کی حمایت کے لیے راضی کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب لاہور کے بہت سے مسلم طلبہ کالج چھوڑ کر انتشار اور بدنظمی کے مارے شمال مغربی سرحدی علاقے میں داخل ہو گئے تھے جہاں وہ انتہا پرست قبائل کے ساتھ ہو لیے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف جہاد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ تاریخ کی کتابوں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کی کوششیں ناکام ہونے والی تھیں۔ اپنی تمام تر مشکلات اور خطرات کے باوجود اپنے لوگوں کو غیر جانب دار رکھا اور اپنا سارا زور سرحد کو پُرسکون رکھنے پر صرف کر دیا تھا۔ خلیق الزماں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اپنے دوستوں کی مہم جوئیوں کا بہت صاف نقشہ کھینچا ہے۔ اپنی اور اپنے قریبی دوستوں کی دلیرانہ کارروائیوں کے بارے میں، جو نہ صرف اپنے مستقبل بلکہ اپنی جانوں پر کھیل کر جو کچھ کر گزرنا چاہتے تھے، اس کے بارے میں یہ ایک عمدہ تحریری یادگار کے مماثل ہے۔

اس دوران ARS نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں قانون پڑھنے کے لیے داخلہ لے لیا تھا اور امتیاز کے ساتھ LL.B کر لیا تھا۔ پھر بھی ان کی سیاسی اور عوامی سرگرمیاں جاری رہیں اور کچھ دنوں کے لیے وہ کانگریس کے فعال کارکن بھی رہے مگر بالآخر جب محمد علی جناح نے اس میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلم لیگ ہی وہ جگہ ہے جہاں ان کو ہونا چاہیے۔ تمام عمر ان کی محبتیں اور سرگرمیاں عالمی اسلامی مسائل کے لیے وقف رہیں۔ ان کے گُرو اور باپ کے مماثل، محمد علی، کے عقائد ہمیشہ ان کے عقائد رہے۔ قید سے رہائی کے بعد محمد علی ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت میں ۱۹۱۹ء میں برطانیہ گئے تاکہ برطانوی حکومت کو بتائیں کہ مسلمان کبھی پیغمبرِ اسلام کے احکام سے روگردانی نہیں کر سکتے، جنھوں نے بسترِ مرگ پر ہونے کے باوجود مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا کہ جزیرہ نمائے عرب (عرب، عراق، شام اور فلسطین) کو کسی غیر اسلامی طاقت کے ہاتھ نہ جانے دیا جائے۔ یہی ARS کا بھی ایمان تھا اور اپنے طویل سیاسی کردار میں انھوں نے اس

کو اپنا مطمحِ نظر بنائے رکھا تھا۔ انھوں نے بہت سے بین الاقوامی اجتماعات میں مسلمانوں کی نمائندگی کی اور لندن کے دفترِ خارجہ میں منعقد ہونے والی اسکاربرا (Scarborough) کمیٹی میں مسلم لیگ کی نمائندگی کی، جو ۱۹۲۱ء میں ہندوستان سُدھار کے لیے بنائی جانے والی مشہور Montague-Chelmsford Scheme for Reforms in India کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اور یہی وہ وقت بھی تھا جب علی برادران، شعیب قریشی، اور خلیق الزماں نے مل کر قسم کھائی تھی کہ وہ کبھی شادی نہیں کریں گے اور صرف اپنے پیارے ملک کی خدمت میں زندگی گزار دیں گے۔ بیگم قاضی کہتی ہیں کہ ''ان کی جانب سے یہ ایک بہت سوچا سمجھا اقدام تھا، ورنہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے پاس ملک کی خدمت کرنے کے لیے کافی وقت نہ ہوگا۔'' ان کے دو دوستوں نے بعد میں اپنا ارادہ تبدیل کر دیا مگر ARS اپنے عہد پر اٹل رہے اور تجرد کی زندگی گزار دی۔ اور وہ لوگ جو ان سے اچھی طرح واقف تھے بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے عہد کی پاسداری کی حالاں کہ بعد کے برسوں میں ان میں وہ تمام خصوصیتیں (چڑچڑا پن وغیرہ) پیدا ہوگئی تھیں جنھوں نے ان کو ایک 'دل آویز سن رسیدہ کنواری عورت' جیسا مرد بنا دیا تھا۔

انگلستان میں اپنے قیام کے دوران ARS نے آکسفرڈ کے Wadham College میں قانون کی تعلیم کے لیے داخلہ لے لیا اور ۱۹۲۲ء میں بیرسٹر بن گئے۔ انھوں نے کچھ سیاسی مصروفیتوں کی بنا پر آکسفرڈ میں مزید اعلیٰ تعلیم کے مواقع چھوڑ دیے۔ ان میں سے ایک مصروفیت خلافت کمیٹی کے چیف ایجنٹ کی تھی جس کی رہنمائی مولانا محمد علی کر رہے تھے۔ لندن کے قیام کے دوران رفتہ رفتہ زندگی کے بارے میں ان کا زاویۂ نظر تبدیل ہوتا رہا۔ ان کے ذہن میں پُرانے دوستوں کی مرکزیت تو تھی ہی مگر اس دوران انھوں نے کچھ نئی دوستیاں بھی قائم کیں، ان کے ذہن میں نئے خیالات بھی ابھرے اور انھوں نے تازہ تصورات بھی اخذ کیے۔ سر حمید اللہ خان جیسے لوگ، جو بعد میں نواب بھوپال بنے، اور ان کے دوستوں کے مرکزی کردار کے ایف حیدر وغیرہ نے ان کے زرخیز ذہن کی آبیاری کی۔ غلام محمد بھی، جو بعد میں پاکستان کی گورنر جنرل بنے، ان کے حلقۂ دوستاں کے ایک فرد تھے اس لیے کہ وہ حیدر سے بہت قربت رکھتے تھے۔ غلام محمد عمر میں سب سے چھوٹے تھے اس لیے ARS ان کے روز مرّہ پر نظر بھی رکھتے تھے۔ حیدر مشہورِ زمانہ Lincoln's Inn میں قانون پڑھ رہے تھے جہاں سے ۲۵ برس قبل محمد علی جناح فارغ تحصیل ہوئے تھے اور اعزاز کے طور پر اس کے ہال کمرے اور گیلری کے صدر دروازے کے اوپر کی سنگی دیوار پر ان کی تصویر آویزاں ہے۔ یہ ایک مختصر سا گروہ تھا جس میں اکثر ملک سے آنے والے کچھ لوگ بھی شامل ہو جاتے۔ حیدر جو بیکر اسٹریٹ پر ایک فلیٹ میں مقیم تھے، کھانا پکانے کے شوقین تھے۔ اس طرح سب دوست دوپہر کے کھانے پر ملاقات کرتے اور حیدر ان سب کے لیے مزے مزے کے ہندوستانی کھانے تیار کرتے۔ کہتے ہیں کہ کرکٹ اور برج کے علاوہ یہ لوگ ہر وقت مسلم سیاست پر باتیں کرتے تھے۔ ARS کی طرح ان میں سے بہت سے علی گڑھ سے پڑھے ہوئے تھے جن میں شعیب قریشی، غلام محمد اور شہزادہ حمید اللہ خان شامل تھے۔ ان کے مرغوب موضوعات میں سے ایک ہندوستان کے تجارتی اور تعلیمی میدانوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کی پس ماندگی ہوتی تھی۔ ہندوستان کے زیادہ تر صنعتی اور تجارتی حلقے انگریزوں یا ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھے۔ بیگم قاضی کہتی ہیں کہ یہ ولولہ انگیز اور روشن خیال نوجوان لوگ ایک طرح سے لندن کے مشہور ادارے Lloyds Syndicate کے مماثل تھے۔ ''اگرچہ یہ سب ہمیشہ ہم خیال نہیں ہوتے تھے اور کچھ تو سیاسی اختلافات بھی رکھتے تھے، وہ بار بار کہتے تھے، سیاسی اختلاف اپنی جگہ مگر ہم سب پہلے دوست ہیں بعد میں کچھ اور۔ ہم ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔''

غالباً ۱۹۲۵ء میں ARS اور حیدر نے ایک ساتھ کاروبار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے کاروباری قسمت آزمائی کے لیے Haira Limited نام کا ایک مشترکہ ادارہ ترتیب دیا۔ اس نام میں 'Hai' حیدر سے لیا گیا تھا اور 'ra' رحمٰن صدیقی کے نام سے۔ یہ درآمد و برآمد میں اچھا خاصا کام کر لیتے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب پہلی بار کے ایف حیدر کی مالیاتی ہنرمندی دریافت ہوئی۔ ARS ان کے

جیسے ساتھی پا کر خوش تھے اس لیے حیدر کی موجودگی میں ان کو سیاسی مصروفیتوں پر توجہ دینے کے لیے خاصا وقت مل جایا کرتا۔ اسی دوران ARS اور کے ایف حیدر کی ملاقات Clive Collin نامی ایک شخص سے ہوئی جو لندن کے ایک Lloyds Brokers ادارے کے شراکت دار کا بیٹا تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ARS کی ملاقات اس کے والد BM Collins سے استنبول میں ہو چکی تھی جب وہ اپنی سیاسی مصروفیتوں کے سلسلے میں وہاں گئے ہوئے تھے۔ ARS کے نزدیک وہ نہ صرف ایک معتبر شخص تھے بلکہ کاروبار کے معاملے میں مہم جو بھی واقع ہوئے تھے۔ یہ کولنز ہی تھے جنھوں نے ان دونوں کو ہندوستان میں بیمہ کمپنی کھولنے کا خیال پیش کیا۔ ان لوگوں کے سیاسی پس منظر اور فعال دوستوں کے ممکنہ تعاون کے پیشِ نظر یہ خیال زرخیز زمین میں ایک بیج کے مماثل ٹھہرا۔ دوستوں کے درمیان سنجیدہ اور گرما گرم مباحث جاری رہی جس میں شہزادہ حمید اللہ اور غلام محمد بھی شامل ہوتے۔ سب اس بات پر متفق تھے کہ مسلمانوں کی ملکیت اور مسلمان کارکنوں پر منحصر بیمہ کمپنی ایک اچھی شروعات ہوگی جس سے اس کے شرکا اور مسلم عوام کو فائدہ ہوگا۔ لہٰذا اس مشورے کو صدقِ دل سے قبول کر لیا گیا اور دی اٹلس انشورنس کمپنی کے چیف ایگزیکٹو کی مدد بھی حاصل کر لی گئی جنھوں نے کمپنی کی شروعات میں انتظامی امور پر مشاورت اور امداد کے وعدے کیے۔ صدی کے تیسرے عشرے میں ضروری کارروائی مکمل کر لی گئی۔ اس وقت تک شہزادہ حمید اللہ خان نے، جو بھوپال کے نواب بن چکے تھے، اور آغا خان دونوں نے ایسٹرن فیڈرل یونین کی سرپرستی قبول کر لی۔ کمپنی کلکتے میں رجسٹر کرائی گئی اور اس کے صدر دفاتر واقع ۹ کلائیو اسٹریٹ، کلکتے میں ۲ر ستمبر ۱۹۳۲ء میں پہلی بار کھولے گئے۔ کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے پہلے چیئرمین ARS بنائے گئے اور لندن کی کمپنی اٹلس سے ای این مینچی نک نام کے ایک افسر جنرل منیجر مقرر کیے گئے۔ نواب بھوپال اور آغا خان کی خاصی بڑی مالی معاونت کے باوجود کمپنی کے حصص کو عوام میں فروخت کرنا تھا جو ایک بہت مشکل کام تھا۔

جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر کے ہڈیوں کے سرجن پروفیسر قاضی نے بتایا کہ ''جب ہمارے چچا اور ان کے ساتھیوں نے ایسٹرن فیڈرل نام کی کمپنی قائم کی تو ہم لوگوں کو اس کے حصص فروخت کرنے پر مامور کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے اپنے اسکول کے پرنسپل پر حصص تھوپنے کی کوشش کی تھی جب کہ میری والدہ اپنے کلب میں حصص خواتین میں فروخت کرتی تھیں۔ میرے چچا نے ہم لوگوں کے لیے بھی شاید پانچ پانچ حصص خریدے تھے۔ کم عمری کی وجہ سے اس وقت مجھ میں اس کاروبار کو سمجھنے کی صلاحیت نہ تھی۔ مگر جب ہم بڑے ہوئے تو ہمیں پتہ چلا کہ ایسٹرن فیڈرل اور میرے چچا کا نام ایک دوسرے کے مترادف تھے اور ہم نے خود بمبئی شہر میں اس کی شاخ کو کھلتے دیکھا تھا۔''

وہ زمانہ دیوہیکل برطانوی کمپنیوں کا تھا جب وہ ہندوستان کی مارکٹ پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان میں کئی غیر مسلم ہندوستانی کمپنیاں بھی تھیں جن کے قبضے میں کاروبار کا معتد بہ حصہ تھا۔ ان کے مقابلے میں EFU کا اپنے کاروبار کو قائم کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں اور تقسیم ہند سے قبل ہی اس کو ایک معیاری کمپنی ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ کمپنی کی ساکھ کی بنیادی وجہ ان لوگوں کی وجہ سے تھی جو اس سے منسلک تھے جنھوں نے علی گڑھ تعلیم اور ترکی جانے والے طبی مشن اور لندن جانے والے وفد میں شرکت کی وجہ سے اعتبار پایا تھا۔ اور کچھ وہ تھے جنھوں نے ۱۹۲۰ء میں اس ادارے میں شرکت کی تھی جو درآمد اور برآمدی تجارت کی غرض سے دی یونائیٹڈ ڈیولپمنٹ کمپنی کے نام سے لکھنؤ میں قائم ہوئی تھی اور ۱۹۲۱ء میں کلکتے منتقل کر دی گئی تھی۔ اس میں پانچ حصے دار تھے: شعیب قریشی، چودھری خلیق الزماں، ترکی جانے والے مشہور طبی مشن کے سربراہ ڈاکٹر انصاری اور ان کے بھتیجے عزیز انصاری۔ کچھ دنوں بعد کے ایف حیدر نے ان سے مل کر لندن میں ایک ادارہ قائم کیا تھا۔

عزیز انصاری جو علی گڑھ میں تعلیم کے دوران سر سیّد ہال میں ان کے کالج کے اقامتی ساتھی تھے، یوپی کے شہر بارہ بنکی میں وکالت کرتے تھے۔ ان کو بعد میں نواب رام پور نے جج کے عہدے پر فائز کیا اور وہ وہیں بس رہے۔ مگر ۱۹۳۰ء میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کلکتے گئے جہاں ۱۹۳۲ء میں وہ ایسٹرن فیڈرل یونین کے ڈائریکٹر بنا دیے گئے۔ اس وقت کمپنی میں ARS کے سب سے معتمد ساتھی نو ہی تھے اور

اس کی ضرورت اس لیے تھی کہ ARS اپنی گوں ناگوں سیاسی اور کاروباری مصروفیات کی وجہ سے کلکتے سے باہر ہوتے۔ اور یہ غیر حاضریاں بڑھتی ہی گئیں۔ اس وقت تک ARS مسلم لیگ کے اندرونی حلقے کے ایک سینئر رُکن بن چکے تھے، اتنے کہ محمد علی جناح نے ان کو ۱۹۳۶ء میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کا رُکن نامزد کر دیا تھا۔ اس کے بائیس ارکان میں سے آٹھ بنگال سے تھے۔ ان میں نواب ڈھاکا، حسین شہید سہروردی، فضل الحق، ابوالحسن اصفہانی، اور ان کے بڑے بھائی مرزا احمد اور مجیب الرحمٰن شامل تھے۔ یو پی سے جناح نے سات افراد کو چُنا تھا ان میں لیاقت علی خان، راجا صاحب محمود آباد، مولانا شوکت علی اور خلیق الزمان شامل تھے۔ ہم اس جگمگ کرتے ہوئے ناموں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو وہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے مسلم حصے کے "Who's Who" معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر سربرآوردہ شخصیات ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کی ایگزیکٹیو کاونسل کی رُکن بھی بنائی گئیں۔ ARS ان میں سے ایک تھے اور اسی سال انھوں نے کلکتے سے انتخاب لڑا اور اس جیسے بڑے شہر کے لارڈ میئر منتخب ہوئے۔

گویا اتنا کچھ ایک آدمی کے لیے کافی نہ تھا، ARS نے ۱۹۴۰ء میں ''مارننگ نیوز'' کے نام سے اپنا اخبار جاری کیا۔ اس وجہ سے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے عزیز انصاری کو EFU کا ریزیڈنٹ ڈائریکٹر بنادیا تاکہ ARS کو کچھ سہولت مہیا ہو۔ عزیز انصاری اس عہدے پر رہے تاآنکہ ۱۹۴۶ء میں حکومتِ ہندوستان نے ان کو کنٹرولر آف انشورنس بنا دیا۔

اتنی ساری تہہ در تہہ ذمے داریوں اور مصروفیتوں کے باوجود ARS 'اپنی' EFU کے لیے کافی وقت نکالتے رہے۔ وہ ۱۹۵۰ء تک نہایت فعّال چیئرمین رہے۔ اس کے بعد انھوں نے یہ عہدہ اصفہانی گروپ کے سربراہ مرزا احمد اصفہانی کے لیے خالی کر دیا، جو اس وقت EFU کے سب سے بڑے حصص دار تھا۔

جب بھی وہ کلکتے میں ہوتے پورا دن اپنے دفتر میں گزارتے۔ محمد چودھری نے، جو پاکستان کے سب سے کامیاب بیمہ سربراہوں میں سے ایک ہیں اور اپنا بیمے کا پیشہ انھوں نے اسی کمپنی سے شروع کیا تھا، ARS کی بہت سی عادتوں اور خصوصیتوں کے بارے دل چسپ باتیں بتائیں۔ چودھری، جن کو میں اپنی ملازمت کے دنوں سے جانتا ہوں، یکم ستمبر ۱۹۴۷ء میں، پاکستان کی تخلیق سے چند دن قبل، ای ایف یو میں ملازم ہوئے تھے اور اس وقت تک اس میں رہے جب کمپنی کا دفتر کلکتے سے کراچی منتقل ہو رہا تھا۔ چودھری کہتے ہیں کہ ''عبد الرحمٰن صدیقی اس وقت چیئرمین تھے۔ وہ میرے دادا عبدالمتین چودھری کے قریبی دوست تھے جو اس وقت مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل اور مسٹر جناح کے قریبی ساتھی تھے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں صدیقی صاحب سے جا کر ملوں۔ مجھ جیسا کم عمر اور زیرِ تربیت ملازم عمومی طور پر چیئرمین سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ میرے لیے یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے دادا کے نام کے حوالے سے ان کے سیکریٹری سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ صدیقی صاحب نے دوسرے دن صبح کے وقت مجھے میکلوڈ اسٹریٹ کے دفتر میں، جو گوروں کے قبرستان کے ساتھ ہی تھا، مجھے طلب کیا جس پر میں بہت خوش تھا۔ یہ دفتر ایک تین منزلہ انگریزی طرز کا ٹاؤن ہاؤس تھا۔ اس میں ایک لفٹ موجود تھی جس کے ذریعے مجھے تیسری منزل پر جانے کے لیے کہا گیا تھا۔ میں وہاں گیا اور میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے صدیقی صاحب کو کمرے کے دروازے پر اپنا انتظار کرتے پایا، شاید دربان نے ٹیلی فون کے ذریعے ان کو میری متوقع آمد سے مطلع کر دیا تھا۔ انھوں نے مجھے اپنے دفتر کے دروازے ہی پر خوش آمدید کہا جو میرے لیے بے حد غیر متوقع بات تھی۔ بہر حال وہ مجھے ملاقات کے کمرے میں لے گئے جہاں ایک میز پر ناشتے کے تمام لوازم چُنے ہوئے تھے۔ میں نے ناشتا کیا اور اپنے دادا کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ انھوں نے میری ہمت افزائی کی اور کمپنی میں دیے جانے والے نئے فرائض پر نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ہماری ملاقات ختم ہوگئی۔

اس کے بعد بھی ان سے میری مڈبھیڑ ہوتی رہی اس لیے کہ وہ دفتر آنے کے معاملے میں بہت پابند تھے۔ وہ ٹھیک نو بجے دفتر پہنچ جاتے۔ دن کا بیشتر وقت دفتر میں گزارتے، غالبًا دوپہر کے کھانے کے وقت تک یا اکثر اس کے بعد تک۔ وہ لفٹ میں کم ہی نظر آتے تھے۔

زیادہ تر سیڑھیاں استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔ اپنے دفتر کے اہلکاروں کے لیے وہ ایک بڑا مسئلہ تھے۔ مثال کے طور پر دفتر کا دربان مشکل ہی سے ان کو پہلے سلام کر پاتا، اس لیے اس کے ہاتھ اُٹھانے سے قبل ہی چیئر مین اس کو سلام کر لیتے۔ یہ ان کی خصوصیت تھی۔

وہ بہت خوش وضع اور با سلیقہ شخصیت کے مالک تھے۔ ہمیشہ سپید شروانی زیبِ تن کرتے تھے اور ان کے سر پر ہمیشہ ترکی ٹوپی Fez ہوتی تھی۔ آنکھوں پر بہت موٹے فریم کا چشمہ پہنتے تھے۔ ایک اور بات جو ان کے منصب کے لحاظ سے بہت اہم تھی، جس کے بارے میں تمام کام کرنے والے بات کرتے تھے، کہ وہ ہمیشہ عام دفتر والوں کا غسل خانہ استعمال کرتے تھے، افسروں کے لیے مخصوص غسل خانہ انھوں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔''

جب محمد چودھری EFU میں ملازم ہوئے اس وقت کمپنی کے دفاتر کلائیو روڈ سے ڈلہوزی اسکوائر منتقل ہو گئے تھے۔ ایک نفیس اور اعلیٰ درجے کی عمارت میں جس کا نام اسٹینڈرڈ بلڈنگ تھا جو اسی نام کی ایک بڑی انشورنس کمپنی کی ملکیت تھی۔ اسی عمارت میں برطانیہ کی بڑی کمپنیوں میں سے ایک کمرشل یونین کے دفاتر بھی تھے جو کچھ برس بعد کراچی، پاکستان کے قمر ہاؤس میں (جو اب EFU House بن چکا ہے) ایک بار پھر پڑوسی بن گئے۔

یہ عمارت اب بھی موجود اور خاصی اچھی حالت میں ہے۔ آج کل اس میں ویسٹ بنگال واٹر اتھارٹیز کا دفتر ہے جو ایک حکومتی ادارہ ہے۔ اس کا اندرون کم و بیش ویسا ہی ہے۔ لفٹ کام نہیں کرتی، بڑے ہال کمروں میں پنکھے لگے ہوئے، پہلی منزل پر خوبصورت ماہوگنی لکڑی کے تختوں سے مزیّن دیواروں والا بڑا کمرہ جو اب منیجر کا کمرہ ہے، یقیناً ان دنوں چیئر مین کی حیثیت میں ARS کا دفتر رہا ہوگا وہاں بھی وہ، جیسا کہ ہم نے سنا ہے، ٹھیک نو بجے دفتر پہنچتے رہے ہوں گے۔ میں اور میری اہلیہ EFU کے شاندار ماضی کی کھوج میں ۱۹۹۸ء میں وہاں گئے تھے۔ اس میں بیٹھنے والے منیجر نے ہماری چائے سے تواضع کی اور جب اس کو بتایا گیا کہ اس کمرے میں، جو آج اس کا دفتر ہے، کس قسم کے لوگ بیٹھتے اور بات کرتے رہے ہوں گے تو وہ سن کر پھڑک اُٹھا تھا۔ اور جب ہم اس سے رخصت ہوئے تو اس کے چہرے پر سرور پھیلا ہوا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس دن اپنے آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ اہم سمجھتا رہا ہوگا۔

میں بھی جذباتی ہو رہا تھا۔ کھلے ہوئے وسیع و عریض دفتر سے گزرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھی محمد حنیف، جو EFU میں میری تقرری کے دوران مشرقی پاکستان کے شہر کھلنا میں برانچ منیجر تھے، بہت یاد آئے۔ انھوں نے ۱۹۸۲ء میں کمپنی کی گولڈن جوبلی کے موقعے پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

''رحمٰن صاحب EFU کے نچلے درجے کے ملازمین کے لیے بہت ہمدردی رکھتے تھے۔ وہ جب بھی ہال کمرے سے گزرتے تو کسی ٹائپسٹ یا کلرک کی میز کے قریب رُکتے، یا کسی چپراسی کی طرف بڑھ کر ان کے احوال دریافت کرتے۔ میں نے ان کو بذاتِ خود جھک کر فرش پر گری ہوئی pins اور gem clips اٹھا کر قریبی میز پر رکھتے دیکھا ہے۔ وہ حقیقتاً دفتر کے کارکنوں سے محبت کرتے تھے، خاص کر وہ جو نچلے درجے میں ہوتے تھے۔ میں ایک مسٹر اللہ رکھا کی مثال دینا چاہوں گا جو ہمارے دفتر میں چپراسی تھے۔ انھوں نے عبد الرحمٰن صدیقی صاحب کو مشرقی پاکستان کے گورنر کے عہدے پر فائز ہونے کے سلسلے میں مبارک باد کا خط لکھا تھا۔

خط ملنے پر خوشی سے وہ اتنے مغلوب ہوئے کہ انھوں نے اپنے ADC کو حکم دیا کہ وہ کلکتے میں ہوائی جہاز کے منیجر سے کہیں کہ اللہ رکھا کے لیے فوراً ڈھاکے سفر کرنے کے لیے ٹکٹ جاری کریں اور مہمان کی حیثیت سے ان کے ڈھاکا آنے کے لیے انتظامات کیے جائیں۔ جس دن اللہ رکھا آنے والے تھے صدیقی صاحب بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس کی راہداری میں تیز تیز قدموں چلتے ہوئے اللہ رکھا کا انتظار کر رہے تھے اور جوں ہی اللہ رکھا آئے ان کی طرف تیزی سے بڑھے اور بڑی گرم جوشی سے ان کو گلے سے لگا لیا۔

ڈھاکے میں گورنری کے دوران وہ EFU کے دفتر سے رابطے میں رہتے اور ہمارے برانچ منیجر مسٹر شمس الحق کو برابر فون کرتے

رہتے، کبھی کبھی تو دن میں کئی بار۔ کبھی کبھی وہ دفتر بھی تشریف لاتے تھے۔"

اگر چہ وہ بہت درشت اور صاف گو انسان تھے، دل کے بہت اچھے رہے ہوں گے۔ ان کے بھانجے پروفیسر قاضی کہتے ہیں کہ ماموں جان، جس نام سے وہ خاندان میں پکارے جاتے تھے، اپنی دو بہنوں پر غضب ناک رہتے۔ سب سے چھوٹے ہونے کے باوجود وہ سب پر حاوی رہتے تھے۔ کم سنی کے زمانے میں ہم بھانجوں کے لیے وہ دہشت ہوتے تھے۔ اس کے بعد وہ ایسے دوست بن گئے ہم جس کی عزت کرتے تھے۔ ماموں جان نے تعلیم کے دوران بھی اور بعد میں ملازمت کے سلسلے میں ہم لوگوں کی اکثر مدد کی۔ خاص طور پر میں ان سے بہت فیضیاب ہوا تھا۔ میں جب انگلستان میں تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھا تو وہ میرے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ جب میں واپس آرہا تھا تو انھوں نے آلاتِ جراحی خریدنے میں بھی میری مالی معاونت کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ "اپنے اوزار کے بغیر حجام کسی کام کا نہیں ہوتا۔" میری شادی کے سلسلے میں ان کی پوری رضامندی شامل تھی اس لیے کہ ان کے قریب ترین ساتھی مرحوم شعیب قریشی کی لڑکی سے ہورہی تھی۔ شعیب تو تقریباً ان کے ہمزاد جیسے تھے۔ جب میں نے کمانا شروع کیا تو میں نے ماموں جان سے کہا کہ میں وہ روپے واپس کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے انگلستان میں میرے تعلیم پر خرچ کیے تھے۔ وہ بولے، "ضرور دو میرے بیٹے مگر اسی طرح جیسے میں نے اپنے قرض چکائے ہیں۔ میرے ماموں نے مجھے پڑھایا، میں نے تم کو پڑھایا۔ لہٰذا اب تم دوسروں کو تعلیم دلواؤ۔"

پہلے جن دو لڑکوں کی تعلیم کے لیے انھوں نے سفارش کی وہ ہمارے کلب میں ٹینس کورٹ میں گیندیں اُٹھانے پر مامور تھے۔ چوں کہ وہ اسکول نہیں جاسکتے تھے، ان کو گھر پر تعلیم دلوائی گئی۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ کلکتے کی کچی آبادیوں سے لڑکے ڈھونڈ کر لاتے اور ان کی تعلیم کا بندوبست کرتے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے ایک نے ایم ایس سی کرلیا تھا اور ڈاکٹریٹ کرنے کی تیاری میں تھا۔ وہ ایک چوکی دار کا بیٹا تھا۔ دو اور لڑکے، انھوں نے جن کی مدد کی تھی، اب آنکھوں کے سرجن بن چکے ہیں۔ وہ طبّی پیشے کے لیے بہت ہم دردی کے جذبات رکھتے تھے۔ شاید طبّی پیشے کی طرف ان کا جھکاؤ ڈاکٹر انصاری سے ان کے پرانے روابط اور ترکی جانے والے طبّی مشن کے سلسلے میں ان کے تجربات کی بنا پر تھا۔ اتنی ساری انسانی خصوصیات کے باوجود وہ بہت سخت آدمی تھے۔"

وہ بہت صاف گو اور بے حد راست باز انسان تھے۔ ان کے بھانجے کے مطابق، "وہ سفارت کار کبھی نہیں بن سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر غیر موقع شناس کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بار مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں سفارتی فرائض کے لیے ان کے بارے میں غور بھی کیا جارہا تھا۔ مسلم دنیا کے بیشتر اہم رہنماؤں سے بہت قریبی اور ذاتی تعلقات اور ترکی و فلسطین میں ان کی خدمات کے پیشِ نظر بلاشبہ وہ ایک اچھے سفیر ثابت ہوتے۔ مگر خطرہ اس بات کا رہتا تھا کہ اگر ان کو سفیر بنادیا گیا تو وہ مشرقِ وسطیٰ جنگ کی ابتدا کرادیں گے۔"

مجھے خبر نہیں کہ یہ بات کہاں تک درست ہے مگر جس انداز میں وہ گفتگو کرتے، اور لکھتے تھے، یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت تیز و تند زبان استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔ بیگم قاضی نے ایک دل چسپ اور مزے دار قصہ سنایا جو قارئین کو ضرور پسند آئے گا۔

آپ کو معلوم ہے کی ہمارے ماموں جان کلکتے کے میئر بنے اور کافی دنوں تک اس عہدے پر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا یہ عیدِ میلادالنبی کے سلسلے میں ہورہا تھا۔ اور مولانا جوٹا نے اس موقعے پر بڑی دھواں دار تقریر کی۔ انھوں نے امہات المومنین کے حمل کے بارے میں بیان کرنا شروع کیا کہ نو ماہ تک بچہ رحمِ مادر میں رہا وغیرہ وغیرہ۔ جب وہ اپنی تقریر ختم کرچکے تو ہمارے ماموں نے جو اس وقت میئر تھے، ان کی طرف پلٹے اور پوچھا کہ مولانا کیا آپ کے لڑکیاں بھی ہیں۔ مولانا نے فرمایا جی ہاں خدا کے فضل سے۔ ماموں نے کہا "اچھا تو پھر جب ان میں سے کوئی بچہ جنم دینے کے قریب ہو تو مجھ کو بلا لیجیے گا۔ مولانا بہت جز بز ہوئے اور انھوں نے عبدالرحمٰن صدیقی کی بدتہذیبی کی سختی سے شکایت کی۔ انھوں نے مولانا کی سرزنش کرتے ہوئے کہ اس سے بڑی تو مولانا کی بدتہذیبی تھی کہ وہ ہمارے نبی کے خانگی معاملات کے بارے میں ہزاروں افراد کے سامنے باتیں کررہے تھے حالاں کہ ان کو کچھ اور موضوعات پر تقریر کرنی

چاہیے تھی۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ مولانا صاحب حق بجانب ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ماموں بہت زیادہ صاف گو تھے بلکہ کبھی کبھی بدتہذیب بھی ہو جاتے تھے، اس لیے بہت سے لوگ ان کے درشت لہجے کی وجہ سے انھیں پسند نہیں کرتے تھے حالاں کہ بیشتر لوگ، حتیٰ کہ ان کے ناقد بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ اس واقعے پر، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے شاید وہ صحیح تھے۔ مگر سیاسی اعتبار سے اتنے لوگوں کی موجودگی میں انہیں علی الاعلان اس طرح مولانا کی خبر نہیں لینی چاہیے تھے۔ جی ہاں ماموں بہت سے اعزازات ملنے کے باعث کچھ بد دماغ ہو گئے تھے۔ مگر وہ ایسے انسان تھے جو کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔

وہ بہت تنہا انسان تھے۔ اور حالاں کہ وہ لوگوں سے ملتے جلتے تھے، محفلوں میں جاتے اور خود بھی محفلیں سجاتے تھے مگر کبھی کبھی اور اچانک وہ جارحانہ انداز میں سنگ دل ہو جاتے اور لوگوں کی خبر لینے لگتے، بلا وجہ۔ مختلف لوگوں سے ARS کے بارے میں قصے سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ افسردہ اور غم زدہ ہو جاتے ہوں گے۔ میرے خیال میں اس انسان نے اپنے اوپر اتنے فرائض لاد لیے تھے اور ان سب کی ادائیگی ان کے بس سے باہر ہو جاتی رہی ہوگی جو شاید اُن جیسے 'سوپر ہیومن' کے لیے بھی مشکل تھی۔

بیگم قاضی کہتی ہیں کہ ''اکثر ہمارے ماموں جان لوگوں سے پریشان ہو جاتے تھے۔ اور ہم کبھی کبھی سوچتے کہ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مگر ہمیں اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ ایک رات ان کے ایک بہت عزیز دوست نے ان کو کھانے کی دعوت دی تھی۔ اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے، ایسا وہ اس وقت کیا کرتے تھے جب مدعوئین کی بیویاں بھی مدعو ہوتی تھیں۔ اور اچانک ان کی نظر ایک شخص پر پڑی، میں جن کا نام اب بھول چکی ہوں، اور ذرا اونچی آواز میں انھوں نے اپنے میزبان سے کہا، 'تم نے اس احمق کو کیوں بلایا ہے۔ یہاں یہ رہے گا یا میں۔ تمہیں اس جیسے لوگوں کو نہیں بلانا چاہیے۔ اور اس کے بعد وہ دعوت چھوڑ کر چلے گئے۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں رُکنا چاہتی ہوں یا نہیں شاید اس لیے کہ اس شخص سے میرا کوئی سروکار نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں، میں بھلا کیسے رُک سکتی تھی۔ میں بھی ان کے ساتھ واپس ہو گئی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہر شخص ایسی باتوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔''

مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ بالکل مختلف آدمی بھی ہو جاتے تھے۔ دوست دار، خوش، پُرکشش اور ہمہ وقت حاضر۔ کبھی وہ بہت ملنسار اور دوستوں عزیزوں سے رابطہ رکھنے والے بھی نظر آتے تھے۔ اور وہ جب اچھے موڈ میں ہوتے تو گنگناتے اور گاتے ہوئے بھی سنے جاتے تھے۔ امریکہ اور یورپ کی پرانی فلموں کے عوام میں مقبول گانے، لوک دھنیں وغیرہ۔ میرا خیال ہے کہ وہ منقسم شخصیت رکھتے تھے مگر اپنے فرائض سے انھوں نے کبھی پہلو تہی نہیں کی۔ مسلمانوں سے متعلق سیاسی مسائل سے ان کی دل بستگی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ غیر مسلم بھی ان کی ایمان داری اور ان کے ذاتی کردار کے حوالے سے ان کی عزت کرتے تھے۔ جن سے انہیں اختلاف ہوتا ان سے بھی بہت صفائی اور حقیقت مندانہ انداز میں پیش آتے۔ انھوں نے کبھی اپنے مخالفین پر بھی اوچھے وار نہیں کیے۔ پروفیسر قاضی نے مجھے بتایا کہ ایک بار، جب وہ فلسطین کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے، ان کے اخبار مارننگ نیوز میں مہاتما گاندھی کے بارے کچھ رکیک الفاظ شائع کر دیے گئے تھے۔ انھوں نے ایڈیٹر کی اچھی طرح خبر لی اس لیے کہ وہ اپنے اخبار کو ذاتیات سے آزاد رکھنا چاہتے تھے اور انھوں نے کبھی اس قسم کے الفاظ کسی کے لیے استعمال نہیں کیے تھے۔ بیگم قاضی کہتی ہیں کہ ''صحافتی معاملات میں بھی وہ اپنے متعین کردہ اصولوں پر سختی سے کار بند رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ سچ بولنے اور سچ لکھنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کی صحافی کو ہمیشہ سچ بولنا چاہیے۔ آپ خبر لکھ رہے ہیں تو وہ خبر ہی ہونی چاہیے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہونے چاہیے۔ ایک صحافی کو ہر موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کو کبھی کبھی ایک خاموش مبصر کا کردار بھی ادا کرنا چاہیے۔ وہ ایسی باتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔''

میرے خیال میں ہندوستان کی آزادی کے تاریخ نویسوں نے ARS کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ صرف ہما شما ہی نہیں تھے جن کے بارے جو جی چاہے لکھ دیا جاتا۔ وہ ایک اہم شخصیت تھے اور اپنی، اچھی یا بُری، کارگزاریوں کی بنا پر صرف پسند ہی نہیں کیے جاتے تھے،

لوگ ان سے انسیت بھی رکھتے تھے۔ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ مسلم تحریک اور مسلمانوں کی معاشی نشاۃِ الثانیہ کے معاملے میں وہ ندرتِ خیال سے کام لیتے تھے۔ قائدِاعظم کے قریبی رفیقِ کار جناب ابوالحسن اصفہانی نے، مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں خود جن کی کوششوں کو خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی ہے، اپنی کتاب میں جس کا عنوان تھا ''قائدِاعظم جناح جیسا میں نے انھیں دیکھا'' میں ARS کو ان کی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آزادی سے قبل کے بنگال میں مسلمانوں کی آبادی سواتین کروڑ کے لگ بھگ تھی جو ہندوستان کی سیاست میں خاصی اہمیت کی حامل تھی۔ پاکستان کی تخلیق میں کامیابی پر بنگال کے مسلمانوں اور مسلم لیگ کی کامیابی بہت اہم تھی۔ بنگال کے بارے میں بات کرتے ہوئے میرے نزدیک یہ بڑی ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے قریبی ساتھیوں عبدالرحمٰن صدیقی اور خواجہ ناظم الدین کا تذکرہ نہ کروں جنھوں نے بنگال میں مسلم لیگ کو خود پسند اور موقع پرست نام نہاد لیڈروں سے نجات دلائی اور اس کو ایک اہم ادارے میں تبدیل کردیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ۱۹۳۲ء سے قبل، جب تک میں محمد علی جناح کا معتقد نہیں بنا تھا، عبدالرحمٰن میرے سیاسی گرو تھے۔ اس زمانے میں نورالدین، عبدالرحمٰن اور میں 'The Three Tailors of Tooley Street' کے نام سے جانے جاتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو ہم کو 'The Three Musketeers' کہا جاتا تھا۔ ہم اپنے مخالفین کے لیے انگریزی محاورے کے مطابق ان کے ''پہلو میں کانٹے'' کے مصداق تھے اور ہم نے ہمیشہ اپنے فرائض بغیر کسی خوف کے انجام دیتے تھے۔''

اور وہ واقعی نڈر تھے، اپنی تقریروں میں بھی۔ انھوں نے اپنی سیاسی اور کاروباری زندگی کے دوران بےشمار تقریریں کی تھیں مگر ان میں سے بہت کم ہی محفوظ رہ سکیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ان کی کئی تقریریں مل گئی جو ان کے بھانجے اور بھانجی کے پاس محفوظ تھیں۔ ان میں سے ایک تقریر تو وہ تھی جو دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر انھوں نے آل انڈیا انڈونیشیا کانفرنس، منعقدہ لاہور ۱۹ رجنوری ۱۹۴۵ء میں صدر کی حیثیت سے کی تھی۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا ہے انھوں نے اپنی تقریر میں بہت سخت زبان استعمال کی تھی۔ اس تقریر کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ان کی شعلہ بیانی خود ظاہر ہو جائے گی:

''ہمیں بتایا گیا تھا کہ جنگ آزادی اور جمہوریت کے لیے لڑی گئی ہے۔ اب ہم عالمی تناظر میں خود اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آیا جن اعلیٰ مقاصد کے لیے یہ جنگ لڑی گئی تھی وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں بھی یا نہیں جو انسانیت کی تقدیر کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں۔ میرے خیال میں آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ فاتحین نے دنیا کو اتنا ہی مخدوش بنادیا ہے جتنا کہ ان کے متکبر اور فساد انگیز اذہان بنا سکتے تھے۔ انسانیت کی قابلِ تحسین اور اعلیٰ اقدار کو سیاسی ریشہ دوانیوں، تجارتی رقابتوں، حسد، بےاعتباری ایک دوسرے کے درمیان یقین کے فقدان، وسیع وعریض دنیا میں بسنے والے عوام الناس پر حکم چلانے، کمزور اور خوف زدہ کو دھکانے سے بدل دیا گیا ہے، ان لوگوں کے طفیل جو ایک قیامتِ صغریٰ کے کھنڈرات سے اور بھی طاقتور ہوکر ابھرے ہیں۔ ایک بھوکی اور تباہ حال دنیا پر خودغرضی اور بےشرمی کا، راج پھر سے نافذ ہوگیا ہے۔ کمزور اور مفلس کو اب اپنے ہاتھوں میں کاسۂ گدائی لے کر قطار میں ان کے دروازے پر کھڑے ہو کے بھیک اور چھوٹی چھوٹی مہربانیوں کا منتظر ہونا پڑ رہا ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ ایک قسم کے آمروں کی جگہ اب دوسری قسم کے آمروں نے لے لی ہے۔

جنگیں آتی جاتی رہتی ہیں مگر جب ایک جنگ ختم ہوتی ہے تو اپنے عقب میں تباہیوں اور تلخیوں کا ایک بُونبالہٴ گرد چھوڑ جاتی ہے جو اس وقت تک چھایا رہتا ہے جب تک کہ دوسری جنگ چھڑ نہیں جاتی۔ ابھی ہم ۱۹۱۴ء کی تباہ کاریوں سے بہ مشکل نکل پائے تھے کہ ۱۹۳۹ کے ایسے شعلوں میں جھونک دیے گئے ہیں جو غیر مشروط ہتھیار ڈالنے کے ناٹک کے باوجود اب بھی بھڑک رہے ہیں۔ تلوار ابھی بل نہیں بنی ہے، امن ابھی نہیں ہوا ہے۔''

پنانگ (Penang) میں ہندوستان اور ملایا کے مسلمانوں کی کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں کی گئی صدارتی تقریر میں فلسطین

کے موضوع پر ان کے سیاسی عقائد کی ایک اور روشن مثال ملتی ہے:

''اسرائیل کی سلطنتِ موعودہ، کوئی آزاد مملکت نہیں، زیادہ سے زیادہ ایک تحفظ شدہ طفیلی ریاست ہوگی۔ اس کو ایک عیسائی اتالیق کی ضرورت ہوگی۔ یہودیوں کے لیے بہتر یہی ہوگا کہ وہ اپنے ہم نسل عرب برادران سے بنا کر رکھیں جن کو اگر ٹھنڈا اور پُرسکون نہیں کیا گیا تو وہ اپنی جان کی بازی لگا کر بھی اپنے وطن کے ٹکڑے ہونے اور اپنی زمین کو قبضے میں جانے سے بچانے پر تُل جائیں گے۔

ہم (مسلمان) نفیس ترین اور حقیقی معنوں میں بین الاقومیت کے پیروکار ہیں اور چودہ سو برس پہلے آنے والے اپنے عظیم رہبر کی تعلیمات کی روشنی میں، یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، نسل، رنگ اور ملک ہمارے اندازِ زندگی پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ روگردان ہوئے ہوں اور راہِ راست سے بھٹک گئے ہوں مگر اس کا پیغام، شفاف بلور کی مانند آج بھی اُسی طرح دمک رہا ہے جیسا کہ اس دن تھا جب یہ پہلی بار ہم تک پہنچایا گیا تھا۔

مغرب کی پیدا کردہ قومیت انسانیت کے لیے ایک بددعا ہے۔ کیا ہمیں اس کی تاراجی کی مثالیں دیکھنے کے لیے بہت دور تک جانا پڑے گا؟ دونوں جنگیں اور سامراجیت کی پوری تاریخ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں جس نے انسانیت کو 'میری قوم، اچھی ہو یا بُری' کی لعنت کے ذریعے اس قعرِ مذلّت تک پہنچایا ہے۔ اس نے انسان کی برادری کے تصور ہی کو پارہ پارہ کردیا ہے۔ اس نے ہم میں حسد اور رقابتوں کو جنم دیا ہے جو اب بھی ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ ہمارے کے لیے فساد اور تباہی کا باعث ہوں گے۔''

عبدالرحمٰن ایک نڈر انسان تھا۔ وہ اپنے معیار اور اپنے تصورات کے لیے لڑتا رہا۔ اور یہ کچھ اس نے اپنی آنکھیں کُھلی رکھتے ہوئے کیا۔ ضرورت کے وقت وہ شدید وار سے نہیں چوکتا تھا مگر اس نے کبھی اوچھا وار نہیں کیا۔ جب اس پوچھا گیا کہ اس نے اپنی پچاس برس کی ہنگامہ خیز زندگی کے باوجود اپنی سوانح حیات کیوں نہیں لکھی تو اس نے جواب دیا، ''میں حقیقتوں کو چٹ پٹی زبان میں چھپا کر بیان نہیں کرسکتا۔ اور اگر میں نے کبھی وہ کچھ لکھ دیا جو میں لکھنا چاہتا ہوں تو ایمپریس مارکیٹ (کے مذبح) میں میرے ٹکڑے ٹکڑے کردیے جائیں گے''

دوسروں کے مقابلے میں، جن میں ان کے قریبی دوست بھی شامل ہیں، انھوں نے اپنے لیے کچھ نہیں چاہا۔ اور جب عملی طور پر انھوں نے ایسٹرن فیڈرل کی بنیاد رکھی تو اس لیے نہیں کہ اپنی انا کو آسودہ کرنا یا ایک بڑے مالیاتی ادارے کے چیئرمین بننا چاہتے تھے۔ اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ مل کر انھوں نے اس ادارے کی بنیاد اس لیے ڈالی کہ ان کو یقین تھا کہ اس کے ذریعے مسلمانوں کی خدمت ہوگی اور ان کی مالیاتی نشاۃِ الثانیہ کے سلسلے میں یہ عمل ان کی ذاتی امداد کے مماثل ہوگا۔ اپنے اخبار 'مارننگ نیوز' میں ایک بار انھوں نے لکھا تھا، ''پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے اس کی زراعت کو، صنعتوں کو، تجارت اور عام مالیاتی اداروں کو مستحکم کرنا ہوگا۔ ہم میں سے جو لوگ اس تعمیر کے عمل میں ہاتھ بٹائیں گے وہ اپنا فرض ادا کر رہے ہوں گے۔''

اپنا فرض ادا کرنا ان کا ایمان تھا۔ ان کے بھتیجے پروفیسر قاضی کہتے ہیں کہ ''ان کے اُصول ان کے اپنے بنائے ہوئے تھے، اگرچہ ان میں سے بیشتر اخلاقیات کے اعتبار سے صحیح ہوتے تھے۔ خراب انگریزی ان کو کبھی برداشت نہیں ہوتی تھی خواہ تحریری ہو یا تقریری۔ کم از کم میرے خیال میں وہ ایک گرج دار مقرر تھے اور ان کے لکھے ہوئے بیشتر خطوط بڑی روانی تحریر کے مظہر تھے، ہمیشہ صاف ستھرے اور بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے۔ ڈھاکا میں اپنی گورنری کے دوران جب وہ علیل ہوگئے تو ان کے لکھے ہوئے خطوط میں ہجے اور قواعد کی غلطیاں ہوتی تھیں۔ ہمیں فوراً احساس ہوگیا کہ ان کا دماغ اب ان کے قابو میں نہیں۔ شعیب قریشی (پروفیسر قاضی کے خسر جو اس وقت ہندوستان میں ہائی کمشنر کے رُتبے پر فائز تھے) پریشان ہوگئے تھے، انھوں نے کہا کہ رحمٰن غلطی نہیں کرتا، یقیناً وہ ضرور بیمار ہے۔

میرے چچا چالیس برس کی عمر سے ذیابیطس کے مریض تھے۔ ان دنوں اس مرض کا صرف یہی علاج تھا کہ انسولین کے انجکشن لیے جائیں اور غذا پر سخت پابندیاں ہوں۔ وہ انجکشن تو لیتے تھے مگر پرہیز کے معاملے میں وہ کسی کی نہیں سنتے تھے۔ ہر نقصان دہ شے ان کو دل سے

مرغوب تھی۔ آم کے موسم میں کھانے کے وقت ایک درجن آم کھانا ان کا معمول تھا۔ بالآخران کو اپنی بد پرہیزیوں کا قرض چکانا پڑا۔ ان کے خون میں ہمیشہ شکر کی بہتات رہتی مگر اس کے باوجود جب ۱۹۵۲ء میں وہ مشرقی پاکستان کے گورنر بنے تو ٹھیک ٹھاک تھے۔ مگر چھ ماہ بعد وہ ہمارے فلیٹ پر نیم فالج زدہ اور ذہنی طور پر ابتر کیفیت میں پہنچائے گئے۔''

پروفیسر قاضی نے ان کو جناح ہسپتال کے خاص الخاص وارڈ میں داخل کرادیا تھا۔ اور ان کے قریبی دوست غلام محمد، جو اس وقت پاکستان کے گورنر جنرل تھے اور کے ایف حیدر برابر ان کی مزاج پرسی کے لیے آتے رہتے تھے۔ بیگم قاضی نے بتایا کہ ''انھوں نے کافی امداد کی۔ وہ جب آتے تو سہارا دے کر ان کو بستر سے اُٹھاتے اور چلاتے اس لیے کہ ان کی ٹانگیں پوری طرح کام نہیں کر رہی تھیں۔ یہ بہت درد انگیز منظر تھا۔ میرے خیال میں وہ ذہنی طور پر بہت مضطرب اور پراگندہ تھے۔ پراگندہ اس لیے کہ تقسیم ہند کے بعد لوگ ویسے نہیں رہ گئے تھے جیسے کہ تحریکِ آزادی کے دوران تھے۔ لوگوں کے دل و دماغ میں تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اکثر وہ اس بات کا شکوہ کرتے اور رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ اقدار تبدیل ہوگئی تھیں۔ دولت سب سے اہم شے ہوگئی تھی۔ جب بھی وہ اخبار پڑھتے تو جو کچھ لکھا ہوتا اس پر کبیدہ خاطر ہو جاتے۔''

اپنے قریب ترین دوست شعیب قریشی سے جن کو وہ اپنا بھائی سمجھتے تھے اور جو دلّی سے ان کی عیادت کو آئے تھے، ان کو کہتے سنا گیا تھا کہ ''ہمارے اطراف جھوٹ اور جھوٹوں کی بہتات ہوگئی ہے۔''

بالآخر ایک طویل علالت کے بعد انھوں نے ۲۶رمئی ۱۹۵۳ء کو انتقال کیا اور پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

۱۹۶۰ء کراچی بوٹ کلب میں کے ایف حیدر کو دی گئی الوداعی تقریب میں ایس ایم معین الدین گفتگو کرتے ہوئے، تصویر میں امین خراسانی، ڈبلیو ڈبلیو کرنوسکی، خدا بخش، ایم وصال الدین اور ایس سی سجالی بھی نمایاں ہیں

کے ایف حیدر گورنر جنرل غلام محمد کے ساتھ سعودی عرب کے دورے پر

کے ایف حیدر احباب کے ساتھ کھانے کی میز پر

کے ایف حیدر صنعت کاروں اور کاروباری شخصیات کے ساتھ ملاقات کے موقع پر
ان کے بائیں طرف احمد داؤد ہیں

خوند کر فضلِ حیدر

بھوپال سے ہمارے ساتھی

یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس وقت نوجوان تھا، ابھی میری عمر تیس برس بھی نہیں تھی۔ جب میں نے ایک غیر ملک میں نئی ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے اپنا ملک چھوڑا تو ہر نوجوان کی طرح میں متردّد بھی تھا اور متجسس بھی۔ ایک بالکل ہی نئی دنیا مجھے للکار رہی تھی۔ کئی برسوں سے جنگ کے بعد کے جرمنی کو چھوڑنا چاہ رہا تھا، اگر چہ وہاں کے حالات ٹھیک ہو چکے تھے۔ میں ان پرانے چاولوں میں سے تھا جن کو جنگ کے اختتام اور اس کی تباہ کاریوں کے بعد نئی پیشہ ورانہ ذمے داریاں اور ترقی کے نئے مواقع مل رہے تھے، اگر چہ عمر اور تجربے کے اعتبار سے یہ کچھ جلد ہی ہو رہا تھا۔ میں بھی فائدہ حاصل کرنے والوں میں سے تھا، ہمبرگ کی کاروباری اور پیشہ ورانہ روایات کے مطابق جس کے خون میں شامل تھا کہ 'دنیا دیکھو پھر کچھ کرو'، میں ہمیشہ سے نئی تہذیب اور نئے لوگوں کے تجربے کا خواہش مند تھا۔ صرف دیکھنے کی حد تک نہیں بلکہ ان کے ملک اور ماحول میں رہ کر تجربے کی خواہش رکھتا تھا۔ جس زمانے میں یورپ میں ہر شخص نئے سرے سے اپنی حیثیت کی شناخت بنانے اور کوئی مقام حاصل کرنے میں کوشاں تھا، ایک نوجوان جرمن کے لیے یہ بہت مشکل کام تھا۔

میرے دوستوں کو میری خواہشات کا علم تھا اور میری قسمت یا میرے مقسوم میں یہی لکھا تھا کہ بہت دور کہیں، کوئی مجھ جیسے ایک جرمن انسان کی تلاش میں ہے جس کو ایک ایسے جرمن کی جگہ لینی ہوگی جو اپنی ملازمت کی مدّت پوری کر لینے کے بعد اپنے وطن واپسی کا خواہاں تھا۔ میرے دوستوں کے ذریعے میرا انتخاب کر لیا گیا تھا۔ اب میں اپنے میونخ ری کے ساتھیوں ہائنز ڈبلیو شوارز اور ولف گانگ برن ہارڈ کے ہمراہ کراچی کے میٹروپول ہوٹل سے، جس میں پاکستان آنے کے بعد میں ایک رات قیام کر چکا تھا، ایک پُرانی Vauxhall موٹر کار میں سوار ہو کر قمر ہاؤس کی طرف رواں تھا جہاں میری ملاقات ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے جنرل منیجر سے ہونے والی تھی۔

ان کا نام کے ایف حیدر (خوند کر فضلِ حیدر) تھا۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ وہ ساٹھ کے پیٹے میں ہیں اور یہ بھی کہ غیر منقسم ہند، اور پاکستان کے قیام سے قبل ہی سے بڑے آدمی تھے، ریاست بھوپال کے وزیرِ خزانہ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے اس سے پہلے خبر ہی نہیں تھی کہ ایسی کوئی ریاست تھی بھی، اس لیے کہ میں اس خطے کے جغرافیہ اور اس ریاست کے حدودِ اربعہ سے بالکل نابلد تھا۔ بس مجھے اتنا معلوم تھا کہ میں پاکستان کی سب سے بڑی اور سب سے پُرانی بیمہ کمپنی میں شامل ہونے جا رہا تھا، مسٹر شوارز کی جگہ جو ایسٹرن فیڈرل یونین کے صدر دفتر میں جنرل انشورنس ڈویژن کے تکنیکی معاملات کے سربراہ تھے۔ اس وقت میں دنیا کی سب سے بڑی 'ری انشورنس' کمپنی 'میونخ ری' کا ایک افسر تھا اور مسٹر شوارز اس شرط پر 'میونخ ری' واپس جاتے کہ میں خود کو ان کی جگہ لینے کا اہل ثابت ہوتا۔ عمر کے اعتبار سے تقریباً ہر ایک یہ سمجھ رہا

تھا (کم از کم آج میرا خیال یہی ہے) کہ شاید میرے تبادلے میں خطرات ہوں گے۔ جنوری ۱۹۶۰ء کی اس سنہری صبح مجھے کچھ خبر نہیں تھی اور میں بڑے اعتماد کے ساتھ اس انسان سے ملنے جا رہا تھا جس کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا، کچھ کتابیں بھی پڑھ رکھی تھیں۔ اگر چہ میں ان سے کچھ زیادہ اخذ نہیں کر سکا تھا۔ میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی، نہرو اور گاندھی کے بارے میں سُن چکا تھا، اور کچھ کتابیں پڑھنے کے بعد اب میں جناح سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اب پاکستان پر ایک فوجی صدر، فیلڈ مارشل ایوب خان حکمرانی کر رہا تھا، جرمنی سے میری روانگی سے قبل جس کی ایک نہایت مرعوب کُن تصویر جرمنی کے اخبارات میں شائع ہو چکی تھی، اس لیے کہ وہ جلد ہی مغربی جرمنی کے دارالحکومت بون (Bonn) کا دورہ کرنے والا تھا۔

مجھے یہ بھی بتایا جا چکا تھا کہ مسٹر حیدر نہ صرف یہ کہ اس پاکستانی کمپنی کے سربراہ تھے، وہ سیاسی اعتبار سے بہت اہم اور رسوخ والے انسان تھے، کہ وہ پاکستان کے ایک سابق گورنر جنرل غلام محمد مرحوم، کے بہت قریبی دوستوں میں سے تھے۔ آج چالیس برس بعد بھی مجھے یاد ہے کہ اس ملاقات سے قبل میں کتنا جذباتی ہو رہا تھا۔ دفتر کی جانب سفر کے دوران میں نے اطراف پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا، اگر چہ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے بائیں جانب کراچی کی بڑی مصروف بندرگاہ تھی اور یہ کہ سامنے نظر آنے والی بڑی سے عمارت قمر ہاؤس تھی جس کے اطراف، کراچی پورٹ ٹرسٹ کی عمارت کے ساتھ ہی، درجنوں اونٹ گاڑیاں اور ہزاروں گدھے بار برداری کے لیے منتظر تھے۔ اپنی زندگی میں اس سے قبل میں نے ایسا دل چسپ منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر یہ وقت مشرق سے میری ملاقات کا نہیں تھا۔ پاکستان کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی کے جنرل منیجر، جس کو بیمے کی صنعت کا گہوارہ کہا جاتا ہے، جناب کے ایف حیدر میرے منتظر تھے۔

ان کا دفتر پہلی منزل پر تھا۔ اس وقت میں واقعی بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے ان گُلدانوں پر نظر نہیں کی تھی جو سیڑھیوں کے کونوں میں رکھے ہوئے تھے اور پان کی اُگال سے سُرخ ہو رہے تھے۔ میں نہ اس منظر سے کبھی آشنا تھا نہ میں نے اپنے ساڑھے چھ برس کے قیام میں کبھی پسند کیا تھا۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ حیدر صاحب کے سکریٹری، ایک خوب صورت ریش والے اور عمر رسیدہ شخص نے ہاتھ ہلا کر ہمیں متوجہ کیا اور کہا، ''حیدر صاحب آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔'' انھوں نے دروازہ کھولا اور سب سے پہلے جو میں نے سنا وہ ایک گمبھیر اور دوستانہ آواز تھی، ''خوش آمدید حضرات، تشریف لائیے۔'' وہ ایک بڑی سے میز کی دوسری جانب تشریف فرما تھے۔ سب سے پہلے جو چیز میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ ان کی میز پر مشکل سے دو چار ہی کاغذ رہے ہوں گے۔ اور ایک چمک دار دھات کی بنی ہوئی گھنٹی، چائے سے بھری ہوئی ایک پیالی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور آہستہ سے آگے بڑھ کر انھوں نے مسٹر برنہارڈ کو، جو تبادلے پر سنگاپور جانے والے تھے، گلے سے لگایا۔ برنہارڈ صاحب سنگاپور جاتے ہوئے مجھے میونخ ری کے دوستوں سے متعارف کرنے کی غرض سے ایک مختصر عرصے کے لیے، جو تقریباً تین دن کے لگ بھگ تھا، کراچی ٹھہرے تھے۔ برنارڈ کے یہاں کے دوروں اور حیدر صاحب کے میونخ کے دوروں کے باعث ان سے سب لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے ہائنز شوارز سے مصافحہ کیا اور پھر آہستگی سے میری جانب متوجہ ہوئے اور بولے، ''تو میونخ سے آنے والے یہی ہمارے نوجوان دوست ہیں۔ ایسٹرن فیڈرل میں ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں، اس ادارے کو اپنا ہی سمجھیے۔'' اور یہ کچھ انھوں نے ایسے دوستانہ اور دل کو گرما دینے والے لہجے میں کہا کہ میں ایک ہی لمحے میں پُرسکون ہو گیا۔ کئی مہینوں سے میرے دل میں پیدا ہونے والے سارے سوالات اور تمام وسوسے یک دم کافور ہو گئے۔ اور چند ہی لمحوں میں اچانک یوں محسوس ہوا گویا میں سچ مچ اپنی منزل پر پہنچ گیا ہوں۔

میرے خیال میں جیسا کہ میں سمجھتا تھا، مجھے وہ اس سے کہیں مختلف لگے۔ میرے تصور کے بنائے ہوئے ہیولے سے کہیں چھوٹا اور بھرے بھرے جسم والا۔ بڑے سر پر گھنے ابرو اور دوستانہ نظروں والی آنکھیں۔ سر پر چھوٹے چھوٹے مگر سلیقے سے شانہ کیے ہوئے بال، جن کو دیکھ کر مجھے اپنے اسکول کے اساتذہ، بالخصوص مسٹر Hirmer یاد آ گئے۔ وہ ہمیں جرمن ادب اور تاریخ پڑھایا کرتے تھے۔ میں ان کا بہت احسان مند ہوں۔ وہی تھے جنھوں نے مجھ میں ماضی سے لگاؤ کا جذبہ پیدا کیا اور میری زندگی میں عظیم ماضی کے نقوش چھوڑے تھے۔ جی ہاں، جیسا کہ میں نے کہا ہے، حیدر صاحب ایک بیمہ کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو کم اور تاریخ کے پروفیسر زیادہ لگتے تھے۔ انھوں نے سپید لینن کا سوٹ زیبِ تن کر رکھا تھا اور کلب کی ٹائی لگائے ہوئے تھے جو ان کے پاس کافی دنوں سے رہی ہوگی۔ اور جب وہ بیٹھے تو ان کے جیکٹ پر دو بہت واضح سرخ دھبے نظر آ رہے تھے جو اس وقت نہیں رہے ہوں گے جب ہم ان کے دفتر میں داخل ہوئے تھے۔ مگر ہم نے ان کو کچھ چباتے ہوئے دیکھا تھا جب، وہ ہاتھ بڑھا کر ہمیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ دو حضرات جو پہلے سے کرسی نشین تھے ان میں سے ایک نے اچانک کہا تھا، ''حیدر صاحب آپ کی جیکٹ خراب ہوگئی ہے، کیا میں صدیقی کو آواز دوں۔'' جواب میں حیدر صاحب ہلکے سے مسکرائے اور کہنے لگے، ''معین فکر نہیں کرو، یہ پان کا ذرا سا دھبا ہے۔ گھر والے اس کے بارے میں کچھ کریں گے۔'' اور پھر انھوں نے ان دونوں حضرات کا ہم سے، یا یوں کہیے کہ مجھ سے تعارف کرایا۔ اس لیے کہ مسٹر برنہارڈ تو ان کو پہلے سے جانتے تھے۔ ان میں سے ایک تو جناب معین الدین، ای ایف یو، کراچی کی ایجنسی سیکشن کے منیجر تھے اور دوسرے امین صاحب، کمپنی کے چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔ KFH نے (اب میں اختصار کی خاطر حیدر کا ذکر ان الفاظ میں کروں گا) کہا، ''مسٹر کرتوسکی آپ بہت کم عمر ہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی کم عمر، مگر ہم ایسا ہی چاہتے تھے۔ یہ آپ کے لیے فائدہ مند ہے اس لیے کہ اپنی کم عمری کے باعث آپ جنگ کے دوران نانسی (نازیوں کو جرمن زبان میں نانسی ہی پکارا جاتا ہے مترجم) یا فوجی نہیں ہو سکتے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ اس نسل سے ہیں جو برطانیہ مخالف نہیں، بلکہ اس قسم کے کسی طبقے کی مخالف نہیں۔ آپ میں نوآبادیاتی امتیازات قسم کی باتیں نہیں ہوں گی۔ آپ کے لیے یہ بات بہت فائدے کی بھی ہے اور بڑے امکانات کا باعث بھی ہوگی۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمارے نوجوانوں سے بغیر کسی تکلف کے دوستیاں کریں۔ وہ سب آپ کی معاونت کریں گے اس لیے کہ آپ خود دیکھیں گے کہ پاکستانی آپ کے ملک کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان، صحیح ہے یا غلط، ایک نوع کا تصور عام ہے کہ ہم اپنی آزادی کے سلسلے میں بالواسطہ آپ کے مقروض ہیں اس لیے کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عالمی جنگ دوئم ہی تھی جس کی وجہ سے برطانیہ نے اپنی نوآبادیات کو خیر باد کہا تھا۔ آپ اس ملک میں اپنے لیے راستے خود تلاش کریں۔ پاکستانی عوام میں گھل مل جانے کی کوشش کریں اور یقین کریں کہ یہ آپ کے لیے بہت فائدہ مند ہوگا۔ بے شک اس سلسلے میں آپ کی مدد میں بھی کروں گا، مسٹر معین الدین، مسٹر امین اور کمپنی کے تمام لوگ آپ کی مدد کریں گے۔ آپ بالخصوص نوجوانوں سے ضرور ملیں، مثلاً میرے بیٹوں سے بھی، اس لیے کہ اس کمپنی کا مستقبل انھیں سے وابستہ ہے نہ کہ پرانی اور تاریخی نسل سے۔ اپنے ملک کے قیام کے لیے ہم اہم تھے، اب اس کو بنانے کے لیے دوسروں کی، یعنی نوجوانوں کی ضرورت ہے۔'' ان الفاظ کو سن کر میرا خیال اور بھی پختہ ہوگیا کہ KFH تاریخ کے پروفیسر سے کسی طور بھی کم نہیں۔

خوب صورت الفاظ سے مزین یہ نہایت عمدہ تقریر تھی۔ میں نہ صرف بے انتہا متاثر ہوا بلکہ پُر سکون بھی ہوگیا۔ میں خاص کر اس بات سے بہت خوش ہوا کہ حیدر صاحب مجھ ہی سے مخاطب ہو کر باتیں کرتے رہے اور مجھے سوال جواب کے مراحل سے نہیں گزرنا پڑا جس کی مجھے بہت توقع تھی اور جس کے تصور ہی سے میری راتوں کی نیند اڑی ہوئی تھی۔ اس کے برعکس میرے نقطۂ نگاہ سے یہ صورتِ حال زیادہ

اطمینان کی تھی۔ میں خوف زدہ تو نہیں تھا نہ مجھے کچھ چھپانا تھا، بس چوں کہ میں اس ملک کے لوگوں کو نہیں جانتا تھا اس لیے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھ سے کس طرح پیش آئیں گے۔ کیا واقعی مجھے صرف ایک غیر ملکی سمجھ کر خوش آمدید کہا جائے گا یا پھر مقامی لوگوں کی نظر میں میرا یہاں آنا ان کے مفادات کے خلاف ہوگا؟

حیدر صاحب نے میرے لیے سب کچھ بہت آسان کر دیا تھا۔ جس طرح انھوں نے مجھ سے باتیں کی اس سے میری بہت ڈھارس بندھی اور مجھے ایک طرح کا احساس ہوا کہ ان لوگوں کو واقعی میری ضرورت ہے، بس میرے لیے یہی سب سے اہم بات تھی۔ اس کے علاوہ جو کچھ میرے اختیار میں ہوگا، میں اس سے بہ خوبی عہدہ برآ ہوں گا۔ اور اب، چالیس برس بعد بھی، ایسا لگتا ہے گویا میں اس وقت بھی انھیں، الفاظ تول تول کر آہستہ انداز تکلم میں، جیسے کوئی لیکچر دیا جا رہا ہو، باتیں کرتا سُن رہا ہوں۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے تھے سچ مچ وہی ان کا مقصد تھا، اور ان کی باتیں میرے دل میں اترتی جا رہی تھیں۔

KFH کی جب ہم سے ملاقات ہوئی اسی دن وہ ساٹھ برس کے ہو گئے تھے اور اب میں سوچتا ہوں کہ اس دن جو کچھ اور جس طرح انھوں نے کہا تھا، دراصل KFH کا وہی اصلی روپ تھا۔

وہ ۱۰رفروری ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئے تھے، نئی صدی کی شروعات سے صرف چند ہفتے قبل۔ ان کی جائے پیدائش مرشد آباد تھی جو مغربی بنگال کا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں وہ انگلستان گئے، جب پہلی عالمی جنگ جاری تھی، وہ صرف سترہ برس کے تھے۔ انھوں نے مشہورِ زمانہ قانون 'لنکنز اِن' سے قانون کی پہلی منزل سر کرلی تھی، جہاں ۱۸۹۳ء میں محمد علی جناح نے درخواست دے کر ابتدائی مرحلے میں لاطینی زبان پڑھنے سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔ اور وہ اس عظیم ہال کمرے سے بھی گزرے ہوں گے جہاں کے عظیم کامیاب لوگوں کی طویل فہرست میں ٹامس مور، ولیم پٹ اور آدھے درجن کے قریب دوسرے حضرات گزرے ہوں گے جو بعد میں برطانیہ کے وزرائے اعظم بنے تھے۔ برطانیہ کے دو عظیم وزرائے اعظم ڈزرائیلی اور گلیڈ اسٹن بھی وہاں داخل ہوئے تھے مگر اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکے۔ کیا KFH انگلستان کے قیام کے دوران ان عظیم لوگوں سے متاثر ہوئے تھے یا نہیں، اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا اس لیے کہ انھوں نے اس بابت کبھی کچھ نہیں کہا۔ بس ہمیں اتنا معلوم ہے کہ انگلستان ہی میں ان کی ملاقات عبد الرحمٰن صدیقی سے ہوئی تھی جو اس زمانے میں خلافت تحریک کے بے لچک حامی تھے اور آکسفرڈ میں تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے۔ انھی دنوں شعیب قریشی، جو عبد الرحمٰن صدیقی کے قریبی دوست تھے اور ریاست بھوپال کے شہزادے حمید اللہ خان بھی برطانیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے قریبی دوست تھے۔ انھوں نے ایک حلقہ بنا رکھا تھا اور جہاں تک ممکن ہوتا ایک ساتھ وقت گزارا کرتے تھے، بالکل ایک خاندان کی طرح جو گھر سے دور رہ رہا ہو۔

سجاد حیدر نے بتایا، جو دبئی میں ۲۵ر برس سے کامیاب چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں، کہ ''میرے والد برج کھیلنے کے بہت شوقین تھے۔ انھیں کھانا پکانے کا بھی شوق تھا۔ تو ہر اتوار کو دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوتی تھی جس، کے لیے وہ خود کھانا تیار کرتے تھے۔ اچھے کھانے کے علاوہ ان لوگوں کو سیاست بھی یکجا رکھتی تھی۔ مسلمانوں کی سیاست، آزادی کی تحریک۔ ان دنوں مسلمانوں میں بہت کم پڑھے لکھے لوگ ہوتے تھے، جو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔''

میرا خیال ہے کہ KFH کو برطانیہ میں قیام پسند تھا۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی برطانیہ کو اپنا عقلی گھر یا دانش گاہ سمجھتے تھے۔

وہ اس ملک کے جمہوری اداروں کو اور بادشاہت کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کو برطانوی طرزِ زندگی پسند تھا، حالاں کہ اپنے دوسرے ہندوستانی دوستوں کی طرح وہ ہندوستان سے برطانوی راج کا جلد اختتام چاہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کو وہاں کے لوگ اچھے لگتے تھے اور انگریزوں سے انھیں کوئی ذاتی بغض نہیں تھا۔ ان میں سے بہتوں سے ان کی دوستیاں تھیں جن میں وکلا، دانشور اور تجار شامل تھے۔ عبدالرحمٰن صدیقی کی شراکت میں ہائڈ لمیٹڈ کے نام سے ہندوستان سے برآمد درآمد کے لیے ایک تجارتی ادارہ کھول کر جس کا میں پچھلے صفحات میں تذکرہ کر چکا ہوں، وہ خود بھی تاجروں میں شامل ہو گئے تھے۔

اس ادارے کے اصل کرتا دھرتا KFH ہی تھے۔ وہی اس کے تجارتی سربراہ تھے۔ چوں کہ عبدالرحمٰن صدیقی خلافت تحریک کے چیف ایجنٹ تھے اور وہ اپنی سیاسی مصروفیتوں میں الجھے رہتے تھے اس لیے انھوں نے زیادہ تر ذمے داریاں اپنے نسبتاً کم عمر دوست کو سونپ دی تھیں جن کی مالیاتی صلاحیتوں پر ان کو پورا بھروسا تھا۔ ان کی کاروباری ضروریات کی دیکھ بھال لائڈز بروکر بی ایم کولنز کرتے تھے۔ کمپنی کے مالک سے صدیقی کی ملاقات ایک ترک صنعت کار کے گھر پر استنبول میں ہوئی تھی۔ ان کا ایک بیٹا کلائیو کولنز حیدر صاحب کا اچھا دوست بن گیا تھا اور اسی نے KFH کو ہندوستان میں مسلمانوں کی ملکیت اور انتظام میں بیمہ کمپنی کھولنے کے مشورہ دیا تھا۔ میں نے عبدالرحمٰن صدیقی کے خاکے میں اس کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ اگر چہ اس کمپنی کی کامیابی کا سہرا کئی لوگوں کے سر دکھائی دیتا ہے مگر سب سے بڑھ کر یہ KFH کے سر بندھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے اور کولنز کی دوستی کے بغیر ای ایف یو کی بیل کبھی منڈھے نہیں چڑھ سکتی تھی۔ اور بجا طور پر KFH اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اس ادارے کی ابتدائی اور عملی نگہداشت ان کے ہاتھوں ہی ہوئی تھی۔ وہی تھے جو اس منصوبے کی تفصیلات، موافق اور مخالف حقائق کے ساتھ، اپنے دوستوں کے پاس لے گئے تھے۔ ان میں غلام محمد شامل تھے، جو اس دوران شعیب قریشی اور شہزادہ حمید اللہ خان کے دوست بن گئے تھے۔ ان کے دوسرے بڑے دوستوں میں مشہور ڈاکٹر انصاری تھے جو خلافت تحریک کے سلسلے میں ترکی جانے والے مشن کے سربراہ تھے اور ان کے بھتیجے عزیز انصاری تھے، صدیقی صاحب نے جن سے ضرور مشورہ کیا ہوگا۔ منصوبے کو تکمیل تک پہنچنے میں کئی برس لگ گئے تھے۔ اس دوران زندگی کا پہیہ اپنی پوری رفتار سے چلتا رہا، دوستیاں قائم رہیں اور ان کے زیادہ تر دوست ہندوستان واپس جا چکے تھے۔ KFH بھی ہندوستان واپس جا چکے تھے اور دوست شہزادے کی زندگی میں سب سے بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔

سجاد حیدر کے مطابق ''شہزادہ حمید اللہ خان کو، جنھوں نے علی گڑھ میں کچھ سال گزارے تھے، مزید تعلیم کے لیے انگلستان جانے کی اجازت مل گئی تھی صرف اس لیے کہ اس وقت وہ اپنی والدہ کے، جو اپنے والد کے انتقال کے بعد بھوپال کی نواب تھیں، پرائیویٹ سیکریٹری تھے۔ اس وقت اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ شہزادے بھوپال کے نواب بن سکیں گے اس لیے کہ ان سے بڑے دو اور بھی بھائی بقیدِ حیات تھے۔ مگر صرف پانچ مہینوں کے عرصے میں ۱۹۲۴ء میں دونوں انتقال کر گئے تھے اور شہزادہ حمید اللہ کی والدہ ان کی ولی عہدی کی اجازت کے لیے لندن گئی تھیں۔ اور طویل مشکلات اور مسائل کے بعد، جب موجودہ نواب نے نوابی سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تو شہزادے بھوپال کے نواب بن گئے تھے۔''

''ہز ہائی نس نواب آف بھوپال کی میرے والد سے قریبی دوستی کی وجہ سے ہز ہائی نس نے بھوپال پہنچ کر میرے والد سے رابطہ کیا اور ان کو ریاست کے انتظامی امور میں ہاتھ بٹانے کی پیش کش کی۔ غالباً انھوں نے تجارت کے محکمے کی سربراہی سے شروعات کی تھی جس میں انھوں نے کئی برس کام کیا اور ۱۹۳۹ء میں ان کو وزیرِ مالیات بنا دیا گیا۔ نواب صاحب نے انھیں بہت سی ذمے داریاں سونپ دی تھیں۔ وہ

حاکمِ ریاست کے قریب ترین اور معتمد ترین فرد سمجھے جاتے تھے۔ اردو زبان میں ایسے مناصب کے لیے خوب صورت الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ میرے لیے مشکل ہے مگر 'ریاست کا متولی' Trustee of the Country اور 'سب سے اہم رُتبے والا شخص' Man of the Highest Rank شاید ان سے قریب ترین ہوگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عملی طور پر ہر معاملے میں، جس میں ہندوستان کی مسلم سیاست بھی شامل تھی اور نواب صاحب ذاتی دل چسپی بھی لیتے تھے، میرے والد سے مشاورت کرتے تھے۔ علی گڑھ کے دنوں سے ہی وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل میں اور تحریکِ آزادی میں اپنے کردار میں ذاتی دل چسپی لیتے تھے۔ اس زمانے میں ایک بیمہ کمپنی کھولنے کا خیال پیش کیا گیا تھا اور حتمی فیصلے کے بعد نواب صاحب نے اس کی سرپرستی قبول کی تھی۔''

حیدر صاحب کہتے تھے، ''وہ دنیا کا ایک حسین طبقہ ہے۔ تمھیں وہاں ضرور جانا چاہیے'' حیدر صاحب نے کئی بار مجھ سے کہا، جب انھیں اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ ہمبرگ سے آنے والے اس نوجوان نے ان کی توقعات کو پورا کر دکھایا تھا۔ ''بھوپال کچھ پہاڑی علاقہ ہے، پرتگال کی مثل، یا باویریا (Bavaria) جیسا، اونچا نیچا، دریا، وافر پانی، اور فراواں سبزے کی جگہ۔ خوب صورت جنگلات، وحشی درندوں اور جانوروں سے پُر۔ ہماری زندگی دیہات جیسی تھی۔ ہمارے ہاں ۸۸ فی صد ہندو اور ۱۲ فی صد مسلمان باشندے تھے، آپس میں کوئی رنجش نہیں، کبھی ایک بھی فساد نہیں ہوا، ایک آدمی بھی نہیں مارا گیا۔ دونوں گروہوں میں کوئی تفریق نہیں تھی۔ وزیرِاعظم ہندو تھا۔ رمضان کے پہلے دن کی سحری ہندوؤں کی جانب سے مسجد بھیجی جاتی تھی۔ مسلمان ان کے ہولی اور دسہرے کے تہواروں میں شرکت کرتے تھے۔ ہم رنگوں میں نہلا دیے جاتے تھے۔ اور ہمیں بہت لطف آتا تھا۔'' یہ ساری تفصیلات مجھے شہزادی عابدہ سلطان نے بھی بتائیں تھیں، جب میں ان کا انٹرویو کرنے کی غرض سے ان سے ملنے گیا تھا۔ اور حیدر صاحب بھی یہی کچھ کہا کرتے تھے جب وہ ریاست کے بارے میں باتیں کرتے تھے جہاں انھوں نے بہت اچھے اور کامیاب دن گزارے تھے۔ انگلستان سے واپسی پر مغربی بنگال کی ایک دوشیزہ سے شادی کے بعد وہ وہیں بس گئے تھے۔ ان کے پانچ بیٹوں میں سے چار بھوپال ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ سجاد پہلے تھے جن کی ولادت ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی، اور دوسرے مصطفیٰ تھے جو ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں سجاد دبئی میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ چارٹرڈ اکاؤنٹینسی انھوں نے لندن سے مکمل کی تھی جس میں کولنز کی عملی مدد شامل تھی۔ مصطفیٰ نے ۱۹۵۵ء میں سینئر کیمبرج کراچی گرامر اسکول سے کیا تھا جس کے بعد عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے وہ ایسٹرن فیڈرل سے منسلک ہوئے اور بعد میں سرویئر بن کر اپنا کاروبار کرنے لگے تھے۔ میں ان دونوں بیٹوں سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے کہ یہ دونوں میرے ہم عمر ہی تھے۔ ان دونوں نے اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کرنے میں میری بہت مدد کی تھی۔ بالخصوص مصطفیٰ نے شہزادی عابدہ سلطان، شعیب قریشی کی بیٹی بیگم قاضی اور صدیقی صاحب کی بھتیجی، ابوالحسن حسن اصفہانی مرحوم کی اہلیہ بیگم اصفہانی، سے میری ملاقات کے سلسلے میں میری بہت مدد کی تھی۔

حیدر صاحب نے قانون میں گریجویشن کیا تھا مگر وکالت کا پیشہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ وہ سیدھے کاروبار میں لگ گئے اور اس کے بعد نواب بھوپال کے ساتھ ریاست میں انتظامیہ کے ایک اہم رُکن بن گئے۔ مصطفیٰ نے بتایا ''والد صاحب وکالت کو پسند نہیں کرتے تھے مگر ان کے دو بھائی اس پیشے میں گئے۔ حیدر صاحب کے بعد والے بھائی جسٹس ذوالعین فضلِ اکبر پاکستان کے چیف جسٹس بنے اور دوسرے بھائی فضلِ سبحان تقسیم سے قبل ہندوستان کی پولیس میں تھے۔ منقسم بنگال میں وہ ڈی آئی جی تھے۔ پاکستان بنا تو کچھ عرصے کے لیے انھوں نے خواجہ ناظم الدین کے ساتھ کام کیا جو پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل بنے تھے اور بعد میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک ملک کے وزیرِاعظم رہے۔ ان کو

کراچی امپروومنٹ ٹرسٹ کا پہلا چیئرمین بنایا گیا تھا جس کا نام بدل کر KDA کردیا گیا تھا۔ اس کے بعد نیروبی میں ملک کے سفیر رہے۔ ان کے لڑکے آج کل بنگلہ دیش میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ اپنی پوری زندگی حیدر صاحب بنگال ہی کو اپنا اصل وطن جانتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہز ہائی نیس نواب آف بھوپال سے میری دوستی تھی جس کی وجہ سے میں اپنی جنم بھومی واپس نہیں جا سکا۔'' ای ایف یو میں ان سے نسبتاً قلیل عرصے قربت کے دوران بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ دل سے بنگالی تھے۔ اور جب بھی وہ دورے پر وہاں جاتے جس کو اس زمانے میں مشرقی پاکستان کہا جاتا تھا، ان کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھتا تھا۔

مگر شاید بھوپال میں قیام کے دوران ایسا نہیں رہا ہوگا۔ وہاں وہ ہمیشہ اپنے بہت قریبی دوستوں کے گھیرے میں ہوتے تھے۔ شعیب قریشی وزیرِ داخلہ تھے، راجا صاحب محمودآباد اور عبدالرحمٰن صدیقی برابر آتے جاتے رہتے تھے، کم از کم اس وقت تک جب وہ کلکتے کے میئر نہیں بن گئے تھے۔ ظفر اللہ خان وزیرِ خارجہ تھے۔ گویا روشن خیال حاکم کے اطراف باکمال افراد کا ایک حلقہ تھا جو ترقی پسندانہ فکر کے حامل تھے اور جنھوں نے پاکستان کی تشکیل اور اس کی ترقی میں اہم کردار ادا کیے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ بھوپال ایک بہت اہم ریاست تھی۔ دراصل یہ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی دوسری سب سے بڑی ریاست تھی۔ حیدرآباد سب سے بڑی تھی۔

جب ۱۹۴۷ء میں آزادی ملی، دوسری ریاستوں کی طرح ریاست بھوپال بھی ختم ہوگئی اگرچہ الحاق کے سلسلے کے کام دیر تک چلتے رہے۔ عام توقعات کے مطابق، اور ان کی بڑی صاحب زادی عابدہ سلطان کو بھی حیرت ہوئی، جو پاکستان کی بڑی پُرجوش حامی تھیں، کہ نواب صاحب نے ہندوستان کے مسلمانوں کے وطن پاکستان ہجرت نہیں کی۔ حالاں کہ انھوں نے موہٹا پیلس کے مقابل، جس کو نہ صرف جناح صاحب نے اور ان کے بعد ان کی بہن فاطمہ جناح نے سرکاری رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا، ایک مکان خرید لیا تھا۔ موہٹا پیلس کی آرائش کردی گئی ہے اور یہ عمارت کلفٹن کے رہنے والوں ہی کے لیے نہیں بلکہ دنیا بھر سے آنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ کل کی بے مثال عمارت بہت سے مشاہیر کے استعمال میں رہی مگر اس کے مقابل کی بہت بڑی عمارت ''بھوپال ہاؤس'' جو ایک محل معلوم ہوتی ہے، اپنی خارجی بے توجہی کے باعث ایک بھوت بنگلہ لگتی ہے جس میں برطانوی راج کا ایک بہت بارسوخ گھرانا رہا کرتا تھا۔ شہزادی عابدہ سلطان جو اب شہر سے دس میل دور ایک فارم ہاؤس نما جاگیر میں قیام پذیر ہیں اس عمارت میں شان سے رہا کرتی تھیں۔ اور ۱۹۵۲ء میں پاکستان ہجرت کے بعد حیدر صاحب، جو وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر قمر کورٹ میں رہتے تھے، برابر آتے رہے ہوں گے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں KFH نواب صاحب بھوپال کے بہت اہم رازداں اور مددگار ہوگئے تھے۔ اس لیے یہ حیرت کی بات نہیں تھی کہ پاکستان بننے کے بعد وہ بھی بھوپال ہی میں رہ گئے تھے۔ انھوں نے اپنے اہلِ خانہ کو اپنے برادرِ نسبتی مرشد کے پاس کلکتے روانہ کردیا تھا اس لیے کہ وہ اب نواب صاحب کے مستقل رفیق کے طور پر ملک کے اندر اور باہر سفر میں رہتے تھے۔ درحقیقت KFH اب نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری ہوگئے تھے اور چوں کہ نواب صاحب ایک مضطرب انسان تھے اس لیے KFH کو اپنے اہلِ خانہ کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔

اسی دوران وہ ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کے ڈائریکٹر بھی ہوگئے تھے جو اب کافی بڑی کمپنی ہوگئی تھی۔ اس ادارے نے قابلِ تعریف ترقی کرلی تھی اور اپنا کاروبار بہت پھیلا لیا تھا۔ مگر ہندوستان کی تقسیم کے بعد ایک فیصلہ کرنا تھا کہ یہ ادارہ ہندوستان ہی میں رہے یا پاکستان ہجرت کرجائے اس لیے کہ اس کا بہت سارا کاروبار اب پاکستان منتقل ہو چکا تھا۔ بالآخر یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ کمپنی کو کلکتے سے کراچی

منتقل کر دیا جائے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے لیے یہ ایک بہت مشکل فیصلہ تھا مگر اس کے علاوہ کوئی اور صورت ہی نہیں رہ گئی تھی اس لیے اور بھی کہ کئی بلکہ تقریباً تمام بنیاد گزاروں کا سیاسی ماضی بھی پاکستان ہی سے منسلک تھا۔

۱۹۵۱ء میں مرزا احمد اصفہانی کا، جو ای ایف یو کے سب سے بڑے حصے دار اور چیئرمین تھے، خیال تھا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ کمپنی کا چیف ایگزیکٹو کسی پاکستانی کو ہونا چاہیے۔ لہٰذا انھوں نے KFH کو اس عہدے پر فائز کرنے کا مشورہ دیا۔ کمپنی کے پہلے چیف ایک برطانوی مسٹر منی نک تھے جو اٹلس انشورنس کمپنی کے جنرل منیجر کے طفیل مستعار لیے گئے تھے۔ انھوں نے اس کمپنی کی چھ برس تک خدمت کی تھی اور ان کی جگہ نیوزی لینڈ کے مسٹر ٹی ہیکسٹر تعینات ہوئے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے ماہرِ فن تھے مگر ان میں ایک غیر ملکی ملازم کے سارے لوازم موجود تھے، جن میں اہم لازمہ یہ تھا کہ وہ دورانِ ملازمت اتنی رقم اکٹھی کر لینا چاہتے تھے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد مالی اعتبار سے ان کی زندگی آرام سے گزر سکے۔ اس کے علاوہ بورڈ کی خواہش تھی کہ کمپنی کی ہجرت کے باعث اس کی پریمیم آمدنی میں جو کمی واقع ہوئی ہے اس کو پورا کرنے کے لیے کچھ مشکل فیصلے کیے جائیں جن کی وجہ سے کمپنی شدید مالی مشکلات سے گزر رہی تھی۔ ای ایف یو کی تاریخ کے اس ناخوش گوار باب پر میں نے تمام پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس منزل پر جو اہم بات قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ سیاسی اور تکنیکی وجوہات کی بنا پر مسٹر ہیکسٹر کی تبدیلی ناگزیر ہو چکی تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ انشورنس کے ایک جرمن ماہر مسٹر اِروِن سی ایوان جن کو اصفہانی خاندان رنگون کے دنوں سے جانتا تھا، کمپنی کے نئے ڈپٹی جنرل منیجر متعین ہوئے اور ان کی اہم ذمے داریوں میں سے ایک عملی طور پر کمپنی کے صدر دفتر کی کراچی منتقلی بھی تھی۔

کچھ اسی قسم کی صورتِ حال تھی جب اپنے پرانے دوستوں اور کمپنی کے چیئرمین جناب عبدالرحمٰن صدیقی اور پاکستان کے گورنر جنرل جناب غلام محمد کے اصرار پر مسٹر ہیکسٹر کی جگہ جناب کے ایف حیدر نے بحیثیت جنرل منیجر سنبھالی تھی۔ جب مشکلوں میں گرفتار اس کمپنی کے چیف ایگزیکٹو حیدر صاحب بنے جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں وہ بہت بارسوخ انسان تھے گو کہ وہ انشورنس کے شعبے کے آدمی نہ تھے۔ اپنے پورے عرصۂ حیات میں وہ ''اپنے'' نواب صاحب کے مخصوص اور قابلِ اعتماد نائب تھے اور وہ یقیناً اس نئی مملکت میں قدر اور اعتبار کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ملک کا ہر فرد دیکھ سکتا تھا کہ وہ گورنر جنرل اور ملک کے اعلیٰ افسران سے کتنے قریب تھے۔ ملک کے پہلے دارالحکومت کے سب سے اہم علاقے کلفٹن میں حیدر صاحب اپنے دوست غلام محمد سے ملنے جاتے جو ملک کی ایک کے بعد دوسری اہم ذمے داریاں سنبھالتے جا رہے تھے، اور دونوں اکٹھے سیر کو نکل جایا کرتے۔ لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ گورنر جنرل کے دورۂ مصر اور مشرقِ وسطیٰ کے مندوبین میں حیدر صاحب بھی شامل تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دنوں حیدر صاحب بہت بارسوخ تھے مگر ایک انشورنس کمپنی چلانے کے لیے جو تکنیکی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں وہ حیدر صاحب کے لیے مشکلات پیدا کر رہی تھیں۔ لہٰذا بیمہ کمپنی کی تکنیکی مشین چلانے کا کام ان کے قد آور، خوش شکل جرمن نائب جناب ای سی ایوان کے ذمے تھا، انشورنس کے بارے میں جن کی تکنیکی اور پیشہ ورانہ مہارت ملک میں بیمے کی صنعت میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ مسٹر آئیون کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ لندن میں ای ایف یو کے انڈر رائٹنگ کے معاملات ٹھیک نہیں تھے اور حیدر صاحب نے کمپنی کی باگ ڈور سنبھالتے ہی مسٹر آئیون کو لندن ایجنٹ کے کاغذات کے معائنے اور مسائل کے حل کی غرض سے فوراً لندن روانہ کیا۔ ان کی سخت کوش معاملاتی صلاحیت کے باعث ناگوار حقیقتوں پر سے پردے اُٹھ گئے اور بہت جلد یہ راز کھل گیا کہ کمپنی کے نقصانات اس کی مالی سکت سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس بات کا سہرا حیدر صاحب کے سر بندھنا چاہیے کہ پہلی بار کمپنی کی انتظامیہ نے کمپنی کی

بڑھتی ہوئی ناگفتہ بہ حالت سے بورڈ کو بلا کم و کاست مطلع کر دیا۔

ان دونوں کی جوڑی بہترین تھی۔ حیدر صاحب ایک انشورنس کمپنی کی تکنیکی نزاکتوں سے نابلد تھے۔ ان کو کسی بڑی تجارتی انتظامیہ کو چلانے کا تجربہ بھی نہیں تھا مگر ان کو انسانوں کو جانچنے میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ کسی کارکن کی صلاحیت کا احاطہ کرتے وقت اس کے قابلِ تعریف پہلوؤں پر پہلے نظر ڈالتے تھے۔ ای ایف یو کے موجودہ چیف ایجنٹ ابوالمحمود کے مطابق، جو صنعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے سے قبل ای ایف یو کراچی کے سب سے کامیاب، طویل عرصے سے اس کمپنی سے منسلک ایجنٹ تھے، ''وہ نہایت نفیس شخصیت کے مالک، ایک مکمل انسان تھے۔ وہ کسی کے بارے میں کبھی بُری بات نہیں کہتے تھے، معاملات میں سیاسی طریقہ تو نہیں اختیار کرتے تھے نہ وہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی ٹھوس اور صائب رائے پیش کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کو خود تک بلا روک ٹوک رسائی دیتے تھے جو ان کے خیال کے مطابق کمپنی کے کاروبار میں ترقی میں ضروری اور معاون ہو سکتے تھے۔ میرے خیال میں یہ ان کی خاصیت تھی اس لیے کہ مجھ جیسے لوگ، بڑے کاروبار کرنے والے اسی وقت اپنی چمک دکھلا سکتے تھے جب نہ صرف وہ مالی منفعت سے نوازے جاتے بلکہ ان کی عقلی صلاحیتوں کا بھی اعتراف کیا جاتا۔ حیدر صاحب پر شاید ای ایف یو میں شمولیت سے پہلے ہی یہ راز منکشف ہو چکا۔ اور اسی وجہ سے وہ مجھ جیسے اچھے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔''

مسٹر آئیون اور ان کے بعد ۱۹۵۱ء میں کمپنی میں شمولیت کرنے والے ایک اور جرمن مسٹر ہائنز شوارز نے مل کر یہ یقینی بنا دیا تھا کہ کمپنی کے کاروبار کی پیشہ ورانہ کیفیت برطانوی اور آسٹریلیشیائی کمپنیوں کے معیار سے کسی طرح کم نہیں ہونی چاہییں۔ انھوں نے اس بات کی بھی پوری کوشش کی کہ کمپنی کے دوسرے کارکنان میں بھی اپنے داخلی نظم و ضبط کو منتقل کر دیں۔ حیدر صاحب نے اس بات کو یقینی بنا لیا تھا کہ کارکنوں کے جذبۂ خودنمائی کو موقع دیا جائے گا۔ وہ اپنے قریبی لوگوں کے ذاتی معاملات میں خاص طور سے گہری دل چسپی لیتے تھے۔

وہ اپنے اہلِ خانہ کو کافی وقت دیتے تھے، جو اُن جیسے منصب پر فائض لوگوں کے لیے ذرا مشکل ہوتا ہے۔ وہ بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ کلفٹن کے علاقے میں واقع ان کا فلیٹ آرام دہ تھا مگر اتنا بڑا نہیں کہ ملک کی ایک بڑی مالیاتی کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو کے شایانِ شان ہو۔ ایسا تو اس کمپنی کے اوسط درجے کے افسران کے لائق ہونا چاہیے تھا۔ وہ صحیح معنوں میں دین دار انسان تھے، اپنے اہلِ خانہ سے محبت کرتے تھے اور اپنے ماتحتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کے اخلاقی معیار بہت بلند تھے مگر ایسے نہیں کہ ایک عام آدمی کی ان تک پہنچ نہ ہو سکے۔ ابوالمحمود نے ایک مخصوص قسم کا واقعہ بیان کیا جو پیشِ خدمت ہے۔

''لائف ڈپارٹمنٹ کے ایک ایجنٹ کو لائف منیجر جناب ریاست اللہ نے چوری کی بنا پر برخاست کر دیا تھا۔ اگر چہ رقم زیادہ بڑی نہ تھی مگر اس عمل کو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چھ ماہ کی مدت گزرنے کے بعد اس کو معاف کر دیا گیا اور کمپنی میں واپس لے لیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کارکن نے انشورنس کا نسبتاً ایک بڑا جرم کیا۔ لہٰذا اس کو پھر برخاست کر دیا گیا مگر اس بار اس کا نام اخباروں میں شائع بھی کر دیا گیا۔ چھ سات ماہ بعد وہ کارکن اپنی خطا پر بے حد شرمندہ واپس آیا اور عاجزی سے معافی کا طلب گار ہوا۔ ریاست اللہ صاحب اس کو لے کر حیدر صاحب کے روبرو گئے اور اُس کی اس شرط کے ساتھ سفارش کی کہ وہ تحریری طور پر یہ وعدہ کرے کہ وہ اب کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ حیدر صاحب نے پہلے تو تحمل سے سب کچھ سُنا پھر اچانک طیش میں آ گئے۔ انھوں نے ریاست اللہ صاحب کی سخت سرزنش کی اور خود ان کو برخاست کرنے کی دھمکی دی اگر وہ آئندہ پھر کبھی اس قسم کی تجویز لے کر آئے۔ انھوں نے کہا ' ریاست اللہ، آپ لائف منیجر ہیں اس لیے اس

آدمی کو واپس لینے کا فیصلہ صرف آپ کر سکتے ہیں۔ آپ جائیے اور جو کچھ آپ درست سمجھتے ہیں کیجیے۔ آپ اگر مجھ سے اس بات کی توقع کرتے ہیں کہ میں اس کے اس تحریری وعدے پر یقین کرلوں کہ وہ پھر کبھی ایسا نہیں کرے گا تو آپ مجھے غیظ وغضب کی دعوت دیں گے۔ میں کسی سے تحریری وعدے لینے میں یقین نہیں رکھتا۔ ریاست اللہ آپ نے دیکھا ہے کہ میں نے اللہ کے سامنے کتنی غلطیاں کی ہیں مگر اللہ نے کبھی مجھ سے کبھی کوئی تحریر نہیں طلب کی۔ تو پھر تحریر طلب کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ ایسا کبھی نہیں کرنا چاہیے۔ اگر آپ کو کسی پر اعتماد ہے تو اس میں اور بھی اعتماد پیدا کیجیے مگر پہلے اپنے آپ کو اتنا بلند کیجیے، تاکہ وہ دوبارہ جرم کرنے کی جرأت نہ کرے۔ اس آدمی کو بہتر بنانا آپ کی ذمے داری ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس کو اچھا بنانے میں ناکام رہے ہیں اسی لیے اس نے بُرے کام کیے ہیں۔ اور پھر انھوں نے اسی قسم کی بہت سی دانشورانہ باتیں کیں جواب مجھے یاد نہیں، بہت سال گزر چکے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے، 'محمود، میرے کئی بگڑے ہوئے بیٹے ہیں، جن میں سے ایک تم ہو، مگر میں سبھوں سے محبت کرتا ہوں۔''

شرافت والا جاہی جو اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جانے سے قبل حیدر صاحب کی ماتحتی میں کام کر چکے تھے، کہتے ہیں کہ ''حیدر صاحب بہت پیارے انسان تھے۔ وہ مجھ پر اور میری اہلیہ پر بہت مہربان تھے۔ ہم دونوں ان سے ملاقات کے لیے اکثر ان کے فلیٹ جاتے تھے۔ وہ میرے لیے باپ جیسے شفیق تھے۔ ایک بات جو وہ میرے سامنے بار بار دہراتے تھے: ''شرافت، ایک بات زندگی بھر یاد رکھنا۔ جو کچھ بھی کماؤ، ہمیشہ اس کا پچاس فی صد پس انداز کیا کرو۔ اگرچہ میں ان کے مشورے پر کبھی عمل نہیں کر سکا مگر اس مشورے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کیسے انسان تھے۔ اس لیے کہ جو کچھ وہ کہتے تھے اس پر ایمانداری سے یقین بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک بڑی قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی، وہ بہت اچھی انگریزی بولتے تھے، اور بہت خوب صورت زبان لکھتے تھے۔ وہ لوگوں کو ایک ہی سطح کا سمجھتے تھے۔ اس کے پیشِ نظر کہ ان کا پس منظر ریاستی افسر کا تھا، میرے نزدیک ان کا یہ طرزِ عمل بہت بڑی بات تھی۔''

حیدر صاحب بہت ذمے دار، بھروسے کے قابل، صاف گو انسان اور لگی لپٹی بغیر اپنے خیالات سچ سچ بیان کر دینے کے قائل تھے۔ وہ اپنے الفاظ کو کبھی توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرتے تھے اگرچہ ان کے کچھ زیادہ فلسفیانہ تبصرے ٹھٹھول جیسے لگتے تھے۔ مگر وہ جس انداز میں ان کو بیان کرتے تھے اس میں بھی حسن اور ان کی شناخت کا پہلو ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو کبھی ہلکے پن کے ساتھ پیش نہیں کیا نہ ہی وہ کسی سے سستی تعریف کی توقع رکھتے تھے۔ ان کی دانائی، بذلہ سنجی اور صاف گوئی تقریر کے جواہر سے مزیّن ہوتی، ان کی گفتگو بے شمار صوتی italics اور استعجابی نکات کے پردوں میں لپٹی ہوئے جملے کے ذریعے اپنے اصل پیغام کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہوتی تھی۔ وہ جو کچھ کہتے اس کے حرف حرف پر پورا یقین رکھتے تھے اور جو بھی ان کا مخاطب ہوتا پوری طرح سمجھ جاتا تھا۔ یہی ان کی سب سے بڑی طاقت تھی جس نے ان کی شخصیت کو، شرافت والا جاہی کے الفاظ میں، ارفع بنا دیا تھا۔ نہ وہ کوئی ٹیکنوکریٹ تھے نہ دانشور مگر وہ ہمیشہ اسی پر یقین رکھتے تھے جو انکے نزدیک حق ہوتا تھا۔ ان کا اعتماد غیر متزلزل تھا۔ ان کے رفیقِ کار Mr Iven نے ایک بار کہا تھا کہ '' وہ ایک گدھے کو بھی گانے کا موقع ضرور دیں گے اگر ان کے نزدیک وہ صحیح آوازیں نکالنے پر قادر ہو' ظاہر ہے کہ میں اپنے آنجہانی رفیقِ کار کو جھٹلانا ہرگز پسند نہیں کروں گا جو مجھ کو پہلے میونخ ری میں لے گئے پھر ای۔ ایف۔ یو میں لے آئے۔

جیسا کہ میں حیدر صاحب کے اس خاکے کے شروع کے صفحات میں بیان کر چکا ہوں، میری ان سے پہلی ملاقات کراچی آمد کے دوسرے دن ہوئی تھی۔ اور یہ وہی زمانہ تھا جب ای۔ ایف۔ یو لندن میں ہونے والی غلط انڈر رائٹنگ کی انتہائی مشکلات سے دوچار تھی۔ حسن

اتفاق سے ان ہی دنوں حیدر صاحب کے ذاتی معاملات میں ایک اہم لمحہ آ گیا تھا جب حکومتِ پاکستان نے ان کو پاکستان انشورنس کارپوریشن کی سربراہی کی پیش کش کی تھی جو ان ہی کے ایما پر ۱۹۵۳ء میں قایم کی گئی تھی۔ PIC ایک ری انشورنس کمپنی تھی جو، جہاں تک ممکن اور مناسب ہو، مقامی کاروبار کو تحفظ اور مدد فراہم کرنے کی غرض سے وجود میں آئی تھی۔

حیدر صاحب نے، جو بلاشبہ ملک میں بیمے کی صنعت کے عمائدین میں سب سے اہم تھے، یہ پیش کش قبول کر لی۔ میرے خیال میں یہ ایک سمجھ میں آنے والا فیصلہ تھا۔ مگر ایسے فیصلہ کن مرحلے پر ای ایف یو سے ان کی علاحدگی متضاد قسم کی چہ می گوئیوں کا باعث بنی تھی۔ اس لیے میں اس مقام پر وہ باتیں دہرانا چاہوں گا جو پہلے کہی جا چکی ہیں۔

جب یہ سب کچھ ہوا میں موجود تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ حیدر صاحب کا PIC میں جانے کا فیصلہ کسی طرح بھی ایک تباہ شدہ جہاز کو چھوڑ کر اپنی جان بچا لینے کا عمل نہیں کہا جا سکتا۔ پاکستان کے سب سے اہم ادارے کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے حکومتی پیش کش ان کو قبول کرنی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ جب انھیں یہ پیش کش کی گئی اور سفینے کا ناخدا اس کو قبول کر رہا تھا اس وقت لندن میں ہونے والے نقصانات سے پیدا ہونے والا انتشار اپنے عروج پر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس پیش کش سے پہلے ہی ای ایف یو ایسے طوفان میں گھر چکی تھی کہ اس کا دیوالیہ ہو جانا تھا مگر یہ حیدر صاحب کی تجربے کاری اور تاخیری حربے کا استعمال تھا جس کی بنا پر کمپنی کو سانس لینے کی فرصت مل گئی اور ۱۹۶۱ء میں کمپنی کی باگ ڈور سنبھالنے والے جناب روشن علی بھیم جی اور نئے چیئرمین جناب عباس خلیلی نے لندن کے قرض خواہوں سے معاملات کر لیے اور اتنے اہم اور بڑے ادارے کو دریا بُرد ہونے سے بچا لیا۔

جب یہ خوش خبری کراچی پہنچی تو سب سے زیادہ خوشی حیدر صاحب کو ہوئی اور وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ادارے کو بچا لینے والے دو حضرات کو مبارک باد پیش کی تھی۔ میں اکثر ان سے ملنے ان کے دفتر چلا جایا کرتا تھا جو قمر ہاؤس سے چند گز کے فاصلے پر، میری ویدر ٹاور سے متصل اس سڑک پر واقع تھا جس کو بانیِ پاکستان کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا۔ ان کا دفتر جس عمارت میں تھا وہ بہت پُرانی، بدنما اور بہت گہرے رنگ کی تھی۔ پھاٹک پر فوج سے فارغ شدہ نگہبان اور بے شمار نیم خوابیدہ چپراسیوں کا ہجوم۔ ہر طرف مثالی افسر شاہی کا ماحول۔ حتیٰ کہ راہ داریوں میں پھیلی ہوئی بو میں بھی نالائقی اور سخت کوشی بسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ حیدر صاحب وہاں کے ماحول سے خوش نہیں دکھائی دیتے تھے۔ وہ اپنے ادارے کے مستقبل کی بات کرنے کے بجائے ہمیشہ گھوم پھر کر ترقی کرتی ہوئی ای ایف یو کا ذکر چھیڑ دیتے۔ ایسٹرن فیڈرل کے اندر یا باہر کہیں کوئی بھی تقریب ہوتی تو حیدر صاحب کو ضرور مدعو کیا جاتا۔ اور ایسی پیش کشوں پر وہ اپنی خوشی کا کھل کر اظہار کرتے۔

حیدر صاحب بہت منکسر المزاج انسان تھے۔ اگر چہ ان کی زندگی سماجی چکا چوند سے بھری ہوئی تھی، اور وہ اپنے وقت کے مشاہیر کے ساتھ ہمہ وقت عوام کی دل چسپی کے مرکز رہے تھے مگر ایسا لگتا تھا گویا انھیں اس سے کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ اپنے مخصوص دوستوں کے ساتھ شطرنج کی ایک بازی یا برج کے چند ہاتھ کھیل لینا ہی ان کی سب بڑی تفریح تھی۔ باتیں کرنے میں ماہر مگر سننے کے معاملے میں بھی بہت صبر کرنے والوں میں سے تھے۔ شاید ان کی یہی خوبیاں تھیں، ان کے مربّی نواب صاحب بھوپال جن کی بہت قدر کرتے تھے اور ان دونوں بڑے لوگوں کے کردار میں جتنا فرق تھا جتنا شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو۔

میں نے انھیں آخری بار ۱۹۶۳ء میں دیکھا تھا۔ وہ پہلے کُل پاکستان انشورنس کنونشن میں شریک تھے جو کنٹرولر انشورنس مسٹر زال کنٹریکٹر کے ایما پر منعقد ہوا تھا جس میں کچھ غیر ملکی مندوبین بھی شریک ہوئے تھے۔ یہ بہت کامیاب کنونشن تھا اس لیے کہ پہلی بار پاکستان کی

بیمے کی صنعت کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرایا جارہا تھا۔ اُن کی پُرانی کمپنی ان دنوں اپنے عروج کے دور سے گزر رہی تھی اور جب روشن علی بھیم جی نے اپنے اہم خطاب میں حیدر صاحب کا نام لے کران کو پاکستان میں بیمے کی صنعت کے باپ کے نام سے یاد کیا تو وہ بہت متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے بعد سے تقریباً ہر شخص ان کے کردار کو سراہتا رہا۔ حیدر صاحب نے بحث میں حصہ بھی لیا اور جب حیدر صاحب نے تقریر کی تو برسرِ عام جناب امیر علی فینسی کے، جو اس وقت نیو جوبلی کے چیئرمین اور اسماعیلی فرقے کے رہنما تھے، اس بات پر لتے لیے کہ وہ حکومت کے کچھ اعمال پر تنقید کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ''آپ لوگ اپنے ملک کے وفادار نہیں ہیں۔ آپ لوگ پالیسی ہولڈروں کی کمزوریوں سے فائدے اُٹھاتے ہیں اور ان کو دھوکا دیتے ہیں۔ پہلے سال کے پریمیم پر آپ لوگ ایجنٹوں کو جتنا کمیشن دیتے ہمیں وہ زیادتی ہے، جرم ہے۔ اپنے اداروں کو مستحکم بنانے کے بجائے آپ لوگ بڑے بڑے منافعے ہڑپ کر کے عوام کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔'' مجھے یقین ہے کہ اس اجلاس کے حاضرین حیدر صاحب کی تقریر کو کبھی نہیں بھولے ہوں گے۔ ان کے بیٹے سجاد حیدر بتاتے ہیں کہ جب وہ گھر واپس پہنچے تو بہت تھکے ہوئے، افسردہ اور بیمار دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے اپنے گھٹنوں میں درد کی شکایت کی اور اہلِ خانہ نے کمپنی کے معالج ڈاکٹر سعید خان کو، جو حیدر صاحب کے بھی ذاتی معالج تھے، بلا بھیجا۔ انھوں نے حیدر صاحب کو انجکشن دیا۔ مگر ان کے دل نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور ۱۸؍ مارچ ۱۹۶۳ء کی رات تین بجے وہ بغیر کسی مزاحمت کے، خاموشی سے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

دوسری صبح کے اجلاس میں مندوبین نے ان کے احترام میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی۔ ایک بہت بڑے مجمعے نے، جس میں ای ایف یو کے لوگ، PIC کے ملازمین، وزارتوں کے نمائندے، ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کی کثیر تعداد شامل تھی، ان کو آخری سلام کیا جب ان کا خاکی جسم لحد میں اُتارا جا رہا تھا۔

نگرانِ کار

عباس خلیلی
راجا صاحب محمود آباد
ایس ایم یوسف
جہانگیر صدیقی
جسٹس میاں محمد محبوب

اصفہانی خاندان
اراگ خاندان
سعید احمد
محمد علی سعید
اشرف تابانی

عباس خلیلی

کراچی میں چیئرمین عباس خلیلی ای ایف یو کے ۱۹۶۳ء کے کنونشن میں آنے والے وفود کے استقبالیہ سے
خطاب کر رہے ہیں

ای ایف یو کے چیئرمین عباس خلیلی اپنی رہائش گاہ 'سیون برکس' پر مینیجنگ ڈائریکٹر روشن علی بھیم جی کے ساتھ
ری آرگنائزیشن کمیٹی' کی فائنل رپورٹ وصول کرتے ہوئے، تصویر میں شرافت علی والا جاہی
ساجد زاہد اور وولفرام کرنوسکی بھی موجود ہیں

عبّاس خلیلی

ہمارے مدراسی ساتھی

''ہندوستان اور پاکستان نے جتنے بھی اعلیٰ درجے کے سرکاری افسر پیدا کیے ہیں، عباس خلیلی ان میں سے ایک ممتاز افسر تھے ہیں۔ وہ خداداد نعمتِ عقل و خرد اور جلد فیصلہ کرنے کی صلاحیت کے مالک تھے۔ صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ تھے۔ وہ عوام کے سچے خادم تھے، ایسے خادم نہیں جو صرف اپنی حکومت کے فرماں بردار ہوتے ہیں۔''

یہ الفاظ اس شخصیت کے قریب ترین دوستوں میں سے ایک کے ہیں، جو ۱۴؍ستمبر ۱۹۰۸ء کو محمد خلیلی نامی شیراز کے ایک متموّل تاجر، رئیسِ قبیلہ اور مریم نمازی کے گھرانے میں پیدا ہوا، جب مریم اپنے والدین کے گھر مقیم تھیں۔ عبّاس اپنے تیرہ بھائی بہنوں میں نویں نمبر پر تھے۔ محمد خلیلی شیرازی نے چھ برس کی کچی عمر میں شیراز چھوڑا تھا جہاں سے وہ کشمیر گیا اور وہاں ۱۴؍برس کی عمر تک مقیم رہا۔ پھر یوں ہوا کہ نمازی نام کے اس کے ایک عم نے جو متموّل تاجر تھا اس کو مدراس طلب کیا تاکہ اس کی شادی اپنی خوب صورت بیٹی سے کردے۔ ضیا خلیلی کے بیان کے مطابق عباس خلیلی کے والد مدراس ہی میں بس رہے، اس بیٹی کو اپنے خاندان میں لے لیا اور بعد میں اس کا کاروبار بھی۔ محمد خلیلی نے اپنی عم زاد سے شادی کرلی اور اپنی تمام زندگی مدراس ہی میں گزار دی۔ تجارت میں انھیں بہت کامیابی ہوئی اور وہ مدراس شہر کے بہت بڑے صاحبِ جائیداد بن گئے۔ نمازی خاندان کے لڑکے اپنی خوبروئی، وجاہت اور طرزِ حیات کی وجہ سے خواتین میں بہت مقبول ہوتے تھے۔ یہ لوگ محنتی اور جفاکش نہیں تھے مگر محمد خلیلی ایسے تھے۔ وہ توانائی سے بھرپور اور ہمت والے تھے جن کو اوائلِ عمری ہی میں اپنے خسر کے کاروبار ''نیل'' (Indigo) کا بوجھ اُٹھانا پڑا۔ نیل کی کاشت مرکزی ہندوستان اور آندھرا پردیش میں ہوتی تھی اور وہیں سے افریقا برآمد کی جاتی تھی جو اس کی سب سے بڑی منڈی تھا۔ حالاں کہ وہ مقامی زبان نہیں بول سکتے تھے، بس تھوڑی بہت انگریزی سے کام چلاتے تھے مگر وہ بہت کامیاب تاجر بن گئے اور انھوں نے اپنا اصول یہ بنایا تھا کہ وہ اپنی کمائی ہوئی ساری رقم جائیداد میں لگائیں گے۔ وہ بہت دور اندیش اور لچک رکھنے والے انسان رہے ہوں گے اس لیے کہ صدی کے دوسرے عشرے میں جب جرمنوں نے مصنوعی کیمیائی مادّوں سے مصنوعی نیل بنانی شروع کردی تو ان کا روبار ٹھپ ہوکر رہ گیا۔ دور اندیش تاجر نے فوراً اپنے کاروبار کا رُخ موڑ دیا اور ہندوستان کے سب سے کامیاب تاجروں کی فہرست میں سے اپنا نام خارج نہیں ہونے دیا۔

عباس خلیلی مدراس میں اسکول میں جاتے اور راستے سے دوستوں کو اپنی سواری پر بٹھاتے جاتے۔ ان میں سے ایک جلال الدین رحیم، سر عبدالرحیم کے بیٹے، تھے جو آئی سی ایس میں کامیاب ہوکر سرکاری افسر بنے اور بعد میں پیپلز پارٹی کے بانی اور وفاقی وزیر بنے۔ دوسرے دوست کرامت تھے، سر محمد بذل اللہ، جنھیں آئی سی ایس میں محمد کرامت اللہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

عباس بہت اچھے کھلاڑی تھے، ہاکی کھیلنے کے ایسے شوقین تھے کہ جب ان کو تعلیم کے لیے، ان الفاظ میں، ملک سے باہر بھیجے جانے

کا خیال پیش کیا گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کے الفاظ میں، ''عبّاس بہت ذہین ہے، اس کو تعلیم کے لیے انگلستان جانا چاہیے'' اور وہ وہاں بھیج دیے گئے۔ ان کو انگلستان جانے والے بحری جہاز پر سوار کر دیا گیا۔ ان کے بڑے بھائی برسٹل میں موجود تھے۔ ان کے علاوہ لندن اور دوسری جگہوں پر اور بھی جاننے والے لوگ تھے۔ مگر وہ خود کو بہت اداس اور تنہا محسوس کرتے تھے کہ، اچانک اپنے پیارے اسکول اور اپنے کئی دوستوں سے دور کر دیے تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف سولہ برس کی تھی۔ وہاں ان کو اسکول میں داخل نہیں کرایا گیا۔ وہ گھر پر ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے لندن میں میٹرک کرنے کے بعد Brasenose College آکسفرڈ میں داخلہ لے لیا جہاں وہ چار برس تک، یعنی ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۱ء تک، تعلیم حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے اوّل درجے میں اعزاز کے ساتھ اصولِ قانون میں گریجویشن کیا اور اپنے کالج کے اعزازی فیلو منتخب کیے گئے۔ انھوں نے آکسفرڈ ہی سے BCL کیا اور ۱۹۳۰ء میں Inner Temple سے بیرسٹر فارغ التحصیل ہوئے۔ اپنے دوسرے امتحانات کے ساتھ وہ ICS کے مقابلے کے امتحانات میں بھی شریک ہوئے۔ ایک سال آکسفرڈ میں رہنے کے بعد ممتاز لوگوں کے حلقے، یعنی ICS میں مدراس کے مرکزی حلقے سے شریک ہوئے۔

اپنے ہم عصروں کے بارے میں وہ بہت خوش قسمت تھے۔ ان ہی دنوں ہمایوں کبیر (مولانا آزاد کے معتمد)، فضل الرحمٰن، معین الدین (جنھوں نے ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات میں نتائج آنے سے پہلے ہی ایوب خان کو منتخب قرار دے دیا، تھا) اشاعت حبیب اللہ (ایک آتش زیرپا جو آرام کرسی میں بیٹھے فسادات کے قانون پڑھا کرتے تھے)۔ فریک موراِئس ہوتھے سنگھ (جنھوں نے جواہر لال نہرو کی بہن سے شادی کی تھی) دوسوکرا کا (پہلے ہندوستانی جو آکسفرڈ یونین کے صدر بنے) اور MCC کے نامور کرکٹر پٹودی بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

خلیلی ضرور ایک نمایاں اور ذہین طالب علم رہے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ، جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا، وہ ایک وقت میں مختلف النّوع موضوعات اور امتحانات دینے کے قابل تھے اور یہی خصوصیت اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ ان میں بہت اعلیٰ درجے کی دانشورانہ صلاحیتیں رہی ہوں گی۔ وہ تیز طرّار، نہایت شائستہ تھے، اور بلا شبہ اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایسے طالب علم تھے جن پر کوئی بھی یونی ورسٹی فخر کر سکتی تھی۔ اسی لیے طالب علم کی حیثیت سے وہ آکسفرڈ کے مختلف کالجوں میں گردش میں رہتے اور تمام مشاہیر، اور صرف معروف پروفیسروں کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ انھوں نے ان مشاہیر میں سے کسی کو مایوس نہیں کیا۔ ان کا ذہن بہت درّاک تھا، ان کی دانش میں اعلیٰ درجے کی ہم آہنگی تھی، اور کبھی تناؤ کا شکار نہیں ہوتے تھے، ہمیشہ پُرسکوں اور خود اعتمادی سے پیش آتے، جس کو دیکھ کر لوگ ان کو عیّار اور متکبّر سمجھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امتحان کے دوران پروفیسروں میں سے ایک نے، جو بہت معزز اور محترم سمجھے جاتے تھے، ان سے پوچھا کہ ''مسٹر خلیلی، آپ نے سُنا ہوگا کہ مشہور انگریز مفسّرِ قانون فرانسس بیکن کے سامنے جج حضرات تخت کے نیچے کے شیر (یعنی جج ان کے تخت کو سنبھالنے والے پائے کی مثال تھے) کے مماثل ہوتے تھے۔ تو پھر یہ بتائیے کہ ایڈورڈ کوک جیمز کے زمانے میں، جو پہلی بار ان کے جانشین منتخب ہوئے تھے، ججوں کا کیا رُتبہ ہوتا تھا؟'' اور بلا کسی جھجک کے خلیلی کا (نہایت شاعرانہ) جواب تھا کہ ''کوک کے زمانے میں وہ بے زنجیر (یعنی آزاد) تھے۔'' اس بے جھجک جواب ہی پر ان کا امتحان ختم ہو گیا اور ان کے ممتحن حضرات نے مسکرا کر ''بہتر'' کہا اور ان کو اوّل درجے میں کامیاب قرار دے دیا۔

عباس خلیلی کو انگلستان بہت بھا گیا تھا۔ وہ انگلستان والوں کو پسند کرتے تھے اور یقیناً کچھ مالک مکان خواتین سے ان کی خوب صورت یادیں وابستہ تھیں۔ جو کچھ انھوں نے اپنے دوستوں کو بتایا اس کے مطابق وہ ان جیسے نوجوان آدمی پر بہت مہربان تھیں۔ اپنے دوستانہ پن اور وسعتِ نظر کی وجہ سے ان کے ساتھ کے طالبِ علم ان کو بہت پسند کرتے تھے، حالاں کہ وہ ورائے تعلیم، یعنی کھیل کود، تقریری مقابلوں یا کسی اور قسم کی غیر تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ چوں کہ اس زمانے میں ان کے والد کا کاروبار زوروں پر تھا اس لیے مالی طور پر وہ بہت خوشحال رہتے تھے اور اپنے آکسفرڈ کے دوستوں کے مقابلے میں کافی آسائش میں تھے۔ ان کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ جب

انھوں نے ایک نئی موٹر کار خریدی تو پٹرول کی ٹنکی لبالب بھر کر پُرانی کار کو کسی سڑک کے کنارے چھوڑ دیا اور کار کی چابی انجن کے تالے میں لگی چھوڑ کر چل دیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں، ۱۹۲۷ء کے مالی بحران کے زمانے میں، استعمال شدہ کاروں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی تھی۔ آج کل کی ماحولیات کے اعتبار سے یہ کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہوگی مگر اس کے باوجود یہ ایک دل چسپ بات ہے جس سے نوجوان خلیلی کی مالی حالت اور طالب علی کے زمانے میں انگلستان میں ان کے ان کے طرزِ زندگی کا پتا چلتا ہے۔

۱۹۳۲ء میں انگلستان میں ان کی تعلیم ختم ہوئی اور جب وہ مشکل سے چوبیس برس کے تھے انھوں نے ICS میں شمولیت اختیار کر لی، معیار کے ہر زاویے سے یہ ایک غیر معمولی کامیابی تھی۔

چوں کہ مدراس سے آئے تھے اس لیے ان کی پہلی تعیناتی مدراس ہی میں، بلکہ شہر کے باہر کے ضلعی دفتر میں ہوئی۔ وہ ایک عام سرکاری افسر کی سی زندگی گزار رہے تھے، جو ان کے نزدیک تنہائی کی زندگی تھی اور غالباً یہ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء کے اوائل کا واقعہ ہے کہ انھوں نے شادی کر لی۔ ان کا پہلا بیٹا ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ ان کی بیوی ان کے چھوٹے چچا کی اکلوتی اولاد تھیں۔ اور خاندان میں یہ اچھی جوڑی تھی۔ ان دنوں ان کی تنخواہ ۴۵۰ روپے ماہانہ تھی۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ خلیلی صاحب کے بیٹے ضیا خلیلی بتاتے ہیں کہ ''اس پر مستزاد یہ کہ ان کے دادا بھی مالی امداد کے لیے مستعد رہتے تھے مگر اتنی زیادہ نہیں اس لیے کہ چھوٹے شہروں میں رہ کر آپ کتنی رقم خرچ کر سکتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں یوں ہی ہوتا ہے کہ وہاں خاندان بھی ہیں اور خاندانوں کے درمیان تعامل بھی ہے۔ عموماً بے شمار بھائی بہن ہوتے ہیں، ان دنوں ہمارا خاندان برصغیر کا ایک مثالی خاندان تھا جس کے رشتے جنوب مشرقی ایشیا میں تقریباً ہر جگہ تھے۔ پورے خاندان میں صرف میرے والد تھے جو سرکاری ملازمت میں تھے۔ باقی تمام کسی نہ کسی طرح کے کاروبار میں تھے۔ دادا جان کی کمپنی کافی دنوں تک چلتی رہی، اس وقت تک جب ۱۹۴۰ء میں ان کا انتقال ہوا، اور ان کے بعد ان کی بیوی کا بھی۔ پورا خاندان مختلف نوعیت کے کاروبار میں تھا، جس میں جہاز رانی بھی شامل تھی۔

دادا جان کو جہاز رانی کا کاروبار پسند نہ تھا۔ مگر یہ ان پر تھوپ دیا گیا تھا، اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنے عم زاد کو جو سنگاپور میں تھے مالی مشکلات سے نجات دلائی تھی۔ عم زاد سنگاپور کے بڑے آدمیوں میں سے تھے، ربر کے باغات تھے، انگریز جن کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ ان کے پاس تیس، چالیس جہاز تھے۔ اس طرح وہ واقعی بڑے آدمی تھے۔ ان کے جہاز کوئن میری کے برابر کے نہیں تھے، مگر وہ سب گہرے سمندروں میں چلنے والے جہاز تھے، مال بردار اور مسافر بردار جن پر حج پر سفر کرنے والے جایا کرتے تھے۔ جب ان کا دیوالیہ ہونے لگا تو خاندان والوں کا خیال تھا کہ دادا کو ان کی امداد نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر دادا جان نے اصرار کیا کہ 'ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ دولت اچھے کاموں میں صرف کرنے ہی کے لیے ہوتی ہے۔ میں ان کو دیوالیہ نہیں ہونے دوں گا۔' اس طرح انھوں نے بینکوں کے قرض چکانے کے لیے رقم فراہم کردی، اور ان کے سارے جہاز واپس مل گئے، اس خاندان کو جسے جہازوں کی تجارت کے لیے چلانے کا تجربہ نہ تھا۔ اور یہ واقعی اس بات کا ثبوت ہے کہ خاندان کے مزاج میں، دادا جان جس میں شامل تھے، دولت کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔''

حقیقت یہ ہے کی اس واقعے کا سارے خاندان کے کاروبار پر اثر پڑا اور جب عباس خلیلی کے والد کا انتقال ہوا، سب بھائی الگ الگ ہو گئے مگر وہ خود سول سروس ہی میں رہے جس میں ان کو بہت لطف آتا تھا۔ ضیا کہتے ہیں کہ ''ہر شخص سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ایرانی النسل مسلمان ہونے کی وجہ سے ہم کسی بھی اعتبار سے مرکزی دھارے میں شامل نہیں، نہ ہندو، نہ انگریز، نہ پارسی نہ ہی ہم لوگ مسلمان اکثریت میں سے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کی افسر شاہی میں ساتھیوں سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مثال کے طور پر راج گوپال اچاریہ سے ان کے قریبی تعلقات تھے، جو ولبھ بھائی پٹیل کی طرح آزادی کے بااثر رہنماؤں میں گنے جاتے تھے، گاندھی جی، فولادی

اعصاب کے مالک 'راجاجی' کو اپنے ضمیر کا رکھوالا کہتے تھے۔ اُس وقت راجاجی آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل تھے۔ ان کا تعلق بھی مدراس سے تھا اس لیے خلیلی صاحب انھیں قریب سے جانتے تھے، بلکہ بعض حالات میں ان کی پیروی کرتے تھے۔ وہ راجاجی کو 'دیو نما انسان' کہتے تھے۔

مختلف اضلاع میں اسسٹنٹ کلکٹر کی حیثیت سے ملازمت کرنے کے بعد ان کو ۱۹۳۶ء میں مدراس حکومت میں 'انڈر سیکریٹری' بنا کر ترقیاتی محکمے میں تعینات کر دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ اپنی جانب مہاتما گاندھی کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب ہوئے۔ مہاتما نے دیہی ترقی کے لیے کئی ایک منصوبے طلب کیے اور ICS نے اس ضمن میں کئی منصوبے تیار کیے۔ ان میں سے ایک منصوبہ عباس خلیلی کے ذہن کی ایجاد تھا۔ یہ کھدر اور اس کی بنائی ہوئی اشیا پر انحصار کرتا تھا جو ایسے چھوٹے چھوٹے دیہی منصوبوں کے لیے تھا جس کے ذریعے انسانی قوت اور کارجوئی (enterprise) کو ترقی دینا مقصود تھا۔ دستکاری کی مصنوعات کو امدادِ باہمی اداروں کے ذریعے بازار میں پھیلایا جانا تھا۔ پیش کی جانے والی تجاویز میں سے خلیلی کی تجویز کو مہاتما نے چنا اور یہ بہت مشہور ہوئی۔ اور یہ شاید پہلا موقع تھا کہ ضلعی سطح سے اوپر ان کی اختراع کی پذیرائی ہوئی اور یہ پورے ہندوستان میں ایک ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئی۔

خلیلی مختلف اضلاع میں تین برس تک کام کرنے کے بعد دلّی میں تعینات ہو گئے۔ وہاں سے کلکتے اور پھر ۱۹۴۲ء میں صنعت اور تجارت کے ڈائریکٹر بنا کر مدراس بھیج دیے گئے۔ پھر وہ خوش قسمت رہے کہ وہاں ان کو پرکاش، گیری، راج گوپال اچاریہ جیسے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملے۔

کہا جاتا ہے کہ مدراس میں ان کی تعیناتی کے دوران کارگزاریوں کو آج تک یاد کیا جاتا ہے اور وہاں کے صنعتی اور تجارتی شعبوں میں، بالخصوص دستکاری کی چھوٹی صنعتوں کی ترقی میں جو کردار انھوں ادا کیا تھا اس کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کو مدراس کے پولی ٹیک انسٹی ٹیوٹ کے 'باپ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھی کی کوششوں کے باعث وہاں چمڑے کی صنعت اور مچھیروں کی امدادِ باہمی نے بہت کامیابی حاصل کی۔ اور صدی کے ساتویں عشرے تک تامل ناڈو میں ان کی ترقیاتی کوششوں اور ان کی محنت کوشی کو یاد کیا جاتا تھا۔

کلکتے میں ریلوے سیٹلمنٹ کمشنر کی حیثیت میں ان کا ٹریڈ یونینوں کے معاملات سے بھی سابقہ پڑا اور اس سلسلے میں اکثر سیاسی معاملات سے بھی۔ ایک بار ان کے سامنے بہت ہی مشکل مسئلہ آن پڑا تھا۔ انھیں ٹریڈ یونین کے ایک مقدمے میں منصف کے فرائض انجام دینے پڑے، انھوں نے دعوے کو رَد کر دیا پھر بھی ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب ان کے فیصلے کو ٹریڈ یونین والوں ہی کی جانب سے سراہا بھی گیا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب ان کی معاملت اور گفتگو اور لوگوں سے منصفانہ طور پر پیش آنے کے ہنر کی پذیرائی ہوئی۔ اس حد تک کہ ایک بہت ہی طاقت ور ہندو ادارے اور 'امرت بازار پتریکا' اخبار نے کلکتے میں عوامی سطح پر ان کی تعریف کی۔

اور اب وہ وقت ہے جب وہ آدمجی اور اصفہانی خاندانوں سے مسلسل رابطے میں رہتے ہیں۔ اصفہانی خاندان سے تو ان کی شناسائی اس وقت سے تھی جب وہ ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بالخصوص مرزا احمد اصفہانی سے جن کو 'بڑا صاحب' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، ان کی گہری دوستی تھی۔

ضیا خلیلی کو ایک چھوٹا سا دل چسپ واقعہ یاد ہے جو ان کے والد نے بیان کیا تھا۔ یہ واقعہ سول سروس کے کردار کے معیار پر روشنی ڈالتا ہے۔ آدمجی خاندان کے سربراہ نے ایک مخصوص سرکاری افسر کو کسی کام کے ہو جانے پر شکریے کی خاطر اپنے گھر مدعو کیا۔ مگر اس افسر نے دعوت کو رد کر دیا اور کہا کہ وہ ان کے گھر نہیں آسکے گا۔ آدمجی نے خلیلی صاحب سے شکایت کی اور وہ اس افسر سے ملنے گئے۔ انھوں نے نہایت شائستگی سے افسر کی تادیب کیا اور کہا کہ ملک کے کسی بڑے کاروباری کے گھر ایک پیالی چائے پی لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ افسر نے جواب میں کہا کہ میں نے ان کا کام اپنا فرض سمجھ کر کیا اور یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی جس کے لیے میں شکریے کا مستحق ہوتا۔ خلیلی صاحب نے کہا،

جب تک افسران اپنے اصولوں کی پابندی کرتے رہیں ان کو عام انداز میں زندگی گزارنی چاہیے۔ اس کے بعد ملاقات کا انتظام کیا گیا اور سب کچھ بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا گیا۔ اس واقعے سے ICS افسران کی دیانت داری کا اظہار ہوتا اور یہ بھی کہ ان دنوں کسی کے لیے کسی قسم کی رعایت کی گنجائش نہیں تھی۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران خلیلی صاحب کو امریکا میں ہندوستان کے اقتصادی کونسلر بنانے کی پیش کش کی گئی جسے انھوں نے قبول نہیں کیا اس لیے کہ ان دنوں ان کی والدہ بہت علیل تھیں، بلکہ بسترِ مرگ پر تھیں۔ لہٰذا انھوں نے اس وقت تک ہندوستان میں قیام کیا کہ ہندوستان کو آزادی مل جائے تا کہ وہ ہندوستان میں رہنے یا پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر سکیں۔

۱۹۴۷ کا مبارک سال ان کے لیے مشکلات کا زمانہ تھا۔ پاکستان ہجرت کروں یا ہندوستان ہی میں قیام کروں؟ مدراس چھوڑنے کی وجوہات کیا ہوں گی؟ ان کا خاندان رئیس تھا، عزت بھی تھی، وہاں فرقہ وارانہ فسادات بھی نہیں ہو رہے تھے۔ کچھ ہندو اور مسلمان خاندانوں نے ان کو ہندوستان میں رُکنے کے مشورے دیے مگر دوسروں نے ان کو قائل کر دیا کہ پاکستان کو ان کی خدمات کی ضرورت ہے۔ اپنی جائیداد چھوڑنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا، نہ اس سلسلے میں یہ عنصر ان کے فیصلے کو بدل سکتا تھا۔ عباس خلیلی نے اپنے دوست ومربی گوپال اچاریہ سے مشورے کے لیے رابطہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کے لیے اس سے بڑی خوشی کی کوئی اور بات نہ ہوگی کہ وہ ہندوستان ہی میں قیام کریں مگر چوں کہ وہ اس فیصلے کے لیے ان سے مشورہ طلب کر رہے ہیں اس لیے وہ یہی کہیں گے کہ ان کو پاکستان چلے جانا چاہیے اور یوں انھوں نے ان کو اپنی آشیرباد دے دی۔

ضیا نے کہا کہ ''پاپا نے بتایا کہ ان کا ہاضمہ خراب ہو رہا تھا، جو ایک مشکل فیصلے کے دباؤ کی وجہ سے تھا۔ جاؤں یا نہ جاؤں؟ یہ کسی قسم کے خود کار فیصلے کا معاملہ نہ تھا۔ اس لیے کہ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے ان پر کوئی دباؤ نہیں تھا۔ وہ سیاسی، انتظامی اور سماجی مسائل میں رچے بسے تھے۔ ان کے لیے کوئی مشکل نہیں تھی۔ مدراس میں فرقہ ورانہ فسادات بھی نہیں ہو رہے تھے، نہ خلیلی خاندان کے لیے نہ ہی کسی مسلمان طبقے کے لیے کوئی خطرہ تھا۔ یہ لوگ جنوبی ہندوستان کے ایک عزت دار خاندان کے فرد تھے جن سے نہ صرف سب واقف تھے بلکہ ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ صاف تھے، انھوں نے صاف ستھری تجارت کی اور جو کچھ کمایا وہ صاف ستھرے انداز میں۔ وہ اسمگلر نہیں تھے، کامیاب تاجر تھے اور عملی طور پر پورے ملک میں ان کے تعلقات تھے، تو پھر پاکستان کیوں جائیں؟ ان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں تھا، اور سب کچھ پیچھے چھوڑ جانے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا، سوائے اس کہ ان کے جذبات بھڑک رہے تھے اس تصور سے کہ بالآخر دنیا میں ایک اسلامی مملکت وجود پا رہی تھی اور اس کی بنیاد میں اپنے حصے کی خدمات پیش کرنا چاہتے تھے، پاکستان کو ایک مستحکم ریاست دیکھنا چاہتے تھے جہاں کروڑوں افراد رہنے والے تھے۔ ان کے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ وہ پاکستان کو مسلمانوں کی شناخت کے طور پر دیکھتے تھے اور ان کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے بیشتر جاننے والے یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ان جیسا انسان صرف اپنے تصور کی تجسیم کے لیے بھلا کیوں سب کچھ تج دینا چاہتا تھا جس کے بچ جانے کے امکانات بہت کم تھے۔

جس وقت یہ فیصلہ کیا جانا تھا عباس خلیلی بڑے دولت مند انسان تھے۔ ان کے والد نے ورثے میں مدراس کی ماؤنٹ روڈ کے تجارتی علاقے میں ایک بہت بڑی عمارت چھوڑی تھی جس میں سو ڈیڑھ سو دکانیں تھیں۔ اس زمانے میں یہ عمارت اندازاً کروڑوں ڈالر کی تھی۔ مگر جب انھوں نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تو ان کے لیے اتنی ساری دولت کو خیر باد کہہ دینا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ انھوں نے اتنی ساری جائیداد اس لیے پیچھے چھوڑ دی کہ ان کے خیال میں یہ محفوظ ہاتھوں میں تھی۔ نہ انھوں نے اس کو فروخت کرنے کی کوشش کی نہ ہی مختار نامہ وغیرہ لکھا۔ وہ اس خیال میں تھے کہ وہ صرف اپنے پڑوسی ملک جا رہے ہیں، جیسے کہ وہ ایران، برما یا سنگاپور جایا کرتے تھے۔ تو پھر پاکستان کیوں نہیں؟ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ ایک دن پاکستان اور ہندوستان آمنے سامنے صف آرا ہوں گے۔ جنگ کا تو تصور بھی

نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تمام مسلمانوں کی طرح عباس خلیلی بھی پاکستان کو اپنے وطن کے طور پر دیکھتے تھے جہاں وہ اپنی سہولت کے مطابق آ جا سکتے تھے۔ حتیٰ کہ جناح صاحب نے بھی بمبئی کے مالا بار ہل میں واقع اپنا مکان فروخت نہیں کیا تھا، بہ ظاہر اس خیال سے کہ وہ جب چاہیں گے ہندوستان پاکستان کے درمیان سفر کیا کریں گے۔ خلیلی صاحب نے غلام محمد اور چودھری محمد علی سے صرف ایک بات پوچھی تھی کہ کیا پاکستان وہ سرزمین ہوگی جہاں لوگ باعزت طور پر کام کاج کر سکیں گے؟ ان کے مثبت جواب کی بنا پر انھوں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ بہت شروع ہی میں، اگست یا ستمبر کے مہینے میں، پاکستان آ گئے تھے اور فوراً ہی کام شروع کر دیا تھا۔ انھیں اس کمیٹی کا رُکن بنا دیا گیا تھا جسے پاکستان کی معاشی اور صنعتی ترقی کے لیے ہدف متعین کرنے کا مسودہ تیار کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ جو دستاویز تیار کی گئی تھی وہ ان افکار اور خیالات کا مجموعہ تھی جن کی بنا پر ملک کو معاشی اور صنعتی ترقی دی جا سکے، اور اس میں مستقبل میں سرکاری اور ذاتی معاشیات کے بارے میں بنیادی مشورے بھی دیے گئے تھے۔ وزارتِ صنعت کے جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے ذاتی حیثیت میں بھی بہت قابلِ داد کام کیے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت اعلیٰ فکر کے آدمی تھے اور اس اعتبار سے ان کو یاد رکھا جائے گا۔ پاکستان ہجرت پر انھیں کبھی افسوس نہیں ہوا۔ وہ اپنے اس فعل سے بہت مطمئن اور مسرور تھے، باوجود اس کے دو 'برادر' ملکوں کے درمیان کے حالات کی وجہ سے ان کو بہت بڑی ذاتی قربانیاں دینی پڑی تھیں۔

۱۹۵۲ء میں انھیں ڈائریکٹر جنرل سپلائی اور ڈیولپمنٹ، اور سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد کے نوآبادکاری بورڈز کے چیئرمین کی اضافی ذمے داریاں بھی سونپ دی گئی تھیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ان کو انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کمشنر کی حیثیت سے مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا تھا جہاں ان کو صنعتی ترقیات کی رہنمائی کرنی تھی۔ انھیں جلد ہی اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ تیسری دنیا میں کسی بھی قسم کی صنعتی ترقی کے لیے توانائی سب سے اہم ہوگی۔ سو انھوں نے کرنافلی ڈیم کا خیال پیش کیا جس کے بعد توانائی مہیا کرنے والے دوسرے اور تیسرے اسٹیشن کا منصوبہ تیار کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ صرف صنعتی ضروریات ہی کے لیے نہیں، ہر جگہ توانائی موجود ہونی چاہیے۔ لوگوں کو اپنے گھروں، اپنی سلائی کی مشینوں کے لیے بھی توانائی ملنی چاہیے۔ یہ بات وہ بار بار دہراتے تھے اور ان لوگوں سے منوانے میں کامیاب بھی ہوگئے جن کے پاس ایسے فیصلے کرنے کے مکمل اختیارات تھے۔ مشرقی پاکستان میں وہ بہت مقبول تھے۔ وہاں ان کو کئی پرانے دوست مل گئے تھے اور بہت سے نئے دوست بھی بن گئے تھے۔

۱۹۵۴ء میں وہ وزارتِ صنعت کے سکریٹری کی حیثیت سے کراچی واپس آ گئے۔

میرے بہت پیارے دوست اور مشہور صحافی اردشیر کاؤس جی کے مطابق، ''وہ بہت اچھے دن تھے۔ فضا خوشبوؤں اور حرکت سے معمور ہوا کرتی تھی۔ صنعت اور تجارت کے شعبے مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ ان وزارتوں کے وفاقی سکریٹریوں کے دفاتر سندھ ہائی کورٹ کی پہلی منزل پر تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اور میرے والد کئی بار ان چار اچھے اور ذہین لوگوں سے ملنے گئے تھے۔ ان میں خلیلی تھے، ان کے دوست کرامت اللہ جو وزارتِ تجارت کے سکریٹری تھے، اور ان کے معاون سکریٹری شجاعت عثمان علی اور شیخ محمد یوسف ہوا کرتے تھے۔

اس زمانے میں سرکاری دفتر جانا کتنا مختلف تجربہ ہوتا تھا۔ ہلکے کردار کے پی اے وغیرہ کا وجود نہیں تھا جن کے درمیان سے رینگ کر نکلنا ضروری ہوتا۔ سکریٹری اور ان کے افسران کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ ''آیئے، آیئے، رُستم اور اردشیر'' خلیلی ہمارا استقبال کرتے ہوئے کہتے۔ ''ہم پر یہ مہربانی آج کیسے ہوئی؟'' (خلیلی ان چند لوگوں میں سے تھے جو میرا نام بالکل اُسی طرح لیتے جیسا کہ ہماری زبان میں لینا چاہیے، ساسانی انداز میں نہ کہ انگریزی انداز میں جو ہمارے فرقے میں عام ہو چکا تھا) عوام سے، وہ جن کے خادم تھے، ان کا اندازِ گفتگو، آج کی افسر شاہی کے مقابلے میں، ایسے تھا جیسے سپید کے مقابلے میں سیاہ۔ ہمیشہ لوگوں کے مسائل حل کرنا، ان کی مدد کرنا نہ کہ روڑے اٹکانا جیسا کہ آج کل کے افسران کا شیوہ ہے۔ جہاز رانی کا محکمہ وزارتِ تجارت کے ماتحت تھا مگر ہم ہمیشہ اپنے مسائل سلجھانے کی

غرض سے کرامت سے خلیلی کے دفتر میں ہی ملاقات کرتے۔ اور سب کچھ حل ہو جایا کرتا تھا۔

خلیلی کا تبادلہ وزارتِ آبادکاری اور محنت میں ہو گیا تھا اور اس کے بعد وزارتِ تجارت میں۔ PIDC کی کاغذی کارروائی انھی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور انھوں نے ہی چیئرمین کے لیے غلام فاروق کا نام پیش کیا تھا۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ میں وہ بہت دل چسپی لیتے تھے اور حبیب رحمت اللہ کو KDA کا چیئرمین انھی نے بنوایا تھا۔ انھوں نے ایک اتنے اہم منصوبے پر ایک غیر سرکاری شخصیت کے تقرر کے حق میں پُر زور دلائل دیے تھے۔

جو بھی ان کی متحرک اور جوشیلی شخصیت سے متعارف ہوتا، اس کو اندازہ ہو جاتا کہ جو کچھ یہ شخص کرتا ہے پورے جوش و جذبے سے، اور وہ صحیح وقت پر صحیح قدم اٹھانے میں یقین رکھتا ہے۔ انھوں نے شبہات کو کبھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا، اپنے اطراف خود اعتمادی اور مہارت کا ایک نوری ہالا بنا رکھا تھا جس کی وجہ سے جو بھی ان سے گفتگو کرتا ان ہی کا ہم نوا ہو جاتا۔ ایک ہی وقت میں مختلف النوع منصوبوں کو نمٹانے کا ہنر ان کو خوب آتا تھا اور وہ ہمیشہ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے جو ان کے منصوبوں میں ان کی مدد کر سکیں۔ انھوں نے کبھی مذہب، نسل یا فرقے کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز نہیں برتا۔ وہ ایسے ساتھی چاہتے تھے جو کر گزرنے کے اہل ہوں۔ ضروری نہیں کہ ایسے لوگ صرف آکسفرڈ، کیمبرج یا ہارورڈ، یا کسی اور یونی ورسٹی سے آئیں۔ وہ ہر ایک کو موقع فراہم کرنے پر تیار رہتے تھے۔ ان کا قول تھا "کام دو اور آزماؤ" اور ان لوگوں کے لیے جنھیں انھوں نے مدراس میں لیڈر انسٹی ٹیوٹ میں ذمے داریاں سونپی تھیں وہ چالیس برس بعد 'بڑا صاحب' بن گئے تھے۔

ایسے لوگ اپنے ہدف کو حاصل کرنے میں دوستوں کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ عباس خلیلی کو ایسے بہت سے دوست ملے تھے۔ سب بارسوخ، اعلیٰ درجے کے سرکاری افسر، سیاست داں، صنعت کار اور زندگی کے ہر شعبے کے لوگ۔ پاکستان کے ابتدائی زمانے میں "آؤٹ والے" ملک پر حکمران تھے۔ غلام محمد، چودھری محمد علی وغیرہ۔ آئی سی ایس افسران ان کے مقابلے میں کمتر سمجھے جاتے تھے۔ مگر عباس خلیلی ایسے معاملات میں کبھی گھبراتے نہیں تھے، وہ ان لوگوں سے دوستیاں گانٹھنے کے راستے نکال لیتے تھے۔ ضیا خلیلی کہتے ہیں کہ "جب آپ کسی ایسے صوبے میں اقلیت کے فرد کی حیثیت میں کام کر رہے ہوں جہاں آپ کی پوری آبادی بھی اقلیت میں ہو تو آپ کو ان لوگوں سے تعامل کا فن سیکھنا ہوتا ہے۔ آپ کو اکثریتی طبقے سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ چوں کہ مدراس میں ہندو اکثریت میں تھے، وہاں اکثریتی طبقے کے خلاف امتیازی برتاؤ کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ہمیں وہاں مسائل کیوں درپیش نہیں ہوئے تھے؟ نہ پنجابیوں اور نہ بنگالیوں کے ساتھ؟ ہمیں سچ مچ کسی سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی اس لیے کہ ہم انھیں اپنے ہی جیسا سمجھتے تھے، دوستیاں کرتے تھے، ان کو اچھے کارکن سمجھتے تھے اور ان کی مدد کرتے تھے۔ اور ان میں سے اگر ہمیں کوئی پسند نہ آتا، ہم اس سے الگ ہو جاتے۔ درحقیقت ایسے رویے سے آپ ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھ جاتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ 'جیو اور جینے دو' کی ابتدائی تربیت ہی تھی جس کی وجہ سے میرے والد جس کے چاہتے اس کے دوست بن جاتے۔"

صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے کو اکثر 'پرمٹوں اور لائسنسوں'، 'جان پہچان اور رسوخ'، 'اقربا پروری اور حلقہ بندی' کا دور کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں درآمد اور برآمد کے ادارے، تجارتی اور سرمایہ کاری کے بینک حتیٰ کہ انشورنس کمپنیاں بھی صرف مٹھی بھر خاندانوں کے قبضے میں تھیں۔ اور جب خلیلی وزارتِ تجارت میں ہوتو اس کے کارِ منصبی میں سے ایک منصب لائسنسوں کا اجرا ہوگا۔ بڑی نازک اور کرتب والی ذمے داری جس میں ہر طرف سے اثر اندازی اور جانب داری کے لیے دباؤ ہوتا ہوگا۔ ایسے میں ان کا نعرہ تھا 'لائسنس سب کے لیے' اور ان میں اتنی ہمت تھی کہ وہ اپنے وزیر سے کہہ دیتے تھے کہ "جناب مجھے معلوم ہے کہ آپ کو کچھ لوگوں کو خوش کرنا پڑتا ہے، سو آپ مجھے بتادیں اور میں ان کا خیال رکھوں گا۔ اور اگر آپ اپنے کسی پسندیدہ کو لائسنس دینے کے خواہش مند ہیں تو اس کی بھی نشاندہی کر دیجیے، ہم ان کو بھی ناخوش نہیں کریں گے مگر ہماری پالیسی کو تو مت بگاڑیے، ہمیں اپنی پالیسی کو عمل میں تو لانے دیجیے" دوسرے الفاظ میں یہ ایک حقیقت پسندانہ

اور نتائجی طریقۂ کار تھا جس میں سیاستدانوں سے مقابلہ نہیں ہوتا تھا۔ اور ان کی کامیابی نے ان کو صحیح ثابت کر دیا تھا، جیسی کہ وہ اور ان کے ساتھی سمجھتے تھے، اسی میں اپنے ملک کی بھلائی بھی تھی۔

ایک مرحلے پر وہ آبادیات کے محکمے کے ذمے دار تھے اور ہندوستانی حکومت سے ہجرت کرنے والوں کی جائیداد کے حتمی مالی لین دین کے طے کرنے میں آلۂ کار رہے تھے۔ اس مرحلے پر ان کی دیانت، اُجلے پن اور غیر جانب داری کا کڑا امتحان تھا۔ انھوں نے خود کو کھرا ثابت کر دیا جب ان کو ان کی جائیداد کا معاوضہ صرف ایک لاکھ روپے ملا۔ جتنی جائیداد وہ ہندوستان میں چھوڑ کر آئے تھے اس کے مقابلے میں یہ رقم کچھ بھی نہ تھی جب کہ، جیسا کہ سب کو علم ہے، لوگوں نے خوب دولت بنائی تھی۔ مگر انھیں اس کی بالکل پروا نہیں تھی۔ ان کے نزدیک وہ سب تاریخ تھی، ماضی تھا۔ اتنی بڑی جائیداد کے چلے جانے نے ان کو کبھی کبیدہ خاطر نہیں کیا۔ ترقیات، تصورات، نئی نسل کے لیے مواقع، ملک کے لیے ایک روشن مستقبل، بس یہی کچھ ان کے ہدف تھے اور دن رات، اپنی ذاتی زندگی سے لاپروا، وہ اسی کے حصول کے لیے کوشاں رہتے۔ ان کی بیوی اور سات بچے، سب ۱۹۵۴ء میں کراچی چھوڑ کر انگلستان چلے گئے اور اپنے خوب صورت مکان Seven Bricks (ہر بچے کے نام کی ایک اینٹ) میں عباس خلیلی کنواروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

اس طرح ان کے پاس بہت وقت ہوتا تھا جس کو وہ اپنے ملک اور اپنے دوستوں کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ اگرچہ سول سروس کے لیے ان کی تربیت نظم و ضبط اور اخلاقیات کے کڑے اُصولوں کی پاسداری پر ہوئی تھی مگر وہ کسی بھی مسئلے کے حل کے لئے نتائجی انداز میں سوچتے اور حل نکالنے کی کوشش کرتے۔ کوئی بھی اڑچن آجائے، کسی سرکاری افسر کی انا کا مسئلہ ہو، عباس جیسا مددگار دوست ہمیشہ خدمت کے لیے حاضر۔ وہ قانونوں کو کبھی موڑتے نہیں تھے مگر ان کی کوشش ہوتی تھی کہ 'سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'۔ اگر آپ تاجر قوم کو صنعت کار بنانا چاہتے ہیں تو ان سب کو، جو کارخانے چلاتے ہوں، قید کر کے چابی کہیں دور نہیں پھینک سکتے۔ اگر آپ ترقی دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو لوگوں کو لبھانے کے لیے بھی کچھ کرنا ہوگا، صرف ڈنڈے ہی سے کام نہیں نکلتے۔

ظاہر ہے، خلیلی اچھی طرح جانتے تھے کہ نئے نویلے صنعت کار غلط کاری میں ملوث ہیں، اور بہت کچھ کرتے ہیں جو قانون اور قاعدے کے مطابق نہیں ہوتا مگر ان کو یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ کچھ ایسے دیوانے بھی ہیں جن کو اگر تحفظ دیا جائے، مواقع فراہم کیے جائیں، ان کی کارکردگی پر نظر رکھی جائے، غلطی پر فہمائش بھی کی جائے مگر ایسی بھی نہیں کہ ان کو برباد کر دے، تو ترقی بھی ہوگی اور ملک کا مقدر ایک تابناک معاشیاتی مستقبل ہوگا۔

ان سب خصوصیات نے ان کو بے حد مقبول بنا دیا تھا۔ اس قدر کہ جب ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے ملک کا انتظام سنبھال لیا تھا، ان کو وزارتِ تجارت کا سیکریٹری بنا دیا گیا تھا، جس کی باگ ڈور ذوالفقار علی بھٹو جیسے کم عمر وزیر کے سپرد تھی۔ انھوں نے اس نوعمر وزیر کو بہت ذہین، من چلا مگر، مہذب پایا۔ جب بھی خلیلی ان کے دفتر میں داخل ہوتے وہ احتراماً کھڑے ہو جاتے۔ ان کی موجودگی میں وزیر صاحب نے کبھی بدتمیزی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ خلیلی نے خود اس ایک برس کے عرصے کو اپنی ملازمت کا سب سے خوش گوار وقت کہا ہے۔ خلیلی صاحب کو ایوب خان، کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی جن کو وہ ۱۹۵۴ء سے جانتے تھے جب ان کو وزارت دفاع کے سیکریٹری کے طور پر مانگا گیا تھا، بعض وجوہ کی بنا پر جو ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ یہ ایوب خان کی مکمل پشت پناہی تھی جس کی وجہ سے خلیلی صاحب نے کامیابی سے بونس ووچر اسکیم کا نفاذ کیا تھا جو German Bundesbank کے سابق صدر Herr Vocke نے تجویز کیا تھا تاکہ ملک میں طاقت ور برآمدی صنعت کا نظام قائم ہو سکے۔ عالمی بینک کے سابق افسر اور اس وقت کے وزیر مالیات شعیب صاحب لاتعلق، مزاحم، اور منصوبے کے خلاف تھے مگر خلیلی صاحب نے ایوب خان کی آشیرباد حاصل کر لی جنھوں نے کہا تھا، ''اگر آپ اس کو سمجھتے ہیں تو بسم اللہ۔ شروع کیجیے۔'' اس کو وقعت کہتے ہیں۔ ایوب خان کے دور میں ان کو ایک برس تک، جب وہ ملازمت میں رہے ناقابلِ مثال اختیارات حاصل تھے۔ مگر اتنے سارے اختیارات، اتنے

سارے دوست تھے تو، حسد اور رقابت تو ہونی ہی تھی۔

۱۹۵۹ء میں ان بارہ آئی سی ایس افسروں میں سے، جنھوں نے امیدوں کی اس نئی مملکت کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے اور چلانے کی نیت سے ہندوستان میں اپنے گھر بار چھوڑے تھے، گیارہ کو مارشل لا کے افسران نے گھر بھیج دیا۔ ایوب خان نے نہیں، نہ فوج کے جنرلوں نے، بلکہ ایک مختصر سی کمیٹی نے۔ فیصلے کی بنیاد ایسی مبہم وجوہات تھیں کہ پاکستان کی اہم شخصیات کے نزدیک یہ ایک سانحہ تھا جو مستقبل میں ملک کی ترقی کے لیے بڑی رُکاوٹ تھا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ پردہ اندازی (screening) کا یہ عمل خالصتاً رشک وحسد کی شہ پر اور مردم آزاری کے جذبے کے تحت کیا گیا تھا۔

خلیلی صاحب پر یہ الزام تھا کہ انھوں نے طاقت کے غلط استعمال سے گروہ بندی کی اور اپنا ذاتی حلقہ اثر بنالیا تھا۔ یہ بھی کہ ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی کی ادائیگی سے صنعت کاروں کے انکار کی جزوی ذمے داری ان پر عائد ہوتی تھی۔ انھوں نے الزام کے جواب میں کہا تھا، ''میرا کام صنعت کی وزارت کے سیکریٹری کی ذمے داریاں نبھانا تھا۔ میرا کام بنانا تھا۔ مجھے اس فرض کی ادائیگی کے لیے لوگوں کو اکٹھا کرنا اور ان کو ترقیات کے لیے ترغیبات دینا تھا جو محنت کرنے پر راضی تھے۔ مجھے ایک ولیکا کی اس لیے حمایت کرنی تھی کہ وہ ایک کارکن تھا، ایک فینسی کی اس لیے کہ وہ بھی ایک کارکن تھا، مجھے ان سب کی امداد کرنی تھی اس لیے میرا کام پاکستان کو بنانے میں مدد کرنا تھا۔ میرا یہ کام نہیں تھا کہ میں ان سے ٹیکس وصول کروں۔ یہ کام وزارتِ مالیات کا تھا۔'' یہ سب کچھ وہ عموماً کہا کرتے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ان کا فرض تھا کہ ملک آگے بڑھے، اور ان لوگون کے خلاف اخلاقی فیصلے کرنا ان کا کام نہیں تھا جو ایک ہمالیائی کوشش میں ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کی جانب داری نہیں کی۔ انھوں نے کبھی کسی بھی نسلی گروہ کو ترقی کرنے سے نہیں روکا۔ جنوبی ہندوستان سے حئی سنز کے، میمن آدمجی اور ولیکا کے آغا خانی امیر علی فینسی کے اور پنجابی سہگل کے راستے داخل ہوئے تھے۔

اور اگرچہ سب جانتے تھے یہی سب کچھ سچ ہے، اور باوجود اس کے کہ طاقت کے اس مرکز میں ان کے بھی کئی دوست شامل تھے، ان کو اس لیے جانا پڑا کہ وہ اس حلقے میں شامل تھے جس کو بہرحال فارغ کیا جانا تھا، کہ وہ بہت طاقت ور ہوتا جا رہا تھا۔

فارغ کیے جانے والے ساتھیوں میں سے کچھ اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ وہ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ کرامت اللہ کی تلخی کبھی نہیں گئی۔ وہ انگلستان چلے گئے تھے مگر انتقال سے کچھ دنوں قبل پاکستان واپس آگئے تھے۔ انھوں نے وصیت کر رکھی تھی کہ وہ پاکستان میں دفن نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ وہ اپنی قبر کے لیے اس ملک کی زمین غصب نہیں کرنا چاہتے تھے جس نے ان کو رَد کر دیا تھا۔ ان کا جسدِ خاکی انگلستان بھیج دیا گیا تھا جہاں وہ دفن ہوئے۔

غیر معمولی حد تک رجائیت پسند خلیلی نے نجی شعبے میں قسمت آزمائی کی، اپنی صنعتیں اور کئی ادارے قائم کیے۔ ان میں مشہور ادارے کینیڈا ڈرائی، ایسوی ایٹڈ کنسلٹنگ انجینیئرز تھے۔ چٹاگانگ میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ ایسٹرن ریفائنری کے نام سے قائم کیا جس کے ساتھ برما ایسٹرن کے نام سے تیل کی فروخت کا ایک مربوط نظام قائم کیا جس کے وہ چیئرمین بنے۔ یہ ایک بڑا منصوبہ تھا جو شاید ان کی زندگی کا سب سے اہم کام تھا۔ اس وقت کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ملک کے دونوں بازوؤں کے علیحدہ ہونے کی پیشین گوئی کرسکتا جس کے باعث اپنی ذاتی زندگی میں ایک بار پھر عباس خلیلی ایک بڑے نقصان سے گزرے۔ یہ منصوبہ زور شور سے اپنی کامیابی کی طرف گامزن تھا اور وہ اس کی ممکنہ کامیابی کے بارے میں بہت پُر امید تھے کہ دسمبر ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا روح فرسا واقعہ رونما ہوا اور خلیلی صاحب کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ انھوں نے اس واقعے کو بڑی بہادری سے سہا مگر مجھے یقین ہے کہ اپنی تنہائیوں کے لمحات میں انھوں نے زندگی کے بدنما رُخوں اور اس کی منطق بارے میں ضرور سوچا ہوگا کہ ہندوستان کے تناظر میں وہ جس مقام کے حق دار تھے، وہ ان کے مقدر میں نہ تھا۔

بہرحال ایسٹرن ریفائنری کی تکمیل سے کچھ برس پہلے ۱۹۶۰ء میں ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا جو ان کی تہ در تہ صلاحیتوں کے لیے

ایک بڑی للکار سے کم نہ تھا۔ مشرقی پاکستان کے ایک بڑے، بارسوخ صنعت کار اور خلیلی صاحب کے پرانے دوست مرزا احمد اصفہانی نے، جن کے بھائی حسن، قائدِ اعظم کے معتمد ساتھیوں میں سے ایک تھے، پاکستان کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی، ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی، کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کے لیے ان کی امداد چاہی تھی، جس کے دگرگوں احوال سے اس وقت تک صرف چند ہی لوگ واقف تھے۔ 'بڑا صاحب' چاہتے تھے کہ وہ (یعنی خلیلی صاحب) پاکستان کی سب سے بڑی مقامی کمپنی کے حالات کو درست کرنے میں مدد دیں۔ اس کمپنی کے صدر دفاتر قمر ہاؤس میں تھے، جو پورٹ ٹرسٹ کی عمارت سے بالکل متصل تھی۔ صنعتِ تعمیر کے اعتبار سے قمر ہاؤس ایک بڑی اثر انگیز عمارت تھی بحری جہاز سے کراچی آنے والے لوگوں کا جس سے پہلا واسطہ پڑتا تھا۔ کمپنی کی مالی حالت اور اس کی وجوہات کے بارے میں ایک مختلف باب میں تفصیلات بیان کی جا چکی ہیں۔ اصفہانی خاندان ایسٹرن فیڈرل کے ابتدائی دنوں سے اس سے منسلک تھا اور مرزا احمد اصفہانی، عبدالرحمن صدیقی صاحب کے بعد، جو کمپنی کے مؤسسین میں سے تھے، اس کے چیئر مین بن چکے تھے۔ اصفہانی خاندان کے پاس ای ایف یو کے اکثریتی حصص تھے اور اگر چہ 'بڑا صاحب' ۱۹۵۱ء میں چیئر مین کا عہدہ چھوڑ چکے تھے اور ان کی جگہ جناب غلام حسین شیرازی لے چکے تھے، پھر بھی کمپنی کے مسائل میں وہ ذاتی دل چسپی رکھتے تھے۔

۱۹۵۰ء کے عشرے میں ای ایف یو کے لندن میں ہونے والے نقصانات اپنے عروج پر پہنچ رہے تھے۔ کمپنی کے جنرل منیجر جناب کے ایف حیدر لندن کے قرض خواہوں کو منانے میں اپنی کوششیں تمام کر چکے تھے۔ ساری کوششیں بے کار ثابت ہو چکی تھیں۔ حیدر صاحب اس بھونچال کے عین وسط میں کمپنی چھوڑ کر پاکستان انشورنس کارپوریشن میں جا چکے تھے۔

عباس خلیلی نے پہلے تو سارے معاملے کا خود تجزیہ کیا اور بعد میں اپنے پرانے ساتھی عثمان علی سے مشاورت کی، جو ان دنوں وزارتِ تجارت میں سیکریٹری تھے۔ خلیلی صاحب نے اس مشکل چیلنج کو قبول کیا مگر اس شرط پر کہ اصفہانی خاندان کمپنی پر اپنے غلبے سے دست بردار ہو کر روشن علی بھیم جی کو حیدر صاحب کی جگہ جنرل منیجر بنانے پر راضی ہوگا۔

اپنے حصص کی فروخت، اس پر غلبے سے دست برداری اس لیے ضروری تھی کہ اس نوع کے مالی ادارے کو ایک وسیع ملکیتی ادارے کی صورت میں نئے سرے سے جمایا کیا جائے۔ خلیلی صرف ایک شخص یا خاندان کی ملکیت کے مقابلے میں جو کمپنی کو اپنی خاندانی جائیداد کی طرح چلا رہا ہو، وسیع ملکیتی کیفیت کو، پاکستان کے تناظر میں، بہتر سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں پیشہ ور ماہرین کے ہاتھوں انتظام ممکن نہیں ہوتا اگر ادارے پر کسی خاندان کی اجارہ داری ہو اور وہی اس کے بارے میں فیصلے کر رہا ہو۔ جہاں وہ اکیلے فیصلے کرنے والے کی حیثیت میں ہوں تو اپنے بارے میں بھی وہ اسی طریقے کو بہتر جانتے ہیں۔ اسی لیے ایسٹرن ریفائنری میں انھوں نے مختلف مقامات سے دس مختلف حصصی ملکیت رکھنے والوں کو ڈائریکٹر کی حیثیت سے شریکِ کار کیا تھا۔

'بڑا صاحب' کو اگر چہ ایسی صورتیں پسند نہیں ہوتی تھیں مگر اس مقام پر ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں تھا سوائے اس کے کہ خلیلی صاحب کی شرائط کو قبول کر لیں۔ روشن علی بھیم جی کا تقرر بھی خلیلی صاحب کی شرائط کا حصہ تھا۔ اصفہانی خاندان کے لوگ اس شرط کے بارے میں بہت خوش نہ تھے اس لیے کہ وہ بھیم جی کو اچھی طرح جانتے نہ تھے۔ مگر بھیم جی کے بارے میں، ان کے سیاسی پس منظر ان کے دوستوں کی تفصیلات وغیرہ کی جو معلومات ان کے سامنے آ رہی تھیں ان کے پیشِ نظر ان کو اس کڑوی گولی کو فوراً نگل لینا ذرا مشکل تھا۔ عثمان علی، بھیم جی سے اچھی طرح واقف تھے اور کسی حد تک خلیلی بھی انھیں جانتے تھے اور ان کو ایک وسیع النظر اور کرشماتی شخصیت کا حامل سمجھتے تھے۔ ایک شخصیت جو اپنی ابلاغی ہنر مندی اور پیشہ ورانہ صلاحیت کے لیے مشہور تھی۔ یکم جنوری ۱۹۶۱ء کو ایک معاہدہ طے پا گیا، خلیلی اور بھیم جی نے ای ایف یو کی زمامِ اقتدار سنبھال لی اور کمپنی کی کشتی کو طوفان سے نکالنے کے چیلنج کو قبول کر لیا۔ اصفہانی خاندان کے فروخت کیے جانے والے حصص بھیم جی سے قربت رکھنے والے ARAG خاندان نے خرید لیے اور کچھ حصہ عوام میں فروخت کر دیا گیا۔

سب سے پہلا کام جو بھیم جی اور چیئر مین خلیلی کے سامنے تھا وہ لندن کے قرض خواہوں سے معاملہ طے کرنا تھا۔ دونوں میونخ کے راستے لندن کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ بھیم جی پہلے جرمنی گئے جہاں کمپنی کے ری انشورر میونخ ری سے ملاقات طے تھی۔ غیر متوقع اور نا امیدی کے کیفیت تھی پھر بھی ان کو میونخ ری میں خوش آمدید کہا گیا اور بالآخر میونخ ری نے کمپنی کے نقصانات کو پورا کرنے کے لیے مالی امداد کا وعدہ کرلیا۔ اس وعدے کے ساتھ وہ لندن پہنچے۔

خلیلی کے صاحب زادے کی یادوں میں اتنا تھا کہ وہ سردی کا موسم رہا ہوگا اس لیے کہ خلیلی صاحب اوورکوٹ میں نکلتے تھے اور اسی میں واپس گھر آتے تھے۔ ''مجھے یاد ہے کہ یہ سردی کا زمانہ تھا اور فضا میں برف باری کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں ان دنوں اسکول میں تھا اور اتنا یاد ہے کہ وہ لوگ چار یا پانچ دن آتے جاتے رہے تھے۔ لندن میں یہ ایک مختصر قیام تھا خاص اس مسئلے کے لیے۔ والد صاحب بہت پُرسکون نظر آتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ جب آپ کی پشت دیوار سے لگی ہوئی ہو تو آپ کو صرف آگے ہی جانا ہوتا ہے۔ اور اپنے بچاؤ کے لیے ایک واضح تصویر کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو، لندن کے قرض خواہوں کے لیے ایک سادہ سی تجویز تھی 'اسے قبول کیجیے یا سب کچھ بھول جائیے'۔ اور اگر آپ اس کو قبول نہیں کرتے تو پھر ہم ختم اور کچھ بھی باقی نہیں رہے گا، بس یہی ایک حقیقت ہوگی۔ اور اگر آپ راضی ہیں تو آنے والے برسوں میں ہم دونوں کو ایک ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع بھی ملے گا اور آپ ہم سے کچھ کما بھی سکیں گے۔ مگر ہماری موت کی صورت میں آپ کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ اس طرح انھوں نے ہم لوگوں کو حالات سے آگاہ کیا تھا۔ لندن کے قرض خواہوں نے تجویز کو قبول کر لیا، خاصی رقم معاف کردی اور اپنے تعلقات کو دوبارہ استوار کرلیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ای ایف یو کے مردہ جسم میں جان پڑ گئی ہے۔''

کیا ان جیسے بے حد مستعد اور جذباتی کارکنوں سے بہتر کوئی ٹیم بنائی جاسکتی ہے؟

خلیلی حکمتِ عملی کی سوچ بچار کے اور بھیم جی ان کے تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے ذمے دار تھے۔ ان کا مشترکہ نظریہ تھا کہ اس کو اپنی کمپنی تصور کیجیے۔ اپنائیت کا تصور بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ دونوں 'Seven Bricks' نامی مکان میں بیٹھ کر منصوبے بناتے اور گپ بازی بھی کرتے۔ ضیا کے مطابق روشن علی بھیم جی کا کام ابلاغ تھا۔ عوام سے رابطے کے معاملے میں وہ بہت اچھے تھے۔ لوگوں سے میل ملاقات، گفتگو، ہمت افزائی اور انتظام میں وہ اعلیٰ درجے کے ماہر تھے۔

والد صاحب سوچ بچار کے آدمی تھے۔ ان دونوں کی جوڑی بہت اچھی تھی اور ان ہی کی وجہ سے ای ایف یو ایک حرکی ادارہ اور بیمے کی صنعت کا لیڈر بن گیا تھا۔''

صدی کے چھٹے عشرے میں ہونے والی ای ایف یو کی ترقی میں خلیلی کے کردار کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ کمپنی کی ۱۹۶۱ء کی بیلنس شیٹ کے مقدمے میں، جو ان کا پہلا تھا، انھوں نے لکھا تھا:

اس ادارے کی صدارت میں بڑے عظیم لوگ شامل رہے ہیں۔ ۲۹ ر برس قبل اس کی تاسیس میں آغا خان، سر سلطان محمد شاہ، بھوپال کے نواب سر حمید اللہ خان مرحوم اور وہ عظیم قوم پرست عبدالرحمٰن صدیقی جیسے لوگ شامل تھے۔ میں اس ادارے کو ایک وقف سمجھتا ہوں جو ان لوگوں نے قوم کو تحفے میں دیا تھا۔''

میں سمجھتا ہوں کہ عباس خلیلی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے چیئر مین کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اس لیے کہ وہ دوسرے منصوبوں پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ مینیجنگ ڈائریکٹر کے حیثیت سے ان کے دوست بھیم جی کی موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ کمپنی محفوظ ہاتھوں میں ہے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا، خلیلی کو سرکاری ملازمت سے ۱۹۵۹ء میں فارغ کردیا گیا تھا مگر ان کو ذوالفقار علی بھٹو نے اسلام آباد طلب کیا اور وزارتِ دفاع کے ماتحت ڈیفنس پروڈکشن بورڈ کا چیئر مین بنا دیا۔ اس حیثیت میں انھوں نے ایران، ترکی اور لیبیا کے دورے کیے اور

دفاعی صنعت کی ترقی میں بے بہا کردار ادا کیا۔ وہ سابقہ مشرقی پاکستان سے ۱۹۷۱ء میں واپس ہوئے تھے اور بہت کچھ کھو کے آئے تھے۔ اور جب انھیں ملازمت پر دوبارہ بلایا گیا تو ان کا خیال تھا کہ وہ وزارتیں اسی طرح چلا سکتے ہیں جیسے کہ پہلے وزارتیں چلائیں تھیں۔ مگر ان کے دوستوں کے مطابق یہ ایک خام خیالی تھی اس لیے کہ اس ماحول میں عباس خلیلی جیسا آزاد خیال انسان بھی زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ عباس خلیلی دو سال تک چل سکے، جو کاؤس جی کے الفاظ میں، بھٹو کے معیار کے مطابق خاصہ طویل عرصہ تھا۔ ان کو بغیر کسی وجہ کے گھر بھیج دیا گیا۔ انھوں نے آخر وقت تک کام کیا، اپنے دفتر میں اس وقت تک کام کرتے رہے جب یہ جبر ان کو ہسپتال بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ادارے کے چیئر مین تھے جو نجی شعبے میں ملک کی سب پرانی انجینئرنگ کی ایجنسی تھی۔ یہ ادارہ ملک سے باہر ملائیشیا، انڈونیشیا، امارات، سعودی عرب، مشرقِ وسطٰی کے کئی ممالک اور افریقا میں کام کر رہا تھا۔ انھوں نے کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی، ایک بار بنگلور میں ECAFE کی صدارت بھی کی جس میں جواہر لال نہرو، اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل ڈاگ ہیمر شولڈ نے بھی شرکت کی تھی۔ خلیلی یونی ورسٹی میں تقریری مقابلوں میں اور کھیلوں میں حصہ لیتے تھے۔ وہ کھیل کے کئی اداروں سے منسلک تھے۔ وہ YMCA کے اور Old Scouts Association کے کئی برس تک رُکن رہے۔ وہ برسوں اسلامیہ کلب کے ممبر بھی رہے تھے جو ٹیبل ٹینس کا اہم مرکز تھا۔

میں اس وقت سے انھیں اچھی طرح جانتا تھا جب میں ای ایف یو کی انتظامیہ کا ایک رکن تھا اور عباس خلیلی اس کے چیئر مین تھے۔ وہ سب کے لیے وجدان کا منبع تھے اور مجھے بالخصوص اپنی بذلہ سنجی اور درّاک عقل کے باعث بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ ایک اچھے انسان تھے، ہر شخص کی پہنچ میں رہتے تھے، ایسے انسان جس کے اطراف پیشہ ورانہ مہارت اور اعتماد کا ایک ہالہ سا رہتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے اور عزت بھی کرتے تھے۔ اگر چہ عمر کے اعتبار سے ان کے مقابلے میں میرا کوئی خاص مقام نہیں تھا، مگر ان کی نظر میں عمر کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی، لہٰذا مجھے ایک قسم کی قربت اور انسیت ہوگئی تھی۔

میں نے آخری بار انھیں ای ایف یو کی گولڈن جوبلی تقریبات میں ۱۹۸۲ء میں دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہمیشہ کی طرح تیز طرّار نظر آتے تھے اور گزشتہ زمانے کی تمام جزئیات ان کو یاد تھیں۔ ان کی تعزیت میں ان کے دوست کاؤس جی نے لکھا تھا، "وہ واقعتاً ایک غیر معمولی انسان تھے، بیدار مغز، دور بیں اور تجزیاتی ذہن کے مالک تھے۔ ۸۷ برس کی عمر میں بھی وہ سارے ملک میں اُڑتے پھرتے اور مذاکرات میں تقریریں کرتے پھرتے تھے۔

ملک کے سیاست دانوں کو خطوط لکھ کر سیاسی اور عدالتی مسائل پر مشورے دیتے تھے۔

یہ لمبی عمر پانے کا راز ہے۔ انسان کو ضرور بالضرور اپنے زندگی میں اور اپنے اطراف میں ہونے والے واقعات میں دل چسپی لیتے رہنا چاہیے۔ ستاسی برس کی عمر میں وہ ساٹھ برس کے لوگوں سے بھی کم عمر لگتے تھے۔ میرے لیے یہ استثنٰی اور مسرت کی بات تھی کہ میں انھیں جانتا تھا اور ان کی، منکسرانہ ذہانت اور بذلہ سنجی سے فیضیاب ہوا تھا۔

وہ خوش قسمت تھے کہ انھیں طویل علالت لاحق نہیں ہوئی۔ ۱۳ر نومبر کو اسپتال میں داخل ہوئے اور ۱۷ر نومبر کو، جب ان کے اعزہ ان کے بستر کے اطراف موجود تھے پرسکون انداز میں موت سے ہم آغوش ہو گئے۔ ہم نے دوسرے دن ان کو ان کے پرانے رفیق ایڈمرل احسن کے قریب، نیوی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں وہ کراچی کے ہوائی اڈے پر اترے تھے تو ان سے میری ملاقات ہوئی تھی اور جس صبح ان کا انتقال ہوا اس وقت بھی میں ان کے بستر کے قریب تھا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور میں ہمیشہ ان کی کمی محسوس کروں گا۔"

عباس خلیلی نے ۱۷ر نومبر ۱۹۹۴ء کو انتقال کیا۔ ان کے پانچ بیٹے، دو بیٹیاں تھیں۔ اُن کی تیسرے نسل میں سترہ اولادیں تھیں جس میں نو لڑکے اور آٹھ لڑکیاں تھیں۔

مرزا احمد اصفہانی (بڑا صاحب)

۱۹۶۷ء میں ای ایف یو کے ڈھاکا کنونشن میں مرزا احمد اصفہانی گورنر منعم خان کو سووینئر پیش کر رہے ہیں

اصفہانی خاندان

زیبِ داستان

جب میں نے ۱۹۶۰ء میں ایسٹرن فیڈرل یونین میں ذمے داریاں سنبھالی تھیں تو مجھے اصفہانی حلقے کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ کمپنی کے سب سے بڑے حصے دار تھے اور مرزا احمد اصفہانی جن کو لوگ احتراماً 'بڑا صاحب' کہتے تھے، چیئرمین تھے اور عملی طور پر ان کے پاس کمپنی کا پورا کنٹرول تھا۔ اگرچہ ان کے نامزد جناب غلام حسین شیرازی قائم مقام چیئرمین تھے۔ یہ انتظام ضروری تھا کہ 'بڑا صاحب' نے وزیرِ اعظم پاکستان جناب لیاقت علی خان کی درخواست پر جوٹ بورڈ کا رُکن بننا قبول کرلیا تھا اور ساتھ ہی نئی تشکیل شدہ (PIDC) پاکستان انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن سے بھی منسلک ہوگئے تھے۔ یہ دونوں ادارے پاکستان کی معاشی اور صنعتی ترقی کے لیے بہت اہم تھے۔

اصفہانی خاندان نے پاکستان کے ابتدائی دنوں میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا، اسی طرح جیسا کہ وہ اس کی تخلیق سے پہلے ادا کرچکے تھے۔ دونوں بھائی، یعنی مرزا احمد اور مرزا ابوالحسن اصفہانی عملی طور پر آل انڈیا مسلم لیگ سے منسلک تھے اور ابوالحسن جناب محمد علی جناح کے نہایت معتمد ساتھی بن گئے تھے۔ مجھے علم نہیں کی ذمے داریوں کی تقسیم کسی دوررس منصوبے یا کسی سوچی سمجھی حکمتِ عملی کی بنا پر تھی یا بس یوں ہی ہوگئی تھی۔ بہرحال اس کے باعث اصفہانی خاندان نے اپنے کاروباری مقاصد میں بہت کامیابی حاصل کی۔ مرزا ابوالحسن کو سیاسی میدان میں آگے کرکے اور مرزا احمد کو 'بڑا صاحب' کے رُتبے پر اور محمد علی جناح کے سب سے اہم معاشیاتی مشیر کے درجے پر فائز کرکے اصفہانی گروپ ایسی پوزیشن میں آگیا تھا جہاں وہ اپنی ترقی کی خاطر خواہ منصوبہ بندی کرسکتا تھا۔

اس زمانے کے قاری کے لیے اصفہانی خاندان کے بارے میں کچھ لکھنا کارِ دُشوار ہے۔ جب ۱۹۷۰ء میں پاکستان تقسیم ہوگیا اور بنگلہ دیش وجود میں آگیا تو اصفہانی گروپ بھی خاندانی جھگڑوں اور سیاسی مسائل کی وجہ بھی دو حصوں میں بٹ گیا۔ ان دونوں بھائیوں کے درمیان کیا ہوا اور کیسے ہوا، میں اس کے بارے میں کچھ لکھنے کا مجاز نہیں، اگرچہ یہ دونوں اس سے قبل ایک دوسرے کے لیے بہت قریبی اور قابلِ اعتماد دوست بھی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوالحسن، اپنی سیاسی اور سرکاری افسری کی زندگی میں بہت سے قابلِ احترام رُتبوں پر فائز رہ چکے تھے اس لیے انھوں نے سرکاری نوکری کو چھوڑ کر پاکستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا جب کہ 'بڑا صاحب' اپنی بنگالی بنیاد سے جڑے رہے اور انھوں نے جہاں تک اور جس قدر ممکن ہوا، اپنی موروثی خاندانی 'سلطنت' کو بچانے کی کوشش کی۔

اصفہانی خاندان سے میری دل چسپی ای ایف یو سے ان کے مالیاتی رشتوں تک محدود ہے۔ اگرچہ ۱۹۸۹ء تک اس خاندان کے لوگ کمپنی کے بورڈ پر بھی تھے، جن میں آخری مرزا محمد اصفہانی کے والد ابوالحسن مرحوم تھے جن کو Isky کی عرفیت سے پکارا جاتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے فوراً بعد تک کمپنی کے بورڈ پر تین اصفہانی موجود تھے۔ اصفہانیوں کے فیصلہ کن اثرات ۱۹۶۱ء میں اس وقت ختم ہوئے جب 'بڑا صاحب' نے اپنے اکثریتی حصص فروخت کرنے اور بھیم جی کو کمپنی کی زمامِ انتظام سونپنے کا فیصلہ کیا، جو ایک معاہدے کے تحت ادارے کے چیف ایگزیکٹیو بن گئے تھے۔

اس کتاب کے متن کی تیاری کے سلسلے میں مجھے خاندان کے دونوں بازوؤں سے گفتگو کا موقع ملا تھا، کراچی میں مرحوم ابوالحسن اصفہانی کی بیگم قمر اصفہانی اور ڈھاکے میں مرزا احمد یعنی 'بڑا صاحب' کے بیٹے صدری سے۔ دونوں مجھ سے بہت ہم دردی سے پیش آئے اور 'پرانی ایسٹرن فیڈرل' کے بارے میں اس طرح بولے گویا وہ اپنے کسی بہت ہی پیارے دوست کے بارے میں بات کر رہے ہوں جس سے مجبوراً رابطے منقطع کرنے پڑے ہوں۔ مگر ان میں کسی قسم کی بدمزگی محسوس نہیں ہوئی، بلکہ ماضی کی باتوں پر افسوس کے سائے ضرور محسوس ہوئے۔ ماضی کی وہ یادیں جو حال میں کسی کے لیے بھی اہم نہیں رہ گئی تھیں۔

مرزا احمد ۱۸۹۸ء میں برما کے شہر رنگون میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ بتایا جاتا ہے، ان کی والدہ وہاں کے چاولوں کے ایک بہت بڑے تاجر کی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی اور پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ مدراس میں بس گئے تھے۔ پھر وہ کلکتے چلے گئے جہاں ان کے خاندان کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ یہ کاروبار احمد کے دادا نے جمایا تھا جو ایرانی النسل تھے اور اصفہان سے تعلق رکھتے تھے۔ احمد نوجوان تھے جب وہ قاہرہ چلے گئے تھے جہاں وہ بارہ برس رہے اور اس دوران ایک کامیاب تاجر بن گئے۔ وہ جدید خیالات اور دور بین نگاہوں کے آدمی رہے ہوں گے اس لیے کہ انھیں جلد ہی مؤثر ابلاغ کی اہمیت کا احساس ہوگیا تھا اور وہ رو بہ رو ذاتی مراسم کے قائل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے منطقے میں اور برِصغیر ہندوستان میں بہت سے لوگوں سے ذاتی تعلقات استوار کر لیے تھے جس کی وجہ سے وہ بنگال کے تجارتی مرکز کلکتے میں اپنا ایک خاصا بڑا دفتر بنانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

مرزا احمد کے بیٹے صدری اصفہانی نے بتایا کہ ''جس برس ہم اور ہمارے خاندان والے دنیا کے اس حصے میں آئے تھے وہ ۱۸۲۰ء تھا۔ ایران سے وہ سب پہلے مغربی ساحل پر آئے اور اس کے بعد مدراس پہنچے۔ جب تک پہلی عالمی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی خاندان والوں کا برابر آنا جانا رہتا تھا۔ غیر ملکیوں کی طرح، ایران واپس جانا، وہیں اپنی بیویوں سے ملنا، وہیں بچے پیدا کرنا، یا شادیوں کے رشتے لگانا۔ لگاتار آمد و رفت، اور حقیقت میں بے گھر۔ پھر ہمارے کچھ لوگوں نے ہندوستان میں مستقل قیام اور زندگی گزارنے کا ارادہ کیا۔ سو، جب ہمارے قبیلے کے کچھ لوگ مدراس میں بس رہے تو، خلیلی خاندان کی طرح، آہستہ آہستہ مقامی لوگوں میں شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ انھوں نے بنگالیوں، پنجابیوں اور دوسرے ہندوستانیوں سے میل ملاپ شروع کر دیا۔''

۱۹۱۱ء کے لگ بھگ مرزا احمد کی والدہ اچانک انتقال کر گئیں، اور ان کے والد نے دو بھائیوں ابوالحسن اور محمد علی کے ساتھ ان کو مدراس بھیج دیا جہاں ان کے قبیلے کے کچھ لوگوں نے ان کو پالا پوسا اور وہ وہیں بڑے ہوئے۔ کاروبار، جو چائے اور نیل پر مشتمل تھا، خاصا بڑھ چکا تھا اور مرزا احمد، جو بڑے بیٹے تھے، ۱۹۱۸ء میں کاروبار سنبھالنے کی غرض سے کلکتے چلے گئے۔ اتفاق سے یہ مناسب وقت تھا، اس لیے کہ اس کے فوراً بعد ہی خاندان کے افراد کے درمیان کچھ مسائل پیدا ہوگئے۔ ان کے والد کے بھائی نے، جو پہلی عالمی جنگ کے دوران لندن میں مقیم تھے، عدالتی چارہ جوئی پر مجبور کر دیا اور خاندان والوں کو مشترکہ اثاثوں کا بٹوارہ کرنا پڑا۔ اس وجہ سے مدراس میں ان کا قیام ضروری ہوگیا تھا اور نوجوان مرزا احمد تنِ تنہا کاروبار چلانے کے لیے رہ گئے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان قانونی جنگ کئی برس تک چلتی رہی اور مرزا احمد کو کامیابی سے کاروبار چلانے کے لیے سرمایہ مہیا کرنا مشکل ہوگیا۔ انھوں نے اپنے والد سے تنازعے کے جلد سے جلد تصفیے کی درخواست کی۔ انھوں نے اپنے والد سے کہا، ''جتنا جلد ہو سکے ان سے معاملہ طے کیجیے۔ وہ جو کچھ مانگتے ہیں دے دیجیے، جو جائیداد مانگتے ہیں، دے دلا کر رفع دفع کیجیے تاکہ ہم اپنا ذاتی کاروبار شروع کر سکیں۔''

والد نے غور سے ان کی بات سنی، تصفیے کا فیصلہ کیا، مگر چند ماہ کے اندر ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر پچاس برس سے زیادہ کی نہیں رہی ہوگی۔ یہ ۱۹۲۵ء کا زمانہ تھا اور مرزا احمد اب خاندان کے مربّی تھے اور 'بڑا صاحب' نے اپنے جوہر دکھائے۔ ۱۹۸۸ء میں جب ڈھاکے میں ہماری ملاقات ہوئی تو ان کے سب سے بڑے بیٹے صدری نے بتایا، ''مگر کچھ خوش قسمتی کے علاوہ، ہماری کامیابی ان

رشتوں کی مرہونِ منت تھی جو ہم اپنے سمندر پار ایجنٹوں سے استوار کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اور میرے والد کی یہی سب سے بڑی طاقت تھی۔ وہ اپنے کچھ بہت قریبی دوستوں کے ذریعے اچھے رابطے استوار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس کے گُر انھوں نے اپنے والد سے سیکھے تھے۔ اس طرح اصفہانی خاندان، دوستانہ مسابقت رکھنے والے خاندان آدمجی، کی طرح ایک مضبوط معاشیاتی طاقت بن گیا۔'' بیگم اصفہانی نے، جنھوں نے از راہِ کرم مجھے اپنے کراچی کی قیام گاہ پر ملنے کا وقت دیا تھا، بتایا کہ ''وہ بڑے غیر معمولی کاروباری آدمی تھے۔ اصفہانی خاندان میں جو کچھ بھی ہوتا تھا مرزا احمد کی ایما پر ہوتا تھا۔ وہ بہت اعلیٰ درجے کا ذہن رکھتے تھے۔''

خاندانی کاروبار میں تینوں بھائی عملی طور پر حصہ لیتے تھے۔ مرزا احمد ان کے متفقہ ہم پلّہ مگر بزرگ تھے۔ صدی کے تیسرے عشرے کی ابتدا ہی سے ابوالحسن سیاست میں الجھتے چلے گئے۔ ۱۹۲۰ء میں پہلی ملاقات سے ہی وہ محمد علی جناح کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ ان دنوں وہ کیمبرج میں اپنی تعلیم کے پہلے برس میں تھے۔ جناح صاحب نے انڈین مجلس کے ارکان سے خطاب کرنے کی دعوت قبول کر لی تھی۔ یہ حلقہ انگلستان میں ہندوستانیوں کی پہلی مباحثہ سوسائٹی تھی۔ ابوالحسن کہتے ہیں کہ خطاب کے دوران قائدِ اعظم، اپنے مشہور رکھ کھاؤ کے باوجود نوجوانوں سے بہت قریب دکھائی دیے۔ ہم ان کے اندازِ تخاطب، زبان کی سلاست، اور سیاسی باریکیوں پر مکمل عبور سے مبہوت ہو کر رہ گئے تھے۔ انھوں نے ہمیں اپنی تعلیم پر توجہ مرکوز رکھنے اور تعلیم یافتہ ہو کر مادرِ وطن واپس جانے کا مشورہ دیا تاکہ ہم برطانیہ کے تسلط سے آزادی حاصل کر سکیں۔''

سال پر سال گزرتے گئے اور جب جناح صاحب لندن میں اپنی خود ساختہ جلاوطنی ختم کر کے واپس آئے تو انھوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کی جس کے وہ صدر بنے اور جو سات ارکان نامزد کیے گئے ان میں دو اصفہانی برادران مرزا احمد اور ابوالحسن شامل تھے۔ اور اس کتاب کے تناظر میں جو ایک اور اہم نام تھا وہ عبدالرحمٰن صدیقی کا تھا جو ایسٹرن فیڈرل یونین کے بنیاد گزاروں میں سے تھے۔ جناح صاحب نے مسلم لیگ کو اس کے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے، اس کو نئے ساحلوں اور خوش نما مستقبل کی طرف لے جانے کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ بظاہر، وہ اپنے نئے اور نوجوان پیروکاروں، ابوالحسن اور عبدالرحمٰن صدیقی سے بہت متاثر تھے اس لیے ان دونوں کو انھوں نے بنگال میں مسلم لیگ کی تنظیم کی ذمے داری سونپ دی۔ انھوں نے ابوالحسن کو، جو عمر میں چھوٹے تھے، مرکزی کردار ادا کرنے اور دوڑ بھاگ کرنے کے لیے کہا۔ دوسرے الفاظ میں کامیابی حاصل کرنے کی ذمے داری ابوالحسن کے کاندھوں پر تھی۔

مرزا احمد نے جہاں تک ممکن ہوا سیاسی میدان میں اپنے چھوٹے بھائی کی حمایت کی۔ وہ اس بات کے بھی قائل ہوگئے تھے کہ ابوالحسن کا مستقبل کاروبار سے زیادہ جناح صاحب اور مسلم لیگ کے ساتھ ہوگا۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی محمود کو اپنے کاروبار کا مزید بوجھ اُٹھانے پر راضی کر لیا۔

قائدِ اعظم 'بڑا صاحب' کے مشوروں اور حمایت کی بہت قدر کرتے تھے اور وہ اکثر ان سے معاشیاتی اور مالیاتی مسائل پر تبادلۂ خیال بھی کرتے تھے۔ ان دنوں ایک بہت ہی قریبی حلقہ تھا جو قائدِ اعظم کے اطراف ہوتا تھا۔ اس وقت تک مسلم لیگ عوامی تحریک کی صورت نہیں اختیار کر سکی تھی جو بہت بعد میں ممکن ہوا تھا۔ ابوالحسن نے کلکتے میں ہونے والے ایک بڑے سیاسی بحران کے ضمن میں بتایا جو اے کے فضل الحق کی ذاتی جاہ طلبی کے باعث پیدا ہوا تھا۔ ابوالحسن اور ان کے سیاسی دوستوں نے جناح صاحب سے فوراً کلکتے پہنچ کر بنگال کے مسلمانوں کو آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد کرنے کی درخواست کی تھی، ''تاکہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے ہندوؤں کا اعتماد کے ساتھ مقابلہ کر سکیں'' جناح صاحب نے فوراً ان کی درخواست کو قبول کیا اور ایک طویل سفر کے بعد بمبئی سے کلکتے پہنچ گئے۔ ابوالحسن کے مطابق ''جو لوگ جناح صاحب کے استقبال کے لیے ہوڑہ اسٹیشن پر پہنچے ان میں میرے بڑے بھائی مرزا احمد اصفہانی، خواجہ نورالدین اور میں شامل تھا۔ یہ

موقع بعد کے مواقع سے کتنا مختلف تھا جب اسی ہوڑہ اسٹیشن پر شہر اور پل کی جانب سے لوگ ریل گاڑی کی آمد سے گھنٹوں پہلے امڈ آیا کرتے تھے۔ ہم لوگ جناح صاحب کو 5 Camac Street پر واقع اپنے گھر لے آئے۔ شام تک ہم ان کو موجودہ حالات اور صوبے میں سیاسی صورتِ حال کی تفصیلات بتاتے رہے اور وہ وجوہات بھی جن کے زیر اثر بنگال میں مسلم لیگ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ اپنے نوجوانوں کے مقابلے میں ہم لوگوں کو اپنی تاریخ کا بہتر ادراک تھا۔ لہٰذا یہ طے ہوا کہ میں جناح صاحب کے ADC اور پرائیویٹ سیکریٹری کی خدمات انجام دوں اور ان سے ملاقاتوں کے انتظامات کروں۔"

دونوں بھائی ایک ہم آہنگ ٹیم کی طرح تھے۔ ابوالحسن جناح صاحب سے قریب تر ہوتے گئے جب کہ مرزا احمد عقب سے خفیہ ڈوریاں ہلاتے۔ ان کے بڑے بیٹے صدری نے بتایا کہ "میرے والد آنے والے انتخابات کے لیے کامیابی سے چندے جمع کرتے، اس لیے کہ وہ ان لوگوں کے نام اور پتے سے واقف جن پر بھروسا کیا جاسکتا تھا۔ قدرتی طور پر جناح صاحب اور میرے چچا حسن ایسے معاملات میں نہیں الجھ سکتے تھے اس لیے کہ بنگال میں ان کے والد جیسے رسوخ اور تعلقات ان لوگوں کو میسر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جناح صاحب بنگال کے معاملات میں میرے والد کی رائے 'علیحدہ سنتے تھے۔ بنگال میں قیام اور کاروبار کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ عوام کے کسی طبقے کے سخت رویے یا ان سے علیحدگی کی وکالت نہیں کرتے تھے۔ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے اس علاقے میں کچھ اسی طرح کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ اور صحیح معنوں میں میرے والد خالص سیاسی آدمی تھے اور ایسے حالات میں میرے چچا کے مقابلے میں وہ فضل الحق اور سہروردی صاحبان کے ساتھ زیادہ لچک دار رویہ اختیار کرتے۔ ظاہر ہے کہ ان کے تجارتی مفادات ان کے رویے پر اثر انداز ہوتے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کے قائل تھے کہ آج کے فضل الحق کے مقابلے میں دو برس بعد کے فضل الحق بالکل مختلف ہوں گے اس لیے اس وقت کا لچک دار رویہ عوام کے حق میں کہیں بہتر ہوگا۔ بہر حال ان کو مسلم لیگ کے لیے چندے بھی وصول کرنے تھے اور اس ضمن میں وہ مسلم لیگ سے احترام کے حق دار تھے۔ اس سلسلے میں ایک عملی مثال لے لیجیے: جب بھی کوئی مسلم لیگ کی طرف سے آدمجی خاندان کے افراد کے پاس جاتا تو سب سے پہلا سوال ہوتا کہ "ہمیں بتایئے کہ اصفہانی نے کتنا دیا؟" اور ہمیشہ ان کا یہی پیمانہ ہوتا جس کے مطابق وہ مالی امداد فراہم کرتے تھے۔ ان تمام مصروفیات کی وجہ سے ابوالحسن کاروبار سے کم سروکار رکھتے اور ان کے چھوٹے بھائی زیادہ فعّال ہوتے گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ خاندانی کاروبار میں مل جُل کر یہ فیصلے کیے جاتے ہیں کہ مال کب خریدا جائے اور کب فروخت کیا جائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو عمل بھی کرنا ہوتا ہے جب کہ میرے چچا یہ سب نہیں کر سکتے تھے۔ مگر وہ مسلم لیگ کی اہم کمیٹی رُکن ہونے کے باوجود ہمیشہ مشاورت کی خاندانی بیٹھکوں میں شریک ہوتے جو کم از کم مہینے میں دوبار ہوتی تھیں۔ میں اس مقام پر خصوصاً ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء کے بارے میں بات کررہا ہوں۔ بسا اوقات وہ شہر میں نہیں ہوتے تھے، مگر جب اہم کاروباری فیصلے کرنے ہوتے تو وہ ضرور موجود ہوتے تھے۔"

ایک ساتھ مل کر دونوں بہت طاقت ور اور بارسوخ ہوتے۔ راجا صاحب محمود آباد نے، جو خود بھی مسلم لیگ کے ایک اہم رُکن اور ابوالحسن کے قریبی دوست بن گئے تھے، اپنے ایک دوست کی کتاب کے مقدمے میں ابوالحسن کے بارے میں لکھا ہے، "اب تیس برس ہونے کو آئے ہیں کہ میں اور ابوالحسن اصفہانی دونوں جگری دوست ہیں۔ ہماری پہلی ملاقات اپنے ایک مشترکہ دوست خواجہ نورالدین کے توسط سے ۱۹۳۴ء میں کلکتے میں ہوئی تھی۔ دو سال بعد ہم دونوں کو قائداعظم نے لاہور میں ایک میٹنگ میں مدعو کیا تھا جس میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب ہم دونوں نے قسم کھائی تھی کہ قائدِاعظم کی سربراہی میں ہم اپنی زندگیاں مسلم قوم کی خدمت کے لیے وقف کردیں گے۔ اس یادگار دن کے بعد سے قائدِاعظم کے انتقال کے وقت تک، جو بھی معمولی اختلافات رہے ہوں ان کے باوجود بھی ہمارے قدم اپنے رہنما اور اپنے مقصد سے وفاداری کی راہ میں کبھی متزلزل نہیں ہوئے۔ ہم نے ان کو اپنا پیار بھی دیا، عزت بھی اور وفاداری بھی، جن کے بدلے میں انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ ہم پر اعتبار کیا۔

میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کے سب سے بڑے صوبے بنگال میں قائد نے جو بھی فیصلے کیے، انھوں نے مرزا احمد اصفہانی کی اطلاعات پر مکمل اعتماد کیا۔ ۱۹۴۶ء میں جناب اصفہانی ان کے ذاتی نمائندے اور مسلم لیگ کے سفیر مقرر ہوئے تاکہ وہ غیر ملکی رہنماؤں کو برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کے بارے میں حقائق سے آگاہ کرتے رہیں۔ قائدِ اعظم کی زندگی میں اصفہانی صاحب ان کے وفادار اور قابلِ اعتماد نائب رہے۔"

اسی لیے جب ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آگیا تو قائد نے ان کو ریاست ہائے متحدہ امریکا میں پاکستان کا پہلا سفیر متعین کیا۔ اس دنوں نوتشکیل شدہ ملک میں ہر چیز کی کمی تھی حتیٰ کہ پاکستان کے لیے سفارت خانے کی عمارت کی تعمیر میں بھی اصفہانی خاندان نے اپنا سرمایہ لگادیا تھا۔ جب پاکستان مالی طور پر بہتر حالت میں آگیا تو یہ رقم ان کو واپس ادا کر دی گئی۔

ساتھ ہی ساتھ ان کے بھائی مرزا احمد نے نہ صرف اپنے ہمہ جہت خاندانی کاروبار کی نگہداشت کی جس میں پٹ سن، چائے، پارچہ جات، انجینئرنگ، جہازرانی، دیا سلائی اور پلائی ووڈ شامل تھے بلکہ جب بھی طلب کیا گیا انھوں نے ملکی خدمات کے لیے بھی وقت نکالا۔ حکومت کے بنائے ہوئے جوٹ بورڈ میں بھی، جو وزارتِ تجارت کے ماتحت تھا اور جس کی صدارت غلام فاروق کے سپرد تھی، مرزا احمد کی رُکنیت ایک بہت اہم ذمے داری تھی جو انھوں نے سنبھالی تھی۔ اسی طرح وہ PIDC میں بھی شامل تھے اور ان ذمے داریوں ہی کی وجہ سے انھیں ایسٹرن فیڈرل یونین کے چیئرمین کے عہدے کو عارضی طور پر چھوڑنا پڑا تھا۔

پاکستان کی تشکیل سے پہلے کے سخت مصروف اور فیصلہ کن دنوں میں بھی مرزا احمد اور ابوالحسن دو ایسے بڑے اداروں کی بنیاد رکھنے میں مصروف رہے تھے جن کو آگے چل کر نئی مملکت کی معاشیات میں اہم کردار ادا کرتا تھا۔ یہاں میری مراد اورینٹ ایئرویز اور مسلم کمرشل بینک سے ہے۔ ابوالحسن نے کچھ تفصیلات بیان کی ہیں:

"یہ جون ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، میں دلّی میں تھا، اور حسبِ معمول قائدِ اعظم سے ملاقات کے لیے ان کی قیام گاہ ۱۰ اورنگزیب روڈ پر گیا تھا، ہم دوپہر کا کھانا کھانے میں مصروف تھے، اس دوران ہمارے درمیان صوبائی اور قومی سیاست پر بھی باتیں ہو رہی تھیں۔ قائد نے بات کاٹتے ہوئے فرمایا، 'باتیں کرنے کے لیے یہ سب تو ٹھیک ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کے اپنے 'علیحدہ وطن کا مطالبہ بھی ٹھیک ہے جس میں وہ اپنی مرضی سے رہ سکیں اور اپنے مستقبل کے خود مالک ہوں، مگر تمھیں اس بات کا اندازہ بھی ہے کہ یہ مملکت کسی کام کی نہ ہوگی، اگر ہمارے پاس اس کو چلانے کے لیے مناسب افراد اور ضروری وسائل نہ ہوں۔ کیا تمھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہندوستان میں ایک بھی ہوائی کمپنی نہیں جو مسلمانوں کی ملکیت ہو؟ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہوائی کمپنیاں ملکیت، سرمائے اور انتظامی افراد کے لحاظ سے ہندوؤں کی ہیں؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں کتنے مسلمان ہواباز اور انجینئر ہیں؟ بھلا وسائل کی ایسی کمی کی صورت میں، جو کسی بھی قوم کے پاس وافر مقدار میں ہونی چاہیے، ہم کیا کر سکیں گے؟"

ابوالحسن نے اپنے بھائی اور سر آدمجی سے کلکتے میں اس مسئلے پر تبادلۂ خیالات کیا اور بغیر کسی تاخیر کے، فوراً ہی وہ ایک ہوائی کمپنی کی داغ بیل ڈالنے میں مصروف ہو گئے۔ اور پھر انھوں نے اورینٹ ایئرویز کے نام سے کمپنی بنائی جو تقسیم ہند سے پہلے مسلمانوں کی پہلی ہوائی کمپنی تھی۔ اس کی پروازوں کی شروعات میں کچھ وقت لگا اس لیے کہ متعلقہ سرکاری اداروں میں ہندو اکثریت ایک کے بعد دوسرے تاخیری بہانے کرتی رہی تا آں کہ ساری رکاوٹیں دور کر دی گئیں۔

ابوالحسن لکھتے ہیں کہ "اورینٹ ایئرویز کا اڈہ کلکتے میں تھا۔ اس کمپنی کی جانشین آج کی PIA کے مقابلے میں اور حکومتی امداد اور سرمائے کے بغیر یہ ایک معمولی سا ادارہ تھا۔ تقسیم ہند کے بعد اورینٹ ایئرویز نے اپنا اڈہ کراچی منتقل کر دیا اور ایک دن کی بھی تاخیر کے بغیر پروازیں شروع کر دیں اور اس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ اس کو نئے ادارے PIA میں ضم نہیں کر دیا گیا۔ اورینٹ ایئرویز نے تقسیم

کے بعد کے فسادات کے دنوں میں عوام کی خدمت کے فرائض انجام دیے۔ اس نے مسلمانوں کو پاکستان لانے اور ہندوؤں کو ہندوستان لے جانے میں مدد فراہم کی۔ اگر اورینٹ نہ ہوتی تو تقسیم کے بعد مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان طویل عرصے تک کوئی ہوائی رابطہ ہی نہ ہوتا۔'' ہوائی کمپنی کے بارے میں جناح صاحب کے مشورے کے پیچھے کارفرما اصل طاقت مرزا احمد اصفہانی ہی کی تھی جس میں آدمجی کی امداد بھی شامل تھی۔

مسلم کمرشل بینک کی ابتدا بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی جس میں یہی 'کھلاڑی' حصہ لے رہے تھے۔ ابوالحسن نے کہا، ''ہم میں سے کتنے لوگوں کو علم ہے کہ وہ قائدِاعظم ہی تھے جن کے اصرار پر برِّصغیر میں مسلمانوں کے ایک اور بینک کی داغ بیل ڈالی گئی۔ قائد کہتے تھے کہ 'ہم ایک سو ملین افراد کی قوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ہمارے پاس ہندوستان کے بے شمار بینکوں میں صرف ایک ہی بینک (حبیب بینک) ہے' اور یہ بالکل سچ بات تھی۔ یہ دراصل مرحوم سر آدمجی حاجی داؤد اور میرے بھائی، مرزا احمد، سے ان کے بار بار اصرار اور بحث کا نتیجہ تھا کہ مسلم کمرشل بینک وجود میں آیا۔ اس کی تشکیل تین کروڑ کے منظور شدہ سرمائے سے ۹/ جولائی ۱۹۴۷ء کو کلکتے میں ہوئی۔ تقسیم کے بعد، جو تھوڑے ہی عرصے بعد ہو گئی تھی، ۱۹۴۸ء تک پاکستان کے بڑے شہروں میں اس کی شاخیں کھل گئیں اور اس کا صدر دفتر کراچی میں قائم کیا گیا۔''

اورینٹ ایئرویز کے حالات کے برعکس بینک پر آدمجی خاندان کو پوری گرفت حاصل تھی۔ صدری کہتے ہیں کہ ''یوں ہوا کہ دوسرے دو گروہوں نے، جن کی ملکیت میں بینک کا خاصا بڑا حصہ تھا، اپنے حصص آدمجی خاندان کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ اس طرح وہ بینک کے سب سے زیادہ حصص کے مالک ہو گئے۔ میرے والد، کو اس بات کا آخری عمر تک قلق رہا۔''

مجھے یہ خاصا دل چسپ، اور مخصوص ہندوستانی اندازِ خیال معلوم ہوا جو مسلمان معاشرے کے بڑے کاروباری افراد میں عام تھا۔ اس لیے میں نے صدری اصفہانی سے پوچھا کہ کیا اس واقعے کی وجہ سے ان کے والد اور سر آدمجی کے درمیان تعلقات میں تلخی نہیں ہوئی؟ وہ مسکرائے اور کہا، ''وہ آپس میں اچھے دوست تھے مگر ساتھ ہی ایک دوسرے کے کاروباری حریف بھی تھے۔ مگر یہ وہ دن تھے جب ہمارے پٹ سن کے کارخانے نہیں تھے۔ مگر درآمد اور برآمد کے میدان میں کسی چیز میں وہ آگے تو کسی میں ہم آگے تھے۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے براہِ راست مدِ مقابل نہیں تھے۔ اور پھر ہمارے اور ان کے اندازِ کار مختلف تھے، اور ایسا لگتا تھا کہ دونوں گروہ عمداً ایک دوسرے کے راستے میں آنے سے پرہیز کرتے تھے جس سے دوسرے گروہ کے مفادات پر ضرب پڑے۔''

میں نے اب تک برِّصغیر کی تقسیم اور اس کے بعد کے جن حالات کی تفصیلات لکھی ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں اصفہانی بھائی پاکستان کی ترقیاتی کوششوں میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ ان کے پاس ایسٹرن فیڈرل یونین کے مسائل کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا اس لیے یہ ادارہ ان کی فہرستِ ترجیحات میں اوپری درجے پر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میرے خیال میں یہ کہنا مرزا احمد سے ناانصافی ہوگی اس لیے کہ ایسٹرن فیڈرل یونین کے مفادات ہمیشہ ان کے دل میں پیوستہ رہے تھے۔ ان کے کاروباری ڈھانچے کی جزئیات کے مطابق یہ بیمہ کمپنی ان کی اپنی اختراع نہیں تھی نہ وہ اس کی بنیادگزاری میں شریک تھے۔

یہ تو مسلم لیگ میں ان کی عملی سرگرمی یا فعالیت تھی جس کی وجہ سے ان کا سابقہ ایسی شخصیات سے پڑتا رہا جو ۱۹۳۲ء میں ای ایف یو کی تشکیل میں شریک تھے۔ جن میں عبدالرحمٰن صدیقی، نواب صاحب بھوپال، راجا صاحب محمود آباد، غلام محمد، اور کے ایف حیدر جیسے اہم حضرات شامل تھے۔ میں ایسے کاغذاتِ شہادت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ کیوں اور کس طرح اصفہانی خاندان مسلمانوں کی تشکیل دی ہوئی اس کمپنی سے منسلک ہوا، سوائے اس کے کہ کمپنی کے ۱۹۳۵ء کے میزانیے میں، جو اس ادارے کا تیسرا میزانیہ تھا، کلکتے کے ایک تاجر مرزا احمد اصفہانی کا نام کمپنی کے بورڈ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اصفہانی

خاندان اپنے تمام کاروبار کا بیمہ اسی ادارے سے کرانے کے ذریعے اس کی خاصی کاروباری امداد کرتا تھا۔ اگر چہ اصفہانی خاندان کمپنی کے چیف ایجنٹ ہونے کے باعث کاروبار پر کمیشن لینے کا حق دار تھا مگر صدری اصفہانی کے مطابق، ہم نے اس کمپنی کے ابتدائی دور میں، اپنے تمام کاروبار پر کمیشن لینے سے پرہیز کیا تھا۔

۱۹۴۹ء میں بھی، جب یہ فیصلہ ہونا تھا کہ ای ایف یو کا صدر دفتر کلکتے سے پاکستان منتقل کیا جائے یا ہندوستان میں ہی رہنے دیا جائے، اصفہانی برادران نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس ضمن میں اس وقت کے ڈپٹی جنرل منیجر ای سی آئیون نے، جنھیں اصفہانی برادران ہی جرمنی کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی الیانز سے لے کر آئے تھے، فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔

ای ایف یو کے اس مشکل وقت کے سلسلے سے، جب لندن میں ہونے والے نقصانات ہوئے تھے، مرزا احمد اصفہانی کے رویے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے کہ جب کمپنی مالی مشکلات میں گرفتار ہونے کے باعث نہ صرف سسک رہی تھی بلکہ سخت مالی اصولوں کے مطابق دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی، اصفہانی خاندان کو اپنا سرمایہ لگا کر امداد کرنی چاہیے تھی۔

میرے پاس وہ ساری خط کتابت موجود ہے جو میرے ساتھی اروِن سی ایون نے لندن میں ہونے والے نقصانات کے حوالے سے ای ایف یو کے اس وقت کے جنرل منیجر جناب کے ایف حیدر سے کی تھی۔ Marine Hull Underwriting میں ہونے والے نقصانات کی تفتیش کے لیے آئیون کو لندن بھیجا گیا تھا۔ ان خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا احمد اصفہانی نے حقیقتاً اس معاملے میں خاصی دل چسپی لی تھی۔ وہ اور ان کے جرمن دوست آئیون کی دریافت پر تبادلۂ خیالات کرنے کے لیے ملے تھے۔ مگر کسی مرحلے پر اضافی سرمایہ لگانے کا سوال نہیں اُٹھایا گیا تھا۔ کیا اس کی یہ وجہ تھی کہ حیدر صاحب سوئے ہوئے شیر کو جگانا نہیں چاہتے تھے، اس لیے کہ انھیں امید تھی کہ شاید کمپنی اس مسئلے میں الجھنے سے بچ جائے گی؟ یا پھر اس لیے کہ لندن کے قرض خواہ اپنے مطالبات میں کمی پر آمادہ ہو جائیں گے۔ یا، حیدر صاحب جانتے تھے کہ اصفہانی خاندان ان دنوں اپنی کاروباری ضروریات کی بنا پر مالی طور پر اس حالت میں نہیں تھا کہ مزید سرمایہ فراہم کرتا۔ میرے خیال میں یہ سوالات ہمیشہ تشنۂ جواب رہیں گے۔

میرے ناقص خیال میں ۱۹۶۰ء میں 'بڑا صاحب' کے لیے عباس خلیلی کا مشورہ قبول کرنا کہ وہ ای ایف یو کے حصص ARAG کو فروخت کردیں، کچھ آسان نہ رہا ہوگا۔ اور مجھے اس بات کا بھی پورا یقین ہے کہ کمپنی کی باگ ڈور کو روشن علی بھیم جی کے ہاتھ میں دیے جانے پر بھی وہ خوش نہیں رہے ہوں گے۔ بھیم جی نے خود مجھے بتایا تھا کہ ان کی اصفہانی سے پہلی ملاقات اتنی مشکل تھی کہ لگتا تھا کہ شروع ہونے سے قبل ہی ختم ہو جائے گی اس لیے کہ اس خاندان کا پس منظر اور کاروباری معاملات میں ان کے نظریات قطعی نوعیت کے تھے۔ 'بڑا صاحب' اور جناب بھیم جی دونوں کو اس بات کی داد دی جانی چاہیے کہ اس مسئلے کو سلجھانے میں انھوں نے بڑے پن کا مظاہر کیا تھا۔ یہ مرزا احمد کی کمپنی سے شدید محبت ہی تھی جس نے انھیں کمپنی کو گرداب سے نکالنے کے لیے بھیم جی سے معاملت کرنے پر راضی کیا تھا۔

صدری کہتے ہیں کہ "جو کچھ بھی میرے والد نے کیا وہ دل وہی سے کیا تھا۔ وہ اپنے تمام منصوبوں پر بہت احتیاط سے عمل کرتے تھے تا کہ ان کے نام کو بٹا نہ لگے۔ اداروں کو نفع بخش بنانے کے علاوہ یہ بات ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتی تھی۔ تقسیم کے وقت جب وہ کلکتے سے ہجرت کر رہے تھے انھوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ جاتے کے بعد کبھی کوئی بھی ان کو نا دہندہ نہ کہہ سکے۔"

میں 'بڑا صاحب' کے کاروباری کردار کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ اس لیے صادر نہیں کر سکتا کہ میں ان سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ ان سے ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی مگر وہ بھی کئی لوگوں کے ہمراہ۔ یہ بھی کہ اس وقت میں کم عمر ہونے کے باعث ان کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکتا تھا۔ ان کو اس بات کا علم تھا کہ ان کے دوست اروِن آئیون ہی مجھے پاکستان لائے تھے اور صرف اسی بنا پر میں ان کی دوستانہ مسکراہٹ اور مصافحے کے قابل تھا۔ اس کے علاوہ جب تک میں کمپنی کے مدارج میں، روشن علی بھیم جی کے ساتھ، ذرا بڑے رُتبے پر پہنچا تھا

اس وقت تک مرزا احمد اپنے اکثریتی حصص فروخت کر چکے تھے اور کمپنی کے معاملات میں ان کا دخل ختم ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ ملک کی معاشیاتی ترقی میں ان کا بڑا کردار اب تاریخ کا حصہ بننے والا تھا اور ان کو صرف ایک بزرگ مدبّر کا رُتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ خاندان اور کاروبار کے زیادہ تر کام اب ان کے سب سے بڑے بیٹے صدری ہی انجام دینے لگے تھے۔

اپنے والد کی زندگی کے اس مرحلے کے بارے میں بات کرتے ہوئے صدری نے کچھ فلسفیانہ انداز اختیار کر لیا اور کہا کہ ''آپ جانتے ہیں کہ ایک انسان جو ۸۸ برس کی عمر تک پہنچ چکا ہو، زندگی کے بارے میں اس کے اپنے تصورات ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی زندگی کے آخری دس سے پندرہ برسوں میں انھیں واقعی دولت کمانے میں کوئی دل چسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ سماجی کاموں میں زیادہ دل چسپی لینے لگے تھے۔ خیراتی نہیں بلکہ اپنا اسپتال بنانا، اسکول قائم کرنا وغیرہ۔ اگر کبھی میں ان کو پیغام بھیجتا کہ فلاں فلاں منصوبہ، یا فلاں فلاں منیجر ان سے مشاورت چاہتا ہے تو وہ کہتے کہ انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہے مگر جوں ہی کسی فلاحی کام کی بات کی جاتی تو ایک آن میں وہ مستعد ہو جاتے۔ کاروباری معاملات میں وہ یہی کہتے کہ ان کے بیٹے سے بات کی جائے۔

ان کے اور کوئی مشاغل نہیں تھے۔ جب وہ مصروفِ کار رہتے تھے ہمیشہ بڑے فخر سے یہی کہا کرتے تھے کہ ان کا سب سے بڑا مشغلہ کام کرنا ہے۔ مجھے یاد ہے، جن دنوں میں اقامتی اسکول میں تھا، کہ ہفتے وار چھٹی کے دن وہ ریل کے ذریعے اپنے چائے کے باغات اور دوسرے مقامات پر اپنی جائیداد کے معائنے کے لیے جاتے تھے۔ وہاں سے واپسی پر وہ اپنی ڈاک پر توجہ دیتے تھے۔ مجھے صرف ایک ہی بات یاد آتی ہے جو شاید ان کے مشغلے سے قریب تر تھی۔ ان دنوں سینما نیا نیا شروع ہوا تھا۔ کبھی کبھی چھٹیوں کے دن وہ چار اور پانچ تک فلمیں دیکھ ڈالتے تھے۔ ہفتے اور اتوار کے دنوں میں جب وہ شہر سے باہر نہیں جاتے تو شامیں اسی نوعیت کے آرام میں گزارتے تھے۔''

صدری سے میرے اس سوال پر کہ ''کیا مشرقی پاکستان کی 'علیحدگی اور بنگلہ دیش کا قیام آپ کے والد کے لیے حیرت کا باعث بنا تھا؟ انھوں نے بلا تامّل جواب دیا تھا کہ پاکستان کی تشکیل کے وقت ہی انھوں نے جناح صاحب سے کہہ دیا تھا کہ اگرچہ ہم ابھی ایک قوم ہیں، ایک ساتھ ہیں مگر ہم کو بنگال کے لوگوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ مگر بالآخر جب اس پر عمل شروع کیا گیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہم سب کے لیے یہ بہت ناخوشگوار لمحات تھے، ان کے لیے بھی جو ۱۹۷۰ء میں ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے اور ۱۹۷۳ء میں واپس آنا چاہتے تھے جب نئی حکومت نے واپس نہ آنے والوں کی ہمت افزائی کی کوشش کی تھی۔ مگر ان لوگوں کے لیے بھی جو اوّل دن سے وہیں قیام پذیر رہے، زندگی ایک دم بدل چکی تھی۔ ہمارا رہن سہن ویسا نہیں رہ گیا تھا جس کے ہم عادی ہو چکے تھے۔ دیکھیے، یہاں، جو کبھی مشرقی پاکستان تھا، تقریباً دو سو پچاس افراد تھے جو ملک کی معیشت کو چلاتے تھے۔ آدمجی، باوانی، اصفہانی وغیرہ۔ بدقسمتی سے ان کی جگہ اب ایک نئے طبقے کے لوگ آچکے ہیں، بالکل اسی طرح جیسا کہ مغربی پاکستان میں ہوا ہے۔ یہ لوگ راتوں رات دولت کمانے میں دل چسپی رکھتے ہیں، عوام کی کسی کو پروا نہیں ہے''

صدری اصفہانی اور روشن علی بھیم جی، اگرچہ جگری نہیں، مگر دوست بن چکے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اس خطے میں جب یہ مشرقی پاکستان تھا، روشن کے بہت سے دوست ہوتے تھے۔ بہت سے سیاست دانوں اور ان کی اولاد کی انھوں نے بہت مؤثر طریقوں سے امداد کی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر صاحبانِ اثر تھے اور، کچھ تو ایسٹرن فیڈرل یونین کے ڈائریکٹر بھی بن گئے تھے۔ بھیم جی نے ان کو اپنا دوست بنا لیا۔ علیم، جسٹس ستار، ڈاکٹر مالک وغیرہ۔ ان کے علاوہ مجیب الرحمٰن، مولیٰ اور وحید الزماں ان کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ جی ہاں، روشن علی بھیم جی آج بھی بنگلہ دیش میں یاد کیے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کے دوست، صحیح معنوں میں دوست، ملک کے دوسرے علاقوں کی نسبت بنگال میں زیادہ تھے۔''

جب ہم ای ایف یو میں اصفہانی خاندان کے کردار کے بارے میں بات کرتے ہیں تو روشن علی بھیم جی کہتے ہیں کہ ''صدری

حیرت انگیز دوست ہے۔ میں اسے بے انتہا پسند کرتا ہوں۔ وہ سمجھتا تھا کہ ای ایف یو کے لیے کیا کچھ کرنا چاہتا تھا اور میرے کئی دوسرے خیالات سے بھی متفق تھا۔ وہ سچا بنگالی ہے۔"

جب میں صدری سے اُن کے دفتر میں ملاقات کے بعد وداع ہونے لگا جہاں انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مجھے خوش آمدید کہا تھا تو میں ان کا بہت شکر گزار تھا۔ انھوں نے نہ صرف بڑے صبر سے میرے سوالات سنے تھے اور بغیر کسی جھجک کے ان کے جوابات دیے تھے، انھوں نے گرم جوشی کی ایک فضا بنا دی تھی جس میں ہم ای ایف یو کے ماضی میں ان کے والد کے کردار اور خود ای ایف یو کے بارے میں باتیں کر سکتے تھے، جس سے میں بہت خوش ہوا تھا۔ ان کا انداز اِس بات کا غماز تھا کہ کمپنی کے ابتدائی دنوں میں ان کا خاندان اس کے لیے طاقت کا ستون تھا۔

اسی نوعیت کا مجھے اس وقت بھی احساس ہوا تھا جب میں نے، اصفہانی خاندان کے دوسرے طبقے سے جو بنگلہ دیش بننے کے بعد الگ ہوگیا تھا، یعنی ابوالحسن مرحوم کی بیگم قمر اصفہانی سے باتیں کی تھیں۔

انھوں نے کہا، "کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس خاندان کے دونوں حصوں کے ایک دوسرے سے اچھے تعلقات نہیں ہیں۔ سچ یہ ہے کہ خاندان کے دونوں دھڑوں میں جھگڑے بنگلہ دیش کے قیام کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئے تھے۔ ایسا شاید کبھی نہیں ہوتا مگر کچھ لوگوں کی انا اور خود پرستی اس کا باعث بنی تھی، بالکل اسی طرح جیسے بڑے خاندان کے بارے میں الجھے ہوئے ناٹکوں میں المناکیاں دکھائی جاتی ہیں۔ اور یہ سیاسی واقعات ہمارے خاندان پر بھی اثر انداز ہوئے۔ مثال کے طور پر آدمجی خاندان ہی کو لے لیا جائے۔ بے شک دولت اہمیت رکھتی ہے مگر ساتھ ہی تباہی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ بھائی بند، خاندان والے آپس میں بہت خفیہ مگر ظالمانہ انداز میں لڑتے بھی ہیں۔"

بیگم قمر ایرانی النسل ہیں، ایک جاذبِ نظر خاتون، ایک پیشہ ور ایرانی سفارت کار کی بیٹی جس نے دوسری عالمی جنگ کے دوران کئی برس برلن میں خدمات انجام دی تھیں۔ یہ ابوالحسن کی دوسری بیوی ہیں۔ ان کی شادی اس وقت ہوئی تھی جب ابوالحسن لندن میں پاکستان کے ہائی کمشنر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انھیں قمر سے شادی کی بنا پر استعفیٰ دینا پڑا تھا اس لیے کہ قوانین کسی غیر ملکی سے شادی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ بعد میں وہ محمد علی بوگرہ کی حکومت میں وفاقی وزیر برائے صنعت و تجارت بنائے گئے، جن دنوں غلام محمد ملک کے گورنر جنرل تھے۔ مگر ان کی بیوی کے مطابق، ابوالحسن ملکی کی سیاسی فضا سے خوش نہیں تھے اور انھوں نے بالآخر عملی سیاست چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔

بیگم قمر کے مطابق، "استعفے کے بعد ابوالحسن نے لکھنا شروع کر دیا، اور بہت لکھا۔ آپ شاید واقف ہیں کہ انھوں نے مسٹر جناح سے اپنے روابط پر دو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اور انھوں نے پاکستان میں کئی مقامات پر اور دنیا بھر میں خطبے دینے شروع کر دیے۔ اس سلسلے میں وہ بہت مصروف ہو گئے۔ ان دنوں ہمارے گھر میں بہت سے سیاستدان آتے جاتے تھے۔ ایک طرف سے بھٹو آتے تھے اور دوسری جانب سے بہت سے دوسرے لوگ، جوان نسل کے بھی، جن کی وہ بہت ہمت افزائی کرتے تھے۔ میرے شوہر ایک بزرگ سیاسی مدبّر بن چکے تھے مگر بدقسمتی سے لوگ ان کے مشوروں کو قبول نہیں کرتے تھے۔ وہ جناح کی طرح سوچتے تھے مگر وہ اس زمانے کا مروّج انداز نہیں رہ گیا تھا۔"

ابوالحسن کے دو بیٹے تھے، Isky 'اسکی' اور ضیاء تھے، ایک بیٹی جس کا نام ایران تھا۔ بڑا بیٹا پاکستان کا سر برآوردہ تاجر ہے۔ خاندانی کاروبار میں شمولیت کے بعد وہ "جوٹ ملز ایسوسی ایشن" کے سب سے کم عمر چیئر مین بنے تھے۔ انھی دنوں وہ اور بھی بہت سے بین الاقوامی اداروں کے سربراہ تھے۔ جب مشرقی پاکستان جدا ہوگیا اور اس کے ساتھ اصفہانی کے پٹ سن کی کارخانے بھی، تو شہنشاہ ایران نے ان کو ایران میں پٹ سن کا کارخانہ لگانے کا مشورہ دیا اور انھوں نے کامیابی سے یہ کارخانہ لگا دیا۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد انھوں نے اپنے وطن (پاکستان) واپس آنے اور اپنے بہت قدیم خاندانی ادارے ایم ایم اصفہانی لمیٹڈ کی سربراہی سنبھالنے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنے عم

زاد کے ساتھ انھوں نے اس کو چائے کی صنعت کا ایک عظیم ادارہ بنا دیا۔ اپنے خاندانی اندازِ تجارت کے باعث انھوں نے کئی صنعتی ادارے قائم کیے، جن میں بیشتر بین الاقوامی اداروں کی ایجنسی اور سیلون شپنگ کارپوریشن کی نمائندگی شامل تھی۔

ان کے بھائی ضیا نے اپنے والد کی نقشِ قدم پر چلنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ پیپلز پارٹی کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی میں پاکستان کے سفیر کے فرائض انجام دیے۔

بیگم قمران کے تین بچوں کو اپنے بچوں کی مانند سمجھتی ہیں۔ "جب میں نے ان سے شادی کی تو میں نے کہہ دیا تھا کہ میں ان کو اپنے بچے کہوں گی اس لیے کہ نہ صرف میں اپنے شوہر سے بلکہ ان کے بچوں سے بھی محبت کی ہے اور میں ان کی اسی طرح نگہداشت کروں گی گویا وہ میرے ہی خون اور میری ہی گود ہیں۔ بعد میں جب ان لوگوں کے اولاد ہوئی تو میں زچہ خانے میں خود موجود ہوتی تھی۔ لوگ اس کو میرا مسخرہ پن کہیں تو کہیں، مگر میں سمجھتی ہوں کی انسان کو ہمیشہ اور ہر حالت سے بہتر نتائج نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو آپ اس کی شخصیت سے اور اس کے اطوار و اسلوب سے بھی محبت کرتے ہیں۔ مگر میں نے اس انسان سے زیادہ محبت کی ہے، بس وہ جو کچھ بھی تھا اس محبت سے کی ہے۔ چوں کہ میں ان سے محبت کرتی تھی تو میں نے ان کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میں اپنے ملک، ایران، واپس جا سکتی تھی مگر میں نہیں گئی۔ میں اس لیے نہیں گئی کی میں جانتی تھی کہ وہ اپنے ملک سے بہت محبت کرتے تھے اور اس وجہ سے میں نے یہیں قیام کا فیصلہ کرلیا۔"

اپنی گوں ناگوں سیاسی مصروفیات سے فراغت کے بعد ان کے شوہر نے سماجی سدھار میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کر دیا تھا، خصوصاً بچوں کی بہبود میں۔ بیگم قمر نے بتایا کہ "انھوں نے ایک ادارہ 'کاشانۂ اطفال' کے نام سے بنایا تھا جو آج ۳۸ برس بعد بھی چل رہا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ تعلیم کی ترویج میں صرف کیا ہے اس لیے کہ اگر آپ کسی قوم کے لیے واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ ہر فرد کے لیے ضروری ہوتی ہے، مگر لڑکیوں کے لیے سب سے زیادہ اہم، اس لیے کہ انھیں اپنی اولاد کی تربیت کرنی ہوتی ہے۔ میں عوامی بہبود کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا کام کرتی ہوں۔ ہماری کوئی اور مدد نہیں کرتا، ہم جو کچھ کرتے ہیں اپنی کوششوں سے اور اپنے دم قدم سے۔ میں اس کام سے بہت پیار کرتی ہوں، مجھے کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ ملک کے لیے یہ بہت اہم ہے۔ تعلیم کی کمی ہماری قوم پر ایک لعنت کی مانند ہے۔ لوگ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنے ماضی سے واقف نہیں ہونے پاتے۔ یہ میرے مرحوم شوہر کا ورثہ ہے۔ میں پاکستان کے عوام کو اس کا ذمے دار ٹھہراتی ہوں، وہ تعلیم کے سلسلے میں اتنا کام نہیں کر رہے ہیں جتنا کہ ہونا چاہیے۔ وہ اپنے لیے ایک وطن چاہتے تھے مگر اب اس کی ترقی کے لیے ذاتی کوشش نہیں کرتے جتنی کہ ہونی چاہیے۔ جو اقتدار میں ہیں وہ مفلسوں کے لیے، عوام کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ یہ انصاف نہیں، نہ ہی یہ اسلام کے اصولوں کے مطابق ہے۔

میں نے سوچا کہ اتنا بڑا خاندان، ایک اس پار اور دوسرا اُس پار، کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ دونوں اس کیفیت میں آئے ہی کیوں؟

بیگم قمر اور ان کے بیٹے 'اسکی' ای ایف یو کے بورڈ آف ڈائریکٹرز پر ۱۹۸۹ء تک رہے۔ اس کے بعد ہی یعنی پچاس برس بعد، پاکستان کے اس قدیم بیمے کے ادارے سے اصفہانی خاندان کے تعلقات ختم ہو گئے۔

راجا صاحب محمود آباد

راجا صاحب محمود آباد

ایک ذی شرف درویش

جس شخصیت سے انسان اچھی طرح واقف نہ ہو اس کا تذکرہ کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ میں راجا صاحب سے ۱۹۶۹ء میں ای ایف یو کے دفتر قمر ہاؤس میں میں صرف ایک بار ملا ہوں۔ اس وقت کمپنی کے چیئر مین اپنے قریبی دوست راجا صاحب کو مینجنگ ڈائریکٹر روشن علی بھیم سے ملانے کے لیے لائے تھے۔ میں ٹوکیو سے میونخ جارہا تھا اور کراچی کے دوستوں سے ملاقات کے لیے تھوڑے دن کے لیے یہاں ٹھہر گیا تھا۔ میں راجا صاحب کے بارے میں اتنا کچھ سُن چکا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں ان سے پہلے مل نہیں سکا تھا۔ یہ اس لیے اور بھی حیرت انگیز تھا کہ مسٹر بھیم جی ان کے بڑے مداح تھے، اور سید سبطِ حسن بھی جو نہ صرف تعلقاتِ عامہ کے ڈائریکٹر بلکہ ایک ممتاز ادیب اور دانشور تھے۔ دونوں کا کہنا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے جتنے قابلِ احترام رہنما پیدا کیے ہیں، ان میں قائدِاعظم کے بعد، راجا صاحب جیسا سچا رہنما کوئی نہ تھا۔ یہ دونوں راجا صاحب کے بہت چاہنے والے تھے اور جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا، انھوں نے جس مقصد کے حصول کے لیے اپنا سارا اثاثہ، اپنی آرام دہ زندگی کو خیر باد کہہ دیا تھا، تاہم اس نے، جو ایک دن حاصل ہوگیا تھا، ذاتی طور پر اُن کے ساتھ وفا نہیں کی۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے تناظر میں اس داستانوی شخصیت کے بارے میں مجھے کے۔ ایف۔ حیدر صاحب بہت کچھ بتا چکے تھے۔ راجا صاحب نواب بھوپال کے اس مختصر سے حلقے کے فرد تھے میں جن کا تذکرہ حیدر صاحب اور عبدالرحمٰن صدیقی کے خاکوں میں کرچکا ہوں۔ انھوں نے تمام زندگی اپنی پارٹی اور اپنے عزیز ترین رہنما محمد علی جناح کی، جنھیں وہ انکل کہا کرتے تھے، پورے دس برس تک خدمت کی، جب تک کہ پاکستان حاصل نہیں ہوگیا تھا مگر یہ قوم جس نے لاکھوں مسلمانوں کو پناہ دی تھی وہ اپنے ایک ممتاز محسن کے لیے کچھ نہ کرسکی۔

اُسی صبح اخبارات میں ان کے بارے میں کچھ مضامین شائع ہوئے تھے، دفتر جانے سے قبل میں نے جن پر سرسری نظر ڈالی تھی مگر مجھے کیا خبر تھی کہ مجھے اس مسلم لیگ کے ماضی کی اس نامور شخصیت سے ملاقات کا موقع میسر ہوگا جو قائد کے دو جاں نثاروں میں سے ایک تھی، دوسری شخصیت ابوالحسن کی تھی میں جن سے ای ایف یو کے حوالے سے واقف تھا۔ کراچی پریس کلب میں راجا صاحب کے اعزاز میں ایک استقبالیے کا انتظام کیا گیا تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ اس صوفی منش انسان سے میں کتنا مرعوب ہوا تھا جب ایک صحافی نے ان کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا کہ اپنا سب کچھ پاکستان پر قربان کردینے کے بعد وہ اب لندن میں خودساختہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ میں اس مضمون سے بہت متاثر ہوا تھا اس لیے کہ اس کو پڑھ کر مجھے ایک اور بڑی پاکستانی شخصیت یاد آگئی میں جس سے روشن علی بھیم جی کی معرفت میں لندن کے ایک فلیٹ میں ملا تھا، جس کو اس کے ایک قریبی دوست جنرل ایوب خان، مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ملک سے نکال باہر کیا تھا۔

اخبار کے اس مضمون میں راجا صاحب محمود آباد کو اشرافیہ کی شائستگی اور شہری سادگی کے بہترین نمونے کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

ایک ایک کر کے اس مضمون کے سارے جملے مجھے یاد آنے لگے جب اچانک ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ وہ کھدر کی شیروانی میں ملبوس ایک معمولی سی چپل پہنے ہوئے تھے۔ سو یہ تھا وہ انسان، اشرافیہ کا ایک وارث، جس کا باپ بھی اتنا ہی مشہور تھا، میں نے جس کے بارے میں، سنا تھا کہ وہ قائدِ اعظم کا سب سے قریبی دوست تھا۔ قائدِ اعظم کی شادی کی انگوٹھی، جو انھوں نے اپنی پیاری اور نہایت خوب صورت بیوی کو پہنائی تھی، اسی کے بلند مرتبہ والد، مرحوم مہاراجا محمد علی محمد خان کی جانب سے تحفہ تھی، جن کی جاں نثاری اور شوقِ وطن پرستی نے ان کے بیٹے امیر احمد کو بہت متاثر کیا تھا۔ میں نے ان کے بیٹے کے بارے میں تو بہت کچھ سنا تھا مگر خود ان کی ذات میرے لیے اجنبی تھی، جب تک کہ میں نے اس کتاب کے سلسلے میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں خاصا مطالعہ نہیں کر لیا تھا جو اس آزادی اور اس طاقت کے بارے میں تھی جسے برطانیہ نے ہڑپ کر لیا تھا۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب Pathway to Pakistan میں بہت واضح انداز میں ان خدمات کی تلخیص پیش کی ہے جو اس مردِ مجاہد نے مسلمانوں کے مقاصد کے حصول کے سلسلے میں انجام دی تھیں۔ وہ مرحوم آغا خان کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ جب آغا خان آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت پر فائز تھے تو یہ اکثر ان کی نیابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ جب آغا خان نے صدارت سے استعفیٰ دیا تو مہاراجا نے اس وقت تک تا حیات صدارت کا بار اُٹھایا جب ۱۹۱۸ء میں خرابیِ صحت کے باعث انھیں اس باعزت اور نہایت اہم عہدے کو چھوڑنا پڑا تھا۔

''پندرہ برس کے عرصے کے لیے انھیں مسلم سیاست اور تعلیمی سرگرمیوں کو عملی طور پر چھوڑنا پڑا تھا جو ان کی زندگی کے اطراف گھومتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ ایسے کارآمد لوگوں کو سامنے لے آئیں جو مستقبل میں قوم کی رہنمائی کے قابل ہو سکیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ میں جناح صاحب کو یہی لے کر آئے تھے۔ سر وزیر حسن کا سیاسی کردار بھی ان ہی کا مرہونِ منت تھا۔ محمد علی سے بھی انھیں بہت قربت تھی ۔فراخ دلی سے ان کے اخبار 'کامریڈ' کی لاکھوں روپے کی مالی امداد بھی یہی فراہم کرتے تھے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی اور طبّی کالج بھی انھیں کے دستِ تعاون کے مظہر تھے اور یہ انھیں بھی فراواں مالی امداد فراہم کرتے تھے۔ ان کے خیراتی کاموں اور دریا دلی کے تفصیلی بیان کے لیے ایک الگ کتاب چاہیے ہوگی۔''

سید اشتیاق حسین نے مہاراجا کے فرزندِ ارجمند امیر احمد کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ ''ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں خالص اہلیت کی بنا پر مہاراجا کو ایک قومی رہنما کا رُتبہ حاصل تھا۔ وہ ذات اور نسل سے ماورا، عوام اور اپنے عصر کی اہم شخصیات میں بہت محترم اور مقبول تھے۔ ملک کی سرکردہ سیاسی شخصیتوں میں یہ شخصی کشش کا مرکز تھے۔''

ملک کے رہنما، پنڈت موتی لال نہرو، محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، سروجنی نائیڈو، مسز اینی بسنت وغیرہ ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ وہ ڈاکٹر محمد اقبال سے بہت پیار کرتے تھے۔ خصوصاً علی برادران سے ان کو بہت قربت تھی اور جب انگریز حاکموں نے ان دونوں کو چندواڑہ میں نظر بند کر رکھا تھا تو یہ ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔

محمد علی جناح ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ جب انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کے وقت اپنی حکمتِ عملی اور لائحۂ عمل کے بیان کے لیے ۱۹۳۶ء میں ایک کتابچہ ترتیب دیا تھا تو ان کو مندرجہ ذیل الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا:

''وقت کے گزرنے کے ساتھ، جو امداد اور تعاون ہندوستان کے چوٹی کے رہنماؤں نے کیا تھا، خصوصاً اس عظیم انسان، مہاراجا آف محمود آباد نے، جس کی بے غرض جاں نثاری، وطن پرستی کا جذبہ، اور مقصد کے لیے مستقل مزاجی مسلم لیگ کے لیے ایسی پشت پناہی، طاقت اور حمایت کا باعث ہوا ہے کہ آج مسلم لیگ اپنی ان بلندیوں پر پہنچ چکی ہے جس کا مینارۂ نور لکھنؤ معاہدہ ہے، جس کو لیگ کانگریس معاہدہ ۱۹۱۶ء بھی کہا جاتا ہے۔ یہ معاہدہ ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی ارتقا کا سنگِ میل، مقصد کی شناخت کا ثبوت، ہندوستان کے دو بڑے عوامی دھڑوں کے درمیان خیر سگالی کے جذبات اور ہندوستانی عوام کے لیے ایک ذمے دار حکومت کے حصول کی جدوجہد کا آئینہ دار ہوگا۔''

اور آج، اس جگہ ان کا بیٹا، روشن علی بھیم جی کے معمولی سے دفتر میں، عباس خلیلی اور ایک اور صاحب جن کا نام میرے ذہن سے اُتر چکا ہے، بیٹھا ہوا ہے۔ یقیناً اس نا معلوم شخص سے راجا صاحب اچھی طرح واقف رہے ہوں گے، اس لیے کہ مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتے تھے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ راجا صاحب جہاں بھی موجود ہوتے ہمیشہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے۔ ایک انسان جو میرے دوستوں کے خیال میں، بلا شبہ ہندوستان کے نامور سپوتوں میں سے تھا کہ اپنے والد کی طرح اس نے بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی میں نہایت نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے خازن اور آل انڈیا مسلم لیگ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر کی حیثیت میں انھوں نے آزادی کے قلعے میں اپنے لیے ایک مخصوص مقام بنا لیا تھا۔

انھوں نے جرمن زبان میں مجھے خوش آمدید کہا۔ مجھے بعد میں بتایا گیا تھا کہ وہ جرمن زبان اچھی طرح بول سکتے ہیں۔ ہم نے دوسروں کی موجودگی کی بنا پر جرمن زبان بولنے سے احتراز کیا۔ انھوں نے مختصراً بتایا کہ علی گڑھ میں ایک پروفیسر صاحب جرمن زبان سکھانے پر مامور تھے۔ میرے دوست روشن علی بھیم جی نے ہمیشہ کی طرح مجھے بڑے خلوص اور نہایت گرمجوشی سے گلے لگایا۔ مجھے فوراً احساس ہوگیا کہ ماحول بہت بے تکلف، پُرسکون، دوستانہ ہے۔ بظاہر یہ چند دوستوں کی ملاقات کا موقع ہے۔ میں بیٹھ گیا اور ان کے باتیں سننے لگا جو ہمیشہ کی طرح ملی جلی اردو اور انگریزی زبانوں میں ہو رہی تھی۔ پھر اچانک خلیلی صاحب اپنی کرسی سے اچھلے اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بولے، کرنوسکی، کیا تم اپنی زندگی میں کسی حقیقی درویش سے ملے ہو؟ ان کی طرف غور سے دیکھو، ایک درویش یہاں موجود ہے۔ اور انھوں نے راجا صاحب کی طرف اشارہ کیا، جو اس طرح مسکرائے جیسے وہ اس جملے سے لطف لے رہے ہوں۔ مجھے بہت بعد میں احساس ہوا تھا کی خلیلی کی اس جملے سے کیا مراد تھی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ کتنا عمدہ اور لطیف انداز تھا مجھے بتانے کا کہ راجا صاحب محمود آباد نہ صرف پرانی نسل سے تعلق رکھنے والے ایک معروف سیاست داں تھے بلکہ جنھوں نے ایک قوم کی تشکیل کی تھی، بلکہ ایک نہایت مذہبی انسان، ایک بلند مرتبہ مسلم دانشور، اور ایک ہی وقت میں صوفی بھی اور درویش بھی تھے۔ اور اب مجھے یاد آتا ہے کہ روشن علی بھیم جی بتاتے تھے کہ جہاں تک سیاسی نظریات کا معاملہ تھا، یہ دونوں بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے مگر مذہب کے معاملات میں دونوں کے درمیان ایک بُعد حائل تھا۔

اس کے بعد سے صرف میری موجودگی کی وجہ سے باتیں صرف انگریزی زبان میں ہونے لگیں۔ وہ پاکستان کے موجودہ سیاسی حالات پر گفتگو کر رہے تھے۔ بظاہر راجا صاحب، اپنی 'آنٹی' فاطمہ جناح سے مل کر آ رہے تھے جنھوں نے بڑی بہادری سے صدر ایوب خان کے خلاف صدارتی انتخاب لڑا تھا اور بہت کم ووٹوں سے ہاری تھیں۔ راجا صاحب جب پاکستان کے بارے میں بات کر رہے تھے تو مجھے بہت مایوس، بلکہ بیزار دکھائی دے رہے تھے، اس ملک کے لیے جس کی تشکیل میں، اپنی بساط کے مطابق، انھوں نے تن من دھن سے جدو جہد کی تھی۔ مجھے وہ بہت دل شکستہ انسان دکھائی دے رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، مجھے ایک اور شخصیت یاد آئی جس سے میں روشن علی بھیم جی کے ہمراہ لندن میں ملاقات کر چکا تھا۔ مگر اسکندر مرزا کے مقابلے میں، جو سیاست سے مکمل کنارہ کش ہو چکے تھے اور کسی بھی سیاسی گروہ سے متعلق نہیں رہ گئے تھے، راجا صاحب کی شخصیت محرومی اور جوش کے درمیان بٹی ہوئی تھی۔ ان کے بارے میں اخبار میں چھپنے والے مضامین سے میں نے محسوس کیا تھا گویا لوگ اس بات کے خواہش مند تھے کہ راجا صاحب کو عملی سیاست میں واپس آ جانا چاہیے۔ اور اس دن روشن علی بھیم جی کے دفتر میں ہونے والی بات چیت میں خلیلی اور بھیم جی دونوں نے بار بار راجا صاحب سے سوال کیا تھا کہ آخر وہ پاکستان میں آ کر قیام کیوں نہیں کرتے اور جمہوریت کے قیام میں ملک کی امداد کیوں نہیں کرتے۔ جب ان سے ایسے سوالات کیے جا رہے تھے مجھے آج بھی ان کا چہرہ یاد آتا ہے جو ان کی جسمانی ہیئت کے مقابلے میں بہت عمر رسیدہ دکھائی دے رہا تھا، ان کی آنکھوں کے اطراف کچھ مایوسی لہرا رہی تھی۔ میرے خیال میں وہ اس بات پر قطعی راضی نہیں دکھائی دے رہے تھے کہ ان کے مضبوط بازوؤں کو دوسروں کی ذمے

داریاں اٹھانے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اور ایک لمحے کے لیے ایسا لگا کہ ان کی آنکھیں بولنا چاہتی ہیں، سرگوشی کے انداز میں، جو ایک نرم گفتار اعتذار کے مترادف تھا۔

وہ اپنے اس بے نام دوست اور عباس خلیلی کے ساتھ واپس چلے گئے۔ میں نے روشن علی بھیم جی سے کہا کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ آج میری اس شخص سے ملاقات ہوگئی جس کے غیاب میں اُس کو بہت پسند کرتا تھا۔ اور میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے اس شخص کی بظاہر تنہائی اور مایوسی پر بہت ملال ہے۔ روشن علی بھیم جی نے ایک لمحہ توقف کیا۔ کچھ دیر ایک سناٹے کی کیفیت رہی۔ اس وقت ان کے اور میرے خیالات کے درمیان صرف ایئر کنڈیشنر کی آواز تھی جو برابر آ رہی تھی۔ پھر انھوں نے آہستگی اور مری ہوئی آواز میں کہا، ویسے ہی لہجے میں جو وہ ہمیشہ اس وقت استعمال کیا کرتے تھے جب وہ اپنے مخاطب تک کسی اہم بات کی ترسیل چاہتے تھے،'' تعجب کہ تم ایسا کہہ رہے ہو، مگر افسوس کہ ہم لوگ، اس ملک کے باسی، ابھی تک اپنی ممتاز شخصیات کی اچھائیوں اور ان کے بڑے پن کا، جو انھوں نے اس ملک پاکستان کے لیے کیا ہے، تجزیہ کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا کر سکے ہیں۔''

ہوٹل واپس پہنچ کر میں نے راجا صاحب محمود آباد کی سوانحی تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش کی جس سے ان کے اس کردار پر روشنی پڑ سکے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی اور پاکستان کی تشکیل کے عمل کے دوران رہا ہے۔ مگر آج تیس برس بعد میرے ہاتھ ایک کتاب آئی ہے، اشتیاق حسین صاحب کی لکھی ہوئی جو بظاہر ان سے اچھی طرح واقف بھی تھے اور ان سے محبت بھی کرتے تھے۔ کتاب کا عنوان ہے 'The Life and the Times of Raja Saheb of Mahmudabad, Glimpses of Freedom Movement' بہت اچھی لکھی ہوئی اور ایک خوب صورت کتاب۔ میرے تن بدن میں ایک پُر اسرار لہر سی دوڑ گئی جب مجھے پتا چلا کہ میرے دوست کراچی میں اس کتاب کو تلاش کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ شہزادی عابدہ سلطان نے ملیر میں ملاقات کے دوران مجھ سے اس کتاب کا تذکرہ کیا تھا۔ کچھ سربرآوردہ لوگوں نے اس کتاب میں راجا صاحب کے بارے میں تعارفی اور عمیق احترام کے جذبات پیش کیے تھے۔ اور اپنے پیش لفظ میں مصنف نے امید ظاہر کی تھی کہ یہ کتاب آنے والی نسلوں کے دلوں کو برانگیختہ کرے گی۔ ان کی اس عاجزانہ امید کے پیشِ نظر میں اس کتاب کے کچھ اقتباسات اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔ شاید بعد میں ان میں سے کچھ اس کتاب کا خود مطالعہ کرنا چاہیں۔ میں اس مقام پر صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ اس، اشرافیہ کے فرد اور درویش شخصیت، سے تفصیلی ملاقات ایک حیرت ناک تجربہ ہوگا جو میں اس کتاب میں نقل کرنے سے قاصر ہوں۔

''قدرت اور حالات راجا محمد امیر احمد خاں پر مہرباں رہے ہیں جو محمود آباد ریاست کی اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۵ رنومبر ۱۹۱۴ء کو وہ پیدا ہوئے اور ان کی پرورش شاہی محل کے ناز و نعم میں ہوئی۔ وہ مہاراجا محمد علی محمد خاں والیِ ریاست محمود آباد کے سب سے بڑے بیٹے اور ریاست کے ولی عہد تھے۔ لہٰذا نوجوان امیر احمد خاندان کی محبتوں کا مرکز تھے۔ انھیں ایک جدید اور رئیس خانداں کی ساری سہولتیں حاصل تھیں اس کے باوجود ان کا اندازِ حیات نوابینِ اودھ کی روایتوں کا امتزاج تھا۔ ایک طرف تو انھیں ایڈورڈ عہد کے کسی لارڈ کے بیٹے جیسی تعلیم دی گئی تھی۔ ان کے لیے بہترین اساتذہ اور اتالیق مقرر کیے گئے تھے، جن میں سے ایک وہ تھے جو شیکسپیئر پر 'اتھارٹی' تھے۔ دوسری طرف قومی دانشوروں نے ان کو مشرقیت اور تہذیب کی، آپس میں گندھی ہوئی شاخوں کے علوم کی تعلیم دی تھی۔ نوجوان راجا کو قدرت نے مردانہ حسن و جاہت اور کرشماتی شخصیت سے نوازا تھا۔ ایسی شخصیت اور آداب کے امتزاج کے باعث ان کو مشرق اور مغرب دونوں میں پسندیدہ افراد میں شمار کیا جاتا تھا۔

راجا امیر احمد کی والدہ ایک ممتاز موسوی سیّد خاندان کی بیٹی تھیں جو ایران کے شہر اور تعلیمی مرکز، نیشاپور سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہو گیا تھا۔ ان کے خاندان نے بہت سے مشہور دانش ور پیدا کیے تھے۔ ابتدائی تعلیم اور ریاستی آداب اور سرکاری تشریفات کے اچھے

ہوئے نظام سے عہدہ برآ ہونے کے بعد نوجوان امیر احمد کو باقاعدہ تعلیم کی غرض سے College La-Martimiere لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا۔ کالج کے احاطے میں سرسبز میدان، پھولوں کی کیاریاں، فراخ باغیچے اور ایک بڑا سا تالاب تھا۔ مرکزی عمارت ایک خوب صورت، شہانہ تزئین تعمیر کا نمونہ یا جو رومن ریاستی تعمیرات سے مشابہت رکھتی تھی۔ کالج کا ماحول اعلیٰ یورپی معاشرے اور تہذیب کا آئینہ دار تھا۔ اساتذہ کی اکثریت یورپی پر برطانوی تھی۔ ایسے غیر معمولی مکتب سے امیر احمد خان نے سینئر کیمبرج کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

اس سے پہلے کہ نوجوان امیر احمد خان کی تعلیم مکمل ہوتی مہاراجا صاحب کا انتقال ہو گیا۔ پھر بھی راجا صاحب کی ایک غیر ملکی نصابی تعلیم کے اختتام کی خوشی میں ریاستی محل میں ایک پُر وقار تقریب منعقد ہوئی۔ نوجوان راجا صاحب اب فنونِ لطیفہ میں اپنی تعلیم جاری رکھنے اور ڈگری حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور سے رابطہ کیا تا کہ ان کو شانتی نکیتن میں داخل کر لیا جائے۔ ڈاکٹر ٹیگور ان کو داخلہ دینے پر بخوشی راضی ہو گئے۔ مگر جناح صاحب کی مداخلت سے یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا جنھوں نے تاکیداً کہا، 'میں تمھاری یونی ورسٹی ہوں۔ اگر تم میرے ساتھ کام کرو تو تمھیں ہر طرح کی تعلیم حاصل ہو جائے گی۔''

ان کے والد کی جناح صاحب سے قریبی دوستی تھی اس کی وجہ سے امیر احمد بچپنے سے اپنے 'انکل' کے ساتھ ساتھ رہتے۔ مہاراجا صاحب کی وصیت کے مطابق محمود آباد ریاست وقف کے متولی ہونے کی وجہ نے ان کو اور بھی قریب کر دیا تھا۔ اس موقعے نے جناح صاحب کو نہ صرف محمود آباد ریاست کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کر دی بلکہ وہ نوجوان امیر احمد کے ذہنی جھکاؤ، پُر جوش جاں نثاری اور نرم خوئی سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئے۔''

اس وقت ان کے والد بقیدِ حیات تھے جب ۱۹۲۷ء میں ان کی شادی رانی کنیز عابد سے ہوگئی، جو بلہرہ اسٹیٹ کے راجا ابوالحسن خان کی بیٹی تھیں۔

''امیر احمد کی شادی ان دنوں کے بہت رنگین مواقع میں سے تھی جو صحیح معنوں میں روایتی مسلم تہذیب کی آئینہ دار تھی۔ تمام مقامی ریاستوں کے حکمراں، ممتاز شہری، سیاست داں، اشراف، بڑے زمیندار اور سماج کے مختلف طبقوں کے نمائندے شادی میں مدعو تھے۔ عالیجاہ نظام حیدر آباد کی جانب سے ان کے ایک ذاتی افسر نے نمائندگی کی جب رامپور کے حکمراں نے بہ نفسِ نفیس شرکت کی تھی۔ مسٹر جناح نے بھی شرکت کی خاطر بمبئی سے محمود آباد تک کا سفر کیا تھا۔ وہ تحفے میں کچھ قیمتی اشیا لائے تھے جن میں خالص ریشم کی اچکن تھی جس پر طلائی نقوش کاڑھے گئے تھے۔ محمود آباد کا پورا شہر بھرپور طرح سے سجایا گیا تھا۔ بڑے پیمانے پر روشنی کے علاوہ ریاست کی پوری رعایا دعوت میں شریک تھی جو کئی دنوں تک چلتی رہی تھی۔ شادی کا جلوس صحیح معنوں میں ایک جشن تھا، ایک غیر معمولی ماجرا تھا۔

بالغ ہونے پر اور ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے کے سلسلے میں ایک سرکاری تقریب منعقد کی گئی تھی۔ ریاست کی روایت کے مطابق صوبے کے گورنر نے نوجوان شہزادے کی حکمرانی کا علان کیا تھا۔

اسلامی اور مشرقی تہذیب میں پوری طرح رچا ہوا امیر احمد خاں اپنی والدہ کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس لیے اس نے کسی اور کے علاوہ پہلے اپنی والدہ کے ہاتھوں تاج پہننا پسند کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک خاص دربار میں گئے جہاں یوپی کے گورنر نے ان کو سرکاری طور پر راجا مقرر کیا۔ جب تقرر کی سرکاری تقریب ختم ہوئی تو شہزادے نے جا کر تاج کو اپنی والدہ کے قدموں میں رکھ دیا۔ یہ عمل عقیدت کے اس بلند ترین رُتبے سے اپنے احترام کا اظہار تھا جو شہزادے کے دل میں اپنی ماں کے لیے تھا۔

امیر احمد نے ۱۹۳۳ء میں پہلی بار مشرقِ وسطیٰ اور یورپی ممالک کا سفر اختیار کیا۔ لندن پہنچ کر انھوں نے مے فیئر کورٹس میں قیام فرمایا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جناح صاحب خود ساختہ جلاوطنی اختیار کیے ہوئے تھے اور ہیمپسٹڈ ہیتھ میں مقیم تھے۔ امیر احمد اپنے انکل سے ملنے کئی بار گئے اور ان سے مختلف مسائل پر بات چیت کی جس میں ہندوستان کے سیاسی مسائل شامل تھے۔ تقریباً ہر ملاقات میں جناح صاحب

ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں اپنی تشویش اور فکر کا اظہار کرتے۔

ایک شام جب وہ دونوں برکلے ہوٹل میں رات کا کھانا کھا رہے تھے ہمیشہ کی طرح انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اپنی بے انتہا تشویش کا اعادہ کیا اور راجا صاحب سے کہا کہ ان لوگوں کے لیے کچھ کرنا ہی ہوگا۔ امیر احمد نے ان کی تشویش سے متاثر ہو کر ان کو ہندوستان واپس جاتے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی سربراہی سنبھالنے اور اس میں نئی روح پھونکنے کا مشورہ دیا۔ جناح صاحب نے تفصیل سے وسائل اور پُرخلوص کارکنوں کی کمی سے پیدا ہونے والی الجھنوں کی وضاحت کی۔ انھوں نے اس شرط پر واپسی پر راضی ہونے کا وعدہ کیا کہ وہ (امیر احمد) ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے۔ امیر احمد نے ایک لمحہ بھی تامّل کیے بغیر عہد کر لیا اور از خود ہر قسم کی مادّی معاونت کی پیشکش کر دی جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے درکار ہوگی۔ جناح صاحب اس نوجوان کے جذبے سے بے حد متاثر ہوئے اور ہندوستان کے سرنگوں مسلمانوں کی خدمت اور مسلم لیگ کو ایک وسیع اور متحرک ادارہ بنانے کی غرض سے بہت جلد ہندوستان واپسی کا وعدہ کر لیا۔

اگرچہ جناح صاحب دسمبر ۱۹۳۳ء کے آخری ہفتے میں ہندوستان واپس ہوئے، ان کے اگلے کئی برس دونوں ملکوں کے درمیان بحری سفر میں گزر گئے۔ آخر کار اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مستقل طور پر ہندوستان منتقل ہو گئے اور مسلم لیگ کے احیا کا منصوبہ بنالیا۔

راجا صاحب نے ۵/مئی ۱۹۳۶ء کو باقاعدہ آل انڈیا مسلم لیگ کی رُکنیت حاصل کر لی اور جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب قائد کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد سے راجا صاحب قائد سے اپنی وفاداری اور ان کے مقصد کی لگن سے کبھی نہیں ڈگمگائے۔

مئی ۱۹۳۶ء میں جناح صاحب نے ۵۴/ارکان پر مشتمل آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی بورڈ کا اعلان کر دیا اور راجا صاحب محمود آباد اس کے خازن مقرر کر دیے گئے۔

راجا صاحب کے روپ میں جناح صاحب کو ایک پُرخلوص انسان مل گیا جو اس ادارے کے کچھ مفادات کی دیکھ بھال کے لیے موزوں تھا۔ نوجوان راجا نے جس کی عمر اگرچہ صرف بائیس برس کی تھی، ثابت کر دیا کہ وہ ان فرائض کو پوری طرح ادا کرنے کے اہل تھے جو ان کو سونپے گئے تھے۔ اپنے لاہور کے سفر کے دوران جناح صاحب نے پنجاب کے دیرینہ مسلم لیگی ملک برکت علی اور علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال سے راجا صاحب کا تعارف کرایا۔ دونوں رہنماؤں نے نوجوان راجا صاحب کو اپنے حلقے میں شمولیت پر خوش آمدید کہا اور ان کو مسلم لیگ کی ترتیبِ نو کے سلسلے میں اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ علامہ اقبال نے راجا صاحب سے مسلم لیگ کے اگلے اجلاس کو لاہور میں منعقد کرنے کی خواہش کی۔ راجا صاحب نے اس اقدام کی تعریف کی اور اس سلسلے میں تمام ضروری اور امکانی تعاون کا یقین دلایا۔

راجا صاحب سیاست میں پورے جوش وخروش اور جذبے کے ساتھ داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنے ملک کے عوام کی خدمت کو اپنا مقدس فرض سمجھتے ہوئے اپنی دولت لٹادی تاکہ غریب لوگوں کی حالت میں بہتری لائی جا سکے۔ انھوں نے ملک کے کونے کونے تک سفر کیا تاکہ وہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کا خود احاطہ کر سکیں۔ انھوں نے ملک کے طول وعرض میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کیں، لوگوں کو ملازم رکھ کر اور مقررین کی خدمات کے ذریعے مسلم لیگ کا پیغام عام کیا۔ اس طرح وہ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے خود سیکڑوں ہزاروں چھوٹے بڑے اجتماعات سے خطاب کیا اور سامعین پر واضح کیا کہ تحریک ایک بڑے بحران سے گزر رہی ہے:

انھوں نے کہا، ''ہر مسلمان کو مسلم لیگ کے لائحۂ عمل اور منصوبوں کے پیچھے متحد ہو کر کھڑا ہونا چاہیے۔ سب کو اپنے رہنما قائدِاعظم محمد علی جناح کی پیروی کرنی چاہیے جو مسلمانوں کے جذبات کی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہمیں ان کے عقب میں چٹان کی طرح کھڑا ہو جانا چاہیے۔''

ایک ممتاز تعلیم یافتہ انسان ہونے کے علاوہ وہ پور پور مہذب تھے۔ ان کی پرورش اودھی تہذیب کے پالنے میں ہوئی۔ ان کی قائدِ اعظم سے قربت ہوئی، تو اس لیے نہیں کہ وہ ایک رہنما یا سیاست داں تھے۔ امیر احمد خان اپنے والد کے دوست کی حیثیت سے ان کا بے حد

احترام کرتے تھے اور ان کو اپنا 'انکل' مانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قائد سے ان کا طرزِ عمل خوش خلقی اور فرماں برداری سے مملو ہوتا تھا۔ پختہ کار ہونے کی وجہ سے وہ اچھائی اور برائی کے مختلف رنگوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اصولوں اور لائحۂ عمل کے معاملات میں قائد سے اختلاف کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ قائد سے وفاداری میں متزلزل ہوئے ہوں۔ انھوں نے قائد کو اول تا آخر پیار اور احترام دیا تھا۔

امرا اور رُوسا کے درمیان پیدا ہونے کے باوجود، راجا صاحب اس سماج میں کبھی آرام سے نہیں رہے، وہ جس کا حصہ تھے۔ نوجوانی کی بے راہ روتر غیبات کے سامنے انھوں نے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ بچپن ہی سے وہ سادہ رہن سہن اور پُر مشقت زندگی کے عادی تھے۔ خاص اوقات کے لیے قیمتی ملبوسات اور مہنگے کپڑے پہننے کے بجائے وہ گھروں میں بنے ہوئے کھدّر سے بنے لباس پسند کرتے تھے۔ یہ اثرات ان کی ماں سے منسوب کیے جاتے ہیں جو ایک منکسر مگر علمی گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس طرح وہ محمود آباد ہاؤس میں اکثر آنے والے کھدّر پوش رہنماؤں کے لیے اجنبی نہیں ہوتے تھے۔ نوجوان امیر احمد اگر چہ ملاقاتیوں اور مہمانوں کی ریاست محمود آباد کی روایات کے مطابق عمدہ قسم کی ماکولات اور مشروبات سے تواضع کرتے مگر خود ان کی غذا عموماً جو کی روٹی اور ساگ اور ترکاریوں پر مشتمل ہوتی۔ انھوں نے گدیلے بستروں کے بجائے عام قسم کی چارپائی کو اپنا بستر بنالیا تھا۔ کئی برس تک تو وہ زمین پر سوتے تھے اور بستر کی جگہ چٹائی ہوتی تھی۔

ایک زمانے میں تو انھوں نے اپنی ریاست حکومت کو واپس کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ حتیٰ کہ اس سلسلے میں گورنر جنرل سے رابطے بھی کر لیے تھے مگر عین وقت پر جناح صاحب کی مداخلت کہ وجہ سے وہ اپنی اس شدید خواہش پر عمل نہیں کر سکے تھے۔ جناح صاحب نے انھیں سمجھایا کہ اگر چہ ان کو دولت اور امارت سے کوئی لگاؤ نہیں، تاہم اگر محمود آباد اسٹیٹ کا وجود ختم ہو گیا تو وہ سارے ادارے جو عوام کی بہبود اور خدمت کے لیے کام کرتے ہیں محمود آباد اسٹیٹ سے ملنے والی مالی امداد سے محروم ہو جائیں گے۔ ایک بار اسٹیٹ ختم ہو گئی تو اس کو دوبارہ قائم نہیں کیا جا سکے گا۔

یہ وہ پس منظر تھا جس کے پیشِ نظر جب جناح صاحب نے برِّصغیر کی آزادی کی جدو جہد میں راجا صاحب کی شمولیت کی خواہش کی تھی اور انھوں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنی تمام جائیداد مسلم لیگ کے اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے جناح صاحب کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ان کے اس عمل پر صوبائی گورنر کو طیش آ گیا اور اس نے راجا صاحب کو فوراً طلب کرلیا۔ اپنے اختیارات کے نشے میں گورنر نے شہزادے کو دھمکی دی کہ سیاست میں ان کی عملی شمولیت کی بنا پر وہ اپنی موروثی جائیداد سے محروم ہو سکتے ہیں اور یہ بھی کہ انھیں فوراً برطانوی راج کے سب سے بڑے دشمن جناح سے علیٰحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔ نتائج سے بے خبر، راجا صاحب نے گورنر کا حکم بجالانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے صاف الفاظ میں گورنر کو بتا دیا کہ وہ جناح صاحب سے وعدہ کر چکے ہیں اور اب ان کے لیے پیچھے ہٹنا ممکن نہیں۔''

دسمبر ۱۹۴۳ء کی تیسری تاریخ راجا صاحب کے لیے بہت خاص دن تھا۔ ان کی بیوی نے اولادِ نرینہ کو جنم دیا تھا جو ان کا ولی عہد تھا۔ ''ریاست کی روایات اور رسوم کے مطابق یہ واقعہ بڑے دھوم دھام سے منایا گیا۔ راجا صاحب خود بھی بے انتہا خوش تھے اور مجبوراً انھوں نے اس بڑے موقعے کو منانے کا فیصلہ کرلیا مگر ایک غیر روایتی انداز میں۔ مشرقی روایات میں بیٹے کو آنکھوں کی روشنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں بیٹے کو 'نورِ عین' کہا جاتا ہے۔ راجا صاحب نے اپنی کوششوں سے رعایا میں سے بہت سے لوگوں کو اکٹھا کیا جو کسی وجہ سے آنکھوں کی روشنی سے محروم ہو چکے تھے اور علاج کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ دو مشہور سرجن اور آنکھوں کے علاج کے ماہر بلوائے گئے جنھوں نے ان افراد کی جراحی کی۔ سارے اخراجات جن میں رہنا کھانا اور دوائیں وغیرہ شامل تھیں، راجا صاحب نے اپنے ذاتی جیب سے ادا کیے۔ ولی عہد کی ولادت پر خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کرنے کا یہ ان کا اپنا انداز تھا۔''

جو کچھ راجا صاحب کے پاس تھا، تیسرے عشرے میں مسلم لیگ کے احیا سے پاکستان کی تخلیق تک، انھوں نے سب کچھ خرچ کر دیا۔ نئی مملکت کے قیام کے بعد اقتدار کی طلب میں بھاگنے والوں میں راجا صاحب شریک نہیں ہوئے۔ پاکستان کے قیام میں اپنا کردار ادا کرنے کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی ہمت افزائی کے لیے جنھوں نے پاکستان کے حصول میں بے غرض خدمات انجام دی تھیں، انھوں نے ہندوستان ہی میں قیام کا فیصلہ کرلیا۔ مگر فرقہ پرست طبقے کے لیے ہندوستان میں ان کی موجودگی نا قابلِ برداشت تھی اس لیے کہ وہ ان کو اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے۔ ملکی حالات سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے عراق جانے کا فیصلہ کرلیا۔ کئی برس تک وہ بغداد میں قیام پذیر رہے۔ وہاں قیام کے دوران انھوں نے تعلیم پر توجہ دی۔ اگر چہ ان کے شناساؤں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور قریبی دوستوں میں ان کو ایک ممتاز عالم، سیاست داں اور بغداد کی معروف شخصیت تصور کیا جاتا تھا راجا صاحب نے اپنی مصروفیات ایک بہت ہی محدود حلقے تک محدود رکھیں۔ وہ عالموں کے حلقے میں آزادانہ فعال رہے اور تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے مگر انھوں نے سیاست دانوں سے دوری قائم رکھی۔ بالآخر وہ نیک ساعت آ ہی گئی جب اپنے ساتھیوں اور خیر خواہوں کے شدید اصرار پر انھوں نے ایک پاکستانی کی حیثیت سے کراچی میں قیام کا فیصلہ کرلیا۔ انھوں نے سیاست میں حصہ نہیں لیا مگر اپنے دوستوں اور مداحوں کو مشورے دیتے رہے جو ایک بڑی مایوسی کی بات تھی۔ انھوں نے نئی مملکت پاکستان کو بڑی خستہ حالت میں پایا۔ قائد نے اپنی پیروؤں اور قوم سے جو وعدے کیے تھے حالات اس کے بالکل برعکس تھے۔

راجا صاحب ایک ایمان دار اور وطن پرست رہنما تھے جن کا اپنا کوئی مفاد نہیں تھا۔ وہ اس بے ہودگی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور نہ ایک خاموش تماشائی رہ سکتے تھے۔ انھوں نے ایک بڑا قدم اٹھایا، بے خوف وخطر قائد کے پیغام کو پھیلانے اور یہ بتانے کا عزم کرلیا کہ قائد اس مملکت کے معاملات کو کس طرح چلانا چاہتے تھے۔

حالات تیزی سے اور اپنی بنیاد میں بدلنے لگے اور پاکستان میں امیر احمد خان کا قیام مشکل بنا دیا گیا۔ ان کے لیے سوائے پاکستان چھوڑ دینے کے کوئی اور راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ انگلستان چلے گئے، اسی ملک میں جس کے خلاف وہ برسوں اپنے ملک کی آزادی کے لیے تن من دھن سے لڑتے رہے تھے۔ انھیں اس بات کا کبھی خیال بھی نہیں آیا ہوگا کہ ایک دن عمر کے اس نازک دور میں وہ برطانیہ کے رحم وکرم ہوں گے۔

ہندوستان کی اشرافیہ کے ایک معزز خاندان کا پیدا، جس کی پرورش محمود آباد کے مخملیں فرش والے محلوں، قیصر باغ اور لکھنؤ کے بٹلر محل میں ہوئی تھی اب پناہ کا طلب گار تھا۔ لندن شاید ان کے لیے فراخ دل تھا، کہ وہاں نہ صرف ان کو پناہ مل گئی بلکہ ان کو اپنی بقیہ زندگی گزارنے کے باعزت اسباب بھی فراہم ہوگئے۔ امیر احمد خان اپنے حالات پر بالکل فکر مند نہیں تھے۔ اس کے برعکس وہ اس بات پر مطمئن تھے کہ لاکھوں پناہ گزینوں کے مقابلے میں ان کے حالات بہت بہتر تھے۔ لندن کے اسلامی مرکز نے انھیں ملازمت کی پیش کش کی، جس کے ذریعے وہ اپنی سادہ بود و باش کو قائم رکھ سکے۔"

جب سے میں روشن علی بھیم جی کی وساطت سے اس انسان سے واقف ہوا، اس کی آنکھوں کی اداسی نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ میرے ذہن میں جوں ہی اس کا خیال آتا ہے، فوراً اس کی اداسی کا منظر میری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ جب میں اور میرے دوست (روشن علی بھیم جی) اس کتاب کے خاکے کے بارے میں مشاورت کر رہے تھے، ہم نے فوراً یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اس میں اس عظیم انسان کا خاکہ شامل کیا جائے حالاں کہ راجا صاحب کا ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی سے، بورڈ کے ڈائریکٹر کی یا کسی اور حیثیت میں، براہِ راست کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ جناب کے ایف حیدر اور اصفہانی خاندان سے گفتگو کے ذریعے میں یہ جانتا تھا کہ راجا صاحب اس ادارے کی حمایت کرتے تھے اور سنِ بلوغت پر پہنچنے کے بعد ان کے پاس اس کمپنی کے حصص بھی رہے تھے۔ میرے علم کے مطابق اصفہانی خاندان نے راجا

صاحب کو اس کمپنی کا ڈائریکٹر بننے کی پیش کش کی تھی، یہی خواہش خلیلی اور بھیم جی نے بھی کی تھی جب کمپنی کی انتظامیہ ان کے پاس آئی تھی۔ اگر چہ راجا صاحب نے اس تجویز کو کبھی مکمل طور پر رد نہیں کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ چوں کہ وہ حقیقتاً کاروبار کے آدمی نہیں تھے اس لیے وہ کمپنی کی بھلائی کے لیے کچھ نہیں کرسکیں گے۔ اس کے باوجود وہ اخلاقی طور پر اس قومی ادارے کی حمایت کرتے تھے کہ یہ ان کے بہت سے دوستوں سے بہت قریب تھا۔

روشن علی بھیم جی نے مجھ سے کئی بار راجا صاحب سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا تھا اور میں نے ہر بار ان سے یہی سوال کیا تھا کہ پاکستان کی تخلیق کا ہدف حاصل کرلینے کے بعد آخر راجا صاحب نے سیاست سے عملی طور پر دور رہنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس کے بہت قسم کے جوابات دیے گئے مگر کسی جواب نے مجھے پوری طرح مطمئن نہیں کیا۔ اور شاید اس سوال کا کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ اس نکتے پر راجا صاحب کے سوانح نگار نے بھی زور دیا ہے کہ وہ پیدائشی سیاست داں نہیں تھے۔ ان کے چاہنے والے اور پیروکار اس بات پر حیران ہوں گے اور شاید یقین بھی نہ کریں۔ ''فطرتاً وہ سیاست داں نہیں تھے، اس لیے کہ سیاست میں دوسرے گروہوں اور پارٹیوں کی مخالفت کرنی ہوتی ہے اور راجا صاحب کا مہربان مزاج کسی کو تکلیف پہنچانے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ آزادی کے بعد، ان کی تجربہ کار آنکھوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ کسی سیاسی ادارے میں شمولیت ان کے لیے مبنی بر عقل نہ ہوگی۔ محاذ آرائی سے بچنے کا یہی طریقہ تھا۔'' میں سید اشتیاق حسین سے کلی طور پر اتفاق کروں گا۔ وہ پاکستان جسے راجا صاحب نے اس وقت دیکھا، جب وہ یہاں رہنے کی غرض سے آئے تھے، اس پاکستان سے بہت مختلف تھا جس کی انھوں نے تمنا اور جس کے لیے جد و جہد کی تھی۔ جس نیک مقصد کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا، وہاں کے لوگ لوٹ مار میں مصروف تھے، طاقت کے لیے دست و گریباں ہو رہے تھے۔

راجا صاحب نے خود اپنی سوانح حیات کبھی نہیں لکھی۔ مگر کچھ یادداشتیں انھوں نے لکھ رکھی تھیں جنھیں حسین صاحب ترتیب دے کر منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔ یہ بہت طویل نہیں، صرف چند صفحات پر مشتمل ہیں۔ میں نے 'یادداشتوں' کے یہ چند صفحات پڑھے ہیں، اور احتیاط سے بار بار پڑھے ہیں۔ پہلا ہی جملہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ ''ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریکوں میں میری شمولیت ذاتی شمولیت ہے اور عمر بھر کی ہے۔'' اور چند صفحات کے بعد ٹالسٹائی کے تصورات ملتے جلتے رجحانات کے اعتراف کے ساتھ وہ ان باتوں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو ان کو اس مقام تک لے آئے ہیں کہ 'اصول پڑھے لکھے رئیسوں کی اجارہ داری نہیں ہوتے، وقار اور دل رُبائی کے جذبے دل سے نکلتے ہیں، رقص کی تعلیم دینے والے کی کوششوں سے نہیں۔''

میں نے کچھ لوگوں کو راجا صاحب کا تقابل شہزادہ 'سدھارتھ' سے کرتے سنا ہے جس نے سچ اور ابدی سکون کی تلاش کی خاطر اپنی سلطنت، اپنے محلات، خوب صورت بیوی اور نوزائیدہ بیٹے کو تج دیا تھا۔ حسین صاحب نے اپنی کتاب میں اس تقابل کی طرف اشارے کیے ہیں اور مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مگر مجھے زیادہ خوشی راجا صاحب کے اس جواب سے ہوئی جو اس تقابل کے سلسلے میں انھوں نے دیا تھا۔ حسین صاحب نے اپنی کتاب میں اس کو نقل کیا ہے جو یہ تھا، ''ان دونوں کے درمیان بنیادی فرق یہ تھا کہ راجا ترکِ تعلق کے نظریے سے متفق نہیں تھا۔ (اس کے نزدیک) کلیسا اور ریاست، روح اور مادہ، ابتدا سے ایک دوسرے سے ہم رشتہ تھے۔ کسی اور روحانی دور افتادہ دنیا کے حصول کے لیے انسان کو اپنی دنیا سے ترکِ تعلق نہیں کرنا چاہیے، وہ دنیا کا ایک اچھا باشندہ بن کر بھی مسلمان رہ سکتا ہے۔''

میں اس بات کا قائل ہوں کہ وہ اچھے مسلمان بھی تھے اور دنیا کے اچھے باشندے بھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ملک جس کی تخلیق میں انھوں نے مدد کی تھی وہی ان کی قبل از موت کا باعث ہوا۔ ڈھاکا کا زوال اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے اس شخص کو شدید دکھ پہنچایا جس نے اپنا سب کچھ پاکستان کی تخلیق کے سلسلے میں قربان کر دیا تھا۔ یہ ضرب راجا صاحب محمود آباد کے لیے موت کا پیغام بنی اور ڈھاکا کے زوال کے فوراً بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

راجا صاحب کا جسدِ خاکی ایران روانہ کر دیا گیا جہاں مشہد کے مشہور قبرستان 'باغِ رضواں' میں اس کی تدفین ہوئی۔ کچھ عرصے بعد اس قبرستان کو باغ میں تبدیل کر دیا گیا۔ کئی سماجی، تہذیبی، مذہبی انجمنوں اور با اثر شخصیتوں، جس میں راجا صاحب کے قریبی ساتھی اصفہانی کی درخواست شامل تھی، حکومتِ ایران کی ایما پر راجا صاحب کا جسدِ خاکی امام (علی رضا) کے مزار کے احاطے میں دوبارہ دفن کر دیا گیا۔ اس کا سارا انتظام مملکتِ ایران کے حاکمِ اعلیٰ نے براہِ راست کیا تھا اور انھی نے جیبِ خاص سے سارے اخراجات ادا کیے گئے تھے۔

راجا صاحب مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کی ایک اور شہ زور شخصیت ایم اے ایچ اصفہانی نے ایک جملے کے کوزے میں اپنے خیالات کا دریا بند کر دیا، ''انھوں نے مسلمانوں کے مفاد میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور اس کے عوض کسی شے کی توقع نہیں کی۔''

دو اچھے دوست عبدالغنی حاجی حبیب اور روشن علی بھیم جی

ای ایف یو کے دو سابقہ چیئرمین عبدالغنی حاجی حبیب اور مرزا احمد اصفہانی ۱۹۶۷ء کے ڈھاکا کنونشن میں
گورنر منعم خان کا استقبال کر رہے ہیں

اراگ خاندان

مشکل وقت کا ساتھی

چالیس برس قبل جب روشن علی بھیم جی نے ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کا انتظام سنبھالنے کا ارادہ کیا تھا تو اس بنا پر کہ وہ کم از کم تین باتوں پر قطعی بھروسا کر سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ اس شخص کی حمایت پر پورا اعتماد کر سکتے تھے جس نے ان کو اس 'خودکُش' مہم کے لیے راضی کرلیا تھا اور وہ عباس خلیلی کی ذات تھی، جو کمپنی کے چیئر مین کا عہدہ سنبھالنے والے تھے، اور جو ان کو اپنی اور کئی سرکاری افسران کی ایما پر لے آئے تھے۔ دوسرے یہ کہ انھیں اپنی تصوراتی طاقت، غیر متزلزل ارادوں اور خود اعتمادی پر پورا یقین تھا۔ تیسرے وہ اپنے باپ جیسے دوست حاجی حبیب حاجی پیر محمد اور ان کے اہلِ خاندان کی بے غرض اور غیر مشروط امداد پر بھروسا کر سکتے تھے۔

وہ تھے حاجی حبیب پیر محمد، ذات کے میمن، جو حاجی حبیب سیٹھ کے نام سے موسوم تھے جو اپنے اور دوسرے حلقوں میں بھی احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے والد اوسط درجے کے کاشتکار تھے جو ایک چھوٹے سے آبائی قطعۂ آراضی پر گنّے کی کاشت کیا کرتے تھے۔ اس فصل سے وہ کچی شکر (brown sugar) بنا کر منڈیوں میں فروخت کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کو اپنی زندگی بھر کا پیشہ نہیں سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے بمبئی کے ایک بڑے تجارتی ادارے میں کلرک کی ملازمت قبول کر لی۔ یہی وہ تجربہ تھا جس نے ان میں بہت کچھ کرنے کی 'بھوک' کو جنم دیا اور انھوں نے اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ لہٰذا وہ اور ان کے بیٹے سیلون (حال سری لنکا) کے لیے عازمِ سفر ہوئے، انھوں نے وہاں چار برس تک قیام کیا اور برما سے چاول درآمد کر کے سیلون کی منڈیوں میں فروخت کرتے رہے۔ جب کچھ دولت جمع ہوگئی تو انھوں نے کلکتے جانے اور وہاں بنیادی طور پر ہر قسم کی اشیائے خورد و نوش کے تاجر کی حیثیت سے کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے اور بہت جلد ہی سارے ہندوستان میں ان کے ادارے کی شاخیں قائم ہوگئیں۔

مسٹر بھیم جی ان کے بیٹے، حاجی حبیب اور ان کے خاندان سے اس وقت سے واقف تھے جب وہ حاجی حبیب سیٹھ کے کاروبار کے بیمے کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔

ان کے باپ سمان دوست کا گھرانا کافی بڑا تھا، بارہ بچے تھے جن میں سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے تین خاندان کے کاروبار میں شامل تھے، 'عبدل'، 'احمد' اور 'رحمٰن'۔ میں ان تینوں سے واقف تھا۔ رحمٰن جنھیں پیار سے 'مِٹھو' پکارا جاتا تھا، اب تک بقیدِ حیات اور عملی طور پر ای ایف یو کے ڈائریکٹر ہیں۔

مٹھو سیٹھ کہتے ہیں ''والد صاحب بمبئی کے میمنوں کی جماعت کے سب سے معتبر 'بزرگ' سمجھے جاتے تھے۔ اس قدر کہ تقسیم سے قبل، ۱۹۴۷ء کے گرمی کے موسم میں، جب محمد علی جناح نے آدمجی سیٹھ (سر آدمجی حاجی داؤد) سے رجوع کیا تاکہ وہ اپنی جماعت والوں کو نئی تشکیل شدہ مملکت پاکستان کی ترقی کی خاطر وہاں جا کر کاروبار کرنے کی ترغیب دیں، تو آدمجی سیٹھ نے ان سے کہا کہ وہ معروف اور با اثر

شخصیت مسلم لیگی، سر عبداللہ ہارون کے بیٹے یوسف ہارون کو حاجی حبیب سیٹھ کے پاس بھیجیں۔"

ایسا ہی کیا گیا۔ جناب یوسف ہارون حاجی حبیب سیٹھ کے آبائی شہر 'بانٹوا' گئے اور دونوں کے درمیان طویل مذاکرات کے بعد حاجی حبیب سیٹھ نے مشورہ دیا کہ جماعت کے تمام اہم کاروباری حضرات کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا جائے اور جناح صاحب کی ذاتی درخواست اور اس کے عوامل سے آگاہ کیا جائے۔

میری ملاقات کے دوران متھو سیٹھ نے بتایا کہ؟" اس طرح سب کچھ ہوگیا۔ اسی وقت یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ ہم سب پاکستان ہجرت کریں گے۔ اس طرح ہم لوگ یہاں آ گئے۔ یہ نومبر ۱۹۴۷ کا واقعہ ہے، تقسیم سے صرف دو ماہ بعد کا، اور ہم لوگ کراچی میں آباد ہو گئے۔ ہمیں جلدی کرنی پڑی اس لیے کہ ہمارے خاندان کے تمام قلیٹ بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں لوٹے گئے، مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ میرے والد نے یہاں آ کے نئے سرے سے اپنا کاروبار شروع کیا، اس کی توسیع ہوئی اور نیا نام ARAG Limited رکھا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں حبیب ٹیکسٹائل ملز کے علاوہ اور دوسرے کاروبار شروع کیے گئے، جن میں سے کچھ بڑی نوعیت کے مشرقی پاکستان میں تھے۔

ہم روشن علی بھیم جی سے اچھی طرح واقف تھے مگر میرے بڑے بھائی عبدل اور میرے والد ان کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔ کہ وہ بمبئی میں ہمارے کاروبار کے بیمے کی دیکھ بھال کرتے تھے اور یہاں کراچی میں بھی یہ فرض انھیں کو اس وقت سونپا گیا جب انھوں نے 'پاک انڈر رائٹرز' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ میرے والد ان کو اپنا بیٹا سمجھتے تھے، بالکل ہم میں سے ایک کی طرح۔ کچھ باتوں میں تو وہ بیٹوں سے بھی زیادہ قریب تھے۔ مثال کے طور پر جب میرے والد پاکستان سے باہر جاتے، ہم میں سے کوئی نہیں مگر، روشن ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اور پھر ایک دن جناب عباس خلیلی اور روشن دونوں ساتھ آئے اور میرے والد سے ایسٹرن فیڈرل یونین کے بارے میں بات چیت کی جس کے اکثریتی حصص ان دنوں اصفہانی خاندان کی ملکیت تھے۔ انھوں نے میرے والد سے کہا کہ اس ادارے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا اور یہ بھی کہ اصفہانی خاندان کو اس کے حصص کسی اور کے حوالے کرنے ہوں گے۔ تو کیا یہ ARAG اور ای ایف یو کے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ARAG اپنے قدم آگے بڑھانے کا فیصلہ کرے؟

میرے والد ہمیشہ سے روشن پر پورا بھروسا کرتے تھے اور انھیں علم تھا کہ ان کے بیٹوں میں سے کوئی بھی اس بیمہ کمپنی کو نہیں چلا سکتا تھا۔ مگر چوں کہ وہ روشن کو اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتے تھے اس لیے یہ ان کا خاندانی مسئلہ بن گیا تھا اور انھوں نے تجویز کو قبول کرلیا۔ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا اس لیے کہ، جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، ہم میں سے کسی کو بھی بیمے کے کاروبار کا ادراک نہیں تھا۔ مگر ہم سب کو روشن پر پورا اعتماد تھا۔ ان کو، جس طرح وہ چاہیں، ای ایف یو چلانے کے تمام اختیارات سونپ دیے گئے اور عبدل بھائی اس کے چیئرمین بنا دیے گئے۔ اگر چہ انھوں نے کبھی کسی معاملے میں مداخلت نہیں کی۔ خاندان میں سے کسی نے بھی کبھی ایسا نہیں کیا اور اس طرح ای ایف یو ہمارے خاندانی ادارے ARAG کا حصہ بن گئی۔ مگر ہم سب اہلِ خاندان اس کو بنیادی طور پر سرمایہ داری کا معاملہ سمجھتے تھے۔ روشن کے لیے یہ مختلف معاملہ تھا۔ وہ بیمہ اور بالخصوص زندگی کے بیمے کو اپنی زندگی کی مہم سمجھتے تھے، اور وہ پاکستان کی سب سے پرانی اور سب سے بڑی بیمہ کمپنی کو بچانا چاہتے تھے، جس کو تجارتی ادارے کی طرح نہیں بلکہ ایک تنظیم کی طرح چلا رہے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب ہم لوگوں نے ای ایف یو میں سرمایہ کاری کا ارادہ کیا تھا تو ذاتی طور پر میں اس کے بارے میں زیادہ پُر جوش نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ ای ایف یو کی مالی مشکلات کے پیشِ نظر اس سرمایہ کاری میں خطرات تھے۔ مگر روشن پر ہمیں بڑا اعتماد تھا اور جب وہ لندن اور میونخ سے واپس آئے تو ہمیں احساس ہوگیا تھا کہ میونخ ری کی معیت میں ای ایف یو مشکلات کے طوفان سے بچ نکلے گی۔ ہمیں خوشی بھی تھی بلکہ ایک طرح کا فخر بھی محسوس ہو رہا تھا کہ ہم نے روشن کو بڑی مشکل سے نکلنے میں مدد فراہم کی ہے۔ اور اس موقعے پر بہت سے لوگوں کی خواہش تھی کہ ہم کمپنی کے حصص کو انھیں فروخت کر دیں۔ اس وقت ہمارے لیے اچھا خاصا منافع کمانے کا موقع تھا۔ اگر چہ روشن اور عبدل بھائی نے مجھے پورا اختیار دے دیا تھا کہ میں جب

چاہوں اور جسے چاہوں اپنے حصص فروخت کر سکتا ہوں مگر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ہمارے مفاد کے خلاف ہوگا۔ ہمیں اس ادارے کو چلانا چاہیے اور روشن ہی اس کو صحیح طرح چلا سکتے ہیں۔ ہمارے خاندان کے لیے میونخ ری کی ساجھے داری اس مشکل سے نکلنے کی بہترین راہ تھی۔ ہم اس وقت قائل ہو گئے تھے کہ تینوں ساجھے دار، میونخ ری، روشن اور ARAG مل کر اس کو ایک کامیاب داستان میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ہم لوگ صحیح راہ پر تھے، اور بھٹکے نہیں۔''

اس طرح حبیب خانوادہ اور اس کا ادارہ ARAG Ltd ایسٹرن فیڈرل یونین کا اکثریتی حصے دار بن گیا اور روشن علی بھیم جی اپنے دوستوں کی مدد سے ملک کے سب سے بڑے بیمے کے ادارے کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔

بھیم جی کے دوست کے سب سے بڑے بیٹے عبدالغنی حبیب، کمپنی کے چیئرمین بن گئے۔ مگر جیسا کی ان کے بھائی مٹھو نے کہا ہے، برائے نام سربراہ تھے اور انھوں نے کبھی کمپنی کے پیشہ ورانہ انتظام میں دخل اندازی نہیں کی۔ انھوں نے سب کچھ روشن پر چھوڑ دیا تھا اور حبیب خاندان کے دوسرے افراد کی طرح وہ بھی روشن کو اس خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔

ای ایف یو میں اپنے قیام کے دوران میں عبدل بھائی سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ اس کے بعد بھی میری ان سے لندن میں کئی بار ملاقات ہوئی مگر ہمیشہ روشن علی بھیم جی اور مٹھو کے ساتھ۔ میں نے کمپنی کی ایسی کئی میٹنگ میں شرکت کی تھی جب عبدل بھائی چیئرمین کی کرسی پر ہوتے تھے۔ مگر وہ ایسے نہیں تھے کہ اپنی موجودگی، بیمے کے تکنیکی اور مالیاتی معاملات کے علم کے باعث میٹنگ پر حاوی ہو جاتے۔ انھوں نے کبھی یہ عندیہ بھی نہیں دیا کہ وہ حاوی ہو سکتے ہیں۔ وہ تو ایسے انسان تھے جن کی سنجیدگی اور راست بازی ڈھکی چھپی نہیں ہوتی تھی، اس قدر کہ میٹنگ کے دوسرے شرکا کبھی ان کو غلط راستے پر ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عام اور بڑے مجمعے میں وہ ایک شرمیلے انسان لگتے تھے مگر قریبی دوستوں کی نجی محفلوں میں وہ ملنسار بلکہ باتونی لگتے تھے۔ وہ بہت نرم دل انسان تھے اور اپنی زندگی میں انھوں نے بہت سے لوگوں کی فراخ دلی سے امداد کی تھی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ 'بانٹوا' میں جہاں سے حبیب خانوادے کا تعلق تھا، لوگ عبدل بھائی کو 'شہزادہ سیٹھ' کہتے تھے۔ انھوں نے اپنی جماعت کے اتنے لوگوں کی امداد کی ہے، بیواؤں، یتیموں اور دوسرے ضرورت مندوں کی کہ لوگ آج بھی ان کو بڑے احترام سے یاد کرتے ہیں۔

مٹھو نے مجھے ایک واقعہ سنایا تھا جس کی بنا پر عبدالغنی کو 'عبدل سیٹھ' کہا جانے لگا تھا۔ '' ہمارا خاندانی معالج عبدل بھائی اور روشن کے ساتھ اپنی سالانہ تفریح کے لیے یورپ گیا ہوا تھا۔ مجھے کسی ڈاکٹر کی ضرورت ہوئی تو میں نے ARAG کے اکاؤنٹنٹ قاسم سے پوچھا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو جانتا ہے جو بھروسے کا اور اچھا ہو۔ اس نے جوڑیا بازار کے ایک ڈاکٹر کا نام پیش کیا۔ جب میں نے پوچھا کہ صرف یہی ڈاکٹر کیوں تو وہ بولا کہ آپ خود جا کر دیکھ لیجیے۔ اور جب میں نے اس ڈاکٹر سے رابطہ کیا تو اس نے مجھے اپنی مطب آنے سے منع کیا اور کہا کہ میں جہاں بھی ہوں وہ فوراً وہاں پہنچ جائے گا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا کہ اس نے مجھے اپنے مطب آنے سے کیوں منع کیا تھا اور اس نے خود میرے پاس آنے کی زحمت کیوں گوارا کی۔ اس نے اپنی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ شخص جو اس وقت آپ کے سامنے ہے، ہائی اسکول سے میڈیکل کالج تک، صرف عبدل بھائی ہی کی وجہ سے پہنچا تھا۔ مجھے یہ سن کر بہت حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ اتنے برس تک وہ اس کی مدد کرتے رہے اور ہم میں سے کسی کو بھنک تک نہیں پڑنے دی۔ مگر مجھے تو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میرا بھائی ایسا تھا، جو، جتنی جلد ہو سکے اور جہاں تک ممکن ہو، لوگوں کی مدد کرتا تھا۔ وہ میں ہوں، میرے بھائی احمد، روشن، ڈاکٹر خان، وحید آدجی، صدری اصفہانی یا حاکم علی ہوں، جب بھی ہماری کوئی ضرورت ہوتی، مالی یا ذہنی، ہم سب ہمیشہ انھی سے رجوع کرتے تھے اور وہ ہمیشہ مدد کے لیے تیار ہوتے، اور ہمیشہ کوئی حل ڈھونڈ نکالتے۔''

عبدالغنی مارچ ۱۹۸۰ء میں اور نسبتاً کم عمری میں انتقال کر گئے۔ اس وقت وہ صرف تریسٹھ برس کے تھے۔ اپنے بھائی احمد جو

ای ایف یو بورڈ میں ڈائریکٹر تھے، ان کے ایک برس بعد چل بسے۔ ان دونوں کا انتقال خاندان کے لیے اور کاروبار کے لیے بڑا مہیب نقصان تھا جو ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سبب اپنے کاروبار کا ایک بڑا حصہ گنوا چکا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب انھیں (اپنے خاندان کو) ای ایف یو کے حصص کا ایک بڑا حصہ فروخت کرنا پڑ گیا تھا۔ مگر عبدالرحمٰن حاجی حبیب، مٹھو اپنے بھائیوں کی جگہ ۱۹۸۱ء میں ڈائریکٹر بنے اور ابھی تک ہیں۔ کمپنی میں ان کو ایک مستقل دفتر مہیا کیا گیا ہے۔ کاروباری افراد اور تاجروں سے ان کے بڑے مضبوط روابط ہیں اور ان کو اکثر کمپنی کے لیے ان روابط کو استعمال کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

مٹھو شہر کی ایک جانی پہچانی سماجی شخصیت ہیں۔ ان کا کہا ہوا اور ان کے رسوخ آج بھی اہم ہوتے ہیں باوجودیکہ مشرقی پاکستان کے سانحے میں ان کے خاندان نے سب سے زیادہ نقصان اٹھایا ہے۔ کراچی جم خانہ ہو یا سندھ کلب ان کا نام سب جانتے ہیں اور وہ لوگ جو کلب میں اثر رکھتے ہیں یا اس کی صدارات یا کمیٹی کی رُکنیت کے خواہاں ہوتے ہیں، مٹھو کی مدد چاہتے ہیں۔

کراچی چیمبر آف ٹریڈ کی حیثیت سے وہ شہر کے کاروباری حلقے کی ایک معروف شخصیت تھے۔ میں معاشیاتی اور سیاسی مسائل پر ان سے گفتگو کر کے لطف لیتا رہا ہوں۔ اس لیے کہ ان مسائل پر ان کے خیالات درسی نہیں بلکہ عملی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ انھیں اور ان کے 'حبیب' خاندان کو ماضی کے ذاتی نقصانات اور قربانیوں کا خوب تجربہ ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ قائدِاعظم کے بلاوے پر ہندوستان سے ہجرت اور مشرقی پاکستان کی علٰحدگی میں بہت کچھ کھو چکے ہیں۔

مجھے ان کی ایک بڑی دل چسپ گفتگو اچھی طرح یاد ہے جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ ان لوگوں نے جو غیر منقسم ہندوستان میں مستحکم حیثیت میں رہ رہے تھے جناح کے کہنے پر پاکستان ہجرت کی تھی۔ انھوں نے کہا، ''یہ ایک بڑا سوال ہے، اور میرے لیے مشکل بھی۔ کسی کے لیے بھی مجھ جیسے، اور میرے خاندانی پس منظر کے آدمی سے اس پر گفتگو کرنا آسان نہ ہوگا۔ مادّی نقطۂ نگاہ سے ہم جیسے لوگوں کو پاکستان کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ پاکستان ہمارے لیے ضروری نہیں تھا۔ ہندوستان میں ہم سکون سے آباد تھے اور آرام دہ ترین احوال اور پُرسکون اطراف میں رہتے تھے۔ ہمارا ادارہ ہر اعتبار سے محفوظ و مامون تھا۔ صرف برصغیر میں ہماری ۶۷ اور ملک سے باہر ۱۷ شاخیں کام کر رہی تھیں۔ تو پھر کسی کو پاکستان جیسے ملک کی کیا ضرورت ہوگی، جو اس ملک کے مقابلے میں جہاں ہم کاروبار کر رہے تھے، ایک چھوٹا سا ملک تھا؟ جس خطے کو پاکستان بننا تھا وہاں ہماری ایک چھوٹی سے شاخ، کراچی میں تھی۔ وہاں مشکل سے کوئی کاروبار تھا۔ پنجاب کے بیوپاری بھی کراچی کے مقابلے میں کلکتے، بمبئی، کانپور اور مدراس سے کاروبار کرنا پسند کرتے تھے۔ اس لیے کہ کراچی کے رہنے والے، پاکستان بننے سے پہلے تجارت میں دل چسپی نہیں رکھتے تھے۔ وہ زمیندار، وڈیرے، سردار وغیرہ ہوتے تھے۔ ان کے ذہن کاروباری نہیں تھے۔ مگر جب پاکستان وجود میں آیا تو یہ ان لوگوں کے لیے سنہرا موقع تھا جن کا غیر منقسم ہندوستان میں کوئی کاروبار نہیں تھا، لہٰذا انھوں نے کاروبار جمانے کی کوشش کی۔ مگر ہمارے خاندان جیسے لوگوں کو بھلا کیا ضرورت تھی، ہندوستان اور دنیا بھر میں جن کے کاروبار تھے اور جو اپنا سب کچھ لٹا کر آئے تھے؟ اگر آنا ہی تھا تو خاندان کے آدھے لوگوں کو آنا چاہیے تھا، باقی وہیں رُک جاتے۔ مگر بدقسمتی سے چوں کہ بانٹوا میں لوٹ مار شروع ہو گئی تھی اس لیے پورے خاندان کو ہجرت کرنی پڑی تھی۔''

ان سب باتوں کے باوجود عبدالرحمٰن حاجی حبیب جیسے لوگوں نے ملک کے قیام کے بعد کے پہلے پچاس برسوں میں جو کچھ حاصل کیا ہے، اس پر فخر کرتے ہیں۔ اگر چہ وہ اور ان کے خاندان والے اس کا کوئی صلہ نہیں چاہتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے اہلِ خاندان کے کارناموں سے واقف ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھ سے کہا، ''میرا خیال ہے کہ پاکستان کے قیام کے باعث اب یہاں رہنے والے مسلمانوں کو بہت فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ اور ہندوستان سے ہجرت کرنے والے مسلمان غیر منقسم ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہیں۔ اگر ہم تمام کیفیات کا احاطہ کریں تو میں اس بات کا قائل ہوں کہ اس ملک میں ہم نے کافی ترقی کی ہے۔ ترقی ہوئی تو ہے مگر بیشتر

مادّی نوعیت کی۔ وہ لوگ جو گھوڑا گاڑی استعمال کرتے تھے وہ آج شہر میں ٹویوٹا اُڑائے پھرتے ہیں۔ اس میں کوئی قباحت نہیں اور میں اس کو بھی ترقی کہنے کے لیے تیار ہوں اگر ہم اپنے مشترکہ ماضی اور پرانی قدروں کو برقرار رہنے میں کامیاب ہوجاتے جو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں، اپنے ہی سیاست دانوں کے ہاتھوں برباد ہو چکی ہیں۔ ان لوگوں نے کوئی ترقی نہیں کی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ بازار کا عام آدمی ہمہ وقت ان طاقتوں کے ساتھ، اپنی حکومتوں کے ساتھ جنگ کی حالت میں ہے۔ اس لیے کہ دل کی گہرائیوں سے یہ اربابِ اقتدار کو 'حاکم' سمجھتے ہیں، پرانے جاگیرداروں کی مانند، غیر ملکیوں کی طرح۔ ان کے ذہنوں میں کم از کم یہی ہے۔ جب اپنی حکومتوں کے بارے میں ہمارے دونوں ملکوں کے لوگ بات کرتے ہیں تو 'ہم' اور 'وہ' کیوں کہتے ہیں؟''

میں نے مٹھو یا حبیب خاندان کے کسی اور فرد کو اپنے نقصانات پر شکوہ کرتے نہیں سنا مگر سچ پوچھا جائے تو یہ بڑے دل گردے کی بات ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کے وقت لٹنے کے بعد جو کچھ بنایا تھا وہ دوسری بار اس وقت لُٹا، جب دسمبر ۱۹۷۰ء میں بنگلہ دیش بنا، اور زخموں پر نمک کے مانند، جب بھٹو نے ان لوگوں کی بیشتر صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ پاکستان کی قوم نے کبھی ان لوگوں کی شکرگزاری نہیں کی، جن خاندانوں نے اپنے ملک کے لیے قربانیاں دی ہیں۔

دوستی کے لیے مٹھو لاجواب انسان ہیں۔ وہ بہت خیال رکھنے والے ہیں اور ہمیشہ مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان کے اور روشن علی بھیم جی کے درمیان پیدا ہونے والی ذاتی دوستی میں ان کی یہ خصوصیت اور بھی ابھر کر سامنے آئی ہے۔ جب وہ دونوں شہر میں ہوں تب شاید ہی ایسا کوئی دن گزرتا ہو جس میں ان دونوں کی ملاقات نہ ہو۔ اور ان دنوں جب کبھی مسٹر بھیم جی گھر سے نکلنے کے قابل نہیں ہوتے، تب بھی مٹھو اپنے دوست سے ملاقات اور گپ شپ کے لیے ضرور پہنچتے۔ مٹھو کہتے ہیں کہ روشن کتنے حیرت انگیز انسان ہیں۔ ان جیسا دوست مشکل سے ملتا ہے۔ انھوں نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے، مالی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انھوں نے میری مدد کی ہے اور میری رہنمائی کی ہے۔ اس دن سے جب میں نے ڈاڑھی مونڈنا شروع کیا ہے، انھوں نے مجھے ڈاڑھی مونڈنا بھی سکھایا ہے۔ ہماری ان کی بہت طویل اور حیرت انگیز دوستی ہے۔ انھوں نے ہر معاملے میں میرے مدد کی ہے، حتیٰ کہ میرے بچوں کی شادی میں بھی۔ اور بھلا میری بیوی نے پردہ کیسے چھوڑا۔ وہی تھے جنھوں نے یہ کام کیا۔ میں بے شمار طریقوں سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ حیرت انگیز انسان ہیں۔ اور 'اس دن' کے بعد میں ہمیشہ انھیں تلاش ہی کرتا رہوں گا۔''

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، حبیب خاندان نے ای ایف یو کے چیف ایگزیکٹو، چیئرمین اور اکثریتی حصص کے مالک، جناب روشن علی بھیم جی کی زندگی میں ویسا ہی اہم کردار ادا کیا ہے جیسا انھوں نے حبیب خاندان کے لیے کیا تھا۔

ای ایف یو کے اس دور کے ڈائریکٹر ایس ایم یوسف قمر ہاؤس کی ایک تقریب میں
روشن علی بھیم جی کے ساتھ

ایس ایم یوسف

ایک بے مثال سرکاری افسر

روشن علی بھیم جی نے ایسٹرن فیڈرل کے چیف ایگزیکٹیو کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ایک طاقت ور اور نہایت بارسوخ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ضرورت کو محسوس کیا۔ لہٰذا انھوں نے ایسے لوگوں کی تلاش شروع کردی جو اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں اور مضبوط کردار کے لیے مشہور ہوں۔ ایسے لوگ جو ای ایف یو کے مقاصد کو آگے بڑھانے، عوام کو اس ادارے سے روشناس کرنے میں مدد فراہم کرسکیں جس کا بنیادی کام صرف سرمایہ کاری کرنے والے حصے داروں کے مالی مفادات ہی نہیں بلکہ دراصل بیمہ داروں کی ضروریات کی نگہداری کرنا ہے، جن کے بغیر کمپنی کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔

ان کے ذہن میں ایسے چند عظیم لوگوں میں سے ایک شخصیت ایس ایم یوسف کی تھی جس سے وہ عباس خلیلی اور عثمان علی کی طرح واقف ہوئے تھے۔ جب ان کی یوسف صاحب سے ملاقات ہوئی اس وقت تک یوسف صاحب کی پہچان ایک قابلِ احترام اور معروف سرکاری افسر کے طور پر ہوچکی تھی جن کی پیشہ ورانہ اور ذاتی دیانت داری ضرب المثل بن چکی تھی۔ ای ایف یو کے میڈیکل ڈائریکٹر ڈاکٹر تاج الدین مانجی کے الفاظ میں، جو طبی شعبے میں خود اپنا ایک مقام رکھتے ہیں، یوسف صاحب ''ایک دیو قامت شخصیت'' تھے۔

میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات تھی کہ میری ان سے اچھی واقفیت ہوچکی تھی۔ جیسا کہ اس کتاب کے قاری سمجھ گئے ہوں گے، یوسف صاحب سے میری واقفیت میرے دوست روشن علی بھیم جی کے مکان پر دی گئی متعدد دعوتوں میں ہوئی تھی اور وہ مجھے پہلی ہی نظر میں پسند آگئے تھے۔ اس وقت تک میری ملاقات بہت سے سرکاری افسران سے ہوچکی تھی مگر سچ تو یہ تھا کہ اس وقت میری ملاقات ایسے شخص سے ہوئی تھی جو صحیح معنوں میں ایک سرکاری افسر تھا۔ جو ہر پہلو سے ایک ICS کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔ دراز قد، سر سے پاؤں تک ایک مکمل جنٹل مین۔ ان کا اندازِ تقریر بڑا منفرد تھا، بہت تیز نہیں، باضابطہ، ہمیشہ برمحل۔ غیر ضروری رنگوں سے مبرا۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں ایک جرمن ہوں، وہ جرمنی کے صدر کے حالیہ دورے کے بارے میں باتیں کرتے، اور یہ بھی کہ ذاتی طور پر وہ گوئٹے، کانٹ، باخ اور بیتھوون کی سرزمین کے بارے میں کیسے خیالات رکھتے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مجھ پر اقبال کی شاعری اور فلسفے کے رموز آشکار ہورہے تھے۔ جلد ہی ہم اقبال پر جرمنی کے عظیم لکھنے والوں اور دانشوروں کے اثرات کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے۔ ہم نے میونخ میں اقبال کی تعلیم کے دوران قیام کی یادگار کے بارے میں بھی باتیں کیں تھیں۔

ایس ایم یوسف نومبر۱۹۱۴ء میں لاہور میں پیدا ہوئے اور ۲۱ برس کی عمر میں انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد ICS میں بھرتی کے سلسلے میں وہ آکسفرڈ کے سینٹ جان کالج میں زیرِ تعلیم رہے تھے۔ انگلستان سے واپسی پر وہ یونائیٹڈ پراونسز (یوپی) میں تعینات ہوئے۔ اپنی اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے ان کی نئی دلی کے مرکزی دفاتر میں تعیناتی ہوگئی۔

تقسیم کی موقعے پر یوسف صاحب قائدِاعظم محمد علی جناح کے افسرِ تعمیل (Aide) متعین ہوئے۔

ان کے قریب ترین دوست اور ساتھی عباس خلیلی کہتے ہیں کہ" اس خوب رو اور نوجوان سکریٹری کو قائد سے ذاتی قربت حاصل کر لینے میں زیادہ دیر نہیں لگی جو ان کے نزدیک تمام خوبیوں، راستی اور دیانت داری، اور خود داری کا مجسمہ تھا۔ وعدے کے پکّے اس انسان نے کبھی اپنے اختیارات پر فخر نہیں کیا اور ہمیشہ کاسہ لیسوں اور مفاد پرستوں سے فاصلہ رکھا۔"

اپنے طویل سرکاری افسری کے اور عوام کی خدمات گاری کے زمانے میں یوسف صاحب نے ایسا کردار پیش کیا تھا جس نے ان کو کبھی نہ ختم ہونے والی عزت اور احترام سے نوازا۔ انھوں نے جو کچھ بھی کیا اس میں ان کا ضمیر ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتا تھا۔ ونسٹن چرچل کے مطابق انھوں نے اپنی یادداشتوں کے لیے وہی ڈھال بنائی تھی جو اہم تھی، یعنی دیانت داری اور خلوص کی، عمل کی جس نے ان کو سر اٹھا کر چلنے والوں کے ساتھ چلنے کا حوصلہ دیا۔

پہلے قائدِاعظم کے، ان کے بعد لیاقت علی خان کے اور ان کے بعد گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کے ذاتی معاون کی حیثیت میں انھیں ایسے منفرد مواقع فراہم ہوئے تھے جن میں انھوں نے بڑے آدمیوں کو بہت قریب سے کام کرتے دیکھا تھا۔ انھیں ہر ایسے شخص سے قربت رہی تھی جو ملک کے لیے اہم تھا، اور اُن ہی ذرائع سے انھیں مختلف وزارتوں اور ان سے منسلک اداروں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملے تھے۔ جوٹ بورڈ ڈھاکا کے چیئرمین، WPIDC کراچی کے رُکن، منرل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے چیئرمین کی حیثیت میں انھوں نے روز مرّہ کے مسائل کا کامیابی سے مقابلہ کرنے میں اپنی ہنرمندی دکھائی۔ وفاقی حکومت کی مختلف وزارتوں میں سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے بہت سے کامیاب معاشیاتی منصوبوں کی تدوین میں بہت سے وزرا کی مدد کی تھی۔

وزارتِ خارجہ کے سکریٹری کی حیثیت سے یوسف صاحب نے خارجی تعلقات کے ذریعے ملک کی معاشی وسعت کو اجاگر کیا جس نے علاقائی امدادِ باہمی کو بڑھاوا دیا۔ ان کی آخری تعیناتی پاکستان اسٹیل کے چیرمین (نائب وزیر کے برابر) کی حیثیت سے ہوئی تھی جس کی بنیاد رکھنے میں انھوں نے حقیقی راست بازی سے کام لیا۔ ان کی سرکاری ملازمت نومبر ۱۹۷۱ء تک چلی تھی اور اس دوران ان کو دوبار ستارۂ پاکستان اور ہلالِ قائدِاعظم کے اعزازات سے نوازا گیا۔

سرکاری ملازمت سے فراغت کے بعد انھوں نے Associated Consulting Engineers (ACE) کے چیئرمین کا عہدہ سنبھالا۔ یہ ادارہ جس کی بنیاد ان کے عزیز ترین دوست عباس خلیلی نے رکھی تھی، پورے پاکستان اور مشرقِ وسطیٰ میں مشہور تھا۔ ابتدائی مشکلات کے بعد یہ ادارہ بہت کامیابی سے چلایا گیا جس نے بہت سے لوگوں کو ملک سے باہر ملازمتیں فراہم کیں۔ یوسف صاحب اس عہدے پر بارہ برس تک فائز رہے اور اس ادارے کو آخری وقت تک بے مثال طریقے سے چلایا۔ اس ادارے کے موسّس کے الفاظ میں "ادارے کے لیے ان کی انمول خدمات سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔"

اپنے دوست عباس خلیلی کے ایک اور منصوبے پاکستان ریفائنری، چاٹگام کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی انھوں نے کام کیا۔ وہ پاکستان کیمیکلز کے، Exon کے اور کئی برس تک ایسٹرن فیڈرل یونین کے بھی ڈائریکٹر رہے۔ جن لوگوں نے انھیں کام کرتے دیکھا ہے وہ ان کی کارکردگی اور ان کی خدمات کے بڑے مداح رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس حیثیت میں بھی انھوں نے کام کیا، ان کے ساتھیوں نے ہمیشہ اس کو سراہا ہے۔

یوسف صاحب کے بارے میں عباس خلیلی لکھتے ہیں، "انسان سا انسان تھا وہ، جس عہدے پر بھی اس نے کام کیا اس کو عزت بخشی، خواہ وہ عہدہ حکومت کا یا نجی ادارے کا رہا ہو۔ کامیابی نے انھیں کبھی بدعنوان نہیں بنایا نہ ہی ناکامی نے ان کے تصورات اور ان کے عزائم کو کم زور کیا۔ دوستی میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ جتنے دوست انھوں نے بنائے تھے، شاید ہی کوئی انسان بنا سکا ہوگا۔ ہر شعبۂ حیات میں ان کے دوست

تھے، ہر طبقے کے لوگوں سے ان کی دوستیاں تھیں، اسکول کی جماعت سے کالج کے میدانوں تک، ضلعی کچہریوں سے سرکاری سکریٹریٹ کی 'خانقاہوں' تک، اعلیٰ عہدوں والے سفارت کاروں سے بازار کے تاجروں تک، گالف کے میدانوں اور ٹینس کورٹ سے برج کی میزوں تک۔ پچیس برسوں پر محیط اسلامیہ کلب سے ان کے تعلقات نوجوانوں کے معاملات میں ان کی دل چسپیوں کے واضح مظہر ہیں۔ ان کی دوستیاں طویل اور گہری ہوتی تھیں۔ جس سے دوستی ہوگئی تو پھر نہ اس نے انھیں چھوڑا نہ انھوں نے اس کو۔ ان کے نزدیک دوستی صرف ایک فرد سے نہیں بلکہ خاندان سے ہوتی تھی۔ اصغر معیز شاہ سے ان کی صاحبزادی کی شادی سے دو اولاد ہوئیں جن سے وہ ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا شاہدان کی آنکھوں کا نور تھا۔ ان کی شریکِ زندگی بیگم زبیدہ یوسف نے زندگی میں انھیں ساری خوشیاں فراہم کیں۔ ہمیشہ ان کا ساتھ دیا، مشکل اوقات میں ان کی ہمت بڑھائی اور ایسی اخلاقی حمایت فراہم کی جیسی دنیا کی چند ہی عورتیں کرسکتی ہیں۔"

ان کے جگری دوست عباس خلیلی کے ان الفاظ سے بہتر شاید ہی کوئی اور ان کے بارے میں لکھ سکتا۔ ان سے مل کر میں ہمیشہ خوش ہوتا تھا اور مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ ۱۹۶۵ء میں میرے پاکستان چھوڑنے کے بعد سے صرف گاہے گاہے ہی ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ میری یادوں میں ان سے ایک ہی ملاقات ایسی ہے جس کو میں کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔ غالباً یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے، وہ پاکستان اسٹیل کے چیئر مین تھے اور میری کمپنی نے اپنا دفتر قائم کرنے کے لیے مجھے جاپان میں تعینات کردیا تھا۔ ان دنوں روشن علی بھیم جی سے برابر ملاقات رہتی تھی اس لیے کہ وہ اپنے اسکریپ یارڈ کے کاروبار کے سلسلے میں جاپان آتے رہتے تھے۔ اوساکا میں ان کی نمائندگی کرنے والے ایک صاحب، ناتھیانی تھے جن کا تعلق بمبئی سے تھا اور پہلے تو وہ صرف بھیم جی کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ ہندوستان سے جاپان اسکریپ کا مال برآمد کرتے تھے۔ انھیں کے مشورے پر بھیم جی نے بھی کراچی میں اپنا اسکریپ یارڈ قائم کیا تھا۔ بھیم جی نے اپنے دوست کی خاطر مدارات کے لیے مجھ سے فرمائش کی تھی اور اس طرح مجھے ٹوکیو میں یوسف صاحب کو خوش آمدید کہنے کا موقع ملا تھا۔ اس دوران ہم نے پورے برصغیر اور جرمنی کے درمیان تہ در تہ تہذیبی اور معاشیاتی رشتوں پر تبادلۂ خیالات کیا تھا۔ اسی دوران بین الاقوامی سطح پر معروف مستشرق پروفیسر این میری شمل کا تذکرہ بھی رہا جنھوں نے اقبال اور صوفیا پر بہت کام کیا تھا۔ وہ پاکستان برابر جاتی رہتی تھیں اور اپنی سرکاری حیثیت میں بھی یوسف صاحب سے ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے درمیان مشترک اور بھی دل چسپیاں تھیں، جاپانی کشتی، کچی مچھلی کھانے کا شوق، کابوکی تھیٹر اور جاپان کی موجودہ تہذیب پر گیشا (Geisha) خواتین کے اثرات وغیرہ جیسے موضوعات تھے جن پر ہم باتیں کرتے۔ در اصل ہمارے درمیان بات چیت کے لیے موضوعات کم پڑ گئے تھے۔ چوں کہ ہم دونوں کو گالف سے بہت دل چسپی تھی اس لیے کھیل میں عملی طور پر حصہ لیے بغیر بھی ہم گھنٹوں اس پر باتیں کرتے تھے۔ اگر کبھی موقع ملتا تو شاید دونوں کھیل بھی لیتے۔ ہم نے کئی بار کھیلنے کے بارے میں سوچا بھی تھا۔ یوسف صاحب کو اسلام آباد کے ہرے بھرے گالف کورس بہت یاد آتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ کبھی میں اسلام آباد کے گالف کورس کو دیکھتا، جس کے اساسی صدر یوسف صاحب ہی تھے۔ مجھے کئی ماہ قبل اس وقت اپنے دوست بہت یاد آئے تھے جب میں اپنے پیارے اور قریبی دوست روشن علی بھیم جی اور وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس جناب جسٹس محبوب سے ملنے اسلام آباد گیا تھا۔ اسلام آباد کے مقامی منیجر کے ہمراہ ہم تینوں رات کا کھانا کھانے اسلام آباد کلب گئے تھے اور جوں ہی ہم داخل ہوئے، سامنے آویزاں بڑی سی چوبی تختی پر لکھے ہوئے تمام سابقہ صدور کے ناموں کے ساتھ، مگر سب سے اوپر، یوسف صاحب کا نام کندہ نظر آیا تھا۔ بعد کی نسلوں کے لیے یہ ایک خوب صورت یادگار تھی جو ایک نوزائیدہ ملک کے ایک عظیم سپوت کے لیے ایک موزوں خراجِ تحسین تھا جس کو اپنی زندگی میں اس ملک کے لیے بہت کچھ کرنے کا موقع ملا تھا اور جس نے بین الاقوامی سطح پر اپنے ملک کا نام اجاگر کیا تھا۔ مجھے ان کا نام پڑھ کر فخر کا احساس ہوا اس لیے میں ان سے اپنے دوستی کے حوالے سے خود پر فخر کرتا تھا۔

میں اپنے ان لمحات کو ہمیشہ اپنی یادوں کے خزانے میں محفوظ رکھوں گا جن میں ہم دونوں ملا کرتے تھے، جو صرف خلوت کی

دعوتوں پر اور مختلف مسائل پر گفتگو میں گزرتے تھے۔

یوسف صاحب نے ۲۱راپریل ۱۹۸۷ء کو انتقال کیا۔ روشن علی بھیم جی نے دوسرے دن مجھے فون پر اطلاع دی۔ وہ مرحوم کے سوئم میں شرکت کے بعد واپس ہوئے تھے، جو ایک بے مثال انسان تھے اور جن کے بارے میں وہ بڑے احترام اور خلوصِ دل کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے۔ یوسف صاحب سے ملاقات کے بعد مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ بھی روشن علی بھیم جی کے بارے میں اسی نوع کے جذبات رکھتے تھے۔

یوسف صاحب کے انتقال پر عباس خلیلی ان خوب صورت الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا:

''ہم ایس ایم یوسف کو ایک گرم جوش اور محبت کرنے والے انسان کے طور پر یاد رکھنا چاہتے ہیں۔انھوں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا، ہمیشہ امداد کے خواہاں لوگوں کی مدد کی۔ بوڑھا ہو یا جوان وہ سب کے لیے حاضر رہتے۔ ہماری چالیس سالہ رفاقت، جو ۱۹۴۷ء میں شروع ہوئی تھی پلک جھپکتے ۱۹۸۷ء میں انجام کو پہنچی۔ مگر سچ مچ ایسا نہیں ہے۔ وہ ہماری یادداشتوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے، جیسا کہ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے:

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

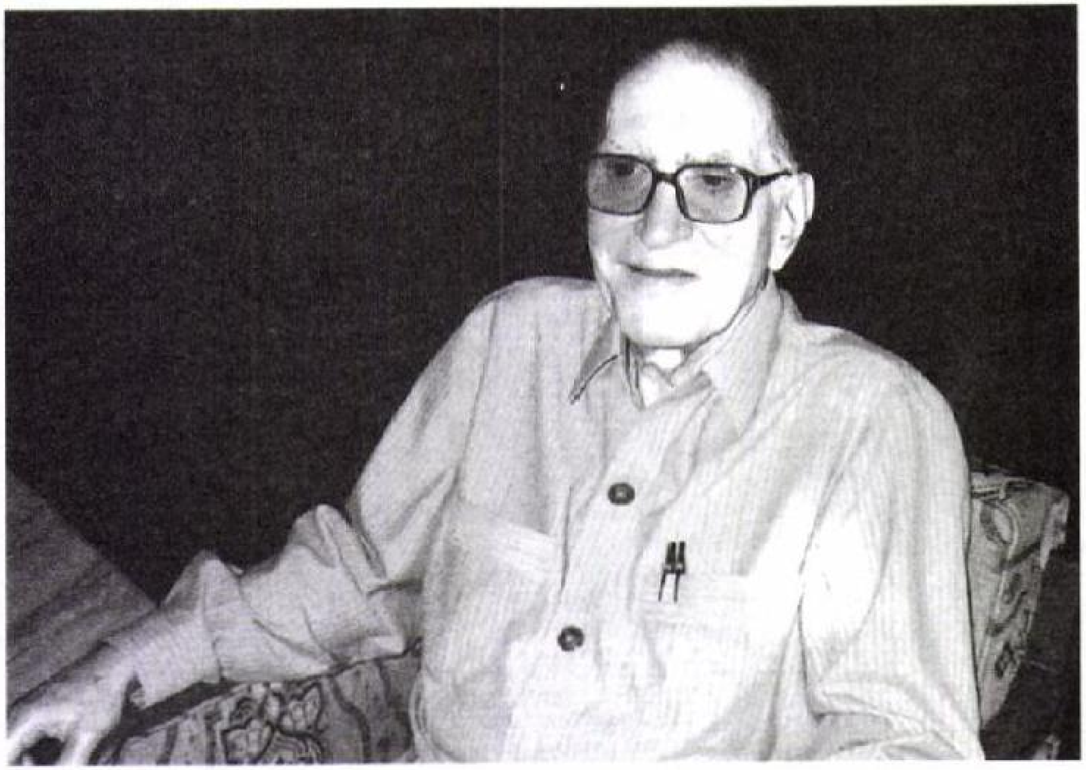

سعید احمد ۱۹۹۷ء میں سندھ کلب میں

روشن علی بھیم جی ای ایف یو کے زیرِ تربیت افراد سے سعید احمد کا تعارف کراتے ہوئے

سعید احمد

اعتبار کا قلعہ

جب پاکستان وجود میں آیا تو ملک کو بالکل نئے سرے سے شروعات کرنی پڑی تھی۔ مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں بازوؤں میں شاید ہی کوئی صنعتی ادارے رہے ہوں۔ بنیادی طور پر یہ ایک زراعتی قوم تھی جس کی دولت پٹ سن اور کپاس پر منحصر تھی جو برآمد کے کام آتی تھیں۔ اس ملک کی سب سے بڑی دولت اس کے ایک سو بیس ملین عوام تھے۔ مگر ان میں سے زیادہ تر کو تعلیم کے مواقع نصیب نہیں ہوئے تھے۔ ملک کے باشندوں کی ایک بڑی اکثریت جاگیرداروں اور زمینداروں کے رحم وکرم پر زندہ تھی۔ ان میں کچھ تو بااثر افراد کے غلاموں جیسے تھے۔ دو طبقے ایسے تھے جو ابتدائی دنوں ہی سے ملک کے ستون سمجھے جاتے تھے جن پر قوم کا انحصار تھا اور جن کے بغیر شاید ملک کی تاریخ ہی اور ہوتی، یعنی فوج اور سرکاری ملازم۔ سرکاری ملازمین میں ICS (انڈین سول سروس) کے افراد تھے جو ملک کے بہترین ذہنوں میں سے منتخب تھے۔ اور تعجب نہیں کہ جب ملک کو اپنی حکومت کی مشین تیار کرنی تھی تو انھیں لوگوں پر انحصار ایک مجبوری تھی، جنھوں نے ہندوستان کے مختلف اداروں سے اپنے نئے وطن پاکستان تبادلے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان میں جو اہم اور قابلِ ذکر نام تھے ان میں غلام محمد، ایس ایم یوسف، عباس خلیلی، غلام فاروق، عقیلی، ممتاز حسن، زاہد حسین، سعید احمد اور کئی دوسرے شامل تھے جو ملک کے دوسرے عشرے میں ہونے والی سیاسی اور معاشی ترقی کے حوالے سے ملک میں زباں زدِ عام ہونے والے تھے۔

مجھے مواقع میسر تھے جن کی بنا پر، جیسا کہ میں اس کتاب میں بیان کر چکا ہوں، ان میں سے بہت سے افراد سے ذاتی تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ کچھ سے تو بس واجبی سی شناسائی تھی مگر کچھ ایسے بھی تھے جن سے اچھی طرح واقفیت ہوگئی تھی۔ ان ہی میں سے سعید احمد بھی تھے۔ یہ سرکاری افسران کے اسی ممتاز اور قابلِ فخر طبقے سے تعلق رکھتے تھے، پاکستان کے پہلے بیس برسوں میں جنھوں نے ملکی معاملات میں نمایاں کردار ادا کیے تھے۔

ان ہی جیسے لوگ، جن کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے، معاشیاتی اور صنعتی میدانوں میں ملکی ترقی کے روشن دماغ تھے۔ وہ سارے ملک، حکومتیں، ادارے اور افراد جو ان دنوں دنیا کے معاملات چلا رہے تھے ان افراد کی ہمت، ولولہ انگیزی اور بصیرت کے قائل تھے۔ اور میرے اپنے خیال کے مطابق میرے دوست جناب سعید احمد ان روشن دماغ لوگوں میں سے تھے جن کی دیانت داری پر کسی کو کبھی شک نہیں ہوا تھا اور جن پر سب اعتماد کرتے تھے۔ اگر میں نے اس شخصیت کے بارے میں کچھ تفصیلات اس کتاب میں بیان نہ کیں، جو ایسٹرن فیڈرل یونین کے ممتاز ڈائریکٹروں میں سے تھے، تو ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ مجھے اس بات کی زیادہ خوشی ہے کہ میرے دوست، اپنی عمر کے آٹھویں عشرے میں ہیں، اب بھی نہ صرف بقیدِ حیات ہیں بلکہ اس ملک کی ترقی پر نظر رکھے ہوئے ہیں جس کو انھوں نے اُس وقت اپنا وطن بنایا تھا جب پاکستان کا خواب شرمندۂ تعمیر تعبیر ہوا تھا۔

سعید احمد ۱۹۱۳ء میں غیر منقسم پنجاب کے شہر امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد انھوں نے بینکنگ کی صنعت میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے اس پیشے کے گرویدہ تھے۔ ان کے والد پولیس کے محکمے میں افسر کی حیثیت سے ملازم تھے۔ سعید احمد نے اپنے والد کی اجازت سے امپیریل بینک میں ملازمت کی درخواست دی۔ ''میرے دو دوست اس بینک میں کام کر رہے تھے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ اس ادارے میں ایک اسکیم کے تحت ''آزمائشی مدت کے معاونِ کار'' رکھے جا رہے تھے۔ منتخب لوگوں کو تربیت کے دوران بھی اچھی تنخواہ دی جا رہی تھی۔'' جب سعید احمد ماضی کی یادوں سے بینک میں اپنی ملازمت کی تفصیلات بیان کر رہے تھے تو ان کا مسکراہٹ بھرا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ ''مگر پھر جب ۱۹۳۳ء۔ ۱۹۳۴ء کی شدید مالی کساد بازاری آئی تو امپیریل بینک پر بھی اثر انداز ہوئی اور ملازمت کی یہ اسکیم ختم کر دی گئی تھی مگر انھوں نے مجھے ایک زیرِ تربیت ملازم کی آسامی کی پیش کش کر دی جو میں نے بخوشی قبول کر لی۔ مگر انھوں نے یہ وعدہ ضرور کیا تھا کہ اگر میری کارکردگی ان کے معیار پر پوری اُتری تو مجھے افسری کی سطح پر ترقی دے دی جائے گی۔ تو میں نے کمپنی کے صدر دفتر، کلکتے میں اپنی تربیت شروع کر دی۔ اس وقت اتنی بڑی عمارت میں صرف میں ہی ایک مسلمان کام کر رہا تھا۔ میرے سوا ایک بھی مسلمان نہیں تھا وہاں، مسلمان افسروں کا سوال ہی نہیں۔ میں واقعی خود کو وہاں بہت بے چین اور تنہا محسوس کر رہا تھا حالاں کہ وہاں کا ماحول اچھا خاصا تھا، نہ کسی قسم کی تعصب تھا نہ مسلمانوں کے خلاف جذبات تھے۔ ہم سب ایک ہی مقام سے ایک ہی طبقے اور ایک ہی سطح کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت میری عمر چوبیس برس کی تھی۔ بعد میں میرا تبادلہ بینک کی امرتسر شاخ میں کر دیا گیا۔ دراصل کام کی زیادتی کی وجہ سے انھیں مدد کی ضرورت تھی اس لیے مجھے وہاں بھیج دیا گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس شاخ میں ایک مسلمان بھی ملازم تھا جس نے میری بہت مدد کی جب کہ دوسرے مجھے بالکل نظر انداز کرتے اور میری کسی قسم کی مدد کے لیے تیار نہ تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ میرے ساتھیوں میں ایک شخص تھا جس نے کام کے بارے میں میرا علم وسیع کرنے میں میری مدد کی، وہ ایک نوجوان پارسی تھا۔ اس کے علاوہ بینک میں زیادہ تر انگریز تھے جن میں اسکاٹش کی تعداد زیادہ تھی۔ وہاں ملازمت سے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میرے علم میں بہت اضافہ ہوا۔ میں اس وقت لاہور میں تھا جب ریزرو بینک آف انڈیا بنا تھا اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، ان دنوں بینک کے کاروبار میں بہت کم مسلمان ملتے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان یہ پیشہ کچھ زیادہ مقبول نہ تھا۔ میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ مذہبی نہیں تھی۔ مسلمانوں کی تہذیب میں اس پیشے کے بارے میں ایک قسم کی ناگواری پائی جاتی تھی۔ سودی لین دین بازاروں میں ہندو کرتے تھے۔ یہاں میں بینکوں کے حوالے سے بات نہیں کر رہا ہوں جو زیادہ تر غیر ملکیوں، انگریزوں، کی ملکیت ہوتے تھے۔''

بہر حال جیسا کہ تقدیر نے چاہا تھا، سعید احمد کا مسلمان ہونا ہی ریزرو بینک، بمبئی میں ان کی ملازمت کا باعث ہوا۔ شاید سیاسی اعتبار سے اس کی ضرورت محسوس کی گئی تھی کہ اس نئے سرکاری ادارے میں کچھ مسلمانوں کو بھی ہونا چاہیے۔

جب تقسیم ہوئی اس وقت سعید احمد بمبئی میں اسسٹنٹ کنٹرولر آف فارن ایکسچینج کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے ملازمت کے لیے پاکستان کا انتخاب کیا اور ۱۹۴۸ء کے اوائل ہی میں وہ اور ان کے اہلِ خاندان پاکستان ہجرت کر گئے، جہاں پہنچتے ہی انھوں نے ریزرو بینک آف انڈیا کی کراچی شاخ میں کام کرنا شروع کر دیا۔

تقسیم کے وقت کے طے ہوا تھا کہ تیس جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مرکزی بینک مشترکہ ہوں گے، اس کے بعد اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو وجود میں آنا تھا۔ اس وقت تک ریزرو بینک آف انڈیا کی کراچی شاخ کو سارے مالیاتی فرائض ادا کرنے تھے۔ میں نے جو کچھ سرکاری افسروں کی قابلیت اور کاروباری معیار کے بارے میں کہا اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ باوجود گوں ناگوں مشکلات اور دباؤ کے جوان اہل کاروں پر تھا، یہ کام مقررہ وقت میں انجام کو پہنچا۔ ساری اَن ہونیوں اور مشکلات کے باوجود یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح قائدِ اعظم کے ہاتھوں ہوا۔ اتفاق ہے کہ قائدِ اعظم اس افتتاح کے بعد، بالخصوص جس کے لیے انھوں

نے کوئٹہ سے کراچی کا ہوائی سفر کیا تھا، منظرِ عام پر نہیں آسکے۔ اس سلسلے میں زاہد حسین صاحب نے بہت کام کیا تھا جو اسٹیٹ بینک کے مؤسس بھی تھے اور پہلے گورنر بھی۔ اور ان کے معتمد اور لائق ساتھیوں میں سے ایک سعید احمد تھے۔

ان ہی دنوں سعید احمد کو ایک ضروری سرکاری کام سے بمبئی جانا پڑا جہاں ان کی ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس سے وہ پہلے کبھی نہیں ملے تھے، مگر جو بعد میں ان کا قریبی ساتھی بن گیا۔ میری مراد روشن علی بھیم جی سے ہے۔ کس طرح یہ دونوں پہلی بار ملے، اس کی تفصیلات سعید احمد نے خود مجھے بتائیں جب وہ ملازمت سے فارغ ہوچکے تھے اور کافی دنوں سعودی عرب کی مالیاتی ایجنسی کے مشیر رہ کر پاکستان واپس پہنچے تھے۔

''یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے جناب روشن علی بھیم جی سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اور جن حالات کے پیشِ نظر ہم دونوں کی ملاقات ہوئی اس کا بتانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کو ایک دن سیاسی اور تاریخی پس منظر میں دیکھا جانا ہے۔ ریزرو بینک آف انڈیا اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے مابین اثاثوں کی تقسیم ہونی تھی۔ اور یہ گردش میں موجود کرنسی نوٹوں کی بنیاد پر ہونے تھے جو پاکستان سے بمبئی بھیجے جانے والے تھے۔ اثاثے سونے کی سلاخوں، حصص اور زرِ مبادلہ پر مشتمل تھے۔ اس لیے ہم لوگ کراچی سے بمبئی اپنے لوگوں کے ہاتھوں کرنسی نوٹ بمبئی بھیجتے جہاں ان کی جانچ پڑتال ہوتی اور پھر ان کا رجسٹریشن ہوتا تھا۔ ان کے عوض اثاثے جاری کیے جاتے جو ہم تک پہنچائے جاتے۔ بدقسمتی سے ان تبادلوں میں بہت تاخیر ہوتی تھی اور چوں کہ ریزرو بینک کے ڈپٹی گورنر Sir Cecil Trevor سے میرے ذاتی مراسم تھے اس لیے مجھے بھیجا گیا تھا تاکہ میں معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کرادوں۔ اس سلسلے میں تمہیدی خط کتابت ہوچکی تھی اور Sir Cecil نے پیغام بھیج دیا تھا کہ وہ بمبئی سے کراچی آمد کے منتظر ہیں اور یہ بھی کہ جہاں تک ہوسکا وہ سونا اپنے ساتھ لانے میں میری مدد کریں گے۔ لہٰذا ہم نے پاکستان ایئر فورس کے ایک مال بردار جہاز کا انتظام کیا اور خوش قسمتی سے اس کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ میں نے بینک سے ہوائی اڈے تک سونے کی ترسیل کے لیے ایک بکتر بند گاڑی کرائے پر حاصل کی۔ ان دنوں بمبئی میں حالات بہت خراب ہورہے تھے اس لیے اگر پاکستان لے جائے جانے والے قیمتی اثاثے کی خبر پھیلے تو اس کو خطرات لاحق ہوسکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان اثاثوں کی راہ داری کے دوران خطرات کا بیمہ کرالیا جانا چاہیے۔ میں نے اپنے اسٹیٹ بینک کے گورنر سے مشورہ کیا اور انھوں نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ سو میں نے بمبئی میں بیمے کے لوگوں سے بات کی مگر اس خطرے کے بیمے کے لیے کوئی راضی نہیں تھا۔ کوئی اس مال کو جو پاکستان لے جایا جانا تھا، چھونا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ان حالات کے پیشِ نظر مجھے کیا کرنا چاہیے، اس سلسلے میں اپنے دوستوں سے مشورے کیے۔ ان میں سے ایک مسلمان نے ایک نام پیش کیا تھا، روشن علی بھیم جی۔ وہ بمبئی کے معروف بیمہ ایجنٹ تھے جن کے بیمے کی صنعت میں کافی تعلقات تھے اور خیال تھا کہ وہ واحد انسان ہیں جو اس سلسلے میں میری مدد کرسکیں گے۔ لہٰذا میں نے ان سے رابطہ کیا۔ میں نے ان کو بہت خوش اخلاق، ماہر پیشہ ور اور مددگار پایا۔ انھوں نے کہا کہ وہ لندن میں اپنے دوست بروکروں کی مدد سے ''کوانشورنس'' کے ذریعے اس مسئلے کا حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔ اور وہ اس کوشش میں کامیاب ہوگئے، انھوں نے سب کچھ طے کرادیا جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ مگر تاریخ کی خاطر مجھے سونے کی ترسیل کے اس واقعے کی تکمیل کرنی ضروری ہے۔

جب ہمارا خزانہ بار ہوچکا، سبز سگنل دیا جاچکا تھا اور ہوائی جہاز اُڑنے ہی والا تھا کہ اچانک جہاز کے ہواباز کو پیغام ملا کہ جہاز کو اڑنے سے روک دیا جائے اور جہاز کو ہوائی پٹی سے واپس اڈے کی طرف لے آیا جائے۔ میں یہ سب کچھ دیکھ اور سن سکتا تھا اس لیے کہ میں خود بھی جہاز پر سوار تھا اور ساری کارروائی میرے اشارے پر ہی ہورہی تھی۔ مڑتے وقت جہاز کا ایک پہیہ ہوائی پٹی سے اُتر گیا تھا۔ ہواباز کی بارہا کوشش کے باوجود پھنسا ہوا پہیہ نکالا نہیں جاسکا۔ میں نے خود جہاز سے اُتر کر ریزرو بینک میں اپنے دوستوں کو ٹیلی فون کیا اور Sir

Cecil سے بھی بات کی اس لیے کہ ہوائی اڈے کے اربابِ اقتدار ہماری سُن ہی نہیں رہے تھے۔ Sir Cecil نے از راہِ مہربانی ایک ٹریلر جیسی کسی گاڑی کا انتظام کرادیا جس کی مدد سے جہاز کے پھنسے ہوئے پہیے کو نکالا گیا اور بالآخر جہاز نے پرواز کی۔ میرے افسر جناب زاہد حسین ہماری کارکردگی سے بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے بار بار بیمہ کرانے کے ہمارے فیصلے کو سراہا اس لیے کہ ہمارا جہاز تقریباً سارا وقت ہندوستانی فضاؤں میں پرواز کرتا رہا تھا۔ میری اور روشن علی بھیم جی کی دوستی کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی۔ انھوں نے پاکستان کی خاطر ہماری مدد کی جو پاکستان کے لیے تھی۔ ذرا سونے سے بھرے ہوئے ایک ہوائی جہاز کا تصور کیجیے، لبالب سونے سے بھرا ہوا!

جب جناب بھیم جی پاکستان آئے، غالباً ۱۹۵۲ء میں، تو انھوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور ہم دونوں اچھے دوست بن گئے۔ اور پھر ۱۹۶۰ء میں انھوں نے ایسٹرن فیڈرل یونین کی زمام انتظام سنبھال لی، اور چند برس بعد مجھے اس کمپنی میں ڈائریکٹر بننے کی پیش کش کی۔ عباس خلیلی جنھیں میں قریب سے جانتا تھا، اس وقت کمپنی کے چیئرمین تھے اور کئی سربرآوردہ شخصیات بورڈ میں شامل تھیں۔ اس ادارے میں شمولیت میرے لیے خوشی اور اعزاز کی بات تھی۔ روشن علی بھیم جی کی سربراہی میں یہ ادارہ بڑا، مالی طور پر مضبوط اور کاروبار کے معاملے میں طاقتور بن چکا تھا۔ عباس خلیلی چیئرمین کی حیثیت سے کمپنی کے لیے بڑا اثاثہ تھے۔ قصہ مختصر، ان دنوں ای ایف یو ایک بڑا اور نہایت طاقتور ادارہ بن چکی تھی، بلکہ میں تو اس کو ایک قومی انسٹی ٹیوشن کہوں گا۔ ان دنوں کی یادیں میرے دل و دماغ میں اب تک محفوظ ہیں، کہ مجھے اس کے بورڈ میں شامل ہو کر خدمت کا موقع دیا گیا تھا۔“

جناب سعید احمد نے، جس حیثیت میں بھی ممکن ہو سکا، ہمیشہ پاکستان کی حکومت اور اس کے عوام کی خدمت کی، جذبے کے ساتھ اور سرگرمی کے ساتھ۔ وہ ہمیشہ سے داخلیت پسند آدمی تھے، بہت خاموش مگر کھلی اور متجسس آنکھوں والے۔ ان کا کسی مسئلے کو حل کرنے کا انداز مجھے پسند تھا۔ چوں کہ وہ صبر آزما سننے والے انسان تھے۔ قبل اس کے اس میں کود پڑیں، وہ ذرا پیچھے ہٹ کر مسئلے پر غور کرنے کے عادی تھے۔ لیکن ایک بار وہ فیصلہ کر لیں تو لوگ ان پر اعتبار کرتے تھے۔ اپنے ایک دوست کے الفاظ میں وہ ایک ”اعتبار کا قلعہ“ تھے۔ جب میری ان سے شناسائی ہوئی اس وقت وہ ڈپٹی کنٹرولر آف فارن ایکسچینج تھے، ایسے عہدے پر جو پیسے بنانے والے لوگوں کے لیے پُرکشش تھا، مگر ہمارے دوست سعید احمد کے لیے نہیں۔ وہ کسی کے لیے بھی ”غیر ضروری“ مدد کرنے کے قائل نہیں تھے، حتیٰ کہ اپنے قریبی دوستوں کے لیے بھی۔ ان کی دوست نما اور مہربان شخصیت کے نیچے، پاکستان کی سول سروس کے اعلیٰ طبقوں کے بلند معیارِ دیانت کے مطابق بھی، ایک ناقابلِ تبدّل دیانت داری چھپی ہوئی تھی جو ناقابلِ شکست بھی تھی۔ وہ اصولوں کی پاسداری سمندری لہروں کے بیچ ایک چٹان کی مانند کرتے تھے مگر یہ سب کچھ وہ پُرکشش مسکراہٹ کے ساتھ کرتے تھے۔ اس طرح کہ ان کے قریبی دوست بھی ان کے انکار کو خنداں پیشانی سے قبول کر لیتے تھے۔

ایک اپنے اصولوں والی فطرت رکھنے والے ان جیسے انسان کے لیے ایوب خان کی نرم خو فوجی حکومت اس وقت کے ترقی پذیر پاکستان کے حالات کے لیے مناسب رہی ہوگی۔ وہ مضبوط اعتقادات والے انسان تھے اور ہمیشہ اس کی نگہداری کرتے تھے۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ وہ پاکستان کے ماضی کے دنوں کو کس طرح دیکھتے ہیں انھوں نے کہا، ”میں سمجھتا ہوں کچھ دنوں تک ہم صحیح سمت میں جا رہے تھے۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد بدقسمتی سے کچھ بدنظمی اور عدمِ استحکام پیدا ہو گیا۔ قائدِ اعظم بھی ذرا جلد ہی ہمیں چھوڑ گئے تھے۔ ان کے بعد ایک دور ایسا آیا تھا جس میں سیاست داں کھینچا تانی میں مصروف ہو گئے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ سب منتخب سیاست داں نہیں تھے۔ یہ سب ہندوستان کی پُرانی قومی اسمبلی کے ارکان تھے جو پاکستان آ گئے تھے اور پنجاب، شمالی سرحد، سندھ اور بنگال کی نمائندگی کر رہے تھے۔ وہ ووٹ کے ذریعے اقتدار میں نہیں آئے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس صحیح معنوں میں اختیارات نہیں تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ مرکزی اسمبلی کے ارکان رہ چکے تھے اس لیے وہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے رُکن بن گئے تھے۔ اور پھر غلام محمد نے اقتدار سنبھال لیا اور بالآخر سیاسی بیداری اور آگاہی کی وہ تمام نرم جڑیں جو نئے ملک کی سرزمین میں پیوست ہو رہی تھیں ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔

مگر وہ بہت بوڑھے اور کم زور ہو گئے تھے، ان کی صحت بھی خراب رہتی تھی۔ اسکندر مرزا کی مدد سے جنرل ایوب خان نے ان کو اور ان کی کٹھ پتلی حکومت کو نکال باہر کیا۔ اور پھر پاکستان کے 'سنہرے دور' کا آغاز ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ میرے ہم عصر لوگوں کی اکثریت مجھ سے اتفاق کرے گی۔ وہ ہماری تاریخ کا بہترین دور تھا۔ ہمارے ملک میں صنعتی اور معاشیاتی میدانوں میں بہت ترقی ہوئی۔ اس دور کی دنیا کی اہم طاقتوں کے نزدیک ایوب خان محترم ٹھہرے۔ مگر یہ سب کچھ ایک شخص کے عوامی تصورات اور انا پرستی نے زمیں بوس کر دیا جس نے ایک آن میں بہت ساری صنعتوں، بینکوں، بیمہ کمپنیوں، جہاز رانی کے اداروں وغیرہ کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ اُس پر مستزاد یہ کہ ہم نے مشرقی پاکستان کھو دیا۔ میں نہ سیاست داں ہوں نہ کبھی رہا ہوں، اس لیے میں اس بات پر بحث نہیں کرنا چاہتا کہ مشرقی پاکستان کی 'علیحدگی' سے احتراز کیا جاسکتا تھا یا نہیں۔ میں صرف ان پہلوؤں کے بارے میں اظہارِ خیال کر سکتا ہوں جو بالواسطہ یا بلا واسطہ میرے فرضِ منصبی سے متعلق تھے۔ جب یہ سب کچھ قومیائے جانے کے واقعات ہوئے، میں PIDC کا چیئر مین تھا۔ اس حیثیت میں کچھ قومیائے ہوئے صنعتی اداروں کی ذمے داری مجھ پر تھی۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ڈپٹی گورنر رہنے کے بعد پہلے مجھے پانچ برس کے لیے PICIC بھیجا گیا تھا جہاں میں نے اس عظیم اور حیرت انگیز انسان عقیلی کی ماتحتی میں کام کیا۔ جب ایوب خان نے ان کو وزیرِ خزانہ بنادیا تو ان کی جگہ میں چیئر مین بنا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے PICIC کا انتظام سنبھالا اور وہاں سے میں نے دیکھا کہ کس طرح پاکستان کے عوام کے نام پر پرانے مالکان اور پیشہ ور صنعت کاروں کو نکال کر ان کی جگہ ایسے لوگوں کو بٹھا دیا گیا جن کے پاس سوائے ایک مخصوص سیاسی پارٹی کی رکنیت کے کوئی اور سند نہیں تھی۔ مجھے یہ سب اس لیے معلوم ہوا کہ عارضی طور پر PIDC کو کچھ صنعتی اداروں کی اس وقت تک دیکھ بھال کرنی پڑی تھی جب تک کہ ان کے نئے منتظمین کا تقرر نہیں ہو گیا تھا۔ اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے فوراً بعد کے دنوں میں جو کچھ ہوا اس کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ برسرِ اقتدار جماعت کے ایک اہم رُکن جو حکومتِ سندھ میں بارسوخ وزیر تھے، مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس وزیرِ اعظم سے احکامات آئے ہیں اور انھوں نے مجھے وہ فہرست دکھائی جس میں سو سے زیادہ افراد کے نام تھے جن کو قومی ملکیت میں لیے جانے والے اداروں میں سربراہ یا اعلیٰ انتظامی عہدوں پر تعینات کیے جانے کے احکامات صادر کیے گئے تھے۔ اور اگر جگہیں نہ ہوں تو بھی ان کی تعیناتی کا کسی نہ کسی طرح انتظام کیا جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ تھا وہ طریقہ جس طرح ان دنوں حکومت چلائی جا رہی تھی۔ انھیں اپنے لوگوں کی مدد کرنی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے لوگوں کو ان تمام صنعتوں کے اہم عہدوں پر فائز کیا جائے جن کو قومی ملکیت میں لیا جا چکا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اپنے لوگوں کو فیضیاب کیے جانے کا رواج پوری دنیا میں ہے اور بالخصوص اس علاقے میں جس کے سیاسی اور تہذیبی ماحول میں ہم رہتے ہیں۔ مگر سیاسی اعتبار سے بھی ہر کام کی ایک حد ہوا کرتی ہے۔ ایسے بڑے تجارتی اداروں کے اعلیٰ عہدوں کے ساتھ کھلواڑ کرنا، جو آپ کے ملک کی ریڑھ کی ہڈی کے مترادف ہوتے ہیں، بدترین نالائقی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں میں کچھ قابل لوگ بھی تھے مگر اس کھیل کے لیے جو عام 'اصول' اپنائے گئے تھے وہ دنیا کے کسی خطے میں بھی قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ ایک بار آپ تجارتی اداروں کو سیاسی کھیل میں گھسیٹ لائیں تو پھر، آپ جانتے ہیں کہ، ان سے کارکردگی میں چستی اور پیشہ وری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

اس کے برعکس اسی نوع کے حالات میں ایوب خان کا رویہ کیا تھا، وہ بھی میں دیکھ چکا تھا۔ حکومت سے ان کے اخراج کے بعد لوگ جو کچھ ان کے بارے میں کہتے ہیں اس کو سُن کر مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ ان کے بارے میں میرا تجربہ بہت مختلف تھا اور میں پوری طرح حکومت کے معاملات میں شامل تھا جب زمامِ اقتدار فیلڈ مارشل ایوب خان کے ہاتھوں میں تھی۔ میرے پاس مثال کے طور پر ایک واقعہ ہے جس سے ان کے ذاتی طریقۂ کار کا صحیح انداز ہوتا ہے۔ میں اس وقت PICIC کا چیئر مین تھا۔

ایک دن ایوب خان کا سب سے چھوٹا بیٹا طاہر، جو گوہر ایوب سے چھوٹا تھا، مجھ سے ملاقات کے لیے آیا اور ڈھائی ہزار تکلوں کی ایک ٹیکسٹائل مل لگانے کے لیے قرض دیے جانے کی درخواست کی۔ پہلے میں نے ان کی پوری بات سنی اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ وہ

سرکاری طور پر اپنے منصوبے کے لیے تحریری درخواست دیں، ہمارے ماہرین جس کی جانچ پڑتال کریں گے، اس کا قدری تخمینہ کیا جائے گا اور اس کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ ہم اس منصوبے کے لیے قرض دے سکتے ہیں یا نہیں۔ طاہر ایوب نے مجھے کچھ استعجاب کی نظروں سے دیکھا مگر فوراً ہی سمجھ داری کا مظاہر کیا اور بغیر کسی غصے یا بیزاری کا اظہار کیے چلا گیا۔ اس کے بعد اس نے تمام کام کے لیے ذاتی کارروائی مکمل کی اور با قاعدہ اپنی درخواست داخل کر دی۔ درخواست کا تجزیہ کیا گیا، اس کو معاشیاتی اعتبار سے قابلِ قبول پایا گیا، مزید یہ بھی کہ اس منصوبے کی معاونت کرنے والے صاحبانِ حیثیت بھی تھے اور اس صنعت کو کامیابی سے چلانے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ میں نے سوچا کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ قبل اس کے کہ یہ قرض منظور کیا جائے ہمیں اس کو صدر کے علم میں لانا چاہیے اس لیے کہ ان کا بیٹا اس منصوبے کا lead sponsor ہے۔ میں اسلام آباد گیا اور صدر کے پرنسپل سیکریٹری جناب فدا حسین سے ملا اور انھیں اس منصوبے کے بارے میں تمام نکات بتائے۔ وہ میری بات فوراً سمجھ گئے اور انھوں نے مجھ سے اتفاق کیا اور کہا کہ یہ اچھا خیال ہے کہ ایسے معاملات کو صدر کے علم میں ضرور لایا جانا چاہیے اور اس کو اس وقت تک منظور نہیں کیا جانا چاہیے جب تک کہ صدر اس پر اپنی رائے نہ دے دیں۔ لہٰذا دو تین ہفتے تک میں نے صدر کے ردِعمل کا انتظار کیا۔ ایک دن فدا حسین صاحب نے ٹیلی فون پر بتایا کہ انھوں نے اس موضوع پر صدر سے بات کی تھی اور انھوں نے ہدایت کی ہے کہ میں اس منصوبے کو داخلِ دفتر کر دوں اور یہ بھی کہا کہ اب طاہر ایوب اس معاملے پر آپ کو پریشان نہیں کریں گے، اس لیے مجھے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ اس بات سے میں بہت متاثر ہوا تھا، اور جب یاد کرتا ہوں تو آج بھی وہی کیفیت ہوتی ہے۔ لہٰذا مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے جب میں گندھارا انڈسٹریز کے سلسلے میں ایوب خان کے خلاف الزام تراشی سنتا ہوں، جو میرے خیال میں حقیقت پر مبنی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایوب خان کا اس معاملے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ معاملہ جنرل حبیب اللہ کا تھا جن کی اپنی ایک حیثیت تھی۔ ان کی اپنی حیثیت تھی جس کی بنا پر جنرل موٹرز نے ان کو اس منصوبے پر بات چیت کے لائق سمجھا تھا۔ وہ خود صاحبِ حیثیت انسان تھے اور انھوں نے اپنی طرف سے سرمایہ لگایا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوگی اگر جنرل موٹرز جیسا بڑا ادارہ کسی ایسے شخص سے معاملت کرے گا جس کے پاس نہ مناسب مقدار میں دولت ہوگی اور نہ اتنی بڑی صنعت چلانے کے لائق انتظامی صلاحیت۔ میرے خیال میں یہ سارا معاملہ بالکل غلط انداز میں عوام کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ منصوبہ جنرل حبیب اللہ کا اپنا تھا، اتفاق سے جن کے داماد صدر ایوب کے سب سے بڑے بیٹے گوہر ایوب تھے۔ صدر بذاتِ خود بہت نفیس انسان تھے۔ اتنے عرصے کے دوران انھوں نے کبھی مجھ سے نہ اپنے لیے اور نہ اپنے دوستوں کے لیے کوئی رعایت طلب کی تھی۔ وہ بہت سلجھے ہوئے انسان تھے، ایک بڑے زمیندار بھی مگر ملک کے لیے بہت اچھے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ میں غلط ہوں مگر میرے احساسات کچھ ایسے ہی ہیں۔''

سعید احمد صاحب سے چالیس برس کی شناسائی کے دوران میں نے نہ صرف ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے بلکہ ایک دوست اور ایک انسان کی حیثیت سے ان کے اچھائیوں پر بھی میری نظر رہی ہے۔ جب بھی وہ اور ان کی دل موہ لینے والی شریکِ حیات یورپ آتے ان کی ہمیشہ کوشش ہوتی کہ وہ میونخ آئیں، ہم سے ملاقات کریں اور جھیل اسٹارن برگ پر واقع میرے مکان پر ہمارے مہمان ہوں۔ ان سے میل جول بہت آسان لگتا تھا اس لیے کہ اپنے اطراف وہ ایسی کیفیات پیدا کرتے تھے جو نہ صرف دوسروں کو بلکہ ان کے اپنے لیے بھی اطمینان کا باعث ہوتی تھیں۔ وہ لفظوں کا ہیر پھیر نہیں کرتے تھے، صاف صاف وہی کچھ کہتے دیتے تھے جو اُن کے دل اور اُن کے ذہن میں ہوتا تھا۔ اکثر اوقات میں نے ان کے ذہن سے ان کے وطن، پاکستان کے، جس سے وہ بہت محبت کرتے تھے، بہت سے معاشی اور سیاسی مسائل کے تجزیے اور حالات آسانی سے اخذ کر لیتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہم ملک کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں طویل گفتگو کر رہے تھے۔ اتفاق سے یہ ایک دن قبل کا واقعہ ہے جب پاکستان کی پچاسویں سالگرہ منائی جانے والی تھی۔ انھوں نے اپنے خیالات کا خلاصہ پیش کیا جس کو میرے خیال میں اس لیے محفوظ کیا جانا چاہیے کہ یہ وہ انسان کہہ رہا ہے جو اس ملک کی مقتدرہ کے مرکز میں پچیس برس

تک کام کرتا رہا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کہا وہ مندرجہ ذیل ہے:

"میرے خیال میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا قومی ملکیت میں لیے جانے کا پروگرام ہماری معاشی تنزلی کا باعث ہوا تھا۔ اس سے قبل پاکستان، شاید پہلا، "ایشین ٹائیگر" بننے کی طرف رواں دواں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار 'ٹائمز' میگزین کے سرورق پر احمد داؤد کی تصویر شائع ہوئی تھی، جو اس زمانے میں پاکستان کے بہت کامیاب تاجر اور صنعتکار سمجھے جاتے تھے۔ ان کو ایک صاحبِ بصیرت کاروباری اور پاکستان میں ترقی کی علامت کے طور پر جانا جاتا تھا، بین الاقوامی اعتبار سے بھی ایک بڑے کامیاب تاجر۔ بھٹو کے ظہور کی وجہ سے ان کے کاروبار کی سلطنت مکمل طور پر تباہ اور صفحۂ ہستی سے غائب ہوگئی تھی۔ اور یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہوا جب، جیسا کہ مجھے علم ہے، وہ اپنے وطن کے فائدے کے لیے ملک سے باہر اپنے پر پھیلانا چاہتے تھے۔ اپنی بربادی کے باوجود انھوں نے ہمت نہیں ہاری تھی اور چھوٹا موٹا کام کرنے کی کوشش میں لگے رہے تھے۔

اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود، میرے خیال میں، ہم نے اچھی خاصی کامیابی حاصل کرلی ہے۔ ہمارا مستقبل بہت تابناک ہے، ہمیں پُرامید رہنا چاہیے۔ مگر کچھ کمزوریاں ہیں جن سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ میں نے اکثر کہا ہے کہ ہر چیز میں سیاست بازی، صنعتوں میں، تجارت میں، تقرریوں میں ہر جگہ سفارش اور رسوخ ہی ہمارا مسئلہ ہے۔ یہ منفی عوامل ہیں جنھوں نے ہماری معاشیات کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے، ورنہ ملک تو اچھی طرح سے آگے بڑھ رہا تھا۔ دراصل ہمارا اوّلین مقصد وہی ہونا چاہیے تھا جو ملک کے مفاد میں ہو۔ دوسرا مسئلہ بدعنوانی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ہر طرف بدعنوانی کا راج ہے۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ دوسرے ملکوں میں بھی بدعنوانی ہے مگر اس کو ملک کے مفاد کے تناظر میں ایسی شائستگی سے کیا جاتا ہے کہ یہ ملکی ترقی میں معاون ہوتی ہے۔ مگر ہمارے ملک میں، ہندوستان کی طرح، بدعنوانی نجی زراندوزی کے لیے کی جاتی ہے جس سے امیر اور بھی امیر ہوجاتا ہے، ملک کو کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوتا۔ ہماری سب سے بڑی مشکل یہی ہے۔ اور یہی خرابیوں کی جڑ ہے جس سے ہم آج نبرد آزما ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پاکستان میں بہت کچھ کام کیا ہے مگر قرینے سے نہیں کیا گیا۔ اس کی وضاحت کے لیے میں بینکنگ کے شعبے سے ایک عملی مثال دینا چاہوں گا جس سے میں اچھی طرح سے واقف ہوں۔ قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد قرضوں میں سیاست کی گئی ہے، ملازمتوں میں بھی۔ اگر ایک بینک کا کام سو افراد سے چل جاتا تو ان کو ڈیڑھ سو افراد بھرتی کرنے کے لیے کہا گیا۔ اور ادارے کا سربراہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اتنے افراد کی ضرورت نہیں، مزاحمت نہیں کرسکا۔ میں جنرل یحیٰی خان کے دور کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا جس کا مجھے ذاتی تجربہ ہوا تھا۔ وہ اپنے شناساؤں اور پسندیدہ افراد پر مہربان ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایک بار کراچی آئے تو انھوں نے مجھے ملاقات کے لیے طلب کیا۔ ظاہر ہے کہ میں ملنے گیا۔ وہ گورنر ہاؤس میں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا، "سعید احمد میری ایک دوست ہیں جو ایک ٹیکسٹائل مل لگانا چاہتی ہیں۔ تمھیں ضرور ان کی مدد کرنا چاہیے، میں انھیں تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ وہ مجھ سے ملنے آئیں اور ایسے لباس میں تھیں جو مجھے پسند نہیں آیا، مگر یہ ایک اور ہی بات تھی جس سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے ان کو درخواست دینے کے لیے کاغذات دیے اور ان سے کہا کہ وہ ان کو پُر کر کے جمع کرادیں تاکہ متعلقہ افراد اس منصوبے کی جانچ پڑتال کوسکیں۔ چند دنوں بعد وہ درخواست موصول ہوئی اور پڑتال کے بعد ہمارے کارکن اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ قابلِ عمل تجویز نہیں۔ شاید اس لیے کہ ان دنوں ملک میں بہت زیادہ ٹیکسٹائل ملیں لگ چکی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کی اس کے ضمانت دینے والے افراد میں سے کچھ افراد کی حیثیت اور کردار مشکوک تھے۔ میں نے اصل وجہ نہیں بتائی تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو، اور صرف اتنا کہہ دیا کہ اس وقت ہمارے پاس وسائل کی کمی ہے۔ اور یہ بات صحیح بھی تھی اس لیے کہ ان دنوں ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان فاصلے بڑھ رہے تھے اور مشرقی پاکستان کے حالات قابو سے باہر ہوتے جارہے تھے۔ عالمی بینک اور دوسرے قرض دینے والے اداروں نے اپنے ہاتھ روک لیے تھے اور یہ کہا تھا کہ جب تک حالات دوبارہ بہتر نہیں ہوجاتے وہ مزید قرضے نہیں جاری کرسکیں گے۔

وہ خاتون دو تین بار آئیں اور میں نے ان کو دلاسا دیا کہ ہم لوگ اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ مگر صدر یحییٰ خان کو اس کی خبر ہوگئی۔ ان خاتون نے ان سے کہا ہوگا کہ ان کا منصوبہ آگے بڑھتا نظر نہیں آتا۔ انھوں نے اپنے پرنسپل سیکریٹری سے منصوبے کے بارے میں معلومات کے لیے کہا۔ میں نے ان کو سارا قصہ کہہ سنایا اور اس بات کو دہرایا کہ بدقسمتی سے اس وقت وسائل موجود نہیں ہیں۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ عالمی بینک نے ٹیکسٹائل ملوں کے لیے قرضے جاری کرنے مکمل طور پر بند کردیے ہیں اس لیے کہ ان کے خیال میں ملک میں ضرورت سے زیادہ ٹیکسائل ملیں لگ چکی ہیں۔ چند دنوں بعد پرنسپل سیکریٹری نے مجھے فون کیا اور اپنی سہولت کے مطابق اسلام آباد آنے کے لیے کہا۔ وہ میرے پرانے ساتھی بھی تھے اور اچھے دوست بھی۔ اس لیے انھوں نے مجھ سے کہا، ''سعید احمد مجھے معلوم نہیں کہ تمھارے اور صدر کے درمیان کیا ہوگیا ہے، مگر انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم سے استعفیٰ طلب کروں۔ یہ رہا تمھارا استعفیٰ جس پر تم دستخط کردو'' میں نے جواب میں کہا، آفتاب، ہم دونوں پرانے دوست ہیں اور تمھیں معلوم ہے کہ PICIC تقریباً نجی شعبے کی ملکیت ہے، حکومت کا ادارہ نہیں۔ اگر میں استعفیٰ دینے سے انکار کردوں تو کیا ہوگا؟'' تھوڑی دیر سکوت کے بعد میرے دوست نے کہا، ''اگر تم نے اس بنا پر انکار کیا تو نہ صرف یہ کہ تم بلکہ تمھارے اہلِ خانہ بھی مصیبت میں ہوں گے۔ اس لیے مہربانی کر کے اس کاغذ پر دستخط کردو، اور میں نے چپ چاپ دستخط کردیے۔ اس کے بعد پانچ چھ ماہ میں بے روزگار رہا۔ اس وقت میرے اچھے دوست روشن علی بھیم جی کام آئے اور انھوں نے مجھے ایسٹرن فیڈرل انشورنس میں، ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ جو میں کئی برسوں سے تھا، اضافی طور پر مالی مشیر کی حیثیت سے شامل ہونے کی پیش کش کی۔

اس واقعے کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ میں شکایتاً یہ سب کچھ نہیں کہہ رہا ہوں اس لیے کہ مجھے اس قسم کی مشکلات کبھی درپیش نہیں رہیں۔ میں صرف آپ کے اس سوال کے جواب میں کہ '' ہماری قوم کے پچھلے پچاس برس کیسے گزرے؟'' یہ باتیں کررہا ہوں۔ اس کے باوجود کہ ہمیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے، میں اب بھی سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی کارکردگی بُری نہیں رہی، بلاشبہ ہم اس سے بہتر ہو سکتے تھے مگر اس قسم کے واقعات کی بنا پر، جو میں نے ابھی بیان کیے ہیں، ہم زیادہ کچھ نہیں کرسکے ہیں۔''

نئی صدی کی آمد سے چند دن پہلے، جب میں نے یہ سطور لکھنی شروع کی تھیں، میں اپنے دوست سے ان کے دفتر میں ملا تھا۔ وہ اب بھی ایک نسبتاً چھوٹی بیمہ کمپنی کے چیئرمین ہیں اور اسی وقار اور نظم وضبط کے جذبے کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے ہیں جس طرح وہ زندگی بھر کرتے رہے ہیں۔ کوئی بھی ذمے داری ہو، چھوٹی ہو یا بڑی، باعزت ہو یا مشقت والی، وہ ویسی ہی سنجیدگی سے نبھاتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں ایمان داری سے کام انجام دیں۔ ان کے نزدیک ان کی ذمے داریاں، عوام اور سماج کے مفادات ہمیشہ ان کی پہلی ترجیحات رہی ہیں۔ ایسے دوست ملنا انسان کی خوش قسمتی ہوتی ہے جن پر مکمل اعتبار کیا جاسکے، جو اعتبار کے قلعے کے مترادف ہوتے ہیں۔

جہانگیر صدیقی

مالیات کے جادوگر

جب مارچ ۱۹۹۸ء میں جہانگیر صدیقی سے ان کے خوب صورتی اور پیشہ ورانہ انداز میں سجائے ہوئے دفتر میں ملاقات ہوئی جو کراچی اسٹاک ایکس چینج سے متصل ایک عمارت کی چودھویں منزل پر واقع تھا جہاں میں اُن سے اُن کے ای ایف یو سے روابط کے بارے میں بات چیت کرنے گیا تھا تو ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ دراصل ہم ایک دوسرے سے کافی دنوں سے واقف تھے، صرف اُسی وقت سے نہیں جب سے میں نے کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شمولیت اختیار کی تھی، جس کے وہ بھی رُکن تھے۔ مگر یہ پہلا موقع تھا جب میں ان کے دفتر میں ان سے ملاقات کے لیے پہنچا تھا۔ انھوں نے مجھے اپنا دفتر دکھایا جو واقعتاً جدید رکھ رکھاؤ اور اعلیٰ درجے کے ساز و سامان سے قابلِ فخر طریقے پر مزیّن تھا، ان دفاتر سے کہیں مختلف جن کا میں ای ایف یو کے زمانے سے عادی تھا۔ دفتر کی کشادہ کھڑکیاں ہمیں وہ نظارے دکھا رہی تھیں جن میں بے شمار مکانات، سڑکیں، گودام، سارس جیسی سامان اٹھانے والی مشینیں، بندرگاہ اور جہاز شامل تھے جس کو کراچی کہتے ہیں، پاکستان کا سب سے بڑا شہر، جس میں ڈیڑھ کروڑ افراد بستے ہیں، جو دنیا کا ایک عظیم شہر ہے، اپنے تمام تقریباً ناقابلِ حل بڑے بڑے مسائل کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے تھا۔

انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کافی پسند کروں گا یا چائے، اور پھر خود اُٹھ کر لینے چلے گئے، اس لیے اس کہ وقت ان کی سیکریٹری مصروف تھی۔ ان کے اطراف ایک پیشہ ورانہ خصوصیت، خود اعتمادی اور بے فکری کا ہالہ تھا جس نے مجھے حیران کر دیا۔ یہ سب کچھ بالکل فطری لگ رہا تھا، ان میں شمّہ برابر بھی کسی قسم کا تکبر نہیں تھا جو عموماً ایسے لوگوں کی شخصیت کو گھیر لیتا ہے جو بلندیوں پر پہنچنے کے صحیح معنوں میں دعوے کرتے ہیں۔ میں مالیاتی امریکی تاجروں سے ان کے روابط سے بھی واقف تھا اور ان لوگوں سے ایسے ہی بے فکرے انداز میں ان کی معاملت کی مہارت سے بھی۔ مگر میں اس روایت کے پاسدار، بے حد محتاط سندھ نژاد کاروباری سے بھی واقف تھا جس کے بے عیب و بے مثال آداب اور جس کی ممتاز شائستگی اس کو ماضی کے کسی شاہی درباری کے گھرانے میں ایک اعلیٰ مقام کا حق دار بنا دیتے۔

ہم نے ملک کی معاشیاتی حالت پر باتیں کیں، ماضی کے جھروکوں پر بھی نظر کی اور سیاست دانوں کو اس ملک کے اس بدعنوان جنگل کا بھی ذمے دار ٹھہرایا، جو اس کی تیز رفتار ترقی کی راہوں میں حائل کر دیا گیا تھا۔ اس کی تصورات سے عاری بے عمل اور کٹر افسر شاہی اور اس کے کم عقل اور بے لچک رویوں کا بھی جائزہ لیا، ملک کے بہت سے نوجوان صنعتکاروں کے بارے میں بھی باتیں کیں جو صرف اپنے سرمائے پر تکیہ کرتے ہیں، اپنے اثاثے اپنے قبضے میں رکھتے ہوئے بھی ترقیاتی معجزے کے منتظر رہتے ہیں، اپنے آبا و اجداد سے بالکل مختلف جنھوں نے پاکستان کی معیشت کی ایسی بنیاد رکھی تھی جو صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے میں پھولی پھلی اور بعد میں آزادی پانے والے ملکوں کے ایشین ٹائیگر بننے میں نشانِ راہ بنی تھی۔

جس دم وہ پیالی میں چائے انڈیل رہے تھے میں سوچ رہا تھا کہ یہ ہے وہ شخص جس پر ایک ابھرتا ہوا ملک فخر کر سکتا ہے۔ اگر اس جیسے اور بھی لوگ ہوتے تو آج ہمیں اور اس کو ماضی کی بے عملیوں اور لمحۂ موجود کے ہاتھوں سے نکلتے ہوئے امکانات پر اشکباری نہ کرنی پڑتی۔

جہانگیر صدیقی ۲۷ رجولائی ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد سندھ میں پیدا ہوئے، ایسی حقیقی پاکستانی شخصیت جو کاروبار ہو یا اور کوئی میدان، ہر جگہ اپنے نقوش قدم چھوڑتی نظر آتی ہے۔ اسی زمین پر جس نے ماضی کے دو ممتاز مگر متنازع فیہ وزرائے اعظم کو جنم دیا تھا۔

جہانگیر صدیقی کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی اور سندھ یونی ورسٹی سے اُنھوں نے کامرس میں گریجویشن کیا۔ اس کے بعد وہ چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کے لیے کراچی چلے گئے۔

میرے سوال پر کہ ایک درمیانے درجے کے خاندان کے فرد ہوتے ہوئے آپ کاروبار کی طرف کیوں آئے، جہانگیر صدیقی نے کہا، ''میں ہمیشہ سے حصص کی دلالی میں دل چسپی رکھتا تھا۔ ہمارے دفتر کے سامنے جو عمارت آپ دیکھ رہے ہیں، جسے حبیب ایکس چینج بلڈنگ کہا جاتا ہے، اس میں جب میں پہلی بار ۱۹۶۷ء میں داخل ہوا تھا اس وقت یہ سیکورٹی سیف ڈپازٹ چیمبر کے نام سے موسوم تھی۔ مجھے وہ تاریخ ابھی تک یاد ہے، وہ بائیس مارچ کا دن تھا۔ میں چارٹرڈ اکاؤنٹینسی کے لیے آرٹیکل کلرک کی حیثیت سے ایک آڈٹ کرنے والے ادارے میں بھرتی ہوگیا تھا جس کا دفتر اسی عمارت میں واقع تھا۔ میں نے اپنے طالب علمی کے دنوں میں آدمجی شوگر ملز اور میر پور خاص شوگر ملز کے حصص خریدنے کی درخواستیں دی تھیں۔ مجھے تو اس وقت یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ درخواستیں دی کس طرح جاتی ہیں اور حصص کی فروخت کیسے ہوتی ہے۔ جب میں نے کراچی میں کام شروع کیا تو اپنے ایک دوست سے کسی ایسے شخص کے بارے میں جاننا چاہا جو میرے حصص کو خریدنا چاہے گا۔ وہ مجھے اپنے بھائی کے پاس لے گیا جو حصص کے کاروبار میں دلالی کرتا تھا اور اس نے مجھے دو عدد ٹرانسفر ڈیڈ کے فارم دیے۔ میں بہت خوش اور متاثر ہوا اور میں نے سوال کیا کہ مجھے اس کام کے لیے کتنی رقم ادا کرنی پڑے گی۔ وہ یہ سن کر ہنسا اور اس نے کہا کہ اس کام کی کوئی اجرت نہیں ہوگی بلکہ اس نے تو یہ بھی کہا کہ اس قسم کے کام میں میری مدد کرنے میں خوشی محسوس کر رہا ہے۔ آج میں اپنے گاہکوں کو اس قسم کے کروڑوں فارم دیتا ہوں مگر اس دن مجھے واقعی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ پر بہت مہربانی کر رہا تھا۔ کسی اسٹاک ایکس چینج میں جانے کا یہ پہلا تجربہ تھا جس نے مجھ میں ایسا جوش پیدا کر دیا کہ کھانے کے وقفے کے دوران میں ہر روز وہاں جانے لگا۔ میرا کھانے کا وقفہ ساڑھے بارہ بجے سے دو بجے تک ہوتا تھا جب کہ ایکس چینج میں کاروبار ساڑھے دس بجے سے دو بجے تک ہوتا تھا۔ میں وہاں صرف گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اس طرح میری کچھ دلالوں سے دوستی ہوگئی۔ ان میں سے ایک نے مجھے کچھ حصص خریدنے کا مشورہ دیا۔ اس وقت میرے پاس بہت کم رقم تھی مگر میں نے وہ حصص خرید لیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری پہلی خریداری حبیب بینک کے حصص کی تھی۔ میں نے وہ حصص سولہ روپے کے حساب سے خریدے تھے۔ کچھ بائیس روپے میں، کچھ تیئیس اور کچھ ستائیس روپے میں فروخت کیے تھے۔ میں نے ۱۹۶۷ء میں حبیب انشورنس کے حصص اٹھائیس روپے میں خریدے اور اسّی فی صد منافع لیتے ہوئے ان کو پینتالیس اور پچاس روپے میں فروخت کیا۔ اس طرح میں نے کافی دولت کمائی۔ میں صحیح طور پر بیان کروں، اس لیے کہ اس کی پوری جزئیات مجھے از بر ہیں، کہ ۱۹۶۷ء میں مجھے ۱۵۰۰۰ روپے کا فائدہ ہوا تھا، اور یہ بھی صرف پانچ مہینوں میں۔ یہ ہر اعتبار سے بہت بڑی رقم تھی، اس حقیقت کے پیش نظر کہ ان دنوں کراچی میں بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کے ایک فائنانس ڈائریکٹر کی تنخواہ زیادہ سے زیادہ ۲۵۰۰ رہوا کرتی تھی۔

جیسا کہ آپ کو اندازہ ہوگا، میں بے انتہا پُر جوش تھا اور میں نے اپنی پہلی گاڑی خریدی لی تھی۔ جرمنی کی بنی ہوئی ایک Opel Rekord 1900 L، بڑی سی گاڑی۔ اس سے کہیں کم قیمت میں کوئی جاپانی گاڑی بھی خریدی جا سکتی تھی مگر میں سب سے اچھی گاڑی چاہتا تھا اور دنیا بھر میں جرمن گاڑی سب سے اچھی سمجھی جاتی تھی۔ اس گاڑی پر میں نے بتیس ہزار روپے خرچ کیے۔ اب میرا زیادہ وقت

اسٹاک ایکس چینج میں گزرنے لگا تھا۔ اس کے باوجود میں اپنی تعلیم سے بے خبر نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں ایک اچھا طالب علم تھا اور میں نے ۱۹۶۹ء میں CA کر لیا تھا۔

اس وقت تک میں نے اپنی تمام پونجی اپنے دوست حصص کے دلال کے حوالے کر رکھی تھی جو اس وقت تک ۲۴۵۰۰ روپے تک پہنچ چکی تھی۔ میں یہ سب اتنی تفصیل سے بیان کر رہا ہوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ دنیا بھر کے بازارِ حصص میں ہر روز کیا ہوتا ہے، کاروبار کی اونچ نیچ جو ایک ہی سمت میں نہیں چلتی۔ مگر میں بے انتہا خوش بھی تھا، میری نقد رقم میرے دوست دلال کے پاس، میری Opel Rekord میرے گھر کے سامنے اور دس ہزار روپے نقد میری خواب گاہ کی میز کی دراز میں۔

ایک دن صبح کے وقت میرے دوست دلال نے ٹیلی فون کیا اور فوراً ملاقات کے لیے مجھے بلایا۔ میں افتاں و خیزاں اس کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک کرسی میں دھنسا ہوا، بے قرار، بدحال، زرد اور سُتا ہوا چہرہ لیے ہوئے پریشان حال بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اگلے دن شاید وہ خود کو دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دے، اس کے پاس کوئی اور چارۂ کار نہیں۔ اس لیے کہ اسے بہت سی نقد ادائیگیاں کرنی تھیں مگر اس کے پاس رقم نہیں تھی۔ وہ بار بار کہتا رہا کہ وہ کتنی سنجیدگی سے کم از کم میری، یعنی اپنے دوست کی رقم بچانے کی کوشش کر رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ بہت جلد ہی خودکشی کر لے گا اس لیے کہ اس پریشانی سے نکلنے کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ میں نے اس کی دل جوئی کی بہت کوشش کی اور اسے سمجھایا کہ اپنی جان لینے سے کوئی فائدہ نہیں کہ اس طرح وہ کھوئی ہوئی دولت واپس حاصل نہیں کر سکے گا۔ یہ سب کہتے ہوئے بھی میں اس خوش فہمی میں تھا کہ میری رقم بچ جائے گی اور ہمت کر کے میں اس سے پوچھ بیٹھا کہ اس نے میری رقم کہاں لگائی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی تھا کہ سب کچھ ڈوب چکا ہے۔ میں اس وقت اس کو کسی دوسری دنیا کے آدمی کے مانند لگا ہوں گا اس لیے کہ میرے دلاسے نے اس کے حواس بحال کیے اور اس نے مجھے دل جوئی کے لیے بتایا کہ اس نے کم از کم میری کچھ رقم بچانے کے لیے کچھ انتظامات کر بھی لیے ہیں۔ اس نے بار بار مجھے یقین دلایا کہ اپنی پوری کوشش کرے گا کہ جتنی جلد ہو سکے وہ مجھے میری پوری رقم واپس دلا دے۔

اس کے حالات کچھ بہتر ہوئے مگر چند دنوں بعد ہی اس پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ میں نے اس کو اسپتال داخل کرا دیا۔ کسی حد تک اس کی حالت سنبھل گئی تھی مگر وہ اس قابل نہیں ہو سکا کہ اپنا کاروبار صحیح طور پر چلا سکے۔ وہ دل کا دائمی مریض بن چکا تھا۔ اس بوجھ کے باعث جو اس کے قرض خواہوں کے ہر روز دروازہ کھٹکھٹانے سے پڑ رہا تھا، اس کی حالت بہتر ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پھر ہم دونوں نے طے کیا کہ کچھ حصص، کرنافلی جوٹ، ریان اور پیپر کے، پاکستان نیشنل شپنگ کے اور کچھ دوسرے مغربی اور مشرقی پاکستان کے، جو اس کے پاس بچ رہے، میں خرید لوں گا۔ اور اس کے پانچ دفتروں میں سے دو عدد میں نے خرید لیے۔ اس طرح اسے اپنے قرض خواہوں کے تقاضے سے بچنے میں مدد فراہم کر دی اور پھر مجھے احساس ہوا کہ اچانک اور حادثاتی طور پر، میں خود ہی ایک اسٹاک بروکر بن گیا ہوں۔ میرے دوست نے میرے ساتھ کام جاری رکھا اور اس طرح وہ اپنے خاندان کی کفالت کرنے لگا تھا۔

ماضی میں جھانک کر دیکھنے اور آپ سے بات کرنے کے دوران مجھے سب کچھ حیرت انگیز اور غیر حقیقی لگ رہا ہے۔ مگر یہ سب کچھ میرے لیے اتنا اچھا ہوا جیسا کہ شاید ہی کبھی ہو سکتا۔ اگر میرے ساتھ یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو میں شاید کبھی اسٹاک بروکر نہیں بن سکتا۔ میں آج بھی کسی اور کے دفتر میں کام کر رہا ہوتا، شاید فائنانس ڈائریکٹر یا کسی ادارے کی چیف ایگزیکٹو کی حیثیت میں۔ واقعاتی کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ مگر سب سے بدقسمتی کی بات ابھی ہونی باقی تھی۔ اس سب کے فوراً بعد ہی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ یہ دسمبر ۱۹۷۰ء کا واقعہ ہے۔ بازار بند ہو گیا تھا، ملک میں ہنگامی حالت کا اعلان ہو چکا تھا اور ہم جنگ ہار گئے تھے۔ اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں میری بیشتر پونجی مشرقی پاکستان کے اداروں کے حصص میں لگی ہوئی تھی جو سب ختم ہو چکے تھے اور اور میرا نقصان ہو گیا تھا۔ دس مہینے کے کام کے بعد میں

قلاش ہو گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میرا سارا سرمایہ ڈوب چکا تھا، مجھ پر ایک قرض بھی چڑھا ہوا تھا جو میری خاندانی جائیداد کی ضمانت پر لیا گیا تھا جسے جائیداد فروخت کر کے ادا کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں مجھے نئے سرے سے کاروبار کی ابتدا کرنی تھی مگر بغیر کسی سرمائے کے۔ میرے پاس میری خوب صورت کار Opel Rekord ابھی موجود تھی مگر میں اب اس کو اس لیے استعمال نہیں کر سکتا تھا کہ ایندھن کے لیے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ مجھے 50cc ایک ہنڈا موٹر سائیکل پر اکتفا کرنا پڑا جسے میں اور میرے دفتر کا ایک ملازم دونوں استعمال کرتے تھے۔ موٹر سائیکل کو میں شام کو اپنے گھر لے جاتا اور صبح دفتر لے آتا اور دن بھر اس کو دفتری کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا۔ ان دنوں پٹرول چار روپے گیلن ہوتا تھا۔ مگر کاروبار اور پانچ افراد کی تنخواہ بھی دینی ہوتی تھی، بجلی کے اخراجات، اور دفتر کا کرایہ۔ جزوی طور پر بازار بند رہتا تھا اور بے پناہ سرمایہ ڈوب گیا تھا۔

یہ تھا تناظر جس میں مجھے فیصلے کرنے تھے۔ میرا فیصلہ سب کچھ پھر سے شروع کرنے کا تھا، یہ سمجھتے ہوئے کہ جہاں تک میری پیشہ وارانہ زندگی کا تعلق تھا یہی ایک راستہ تھا۔ میں نے اپنے آپ سے یہ عہد کر لیا تھا کہ میں صحیح معنوں میں سیدھے راستے پر چلوں گا۔ یہ کچھ آسان نہیں تھا اس لیے کہ یہ راستہ میرے خاندان کی خواہشات کے مخالف سمت کو جاتا تھا۔ ان سب کا خیال تھا کہ مجھے سرکاری ملازمت اختیار کر لینی چاہیے یا پھر کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہو جانا چاہیے۔ مگر میری زندگی کے ابتدائی پیشہ ورانہ دنوں کی اتھل پتھل نے مجھے سچ مچ کچھ کر گزرنے پر تیار کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہ جنگ خود لڑنی ہوگی، بلند حوصلگی سے اپنی زندگی کے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لینا ہوگا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک حادثہ تھا جس نے مجھے موجودہ مشکل حالات میں پھینک دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہہ دیا تھا کہ اب مجھے خود فیصلہ کرنا تھا کہ میں کس راستے پر گامزن ہوں۔"

مجھے ان کی باتوں میں مزہ آ رہا تھا۔ وہ بہت جوش میں دکھائی دے رہے تھے اور ان کے ہاتھوں کی جنبش سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا ذہن انھیں کس طرف لے جانا چاہتا ہے۔ ان کی گرمجوشی پُر خلوص تھی، زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ انسان اپنی زندگی میں جو کچھ کر رہا ہے اس سے پورا لطف بھی لے رہا ہے۔ دیکھنے والے کو پہلی نظر میں یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ آدمی بے چین شخصیت کا مالک ہے جو ہمہ وقت مصروف رہنا چاہتا ہے۔ مگر اُس کو قریب سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ جو بھی کام کرتا ہے اس سے لطف بھی اُٹھاتا ہے، اس کی زندگی خوشیوں سے بھرپور ہے، اور وہ فطری طور پر لطف لینے والا ہے۔ ایک آدمی جو نہ صرف ہر قسم کے مالیاتی معاملات میں اپنی طراری اور لیاقت کے باعث احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔، وہ ملنسار بھی ہے، پرانے دوستوں کا دیر تک ساتھ نبھاتا ہے اور نئے دوست بنانے میں بھی ماہر ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں ان کو گالف کھیلنے کی طرف راغب کروں اس لیے کہ، میرا تجربہ کہتا ہے کہ ان جیسے لوگ اپنے swing، جسم کی لچک اور طاقتور بازوؤں کی وجہ سے گالف کے بہت اچھے کھلاڑی بن سکتے ہیں جو اس بات میں وقت ضائع نہیں کرتے کہ کب hook یا slice کیا جائے۔ میں نے یہ نکتہ اس لیے نہیں اُٹھایا تھا کہ مجھے یقین تھا کہ میرا مشورہ قابلِ قبول نہیں ہوگا اس لیے کہ ابھی کچھ عرصے تک ان کے پاس اس کھیل کے لیے وقت نہیں ہوگا۔

میں روشن علی بھیم جی سے دوستی کے باعث شروع دنوں ہی سے جہانگیر صدیقی کا پروانہ ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس نوجوان کے طریقۂ کار کے معترف تھے جس کے ذریعے یہ نرم خو مگر قوی انسان ای ایف یو کا ڈائریکٹر بننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک آدمی جو اپنی عمر کے صرف چوتھے عشرے میں تھا جب اس کو ای ایف یو کے بورڈ میں ڈائریکٹر بننے کی پیش کش گئی تھی۔ آج کے مقابلے میں اس وقت تک ان کو اسٹاک ایکس چینج کے حلقے سے باہر بہت کم لوگ جانتے تھے۔ ان سے ملاقات کے لیے جانے سے قبل میں نے کمپنی کے کاغذات سے اخذ کر لیا تھا کہ ان کو کمپنی کا ڈائریکٹر بنے بیس سال ہو چکے ہیں۔ میں نے ان سے ملتے ہی سب سے پہلے اس بات پر مبارکباد دی۔ کمپنی کو اس بات پر فخر ہے کہ اس کے بورڈ پر ملک کے بڑے بڑے زیرک اور توانا ذہن والے لوگ ماضی میں ڈائریکٹر رہ چکے تھے۔

جہانگیر صدیقی کی اپنی زبانی اس کمپنی میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے ان کی بے مثال کامیابی کا حال پڑھیے۔

جس وقت ہم نے مشرقی پاکستان کھویا تھا، میرا اسٹاک بروکر دوست، کراچی کے اسٹاک ایکسچینج کا ایک قابلِ احترام بروکر تھا، اپنا سب کچھ گنوا دینے کے بعد میرے ساتھ کافی دنوں تک کام کرتا رہا تھا۔ اس نے اعلیٰ درجے کی شہرت رکھنے والی کمپنیوں، ICP اور NIT سے میرا تعارف کرا دیا تھا۔ وہ نیشنل شپنگ کارپوریشن کے لیے بھی بروکر کے طور پر کام کر چکا تھا اور اس ہی کی مدد سے مجھے ان کا اکاؤنٹ بھی مل گیا تھا۔ وہ لوگ Bonus Vouchers کی خرید و فروخت کرتے رہتے تھے، جس کے بارے میں آپ سب جانتے ہوں گے کہ اُن دنوں یہ زرِ مبادلہ کے لین دین میں کام آتے تھے۔ جرمنی کے Bundesbank کے ایک سابق صدر Mr Vocke اس کے موجد تھے۔ یہ ایوب خان کی حکومت کا زمانہ تھا، جب شعیب صاحب وزیرِ خزانہ تھے۔ میں National Shipping Corporation کے پینل پر تھا جو پاکستان کی سرکاری جہازرانی کی ذمے دار تھی۔ جب ذوالفقار علی بھٹو نے زمامِ حکومت سنبھالی اور NSC کی انتظامیہ میں تبدیلیاں کیں تو مجھے بتایا گیا کہ کمپنی کے پینل سے میرا نام خارج کر دیا گیا ہے اس لیے کہ پینل پر کے سارے بروکروں پر یہ الزام تھا کہ ہم نے کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر سے، جنھیں جیل بھیج دیا گیا تھا، ساز باز کر کے بدعنوانی میں ان کی امداد کی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ برطرف کی جانے والی انتظامیہ کے ساتھ میں نے کام کیا تھا مگر میں نے، جو اس وقت صرف چوبیس برس کا نوجوان تھا، ہرگز کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ تو ان لوگوں نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟

نوجوان اور بھولا بھالا انسان، جیسا کہ میں اس وقت تھا، غصے میں تھا اور میں نے کمپنی کے نئے چیئرمین سے ملاقات کی کوشش کی مگر مجھ سے کہہ دیا گیا کہ ان کے پاس وقت نہیں۔ میں نے فائنانس ڈائریکٹر سے ملنا چاہا، دن بھر انتظار کیا مگر وہ اس دن تشریف ہی نہیں لائے۔ ان کے پی اے نے چیف اکاؤنٹنٹ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ میں نے دوسرے روز آدھے دن تک ان کا بھی انتظار کیا مگر ان سے بھی ملاقات نہیں ہوسکی۔ اور مجھے ان کے بھی نائب سے ملنے کا مشورہ دیا گیا جس پر میں نے عمل کیا۔ انھیں صاحب کی مدد سے میں کمپنی کے پینل پر ڈالا گیا تھا، مگر وہ مجھے صرف اتنا ہی بتا سکتے کہ حکام کے مشورے پر انتظامیہ نے تمام پرانے بروکروں کو معطل کر دیا ہے اس لیے کہ ان سب کو 'بلیک لسٹ' کر دیا گیا ہے۔ میں پُرعزم تھا کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، اپنے کمیشن میں سے کسی کو ایک پیسا بھی نہیں دیا ہے اور اس بات کا میں ثبوت پیش کر سکتا ہوں۔ بس میں یہ چاہتا تھا کسی صاحبِ اختیار سے میری ملاقات ہو جائے تاکہ میں اس بات کو ثابت کر سکوں۔

مگر ایسا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا جس کے ذریعے میں کسی ایسے شخص سے ملاقات کر سکوں جو اس فیصلے کو تبدیل کر سکے۔ تو پھر میں کیا کر سکتا تھا؟ اگر کوئی مجھ سے ملاقات نہیں کرنا چاہتا تو صرف یہی ایک راستہ ہے کہ میں اس کمپنی کا ڈائریکٹر بن جاؤں تب ان کو بتا سکوں کہ کیا صحیح اور کیا غلط تھا۔ اور میں سچ مچ یہی چاہتا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۲ء میں مجھے پتا چلا کہ NSC کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے لیے انتخاب ہونے والا ہے۔ اس پر دو نشستیں نجی شعبے کے لیے مختص تھیں اور انھی دونوں کے لیے انتخاب ہونے والا تھا۔ تو پھر ہم نے یہ کیا کہ بمشکل تمام NSC کے حصص یافتگان کی مکمل فہرست حاصل کی۔ پھر میں اور میرے ایک دوست نے اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر جہاں تک ممکن ہوسکا حصص یافتگان سے ملاقات کی اور ان سب کو بتایا کہ آپ کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے اور آپ کو اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے میں ایک ایمان دار آدمی ہوں اور اگر آپ مجھے ووٹ دیں گے تو میں آپ کے حقوق کی حفاظت کروں گا۔ اگر میں آپ کو پسند نہیں تو کسی اور کو ووٹ دے کر کامیاب کرائیے، اپنا ووٹ ضائع نہ ہونے دیجیے، حکومت کو یہ فیصلہ کرنے کا حق نہ دیں کہ وہ نجی سیٹ پر کسی کو مقرر کرے۔ ساتھ ہی میں نے اپنے دوست کے لیے بھی ووٹ مانگے۔ اور سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم دونوں کامیاب ہوئے۔ ہم کو ۶۳۰۰۰ ووٹ ملے تھے جو ہمیں ڈائریکٹر بنانے کے لیے کافی تھے۔ اس دن سے آج تک میں کارپوریشن کا ڈائریکٹر ہوں۔ بے شک میں ان سے کوئی کاروبار نہیں کرتا اس لیے کہ اس حیثیت میں میرے لیے یہ مناسب نہیں مگر کم از کم عوام کو میں نے ثابت کر دکھایا کہ اگر آپ کو اپنے اوپر اعتماد ہو تو آپ افسر

شاہی اور سیاسی جوڑ توڑ کو شکست دے سکتے ہیں۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہیں سے میری کارپوریٹ یا کاروباری سیاست کی ابتدا ہوئی۔ یہ میری پہلی کسی غیر کمپنی کی ڈائریکٹرشپ تھی جس کی بنا پر میں اسٹاک ایکس چینج میں بھی مشہور ہوگیا۔ وہاں کے کچھ پرانے ارکان نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کراچی اسٹاک ایکس چینج کی ڈائریکٹری کا انتخاب بھی لڑوں۔ میں اس بارے میں تذبذب کا شکار تھا اس لیے کہ میں نسبتاً کم عمر تھا اور شاید اس وجہ سے ارکان مجھے ووٹ نہ دیں۔ مگر ان سب لوگوں نے یہ کہہ کر میرے شبہات کو دور کر دیا کہ چوں کہ یہ ان کی تجویز ہے اس لیے وہ اپنی پوری کوشش کریں گے کہ میں کامیاب ہو جاؤں۔ اور یہی ہوا۔ میں نے تین بزرگ ارکان کو شکست دے کر ایک طوفان برپا کردیا۔''

اب بھی جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں تو میرے تن بدن میں ایک جوش سا پیدا ہو رہا ہے۔ میں نے کتنی بار اپنے پاکستانی دوستوں سے یہ بات کہی ہے کہ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر لوگ ذرا زیادہ سیاسی ہمت کا مظاہرہ کریں اور ان کے دلوں میں واقعی جمہوریت کے لیے لگن ہو تو اس قسم کے اعمال دُہرائے جا سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کے اذہان صرف خرید کر ہی نہیں جیت سکتے، جیسا کہ ان ملکوں میں ہوتا ہے۔ آپ انھیں اس بات پر قائل کر کے کہ آپ ایمان دار ہیں اور کچھ کر سکتے ہیں، ان کے دل بھی جیت سکتے ہیں۔ قائدِ اعظم کی کامیابی کا یہی راز تھا۔ قائد جیسے کچھ اور لوگ بھی تھے جنھوں نے ملک کی اور معاشرے کی خدمت کے نشانِ راہ چھوڑے ہیں۔''

میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ میں جہانگیر صدیقی کو قریب سے جانتا ہوں۔ اسی طرح جیسے لوگ دعوتوں پر ملاقاتیں کرتے رہتے ہیں جن میں کبھی ان کی بیویاں بھی شریک ہوتی ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، جو ایک کامیاب بروکر کی حیثیت میں، اس وقت ایک کامیاب مالیاتی جادوگر کی مثال ہو چکے تھے جب انھوں نے بڑے مشکل حالات میں ای ایف یو کے حصص کی انڈر رائٹنگ کی تھی۔ ای ایف یو میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے میری شمولیت کے کچھ عرصے بعد ایک بار اچانک وہ ہم لوگوں سے ملنے میو نخ آئے: اپنی مسحور کن اور مہم جو بیگم کے ساتھ میرے گھر بھی تشریف لائے۔ اس وقت ہمارے اور ان کے درمیان گفتگو نجی سطح تک اُتر آئی تھی مگر ہم اتنے قریب کبھی نہیں ہوئے تھے جتنے کہ اس مخصوص ملاقات کے دوران ہو گئے تھے جس کے دوران جہاں تک ممکن ہوا نجی زندگی اور ان کی سوچ کے انداز کے تجزیے کی کوشش میں گہرائیوں میں اُترتے چلے گئے۔ ہمارے تعلیمی اور تہذیبی پس منظر ہمیں ذاتی سوالات کی اجازت نہیں دیتے مگر جب میں نے اپنی ملاقات کی روداد پڑھی تو اچانک احساس ہوا کہ ایسی ملاقاتوں کے ذریعے جب ہمارے درمیان جھجک کے پردے اور احترام کا غازہ حائل نہیں ہوتا، ہم ایک دوسرے کے بارے میں کتنا جان جاتے ہیں۔

بغیر کسی سیاسی پس منظر یا وابستگی کے باوجود جہانگیر صدیقی خود کو' کارپوریٹ اور کاروباری سیاست داں' کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ایسے پیشہ ور کاروباری ہیں جو دور رس فیصلے کرنے سے قبل اس کے ممکنہ سیاسی امکانات اور اثرات کے بارے میں اچھی طرح سوچتے ہیں۔

مجھے یہ طریقۂ کار پسند ہے اور مجھے اس بات پر خوشی ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں میں، جو ان کے مشوروں اور نظریات کی قدر کرتے ہیں، روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے دنوں جب نواز شریف کی حکومت برطرف ہوگئی اور افواجِ پاکستان نے ایک بار پھر ملک کا نظم و نسق سنبھالا تھا، جہانگیر صدیقی کو ایک اہم اور سینئر رُکن کی حیثیت سے اکانومک ایڈوائزری کونسل کا رکن مقرر کر دیا گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ملک کا کرتا دھرتا کوئی بھی ہو، کوئی بھی پارٹی اقتدار میں ہو، جہانگیر صدیقی جیسے افراد کی آوازوں پر سنجیدگی سے کان دھرے جاتے ہیں۔ اور اسی بنا پر میرے نزدیک ای ایف یو کو اس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ اسے ان جیسے لوگوں کی رفاقت حاصل ہے، خود صدیقی صاحب کے الفاظ میں، جس کا مفاد ان کے دل سے سب سے زیادہ قریب ہے:

''جب ۱۹۷۲ء میں زندگی کے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا، مسٹر بھیم جی ملک چھوڑ کر انگلستان چلے گئے۔ وہ

پاکستان میں مستقل قیام نہیں کرتے تھے مگر ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ اسی دوران ای ایف یو کے کارپوریٹ ڈھانچے میں ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں کہ کمپنی کے حصص کا ایک بڑا حصہ بازار میں فروخت کے لیے پیش ہوا۔ جہاں تک میری یادداشت ساتھ دے رہی ہے قابلِ فروخت حصص کی تعداد کمپنی کے کُل حصص کے آٹھ فی صد کے برابر تھی۔ ایک بروکر مجھ سے ملنے آیا اور اس نے مجھ سے معلوم کرنا چاہا کہ میں ان حصص کو خریدنے میں دل چسپی لوں گا یا نہیں؟ میں نے اپنے ایک گاہک، خیراتی ٹرسٹ کے متولّی کو ٹیلی فون کیا اور ان سے ان حصص کے حصول کی بابت بات چیت کی۔ ان کی اطلاع کے لیے میں نے ای ایف یو کے بارے میں ایک مختصر سا تجزیہ تحریر کیا اور اس کے فوراً بعد یہ طے کر لیا گیا کہ ہم یہ حصص خرید لیں گے۔ دوسرے دن اس بروکر کا پھر ٹیلی فون آیا اور اس نے بتایا کہ دو تین فی صد حصص پھر فروخت کے لیے بازار میں آئے ہیں اور پوچھا کہ میرے گاہک کیا ان کو بھی، کچھ کم قیمت پر، خریدنا چاہیں گے؟ ہم نے خریدنے پر ہامی بھر لی اور اس وقت تک یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ حصص ARAG خاندان، یعنی 'حبیب' کے تھے۔ ایک دو دن کے بعد اس بروکر کا پھر فون آیا اور اس نے پھر کچھ حصص فروخت کے لیے پیش کیے مگر اس بار اس نے کہہ دیا کہ اس کے بعد اس پارٹی کے اور کوئی حصص فروخت نہیں ہوں گے۔ اس پر جب میں نے اپنے گاہک سے رابطہ کیا تو وہ سخت ناراض ہوئے اور کہا، ''بابا، کیا پاکستان میں صرف ایک ہم ہی بیوقوف رہ گئے جو ان حصص کو خرید رہے ہیں؟'' مگر بالآخر یہ حصص بھی ہمارے گاہک نے خرید لیے اور اس طرح وہ خیراتی ادارہ ای ایف یو کا خاصا بڑا حصے دار بن گیا۔ میں اس ادارے کا اس وقت سے آج تک بروکر ہوں۔ اس کے بعد جب ای ایف یو کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے انتخاب کا وقت آیا تو میں ان دنوں کے چیف اکاؤنٹنٹ واصف علی سے ملنے گیا۔ وہ بورڈ کے سیکریٹری بھی تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں بورڈ پر آنے کا خواہش مند ہوں اور ان کا کیا خیال ہے کہ اگر میں انتخاب کے لیے خود کو پیش کروں تو میرے لیے کیا امکانات ہوں گے؟ اس بات پر وہ بہت جز بز دکھائی دیے اور انھوں نے کہا کہ ای ایف یو بہت مضبوط ہاتھوں میں ہے اور یہ بھی کہ میرے انتخاب کے امکانات صفر کے برابر ہیں۔ بہ ظاہر اس وقت تک ان کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ خیراتی ادارے کے حصص میرے قبضے میں تھے۔ پھر میں نے وہی کچھ کیا جو ہم نے NSC اور کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن کے بارے میں کامیابی سے کیا تھا، یعنی ہم نے، جہاں تک ممکن ہو سکا حصے داروں سے 'نیابتی حقوق' (proxy) حاصل کر لیے۔ اس سلسلے میں میری ملاقات مسٹر رشید سے بھی ان کے گھر پر ہوئی۔ مجھے بالکل خبر نہیں تھی کہ مسٹر رشید مسٹر روشن علی بھیم جی کے معاونِ خاص تھے۔ رشید صاحب نے بھی مجھ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بس یہی کہتے رہے کہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ پھر رشید صاحب نے مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا جب کہ میں تقریباً روزانہ ان سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے رشید صاحب کے بارے میں حقیقت اس وقت معلوم ہوئی جب میں ای ایف یو کا ڈائریکٹر بن گیا تھا اس لیے کہ ایک دن اچانک میں نے ان کو بھیم جی صاحب کے دفتر میں بیٹھے دیکھ لیا۔

میں نے خاصے نیابتی حقوق اکٹھے کر لیے تھے اور میرے ایک مشترکہ دوست مجھے بھیم جی صاحب کے گھر ملاقات کے لیے لے گئے۔ انھوں نے مجھے بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا اور بولے، ''آپ ڈائریکٹر کا انتخاب کیوں لڑنا چاہتے ہیں، ہم خود آپ کو بورڈ میں شرکت کی دعوت دیں گے۔'' اور پھر وہی ہوا۔ انھوں نے مجھے دعوت دی اور اس وقت سے آج تک میں ای ایف یو کے بورڈ میں ڈائریکٹر ہوں۔ در اصل میں ان کے دو اداروں بورڈ میں ڈائریکٹر ہوں، اس طرح کہ جب سے EFU Life کا قیام عمل میں آیا ہے میں اس کمپنی کا بھی ڈائریکٹر ہوں۔ میں جہاں تک ضروری ہوتا ہے، مشورے بھی دیتا ہوں اور امداد بھی اور میں مستقبل میں بھی یہ خدمت فراہم کرتا رہوں گا۔ میں نے اس کمپنی کو ہمیشہ پسند کیا ہے۔ یہ خالص پیشہ ورانہ انداز میں چلائی جاتی ہے اور اس سے منسلک رہنا میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ اس کے علاوہ ذاتی طور میں روشن علی بھیم جی کا بھی ثنا خواں ہو گیا ہوں۔ میں ایسے عظیم لوگوں کے ساتھ کام کرنا بھی اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتا ہوں، جیسے اصفہانی خاندان ہے، مسٹر ایس ایم یوسف جو اُن بہترین شخصیتوں میں سے ہیں جن سے میں آشنا ہوں۔ جس بات نے پہلے دن ہی سے

مجھے سب سے زیادہ متجسس کیا ہے وہ اس کمپنی کا پیشہ ورانہ انداز ہے جو ہر طرف نظر آتا ہے۔ ایک تاثر جو، میرے خیال میں، صرف میں ہی نہیں بلکہ عوام بھی رکھتے ہیں، ایک خالص پیشہ ورانہ انداز میں چلائے جانے والے آزاد ادارے کا تاثر۔ اگرچہ میں، میرے خاندان کے افراد اور وہ خیراتی ادارہ، جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے، اس ادارے میں خاصے بڑے اور اہم حصے دار ہیں مگر اس کی پیشہ ورانہ تنظیم کی وجہ سے ہم نے کبھی مداخلت نہیں کی ہے۔ اس ادارے نے ہمیشہ اپنی ایک مخصوص تہذیب کا تاثر دیا ہے۔ اور وہ تہذیب یہ ہے کہ یہ کبھی مالکوں کے ہاتھوں کھیلنے والا ادارہ نہیں رہا ہے۔ کبھی کوئی ایک فرد یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ کمپنی کو کس راہ پر چلنا چاہیے، ایسے فیصلے صرف پیشہ ور ملازمین ہی کرتے ہیں۔ اور کمپنی نے اس کو ثابت بھی کر دیا ہے۔ مسٹر بھیم جی موجود ہوں یا نہیں، چھ ماہ یا ایک برس کے لیے بھی ملک سے باہر رہیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ ادارہ پیشہ ور ہاتھوں میں رہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ہمہ وقت موجودگی کی صورت میں کمپنی موجودہ نتائج سے بہتر نتائج حاصل کر سکتی تھی، مگر میں اس نکتے پر زور نہیں دینا چاہتا۔ دراصل اندازِ کار سے پیدا ہونے والی تہذیب ہے جو فیصلہ کن ہوتی ہے۔ میں اس قسم کا طریقۂ کار پسند کرتا ہوں اور مجھے اس ادارے کے اندازِ نے اتنا متاثر کیا ہے کہ میں خود اپنی کمپنی میں بھی اسی کو اپنا مثالی طریقہ بنانا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، میری کمپنی میں، میں اور میری بیوی اکثریتی حصے دار ہیں۔ مگر خاندان سے صرف ہم دو ہی حصے دار ہیں اور بورڈ میں صرف میں ہی شامل ہوں۔ میں نے اپنے دونوں بیٹوں کو بتا دیا ہے کہ وہ جو کاروبار بھی کرنا چاہیں، کر سکتے ہیں۔ اگر وہ میری کمپنی میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے اصولِ کارکردگی کے مطابق میں انھیں متعارف نہیں کرا سکتا۔ وہ بورڈ کے پچھتر فی صد ووٹ ہی سے داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ اس کمپنی میں ملازمت کی درخواست بھی دے سکتے ہیں مگر کسی بھی صورت میں ان کو فاضل مراعات نہیں دی جا سکتیں۔ تو میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے: میں نے ۱۹۷۸ء میں ای ایف یو کی تہذیبِ کارکردگی سے سبق لیے ہیں کہ کمپنی کس طرح چلائی جانی چاہیے اور یہی میرا معیار ہے۔''

مجھے پورا یقین ہے کہ جہانگیر صدیقی نے ای ایف یو کے حوالے سے اپنے کردار کے بارے میں کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ جب پچھتر برس کی عمر میں روشن علی بھیم جی نے اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل، یعنی ای ایف یو کو نئے سرے سے زندہ کرنے کا بیڑہ اُٹھایا تھا تو صدیقی صاحب نے بہت گرمجوشی سے اُن کی مدد کی تھی۔

ای ایف یو لائف ایک پبلک کمپنی کی صورت میں ۱۹۹۲ء میں قائم کی گئی تھی اور بعد میں اس کے حصص کراچی کے بازارِ حصص میں فروخت کیے گئے تھے۔ ان حصص کی خریداری ایک دھما کا خیز کامیابی تھی۔ نیا جنم لینے والی زندگی کے بیمے کی کمپنی کے حصص ستائیس گنا زیادہ subscribe ہوئے تھے۔ وہ کتنی خوشی کا لمحہ تھا جب کمپنی کے چیئر مین جناب بھیم جی نے کمپیوٹر کا بٹن دبا کر حصص کی تفویض کا آغاز کیا تھا۔ ۲۳ راگست ۱۹۹۲ء میں شائع ہونے والے پروسپیکٹس کے مطابق پانچ کروڑ روپے کے حصص فروخت ہونے تھے اور آخری تاریخ ۳ رستمبر تھی۔ یہ بھیم جی اور ان کے رفقائے کار کے لیے ایک تاریخی لمحہ تھا جب یہ معلوم ہوا کہ پانچ کروڑ روپے کے مقابلے میں بارہ ارب تینتالیس کروڑ چالیس لاکھ روپے کی درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ تاریخی لمحہ اس لیے اور بھی تھا کہ خود ان کے چاہنے والوں نے اس وقت حصص کی فروخت کو ناموزوں قرار دیا تھا۔ اخبار ''ڈان'' نے اپنے کارپوریٹ شعبے میں چند برس بعد لکھا تھا، ''بلا شبہ یہ ایک جرأت مندانہ فیصلہ تھا۔ جرأت مندانہ اس لیے کہ بازارِ حصص ڈیڑھ برس سے دباؤ کی کیفیت میں تھا۔ زیادہ تر بزدل ادارے اس فروخت کو کسی اور وقت پر اُٹھا رکھتے۔ مگر بیمے کے گرو، مسٹر روشن علی بھیم جی نے شاید اپنی ذاتی اور اپنی blue-chip جنرل انشورنس کمپنی کی ساکھ کے بل پر ایک جوا کھیلا تھا۔ اور سرمایہ کاروں نے اس کا جواب بارہ ارب تینتالیس کروڑ روپے کی پیشکش سے دیا۔''

یہ فخر کا موقع جناب جہانگیر صدیقی کے لیے بھی تھا۔ یہ بے پناہ کامیابی انھیں کی وجہ سے ہوئی تھی اور اس کا انتساب انھیں کے نام ہونا چاہیے۔ ایسٹرن فیڈرل سے ان کے روابط اور روشن علی بھیم جی صاحب سے ان کی دوستی ایسے رشتوں میں تبدیل ہو چکی تھی جو ایک خاص قسم کی

تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ صدیقی صاحب ہمیشہ چیف ایگزیکٹیو کی حیثیت میں بھیم جی کے نظریات سے اتفاق کرتے، سماجی اور سیاسی نظریات سے تو بالکل نہیں۔ کمپنی کے حصے دار کی حیثیت میں ان کا یہ خیال رہا ہے کہ تمام کمپنیوں کی انتظامیہ بیمہ داروں کے مفاد کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتی ہیں اور ان کی خواہش تھی کہ حصے داروں کے مفاد کو بھی اہمیت دی جانی چاہیے۔ مگر چوں کہ بھیم جی بھی کمپنی کے بڑے حصے دار تھے اس لیے ذاتی طور پر ان کے مفادات پر بھی زد پڑتی تھی۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ صدیقی صاحب کے نزدیک کمپنی کی انتظامیہ کو بیمہ داروں کے مفادات کا پورا خیال نہیں رکھنا چاہیے۔ مگر وہ یہ سمجھتے تھے کی حصے داروں کے مفاد کی حفاظت ان کی ذمے داریوں میں سے ایک تھی۔ مگر تمام پہلوؤں کے پیشِ نظر انھوں نے بلا شبہ ای ایف یو اور روشن علی بھیم جی کے حامی جنگجو کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور بھیم جی کے مفاد اور ان کی انتظامیہ کو پوری قوت سے حمایت فراہم کرنا اسی وقت سے ان کا شیوہ بن گیا تھا جب ۱۹۷۸ء میں وہ کمپنی کے ڈائریکٹر بنے تھے۔

جہانگیر صدیقی حقیقتاً تسلسل، وفاداری اور استقامت کا جیتا جاگتا مرقع معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تیرہ برس سے کراچی اسٹاک ایکس چینج کے ڈائریکٹر، نائب صدر اور صدر رہے ہیں، بیس برس سے ای ایف یو کے ڈائریکٹر ہیں، چوبیس برس سے NSC کے بورڈ پر ہیں اور بائیس برس سے KESC کے ڈائریکٹر ہیں، اور میرے خیال میں یہ ایک یاد رکھنے والی خصوصیت ہے۔ ایسی سرگرمیوں کے ذریعے صدیقی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے ملک پاکستان کی معیشت کو کیسے چلایا جانا چاہیے۔ وہ متنوع تجربات کا ایک قابلِ قدر خزانہ ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا، مشرقِ بعید، یورپ اور امریکا کے بار بار سفر کے تجربات نے ان کو گھریلو کھانوں میں طرح طرح کے نئے اور چٹ پٹے مصالحے اور خوش بوئیں شامل کرنے کی خصوصیت عطا کر دی ہے۔ انکسار اور مستحکم مگر قدامت پسند رویوں کے اتصال اور غیر ملکی تجربات کی ملاوٹ کی ہمہ وقت خواہش نے صدیقی صاحب کو ایک قابلِ اعتماد کاروباری شراکت دار کا روپ عطا کر دیا ہے۔

ان کی اپنی کمپنی اس کی زندہ مثال ہے۔ پہلے وہ تمسکات کی دلالی اور پاکستان کے مالیاتی بازار کی خدمات کا ادارہ تھی جس کا وال اسٹریٹ کے مشہور حسب نسب رکھنے والے ادارے Bear Sterns سے اشتراک رہا تھا۔ کاروبار کے شروع ہی سے بازار میں ان کی قابلِ رشک ساکھ، اختراعی صلاحیت، جارحانہ اندازِ کار اور منفعت ان کے ادارے کی پہچان رہی ہے۔

ان کے اور ان کی خوب صورت بیوی کے ساتھ دعوت کھائیے، شیرٹن ہوٹل کے پاکستانی یا جاپانی ریستوران میں، اواری ٹاورز کے چائنیز، Gelato Affair میں آئس کریم اور Dejavu میں کافی کا لطف لیجیے، دونوں سے خدا اور دنیا کے بارے میں، امریکا اور ہانگ کانگ میں زیرِ تعلیم ان کے بیٹوں کے بارے میں یا پاکستان کی سیاست اور معاشیات کے بارے میں بحث کیجیے، یہ سب کچھ ایک شام کے کھانے کے دوران اور پُرسکون اور فطری طور پر لطف انگیز ماحول میں ہوسکتا ہے، پھر دیکھیے کہ جہانگیر صدیقی، پاکستان کا، اس وقت کا، سب سے بڑا مالیاتی جادوگر کیسا 'کھلتا ہے!

محمد علی سعید

قانونی مشیراور خاندان کا ایک فرد

ایسٹرن فیڈرل یونین کی کوئی بھی دستاویز اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ اس قانون داں کی نظر سے نہ گزر جائے۔ چند اور افراد کے ہمراہ، یہ ان باقیات الصالحات میں سے ہیں جو اگر چہ دور دور رہتے ہیں مگر آپ ان کے پختہ کار اور شفاف چہرے پر نظر کیجیے تو آپ کو فوراً احساس ہو جائے گا کہ ہر معنوں میں آج بھی یہ اس ادارے کے معاملات میں شامل نظر آتے ہیں۔

میری خوش نصیبی ہے کہ میں محمد علی سعید سے اس وقت سے واقف ہوں جب یہ ای ایف یو کے قانونی مشیر مقرر کیے گئے تھے۔ یہ مدراس کے اس سپوت، عباس خلیلی کے جگری دوست تھے جو اصفہانی خاندان کے مشورے پر کمپنی کے چیئر مین بنے تھے اور جو جناب روشن علی بھیم جی کو کمپنی کے نئے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت میں لائے تھے۔ سب سے اچھی بات یہ کی تھی کہ جب ان دو بڑے آدمیوں نے اس قدیم، خستہ حال اور روایتی ادارے کی باگ ڈور سنبھالی تھی تو انھوں نے موجودہ انتظامیہ کو نہیں چھیڑا تھا۔ ان میں سے کسی کے شناسا یا دوست پچھلے دروازے سے داخل نہیں کیے گئے تھے۔ اس طرح انھوں نے موجودہ انتظامیہ کی حوصلہ افزائی سے اسی کو چست کیا اور کمپنی کو بھنور سے نکال لینے کو حقیقت بنا دیا۔ کمپنی کے چیف ایگزیکٹو اور چیئرمین کے علاوہ بس ایک ہی شخصیت محمد علی سعید کی تھی جن کو ادارے کا قانونی مشیر بنایا گیا تھا۔ ادارے کے نئے رہنما ان کو محکم، قابل، جارحانہ انداز رکھنے والے قانونی اختراعی ذہن کے طور پر جانتے تھے جنھوں نے پاکستانی سیاست کے مشہور زمانہ 'راولپنڈی سازش کیس' میں بے مثال زیرکی اور ثابت قدمی سے اپنی پہلی اور فیصلہ کن کامیابی کا تاج اپنے سر پہ رکھا تھا۔

محمد علی سعید ۱۹۲۵ء میں مدراس میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم اور بی اے آنرز اسی شہر میں کیا اور قانون پڑھنے کے لیے دلّی چلے گئے۔ کالج میں ایک سال تک پڑھنے کے بعد وہ، ہندوستان کے سابقہ چیف جسٹس اور وائس چانسلر کے Bachelor of Civil Law (BCL) کے کورس میں داخل ہو گئے، جس کی تعلیم دلّی میں ہوتی تھی مگر امتحان کے پرچے لندن سے بن کر آتے تھے۔ LLB کے پہلے چار درجے کے طلبہ کا تبادلہ BCL میں کر دیا گیا تھا جن میں ایک محمد علی سعید بھی تھے۔ BCL کی تعلیم کے دوران دلّی میں فسادات ہو گئے اور محمد علی سعید کو مدراس واپس جانا پڑا جو اس نوع کی گروہی بے چینیوں سے قطعی طور پہ پاک تھا، اور وہیں انھوں نے Bachelor of Law مکمل کیا۔ انھوں نے ابتدائی کارآموزی کا زمانہ اپنے شہر ہی میں مکمل کیا اور دسمبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان ہجرت کر گئے جہاں انھوں نے اپنی تئیسویں سالگرہ منائی۔ اپنی عمر کے لوگوں کی طرح وہ بھی پاکستان اکیلے ہی آئے تھے۔ ان کے والد ۱۹۶۲ء میں سرکاری ملازمت سے فراغت تک وہیں رہے۔ بعد میں وہ بھی پاکستان آگئے اور اپنے دو بیٹوں کے ساتھ رہے، جن میں سے ایک محمد علی سعید تھے۔

محمد علی سعید کے والد مدراس پریزیڈینسی میں (اس زمانے میں مدراس ایک پریزیڈینسی تھا) انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ وہ پورے برطانوی ہندوستان میں پہلے مسلمان تھے جو کمشنر آف انکم ٹیکس بنے تھے اور تمام پریزیڈینسی میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد انھوں نے بھی

اس وقت اپنا شہر چھوڑ دیا تھا جب غلام محمد، جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے تھے، حیدرآباد دکن کے وزیرِخزانہ کے عہدے پر فائز ہوئے تھے اور انھوں نے حکومتِ ہندوستان سے ایک ماہرِ معاشیات اور انکم ٹیکس کی خدمات حاصل کرنے کی درخواست کی تھی۔ حکومت نے محمد علی سعید کے والد کی خدمات غلام محمد اور ان کی وزارتِ خزانہ کو پیش کر دیں۔ انھوں نے وہاں آبکاری (Excise Taxation) محصولِ آمدنی (Income Tax) کے محکموں کی ابتدا کی۔

محمد علی سعید جب کراچی منتقل ہوئے تو کنوارے تھے۔ ان کی جناب اے کے بروہی سے شناسائی ہوگئی، جو شاید اس زمانے ہی سے، صرف سندھ یا کراچی میں ہی نہیں، پورے پاکستان میں چوٹی کے قانون دان سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے اس نوجوان دوست کو اپنے قانونی معاونوں میں شامل کرنے کی پیش کش کی جو انھوں نے قبول کر لی۔ یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے۔ ۱۹۵۱ء میں بروہی صاحب راولپنڈی سازش کیس کے چیف پرازی کیوٹر مقرر کیے گئے، جس میں بہت سے معروف لوگ مجرم قرار دیے گئے، جناب سید سبطِ حسن ان میں سے ایک تھے، جو کئی برس بعد ای ایف یو میں تعلقاتِ عامہ کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔

محمد علی سعید نے ڈیڑھ برس حیدرآباد میں قیام کیا اور جنوری ۱۹۵۲ء میں، جب وہ مشہور مقدمہ چل ہی رہا تھا، ایک محترم خاندان کی ایک خوب صورت دوشیزہ سے شادی کر لی۔

۱۹۵۳ء میں ان کے اتالیق، جناب بروہی، وفاقی حکومت میں وزیرِ قانون بنا دیے گئے اور محمد علی سعید ان کے دفتر سے اپنی وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۶۰ء تک ان کے اپنے الفاظ میں وہ، ''ایک خاصا معروف اور کامیاب نوجوان قانون داں بن چکا تھا۔ اس وقت تک میں بہت سے ایسے، اچھے اور دل چسپ مقدمات کی پیروی کر چکا تھا، مجھ سے سینئر وکلا بھی جن میں ہاتھ ڈالنے سے گھبراتے تھے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس وقت تک وکالت کے پیشے میں اپنے نقش ثبت کر چکا تھا اور عباس خلیلی کی مجھ پر نظر تھی۔ جسٹس شہاب الدین بھی، جو بعد میں تھوڑے عرصے کے لیے وزیرِ انصاف بنے، مجھ پر نظر رکھتے تھے، میرے بارے میں اچھے خیالات کے حامل تھے اور عباس خلیلی سے میرا ذکر کرتے رہتے تھے۔ بس اس طرح میرا رابطہ ای ایف یو سے ہوا اور میں اس ادارے کا قانونی مشیر بن گیا۔ اور جب میں اس دارے سے منسلک ہوا تو جن لوگوں سے میری پہلی شناسائی ہوئی ان میں آپ خود، یعنی ولفرام کرنوسکی، جناب امین خراسانی جو اس وقت چیف اکاؤنٹنٹ تھے، نوجوان ایکچوری ساجد زاہد جو ابھی دنوں اس ادارے میں شامل ہوئے تھے۔ اور وہ مسحور کن دن تھے۔ خلیلی اور بھیم جی بھی کچھ عرصے قبل ہی شامل ہوئے تھے اور انھوں نے مجھے ان حالات سے آگاہ کیا جن سے وہ اس کمپنی کو نکالنا چاہتے تھے، جس کا ماضی نہایت شان دار رہا تھا مگر اب یہ تیسرے درجے کا ادارہ بنتا جا رہا تھا۔ کمپنی کی مشکلات ایک نہایت نازک اور بحرانی کیفیت میں تبدیل ہوئیں اور اس کو ایک مستحکم قانونی بنیاد پر قائم رکھنے کے لیے انھوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کی پیش کش کی جو میں نے قبول کر لی۔ یہ ایک باہمی اعتماد اور بھروسے کا ساتھ تھا۔ یہی معاملہ خلیلی اور اصفہانی کے درمیان تھا۔ وہ انھیں اور ان کے خاندان کو قریب سے جانتے تھے۔ اصفہانی کو خلیلی پر پورا بھروسا تھا۔ وہ بھی نسلاً ایرانی تھے، ان پر بھروسا کرتے تھے اس لیے ان کو کمپنی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اور یہ خلیلی ہی تھے جنھوں نے ڈھاکے میں اپنے دوستوں کو باور کرایا کہ بھیم جی ان کے ساتھ ہوں گے اور اس ذمے داری کو اٹھانے پر تیار ہوں گے۔ اس طرح یہ ایک بحالی کا عمل تھا اس لیے کہ اس کے بعد ہی دوبارہ سبزہ اُگنا شروع ہو گیا۔''

تقرری کے وقت وہ کراچی کے ایک کامیاب اور معروف وکیل تھے، جن کے قانونی مشورے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے جن کا حصول 'سستا' نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھی روشن علی بھیم جی کے معتمد دوست بن گئے، جو اپنے خاندانی معاملات میں بھی ان سے مشورے کرتے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوتا، ہر اتوار کی صبح کو وہ روشن علی بھیم جی سے ملاقات کے لیے ان کے گھر جاتے اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کے گھرانے کے فرد کے مانند ہو گئے تھے۔ زندگی بھی ایک دل چسپ تجربہ ہوتی ہے۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ مختلف

کردار اور نظریات کے لوگ کس طرح ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں ۔ میرے خیال میں ان دو مختلف کردار کے افراد کے مابین دوستی ایک اچھی مثال فراہم کرتی ہے۔ بھیم جی اور ان کے درمیان، ان کا انکسار، ان کا تیز طرار ذہن اور ان کی دانشورانہ آب و تاب دونوں کے ملاپ کے لیے ایک مثالی اتصال تھا۔ سعید اپنے دوست کے کرشماتی نظریات پر حیرت زدہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''میں نے ان کو بہت واضح سیاسی بصارت کا حامل انسان پایا۔''

میں سعید صاحب سے ملنے صدر بازار میں ان کے دفتر گیا، جو توقع کے عین مطابق ایک وسیع کمرے، چھدرے فرنیچر، بہت ساری کتابوں سے بھری الماری اور درمیان میں ایک کشادہ سی میز پر مشتمل تھا۔ میں نے ان کو بہت واضح سیاسی بصارت کا حامل انسان پایا۔ میں ان کو اسی دفتر میں چالیس برس قبل بھی دیکھا تھا جس میں آتے والے مؤکلین کے لیے ایک صوفہ اور چند کرسیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس اندھیرے سے دفتر میں براجمان قانون کے اس ماہر کے پاس کتنے پریشان حال اور کتنے لالچی مؤکل مدد کے لیے آکر بیٹھتے ہوں گے، جو شاید ہی کبھی ان کو مایوس لوٹاتا ہو گا۔

میں صوفے پر بیٹھا تھا اور وہ میرے مقابل ایک آرام دہ کرسی میں۔ ریکارڈنگ مشین چل رہی تھی مگر نہ وہ اور نہ ہی میں اس سے پریشان تھے۔ اس لیے کہ ہم اپنے ایک مشترکہ دوست کے بارے میں باتیں کر رہے تھے مگر یک بارگی اچانک ان کا اندازِ گفتگو بدل گیا۔ آواز، جس میں جوش اور گرمی آگئی تھی، قدرے اونچی ہوگئی۔ انھوں نے کہا، '' روشن میں ایک خداداد صلاحیت تھی، لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے اور شاید یہی بات تھی جو لوگوں کو ان کی طرف کھینچتی تھی۔ اور یہ بھی ہے نا کہ انھوں نے اس رُتبے پر پہنچنے کے لیے بہت محنت کی تھی۔ میں انھیں ایک social climber نہیں کہوں گا۔ مگر ایک تو ان کا اپنا ایک طریقۂ کار تھا اور ان میں ایک کشش تھی جو لوگوں کو ان کے قریب لے آتی تھی۔ آپ صاف طور پر دیکھ سکتے تھے کہ جو کچھ وہ کرتے تھے، اس میں ان لوگوں کی جھلک ملتی تھی جو ان کے نزدیک ایک معیار تھے، جیسے جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی اور قائدِ اعظم۔ جب وہ نوجوان تھے، ان شخصیتوں سے ان کے قریبی روابط رہے تھے۔ دراصل زیادہ تر سیاست دانوں سے ان کے بہت ہی قریبی تعلقات تھے جو یا تو قیامِ پاکستان کی تحریک میں فعال رہے تھے یا پھر پاکستان کے ریاستی ڈھانچے کا حصہ رہے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے سیاست میں کبھی براہِ راست حصہ نہیں لیا، انھیں اس میں دل چسپی بہت رہی ہے اس لیے اس میدان میں بھی ان کی شخصیت خاصی وزنی تھی۔ ہم نے کبھی سیاست اور معاشیاتی مسائل پر گفتگو ضروری نہیں جانا مگر ملک کے سماجی پہلوؤں پر میں ان کے خیالات سے واقف رہا ہوں۔ جو چیز ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی وہ معاشیاتی سطح کی ناانصافی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ لیاقت اور ہنر مندی کی سرپرستی کی ہے، حمایت کی ہے، اقربا پروری اور جانب داری سے نفرت کی ہے۔ جب بھی انھوں نے دیکھا ہے کہ بنیادی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے تو انھوں نے مختلف عدالتوں سے شکایت کی ہے۔ روشن نے بھی سیاسی اداروں کے تحفظ کے پیشِ نظر سیاست میں عملی حصہ لیا ہے۔ سیاست میں خود کبھی نہیں کودے مگر ہمیشہ اس کے پیچھے چلتے رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کی صحیح لوگ منتخب ہوں اور انھوں نے صحیح لوگوں کو صحیح مقامات پر رکھنے کے لیے مجھے استعمال کیا ہے۔''

طویل عرصے کے ان کے ساتھی کا یہ تجزیاتی مطالعہ ان کے سوچ کے انداز اور عقائد پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ خود اپنے مؤکل کے مقدمات کسی ذاتی، سیاسی اور مذہبی عقیدے سے قطعِ نظر کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنے دوست روشن علی بھیم جی ہی نہیں بلکہ دوسرے ساتھیوں کے سے بہت سے معاملات میں اتفاق نہیں کرتے مگر اس میں شک نہیں کہ وہ ایک اصولی انسان ہیں اور اقربا پروری یا جبر کے سخت خلاف ہیں۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے، کہا تھا '' اب ذوالفقار بھٹو ہی کو لیجیے، ایک طباع ذہن کا انسان۔ وزیرِ اعظم بننے کے بعد ان سے میرے روابط اچھے نہیں رہے حالاں کہ اس سے قبل وہ میرے اچھے دوست تھے۔ میں نے ان کی حمایت بھی کی تھی اور رعایت بھی۔ مگر جوں ہی میں بار ایسوسی ایشن کا صدر بنا، وہ میرے خلاف ہو گئے۔ وہ پسند اور ناپسند کے معاملے میں بڑے شدت پسند تھے۔ اور ان کی ناپسندیدگیاں پسندیدگی کے مقابلے میں بہت زیادہ

تھیں۔ آخر میں وہ ایک خطرناک نسل کے سیاست داں ظاہر ہوئے۔ وہ ایک منتخب آمر تھے۔ ایک فرانسیسی مفکر نے کہا تھا کہ منتخب آمریت سے بُری کوئی چیز نہیں ہوسکتی اس لیے کہ اختیاری ظلم و جبر عوام کے نام سے کیا جاتا ہے۔ اور صحیح معنوں میں بھٹو وہی کچھ تھے۔"

تمام زندگی محمد علی سعید اس یقین پر کاربند رہے ہیں کہ انسان کو خود اپنا راستہ بنانا چاہیے اور اسی راستے پر چلتے رہے جو انھوں نے بہت عرصہ پہلے سے اپنے لیے متعین کر لیا تھا۔ اور انھوں نے ایسے چند اصولوں پر کبھی سودے بازی نہیں کی جو انھوں نے اپنے لیے مقرر کر رکھے تھے۔ ان کے ضمیر نے انھیں کبھی دھوکا نہیں دیا نہ ہی فیصلہ کر لینے کے بعد کبھی انھوں نے اپنا راستہ بدلنے کے بارے میں سوچا، جب تک کہ کوئی اور اس فیصلے کو غلط ثابت نہیں کر دیتا۔ انھیں اپنا پیشہ پسند ہے اور انھیں اس پر کبھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ صحیح راستے پر نہیں ہیں۔ اور میرے خیال میں ان کا شاید ہی کوئی دوست اس سے اختلاف کرے گا۔

میں نے ہمیشہ ان کو، ان کے متوازن اور تنقیدی ذہن کے حوالے سے سراہا ہے۔ جب وہ کسی پر تنقید کر رہے ہوں تو وہ اپنے خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے قائل نہیں، وہ ہمیشہ مثبت طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ جب انھوں نے مجھے بتایا کہ پاکستان کے سابق گورنر جنرل غلام محمد ان کے والد کے قریبی دوست تھے تو میں نے غلام محمد کے بارے میں ان کے خیالات دریافت کیے جو ایک عرصے تک پاکستان کے سیاسی افق پر چھائے رہے تھے۔ اور محمد علی سعید نے فوراً پاکستان کی تاریخ کی اس متنازعہ شخصیت کا، جس کے بارے میں تاریخ داں مختلف خیالات رکھتے ہیں، اپنے نقطۂ نگاہ سے ایک کاٹ دار تجزیہ پیش کر دیا۔

"جناح صاحب مالیات کے ماہر کی حیثیت سے ان پر بہت اعتماد کرتے تھے، اُسی طرح جیسے سر ظفر اللہ خان پر۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ اعتماد حق بجانب تھا۔ ان دونوں نے نوزائیدہ ملک کے لیے بہت بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ مگر غلام محمد اقتدار کے بھوکے انسان بھی تھے۔ وہ ایوانِ اقتدار میں خود کو مستحکم رکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ان کی لغت میں کوئی لفظ بھی غلط نہیں تھا۔ وہ ایک میکاولی قسم (machiavellian) کی شخصیت تھے۔ مگر وہ ہمیشہ خود کو غیر محفوظ سمجھتے تھے، حالاں کہ جب وہ گورنر جنرل تھے، ان کے سارے وزرائے اعظم ان کی انگلی پر ناچتے تھے۔ وہ کبھی مطمئن نہیں رہتے تھے، بالخصوص پارلیمان کے حوالے سے۔ انھیں اپنے وزرائے اعظم پر کبھی اعتماد نہیں رہا۔ وہ خود سب کچھ ہونا چاہتے تھے، اور یہ بلاشبہ منافقت کی بدترین صورت ہوتی ہے اس لیے کہ ان جیسی دانشورانہ صلاحیت کے انسان کو اپنی حدود سے واقف ہونا چاہیے"

ایک ممتاز قانون داں ہونے کے حوالے سے محمد علی سعید کی شہرت اس وقت ہوئی جب ۱۹۶۹ء میں انھیں ہائی کورٹ میں جج کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ مگر دو برس بعد ہی انھوں نے جج کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اس لیے، جیسا کہ انھوں نے مجھے بتایا کہ "میرے بچے امریکا میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور میں ان کے تعلیمی اخراجات اس تنخواہ سے برداشت نہیں کر سکتا تھا جو اس زمانے میں ایک جج کو ملتی تھی۔"

جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے اس وقت سے واقف ہیں جب میں ای ایف یو کے منظر میں شامل ہوا تھا۔ ان چار عشروں کے درمیان میں ان کے ذہن کی دراکی، ان کے ناقابلِ یقین تیز ذہن، اور (جیسا کہ کسی نے 'آلیور کرامویل' کے بنائے ہوئے پارلیمان کے بارے میں کہا تھا) 'انگریزی قانون کے ٹیڑھے میڑھے اور ungodly جنگل' میں سے کامیابی سے گزر جانے کی صلاحیت کا قائل رہا ہوں۔ مگر میں ان کا نہ صرف ایک صاحبِ علم اور قابل قانون داں، کاروبار کو سمجھنے کی صلاحیت، دنیا دیکھے ہوئے اور وسیع ذہن کے مالک انسان ہونے کا معترف ہوں بلکہ میں نے ان کو ایک قابلِ اعتماد اور اعلیٰ درجے کا مہذب انسان بھی پایا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ "میرا ای ایف یو میں کوئی حصہ نہیں ہے، میں اس کا ڈائریکٹر بھی نہیں ہوں، بس اس ادارے کا قانونی مشیر ہوں۔ مگر میں اس حیثیت میں بھی ای ایف یو خاندان کا حصہ ہوں۔ میں جو کچھ کام کرتا ہوں اس کی فیس لیتا ہوں۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میری فیس واجبی ہوتی ہے، اس سے بہت کم جو میں عام طور پر اپنے دوسرے مؤکلوں سے لیتا ہوں۔ میں ان کے لیے فیس کی خاطر کام نہیں کرتا، اور جیسا کہ

میں نے کہا ہے کہ اس کمپنی میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ میری اپنی کمپنی ہے۔ اور یہ احساس جناب بھیم جی کی شرافت نفسی نے، اور ان کی معرفت سے سیف الدین زومکاوالا جیسے دوسرے لوگوں نے میرے دل میں جاگزیں کر دیا ہے جنھیں انھوں نے اپنے جانشیں کے طور پر تیار کیا تھا۔ اور ایسے جگری دوستوں کی وجہ سے جیسے آپ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ای ایف یو اب ایک مضبوط انتظامیہ کی بنیادوں پر استوار ہوگئی ہے۔ لائف کمپنی میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ روشن علی اب خود کو ایک خوش قسمت آدمی سمجھ سکتے ہیں اس لیے کہ وہ سیف الدین اور طاہر سا چک جیسے آدمی تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ ایک مضبوط انتظامیہ کی بنیاد فراہم کرتے ہیں جیسی آج پاکستان کی کسی بھی بیمہ کمپنی کو میسر نہیں، باوجود اس کے کہ ان کا ایک مدِ مقابل جسامت میں ان سے بڑا نظر آتا ہے۔ مگر یہ تو صرف اعداد و شمار کی باتیں ہیں جو کل تبدیل ہو سکتے ہیں۔ ای ایف یو خود اس کی بہترین مثال ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ای ایف یو محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ کس حد تک ایسا رہے گا، یہ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی بنیادوں کو اور کتنا مستحکم کرتے ہیں اور اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ مستقبل میں بھی انھی نقوش پر کام کیا جائے گا۔''

محمد علی کے پائے کے انسان سے کمپنی کے رشتے استوار کرنے میں، جب وہ کمپنی کو بچانے میں کوشاں تھے، عباس خلیلی اور روشن علی بھیم جی دونوں نے ہمت اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ دور اندیشی اس لیے کہ پچھلے چار عشروں میں بہت سے ایسے مواقع آئے ہیں جن میں محمد علی سعید جیسے نئے قانونی مشیر نے صرف اپنی موجودگی سے اور دیے گئے مشوروں سے اس عظیم ادارے کے وقار میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ہمت اس لیے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے تنقیدی دماغ سے معاملہ رکھنا ہمیشہ آسان نہیں ہوگا۔

ان کی کھردری جلد کے نیچے، جو ان لوگوں کا نشانِ امتیاز ہوتا ہے جو قانون کے میدان میں بلند رُتبہ ہوتے ہیں، یقیناً ایک خاندانی نزاکت کی نرم تہ چھپی ہوئی ہے۔ کیا وہ ایک اچھے باپ تھے، میں صرف اندازہ ہی لگا سکتا ہوں، اس کے لیے ان کی بیٹیوں سے پوچھنا پڑے گا، میں جن سے واقف نہیں ہوں۔ مگر یقیناً وہ ایک اچھے نانا ضرور ہوں گے، اگر بن گئے ہوں۔ جب میں اور میری بیوی ان سے اور ان کی رفیقِ حیات شمیم سے ملاقات کے لیے ان کے خوب صورت انداز میں سجائے ہوئے مکان، نفاست سے رکھے ہوئے باغ، درختوں سے آویزاں ثعلبِ مصری (Orchids) سے متعارف ہوئے تو ہم نے سیاست پر باتیں نہیں کیں، شہر کے حالات پر تبصرے نہیں کیے، پاکستان میں عدلیہ کے مستقبل اور ملک کے ایک سابق وزیرِ اعظم پر جاری مقدمے اور اس نوع کے معاملات پر گفتگو نہیں ہوئی۔ ایسا لگا گویا اتنے دنوں کے بعد ہمارے پاس بات کرنے کے لیے الفاظ نہیں رہے تھے۔ ہم نے شمیم کے اسکول کی بابت باتیں کیں اور ان کے دوستوں کے حلقے کے بارے میں جن کی کوششوں سے نچلے طبقے کی لڑکیوں کو بنیادی تعلیم فراہم کی جا رہی ہے۔ محمد علی سعید ایک بہتر سماج بنانے کی کوششوں پر فخر محسوس کر رہے تھے۔ اور جب ان کی اہلیہ مصوری کے شہ پاروں کے حصول کے بارے میں اپنی کارکردگی کا تذکرہ کر رہی تھیں تو محمد علی سعید سراپا تبسم دکھائی دے رہے تھے۔ اس عصر کے مصوروں میں اس وقت کے سب سے معروف مصور گل جی سے ان کی اہلیہ کی ملاقات، ایک شہ پارے کی خریداری اور مکان میں آویزاں ہونے کی تفصیل کے بیان سے اگر چہ وہ دور دور سے تھے مگر دل چسپی لینے کا اظہار ضرور کر رہے تھے۔ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے اور ان دونوں کے خوشی کے لمحات کے تصور سے وہ محظوظ ضرور ہوئے ہوں گے۔ یہ سب کچھ کسی پیشہ ور قانون داں کے دفتری اوقات کے لمحات سے کتنا مختلف ہوتا ہے، شاید اسی لیے ان کو ان باتوں سے سرور آمیز طمانیت ملتی رہی ہوگی۔
جب ہم گھر میں داخل ہوئے تھے، اس وقت محمد علی سعید کے باورچی کے بچے باغیچے میں کھیل رہے تھے۔ پھر ہم دونوں نے محمد علی سعید کو اپنے باورچی کے بچوں سے، جو خاصے صاف ستھرے لباس میں تھے، انہماک سے باتیں کرتے دیکھا۔ محمد علی سعید ہولے ہولے ان کے گالوں کو تھپتھپا اور ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے تھے۔ ایک اچھے دوست کے گھر سے ہمیشہ یاد رکھنے والا منظر، کیا اچھا تحفہ تھا!

جسٹس میاں محمد محبوب

ایک محافظ، ایک مصلح

جسٹس محبوب سے میرا پہلا رابطہ روشن علی بھیم جی کی وساطت سے ہوا تھا۔ ان دنوں وہ انشورنس ریفارم کمیشن کے چیئر مین تھے، میرے دوست بھی جس کے ایک رُکن تھے۔ میں اس وقت میونخ ری کی ملازمت میں تھا اور جسٹس محبوب بین الاقوامی تجربے کے حامل کسی فرد سے، کوئی ایسا جو انھیں بیمے کی صنعت میں ہونے والے جدید رجحانات خصوصاً زرعی فصلوں کے بیمے کی بابت آگاہ کر سکے، بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ میں اس میدان کا ماہر نہیں تھا، مگر میونخ کے ساتھیوں کے ذریعے میں ان کے لیے ضروری معلومات اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ان دنوں جسٹس محبوب لاہور ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے اور روشن علی بھیم جی سے ان کی اس وقت سے واقفیت تھی جب وہ لندن سے واپس آکر بینظیر بھٹو کی کیبنٹ میں بیمے کے مشیر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ جب میری جسٹس محبوب سے مارچ ۱۹۹۰ء میں لاہور میں ملاقات ہوئی اس وقت وہ حکومت باقی نہیں رہ گئی تھی مگر یہ دونوں حضرات اچھے دوست بن چکے تھے۔ ہماری ملاقات اچھی رہی۔ انھوں نے مجھے اپنی سرکاری قیام گاہ پر خوش آمدید کہا تھا، اس وقت وہاں بہت سے سرکاری افسر بھی حاضر تھے۔ میں نے جوں ہی ان سے ہاتھ ملایا، ان کو پسند کرنے لگا تھا، یا یوں کہوں کہ جب ہم نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، اس لیے کہ وہی موقعے کے لحاظ سے مناسب بھی تھا۔ ہماری سرکاری ملاقات زیادہ دیر نہیں چلی، اس لیے ہم دونوں کے پاس سننے سنانے اور مشترکہ دل چسپیوں کی کھوج کے لیے کچھ وقت باقی رہ گیا تھا۔ مجھے ان کا کشادہ اور دوستانہ چہرہ، ان کی مہربان آنکھیں اور ان کا میرے دوست کے بارے میں محبت بھرے انداز میں باتیں کرنا اچھا لگا۔ میری ان سے پھر ملاقات روشن علی بھیم جی کے گھر ایک دعوت میں ہوئی۔ ہم نے پاکستان کی مختصر سی تاریخ، اس کے مستقبل اور اس کی معاشیاتی کارگزاریوں اور ناکامیوں پر باتیں کیں۔

وقت گزرتا رہا، کافی دنوں تک ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ میں ان کے بارے میں باخبر رہتا اس لیے کہ جب بھی میں کراچی آتا ہمارے مشترکہ دوست روشن علی بھیم جی ان کے بارے میں بہت باتیں کرتے۔ کراچی میں بھیم جی سے میری طویل ملاقاتیں رہتیں اس لیے کہ اب ان کی دوڑ دھوپ کرسی کی نشست تک محدود رہ گئی تھی اور انھوں نے ملک سے باہر جانا ترک کر دیا تھا۔ وہ جسٹس محبوب کا بڑا احترام کرتے تھے جو ای ایف یو کو دوبارہ زندہ کرنے میں ان کے سب سے بڑے حمایتی تھے۔ نومبر ۱۹۹۲ء میں جب اس کمپنی کا افتتاح ہوا تھا تو وہ مہمانِ اعزازی تھے۔ میں نے اپنے دوست سے وعدہ کیا تھا کہ ای ایف یو میں جسٹس محبوب سے ملنے ضرور جاؤں گا اس لیے کہ گروپ کی تاریخ لکھنے کے منصوبے کے لیے اور ای ایف یو کے دوبارہ زندہ کرنے میں جسٹس محبوب کے کردار کے تذکرے کے بغیر یہ منصوبہ نامکمل رہے گا۔ ہم نے سوچا کہ ای ایف یو کے جاذبِ نظر نگار خانے کی ان عظیم شخصیتوں میں، جنھوں نے اس منفرد ادارے کی بنیاد گزاری اور ترقی میں

ہاتھ بٹایا ہے، جسٹس محبوب کی شمولیت بھی مناسب اور بروقت ہوگی۔

یہی وجہ تھی کہ میں اسلام آباد میں بے حد متین، بردبار، قابل اور صاحبِ علم شخصیت میاں محبوب کے دفتر میں باتیں کر رہا تھا جو پاکستان کی شرعی عدالت کے چیف جج کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ واقعہ ہمارے مشترکہ دوست کے انتقال سے ایک سال قبل کا ہے۔ اور پھر اچانک مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میرے مرحوم دوست ان معنوں میں بڑے ہی خوش قسمت تھے کہ جب بھی وہ کسی اہم معاملے میں الجھے ہوئے ہوں تو مہربان تقدیر ہمیشہ ان کی امداد کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی شخصیت فراہم کر دیتی تھی جس کی عملی امداد پر پورا بھروسا کیا جا سکتا ہو۔ جسٹس محبوب کی شخصیت میں انھیں ایک ایسا حمایتی مل گیا تھا جو زندگی کے بیمے کی صنعت کو نجی شعبے میں دوبارہ زندہ کرنے کی جنگ میں ان کے شانہ بہ شانہ کام کر رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس سے بھی اہم ایک بات ہو چکی تھی۔ وہ یہ تھی کہ جسٹس محبوب کی شخصیت کے پردے میں ایک ایسا مخلص اور جگری دوست مل گیا تھا جس کی سوچ، جس کے تصورات، اور جس کا تیقّن ایک ایسا آئینہ تھا جس میں وہ اپنی جھلکیاں صاف دیکھ سکتے تھے۔

جسٹس محبوب، روشن علی کے دوست تھے مگر عمر میں بہت کم۔ وہ ۱۹۳۳ء میں عراق کے دارالحکومت بغداد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مشرقِ وسطیٰ میں ایک برطانوی مشن سے منسلک تھے جو ان دنوں بغداد میں مقیم تھا۔ ان کا تعلق ہندوستان کی پولیس سے تھا، جرائم کی تحقیق سے متعلق (forensic) سائنس کے ماہر تھے اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ جسٹس محبوب کا بچپن لاہور، لائل پور جو اب فیصل آباد کے نام سے مشہور ہے، اور اس کے بعد دلّی میں گزرا تھا جہاں ان کی بیشتر ابتدائی تعلیم ہوئی تھی۔ دلّی ان دنوں پولیس کے محکمے کی انتظامیہ کا مرکز تھا جہاں ان کے والد تعینات تھے۔

دلّی بورڈ سے میٹرک کرنے کے فوراً بعد ستمبر ۱۹۴۷ء میں ان کا خاندان پاکستان ہجرت کر گیا۔ جسٹس محبوب کی اعلیٰ تعلیم فارمین کرسچین کالج میں ہوئی جو اب ایف سی کالج کے نام سے موسوم ہے۔ سائنس میں گریجویشن کرنے کے بعد لاہور کے لا کالج میں داخل ہو گئے، چند برس خرابیِ صحت کے باعث ضائع ہوئے اور بالآخر ۱۹۵۷ء میں قانون کی سند لے کر فارغ ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف حیثیتوں میں وکالت کی، کمپنی اور کارپوریٹ لا، مرکنٹائل لا اور آئینی قانون کے میدان میں۔ ۱۹۷۸ء میں انھیں براہِ راست لاہور ہائی کورٹ کا جج بنا دیا گیا تھا۔

وہ لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے ایک اہم اور محترم رُکن تھے جہاں وہ آئینی اور دیوانی، بالخصوص کاروباری مقدمات کی وکالت کرتے تھے۔ وہ پاکستان انشورنس کارپوریشن، اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن آف پاکستان، نیشنل انشورنس کارپوریشن اور کئی بڑی انشورنس کمپنیوں اور دوسرے تجارتی اداروں کے قانونی مشیر تھے۔

انھیں اور کئی باعزت ذمے داریاں سونپی گئی تھیں۔ چیئرمین پراونشل الیکشن اتھارٹی آف پنجاب کی حیثیت میں انھوں نے تین انتخابات کرائے اور بارہ برس تک یہ ذمے داری نبھائی۔ لاہور ہائیکورٹ کے بینکنگ جج رہے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، وہ انشورنس ریفارمز کمیشن آف پاکستان کے چیئرمین رہے جو پاکستان میں بیمے کی صنعت کی تنظیمِ نو کے لیے قائم کیا گیا تھا جس کی تجاویز پر، لائف اور جنرل دونوں کے میدان میں دور رس تبدیلیاں کی گئیں جن میں غیر روایتی بیمے، فصل، صحت اور مویشی کے بیمے بھی شامل تھے۔ کمیشن کی جامع رپورٹ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کمیٹی اور اس کے چیئرمین کو دی گئی ذمے داریوں سے کتنا لگاؤ تھا۔ کمیشن کی تجاویز میں سے کچھ کو نافذ کر دیا گیا ہے، جو اس نوع کے اہم معاملات میں ایک بڑا غیر معمولی واقعہ ہوتا ہے۔ جسٹس محبوب اس پر فخر کرنے میں حق بجانب ہوں گے اس لیے اور بھی کہ مقتدر بین الاقوامی ادارے، مثلاً عالمی بینک نے اس میں بہت دل چسپی لی اور اس کا ایک وفد کمیشن کی سفارشات پر بات چیت کرنے کے لیے پاکستان آیا تھا۔ نجی شعبے سے اس کمیٹی میں تین ارکان شامل کیے گئے تھے جن میں سے ایک روشن علی بھیم جی تھے۔

''جناب بھیم جی سے، جو اس کمیشن کے ایک رُکن تھے، میں اسی حوالے سے متعارف ہوا تھا'' جسٹس محبوب گویا ہوئے جب میں دسمبر ۱۹۹۹ء کی خوب صورت سنہری صبح کو ان سے ملا تھا، وہ سیاہ لباس میں شریعت کورٹ کے دو قابل ساتھیوں سے مشاورت میں مشغول تھے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میں ان سے، جو بھیم جی صاحب کے آخری وقت کے دوستوں میں سے تھے، پہلے مل چکا تھا اور ان سے پھر ملاقات کے لیے بے چین تھا تا کہ وہ مجھے اپنی دوستی کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔

''کمیٹی کے ارکان میں امدادِ باہمی کا جذبہ تھا اور میں بہت خوش تھا کہ ہم آخرکار ایک متفقہ رپورٹ بھیجنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دراصل وہ بھیم جی صاحب ہی کی شخصیت تھی جس نے کمیشن کی سفارشات میں اپنی دانش کا سارا وزن ڈال دیا تھا۔ ایک اہم بات تھی جس نے میری نظروں میں ان کا وقار بڑھا دیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ جب میں نے یہ تجویز پیش کی کہ چوں کہ بیمہ ایک عام تجارتی شے نہیں ہے اس لیے اس کے اداروں کے منافعے کی تقسیم مروّجہ طریقۂ کار سے نہیں ہونی چاہیے۔ میرا کہنا تھا کہ بیمہ ایک کاروبارِ خدمات ہے اس لیے صرف منافعے کی تقسیم ہی بیمہ کمپنی بنانے کا جواز نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ حصے داروں کو بہت زیادہ منافعے کی تقسیم سے روکنے کے لیے کوئی حد مقرر کی جائے تو بہتر ہوگا۔ اور بھیم جی صاحب نے خود، جو نجی شعبے سے آئے تھے، میری تجویز کی حمایت کی۔ میری طرح وہ بھی بیمے کو ایک قسم کی سماجی خدمت، عوام کے لیے دولت جمع کرنے اور ان کی بھلائی کے لیے ایک اچھا ذریعہ سمجھتے تھے اس شرط کے ساتھ کہ سرمایہ کاروں کے مفادات کو نظرانداز نہ کر دیا جائے اور ان کے سرمائے پر بھی مناسب منافع ملتا رہنا چاہیے۔ میں ضرورت سے زیادہ تقسیم کے فلسفے پر معترض تھا اور مجھے خوشی تھی کہ بھیم جی جیسے انسان کی حمایت بھی میرے ساتھ تھی۔ میں نے ان کو ایک عظیم پیشہ ور پایا۔ ان کے خیالات مجھ سے بہت ملتے تھے۔ مثال کے طور پر میں نے ہمیشہ زندگی کے بیمے کو بنیادی طور پر سماج میں بچت کا ذریعہ سمجھا ہے۔ مگر بدقسمتی سے نجی شعبے کو اس معاملے میں بہت ملوث پایا جاتا ہے۔ مگر بھیم جی صاحب واحد شخص تھے جنھوں نے میرے نظریے کی حمایت کی تھی اور اگر میرا بس چلے تو میں پھر کوشش کروں گا کہ سرمایہ کاری کرنے والوں کے لیے زندگی کے بیمے سے ہونے والے منافعے پر ایک اوپری حد نافذ کی جائے۔''

مجھے یہ جان کر یک گونہ سکون کا احساس ہوا کہ اس قانون داں کو ملک میں بیمے کی صنعت سے متعلقہ تمام معاملات پر پورا عبور حاصل ہو گیا ہے، اور اس طرح من حیث الکل مالیاتی اور معاشیاتی معاملات میں بھی۔

چوں کہ وہ شرعی عدالت کے چیف جج تھے اس لیے میں ان سے اسلام کے قوانین کی روشنی میں بیمے کی حیثیت کے بارے سوال کرنے سے خود کو نہ روک سکا مگر مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس تناظر میں بھی وہ ایک وسیع ذہن کے مالک نکلے۔ میں نے ان سے سوال کیا تھا کہ ادب اور مطالعے میں ان کی گہری دل چسپی کیا ان کو کبھی مذہبی کتب کی طرف بھی راغب کرتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ تاریخ کے علاوہ، جو ان کا مرغوب موضوع رہا ہے، وہ تصوف میں بھی دل چسپی رکھتے ہیں مگر اسلامی قسم کے تصوف میں۔ میں خود بھی تصوف میں دل چسپی رکھتا ہوں، اور پھر ہم دونوں اسی موضوع پر گرما گرم مباحثے میں مشغول ہو گئے۔

انھوں نے کہا ''میں نے تصوف کے بارے میں بہت پڑھا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ گرمجوشی ان صوفیا کی تاریخ پڑھنے سے پیدا ہوئی جو اسلامی دور میں فارس سے ہندوستان آئے تھے۔ اور اگر آپ ان کی زندگی کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ وہ تصوف کے اصلی معنوں میں صوفی نہیں تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں زہد اور دنیاوی معاملات سے دوری کے جذبات کی تجسیم تھے۔ آپ انھیں خالصتاً تبلیغی نہیں بلکہ عملی طور کے مبلغین کہہ سکتے ہیں۔ اور یہی بات میرے لیے دل چسپی کا باعث رہی ہے۔ اسلام کی تاریخ بھی وہی ہے، میں جس کا پُرزور داعی ہوں، جو انسان کو باعمل انداز میں جینا سکھاتی ہے۔ اسلام میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے جو آپ کو دنیا سے دور لے جاتا ہو۔ درحقیقت ہمارے پیغمبر کی زندگی ہمیں مکمل طور پر عملی زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ عملی زندگی گزارنے کے بعد ہی انھوں نے دنیا کو متاثر کیا تھا۔

ہر مسلمان کو ایک طرح سے مُلّا ہونا پڑتا ہے۔ اسلام میں ایک ادارے کے معنوں میں ملّائیت جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ اس لفظ

'بنیاد پرستی' ہی کو لے لیجیے جس نے اس دور میں کتنی غلط فہمی پھیلائی ہے۔ میں نے اس موضوع پر اپنے دوستوں اور دوسرے لوگوں سے بہت بار باتیں کی ہیں، خصوصاً ان لوگوں سے جن کا تعلق مغرب سے ہے۔ میں نے ان سے سوال کیا کہ 'بنیاد پرستی' سے ان کی کیا مراد ہے؟ اگر اس سے آپ کا مطلب مذہب کے اصولوں سے منسلک ہونا ہے تو میرے خیال میں ہر ایک کو اسلام کے بنیادی اصولوں سے منسلک ہونا ہی پڑے گا، کم از کم اس صورت میں جب وہ مذہب پر عمل کر رہا ہو، ہے کہ نہیں؟ اور ہمیں اس پر فخر ہوگا۔ مگر آپ بنیاد پرستی کو دہشت گردی کے برابر سمجھنے لگیں گے تو یہ سراسر غلط فہمی پر مبنی ہوگا۔ اس لیے کہ دہشت گرد تو کسی بھی قسم کے مذہب کے ہو سکتے ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ضرورت کے پیشِ نظر کوئی بھی بنیاد پرست نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ہمارا مذہب ہمیں ہمہ وقت جستجو میں رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس طرح کہ آپ ہمیشہ بدلتے ہوئے حالات کو سامنے رکھ کر اسلام کے اُصولوں کو سمجھنے یا منطبق کرنے کی کوشش کریں۔ تو آپ ایسے مرحلے پر ہوتے ہیں جہاں کبھی نہ ختم ہونے والے سوالات کے جوابات ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ گویا ایک صوفی کے بنیادی اصول یہی ہوتے ہیں کہ وہ حالات کو ان کے موجودہ تناظر میں دیکھتا رہتا ہے، وہ ماضی سے کبھی نہیں الجھتا۔ قرآن کو آپ جتنا زیادہ پڑھیں گے وہ اتنا ہی آپ کو تحقیق اور سائنس کی طرف راغب کرے گا۔"

میں ان سے اس بات پر متفق نہیں ہو سکا اس لیے کہ قرآن کے بارے میں میرا علم اتنا مبتدیانہ ہے کہ اس کی مدد سے اس موضوع پر کوئی با مقصد بحث نہیں کی جا سکتی۔ اس کے باوجود میں آسانی سے ان کے بنیادی یقین اور اصولوں کا احاطہ کر سکتا ہوں اور مجھے ان سے اتفاق کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

یہ ظاہر ہے کہ جسٹس محبوب پکے مسلمان ہیں۔ انھوں نے حج بھی کیا ہے اور کئی بار عمرے کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ اپنے مذہبی اصولوں پر یک گونہ سخت کاربندی کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے بہت سے مذہبی معاملات پر بھی لکھا ہے، اسی طرح جیسے وہ قانونی موضوعات پر، بیمے کے اور دوسرے عام موضوعات پر لکھتے رہے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جو لوگوں کی توجہ اور توصیف کا مرکز بنا ہے، 'اسلامی مملکت میں عدلیہ کا کردار' کے عنوان سے ان کا مضمون یونی ورسٹی لا کالج کے مجلّے میں شائع ہوا ہے جو اس موضوع پر ان کے علم کی گہرائی کا غماض ہے۔

جب ہم ان کے چیمبر میں ملے تھے ان ہی دنوں عساکرِ پاکستان کے ہاتھوں نواز شریف کی حکومت کا تختہ الٹا گیا تھا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ فوج نے ملک کا نظم و نسق سنبھالا ہو۔ ملکی عدلیہ کے ایک اہم نمائندے ہونے کے ناتے میں نے ان سے اس صورتِ حال کے بارے میں ان کی رائے طلب کی۔ اور یہ بھی کہ کیا ملک کا نظامِ عدل اب بھی ریاست کا ویسا ہی اہم ستون ہے جو ہر قسم کا دباؤ برداشت کر سکے جیسا کہ وہ اس وقت سے کرتا رہا ہے جب سے یہ ملک وجود میں آیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا کہ "میں اس ملک کی عدلیہ سے دو عشرے سے زیادہ عرصے تک منسلک رہا ہوں۔ میں بہت طویل عرصے تک لاہور ہائی کورٹ کا چیف بھی رہ چکا ہوں، اور پنجاب اس ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اس ملک کی عدلیہ کے اہلِ کاروں کے بارے میں میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کی نمائندگی کرنے کے لیے بہت اچھے لوگ موجود ہیں اور یہ بھی کہ ان لوگوں نے عدلیہ کی آزادی کو بخوبی قائم رکھا ہے۔ مجھے یہ بھی کہنا چاہیے کہ ہماری کارگزاری پر کسی جانب سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔ حال ہی میں یہی بات میں نے انگلستان، لندن میں اپنے ایک خطبے کے دوران بھی کہی ہے جو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز، یونی ورسٹی آف لندن کی دعوت پر دیا گیا تھا۔ وہاں میں نے سامعین کو بتایا تھا کہ میری ملازمت کے پورے عرصے میں مملکت کے کسی بھی عضو کی جانب سے کسی قسم کا کبھی کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا ہے۔ ہماری عدلیہ آزاد رہی ہے، آزاد ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی آزاد رہے گی۔ ہمارے فیصلے نظامِ عدل کی صلابت کا اظہار ہیں باوجود ان سب مشکلات کے جو یہ اپنے پورے عرصۂ حیات میں جھیلتی رہی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ ہم اس سے بری رہیں گے۔"

جسٹس محبوب نے یہ سب کچھ ایک یقینِ کامل کے ساتھ، جس کا وہ اظہار کر سکتے تھے، کہا اور میں ایک بار پھر ان کے خلوص سے متاثر ہوا۔ ان کا اندازِ انکسار جس کے ذریعے وہ مجھ کو مطمئن کرنا چاہتے تھے، پوری طرح قائم تھا۔ انھوں نے بڑی بے تکلفی سے مجھے اپنے ذاتی عقائد میں شریک ہونے کا موقع دیا اور ایک لمحے کے لیے میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ انھوں نے مجھ کو اتنی قربت کا شرف بخشا ہے۔ اس واقعے نے مجھے وہ وقت بھی یاد دلایا جب میں نے پاکستان کی چیف جسٹس کارنیلئس کے اپنے تجربے اور تصورات پر مبنی ارشادات سنے تھے جو انھوں نے اپنے مخصوص حلقۂ دوستاں اور مداحین کے سامنے بیان کیے تھے۔ میرے ایک دوست مجھ کو اپنے ساتھ اس محفل میں لے گئے تھے۔ مجھے وہ محفل یاد آ گئی جب جسٹس محبوب نے اپنے پیشے کی اخلاقیات کے بارے میں اپنے ارشادات کا اختتام یہ کہہ کر کیا کہ "آپ صرف یوں ہی حکومتوں کے مخالف یا موافق تعصب نہیں رکھ سکتے۔ نہ کسی فرقے یا جماعت کے موافق، نہ اس کے مخالف۔ یہ صرف واقعات کے ظہور پر ہی مبنی ہونا چاہیے۔ اور اس بارے میں قبل از وقت سوچنا ایک جج کے لیے ممنوع ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک ایک جج کو اپنے آپ کو ناوابستہ رکھنا چاہیے۔ اس قسم کے مقدمات کے دوران، جو اسمبلی کی تحلیل کے بارے میں تھے اور میں ان میں شریک تھا، میں نے اخبار کا مطالعہ اور ذرائع ابلاغ کی خبریں سننا بند کر دیا تھا۔ اس لیے کہ ایک انسان ہونے کے ناتے مجھ پر ان کے یا اوروں کے بارے میں کچھ اثرات مرتسم ہونے لازمی ہیں۔ اس لیے بہترین طریقہ یہی تھا کہ اپنے آپ کو قطعی طور پر 'بند' کر لیا جائے۔ اور یہ طریقہ ہے فیصلے کرنے کا اس لیے کہ آپ کو حقائق کی بنیاد پر فیصلے کرنے ہوتے ہیں جو آپ تک بغیر کسی آلودگی کے آنے چاہییں۔ اور میں کہوں گا کہ یہی طریقہ اپنانا چاہیے"

نہ میں وکیل ہوں نہ میں نے کبھی جسٹس محبوب کو عدالتی کارروائی کرتے دیکھا ہے۔ مگر میں قائل ہوں کہ وہ ایک اچھے جج ہوں گے۔ میرے خیال میں ایسے انسان، میں جن پر بھروسا کر سکتا ہوں۔ وہ بہت خلیق مگر مستقل مزاج آدمی ہیں، خوش اخلاق ہیں، انکسار کا بہترین نمونہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ عدالتوں میں جسٹس محبوب کے دیے ہوئے فیصلے مختلف میدانوں، قانون کے اُصولوں کے لیے مستحکم بنیاد فراہم کرتے ہیں اور مجھے اس قول پر پورا اعتبار ہے۔

تعجب نہیں کہ جسٹس محبوب کو بارہا موقعوں پر بین الاقوامی مذاکروں اور کانفرنسوں میں اپنے ملک کی نمائندگی کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔ اور ان تہ در تہ مصروفیات کے باوجود وہ سماجی کاموں اور فیاضانہ کوششوں میں حصہ لینے کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ ہلالِ احمر کی صدارتی کرسی پر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر بھی ہیں۔ یہ ادارہ تقسیمِ ہند سے قبل غریب مسلمان طلبا کو سائنسی تعلیم کے لیے مالی امداد فراہم کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔

جسٹس محبوب نے کثرت سے سفر کیا ہے اس لیے وہ سیاسی، سماجی اور معاشیاتی امور میں وسیع ذہن کے مالک ہیں جیسا کہ ان جیسے دانشورانہ صلاحیت والے انسان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ اپنی نسل اور اپنے طبقے کے دوسرے افراد کی طرح وہ بھی امداد فراہم کرنے والے اداروں پر ملک کے انحصار سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ اگر لوگ صرف بہتر تعلیم حاصل کر لیں اور بجائے قرض کے انھیں زیادہ تکنیکی علم فراوانی سے فراہم ہو سکے تو پاکستان جیسے ملکوں میں اور بہت کچھ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بڑے جذباتی انداز میں جسٹس محبوب نے کہا، "دیکھیے، میں ذاتی سطح پر آپ سے ایک شعبے کے بارے میں بات کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک ہم سے ٹیکنالوجی میں شرکت پر احتراز کرتے ہیں۔ یہ انداز ہمارے لیے حقیقی مشکلات پیدا کرتا ہے۔ ٹیکنالوجی پر مغرب کی اجارہ داری ہے۔ مگر وہ انسانیت کی سطح پر ہمیں اس میں شریک نہیں کرنا چاہتے۔ اس حد تک کہ سائنس کے موضوعات، حتیٰ کہ طب کی نصابی کتابیں تک اتنی گراں کر دی گئی ہیں کہ ہمارے کم حیثیت طلبا ان کو حاصل نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں مغرب سے بہت پیچھے رہے جاتے ہیں۔ بہت عرصہ قبل بیجنگ میں World Intellectual Property Organisation (WIPO) کے زیرِ اہتمام، جو اقوام متحدہ کا ایک مستقل ادارہ ہے، ایک مذاکرہ منعقد ہوا تھا اور میں نے اس میں اپنے ملک کی نمائندگی کی تھی۔ میں نے اس میں کہا تھا کہ یہ دانشورانہ قزاقی،

ٹریڈ مارک کی خلاف ورزی، کتابوں اور ریکارڈوں کی جعلسازیاں اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک کہ لوگوں کے لیے ان کا حصول آسان نہ بنادیا جائے۔ اگر آپ یہ نہیں کریں گے تو فطری نتیجہ وہی ہوگا جو آج آپ کے سامنے ہے۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ بہت سی وجوہات میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو امریکا اور دوسرے جگہوں پر اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں اور وہ واپس نہیں آتے۔ اس لیے کہ ان کے لیے یہاں مواقع نہیں ہیں۔ اور یہ مواقع یہاں صرف اسی وقت مہیا ہو سکتے ہیں جب ٹیکنالوجی درآمد کی جائے اور یہاں اسی قسم کے تکنیکی ادارے قائم کیے جائیں۔ تحقیق کے لیے ضرورت کے مطابق ہمیں سرمایہ فراہم نہیں ہے۔ اور اس سے زیادہ خرابی اور افسوس کی بات یہ ہے کہ جو کچھ سرمایہ ہے وہ بھی اس لیے صحیح طرح استعمال نہیں ہوسکتا کہ ہمارے پاس تحقیق کرنے والے تربیت یافتہ افراد کی کمی ہے۔ تو ایک مسئلہ ملک سے ذہانت کے اخراج کا ہے اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ 'ہائی ٹیک مشینیں' بے حد وحساب گراں ہیں کہ ہمارے ملک ان کو خریدنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس ہمارا خام مال اتنی کم قیمتوں پر خریدا جاتا ہے کہ اتنی زیادہ قیمتوں پر ٹیکنالوجی خریدنے کے لیے ہمارے پاس ضروری زرِ مبادلہ نہیں ہوتا۔''

بلاشبہ، پاکستان کے معروضی حالات میں جسٹس محبوب یہ کہنے میں حق بجانب تھے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ ان مسائل سے پوری طرح واقف بھی تھے جو تمام ترقی پذیر ممالک میں ہر سطح پر موجود ہیں اور یہ معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ ان قابلِ افسوس حالات کا ذمے دار کون ہے۔ اور اگرچہ ہم دونوں کو ان باتوں سے اتفاق کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی، میں نے مناسب جانا کہ میں ان کے مشاہدات اور بحث میں دیے جانے والے دلائل کے اقتباسات پیش کردوں اس لیے کہ یہ ان کی شخصیت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں، میں نے جس کا ایک مختصر خاکہ اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک سرسری سا خاکہ ہے مگر مجھے امید ہے کہ قارئین اس انسان سے واقف ہوسکیں گے جس نے اپنی تمام زندگی اس دنیا کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی ہے جو ہر روز نت نئے روپ میں ہمارے سامنے خود کو پیش کرتی ہے۔

میرے دوست روشن علی بھیم جی جسٹس محبوب کا بہت احترام کرتے ہیں اور یہ میں اب سمجھ سکا ہوں کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے۔

اشرف تابانی

سندھ کے ہمارے گورنر

ہماری پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی۔ اُن ہی دنوں ذوالفقار علی بھٹو نے، بیمہ زندگی سمیت، بہت سی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا تھا۔ میں مختصر عرصے کے لیے کراچی آیا ہوا تھا اور قمر ہاؤس میں روشن علی بھیم جی نے ان سے میری ملاقات کرائی تھی۔ اشرف تابانی ان ہی دنوں راولپنڈی سے واپس آئے تھے۔ بھٹو نے ملک کے بہت سارے سربرآوردہ صنعتکاروں کو ملاقات کے لیے بلایا تھا اور تابانی صاحب فیڈریشن آف پاکستان چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹریز کے صدر کی حیثیت میں وہاں گئے ہوئے تھے۔ میٹنگ نیشنل ڈیفنس کالج میں ہوئی تھی جس سے بھٹو نے خطاب کیا تھا۔ تابانی صاحب نے بھی کاروباری برادری کی طرف سے زوردار تقریر کی تھی اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے عمل کی کُھل کر مخالفت کی تھی۔

تابانی صاحب سے میری اکثر ملاقاتیں رہا کرتی تھیں، اس لیے کہ وہ ای ایف یو لائف کے ڈائریکٹر بھی ہیں۔ تابانی صاحب نے بتایا کہ "راولپنڈی کے اس اجتماع میں کراچی سے بہت سارے لوگ جانا چاہتے تھے مگر پی آئی اے کی عام طور پر جانے والی پروازوں میں سیٹ نہیں مل رہی تھی، تو ہم لوگوں نے پورا ایک ہوائی جہاز چارٹر کیا، راولپنڈی گئے بھی اور اسی شام کراچی واپس بھی آگئے تھے۔ ہماری کراچی واپسی سے قبل ہی صدر (بھٹو) کی اور میری پوری تقریریں ٹیلی وژن پر نشر ہو چکی تھیں اور پورے ملک سے لوگوں کے تعریفی ٹیلی فون آنے شروع ہو گئے تھے۔ میرے بے لاگ تبصرے کو بالخصوص پسند کیا گیا تھا۔"

۵ رمارچ ۱۹۷۲ء کی اس تقریر میں، بہت سی باتوں کے علاوہ، تابانی صاحب نے مندرجہ ذیل باتیں بھٹو صاحب کے گوش گزار کی تھیں: "حکومت نے بہ جبر مختلف صنعتوں پر مشتمل بتیس نجی اداروں کا انتظام سنبھال لیا ہے۔ مجھے صاف الفاظ میں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ حکومت کا یہ عمل نجی غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے ایک دھچکا ثابت ہوگا اور ساتھ ہی ہماری اپنی کاروباری ہنرمندی بھی ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔ نجی شعبہ ان اداروں کی انتظامیہ کو قبضے میں لیے جانے کے پیچھے کارفرما عوامل کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس بات کا کبھی یقین نہیں کیا جاسکتا کہ ناتجربے کار افسران اِن جیسے اداروں کو اعلیٰ درجے کے اُن ہنرمند ڈائریکٹروں کے مقابلے میں بہتر طور پر چلا سکیں گے جنھوں نے ان کی بنیاد رکھی تھی۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ان اداروں کے بہت سے مسائل ان عوامل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں کہ نجی شعبے کے منتظمین کو ان پر کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ کچھ مسائل تو اس لیے پیدا ہوئے تھے کہ ماضی کی حکومتوں کا طریقۂ کار صحیح نہیں تھا جس کے لیے نجی شعبے کو ذمے دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ان میں سے کچھ ادارے تو درمیانے درجے کے ہیں اور ان کے قومی ملکیت میں لیے جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔"

اشرف تابانی ۱۹۳۰ء میں برما کے شہر رنگون میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کپڑے کے بیوپاری تھے اور یعقوب احمد برادرز کے نام سے ان کا ایک ادارہ کام کر رہا تھا جس کی بنیاد ۱۸۹۲ء میں رکھی گئی تھی۔ جس وقت ان کے والد کا انتقال ہوا تابانی صاحب صرف دو برس کے

تھے۔ ان کے سات بھائی اور ایک بہن تھی جن میں سے دو بڑے بھائیوں نے خاندان کا بوجھ سنبھالا تھا۔ اشرف نے ابھی اسکول جانا شروع ہی کیا تھا کہ مسلم — برمی فسادات شروع ہوگئے اور جان بچانے کے لیے ان لوگوں کو رنگون چھوڑنا پڑا۔ یہ لوگ ایک کشتی میں سوار ہو کر انجانے سفر پر روانہ ہوئے اور بالآخر بمبئی پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور وہیں آباد ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی نے بمبئی میں اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا۔

اشرف تابانی بچپنے ہی سے جناب روشن علی بھیم جی سے واقف تھے۔ تابانی صاحب کے سب سے بڑے بھائی روشن علی بھیم جی کے ایسے اچھے دوست تھے کہ ان کی تصویر ان کے بھائی کی لکھنے پڑھنے کی میز پر ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ تابانی صاحب کی مسٹر بھیم جی سے شناسائی بمبئی آکر بڑھی اس لیے کہ وہ بھی بیمے کا کاروبار کرتے تھے۔

قمر ہاؤس میں ایک بورڈ میٹنگ کے بعد کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے تابانی صاحب نے اپنی یادداشتوں کو کھنگالتے ہوئے کہا، ''ہم بمبئی کے مضافات کے ایک پُرسکون اور خوب صورت علاقے میں رہتے تھے اور سینٹ زیویر اسکول جانے کے لیے مجھے ریل کی سواری لینی پڑتی تھی۔ اسکول ہمارے خاندان کے کاروبار کے دفتر کے بالکل قریب تھا۔ میں دوپہر کا کھانا کھانے اپنے دفتر چلا جایا کرتا تھا۔ روشن بھائی وہاں اکثر آیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ہمارے بڑے بھائی کے ساتھ، جو اُن کے بہت اچھے دوست تھے، کھانا بھی کھاتے تھے۔''

۱۹۴۷ء میں ان کے خاندان نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا اور کراچی میں جا بسے، جہاں اشرف تابانی صاحب نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ تابانی صاحب ۱۹۴۸ء میں امریکا چلے گئے جہاں فلاڈلفیا کالج آف ٹیکسٹائلز اینڈ سائنس میں داخلہ لے کر ٹیکسٹائل انجینیرنگ میں بی ایس سی کیا۔ ۱۹۵۲ء میں کراچی واپسی پر انھوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ خاندان کی ٹیکسٹائل فیکٹری میں کام شروع کر دیا۔

ان کا 'بائیوڈاٹا' بہت اچھا دکھائی دیتا ہے۔ آج کل وہ سیری (SERI) شوگر ملز کے چیئرمین، ایمپلائرز فیڈریشن آف پاکستان کے صدر، انٹرنیشنل آرگنائزیشن آف ایمپلائرز، جنیوا کے صدر، گورننگ باڈی آف دی انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن، جنیوا کے ممبر، پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن (سدرن زون) کے صدر اور ای ایف یو لائف کے ڈائریکٹر ہیں۔ اتنی ساری ذمے داریاں ان کی دل چسپیوں اور ان کے ہمیشہ مضطرب رہنے والے دماغ پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کی متحرک شخصیت اور محبتوں بھرے دل نے، ملک اور بیرونِ ملک، انھیں بہت سارے دوست فراہم کیے ہیں۔ بات چیت کرنے اور صائب مشورے دینے کے لیے دوستوں میں ان کی بہت مانگ رہتی ہے۔

وہ بہت سے اعلیٰ درجے کے حکومتی عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ تین برس کے عرصے کے لیے حکومتِ سندھ میں مالیات، صنعت، آبکاری اور محاصل کے وزیر رہے۔ تقریباً دو برس کے لیے انھیں سندھ کے گورنر کے فرائض بھی سونپے گئے تھے۔ تابانی صاحب ہر بات کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینے کے عادی ہیں اس لیے کہ ان کے اندر ہمیشہ ایک متوازن دماغ کی فرمانروائی رہتی ہے۔ ٹھنڈے مزاج کے انسان ہیں اور ان کو جلد غصہ نہیں آتا۔ ان سے میں نے سوال کیا کہ کیا وہ بنیادی طور پر ایک سیاست داں ہیں، تو جواب دینے سے پہلے، اپنی عادت کے مطابق انھوں نے طویل تامّل کیا اور بولے، ''میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ میں نے کبھی کسی پارٹی کے لیے انتخاب لڑنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مگر میں بہت سے اعلیٰ درجے کے سیاست دانوں کے ساتھ کام کرنے میں بہت اچھا ہوں۔ مجھے حکومت کے عہدوں پر کام کرنا اچھا لگا ہے اس لیے کہ اس کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبے کے بہت سے لوگوں سے میری شناسائی ہوئی ہے۔ اس میں مجھے لطف بھی آیا اور کبھی کبھی الجھن بھی ہوئی، اس لیے کہ ایسے عہدوں پر ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی ہوتا دیکھنا پڑتا ہے جس کو دل پسند نہیں کرتا، جو غلط ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سیاسی وجوہ کی بنا پر بہت سے لوگوں کا قتل ہونا، جس کے لیے آپ اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے کہ پولیس کے سربراہ کو حفاظتی اقدام بڑھانے کے لیے کہیں۔ اس ملک کا سب سے بڑا مسئلہ سرکاری افسروں کو سیاست میں گھسیٹنا ہے۔ ایوب خان کے دور میں اس کی ابتدا ہوئی تھی جب مارشل لا کے افسروں نے کئی اعلیٰ عہدے کے سرکاری افسروں کو برطرف کر دیا تھا۔ مارشل لا کے افسروں نے

سرکاری افسروں کی ملازمت کے تحفظ پر سوالات اٹھائے تھے۔ ایک بار آپ انتظامیہ کو سیاست میں گھسیٹ لائیں تو سیاستداں سرکاری محکموں میں دخیل ہونے لگتے ہیں۔ یحییٰ خان اور بھٹو کے دور میں یہی کچھ ہوا تھا اور پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔''

اشرف تابانی فطرتاً پُر امید انسان ہیں اور اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ اگر انسان محنت کرے تو بڑے سے بڑے معرکے سر کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے سندھ میں اپنی شوگر مل کا قصہ سنایا۔ ''چار برس سے میری شوگر مل کامیابی سے چل رہی ہے۔ جب میں نے اندرونِ سندھ اس علاقے میں شوگر مل لگانے کا ارادہ کیا جہاں اُن دنوں ڈاکوؤں کا راج تھا تو میرے جاننے والوں نے مجھے پاگل جانا۔ میں نے کہا تھا کہ ڈاکو تو آتے جاتے رہتے ہیں، وہ ہمیشہ تو نہیں رہیں گے۔ ایک دن آئے گا جب پھر قانون کی حکمرانی ہوگی، ورنہ ہم میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اور اگر ہم باقی نہیں بھی رہتے تب بھی مل لگانے سے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا۔ اس لیے ہمیں مل لگانی چاہیے۔ اور اگر ہم باقی رہے تو یہی مل سیکڑوں لوگوں کے لیے روزی کا ذریعہ ہوگی۔ اس کی مدد سے ہر برس کم از کم دو ہزار کاشت کاروں کو آمدنی ہوگی۔ اس طرح ہم اس علاقے کے بہت سے خاندانوں کی مدد کررہے ہیں۔ اور اگر ہم یہ مل نہیں لگاتے تو ہر رات ہمیں یہ روشنیاں نہیں دکھائی دیتیں۔ اس سے قبل یہاں کتنا اندھیرا ہوتا تھا۔ لوگ اس علاقے میں جاتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ اب کم از کم لوگ خوف تو نہیں کھاتے۔ یقین کیجیے، پاکستان میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کا کوئی علاج نہ ہو۔''

مجھے ان کا یہ انداز اس لیے پسند آیا بھی کہ ''میرے خیال میں اس ملک کے پڑھے لکھے لوگ بہت زیادہ خود تنقیدی کے عادی ہیں۔ وہ اپنی ناکامیابی کی وجوہات تلاش کرنے میں بہت عجلت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو الزام دیتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کام بگڑتے ہیں، اگر چہ وہ اس کے ذمے دار نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے ہدف بناتے ہیں اور ان کو حاصل کرنے میں ناکامیاب ہونے پر الزام تراشی کرتے ہیں۔ میں ہمیشہ سے یہ کہتا رہا ہوں کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ ذرا صبر سے کام لیں، پُر امیدی کا مظاہرہ کریں، اپنی صلاحیتوں پر زیادہ اعتماد کریں اور اس بات پر فخر کریں کہ انھوں نے پچاس برسوں کے قلیل عرصے میں کیا کچھ حاصل نہیں کرلیا ہے۔'' مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ تابانی جیسے لوگ میرے تصورات اور تیقن سے اتفاق کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ''اگر لوگ ایک قوم کی حیثیت میں اپنی کامیابیوں کا اعتراف شروع کردیں، بجائے یہ کہ اس کے برعکس محض دیکھتے رہیں، تو حالات بدرجہا بہتر ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے سوچنے کے انداز کو تبدیل کرنا ہوگا۔ یہ ملک دراصل ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشی بہتری کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اسی ہدف کو حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جو یہ کہتا ہے کہ ہم وہ کچھ حاصل نہیں کرسکے جس کی ہمیں ضرورت تھی، وہ ضرورت سے زیادہ پُر امیدی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یا پھر واقعی وہ صحیح ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دراصل ہم وہ کچھ حاصل نہیں کرسکے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں باون برس کا عرصہ کچھ نہیں ہوتا۔ قوموں کی بلوغت کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ پاکستان جیسے محنت کرنے والے عوام، ان کی جیسی دوسری، تیسری پڑھی لکھی اور زیادہ روشن خیال نسلوں کے ہوتے ہوئے پاکستان کا مستقبل خاصا درخشاں دکھائی دیتا ہے۔''

جو کچھ تابانی صاحب نے فرمایا، میں نے اس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کیا ہے، مگر جاتے جاتے آخری سوال ضرور کیا تھا کہ ''تابانی بھائی، جب کبھی آپ پلٹ کر اپنی سیاسی ذمے داریوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کس بات یا کس کام پر آپ کو زیادہ فخر محسوس ہوتا ہے؟ اس باران کا جواب، ایک لحظہ بھی توقف کے بغیر، غیر معمولی طور پر فوراً آ گیا تھا۔ انھوں نے فرمایا، ''مجھے سندھ کی گورنری بہت اچھی لگی تھی اس لیے کہ اس کے ذریعے مجھے ایک ہی وقت میں بہت سے لوگوں سے قربت کے مواقع ملے تھے۔ دو کروڑ تیس لاکھ انسانوں میں پہلا آدمی ہونا، نہ صرف بڑی بات معلوم ہی نہیں ہوتی، دراصل ہوتی ہے۔ اس لیے اور بھی کہ اس طرح نہ صرف لوگوں کی خدمت کرنے کے زیادہ مواقع ملتے ہیں بلکہ خدمت کے ساتھ انکسار کا احساس بھی ہوتا ہے۔ میں نے اپنے دوست روشن علی بھیم جی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی

بڑی خاکساری سے گزاری ہے۔ میں نے انھیں بمبئی میں بھی اسی طرح دیکھا تھا، اور پاکستان کے ابتدائی دور میں بھی اور اُس وقت بھی جب وہ ای ایف یو جیسی عظیم کمپنی کے چیئرمین کے عہدے پر فائز ہو گئے تھے مگر ان کے اندازِ زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ان کے رہن سہن میں اس قسم کے انکسار کو دیکھ کر ہی، ملک میں یا ملک سے باہر کے لوگ، ان سے دوستی کے خواہاں ہوتے تھے اور جینے کا قرینہ سیکھتے تھے۔ روشن علی بھیم جی وہ انسان تھے جو زندگی کی اصل قدروں کے محافظ تھے۔ انھیں فنون سے بھی محبت تھی۔ بمبئی کے قیام کے وقت ہی سے وہ سر برآوردہ فنکاروں سے محبت کرتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے فنکاروں میں سے ایک، سہگل، جو اداکار بھی پائے کے تھے اور گلوکار بھی، روشن علی کے بہت اچھے دوست تھے۔ آپ نے خود دیکھا ہے کہ پاکستان میں بھی پائے کے شعرا نہ صرف ان کے دوست تھے بلکہ اِن کے گھر اُن کا آنا جانا رہتا تھا۔ صرف معاشرے میں اپنا قد بڑھانے کے لیے وہ دوستیاں نہیں کرتے تھے۔ دراصل ان کی دوستی خلوصِ دل سے ہوا کرتی تھی۔ نجی شعبے میں ای ایف یو کے چیئرمین جیسے بڑے عہدے پر پہنچنے کے باوجود ان کا رہن سہن بہت سادہ ہوا کرتا تھا۔"

شاید یہ صرف انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا احترام ہی تھا جس نے روشن علی بھیم جی کے دل میں زندہ رہنے کی ایسی زندہ تمنا پیدا کی تھی کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں بھی، ۱۹۹۲ء میں، انھوں نے زندگی کی بیمہ کمپنی بنانے کا بیڑا اٹھایا تھا، جس میں ڈائریکٹر کے طور اشرف تابانی کو بھی شامل کیا گیا تھا۔

۱۹۶۷ء - ترقی اور معاہدوں کا سال

روشن علی بھیم جی

ای ایف یو کا کلکتہ میں پہلا دفتر ۱۹۳۲ء

۳۲۔ ڈلہوزی اسکوائر کا اندرونی منظر۔ یہ تصویر ۱۹۹۸ء میں لی گئی تھی، کہا جاتا ہے کہ اس بلڈنگ میں اس زمانے سے جب یہ ای ایف یو کا مرکزی دفتر بنی تھی، اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے

front/back 1

۱۹۶۹ء سے ۱۹۹۳ء تک میونخ ری انشورنس کمپنی کے بورڈ آف مینجمنٹ کے چیئرمین ڈاکٹر ہورسٹ جانوٹ

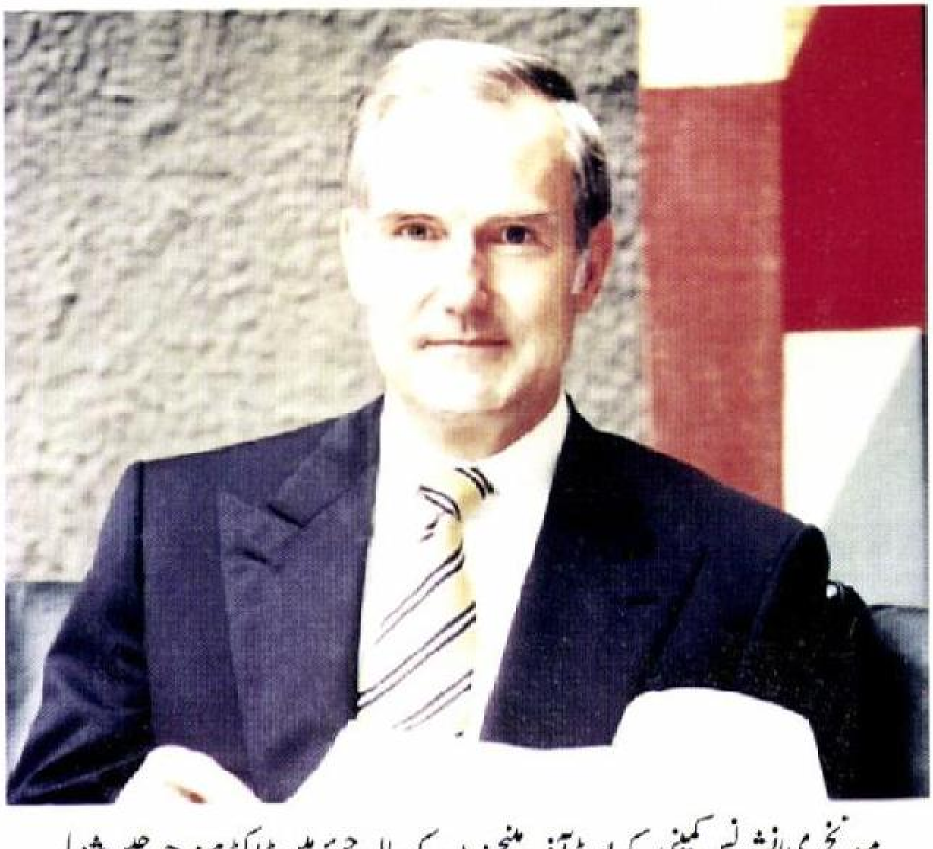

میونخ ری انشورنس کمپنی کے بورڈ آف مینجمنٹ کے حالیہ چیئرمین ڈاکٹر ہینز جورجین شنزلر

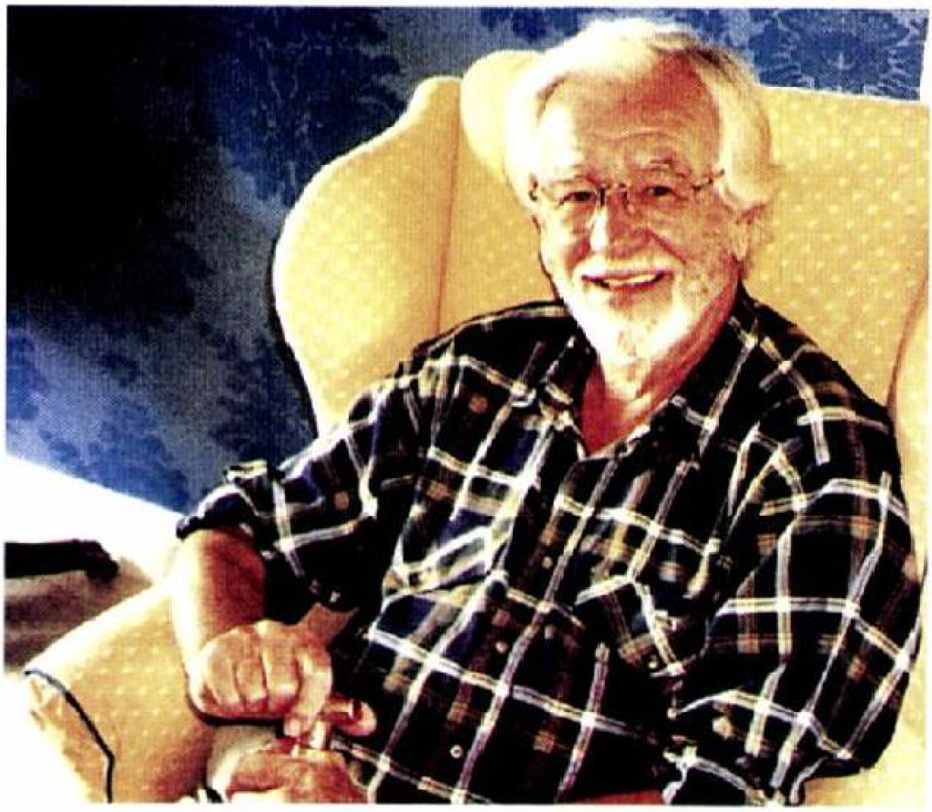

کریڈٹ اینڈ کامرس لائف، لندن کے کے سابق ڈائریکٹر اور رابرٹ بریڈفورڈ لائڈز لندن کے کے سابق
چیئرمین مسٹر ڈیوڈ ڈولن

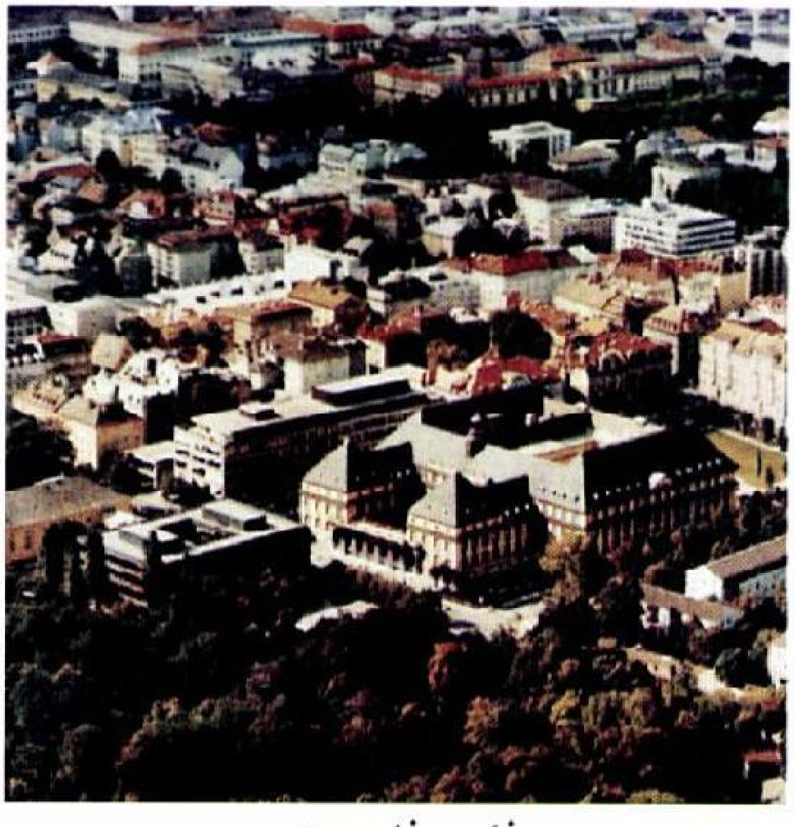

میونخ میں میونخ ری کا ہیڈکوارٹر

این اے قاضی ۱۹۹۷ء میں

آدم جی انشورنس کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر محمد چودھری ۱۹۹۷ء میں اپنے دفتر میں

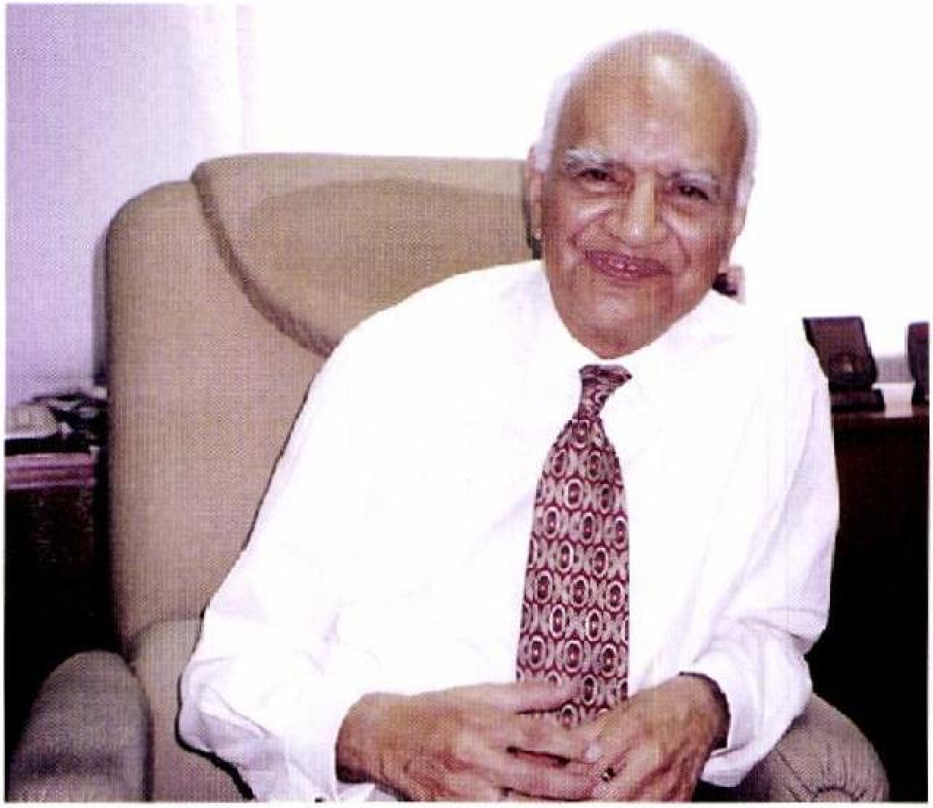

ایم اے چشتی اگست ۱۹۹۷ء میں

مسلم انشورنس کمپنی کے حالیہ جنرل منیجر ایس سی سجالی (ماموں)

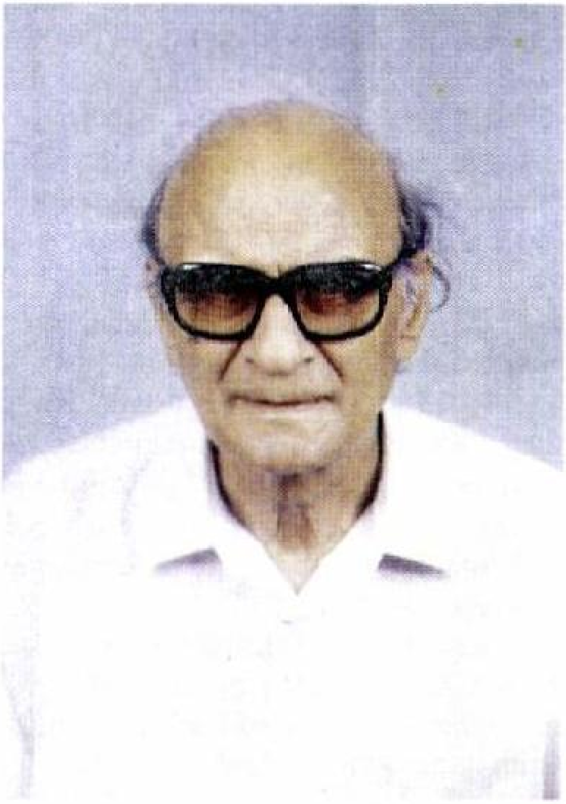

پریمئر انشورنس کمپنی کے حالیہ مشیر اے یو صدیقی

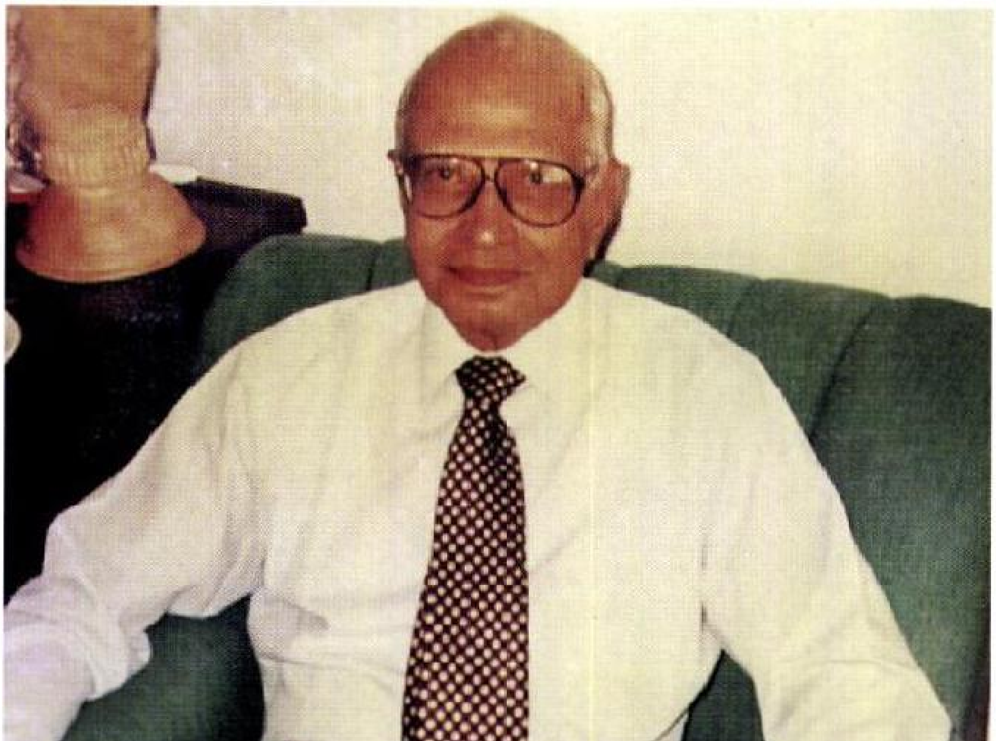

حبیب انشورنس کمپنی کے حالیہ مشیر روسی ڈیاش

نوابینِ بھوپال کی آخری شہزادی محترمہ عابدہ سلطانہ ہندوستان کی پہلی خاتون پائلٹ بننے کے پچاس برس
پورے ہونے پر سندِ اعتراف وصول کرتے ہوئے

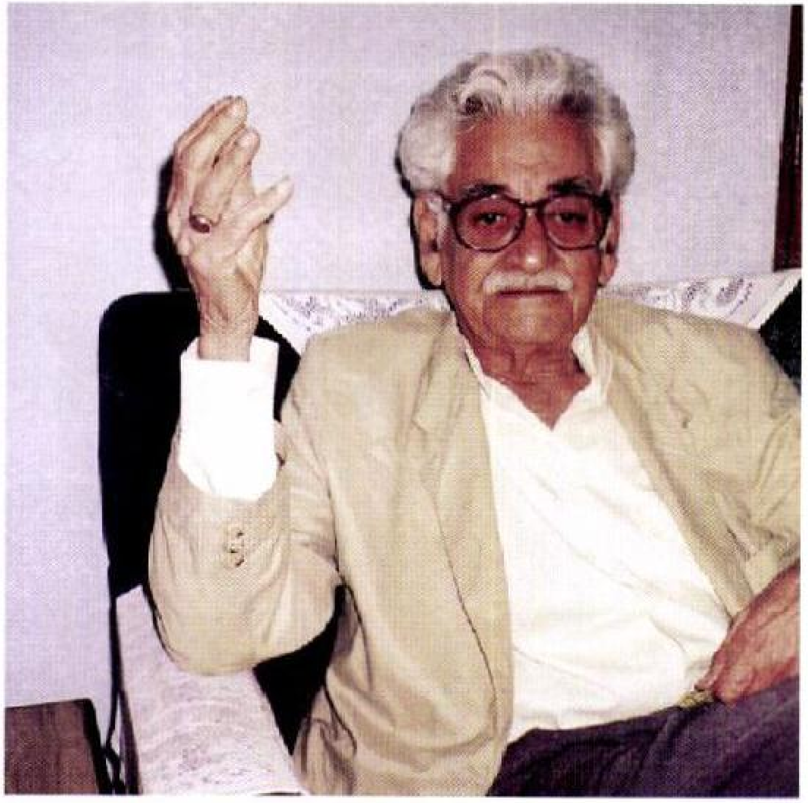

مرزا احمد اصفہانی کے بڑے صاحبزادے صدری اصفہانی مارچ ۱۹۹۸ء میں اپنے ڈھاکا کے دفتر میں

ابوالحسن اصفہانی کی بیوہ، بیگم غامر اصفہانی

عبدل الرحمٰن حاجی حبیب (مٹھو) ۱۹۹۹ء میں اپنے قمر ہاؤس کے دفتر میں

سندھ کلب میں سعید احمد اور ان کی اہلیہ کتاب کے مصنف اور ان کی بیگم کے ساتھ

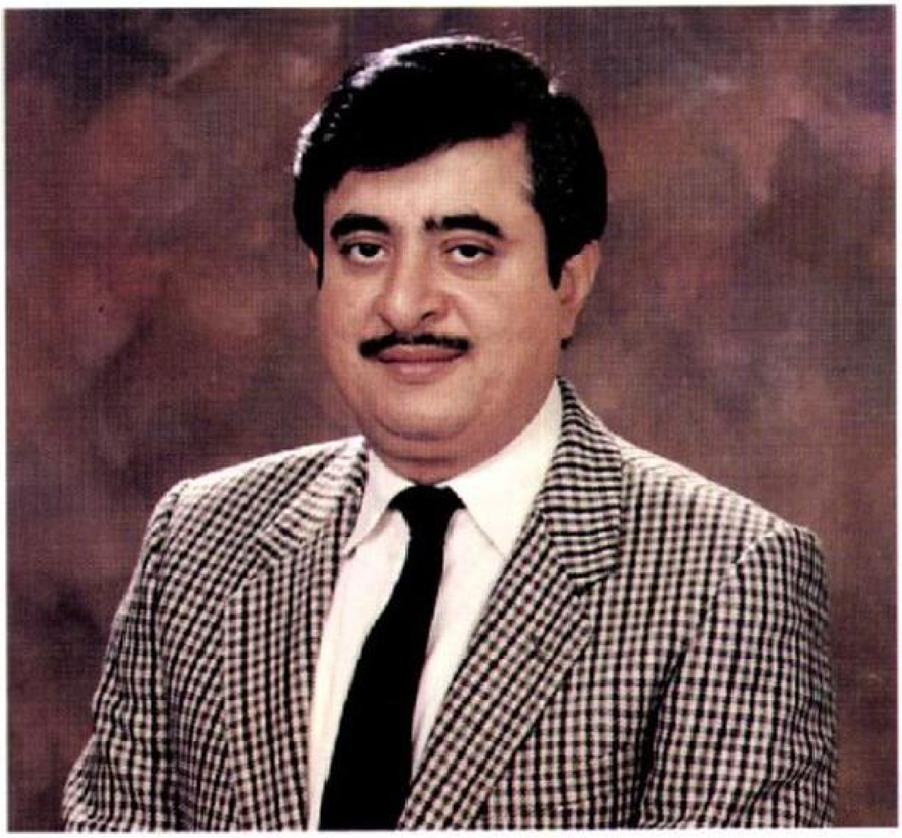

ای ایف یو لائف اور ای ایف یو جنرل کے ڈائریکٹر جہانگیر صدیقی

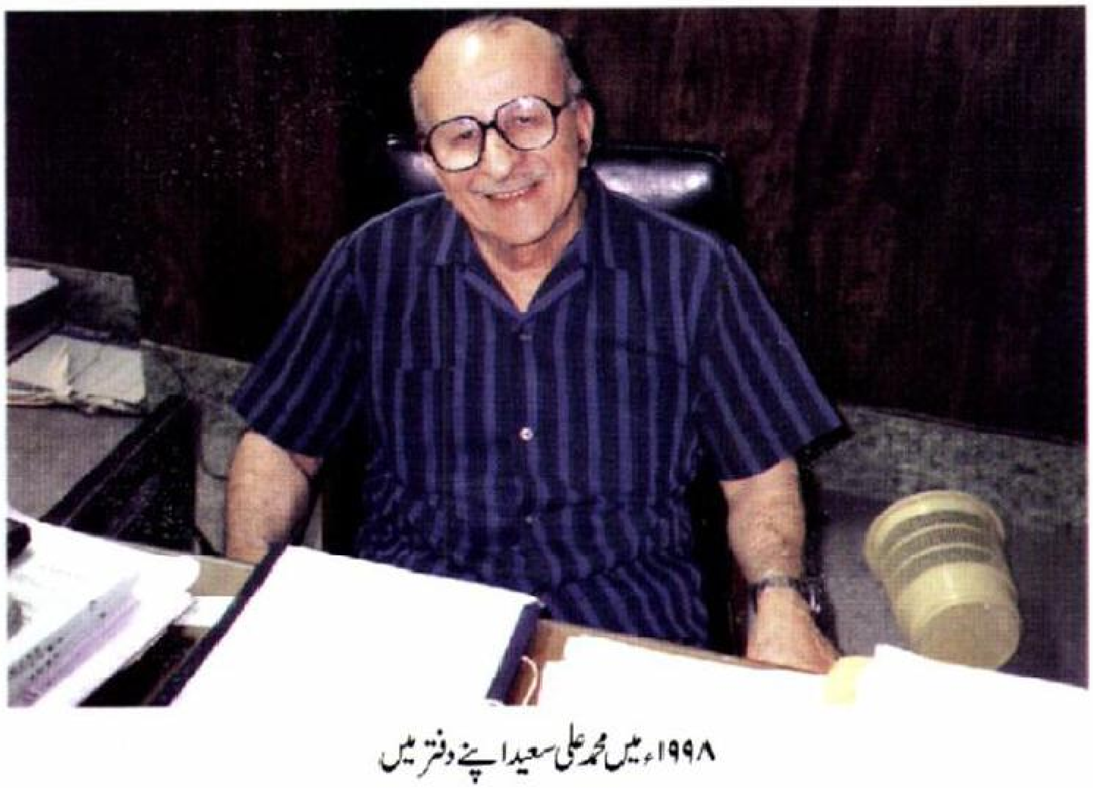

۱۹۹۸ء میں محمد علی سعید اپنے دفتر میں

جسٹس میاں محمد محبوب، ۱۹۹۸ء

اشرف ڈبلیو تابانی، ۱۹۹۹ء

عظیم شراکت دار شخصیات

اِروِن سی آئیون
ایس ایم معین الدین
میاں سعید احمد
ایس ایف عالم
ساجد زاھد
عظیم رحیم
ڈاکٹر محمد سعید خان
ایس اے رشید
مرزا فیض احمد
ابا علی یوسف
ڈاکٹر تاج الدین منجی
طاھر ساچک

خدا بخش
ھائنز شوارز
سید سبط حسن
ایس اے والا جاھی
نواب حسن
سلطان احمد
ابو المحمود
محمود جعفری
محمد حسین علوی
ایم فصیح الدین
حسن علی عبدالله
سیف الدین زومکاوالا

ای ایف یو کے جنرل منیجر ای سی آئیون، ایس ایم معین الدین، ایم وصال الدین اور ٹی بیکسٹر کے ساتھ
(اندازاً ۱۹۵۰ء)

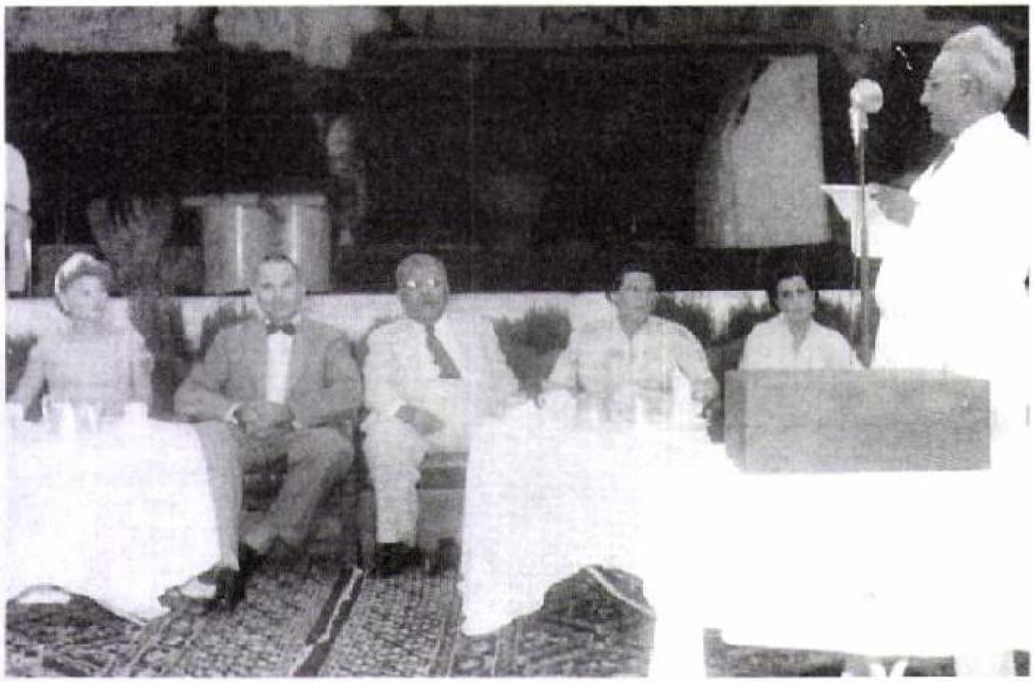

ایس ایم معین الدین ہوٹل میٹرو پول میں ای سی آئیون اور ان کی بیگم کے اعزاز میں منعقدہ الوداعی تقریب سے
خطاب کرتے ہوئے۔ (دائیں سے) مسز ازابیلا خان، مسز آئیون، کے ایف حیدر، ای سی آئیون اور مسز گالینا شوارز

ای سی آئیون اور ان کی بیٹی باربراٹی بیکسٹر کو جرمنی میں استقبالیہ دیتے ہوئے

۱۹۶۷ء کے ای ایف یو کنونشن میں شرکت کے لیے آمد پر خدا بخش ڈھا کا ائیر پورٹ پر
ای سی آئیون کا استقبال کررہے ہیں

اِروِن سی آئیون

جرمنی کا را بِن ہُڈ

اِروِن ۱۹۰۷ء میں جرمنی کے ایک درمیانے درجے کے شمالی شہر ہینووَر Hannover میں پیدا ہوئے اور ہیمبرگ میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ ہیمبرگ Hanseatic League(جرمنی کے ساحلی شہروں کا ایک تجارتی گٹھ جوڑ جو ۱۲۴۱ء میں قائم ہوا تھا اور اُنیسویں صدی تک رہا) ایک اہم رُکن تھا۔ اِروِن سی آئیون کا ہمیشہ سے اس مخصوص شہر سے اپنے ابتدائی رشتے اور اس کے شان دار ماضی سے بہت لگاؤ تھا۔ ان کے والد بھی، جو دوسری عالمی جنگ کے دوران ایک مشہور جرمن آبدوز کے چیف انجینئر تھے، اس قسم کے جذبات رکھتے تھے۔ یہ آبدوز جرمنی اور برطانیہ کے درمیان بحری جنگ میں شامل تھی اور اس کو بڑی شہرت ملی تھی۔ یہ کشتی جرمنی کے عجائب گھر میں نمائش کے لیے آج بھی موجود ہے۔ یہ اس ملک کے بحری ساز و سامان کی نمائشی اشیا میں سے ایک ہے جن سے لوگ مرعوب ہوتے ہیں۔

اِروِن کی ابتدائی تعلیم ہیمبرگ میں ہوئی تھی اور ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ بھی انجینئر بنیں اور ان کے پھلتے پھولتے کاروبار میں ہاتھ بٹائیں، جس طرح کی اِروِن کے چھوٹے بھائی نے کیا تھا۔ نوجوان اِروِن کے ایسے ارادے نہیں تھے۔ ابتدا ہی سے اُسے ہیمبرگ کی بندرگاہ اور اس سے متعلق ہر شے میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا، وہ دور تک پیدل چل کر بحری جہازوں کو سامان اتارتے اور سوار کرتے اور دور دراز کی بندرگاہوں کی طرف روانہ ہوتے دیکھنے جاتا تھا۔ ہیمبرگ، جس کو اپنی انگریزی وضع قطع اور اندازِ گفتگو کے لیے اکثر طعنہ دیا جاتا تھا، جرمنی کے حوالے سے دنیا کا دروازہ کہا جاتا تھا۔ یہ شہرِ تجارت، لین دین اور روایتی طور پر بینکنگ اور بیمے کے کاروبار کے حوالے سے ملک کا تجارتی مرکز تھا۔ جنگ اور اس سے ہونے والی ہول ناک تباہیاں، بھوک، بے روزگاری وغیرہ ایسے نشانات تھے جو بچپنے اور نوجوانی ہی میں اِروِن کے ذہن پر ثبت ہو چکے تھے۔ بڑی مشکلوں سے اس کا باپ اس کو زیرِ تربیت افسر کے طور پر جرمنی کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی اَلیانز مین ملازمت دلوانے میں کامیاب ہوا تھا۔ کمپنی والوں نے اس کو ہر قسم کے بیمے کی جامع تربیت دی جو تین برس پر محیط تھی۔ تربیت کے اختتام پر اِروِن نے ہیمبرگ کے چیمبر آف ٹریڈ کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کی جو برطانیہ کے انشورنس انسٹی ٹیوٹ کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اِروِن اپنے کام سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا اور اسے اس بات پر فخر تھا کہ اس کو Börsenabteilung میں تعینات کیا گیا ہے، اس لیے یہ شعبہ ہیمبرگ انشورنس ایکس چینج کے روزانہ کے اجلاس میں براہ راست نمائندگی کے ذریعے کام کرتا تھا۔ یہ ایکس چینج، جس کو Börse'as کے نام سے پکارا جاتا تھا، لندن کے مشہور ادارے لائیڈز Lloyds کے مماثل تھا مگر چھوٹے پیمانے پر اور یہ صرف قومی لین دین تلک محدود تھا۔ وہاں اَلیانز کا ایک بکس رکھا ہوتا اِروِن کے لیے جس میں بروکروں کی جانب سے جمع کیے گئے آرڈر نکال کر اپنے مرکزی دفتر بھیجا کرتا تھا۔ زیادہ تر کاروبار ہیمبرگ کے صنعتی اور تجارتی اداروں کا اور جہاز راں اداروں کا ہوتا تھا۔ اِروِن اس وقت ایک

نوجوان لڑکا تھا اور اس نے کئی بار مجھے بتایا کہ اس نے کتنا فخر محسوس کیا تھا جب اس کو کمپنی کے نمائندے کی حیثیت میں پہننے کو ایکس چینج کا بلاّ (badge) دیا گیا تھا۔ ایکس چینج اس کے لیے اس وقت تک دنیا کی طرف کھلنے والے دروازے کے مماثل تھا جب ۱۹۳۰ء میں تھائی لینڈ میں مقیم جرمنی کے ایک ادارے کو ایک کارکن کی ضرورت ہوئی اور اس نے آلیانز کے صدر دفتر سے ایک نوجوان، آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھنے والے مہم جو نوجوان کے بھرتی کرنے میں مدد کی درخواست کی تھی۔ درخواست گزاروں کی فہرست طویل تھی مگر اِروِن خوش قسمت نکلا۔ جس وقت جرمنی کی ہَنسا لائنز (Hansa Lines) کا ایک بحری جہاز ہیمبرگ سے بنکاک کے لیے روانہ ہوا، اِروِن اس پر سوار تھا اور بے حد خوش تھا۔

اس وقت اس کی عمر صرف تیئس برس تھی اور اس کا ذہن بہت سارے خوابوں اور بہت سارے تصورات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بہت وجیہ اور دراز قد نوجوان اور نوآبادیاتی زندگی کا دلدادہ یورپی کنوارا تھا۔ اروِن اپنی ملازمت سے بہت خوش تھا اور اس کو اس بات میں قطعی کوئی شک نہیں تھا کہ ایک تابناک مستقبل اس کا منتظر تھا۔ اپنی شخصیت کی کشش اور لوگوں سے گھل مل جانے کے فطری انداز کی بنا پر بہت جلد ہی وہ بنکاک کی سوسائٹی کا پسندیدہ نوجوان بن گیا تھا۔

جنسِ مخالف کے سلسلے میں اس کی کم زوری مردوں کے کلب کے بار اور خواتین کی برِج اور چائے کی پارٹیوں میں گفتگو کے لیے پسندیدہ موضوعات میں سے ایک موضوع تھا۔ گفتگو کے اعتبار سے وہ ایک مشہور کنوارا نوجوان تھا اور ہمیں اس وقت بہت افسوس ہوا جب ہم نے اس کو ایک پُرکشش جرمن خاتون سے شادی کرتے دیکھا جس کے بطن سے ۱۹۳۷ء میں اس کی اکلوتی بیٹی باربرا تولد ہوئی تھی۔

اس وقت تک اِروِن تبدیل ہو کر برما کے شہر رنگون چلا گیا تھا۔ آلیانز وہاں اپنا ایک نمائندہ بھیجنے کا خواہش مند تھا، اس کو یہ ملازمت پیش کی گئی جو اس نے قبول کر لی۔ اس ملازمت میں بھی اِروِن نے زبردست کامیابی حاصل کر لی، اتنی کہ جرمن حکومت نے اس کو وہاں جرمنی کا اعزازی قونصل مقرر کر دیا۔ اس کی بہت ساری خوبیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ نہ صرف وہاں مقیم یورپی باشندوں میں گھل مل گیا تھا بلکہ بالخصوص مقامی کاروباری حلقے میں بہت مقبول ہو گیا تھا۔ وہاں قیام کے دوران جن خاندانوں سے اس کے دوستانہ روابط استوار ہو گئے تھے، ان میں اصفہانی خاندان شامل تھا جو کلکتے کے بڑے تاجر تھے اور کاروباری حلقوں میں جن کے قریبی رابطے تھے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، یہ رشتہ اروِن کی کاروباری زندگی پر خاص انداز میں اثر پذیر ہوا۔

اگست ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی اور رنگون میں مقیم تمام جرمنوں کو قید کیا جانا تھا۔ اپنے سفارتی منصب کی بنا پر اروِن اور اس کے اہلِ خانہ کو اس وقت تک اپنی جائے قیام میں رہنے دیا گیا جب تک کہ برطانوی اور جرمنی میں مقیم برمی سفارت کاروں کے جوابی تبادلے کا انتظام نہیں ہو گیا تھا۔ مقامی افسران سے اپنے قریبی روابط کی بنا پر اروِن نے اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ وہاں مقیم دوسرے گیارہ جرمن افراد کے لیے بھی اس وقت تک اپنے ساتھ رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی جب تک کہ وہ جرمنی لیے کے روانہ نہیں ہو جاتا۔

جرمنی پہنچتے ہی اس کو فوج میں جبری بھرتی کر لیا گیا۔ اپنے پیشہ ورانہ ماضی کی وجہ سے اس کو ایک خاص یونٹ سے منسلک کر دیا گیا جس میں ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے والے مشہور رہنما سبھاش چندر بوس کے پیروکار شامل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاڑھی بڑھا کر چالیس سالہ بنگالی سبھاش چندر بوس جنوری ۱۹۴۱ء کی ایک اندھیری رات میں ایک مسلمان دیہاتی کا بھیس بدل کر ہندوستان سے فرار ہو کر جرمنی پہنچ گیا تھا جہاں اس کو برلن میں ایک پُرتعیش مکان اور سفارتی سطح کے برابر رتبہ دے دیا گیا تھا۔ وہ دو برس تک وہیں مقیم رہا جب تک کہ یہ واضح نہیں ہو گیا تھا کہ جس نوعیت کی پشت پناہی کا وہ طلب گار تھا اس کو فراہم نہیں کی جا سکے گی۔ ایڈولف ہٹلر سے خفیہ ملاقات کے بعد اس کو ایک آبدوز کے ذریعے ۱۹۴۳ء کے اوائل میں جاپان پہنچا دیا گیا تھا جہاں انڈین نیشنل آرمی میں مشرقِ بعید سے قید ہونے والے ہندوستانی فوجیوں کی بھرتی کے لیے امداد دی گئی تھی۔ بہر حال یہ ایک بالکل ہی مختلف، مگر دل چسپ، موضوع ہے۔ جس کا میرے دوست کی زندگی سے

کوئی تعلق نہیں سوائے اس کے کہ ہندوستانیوں پر مبنی اس خاص قسم کے یونٹ سے اس کی وابستگی کی بنا پر جنگ کے اختتام پر فرانسیسیوں نے اسے قید کرلیا تھا۔ اس پر کچھ الزامات بھی لگائے گئے، اس کا کورٹ مارشل ہوا، موت کی سزا بھی سنادی گئی تھی مگر خوش قسمتی سے اس کی اصل حقیقت واضح ہوگئی اور سزا کالعدم کردی گئی۔

بیگم آئیون اور ان کی بیٹی بار بار اس وقت ہیمبرگ چھوڑ کر Silesia چلے گئے جو بعد میں پولینڈ کا حصہ بن گیا، جب یہ شہر اتحادی فوجوں کی بمباری کا نشانہ بن گیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں جب شکست نظر آرہی تھی اور سوویت افواج تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں، یہ خاندان ایک بار پھر فرار ہوکر میونخ کے ایک گاؤں میں اِروِن کی بہن کے گھر منتقل ہوگیا اور اس کا انتظار کرنے لگا، جس کا نام ان دنوں کی خوف ناک اصطلاح میں 'غائب' ہونے والے افراد کی فہرست میں شامل تھا۔ بعد میں فرانس میں اس کی قید کی اطلاع ملی تھی۔ وہ ۱۹۴۸ء میں گھر واپس ہوا۔ سب لوگ ہیمبرگ واپس ہوگئے جہاں الیانز نے اِروِن کو ایک مقامی شاخ میں ملازمت دے دی۔ جیسا کہ میں کہیں بیان کر چکا ہوں، ان کا غیر ملکی کاروبار بالکل ٹھپ ہوگیا تھا اور 'غیر ملکی' شعبے کے تمام افراد ان کے دوسرے اداروں میں کھپا دیے گئے تھے۔ ان کے سابق کارکن ساتھی ہائینز شوارز بیمے کی صنعت ہی کو چھوڑ چکے تھے۔

جب اِروِن اپنی پیشہ ورانہ زندگی کو دوبارہ استوار کرنے کی کوشش میں مشغول تھا، اسے قطعی علم نہیں تھا کہ اس کے پرانے دوست اصفہانی دو برس سے اس کی تلاش میں تھے۔ وہ کلکتے میں قائم اپنی، مخلوط بیمہ کمپنی ایسٹرن فیڈرل یونین کے لیے ایک غیر برطانوی انشورنس افسر کی تلاش میں تھے جس کا چیف ایگزیکیٹو نیوزی لینڈ کا شہری ٹام بیکسٹر تھا اور اس کی اہلیہ کا تعلق اسکاٹ لینڈ سے تھا۔ بیکسٹر ۱۹۳۹ء سے ای ایف یو میں تھا، جنرل منیجر بننے سے قبل وہ کمپنی کا سکریٹری اور انڈر رائیٹر رہ چکا تھا۔ جیسا کہ میں مختلف لوگوں کی اور خود اپنے مربی اِروِن آئیون کی زبانی سن چکا تھا کہ ٹام بیکسٹر انشورنس کا ایک قابل، نہایت اچھے تکنیکی پس منظر کا ماہر پیشہ ور تھا، جسے بازار کے حالات سے اچھی واقفیت تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ کمپنی کی سیلز فورس سے اس کے اچھے تعلقات رہتے تھے۔ وہ بھی ایک روایتی نوآبادیاتی غیر ملکی تھا کمپنی سے جس کا تعلق ایک معینہ مدت کے لیے تھا۔ بنیادی طور پر اس کی سوچ اور اس کے اعمال کمپنی سے اس کے، تین سالہ، معاہدے کے زیر اثر ہوتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تین برس سے طویل مستقبل کی منصوبہ بندی نہیں کرتا تھا۔ اس میں اس کی ذاتی زندگی اور کمپنی کا مستقبل، دونوں شامل ہوتے تھے۔

کمپنی کے مفادات کی بات کی طرف واپس آتے ہوئے، یہ کہنا ضروری ہوگا کہ ۴۸-۱۹۴۷ء تک مختلف وجوہات کی بنا پر کمپنی کے ڈائریکٹرز میں اضطراب پیدا ہوگیا تھا۔ سب سے اہم فیصلہ یہ کرنا تھا، آیا کمپنی کا صدر دفتر کلکتے میں ہی رہے اور اس طرح ہندوستان کا انتخاب کیا جائے یا اسے کراچی تبدیل کردیا جائے یعنی پاکستان ہجرت کی جائے۔ چیئر مین عبدالرحمٰن صدیقی اور اصفہانی خاندان نے سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر پاکستان کا انتخاب کرنا چاہا جب کہ ٹام بیکسٹر چاہتا تھا کہ جیسا ہے ویسا ہی چھوڑ دیا جائے اور ایک بڑی مارکٹ کے امکانات کا انتخاب کیا جائے۔ اور جس کی توقع تھی، کمپنی کی بنیاد رکھنے والوں اور اصفہانی خاندان کے سیاسی پس منظر کے پیشِ نظر پاکستانی ٹولہ حاوی رہا اور اصفہانی خاندان کو اپنا پرانا دوست آئیون ہیمبرگ میں مل گیا۔ آئیون کو بہت خوشی بھی ہوئی اور تامّل بھی۔ تامّل اس لیے کہ الیانز نے اسے ایک ایسی جگہ دے دی تھی جو جرمنی کے ان دنوں کے حالات کے پیشِ نظر اس کے ساتھ بڑا احسان تھا۔ مسرور اس لیے کہ وہ اس سے بہتر خواب کی توقع نہیں کرسکتا تھا، کہ اس کے دوست اسے اچھی پیش کش کر رہے تھے۔ مشرق کی زندگی سے اس کی محبت اور لگاؤ کی فتح ہوئی، اس نے یہ پیش کش قبول کرلی، یہ سمجھتے ہوئے کہ جرمنی چھوڑنے کے لیے کاغذی کارروائی میں زیادہ نہیں تو کم سے کم ایک سال کا عرصہ لگ سکتا تھا جو ان حالات میں عام تھا۔ مگر اصفہانی خاندان نے ڈوریاں ہلائیں اور آئیون کے استعجاب کی انتہا نہ رہی جب تین ماہ کے اندر تمام کاغذی کارروائی مکمل ہوگئی اور ۱۹۴۹ء وہ ہیمبرگ سے پھر روانہ ہوا۔ اس بار کلکتے کے لیے ہوائی جہاز کے ذریعے روانہ ہوا اور ٹام بیکسٹر کے نائب،

ڈپٹی جنرل منیجر کی حیثیت سے، ایسٹرن فیڈرل یونین میں شامل ہو گیا۔

ای ایف یو کا صدر دفتر ان دنوں ۳۲ر ڈلہوزی اسکوائر ساؤتھ میں تھا۔ عمارت کا نام اسٹینڈرڈ بلڈنگ تھا۔ یہ عمارت اب بھی موجود ہے اور اس میں بنگال واٹر اتھارٹی کا دفتر ہے۔ میں اور میری بیوی ای ایف یو کی جڑوں کی تلاش میں ۱۹۹۸ء میں کلکتے گئے اور محمد چودھری کی، جو تقسیم ہند سے چند دن قبل ای ایف یو میں ملازم ہوئے تھے، بتائی ہوئی تفصیلات کے مطابق ہم نے اس عمارت کو تلاش کر لیا۔ عمارت، دوسری قریبی عمارتوں کی طرح، کچھ خستہ حالت میں تھی مگر یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ علاقہ اہم کاروبار کا مرکز رہا ہوگا۔ عمارت کا اندرون بالکل اسی طرح کا لگا گویا چیئرمین صدیقی صاحب اور ان کے ساتھی اس جاذب نظر ہال سے گزر کر موجودہ چیف کے کمرے میں داخل ہوں گے جہاں ایک خلیق افسر نے غیر متوقع طور پر جرمنی سے آئے ہوئے اجنبی مہمانوں کے لیے چائے کا انتظام کیا تھا۔ دیواروں پر نصب چوبی تختے اسی حالت میں نظر آتے تھے جیسے کہ اس وقت رہے ہوں گے جب اِروِن آئیون پہلی بار اس میں داخل ہوا ہوگا۔ خوندکر فضلِ حیدر کے بیٹے مصطفیٰ حیدر ازراہِ مہربانی اپنے ساتھ جناب ہارون رشید کو مجھ سے ملانے ہوٹل میں لے آئے تھے جو آج کل بنگلہ دیش میں ایک بڑے افسر ہیں، ان دنوں بیمہ زندگی کے شعبے میں کام کرتے تھے جب اِروِن کلکتے پہنچے تھے۔

رشید نے کہا ''میں اس ادارے میں یکم مئی ۱۹۴۸ء میں شامل ہوا تھا۔ اس کا صدر دفتر کلکتے میں تھا مگر رجسٹرڈ آفس چاٹگام، مشرقی پاکستان منتقل ہو چکا تھا۔ کلکتے سے ہندوستان، پاکستان اور سیلون میں کمپنی کا سارا کاروبار چلایا جاتا تھا۔ کلکتے میں کمپنی کا یہ دوسرا دفتر تھا۔ پہلا ۹ رکلائیو روڈ پر واقع تھا۔ دونوں دفاتر کلکتے کے تجارتی مرکز میں تھے۔ ڈلہوزی ہندوستان میں ایک برطانوی وائسرائے کا نام تھا۔ تمام بڑے بینک اور بیمہ کمپنیاں وہیں ہوا کرتی تھیں۔ ڈلہوزی اسکوائر کے بیچوں بیچ پانی کی ایک بڑی ٹنکی تھی (جو آج بھی ہے) جس کے اطراف تمام بڑی عمارتیں تھیں۔ جب میں مئی ۱۹۴۸ء میں ملازم ہوا تھا مشہور بنگالی سیاست داں جناب عبدالرحمٰن صدیقی، جو کلکتے کے میئر رہ چکے تھے، کمپنی کے چیئرمین اور ٹامس بیکسٹر جنرل منیجر تھے۔ کئی برس بعد فائر ڈپارٹمنٹ کے سربراہ بننے والے مقبول انصاری ان دنوں کمپنی کے انڈر رائٹر تھے۔ مسٹر بیکسٹر کو لوگ 'نیوزی لینڈ کی لومڑی' کہا کرتے تھے۔ انشورنس کے آدمی کی حیثیت میں وہ بہت چالاک اور مضبوط آدمی تھے۔ وہ ذہین، عقلمند اور عیار آدمی تھے۔ کمپنی سے ان کا پانچ برس کا معاہدہ تھا۔ جب میں ملازم ہوا اس وقت ان کے معاہدے کا دوسرا دور چل رہا تھا۔ مگر مسٹر آئیون زیادہ مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔ جرمن مزاج کے باعث ایک وقت میں کئی چیزوں پر نظر رکھنے کے لیے وہ اِدھر اُدھر بھاگتے پھرتے تھے۔ وہ جب وہاں نہیں بھی ہوتے تھے، ہمیں ان کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ایک طرح سے قدرت کاملہ جیسی صفات رکھتے تھے۔ زیادہ تر ملازمین ان کی ماتحتی میں کام کرنا پسند کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ محنت سے کام کرنے پر اُکساتے تھے۔ وہ رُتبے کے اعتبار سے ڈپٹی جنرل منیجر تھے مگر درحقیقت وہ کہیں زیادہ طاقتور تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسٹر بیکسٹر جیسے لوگ اتنی عجلت میں کمپنی کے دفاتر کلکتے سے کراچی منتقل کرنے کے خلاف تھے۔ میرے خیال میں، اس میں ان کے ذاتی مفادات بھی تھے۔ شاید مرزا احمد اصفہانی صاحب نے مسٹر آئیون کو معاملات تیزی سے نمٹانے کی غرض سے بلایا تھا۔ اس لیے کہ دفتر کی منتقلی اس وقت ہوئی جب مسٹر آئیون آ چکے تھے۔ مجھے یہ سب اچھی طرح معلوم تھا اس لیے کہ میں ان کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ مسٹر آئیون ہی اصل محرک تھے۔ کمپنی کا دفتر یکم مئی ۱۹۵۰ء میں منتقل ہوا اور میں بھی اس کے ساتھ ہی منتقل ہو گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جناب وصال الدین اپنے تمام بھائیوں، صلاح الدین، جمال الدین اور رسال الدین کے ساتھ لائف ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے۔ ہم سب ان کو 'بڑا ٹولہ' کہتے تھے۔ ان کے والد جو ایک بارسوخ ایجنٹ تھے وہ بھی ان میں شامل تھے مگر ایک چھتری کی طرح۔ مگر جلد ہی ایک بڑی جنگ شروع ہو گئی۔ ٹولے کے سب سے بڑے بھائی وصال الدین بڑے مہم جو انسان تھے اور ان کی نظریں کمپنی کے سب سے بڑے عہدے پر تھیں۔ اس لیے انھیں حیدر صاحب سے جنگ کرنی تھی جو ۱۹۵۲ء میں جنرل منیجر بن گئے تھے۔ وصال صاحب نے حیدر صاحب کو سخت قسم کے خطوط لکھنے شروع کر دیے اور دھمکیاں دیں کہ اگر ان کو

راستہ نہ دیا گیا تو اپنے سب بھائیوں کے ساتھ کمپنی سے علیحدہ ہوجائیں گے۔ اس وقت بھی اپنی تمام تر قوتِ ارادی اور مضبوط ارادوں والے مسٹر آئیون ہی کام آئے۔ وہ ڈھونڈ کر مسٹر خدا بخش کو لے آئے اور انھیں کمپنی میں شامل ہوجانے پر راضی کرلیا۔ اس طرح وصال الدین صاحب کی دھمکیاں کم زور پڑ گئیں اور بالآخر وہ ملازمت چھوڑ کر چلے گئے اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی، اس لیے کہ مسٹر آئیون نے ان سے بہتر آدمی تلاش کرلیا تھا۔ مسٹر آئیون کے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرا تھا۔ جب وہ میونخ ری میں ملازم ہوگئے تھے تو اپنے کمپنی کے نمائندے کی حیثیت سے اکثر مشرقی پاکستان آیا کرتے تھے۔ اس دوران میرا تبادلہ یہاں ہوگیا تھا اس لیے کہ میں پیدائشی بنگالی تھا۔ مسٹر آئیون کو اس ملک اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں بہت معلومات تھیں۔ مجھے ان سے بہت ہمدردی تھی اور دل میں ان کا احترام بھی تھا۔ ای ایف یو کے افسران میں وہ سب سے زیادہ سے بڑے تھے، بڑے اس لیے کہ نہیں کہ دراز قد تھے۔ بڑے وہ اپنی پیشہ ورانہ اور دانشورانہ صلاحیتوں کی وجہ سے تھے۔ اور وہاں ایک اور جرمن صاحب تھے، مسٹر شوارز۔ کمپنی کے بیشتر ملازمین ان کو بھی بہت پسند کرتے تھے۔ اگرچہ میرا ان سے براہِ راست کوئی رابطہ نہیں ہوتا تھا مگر مجھے جنرل ڈپارٹمنٹ کے ملازمین پر رشک آتا تھا کہ ان جیسا نفیس انسان ان کا افسر تھا۔ مسٹر آئیون اور وہ دونوں ملازمین کا بہت خیال رکھتے تھے اور سب واقعی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ مسٹر آئیون کا سب سے بڑا کارنامہ خدا بخش کی تلاش تھی۔ وہ انشورنس کے بڑے کامیاب کارکن تھے اور انھوں نے ای ایف یو کے لائف ڈپارٹمنٹ میں نئی روح پھونک دی تھی۔''

آج کل ڈلہوزی اسکوائر تین بنگالی شہیدوں، 'بنائے'، 'بادل' اور 'دینیش' کی یاد میں BBD Bagh کے نام سے موسوم ہے۔ یہ علاقہ Writer's Building کے بعد نیتا جی سبھاش روڈ پر آگے چل کر آتا ہے جہاں اس مشہور قومی ہیرو کی مورتی نصب ہے۔ مجھے اپنے دوست اور مربّی کے بارے میں ان الفاظ کو سن کر بہت مسرت ہوئی تھی اور کچھ فخر بھی ہوا تھا۔ سبھاش بوس کے مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے اچانک خیال آیا کہ اس شخصیت اور میرے دوست کے درمیان کتنا قریبی رشتہ تھا جس سے قریبی رابطے کے شبہے میں میرے دوست کی جان جاتے جاتے بچی تھی جو ان ہی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا اور خوش ہوتا کہ نہ صرف یہ کہ اس کی جان بچ گئی تھی بلکہ وہ دنیا کے اس خطے میں واپس بھی آگیا تھا جو اس کو سب سے زیادہ پسند تھا۔ مجھے یقین ہے، اروِن دل ہی دل میں اس بڑے سے مجسمے کی طرف دیکھ کر مسکرایا ہوگا جس کی عزت سارے ہندوستان میں بڑی بلندیوں پر تھی خواہ وہ تاریخ میں مناسب سیاسی اور سماجی تبدیلیوں ہی سے حاصل کی گئی ہو۔ اس موقعے پر مجھے ایک آدمی کی کہانی یاد آتی ہے جو بہت مختلف وجوہ کی بنا پر شہرت کی اعلیٰ بلندیوں تک پہنچ گیا تھا، میرے شہر ہیمبرگ کا ایک معروف آدمی۔ اس کا نام Störtebecker ہے اور اپنے دوست کا خاکہ مکمل کرنے سے پہلے اس کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

پانچویں عشرے کے کراچی کی زندگی مشکل، رنگین اور حیرت انگیز تھی، میں ای ایف یو کی تاریخ سے منسلک دوسری عظیم شخصیتوں کے خاکوں میں جس کا زیادہ تفصیل سے تذکرہ کر چکا ہوں۔ شہر میں ہوٹلوں کی کمی کی وجہ سے اروِن نے کئی ماہ فوجیوں کے خیموں میں گزارے۔ یہ خیمے زیرِ تعمیر بیچ لگژری ہوٹل کے مالکوں نے اپنی زمین کے سامنے لگوادیے تھے۔ اروِن اور ان کی اہلیہ اس زمانے کو کبھی نہیں بھولے جب ان کو خیمے کی زندگی سے برسٹل ہوٹل بھیجے جانے پر یک گونہ خوشی ہوئی تھی۔ برسٹل ہوٹل پرانا تھا مگر یقیناً خیموں میں موجود سہولیات سے بہتر رہا ہوگا۔

ایروِن ایک مضبوط اعصاب رکھنے والے افسر تھے۔ ٹام بیکسٹر کے دور میں بھی مگر حیدر صاحب کے زمانے میں، جو ۱۹۵۲ء میں بیکسٹر کی جگہ جنرل منیجر بنادیے گئے تھے، ان کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ اس لیے اور بھی قابلِ تعریف تھا کہ حیدر صاحب انشورنس کے پیشے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ نواب بھوپال کے قریبی معتمد اور طویل عرصے تک ریاست کے وزیرِ مالیات ہونے کی وجہ سے وہ ایک با رسوخ سیاسی شخصیت تھے۔ ای ایف یو کے حصے داروں میں سب سے بڑے حصے دار اصفہانی خاندان سے بھی ان کے قریبی تعلقات تھے مگر تکنیکی معاملات میں وہ اپنے نائب اور کمپنی کے اعلیٰ افسران پر اعتبار کرتے تھے۔

کمپنی کے ایک سابق اعلیٰ افسر جناب آغا ناصر علی سے، جو بعد میں اسٹیٹ لائف کارپوریشن کے ڈائریکٹر کے عہدے سے فارغ

ہوئے ہیں، کراچی جیم خانہ میں میری ملاقات ہوئی اور پرانے وقتوں کی باتیں ہوئیں۔ جب ہم اور وہ دونوں ایسٹرن فیڈرل میں کام کررہے تھے، وہ لائل پور میں برانچ منیجر اور میں صدر دفتر میں تھا۔ انھوں نے فرمایا، ''بسا اوقات آپ ایک انسان سے ملتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں اس کا ایک تاثر قائم ہو جاتا ہے جو زندگی بھر نہیں جاتا۔ مسٹر آئیون کے سلسلے میں میرے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ایسے انسان تھے جو ہر شخص کو متاثر کرسکتے تھے۔ آپ انھیں کسی گاہک سے ملاقات کے لیے لے جائیے تو آپ کو واقعتاً خوشی ہوگی کہ آپ نے ایسا کیا۔ ان سے انکار کرنا بہت مشکل بات تھی۔ وہ بڑی اعلیٰ درجے کی شخصیت کے مالک تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ای ایف یو بڑی خوش قسمت تھی کہ حیدر صاحب سیاسی اعتبار سے محترم اور بارسوخ آدمی تھے اور ان کی تکنیکی صلاحیتوں کی کمی پوری کرنے کے لیے ان کو آئیون جیسا مددگار مل گیا تھا۔ چند دن قبل ہی جب کمپنی کو مشکلات سے نکالنے کے لیے مسٹر آئیون لندن آئے تو میں لندن ہی میں تھا جہاں مجھے تربیت کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مجھے اس وقت احساس ہوا کہ اگر مسٹر آئیون نہ ہوتے تو ای ایف یو کی مشکلات اور بڑھ جاتیں۔ حیدر صاحب ان کی صلاحیتوں سے واقف تھے اور یہی وجہ تھی کہ حیدر صاحب ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ جی ہاں، مسٹر آئیون بہت بڑے آدمی تھے، صرف جسمانی اعتبار ہی سے نہیں۔ ایک عظیم شخصیت، صرف انشورنس ہی میں نہیں، پوری مارکیٹ میں ان کو اعتبار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چند لمحے ان سے بات کرکے ہی ان کی عظمت کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ جو بھی ان سے قربت رکھتا تھا وہ ان کی ایک خصوصیت کو کبھی نہیں بھول سکتا، میرے خدا! وہ ہمارے کھانوں کے دیوانے تھے۔ وہ اس قسم کے کھانے بھی کھا سکتے تھے مجھے جن کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ بڑی بڑی ہری مرچیں انھیں بہت مرغوب تھیں۔ وہ پلیٹ بھر ہری مرچیں کھا بھی سکتے تھے۔ وہ بسیار خور تھے اور ان کو کھاتے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کھانے سے لطف اندوز بھی ہورہے ہیں۔ اور بلاشبہ، وہ کسی بھی مقدار میں وہسکی پی سکتے تھے۔ کیا خوب انسان تھے وہ!''

اِروِن آئیون ایسٹرن فیڈرل یونین اور اس مستقبل میں ہونے والی ترقی پر اپنے نشانات چھوڑ گئے تھے۔ وہ لندن مسئلے کو حل تو نہیں کرسکے تھے مگر ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ ان کی وجہ سے ہی بورڈ آف ڈائریکٹرز کو اس مشکل کا صحیح ادراک ہوا تھا۔ یہی دوسری عالمی جنگ سے قبل کے اَلیانز کے اپنے پرانے ساتھی مسٹر ہائینز شوارز کو لے آئے تھے جن کی وجہ سے کمپنی کو تکنیکی اور انتظامی صلاحیتیں بھی حاصل ہوگئی تھیں۔ اور انھی کی بدولت لندن کے بروکروں کے بدلے دنیا کی سب سے بڑی ری انشورنش کمپنی، میونخ ری سے ای ایف یو کے رشتے استوار ہوگئے جو کمپنی کی مالیاتی نجات دہندہ بن کر سامنے آئی۔

اِروِن ۱۹۵۵ء میں ای ایف یو چھوڑ کر میونخ ری میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوگئے اور ۱۹۷۲ء تک وہیں کام کرتے رہے۔ میونخ ری میں ملازمت کے دوران ان کو کئی مہماتی ذمے داریوں کے ساتھ جنوبی افریقا اور ایران بھیجا گیا اور ہانگ کانگ میں کمپنی کے دفتر کی بنیاد رکھنے کے لیے جوان جیسے تجربے کار اور باصلاحیت انسان کے لیے حیرت انگیز کام تھا۔ ہانگ کانگ میں میونخ ری کا قیام بہت کامیاب رہا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اروِن آئیون میرے اتالیق کے مانند تھا اس لیے کہ وہی تھا جس نے مجھے ہیمبرگ سے ڈھونڈ نکالا تھا جب اس کی کمپنی، ای ایف یو کو ہائنز شوارز کا مناسب نعم البدل درکار تھا، جس کا ایک الگ خاکہ اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ تفاوتِ عمری کے باوجود ہمارا رشتہ دوستی سے کچھ زیادہ تھا۔ ہمارے تعلقات خاندانی نوعیت کے ہوگئے تھے اور یہ مارچ ۱۹۹۰ء تک قائم رہے تھے۔

آج بھی ایشیا کے بہت سے حصوں میں، بشمول پاکستان، ان کو ایک باصلاحیت انسان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ جس منظر میں بھی وہ ابھرتے اس پر چھا جاتے تھے۔ صرف اپنی درازقدی اور متاثر کن بُشرے ہی کہ وجہ سے نہیں، وہ دعوتوں میں، خواہ میونخ ہو یا کراچی، منیلا ہو یا تائپے، یا ہانگ کانگ وہ جس محفل میں ہوتے حاضرین کو محظوظ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بے شمار حیرت انگیز واقعات ان کے حافظے میں محفوظ تھے، اصلی بھی اور تصوراتی بھی۔ بڑی توانائی تھی اُن میں۔ دیر تک تھکا دینے والے رتجگے کے باوجود بھی وہ علی الصباح تر وتازہ نظر آتے تھے۔

کچھ دوستوں کے نزدیک، اور ان لوگوں کے لیے بھی جو اُن کو سخت گیر اور انا پرست سمجھتے تھے، وہ 'Hanseatic League کے معروف کردار Klaus Störtebeker کی مانند تھے۔ Störtebeker ان رہنماؤں کے جتھے میں سے تھا جن کو چودھویں صدی کے اواخر میں Vitalien Brotherhood کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ جتھا بحری تجار پر مشتمل تھا جس نے ۱۳۸۹ء سے ۱۳۹۵ء تک اسٹاک ہوم کے محاصرے کے دوران شہریوں کو خوراک اور دوسری ضروریات مہیا کی تھیں اور اپنی سیاسی مہم کے اختتام پر آخر میں سمندری قزاق بن گیا تھا۔ بڑے کامیاب تھے یہ لوگ، انگلستان کے کردار 'رابن ہڈ' کی طرح جو اپنی لوٹی ہوئی اشیا کا ایک حصہ غربا اور مساکین میں تقسیم کر دیتے تھے۔ شمالی 'لیگ' نے اپنے منتخب کپتانوں کو ان کی گرفتاری پر مامور کیا، ان کو پکڑا گیا اور ہمبرگ میں عوام کے سامنے، بھرے بازار میں Störtebeker اور اس کے ساتھیوں کے سر قلم کر دیے گئے تھے۔ سر قلم کرنے سے پہلے جب جلاّد نے حسبِ دستور Störtebeker سے اس کی آخری خواہش پوچھی تو اس نے کہا، ''میرے تمام ساتھیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دو جس میں پہلا شخص میں ہوں۔ اور جب میرا سر قلم کر دیا جائے تو قطار میں موجود جن لوگوں کے سامنے تک میں بغیر سر کے چل سکوں، ان کو معاف کر دیا جائے۔ داستان کے مطابق سر قلم ہونے کے بعد بھی Störtebeker قطار میں کھڑے سات افراد کے سامنے تک بغیر سر کے چلتا گیا۔ ان سات افراد کو معاف کر دیا گیا۔

میں نے ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ اروِن سی آئیون کو داستان کے اس کردار کے مماثل قرار دینا اچھا لگے گا، ہیمبرگ کے بزرگ اپنے ہر بچے کو، کسی نہ کسی مرحلے پر جس کی داستان ضرور سناتے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کو یہ خبر رہی ہوگی کہ کچھ لوگ اس کو اس خوب صورت کہانی کے مشہور ترین کردار جیسا سمجھتے تھے۔ یقیناً وہ اس کو سُن لیتا تو خوش ہوتا۔

خدا بخش

ای ایف یو لائف کے تین عظیم نمائندے جناب عالم، ڈاکٹر سعید خان، جناب خدا بخش

خدا بخش

بیمہ، زندگی جن کی زندگی کا مقصد تھا

وہ ایک حسین اور سنہری شام تھی جب خدا بخش مرحوم کے سب سے بڑے بیٹے ہمیں ڈھاکے کے ہوٹل سے رات کے کھانے کی دعوت پر لے جا رہے تھے، جورات شروع ہونے سے قبل ہی شروع ہونے والی تھی۔ ان کے ساتھ ان کی والدہ، یعنی میرے ساتھی خدا بخش مرحوم کی بیوہ بھی تھیں۔ یہ مارچ ۱۹۹۸ء کا واقعہ ہے۔ میں اور میری بیوی پینتیس برس سے زیادہ عرصے کے بعد اس خطے میں گئے تھے جواب بنگلہ دیش کے نام سے موسوم ہے۔ ای ایف یو میں ملازمت کے دوران ڈھاکے اور چاٹگام برابر آنا جانا رہتا تھا۔ بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے سے قبل جنرل اور لائف انشورنس دونوں کو جڑواں بچوں کی طرح ایک چھت کے نیچے کام کرتے دیکھنا کتنا اچھا لگتا تھا۔ کراچی کے مقابلے میں وہاں کا موسم بہت مختلف ہوتا تھا۔ موسمیات کے اعتبار ہی سے نہیں وہاں کے لوگ مختلف تھے اس لیے وہاں کا سیاسی موسم بھی مختلف ہوتا تھا۔ میں نے بنگالیوں کو بہت نرم دل پایا ہے، اپنی قوم کے دوسرے صوبوں، پنجاب اور سندھ کے لوگوں سے زیادہ ملنسار، مگر جلد بھڑک اُٹھنے والے۔ ان کے اطراف زود حسی کا ایک ہالہ سا ہوتا ہے جو کبھی تو ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے اور کبھی اتنا متوقع ہوتا ہے کہ ان پر پیار آنے لگتا ہے۔ ایک بنگالی کبھی ساکت نہیں بیٹھ سکتا، ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔ ان کے جسم کا کوئی نہ کوئی عضو متحرک ضرور ہوگا، ٹانگیں، ہاتھ یا اِدھر اُدھر دیکھنے والی، ہمیشہ کی سوالی آنکھیں۔ جتنے بنگالیوں سے میں واقف رہا ہوں ان میں سے بیشتر اس تعریف پر پورے اُتریں گے۔ اگر ان کے نزدیک یہ تعریف ایک گستاخی کے مترادف ہو تو میں سنجیدگی سے معافی کا خواستگار ہوں۔ یقیناً میں کبھی ایسا کرنا نہیں چاہوں گا۔ دراصل یہ کہہ کر میں بنگالیوں سے اپنی محبت اور پسندیدگی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ہندوستانیوں کی دانشورانہ اور سیاسی ترقی میں صدیوں اپنا کردار بحسن وخوبی انجام دیا ہے اور ان کو اس کا صلہ بھی دیا گیا ہے۔ مگر اکثر ان کو سستے وقتی فائدے پر اپنی خود داری کی قربانی دینے سے انکار پر بڑے نقصانات بھی اٹھانے پڑے ہیں۔

زبید الرحیم نے میرے دوست خدا بخش کی یاد تازہ کر دی تھی۔ وہی کاٹھی، وہی دوستانہ انداز اور ویسا ہی تبسم۔ جوں ہی آپ اس سے ملیں آپ کو احساس ہو جائے کہ اس شخص پر بھروسا کیا جا سکتا ہے، اور کسی تردّد کی ضرورت نہیں۔ حقیقتاً ایک پُرسکون سا احساس ہوتا ہے۔

میں نے ۱۹۶۰ء میں جب اس ادارے میں شرکت کی تھی ان کے والد ای ایف یو کے لائف ڈپارٹمنٹ کے سربراہ تھے۔ میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ ایک ممتاز سیلز مین تھے، جو زندگی کے بیمے کے خواب بھی دیکھتے تھے۔ لوگ کہتے تھے، وہ بیمے کے خبط میں مبتلا تھے۔ سراپا بنگالی، بوٹا سا قد مگر سب کے لیے بڑا سا دِل، خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو بیمے کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہ سکتے ہوں۔

جناب خدا بخش مشرقی بنگال کے ایک چھوٹے سے شہر فرید پور میں ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ اس شہر نے بہت سے مشہور لوگ

پیدا کیے ہیں، جن میں بنگلہ دیش کے بابائے قوم مجیب الرحمٰن بھی شامل تھے۔ خدا بخش کی ابتدائی زندگی اس علاقے کے ایک عام آدمی جیسی تھی۔ وہ ایک کم حیثیت گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد چاول کے گودام میں کام کرتے تھے اور ان کو اپنے پیشے میں کسی قسم کی ترقی کے مواقع نہیں ملے۔ خدا بخش کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں ہوئی تھی جہاں سے وہ سیکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ کے امتحان میں، ریاضی میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے تھے۔ مزید تعلیم کے لیے وہ کلکتے گئے، اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور وہیں سے مزید اسناد حاصل کیں۔ وہاں بھی وہ اوّل درجے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اعلیٰ درجے کی شہرت رکھنے والے پریزیڈینسی کالج میں داخلہ لیا مگر مزید اعلیٰ تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اس لیے کہ وہ شدید بیمار ہوگئے تھے۔ اس پورے عرصے میں وہ ایک متوسط طبقے کے بنگالی خاندان کے ساتھ، اجرت کے عوض، رہتے تھے۔ مگر بجائے نقد رقم ادا کرنے کے، ان کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اپنے غریب والد پر زیادہ مالی بوجھ نہیں ڈالا جن کی خود اپنی گزر بسر ہی مشکل سے ہوتی تھی۔ اگر ان کے والد کو ورثے میں کچھ زمین نہ ملتی جس کو بیچ کر وہ خدا بخش کی اعانت نہ کرتے تھے تو شاید ان کو اتنی تعلیم بھی میسر نہ آتی۔

اپنے اساتذہ کے مشورے پر انھوں نے پریزیڈینسی کالج کے کتب خانے میں دس ٹکا ماہانہ مشاہرے کی ملازمت اختیار کرلی، جو اس زمانے کے معیار سے بھی کوئی زیادہ تنخواہ نہیں تھی۔ وہ اکثر اپنے بچوں کو اپنے مشکل ایام کے حالات سناتے رہتے تھے اور اس میں انھیں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ کس درجے کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے انھیں کئی بار اپنے کارکنوں اور فیلڈ افسروں کو اپنے گھریلو حالات سناتے ہوئے دیکھا تھا، اور وہ اس پر بہت زور دیتے تھے کہ وہ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات سے سبق حاصل کریں اور مشکل حالات میں ہمت نہ ہاریں۔

انھوں نے کتب خانے میں اس وقت تک کام کیا جب تک کہ اس زمانے کی مشہور بیمہ کمپنی، اورینٹل گورنمنٹ سیکیورٹی لائف ایشورنس کمپنی میں ملازمت نہیں مل گئی تھی۔ یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے، جب ان کی عمر چوبیس برس کی تھی اور وہ پہلے مسلمان تھے جو اس کمپنی کی فیلڈ فورس میں شامل ہوئے تھے۔ ان کی تنخواہ اس وقت تیس ٹکا تھی، یعنی پچھلی تنخواہ کا تین سو فی صد۔ ان کے ایک اچھے دوست نے یہ مشورہ دیا تھا جس کا خیال تھا کہ جس انداز سے وہ لوگوں سے ملتے جلتے اور باتیں کرتے اور ترغیب دینے کی اعلیٰ درجے کی صلاحیت رکھتے تھے، وہ زندگی کے بیمے کی فروخت کے پیشے میں بہت کامیاب رہیں گے۔ اور ان کے دوست کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ خدا بخش اس کمپنی کے اعلیٰ درجے کے کامیاب سیلز مین بن گئے اور پاکستان ہجرت سے قبل سترہ برس تک اس ادارے میں کام کیا۔ انھوں نے ڈھاکے میں، جو مشرقی پاکستان کا دارالحکومت تھا، سکونت اختیار کی اور ایسٹرن فیڈرل یونین میں شامل ہوگئے۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ کمپنی کو ان دنوں لائف انشورنس کے ایک ایسے تجربے کار آدمی کی تلاش تھی جو مشرقی پاکستان میں بھی کمپنی کو انھی خطوط پر استوار کرسکے جس طرح وصال الدین نے ملک کے مغربی حصے میں کیا تھا۔ وہ کمپنی کے منیجر فار ایسٹ پاکستان مقرر ہوئے اور انھوں نے اس ادارے کو وہاں تقریباً ابتدا سے استوار کیا۔ اس وقت کمپنی کے ڈپٹی جنرل منیجر مسٹر اِروِن سی آئیون تھے جنھوں نے اپنے مشترکہ دوستوں کے سلسلے سے اس متحرک سیلز مین کو تلاش کیا اور اس کو اپنے ادارے میں لے آئے۔ بہت جلد ہی خدا بخش کا نام گھر گھر مشہور ہوگیا اور فطری طور پر جگہ خالی ہونے پر وہ EFU کے لائف ڈپارٹمنٹ کے سربراہ کے لیے موزوں ترین آدمی تھے۔ وہ ۱۹۵۹ء کے آس پاس کراچی آگئے تھے مگر انھوں نے ڈھاکے کا اپنا گھر نہیں چھوڑا تھا، جہاں ان کے اہلِ خانہ مقیم رہے۔ ان کی اہلیہ اکثر کراچی آتی تھیں۔ خدا بخش کو کراچی کبھی پسند نہیں آیا۔ یہاں انھوں نے خود کو ہمیشہ اجنبی محسوس کیا۔ مگر انھیں کوئی وقت محسوس نہیں ہوئی اس لیے کہ، ان کے بیٹے کے الفاظ میں، ”انھوں نے آدھی رات سے قبل شاید ہی کبھی کوٹ پتلون اتارے ہوں گے۔ ان کا یہ ہر روز کا معمول تھا۔ میں نے ان کو کبھی تھکا ہوا نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہ وہ اپنے کام میں الجھے رہتے تھے، اس کے بارے میں ہمیشہ گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ لائف انشورنس ان کی زندگی کا مشن تھا۔ وہ صحیح معنوں میں انشورنس کی مصنوعات پر

ایمان رکھتے تھے، انھوں بیمہ پالیسی کو کبھی صرف ایک معاشیاتی تجویز نہیں تصور کیا، جو بنیادی طور پر ایجنٹ کے لیے کمیشن کمانے کا ذریعہ ہوتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتبار سے وہ اور ان کے افسرِ اعلیٰ مسٹر بھیم جی ایک جیسے انسان تھے، ایک ہی جیسا سوچتے تھے۔ دونوں کی خواہش تھی کہ لائف انشورنس کا پیغام مشرقی اور مغربی پاکستان، دونوں کے کونے کونے تک پھیل جائے۔ دونوں کا ایقان تھا کہ اس طرح وہ ملک کے لیے سماجی خدمت کر رہے ہیں۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ اگر کسی کو کوئی شے فروخت کرنی ہو تو خود اس شے کے معیار پر یقین ہونا چاہیے اور اس پر بھی کہ خریدنے والے کو اس کی رقم کی پوری قیمت مل رہی ہے۔ میں نے اپنے کاروباری معاملات میں ہمیشہ ان کے مشورے پر عمل کیا ہے۔ انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اپنے پیشے میں، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو، کامیاب ہونے کے لیے ہر سطح پر ذاتی تعلقات استوار کرنے ہوتے ہیں۔ پیشہ ورانہ سطح پر انسانوں سے ذاتی رشتے قائم کرنا کامیابی کی کلید ہے۔ میں اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے صاف نظر آتا ہے کہ ان کا فیصلہ کن مشورہ میری کاروباری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔''

جناب معین الدین کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں جنرل منیجر کے عہدے پر ان کی بھی ترقی ہو گئی تھی۔ ایک جنرل انشورنس کا اور دوسرا ترقی پذیر لائف انشورنس کا سربراہ بنا۔ اس طرح ان کو ادارے کی انھوں نے جس کو اتنے بڑے کاروباری حجم کا اور مالیاتی اعتبار سے اتنا طاقتور بنا دیا تھا، اعلیٰ ترین خدمت کا صلہ مل گیا۔ اس وقت کمپنی سے میرا چل چلاؤ تھا مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں کتنا مطمئن اور خرم تھا جب اس فیصلے کا اعلان کیا گیا تھا۔

جسمانی طور پر منحنی ہونے کے باوجود کامیابی میں وہ بہت بڑے آدمی تھے اور انشورنس کے میدان میں ان کا نام بہت بڑا تھا۔ اپنے پیشے سے انھیں بے انتہا اُنس تھا اور وہ اپنی پوری استطاعت سے اس کی خدمت کرتے تھے۔ اپنی ظاہری ہیئت میں وہ سراپا انکسار تھے، اور ہمیشہ رہے جب کہ اپنی سادگی اور اپنے خلوص کے باعث وہ اپنی جسامت سے کہیں بڑے دکھائی دیتے تھے۔

ان سب خصوصیتوں کے باوجود بہکاوے کے لیے ان کے سامنے بہت سی ترغیبات تھیں۔ ای ایف یو کے لائف ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ہونے اور کمپنی کا اتنا بڑا بوجھ اٹھائے ہونے کے ناتے ان کے کاروباری قد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا، وہ بہت بڑے آدمی بن گئے تھے۔ وہ ایوب خان کی صدارت کا دور تھا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان تلخیوں کے باوجود دونوں کے کاروبار چل رہے تھے۔ عام طور پر ملک کا مشرقی بازو، مغربی سرمائے، اہم عہدوں وغیرہ کے معاملے میں اپنی حق تلفی کا ذمے دار مغربی بازو کو ٹھہراتا رہتا تھا، جو کسی حد تک درست بھی تھا۔ عوام کے مطابق ایوب خان ان حالات سے واقف تھے اور وہ ان حق تلفیوں کے ازالے کی کوششیں ضرور کرتے رہتے تھے۔ ایک بار جب اُنھیں وفاقی وزیرِ تجارت کے لیے کسی آدمی کی تلاش ہوئی تو اُن کے سامنے خدا بخش کا نام پیش کیا گیا تھا۔ ظاہرہ وجوہات کی بنا پر نہ صرف اس لیے کہ خدا بخش کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا، اتفاق سے وہ فرید پور جیسے چھوٹے سے ضلع سے بھی تعلق رکھتے تھے بلکہ وہ ایک ایماندار انسان کے طور پر مشہور بھی تھے۔ یہ ساری خصوصیات ان کو اس عہدے کے لیے مناسب ترین امیدوار کے طور پر پیش کرتی تھیں۔

جس شخص نے بھی ایوب خاں کو ان کا نام پیش کیا تھا اس نے غلط کام تو کیا تھا مگر صحیح وجوہات کی بنا پر۔ اس لیے کہ خدا بخش اگر کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے تو وہ یقیناً سیاست تھی۔ وہ بہادر آدمی تھے۔ ایوب خان سے ملاقات کے لیے اسلام آباد گئے۔ دورانِ ملاقات جب ان کو عہدے کی پیش کش کی گئی تو انھوں نے جواب دیا، ''جنابِ صدر، آپ غیر متوقع طور پر مجھے ایک بڑا اعزاز بخشنا چاہ رہے ہیں۔ اس کے لیے زندگی بھر میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ مگر مجھے آپ سے، اپنی تمام تر انکسار کے ساتھ یہ کہنا ہے کہ میرے نزدیک یہ ایسا کام نہیں جس کو میں قبول کرلوں۔ میں سیاست داں نہیں ہوں۔ اگر آپ مجھے معاف کریں تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ یہ ایک عارضی عہدہ ہے اور زندگی بھر میں نے ایسے عہدوں سے نفرت کی ہے۔'' ایوب خان نے ان کی بات کا بُرا نہیں مانا بلکہ ان سے پوچھا کہ ان کی نظر میں ایسا کوئی شخص ہے جو اس عہدے کے لیے موزوں ہو، خصوصاً فرید پور سے۔ خدا بخش نے اپنے ایک دوست جناب وحید الزماں کا نام پیش کیا، جن کو یہ عہدہ دے دیا

گیا۔ وحید الزماں صاحب نے نہ صرف یہ عہدہ قبول کرلیا بلکہ ایسٹرن فیڈرل یونین کے ایک بڑے کنونشن کی صدارت کرنا بھی قبول کرلیا۔

اس عظیم شخصیت کی ایک اور بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے کبھی اپنے صلاحیتوں کے بارے میں بڑا بول نہیں بولا۔ ظاہر ہے کہ ہم سب کو، جو ان کے ساتھیوں میں سے تھے، خدا بخش کی ایوب خان سے ملاقات کا علم نہیں تھا مگر ہم سب اس بات پر ضرور حیران تھے کہ وقت کا وزیرِ تجارت، کمپنی کے کنونشن کی صدارت کی کرسی سے، اپنے ابتدائی مدرسے کے ساتھی کے بارے میں اتنے اچھے الفاظ کیوں کہہ رہا ہے۔ ہم سب حیران تھے کہ وزیرِ باتدبیر، اس شخص کے مقابلے میں، جو کمپنی کے کاروبار کے 'شو' کے سب سے اہم اور بڑے کردار (روشن علی بھیم جی) کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی خدا بخش کی توصیف میں رطب اللسان کیوں ہے۔ وزارت کے منصب کو ٹھکرانا خدا بخش کے لیے اچھا ثابت ہوا کہ چند مہینے بعد ہی جنرل یحییٰ صدر بن گئے اور اگر انھوں نے اس کو قبول کرلیا ہوتا تو ان کے لیے یہ عہدہ واقعی کچھ زیادہ ہی عارضی ہوتا۔ ایوب خان نے اقتدار جنرل یحییٰ کو سونپ دیا تھا اور اس شخص (ذوالفقار علی بھٹو) کے لیے بلا واسطہ اقتدار کی راہیں ہموار کردی تھیں جس کو اپنے دورِ اقتدار میں انھوں نے بہت چڑھایا۔ ان وجوہ سے قطع نظر، خدا بخش اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ اس عہدے کے لیے موزوں نہیں تھے۔ ان کے قریب ترین ساتھی بھی خدا بخش کو سیاست میں، اور ان لوگوں سے جو اقتدار کے مرکز میں سرگرمِ عمل تھے، الجھتا دیکھ کر حیران ہوتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا بخش بڑی قوتِ ارادی کے مالک تھے۔ اور انھیں زندگی بھر اپنے بنگالی ہونے پر فخر رہا۔ وہ یہ بات ان لوگوں پر بھی واضح کردیا کرتے تھے جن کو ایسی باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کمپنی کی انتظامیہ کی ملاقاتوں میں بھی وہ کسی نہ کسی طرح ہمیشہ یہ پیغام دے دیتے تھے کہ ان کے اور بنگالی سیاست دانوں کے خیال کے مطابق، مِن حیث الکل پاکستان کی ترقی میں مشرقی پاکستان کے بڑے حصے کا واضح اعتراف کیا جانا چاہیے۔ کبھی کبھی وہ اس حد تک جذباتی ہوجاتے تھے کہ ان جیسے رتبے کے افسر سے اس کی توقع نہیں ہوتی تھی۔ یہ سب وہ جان بوجھ کر اپنے ذاتی جذبے اور عزم کے ساتھ کرتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے کسی مسئلے کو سیاسی رنگ دینے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ انھیں سیاست میں کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ میں ان کے اس انداز کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔

جب بھی مرکزی حکومت یا قومی اسمبلی میں سے کوئی مشرقی پاکستانی مسٹر بھیم جی سے ملاقات کے لیے آتا، ایسی ملاقاتوں میں خدا بخش ضرور شامل ہوتے تھے، جو اس بات پر فخر کرتے نظر آتے کہ آنے والا ان کے قبیلے کا فرد ہے۔ مگر انھوں نے ایسے ملاقاتیوں کے سامنے خود کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے اطراف ایک نوع کی آزادی اور عزتِ نفس کا ہالہ ضرور ہوتا تھا۔ وہ لوگوں سے اسی قسم کے احترام کی توقع بھی رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ان کو اپنی کوتاہ قامتی پر ملال بھی ہوجاتا تھا مگر انھیں اس بنا پر کمتری کا کبھی احساس نہیں ہوا، بس ذرا دلبرداشتہ ہوتے مگر پھر فوراً ہی بحال ہوجاتے۔ میں جس بات کو واضح کرنا چاہ رہا ہوں، اس کی بہترین مثال ایک واقعہ ہے جو ان کے بیٹے نے سنایا۔

''میرے والد پوری زندگی ایک منکسر المزاج انسان رہے، اس وقت بھی جب وہ عوام کی نظروں میں ایک اہم آدمی بن چکے تھے۔ وہ کبھی امیر آدمی نہیں بن سکے اس لیے کہ وہ بہت سے غریب لوگوں کفالت کا بوجھ اٹھائے رہتے تھے۔ وہ بہت فراخ دلی سے ایک اسکول کی امداد کرتے تھے۔ ان میں کوئی عیب نہیں تھا، انھوں نے کبھی سگریٹ تک نہیں پی۔ انھیں ہاکی اور سنیما سے شغل تھا۔ کبھی کبھی وہ نو بجے والا شو دیکھنے جاتے تھے، یا کوئی ہاکی کا میچ دیکھنے۔ انھیں مطالعے کا شوق بھی تھا، مگر انشورنس اور ایکچوری سے متعلق مضامین کی کتب کا۔ وہ بہت محبت کرنے والے باپ تھے، جس کی میں کئی مثالیں پیش کرسکتا ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ان کے انتقال کی صورت میں ایک بڑے انسان سے محروم ہوگیا ہوں۔ میں جو واقعہ بیان کرچاہ رہا تھا اب وہ سنیے۔ میں نے ڈھاکے میں مسلم کمرشل بینک میں ملازمت کرلی تھی۔ میرا دفتر دور نہیں، بالکل گلی کے نکڑ پر تھا، گلستان سنیما کے قریب۔ دوپہر کا وقت تھا، تقریباً ساڑھے چار بجے کا۔ اچانک وہ میرے دفتر کے دروازے پر کچھ چابیاں لیے کھڑے تھے۔ وہ چابیاں ایک بالکل نئی کار کی تھیں، جو دفتر کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ ان کا پورا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ انھوں نے مجھے چابیاں دیتے ہوئے کہا،'' بیٹا، یہ میری عزت کی خاطر ہے۔ تم اب اس کار پر دفتر آیا کروگے۔'' اس واقعے سے زندگی کے بارے میں ان کے اندازِ نظر کا

احساس ہوتا ہے، خلوص، بے غرضی جس سے وہ اپنے پیاروں سے اور قریبی لوگوں سے پیش آتے تھے۔''

۱۹۶۹ء میں ای ایف یو چھوڑ کر اپنی بیمہ کمپنی بنانے کا فیصلہ اس کمپنی کا بڑا نقصان تھا جس کی آبیاری میں ان کا بڑا کردار تھا، جس کو انھوں نے اتنے بڑے مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ کوئی دوسری کمپنی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی مگر یہ نئی قوم بنگلہ دیش کے لیے ایک بہت بڑا تحفہ تھا۔ بہت سے لوگ اس بات پر تعجب کا اظہار کر رہے تھے کہ ای ایف یو کا ایک بڑا باصلاحیت اور اعلیٰ افسر کمپنی کو چھوڑ کر کیوں جا رہا ہے۔ بازار میں اس سلسلے میں بہت سی خبریں گشت کر رہی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے دماغ میں کامیابی کا خناس سما گیا تھا کہ وہ اتنی عظمت اور اتنا عروج ہضم نہیں کر سکے جو ان بیجوں کا نتیجہ تھا جو ان کی زرخیز زمین میں اس درخشندہ ستارے نے بوئے تھے جس کو روشن علی بھیم جی کہتے ہیں، جو پاکستان میں بیمے کی صنعت کے 'ڈین' ہیں۔

ان کے بیٹے، زبید الرحیم کو ان کے والد کے دوستوں نے بتایا تھا کہ خدا بخش اور بھیم جی میں کمپنی کی سرمایہ کاری پر اختلافات ہوگئے تھے۔ ایک قطعۂ زمین کے بارے میں جو انھوں نے ڈھاکے میں کمپنی کے چیف ایگزیکٹو کی اجازت کے بغیر خرید لیا تھا۔ میں اس بات پر ہرگز یقین نہیں کر سکتا، نہ ہی میں اس پر کچھ کہنا چاہوں گا۔ بھیم جی مشرقی پاکستان کے لوگوں کے جذبات کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ راولپنڈی میں کمپنی کی مجوزہ عمارت مکمل ہوتے ہی ڈھاکے میں ایک نہایت خوب صورت عمارت تعمیر کی جائے گی۔ یہ ان کی دلی خواہش تھی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مغربی پاکستان کے مقابلے میں، بھیم جی مشرقی پاکستان کی اہم سیاسی شخصیات سے ہمیشہ زیادہ قریب رہے تھے۔ اس لیے ای ایف یو چھوڑنے کے سلسلے میں اس قسم کی افواہیں اڑانا بھیم جی کے ساتھ انصاف نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اہم لوگوں نے یہ سوچا ہوگا کہ جب وہ اس قابل تھے کہ پورے ملک کی تجارتی پالیسی کی رہنمائی کر سکتے تھے تو یقیناً وہ اس قابل رہے ہوں گے کہ خود وہ اپنی کمپنی کیوں نہ چلائیں جس کے وہ مالک و مختار ہوں گے۔

جو بھی وجوہات رہی ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۶۹ء میں فیڈرل لائف اینڈ جنرل انشورنس کمپنی نام کا ایک نیا ادارہ قائم کیا تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ای ایف یو سے علیحدگی کے بعد بھی خدا بخش نے کبھی ایسٹرن فیڈرل یونین یا مسٹر بھیم جی کے خلاف ایک لفظ بھی اپنے منھ سے نہیں نکالا۔ وہ برسوں ان کے معترف رہے تھے۔ ان کے بیٹے نے کہا کہ،''انھوں نے اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی، ای ایف یو چھوڑنے کی وجوہات بیان نہیں کیں جس کو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ جو کچھ وجوہات میں نے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے وہ ان باتوں پر مبنی ہیں جو میرے والد کے دوستوں نے مجھ بتائی تھیں، خود انھوں نے نہیں۔''

اس نئی کمپنی کا صدر دفتر ڈھاکے میں تھا۔ مشرقی پاکستان کے سات یا آٹھ سربرآوردہ صنعتی اور تجارتی افراد اس کے مددگار تھے۔ اس کمپنی نے بہت جلد کامیابی حاصل کر لی اور صرف پہلے سال کے کاروبار ہی سے حصص یافتگان کو منافع دینے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

بدقسمتی سے یہ خوش آئند کامیابی زیادہ دن نہیں چل سکی۔ مشرقی پاکستان کے حالات بگڑنے لگے اور بالآخر بنگلہ دیش بن گیا۔ بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے کر چار مختلف ادارے بنا دیے گئے، دو لائف انشورنس کے اور دو جنرل انشورنس کے۔ بنگلہ دیش کے بابائے قوم مجیب الرحمٰن، جن سے خدا بخش کی بچپنے سے شناسائی تھی، کہ وہ بھی فرید پور ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ مجیب الرحمٰن نے خدا بخش سے ملک میں بیمے کی صنعت کے مستقبل کے بارے میں مشورے کیے اور ان چار میں سے ایک ادارے کا چیئرمین بنا دیا تھا۔

دو برس بعد یہ محسوس کیا گیا کہ ادارے بہت زیادہ ہوگئے تھے۔ اس لیے دو اداروں کو بند کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ چوں کی خدا بخش سب سے تجربے کار افسر تھے اس لیے وہی لائف کے ادارے 'جیون بیمہ' کے مینیجنگ ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ یہ واقعہ ۱۳ رمئی ۱۹۷۲ء کا تھا۔ ٹھیک ایک برس بعد، یعنی ۱۳ مئی ۱۹۷۳ء کو وہ اپنے دفتر میں بیمار ہوئے۔ فوراً ان کو اسپتال داخل کر دیا گیا۔ کچھ دن اسپتال رہ کر ان کی صحت بہتر ہو گئی تھی۔ مگر ۳۰ رمئی کو انھیں بڑا خطرناک دل کا دورہ پڑا اور اسی روز، صرف باسٹھ برس کی عمر میں وہ انتقال کر گئے۔ اس طرح انھیں اپنی

کارکردگی کے نتائج دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ملک کے اخباروں اور رسائل میں ان کی موت پر لمبے لمبے تعزیت نامے شائع ہوئے۔ ان کو بنگلہ دیش کی مٹی سے پیدا ہونے والے مشہور فرزندوں میں سے ایک گردانا گیا۔ اعزاز کے طور پر ڈھاکا انشورنس انسٹی ٹیوٹ میں ان کی ایک تصویر آویزاں کی گئی ہے۔ لوگ آج بھی ان کو اچھے اور محترم الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ ان کے بیٹے کو اپنے باپ پر بجا طور پر فخر ہے۔ جب وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں، حکومت کے ارکان، سرکاری افسران اور کاروباری مالداروں سے، بر سبیلِ تذکرہ کہتے ہیں کہ وہ خدا بخش کے بیٹے ہیں تو لوگ اپنی کرسیوں سے اچھل پڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے والد کتنے زبردست آدمی تھی جنھوں نے ملک کی اس وقت بھی خدمت کی تھی جب اس کا ایک قوم کی حیثیت سے وجود نہیں تھا۔ اور لوگ ان کے باپ کے حوالے سے ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کیا اس جیسی انسانی روح کے لیے اس سے بہتر لوحِ مزار ہو سکتی ہے؟

ایس ایم معین الدین صدر یحییٰ خان سے اعزاز وصول کررہے ہیں

جناب معین الدین اوران کی اہلیہ سعودی عرب کے سفیر کے ساتھ

ایس ایم معین الدین، گوہر ایوب کے دفتر میں گندھارا انڈسٹریز کے ساتھ گروپ انشورنس کے معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے، شرافت علی والا جاہی بھی تصویر میں موجود ہیں

ایم جعفری ایک تقریب میں ایس ایم معین الدین کا استقبال کرتے ہوئے

ایس ایم معین الدین

ایک سچا دوست

اس شخصیت کے خاکے کی بھلا کیسے ابتدا کی جائے جس کی بیٹیاں اپنے مرحوم باپ کو اپنی زندگی کا ہیرو سمجھتی ہوں، ایسی شخصیت جو ایک حیرت انگیز یادگار کی طرح آسمان پر محیط ہو، جو اُن کے قول کے مطابق، اپنی بلندیوں سے کبھی نہیں گرا۔ ایسے آدمی نے یقیناً ایک کامیاب گھریلو زندگی گزاری ہوگی۔ زیادہ نہیں تو کم سے کم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی انسان تھے۔

جی ہاں! معین بھائی، جیسا کہ ان کے دوست انھیں کہہ کر پکارتے تھے، ایک حیرت انگیز انسان تھے، جن کی شخصیت تمام تر گرمجوشی، دوست داری، ہوشیاری اور زیرکی کے خمیر سے اُٹھی تھی، ہندوستان کی زمیں نے جس کو پیدا کیا۔ نہ وہ دانشور تھے نہ انھیں عسکری سائنسی تحقیق کا آدمی کہا جاسکتا تھا مگر قدرت نے ان کو مشکل اور ناممکن حالات میں سے بھی بچ نکلنے کی فطرتی صلاحیتوں سے خوب نوازا تھا۔ ان کے نزدیک 'ناممکن' جیسے لفظ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ دوستی کے لیے ایک دل چسپ انسان مگر ایسے کہ ان کو اپنا دشمن بناتے پر کوئی تیار نہ ہوگا۔

میرے لیے یہ اعزاز کی بات تھی کہ معین بھائی مجھ سے اور میرے خاندان سے ہمیشہ دوست نوازی کے جذبے سے پیش آئے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ بہت لمحے گزارے تھے۔ ان کی سادگی، فطری جبلّت اور اسی نوع کی دوسری خصوصیتیں جیسے، غیروں کی مدد نقدی سے ہو یا کسی اور طرح، اُن کے امداد کے جذبے نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ معین نے ایک باکمال عورت سالماں، جو دس برس کے لگ بھگ ان سے عمر میں کم تھیں، شادی کی تھی۔ جن سے دونوں پیاری پیاری، یاسمین اور پروین پیدا ہوئیں، میرے دوست نے جن کو بڑی محبتوں سے پالا تھا۔ اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر معیار کی انھیں تعلیم دلائی۔ شادی کر کے دھڑکتے دل مگر فخر اور خوشی کے ساتھ اچھے گھرانوں کے حوالے کردیا۔ ان کے دامادوں میں سے ایک وکیل ہے اور دوسرا آنکھوں کے امراض کا ماہر ہے۔ میں اس سنہری اور خوب صورت صبح کو کبھی نہیں بھول سکتا جب ۱۰ر مارچ ۲۰۰۶ء کو ہم، یعنی میں اور میری اہلیہ، ان کے گھر 'وِنڈ کاسل' ملنے گئے تھے۔ میری اہلیہ چند دن قبل ہی کراچی آئی تھیں۔ بڑی بیٹی یاسمین کی انھیں دنوں شادی ہوئی تھی اور معین نے مجھے اور ایک جرمن جوڑے، پروفیسر ہان، جو ایک مشہور جرمن کیمسٹ تھے، اور ان کی اہلیہ کو غیر رسمی دعوت میں بلایا تھا۔ یہ دراصل میرے اور میری اہلیہ کے اعزاز میں ایک قسم کی خوش آمدید کی محفل تھی۔ پروفیسر ہان، پروفیسر سلیم الزماں صدیقی مرحوم کے قریبی ساتھی، اور تین کیمیائی اداروں کے بنیاد گزار تھے، دو عدد ہندوستان میں اور ایک پاکستان میں قائم کیے گئے تھے۔ پروفیسر ہان اور ان کی آسٹرین بیوی کراچی کی جرمن اسپیکنگ سوسائٹی میں بہت فعّال تھے اور اسی سلسلے سے ان سے ہماری ملاقات تھی۔ میں میری اہلیہ اور پاکستان کی کئی اہم شخصیات، مثلاً نیشنل بینک آف پاکستان کے ممتاز حسن، PICIC کے جناب عقیلی، جناب رنگون والا وغیرہ بھی پاکستان جرمن فورم میں کافی فعّال تھے۔ یہ بہت فعّال سماجی انجمن تھی جو میکلوڈ روڈ سے بہت قریب سِول لائنز میں بنائی گئی ایک عمارت میں تھی اور یہ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کی کرتا دھرتا بھی تھی۔

ہان خاندان معین الدین کے ساتھ بہادر آباد میں نئے بنگلے میں مقیم تھا۔ ہم لوگ سب خوش و خرم بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک لڑکی نے میری بیوی سے ساڑی پہننے کی فرمائش کر ڈالی جو اس کو شادی پر تحفے میں ملی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی میں چھوٹے سے خود بخود ہو جانے والے واقعات اہم ہو جاتے ہیں، اتنے اہم کہ ان کو زندگی بھر بھلایا نہیں جا سکتا، بس انھیں خوشی کے لمحات میں یاد کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی جب ہم ان پیاری پیاری تصویروں کو دیکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی خاص بات ہوگئی تھی کہ میری بیوی نے اچانک پاکستان کے ایک خوب صورت لباس کو زیبِ تن کر لیا تھا۔ ایسے ہی موقعوں پر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ معین کے جیسے گھرانوں سے ہماری ملاقات نہ ہوتی تو شاید اس برِصغیر میں ہمارا قیام مشکل ہو جاتا اور یہاں کی اصل روح سے ہم نابلد رہ جاتے۔

معین بھائی بھوپال کے ذرا اوسط سے بڑے درجے کے بہت با عزت گھرانے میں ۱۱ر جنوری ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ نو بھائی اور تین بہنوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش سے قبل ہی والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ ان کی والدہ جنھوں نے تنِ تنہا ان کی پرورش کی، بہت ہمت والی خاتون تھیں۔ ان کے بڑے بھائی بہن سب ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ معین بھائی بہت آسان بچے تھے، کبھی شرارت نہیں کی اور کم عمری ہی سے بہت سنجیدہ اور متوازن تھے۔ ان کے ایک بڑے بھائی ایس ایم مظہر الدین جو ان سے عمر میں بارہ برس بڑے تھے، ان کا بہت خیال رکھتے تھے اور وہی ان کی زندگی کے "گرو" تھے۔ جب میں معین کے بڑے بھائی سے ملا اُس وقت وہ نیشنل بینک آف پاکستان کے ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر تھے جو اس وقت ایک بہت بڑا عہدہ تھا۔ مگر وہ کسی پر کبھی افسرانہ رعب نہیں ڈالتے تھے۔ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح وہ بھی مختصر جثے کے، آہستہ رو مگر بہت گرم اور تیز گردش کرنے والی آنکھوں کے انسان تھے۔ بہت نرم دل تھے اور اپنے چھوٹے بھائی معین کا بہت خیال رکھتے تھے اور شاید انھوں نے ان کی مدد بھی کی ہوگی۔ مگر یہ رشتہ صرف باہمی احترام ہی سے نہیں کچھ لو اور کچھ دو کی سطح پر قائم تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ برادرِ خورد ہی ہمیشہ کچھ لینے کی منزل میں نہیں رہتے ہوں گے۔

اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد معین الدین نواب آف بھوپال کی حکومت میں ملازم ہو گئے اور مختلف محکموں میں کام کرتے رہے جس میں ریاست کی وزارتِ مالیات بھی شامل تھی۔ اپنی کم عمری ہی میں معین صاحب نے، جو اس وقت شاید جونیئر کلرک رہے ہوں گے، اپنے اندر ایسی خصوصیات اور صلاحیتیں پیدا کر لی ہوں گی کہ اس کی بنا پر بہت سنیئر اور بڑے عہدے کے افسران سے ان کی قربتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ معین صاحب میں کچھ خداداد صلاحیتیں اور عملی کیفیات تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ان کے افسران ان کو اپنے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی کہ بس وہی ان کے ہر قسم کے نازک اور مشکل کام کرنے اور مسائل سلجھانے کے قابل تھے۔ ان میں یہ خصوصیت بھی تھی کہ اپنے افسروں کے وہ اس وقت بھی ممنون اور وفادار رہتے تھے جب کہ سارا کام وہ کرتے تھے مگر نام ان کے افسروں کا ہوتا تھا۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ وہ تلوے چاٹنے والے انسانوں جیسے تھے، ہرگز نہیں۔ معین اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وہ وقت آئے گا جب اپنے افسروں کے ساتھ وہ بھی بلندیوں پر ہوں گے، اور یہ بھی کہ صرف ان کے ساتھ رہ کر ہی وہ رفعتوں کے زینے پر قدم رکھنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ اور ان جیسے لوگوں کے لیے ان دنوں یہ بہت مشکل کام تھا۔ اپنی ان ہی خصوصیات اور وفاداریوں کی وجہ سے وہ کے ایف حیدر جیسے افسر سے قریب ہوئے، جو ان دنوں نواب صاحب کی حکومت میں وزیرِ مالیات تھے۔ ان ہی کے حلقۂ دوستاں میں غلام محمد جیسے لوگوں سے ان کی جان پہچان ہوگئی تھی جو ایک مختصر عرصے کے لیے نواب صاحب کی حکومت میں شامل رہے تھے، ایسے کئی اور لوگ بھی تھے، جو بعد میں پاکستان میں بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ یہاں شاید یہ کہنا ضروری نہیں رہ گیا ہے کہ ایسے اہم لوگ جو ان سے واقف تھے، اور وہ بھی ان سب سے واقف ہوگئے تھے، جنھوں نے بہت برس بعد تک، معین الدین کی بہت مدد کی اور ان کو پاکستان میں پیر جمانے میں مدد فراہم کی تھی۔

ایسٹرن فیڈرل انشورنس کے ۱۹۳۲ء میں قیام کے بعد معین صاحب نے کمپنی کی بھوپال شاخ سے جز وقتی ایجنٹ کے طور پر کام کرنے کی خاطر لائسنس حاصل کرنے کی درخواست دے دی۔ اس طرح وہ اپنی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتے تھے۔ چوں کہ وہ کافی

لوگوں سے اپنے تعلقات استوار کر چکے تھے، وہ بہت کامیاب ایجنٹ بن گئے حالاں کہ وہ ایک جز وقتی ایجنٹ تھے۔ معین صاحب کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ جناب کے ایف حیدر سے ان کی جگری دوستی ہو چکی تھی، جو بعد میں اس ادارے کے مستقبل پر اثر انداز ہوئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ حیدر صاحب ہی کی وجہ سے معین صاحب نے بیمے کا کاروبار شروع کیا تھا۔

آزادی کے بعد معین الدین نے بھوپال چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور وہ ۱۹۴۹ء میں کراچی ہجرت کر گئے جو ای ایف یو کا صدر مقام تھا۔

معین الدین سے میری ملاقات کراچی پہنچنے کے فوراً بعد اس وقت ہوئی تھی جب میں پہلی بار ای ایف یو کے دفتر گیا تھا۔ حیدر صاحب نے ان سے اور دوسرے اعلیٰ افسروں سے میرا تعارف کرایا تھا۔ معین صاحب اس وقت کراچی کے ایجنسی سیکشن کے منیجر تھے۔ انھیں اپنی ملازمت پر فخر تھا جس کی بنا پر انھیں بیمے کی صنعت میں بہت شہرت نصیب ہوئی۔ میں اپنی ملاقات کے لیے خوب تیار ہو کر آیا تھا اس لیے کہ میرے گرو مسٹر آئیون، ڈپٹی جنرل منیجر مجھے سب کچھ بتا چکے تھے اور مجھے مشورہ دے چکے تھے کہ میں ان سے دوستی کر لوں۔ اور بہت جلد مجھے اس مشورے کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔

جناب معین الدین اپنی ذاتی خصوصیتوں اور اچھائیوں کی بنا پر لوگوں کی پسندیدہ شخصیت تھے۔ وہ ہرفن مولا بھی تھے اور اپنے بھائی کی بدولت جو نیشنل بینک میں بڑے افسر تھے، ملک کے ایک کامیاب سیلز مین بن چکے تھے۔ اتنے کامیاب کہ بالآخر وہ کمپنی کے جنرل بزنس کے جنرل منیجر بن گئے تھے۔

تکنیکی معاملات میں کمپنی کی تمام شاخوں کی دیکھ بھال کمپنی کے صدر دفتر سے کی جاتی تھی۔ دیکھ بھال سے مراد یہ ہے کہ کمپنی میں قبول کیے جانے والے کاروبار کو کمپنی کی 'انڈر رائٹنگ پالیسی'، اصولوں اور موجودہ 'ٹیرف' قوانین کے مطابق ہونا چاہیے۔ بڑے بڑے نقصانات کے معاوضوں پر بھی صدر دفتر کے مشورے ضروری تھے۔ یہ ذمے داری بہت دنوں تک شوارز کے کندھوں پر تھی جن کی جگہ میرا تقرر کیا گیا تھا۔ جب جناب کے ایف حیدر کمپنی کی ملازمت چھوڑ کر چلے گئے اور مسٹر بھیم جی نے زمامِ اقتدار سنبھالی تو میں جنرل ڈپارٹمنٹ کا سربراہ بن گیا۔

ہمارے جو قارئین بیمے کی صنعت کے انتظامی معاملات سے واقف نہ ہوں ان کی اطلاع کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ میں اور معین الدین دونوں ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت میں آ گئے تھے۔ میرا کام یہ تھا کہ میں ان جیسے لوگوں کی کارکردگی پر نظر رکھوں۔ اور بظاہر ان بنیادوں پر تو دیرپا دوستی استوار نہیں کی جا سکتی تھی۔

ہمارا معاملہ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ مختلف عہدوں اور عمر میں فرق کے باوجود، کمپنی کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے، ہماری دوستی بہترین رہی۔ کام کے سلسلے میں ہماری مسابقت سخت تھی۔ ابتدائی مشکلات تھیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہم نے متفقہ طور پر خود کچھ خطوط کھینچ رکھے تھے۔ مگر ہم نے ایک دوسرے کے مشورے کے بغیر ان خطوط کو پار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس صورتِ حال اور اس سے خود آگاہی کچھ اتنی آسان نہ تھی۔ اس لیے کہ ایک سیلز مین اگر فیصلہ کن عہدے پر متمکن ہو تو ہم دونوں کے درمیان تکنیکی، تعینِ قیمت اور بزنس کے حصول جیسے معاملات میں نظریاتی اختلاف کے تناؤ کی وجہ سے مشکلات ہوتی تھیں۔ اور جب تکنیکی معاملات کا ماہر غیر ملکی ہو تو اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے نتائج کس طرح کے نکل سکتے ہیں۔ مگر ہمارے درمیان ایسا کبھی نہیں، ایک بار بھی نہیں ہوا۔ اس کے لیے جناب روشن علی بھیم جی کو کھل کر سراہنا چاہیے کہ انھوں نے سب کو، روزِ اوّل سے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس قسم کے 'کھیل' میں وہ کبھی حصہ نہیں لیں گے۔ تاہم معین الدین کو بھی داد ملنی چاہیے کہ انھوں نے میرے قریب سے راہ بنانے یا مجھے نظر انداز کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

روزِ اوّل ہی سے ہمارے ذاتی تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔ مسٹر آئیون کی پیشین گوئی کے مطابق معین نے مجھے اپنے قریب آنے میں آسانی مہیا کی۔ کئی معنوں میں انھوں نے میری مدد بھی کی۔ انھوں نے اپنی قیام گاہ کا تعین کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا۔ اس سلسلے میں ہم نے

اپنی تحقیق کلفٹن کے علاقے تک محدود رکھی، جو ۱۹۶۰ء میں آج کے مقابلے میں بہت مختلف علاقہ تھا۔ ان دنوں یہ علاقہ ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا، کم آبادی، اور زیادہ تر غیرملکی سفارت خانوں سے آباد جہاں ان کے بیشتر کارکن بھی رہتے تھے۔ وہیں قمر کورٹ نامی عمارت میں مسٹر کے ایف حیدر کا فلیٹ بھی تھا۔ ای ایف یو کی ملازمت کے دوران اِرون بھی وہیں قیام پذیر تھے اور مسٹر شوارز بھی۔ کلفٹن کا علاقہ وہاں سے شروع ہوتا تھا جہاں سینٹ پیٹرک اسکول ہے۔ ان چھوٹے جزیروں جیسے علاقوں کے کراچی میں اہم شخصیات بھی رہتی تھیں، جن میں جناح صاحب اور نواب بھوپال کی ولی عہد صاحب زادی شہزادی عابدہ سلطان جیسے شخصیات شامل تھیں۔

معین بھائی کی سینٹرل ہوٹل کے مالکان سے اچھی ملاقات تھی۔ ان دنوں میٹروپول اور کراچی جیم خانہ کے درمیاں سینٹرل ہوٹل ایک بڑا کاروباری مرکز تھا۔ اس کی عمارت میں ہوائی سفر کی کمپنیاں اور کئی قسم کے تجارتی اداروں کے دفاتر تھے۔ اب یہ ہوٹل باقی نہیں رہا۔ مگر ۱۹۶۰ء میں یہ کراچی کے چار بڑے ہوٹلوں میں سے تھا۔ تین دوسرے ہوٹل تھے، میٹروپول، بیچ لگژری اور پیلس ہوٹل جس کی رات کی رنگینیاں 'Gourmet' میں بہار دکھلاتی تھیں جس میں شہزادی امینہ رقص کرتی تھیں اور اپنا دربار سجاتی تھیں۔ جب کوئی خاص شخصیت یا اہم گاہک آتا تھا تو ہم سب اس میں جایا کرتے تھے۔ یہ ہوٹل کاروباری حضرات اور غیرملکی مسافروں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ میں تقریباً تین ماہ تک اس ہوٹل میں مقیم رہا تھا، جب تک کہ میری اہلیہ کراچی نہیں پہنچ گئی تھیں۔ اس دوران، نگہبان کی حیثیت میں، میں پی ای سی ایچ سوسائٹی میں واقع ایک جرمن جوڑے کا فلیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جو تقریباً تین ماہ کے لیے جرمنی گیا ہوا تھا۔

سینٹرل ہوٹل میں میرا قیام یادگار رہا، جس پر ایک پوری کتاب تحریر کی جاسکتی ہے۔ جس میں دوسری عالمی جنگ کی اتھل پتھل اور تقسیم کی صورت میں ہندوستان میں آنے والی بڑی تبدیلیوں اور بے شمار لوگوں کے بے گھر ہوکر پاکستان نقل مکانی کی تصویر پیش کی جاسکتی ہے۔

'آرٹی' نامی ایک سفید فام روسی باشندہ ہوٹل کے ڈائننگ روم کا مہتمم تھا۔ وہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں سوویت فوجوں سے خائف ہوکر روس سے فرار ہوکر چین چلا گیا مگر جب ماؤزے تنگ نے شنگھائی کی طرف پیش قدمی کی تو وہ چین سے فرار ہوکر کراچی آبسا تھا۔ ان دنوں سفارت کار اور اونچی سوسائٹی کے افراد اُبھرتے ہوئے شہر کراچی کو بہت پسند کرتے تھے۔ آرٹی، دعوتوں اور تقریبات کے خوب صورت انتظام کے لیے بہت مشہور تھا اور یہاں کی اشرافیہ اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس کو مختلف مچھلیوں کو دھویں میں بسا کر پکانے میں ملکہ حاصل تھا، کراچی کے اُمرا جن کو بہت رغبت سے کھاتے تھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ 'آرٹی' نے کراچی میں اپنے حصے کا مصالحہ لگا کر اس کو بین الاقوامی درجہ دینے اور اپنی ایک شناخت حاصل کرنے میں بہت مدد کی تھی' تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

سینٹرل ہوٹل کے دوسرے مستقل قیام کرنے والے لوگوں میں فیلڈ برگ نامی جرمنی کا ایک بزرگ یہودی جوڑا بھی تھا۔ اس کے پاس جرمنی کی تاثری پینٹنگز کا ایک مجموعہ تھا جو وہ اپنے خاص اور نجی دوستوں کو دکھایا کرتا تھا۔ زیادہ تر خاکے بغیر فریم کے تھے جنھیں وہ اپنے چند سوٹ کیس میں اپنے کمرے کی چائنیز الماری کے اوپر رکھتا تھا۔ اس کی بیوی، جو ساٹھ کے پیٹے میں اور خاصی خوب صورت تھی، روزانہ ریڈیو پاکستان سے کلاسیکی مغربی موسیقی کا پروگرام پیش کرتی تھی۔

دوسرے لوگوں میں میرے دفتر کے ساتھی Raoul Dietl بھی تھے جنھیں میونخ ری کی جانب سے ای ایف یو کے لائف ڈپارٹمنٹ میں انتظامی امور کی نئے سرے سے، بین الاقوامی معیار کی، شیرازہ بندی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ان کی کچھ دن قبل ہی شادی ہوئی تھی۔ ان کی بیوی ایک ماہر پیانو بجانے والی پیشہ ور موسیقار تھیں۔ انھوں نے ریڈیو پاکستان کے کئی پروگراموں کی ترتیب کے سلسلے میں مسز فیلڈ برگ کی معاونت کی تھی۔ مسٹر کریم اور ان کے بھائی، جو سینٹرل ہوٹل کے مالک تھے، اس بین الاقوامی رنگ سے بہت شاداں تھے اور اپنے مسافر گاہکوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔

معین جانتے تھے کہ ان کے پرانے دوست کریم کا کلفٹن میں ایک بہت وسیع اور خوب صورت گھر تھا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس

میں ایک انیکسی (Annexe) بھی تھی جس میں نہ صرف موٹر گیراج بنے ہوئے تھے بلکہ اس کے اوپر ایک چھوٹا سا فلیٹ بھی تھا۔ یہ انیکسی کریم صاحب کے ہندوستان سے آنے والے دوست اور عزیز استعمال کیا کرتے تھے۔ مجھ سے بات کیے بغیر مہربان معین الدین نے کریم صاحب سے دریافت کیا کہ وہ اپنی انیکسی کو ان کے کسی جرمن دوست کو کرائے پر دینے پر رضا مند ہوں گے یا نہیں۔ اور پھر ایک صبح معین صاحب میرے پاس تشریف لائے اور انھوں اپنے چمکتے ہوئے اور مسکراہٹ سے مزین دل آویز چہرے کے ساتھ اعلان کیا کہ انھوں نے میرے لیے کلفٹن کے علاقے میں ایک بہت اچھی قیام گاہ ڈھونڈ لی ہے اور اگر ہمیں منظور ہو تو ہم اس میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ یہ جگہ ایک احاطے میں تھی جو ۹۰ کلفٹن سے متصل تھا۔ اسی جگہ میری بیوی جرمنی کے سفارت خانے میں کام بھی کرتی تھی۔ اس سے بہتر ہمارے لیے اور کیا ہو سکتا تھا۔ ہم اپنے دوست کے بہت شکر گزار ہوئے۔

ہمیں ایک ٹیلی فون کی ضرورت تھی جو ان دنوں پاکستان میں نایاب تھا۔ کیسے حاصل کیا جائے؟ معین سے پوچھو، وہ کوئی حل نکالیں گے! اپنی خوش دامن کو کرسمس کے موقعے پر جرمنی ٹرنک کال کرنی ہے؟ معین سے پوچھو، وہ ٹرنک ایکس چینج کے جنرل منیجر کے دوست ہیں، کوئی مسئلہ نہیں! انکم ٹیکس کے دفتر سے آپ کو تین سال بعد ملک سے باہر جانے کی راہداری کس نے دلائی؟ معین صاحب ایک افسر کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے، وہ دفتر سے ناظم آباد اپنے گھر جا چکا تھا، پسینے میں شرابور، ہانپتے کانپتے، اسے لائے اور دفتر کھلوا کر سرٹیفکیٹ دلوایا ورنہ فلائٹ چھوٹ جاتی! مختصراً یہ تھے ہمارے معین بھائی، ہر فن مولا!

معین صاحب مرحوم کی بڑی بیٹی یاسمین کہتی ہیں، ''وہ اپنے جاننے والوں میں بہت مشہور تھے، اس لیے کہ جو بھی سامنے آیا، خواہ وہ کوئی بھی ہو، اس کی مدد کی۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، بڑے سے بڑے آدمی سے عام انسان تک۔ لوگ ان کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ وہ ان کے اچھے دوست تھے، مشیر بھی اور بہی خواہ بھی۔ وہ بہتوں کے رازداں تھے، انھوں نے کسی کو بھی مایوس نہیں کیا۔ انھوں نے سماج کے ہر حلقے میں اپنا مقام بنایا تھا، صرف اپنے ماحول ہی میں نہیں۔ انھوں نے ہمیشہ لوگوں کو مطمئن اور خوش رکھنے کی کوشش کی۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ان کے دوست ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ وہ بہت محبت کرنے والے باپ بھی تھے۔ جب بھی میں اور میری بہن کسی مسئلے سے دوچار ہوتے، ہم ان کو اپنا رازدار بنا لیتے۔ انھیں کبھی ہلکا سا بھی شبہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہماری مشکل حل نہیں کر سکیں گے۔ ہم دونوں ان سے بہت قریب تھے اور ان سے رازداری کا سلسلہ ان کی زندگی کے آخر وقت تک جاری رہا۔ انھوں نے ہمیشہ ہماری رہنمائی کی۔''

معین بھائی گھر کی تینوں خواتین سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے، بیوی سالماں، اور دو بیٹیاں۔ انھیں اس بات پر فخر تھا کہ انھوں نے اپنی بیٹیوں کو، جہاں تک ممکن ہوا، بہترین تعلیم دلوائی ہے۔ جب بھی وہ ملک سے باہر جاتے، اپنے وقت کا لمحہ لمحہ اس میں گزارتے کہ وہ اپنے گھر کی پیاری خواتین کے لیے کیا تحفہ لے جائیں۔ ہم دونوں نے کئی بار ساتھ سفر کیا تھا اس لیے میں جانتا ہوں کہ اپنے گھر والوں کے لیے ان کے احساسات کیا تھے۔ ہم، میاں بیوی بھی، جو تین بیٹوں والے تھے، ان کے، اس قدر مہنگے مشغلے سے متاثر تھے۔ اور ہم جب بھی شہر سے باہر ہوتے تو دن میں کم از کم ایک بار گھر والوں سے فون پر بات ضرور کرتے۔

دوسری بیٹی پروین کہتی ہیں، ''ہندوستانی معیار کے اعتبار سے ہمارا ایک چھوٹا سا خاندان تھا، ماں باپ اور صرف دو بیٹیاں۔ مگر ہمارے والدین اتنی محبت کرنے والے تھے، ہماری پرورش میں اتنی دل چسپی لیتے تھے کہ ہمیں اس بات کا کبھی احساس بھی نہیں ہوا کہ بغیر بھائی کے ہمارا خاندان مکمل نہیں، جیسا کہ عام ہندوستانی خاندانوں میں ہوتا ہے اور ایک طرح کی مایوسی کا باعث ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ذہنوں میں اس قسم کے خیالات کبھی نہیں آئے۔ ہم ایک دوسرے پر بہت ناز کرتے تھے۔ میرے نزدیک ہمارے باپ ایک 'ہیرو' تھے جو اپنے بلند مقام سے کبھی نہیں گرے۔ ہمیں اچھی طرح علم ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہوں گے، اس وقت بھی جب وہ پاکستان سے باہر ہوتے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کس ٹیلی فون پر ملیں گے۔ اگر ان کے پروگرام میں کسی قسم کی تبدیلی ہوتی تو وہ ہمیں فوراً مطلع کر دیتے۔ اگرچہ ان کے بغیر

ہم خود کو تنہا محسوس کرتے، مگر چوں کہ وہ ہمیشہ ٹیلی فون پر مل سکتے تھے اس لیے ہمیں اطمینان ہوتا تھا۔"

معین بھائی ہر قسم کے دوست رکھتے تھے، ذاتی بھی اور کاروباری بھی۔ مشہور و معروف شخصیات، جیسے جنرل حبیب اللہ، ایر مارشل نور خاں، صدر ایوب کے بیٹے کیپٹن گوہر ایوب، جو ایک بڑے کاروباری اور صنعت کار تھے، اکثر ان کے گھر آتے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب ایسٹرن فیڈرل یونین ایک عظیم ادارہ بن چکی تھی، جس کے افسرانِ اعلیٰ میں ایس ایم معین الدین جیسے لوگ شامل تھے۔ وہ اس وقت ایک قومی ہیرو بن گئے تھے جب انھوں نے، راولپنڈی کے ریجنل منیجر کی وساطت اور انجیوری ساجد زاہد کی مدد سے، پوری پاکستانی فوج کا گروپ انشورنس کیا تھا۔ اس گروپ انشورنس کے طفیل کمپنی نے گروپ انشورنس کے ایک بڑے محکمے کی بنیاد رکھ دی تھی، اور بین الاقوامی سطح پر انشورنس کا ایک بڑا ادارہ بن کر ابھری تھی۔

ان کے لیے وہ ایک بڑے فخر کا مقام رہا ہوگا جب پاکستان کے صدر جنرل یحییٰ نے انشورنس کے میدان میں ان کی ممتاز خدمات پر ان کو اعزاز سے نوازا تھا۔

اٹھائیس برس گزر گئے ہیں جب ہمارے دوست معین الدین نے کراچی کے جناح اسپتال میں اپنے خالق کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنی زندگی کی آخری سانس لی تھی۔ میں اور میری اہلیہ ان کے گھر 'ونڈ کاسل' کے اسی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں ہم اپنے قریبی دوست معین کے ساتھ درجنوں بار بیٹھ چکے تھے، جب ہم کراچی میں مقیم تھے۔ اور وہ سب بھی وہیں تھے، ان کی بیوی سالماں، ان کی دونوں بیٹیاں، دونوں داماد، اور نواسے نواسیاں۔ سب ان سے محبت کے بندھن میں ایک ساتھ بندھے ہوئے!

ان کی بیٹی نے کہا، "سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارے لیے ہمارے والد ایک ہیرو کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج میں ایک ممتاز آنکھوں کے سرجن کی بیوی ہوں۔ وہ بین الاقوامی سطح پر جانے اور مانے جاتے ہیں۔ جب میں کسی پارٹی میں جاتی ہوں تو پروفیسر کرمانی کی بیوی کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اور لوگ مجھے ایسے معروف انسان کی اہلیہ ہونے پر مبارک باد دیتے ہیں۔ اور پھر فوراً کئی مریضوں کے نام لینے لگتے ہیں، میرے شوہر نے جن کی آنکھوں کے آپریشن کیے ہوتے ہیں۔ یقین کیجیے کہ جب میں لوگوں کو بتاتی ہوں کہ میں جناب ایس ایم معین الدین کی بیٹی ہوں تو لوگ احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور آج بھی میرے دل میں اپنے والد کے لیے شکر کے جذبات موجزن ہیں۔ اور یہی وراثت ہے جو میرے والد نے اپنے پیچھے چھوڑی ہے۔ ایک اچھا نام - ایک نام ہم جس پر بہت، بہت فخر کرتے ہیں۔"

۱۹۶۰ء میں ایچ ڈبلیو شوارز کے اعزاز میں الوداعی تقریب، دائیں جانب کی آخری نشست پر مسٹر شوارز، اگلی نشست پر ان کے جانشین، مصنف اور حبیب انشورنس کمپنی کے جنرل منیجر محمد صاحب تشریف فرما ہیں

ھائنز شوارز

روشنی کا مینار

اس انسان کے ذکر کے بغیر یہ کتاب کبھی لکھی نہیں جاسکتی تھی۔ کیوں؟ میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا۔

اس کتاب کی جڑیں ۱۲/اکتوبر ۱۹۵۱ء تک پہنچتی ہیں، اس دن تک جب ہائنز شوارز ایسٹرن فیڈرل یونین میں افسر بکارِ خاص کی حیثیت سے، نو برس کے لیے، کراچی میں متعین کیے گئے تھے۔ اس وقت یہ ایک طویل سفر تھا۔ اور اگر چہ وہ عالمی جنگ میں چھ سال کے طویل تلخ تجربے سے گزر چکے تھے، ان کے دل و دماغ بھڑکتے ہوئے جذبات سے لبریز اور ذہن اس ادھیڑ بن مین الجھا ہوا تھا اب کہ ان کا ذاتی مستقبل کیسا ہوگا؟ وہ ایک کھنڈر، راکھ کے ڈھیر ملک، بیوی 'گالینا' ماں اور دو بہنوں، سب کو برلن میں چھوڑ کر آرہے تھے۔ برلن کبھی ایک طاقتور ملک کا شان دار دارالحکومت تھا مگر آج وہ جنگ کی فاتح اُن طاقتوں کے درمیان تقسیم تھا جو 'مشرق و مغرب' کے درمیان ایک 'سرد جنگ' میں مصروف تھیں۔

اس انسان کی زندگی کا مجھ سے، یعنی اس کتاب کے مصنف سے، کیا رشتہ ہے؟ اس کتاب کے بیشتر قاری اس سوال کے جواب سے واقف ہوں گے۔ اور جو نہیں جانتے، ان کے لیے ایک مختصر سا جواب یہ ہے کہ میں اس کا جانشین تھا۔ اس ہی کی طرح میں بھی، جذبات سے بھر پور اور توقعات سے لبریز دل و دماغ کے ساتھ اس نوزائیدہ ملک میں صرف نو برس بعد وارد ہوا تھا۔ اس کا اور میرا ملک جرمنی ڈرامائی تبدیلیوں سے گزر چکا تھا۔ شکستہ در و دیوار گرائے جا چکے تھے، جلے ہوئے نشیمن کی راکھ صاف کی جا چکی تھی، اور ایک نئی قوم دوبارہ ابھر رہی تھی۔ ایک ملک جو، پاکستان کی طرح، امیدوں اور توقعات سے لبریز تھا مگر انسانوں کے خاندان میں اپنا مقام حاصل کرنے کی جد و جہد میں مصروف تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دنیا کے پاس اسے دینے کے لیے کیا تھا، جب کہ وہ، نو برس کے عرصے کے بعد، اپنی نسل کے دوسرے لوگوں کی طرح، جو جنگ کی ہولناکیوں سے بچ گئے تھے، خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ ایک معذور ملک پھر کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے گا۔

اب، نو برس بعد، واپسی پر وہ ایک ایسی قوم اور اس کے افراد کے سامنے کھڑا ہوگا جو اس کے لیے اجنبی ہوں گے۔ مسز آئیون، بیوی، بیٹی اور تحسین احمد ہوائی اڈّے پر اس کے منتظر ہوں گے۔ مسٹر شوارز کے قیام کا انتظام تاج ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ جہان ان کا قیام ان کی اہلیہ کی آمد تک رہنا تھا جو اگلے برس، یعنی ۱۹۵۲ء میں آنے والی تھیں۔

اس زمانے میں کراچی بالکل ہی مختلف شہر تھا۔ اس کا رقبہ بہت کم اور آبادی پندرہ لاکھ تھی، جب کہ آزادی سے پہلے یہاں صرف چار لاکھ افراد بستے تھے۔

پاکستان کا دارالحکومت بنائے جانے کے بعد صرف چار برس کے عرصے میں اس شہر میں ڈرامائی تبدیلیاں ہوگئیں تھیں۔ ۱۹۴۸ء

سے قبل کراچی جنوبی ایشیا کا بہترین انداز میں رکھا گیا شہر مشہور تھا۔ اس میں جتنی تبدیلیاں ان چند برسوں میں ہوئیں تھیں، شاید دنیا کا کوئی شہر ان کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ آج اس کی آبادی کا تخمینہ ایک کروڑ لگایا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے تخمینے کے مطابق ۲۰۱۵ء تک اس کا شمار دنیا کے دو کروڑ آبادی والے پانچ بڑے شہروں میں ہوگا۔ اس طول وعرض کی ترقی، ترقی ہوتے ہوئے بھی خوف ناک لگتی ہے۔ اسی طرح جیسے کہ اس کے اصل باسیوں کو، تقسیم ہند کے بعد، اس وقت لگی ہوگی جب لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین پناہ کے طالب ان کے دروازوں پر کھڑے رہے ہوں گے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے کراچی مواقع فراہم کرنے والا شہر رہا ہے۔ بہت سے آنے والوں نے اس شہر سے اگر کچھ حاصل کیا ہے تو اس کو کچھ دیا بھی ہے، جذبے، بلند عزائم، تجارتی اور صنعتی عزائم وغیرہ جن پر اس بڑے شہر، اور اس ملک کے صنعتی اور مالیاتی مرکز کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں۔

مسٹر شوارز کو اس شہر میں قیام کی کوشش میں وہی دشواریاں پیش آئی ہوں گی جیسی کہ ابتدائی دنوں میں ریاست ہائے متحدہ امریکا میں سونے کی تلاش میں آنے والوں کے سامنے تھیں۔ وہ لوگ بھی تو امکانات کی نئی سرزمین پر نئی جنت کی تلاش میں جوق در جوق آئے تھے۔ ہجرت کر کے کراچی آنے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ آدمجی، داؤد اور رنگون والا، جیسے پیش قدم صنعتکار، تجار اور نت نئے اداروں کی بنیاد رکھنے والوں نے اپنے کارخانے قائم کیے۔ اپنے حبیب، اصفہانی وغیرہم نے اپنے بینکوں، بڑی بڑی انشورنس کمپنیوں کے دفاتر بمبئی، کلکتے سے کراچی منتقل کیے۔ بے شک ان میں مقامی اور غیر ملکی قسمت آزمائی کرنے والے بھی رہے ہوں گے جن کے ارادے پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گویا کراچی، خصوصاً اس زمانے میں، ایک ایسی بھٹی کے مماثل تھا جس میں کود کر ہر قسم، ہر رنگ، ہر نسل، ہر تہذیب، ہر مذہب اور ہر انداز کے لوگ ایک نئی دنیا ایجاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہوٹلوں میں کمرے مشکل سے ملتے تھے۔ اور شوارز جیسی قسمت کے لوگوں کو کمروں کی جگہ صرف ایک بستر مل جایا کرتا تھا۔ شوارز کو ایک چھوٹے سے کمرے میں، ایک ہندوستانی سفارت کار کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ ہندوستانی سفارت پیرس میں رہ کر کچھ فرانسیسی سیکھ چکا تھا۔ شوارز کو فرانسیسی زبان آتی تھی۔ تو ان کے درمیان تبادلے کا ایک معاہدہ سا ہوگیا تھا۔ شوارز سفارت کار کو فرانسیسی سکھاتا تھا تو سفارت کار شوارز کی انگریزی درست کرتا تھا۔ اس طرح دونوں کو سہولت بھی ہوگئی تھی۔ صفائی کا معیار بہت خراب تھا، بس بنیادی درجے کی جھاڑ پونچھ ممکن تھی۔ مگر کراچی کے رنگ بھرے ماحول اور بازار نئے آنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتے تھے۔ شوارز ای ایف یو کے صدر دفتر، قمر ہاؤس، میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں بہت پُر امید تھا۔

شوارز کا افسر، آئیون جرمن بھی تھا اور اس ملازمت سے قبل آلیانز انشورنس کمپنی میں کام بھی کر چکا تھا اس لیے ان دونوں میں جلد ہی دوستی ہوگئی۔ شہر میں جرمن سفارت کار بھی مقیم تھے۔ کمپنی کے بڑے حصے دار اصفہانی خاندان سے بھی شوارز کی دوستی بڑھی، جو جنگ اور آزادی کے بعد سے، آئیون جیسے تجربے کار غیر ملکیوں کو اس ملک میں لانے میں آگے آگے تھے۔ شوارز ایک اچھا اضافہ تھا۔

شوارز اور آئیون دونوں آلیانز انشورنش کے فارن ڈیپارٹمنٹ کے دنوں کے ساتھی تھے۔ یہ محکمہ اس لیے بند کر دیا گیا تھا کہ جنگ کی فاتح طاقتوں نے ایک حکم کے ذریعے آلیانز اور دوسری بیمہ کمپنیوں پر غیر ملک میں جرمنوں کو تعینات کرنے پر پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ شوارز جنگ سے قبل ہی سے جرمنی کی فوج میں بھرتی ہوگیا تھا اور جنگ کے اختتام کے وقت وہ فرسٹ لفٹیننٹ تھا۔ میدانِ جنگ سے واپسی پر اس نے انجینئر بننے کے لیے برلن میں سِوِل انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہیں اس کی ملاقات آئیون سے ہوئی تھی جو خود بھی انجینئر تھا۔

شوارز برلن کے متوسط طبقے کے ایک جرمن گھرانے میں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ اسی شہر میں اس کی ابتدائی تعلیم ہوئی تھی۔ پرانی اور نئی صدیوں کے سنگم پر عام لوگوں کی طرح شوارز کے باپ کا بھی کسان خاندان سے تعلق تھا۔ وہ پہلی عالمی جنگ کے دوران شاہی فوج کے چیف آف اسٹاف کا خدمت گزار رہ چکا تھا۔ کئی برس تک اس نے جرمنی کے ایک شہزادے کی بھی خدمت گزاری کی تھی۔ اس کا خاندان

Hanseatic شہر ہیمبرگ کے Rupertis کا تھا اور اس کی نہایت خوب صورت اور خراج ماں کا تعلق بلجیم سے تھا جس کے گھر والے برلن میں بس گئے تھے اور شوارز خاندان سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ وہ برلن میں بس گئے تھے اور شوارز خاندان کی زندگیوں میں بہت کام آئے۔ انھوں نے اس کے والد کو جرمنی کے مشہور ڈپارٹمینٹل اسٹور Wertheimer میں ملازمت دلا دی جو بیسویں صدی کے اوائل میں ایک کارِ مشکل تھا اور مسز روپرٹی نے نوجوان شوارز کو نہ صرف اپنی مادری زبان، فرانسیسی میں ماہر بنا دیا تھا بلکہ اس کو جرمنی کی سب سے بڑی انشورنس کمپنی اَلیانز میں زیرِ تربیت افسر کی حیثیت سے بھرتی کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کا بیٹا Dr Ernst Justus Ruperti ان دنوں کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں تھا اور غیر ملکی کاروبار کا ذمے دار تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مسٹر اروِن سی آئیون، جن کا پہلے ذکر آچکا ہے، بنکاک میں ایک جرمن تجارتی کمپنی میں کچھ دن کام کرنے کے بعد اَلیانز کے رنگون میں نمائندے بنا دیے گئے تھے۔ اروِن اور ہائنز دونوں کشتی رانی کے بہت شوقین تھے اور دونوں کمپنی کے بوٹ کلب میں ملاقاتوں کے ذریعے ایک دوسرے سے واقف ہوگئے تھے۔ مگر دونوں ایک دوسرے سے ۱۹۳۶ء میں علیحدہ ہوگئے اس لیے کہ اروِن کو تربیت کے سلسلے میں بمبئی بھیج دیا گیا تھا۔ تین برس کی تربیت کے بعد مسٹر شوارز نے کامیابی سے برلن چیمبر آف ٹریڈ اینڈ کامرس کے امتحانات پاس کر لیے اور کمپنی کے غیر ملکی کاروبار کے ڈپارٹمنٹ میں کام شروع کر دیا۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں رضاکارانہ طور پر جرمن فوج میں کیڈٹ بننے کی پیش کش کردی۔ اسے اس کا گمان تک نہ تھا کہ ان کی یہ ذمے داری آٹھ برس کے طویل عرصے تک چلے گی۔ اسے اس بات کی بھی توقع نہیں تھی کہ وہ اس وقت کی فاتح فوجوں کے ساتھ فرانس جا پہنچے گا جہاں فرانسیسی زبان میں اس کی مہارت اس کے اعلیٰ افسروں کی نظروں میں اس کا وقار بلند کردے گی۔ جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے، روسی علاقوں پر چڑھائی کے سلسلے میں جرمن فوجوں کی مہم ناکام ہوئی، اسٹالن گراڈ جرمن فوجوں کی شکست کی علامت بن گیا اور Third Reich مکمل تباہی سے دوچار ہوئی۔ ہائنز شوارز کے لیے روسی علاقوں میں داخل ہوجانے کے عمل سے اس مستقبل کی زندگی پر بہت گہرا اور فیصلہ کن اثر پڑا۔ اپنی بیوی گالینا سے اس کی ملاقات ہوئی جو روسی سمفنی آرکسٹرا کے کنڈکٹر کی بیٹی تھی۔ گالینا کا باپ آسٹریا سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے ایک روسی لڑکی سے شادی کی تھی جس سے گالینا پیدا ہوئی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں آرکسٹرا کنڈکٹر کو، کسی جرم، کسی الزام یا کسی مقدمے کے بغیر روسی فوجوں کے جاسوس محکمے نے قید کرلیا، اور پھر وہ کبھی، زندہ یا مُردہ کہیں نہیں دیکھا گیا۔ بس وہ غائب کردیا گیا تھا، بالکل اُسی طرح جیسے اسٹالن کے دورِ اقتدار میں روس کے ہزاروں، لاکھوں تعلیم یافتہ افراد روئے زمیں سے غائب کردیے گئے تھے۔ اور یہ بار بار ہوتا رہا تھا۔ سوویت اقتدار کے ظلم کا نشانہ گالینا اور اس کی ماں کا روسی علاقوں پر قابض جرمن فوجوں نے خاص خیال رکھا اور گالینا نے ان کے لیے ترجمانی کے فرائض ادا کرنے شروع کردیے، حالاں کہ وہ اعلیٰ درجے کی موسیقار بھی تھی، اور باقاعدہ موسیقی کے اسکول سے پیانو بجانے کی تربیت بھی حاصل کرچکی تھی۔ جب جرمن قابض فوجوں کو پسپا ہونا پڑا تو ہائنز شوارز نے دونوں کو اپنی بیوہ ماں اور دو بہنوں کے پاس برلن بھیج دیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد شوارز اور گالینا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

ہائنز شوارز ایک 'فریب خوردہ نسل' سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک نوجوان لڑکے کی حیثیت میں اس نے ایک شکست خوردہ قوم پر پڑنے والے خوف ناک اثرات کو دیکھا تھا، ایک پھلتی پھولتی اور صحت مند معیشت کے زوال کا مشاہدہ کیا تھا اور اسے ایسے خوف ناک افراطِ زر کا تجربہ ہوا تھا جیسا صنعتی دنیا کی نظر سے کبھی نہیں گزرا تھا۔ اس نے آسمان کو چھوتی ہوئی بے روزگاری، چور بازار معیشت کا ظہور، اور ہر لحہ بڑھتے ہوئے جرائم کا وہ حال دیکھا تھا جس نے ہٹلر کی سیاسی جماعت NSDAP اور Third Reich کو جرمنی میں اقتدار کے سنگھاسن پر براجمان کردیا تھا۔

اگرچہ شوارز خود کسی سیاسی جماعت کا رُکن نہیں تھا مگر اپنی نسل کی اکثریت کی طرح اس بات پر اس کا بھی ایقان تھا کہ نئے حاکم ایڈولف ہٹلر کی اقتدار پر موجودگی میں اس کے ملک کا مستقبل محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اپنے ہم عصر سیکڑوں لوگوں کی طرح وہ بھی 'فیوہرر' کا

پیروکار تھا۔ اس کو بھی اس بات کا یقین تھا کہ ہم لوگ اپنے بڑے دشمنوں سے جو جنگ لڑ رہے ہیں وہ حق کے لیے ہے۔ وہ دوسرے صف آرا لوگوں کی طرح یہ نہیں سوچتا تھا کہ جرمنوں کو ان کا رہنما اپنے ذاتی مفاد اور اقتدار کے تحفظ کے لیے توپوں کا ایندھن بنا رہا تھا تاکہ اپنی قوم اور اس کی معاشی برتری کے لیے فتح حاصل کی جاسکے۔ اس کی نسل نے اپنی عمر کا بہترین حصہ، اس بات پر غور کیے بغیر کہ سرحدوں کے پار کیا ہو رہا ہے، خندقوں اور مورچوں میں ضائع کر دیا تھا۔ اور جب جنگ ختم ہوئی اور غبار صاف ہوا تو ان کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا جس پر وہ فخر کر سکتے۔ ان کے زیادہ تر دوست اور اسکول کے ساتھی موت کے گھاٹ اتر چکے تھے یا پھر سائبیریا میں جنگی قیدی بنا لیے گئے تھے۔ جو اس ذلت سے بچ گئے تھے، ان میں بہت سے جسمانی یا ذہنی طور پر معذور ہو چکے تھے۔ اور جہاں تک میری نسل، یعنی دس سے پندرہ برس کے افراد کا سوال تھا، تو وہ بھی یک گونہ مایوسی کا شکار تھے، بھٹکے ہوئے تھے۔ اور جن لوگوں نے جنگی محاذوں پر اپنی جانیں خطرے میں ڈالی تھیں ان کو بھی اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا اور نہ اُن میں یہ ہمت رہ گئی تھی کہ وہ اخلاقی اور دانشورانہ طور پر خود کو نئی راہوں پر ڈال سکیں۔

اکثریت کی طرح شوارز نے بھی سب کچھ پیچھے چھوڑ کر گزرے ہوئے پندرہ برسوں کو بھلا دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں کے استعمال سے نئے تقاضوں کو قبول کر لیا تھا اور نئے جذبے کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کا خواہاں تھا۔ اس کی پیشہ ورانہ مہارت کی وجہ سے ای ایف یو کے کارکن اس کو اسی طرح پسند کرتے تھے جیسے کہ انشورنس اور انشورنس کے حلقے کے باہر کے لوگ اس کا احترام کرتے تھے۔ وہ بہت نرم خو، نرم کلام اور گرم جوشی کا حامل انسان تھا اور اپنے ساتھی کارکنوں کی بھلائی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس نے اپنی اعلیٰ درجے کی صلاحیتوں کو اپنے ساتھیوں کو منتقل کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا تھا۔

وہ فطری طور پر شرمیلا آدمی تھا۔ اس نے کبھی ایسا کام کرنے کی بڑ نہیں ہانکی جو اس کے بس میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایسی تمام کوششوں کو رد کر دیتا تھا جس کے ذریعے لوگ یا تو اس کو استعمال کرنا چاہتے تھے یا اس کی انا کو ابھارنا چاہتے تھے۔ وہ ایک منکسر المزاج انسان تھا، بہت صاف گو تھا، اور جب ضرورت ہو تو ناانصافیوں اور بے ضابطگیوں پر تنقید کرنے سے بھی پرہیز نہیں کرتا تھا۔

اپنی اہلیہ کی آمد کے بعد وہ دونوں کراچی کی سماجی زندگی کا حصہ بن گئے تھے جو ان دنوں خاصی رنگین تھی اور دانشورانہ اعتبار سے بھی کافی پُرکشش تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کراچی نہ صرف یہ کہ تجارتی مصروفیات کا محور تھا بلکہ ملک کی سیاست کا مرکز بھی تھا۔ تمام سفارت خانوں، بین الاقوامی اداروں کی موجودگی میں یہاں کی تہذیبی زندگی بہت فعّال تھی اور تقریباً ہر ملک کی یہی کوشش تھی کہ اس ملک کو اس کے فنون اور اس کی تہذیب سے متعارف کرایا جائے۔ حقیقی معنوں میں کراچی ان دنوں ایک بین الاقوامی شہر تھا اور اس میں دنیا کی شبانہ رنگینیوں کی بھی ہلکی سی جھلک نظر آتی تھی۔ جیسا کہ میں انھیں صفحات میں ذکر کر چکا ہوں، پیلس ہوٹل میں 'le gourmet' نام کا ایک ریستوران تھا جہاں مشہور 'بیلی ڈانسر شہزادی امینہ' ڈنر کے بعد رقص پیش کیا کرتی تھیں۔

مسز شوارز ایک اچھی موسیقار اور اعلیٰ درجے کی پیانو بجانے والی تھی۔ اپنے فن کی وجہ سے وہ سفارتی، اور دوسرے مقتدر حلقوں میں بھی اپنے شوہر کے سماجی تعارف کا باعث ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے گرد ایک دل چسپ حلقۂ دوستاں بنا لیا تھا۔ ان میں کئی نام نہاد 'سفید فام روسی مہاجر' بھی شامل تھے جو کراچی میں میری اہلیہ کی آمد تک موجود تھے۔ کراچی جیم خانہ اور میٹروپول ہوٹل سے متصل سنٹرل ہوٹل کے مسٹر 'آرٹی' ان میں سے ایک تھے، ان صفحات میں جن کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کی تیار کردہ مچھلیوں کی بہت مانگ تھی، جنھیں شہر کے متمول لوگ اپنے دوستوں کی تواضع کے لیے اپنے ڈرائیور بھیج کر ہوٹل سے منگا لیا کرتے تھے۔ پروفیسر سہروردی، معروف بنگالی سیاست داں اور پاکستان کے سابق وزیراعظم کے بھائی بھی تھے جو ماسکو میں بالشویک رقاص حلقے کے ساتھ وقت گزار چکے تھے، وہ اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی لے آئے تھے اور حتی المقدور ان کی امداد بھی کی تھی۔

میں ایسے بے شمار ناموں کی فہرست پیش کر سکتا ہوں جن سے شوارز خاندان اس شہر میں اپنے طویل قیام کے دوران واقف ہو گیا

تھا۔ شوارز اپنے دس سالہ قیام کے دوران بہت سے قابلِ احترام افراد سے قریب ہوگیا تھا، ایسے بھی جن کا نام کمپنی کے لیے احترام کا باعث بھی ہوا تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مسٹر کے ایف حیدر اور مسٹر ای سی آئیون کے ساتھ مل کر شوارز نے سماجی حلقوں میں بھی کمپنی کے وقار میں اضافہ کیا تھا۔ اور جب آئیون اپنی نئی ذمے داریاں سنبھالنے میونخ چلے گئے تھے تو اس ادارے میں ان کی کچھ ذمے داریاں مسٹر شوارز کو سونپ دی گئی تھیں۔

اپنے اندازِ زندگی اور کمپنی کے لیے کیے جانے والے کام کو وہ دونوں (آئیون اور شوارز) جتنا پسند کرتے تھے اتنے ہی معترف ادارے کے چیف ایگزیکٹیو اور بورڈ کے ارکان بھی تھے۔ مگر انھوں نے اس بات کو کبھی نہیں بھلایا تھا کہ اس ملک میں ان کا قیام عارضی تھا۔ مسٹر شوارز نے بہت احتیاط کے ساتھ میونخ ری کے اہم اور سینئر افراد سے اپنے قریبی تعلق برقرار رکھے تھے۔ یہ کام اس لیے اور بھی آسان ہوگیا تھا کہ ان کے پرانے مربی میونخ ری کے ڈائریکٹر ہو گئے تھے اور کمپنی کے ایشیائی کاروبار کی نگرانی ان کے سپرد کر دی گئی تھی۔ قصہ مختصر، میونخ۔ری نے مسٹر شوارز سے اس شرط پر اپنے ادارے کے ایشیائی کاروبار میں ملازمت کا وعدہ کیا کہ وہ ایسٹرن فیڈرل یونین میں اپنی جگہ لینے کے لیے کوئی آدمی تیار کرلیں۔ اس طرح میں اس منظر میں داخل ہوا تھا۔

جنوری ۱۹۶۰ء سے ہم دونوں کو اس طرح ایک ساتھ کام کرنا تھا کہ میں ان کی جگہ پُر کرسکوں۔ اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں ان کے برابر ہی کی میز پر کام کرتا تھا۔ صبح سے شام تک ہم دونوں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے اور وہ مجھے کمپنی کی انتظامیہ میں اپنے دس سالہ تجربے کا نچوڑ منتقل کر رہے تھے۔ جس دن کے ایف حیدر نے PIC میں عہدہ سنبھالنے کے لیے کمپنی کو خیر باد کہا، میں کراچی پہنچ چکا تھا۔ مسٹر شوارز نے اس وقت میری آبرو رکھ لی جب، ادارے کی انتظامیہ کے سینئر ارکان بھی موقعے کی نزاکت سے بھرپور ذاتی فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھے۔ ان کی مدد کے بغیر مجھ جیسے نو وارد کا اس جدو جہد سے عہدہ برآ ہونا مشکل تھا۔ یہ ان ہی کی مدد تھی جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ میں محفوظ رہا بلکہ کافی مضبوط حیثیت میں آ گیا تھا۔

جب وہ ۱۹۶۰ء میں گرمی کے موسم میں جرمنی واپس گئے تو انھوں نے اپنے پیچھے کام کرتا ہوا ایک مستعد اور مضبوط دفتر چھوڑا تھا، ہر اعتبار سے جو ملک کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی کا صدر مقام تھا۔ کمپنی کے ملازمین ان کا بہت احترام کرتے تھے اس لیے کہ جہاں تک ممکن ہوتا وہ سب کی مدد کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی ذاتی کوششوں سے کمپنی کو مہیا کرنے والے کاروبار پر جو کمیشن حاصل کرسکتے تھے اس کو ایک فنڈ میں ڈال دیا جاتا تھا جو انھوں نے تشکیل دیا تھا۔ اس فنڈ میں جمع ہونے والی رقم صرف ضرورت مند کارکنوں کی امداد میں صرف کی جاتی تھی۔ اور ان دنوں ایسے بہت سے لوگ ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس طرح، 'ناقص کھاتا نویسی' کی وجہ سے، فنڈ کی رقم کا کچھ حصہ ضائع بھی ہوسکتا ہے، اپنے ایک نائب کو اس فنڈ کا متولّی مقرر کردیا تھا۔

ان کو انشورنس کے تکنیکی معاملات میں کمال حاصل تھا، کمپنی سے باہر کے حلقوں میں بھی جس کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ انشورنس ایسو سی ایشن آف پاکستان کی فائر سیکشنل کمیٹی کے ایک سینئر رُکن کی حیثیت میں بیمے کے بارے میں ان کے علم اور مہارت کی قدر کی جاتی تھی۔ بیمے کے کام سے الگ، لوگوں نے مقامی زبان، اردو سیکھنے کے سلسلے میں ان کی سنجیدہ کوشش کی بھی ستائش کی تھی۔

مسٹر شوارز نے ای ایف یو کو ایک خالص دوست کی حیثیت میں چھوڑا تھا۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ایک برس بعد جب کمپنی کے نئے چیف ایگزیکٹیو روشن علی بھیم جی اپنی کمپنی کو کاروباری نقصان کے طوفان سے نکالنے کی غرض سے امداد کی طلب میں جرمنی پہنچے تو مسٹر شوارز اور ان کے پیش رو مسٹر آئیون دونوں میونخ ری کے ڈائریکٹر تھے اور یہ انھی کا فیض تھا کہ بھیم جی کو خاطر خواہ مدد دی گئی تھی۔

مسٹر شوارز میونخ ری کے ایشیائی کاروبار کے نگراں کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ہم دونوں ایک بار پھر ساتھی ہوگئے تھے، جب میں 'اپنے' ای ایف یو سے فارغ ہو کر اپنے ادارے، میونخ ری میں واپس پہنچا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں اپنے ریٹائرمنٹ تک وہ ایران،

ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور دوسری جنوبی ایشیائی مارکٹوں کے نگراں تھے۔ وہ ہمارے گھر سے، جہاں ہم لوگ ریٹائرمنٹ کے بعد رہتے ہیں، صرف آدھ گھنٹے کے فاصلے پر ایری جھیل کے کنارے ایک پُر فضا مقام پر خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم دونوں کی اکثر ملاقاتیں ہوتی ہیں، ایک دوسرے کو پوسٹ کارڈ بھیجتے ہیں، اور کچھ ٹیلی فون پر بھی گپ شپ کر لیتے ہیں۔ مزاج میں ہم دونوں بہت مختلف ہیں اور اکثر مسائل پر ہم دونوں میں اختلاف بھی ہوتا ہے۔ مگر ہم دوسروں کے سامنے ایسا نہیں کرتے۔ میرے خیال میں دونوں اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہم، اپنے مشترکہ پلیٹ فارم پر، جس میں پاکستان کسی طرح کم درجے پر نہیں ہوتا، ایک دوسرے کے سچے دوست بن چکے ہیں، ہمارے رشتے معتبر ہیں، ہم ایک دوسرے کے مفاد کا خیال رکھتے ہیں اور بھروسے کے قابل ہیں۔ میں گاہے گاہے ان سے بات چیت کا لطف اٹھاتا رہتا ہوں اور میری دعا ہے کہ ہم اسی طرح ایک طویل عرصہ گزارنے کے قابل رہیں۔

اپنی طویل رفاقت کے دوران ہائنز شوراز مجھے روشنی کے راہ نما مینار میں بیٹھے، اس احتیاط سے کام کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کے بھیجے ہوئے اشارے ان ملاحوں تک پہنچ جائیں جو بہت دور ہوتے ہوئے بھی اپنی کشتی کو صحیح سمت میں رواں رکھنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اور ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کی کوششیں رائگاں نہ ہوں۔ انھوں نے کبھی صلے کی پروا نہیں کی ہے مگر یہ امید ضرور کی ہے کہ لوگ کم از کم ان کے کام کا اعتراف کریں۔

اور میں اُن بہت سے لوگوں سے واقف ہیں جنھوں نے اعتراف کیا ہے۔

میاں سعید احمد (انداز اً ۱۹۵۵ء)

میاں سعید احمد

ایک لاہوری سلسلہ

''ہم اس وقت ایلپس کے پہاڑی سلسلے پر پرواز کر رہے تھے جب لفت ہانسا (Lufthansa) کے جہاز کے کپتان نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی باویریا (Bavaria) صوبے کے دارالحکومت میونخ کے ہوائی اڈّے پر اترنے کے لیے جہاز کو نیچے اتارنا شروع کرنے والا ہے۔ جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا، باویریا وفاقی جرمنی کی ریاستوں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ مجھے اس شہر کی تاریخ کا کوئی علم نہیں تھا، پھر بھی ایسا لگ رہا تھا گویا کالج کے دنوں ہی سے اس کی یادیں میری ہم سفر رہی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تربیت کے لیے میرے والد ایک بڑی جرمن کمپنی میں بھیجے گئے تھے۔ یہ بات مجھے اور میرے بھائی کو بتائی گئی تھی۔ وہاں سے واپسی پر میرے والد اس ملک اور وہاں کے لوگوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے۔ جب بھی وہ اچھے موڈ میں ہوتے تو وہاں کھینچی گئی تصویریں نکال کر دکھاتے۔ ان تصویروں میں ان کے کالج کے ساتھی ساجد زاہد بھی نظر آتے جو والد کے ساتھ گئے تھے۔ ساجد زاہد اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے مشہور گورنر زاہد حسین کے فرزند تھے۔ تصویروں میں وہ دونوں ایک جرمن خاندان کے درمیان تھے، جو خاصا دوست دار دکھائی دیتا تھا۔ اور جب بھی میرے والد اس وقت کی باتیں کرتے تو ان کی آنکھیں چمک رہی ہوتی تھیں اور وہ بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔ یہ تقریباً چالیس برس قبل کا واقعہ ہے۔ اور آج صبح ایلپس کے پہاڑی سلسلے کے اوپر سے گزرتے ہوئے مجھے ایسا لگا گویا میرے برابر والی خالی نشست پر میرے والد بیٹھے ہوئے کھڑکی سے نیچے جھانک رہے ہیں اور بڑے جذباتی اور بلند آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں 'دیکھو شوکت، یہ جرمنی ہے، مجھے بہت خوشی ہے کہ تم بھی یہاں پہنچ گئے ہو' اور میں نے اس لمحے ان کو خود سے بہت قریب محسوس کیا۔ یہ سب کچھ کتنا اصلی معلوم ہو رہا تھا۔''

یہ سب کچھ میاں سعید احمد کے پہلے بیٹے شوکت سعید احمد کہہ رہے تھے جن کو میں ایئرپورٹ سے لے کر Tutzig میں واقع اپنے گھر لیے جا رہا تھا۔ یہ کار کا سفر ایک گھنٹے کا تھا۔ ہماری گاڑی 'آٹوبان' پر فراٹے بھری تھی اور موسم کے معاملے میں ہم خوش قسمت تھے۔ سورج چمک رہا تھا اور ہماری آنکھوں کے سامنے باویریا کے ایلپس کا خوب صورت منظر تھا۔ میں شوکت کو بتا رہا تھا کہ صرف پچیس کلومیٹر آگے مرناؤ (Murnau) نامی چھوٹا سے شہر تھا جس میں اس کے والد اور ساجد زاہد، گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں جرمن زبان سیکھنے کی غرض سے چند ماہ مقیم رہے تھے۔ شوکت بار بار جذباتی انداز میں کہہ رہا تھا کہ وہ کتنا خوش ہے کہ اس علاقے کو آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جسے چالیس برس قبل اس کے والد کی آنکھوں نے دیکھا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس موقعے کا بڑی شدت اور جذباتی انداز سے منتظر رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ کاش، ایسٹرن فیڈرل یونین کے ابتدائی دنوں کے میرے ساتھی، اس کے والد اس موقعے کو دیکھنے کے لیے موجود ہوتے۔ انھیں یقیناً اپنے بیٹے پر بہت ناز ہوتا اور وہ مجھ سے ملتے ہوئے پنجابی خاندانوں کی روایتی تہذیب اور مخصوص محبت کے رشتوں کا مظاہرہ کرتے۔ انھوں نے ایسا بارہا کیا تھا اور جب وہ اس کی ابتدا کرتے تو اس کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا، اور یہ ان کے محبوب مشاغل میں سے ایک تھا۔

انھیں نے مجھے بتایا تھا کہ پنجابی تہذیب میں خاندانی رشتے اور دوستیوں کی نگہداشت، جسے وہ 'لاہوری کنکشن' کہتے تھے، کتنے اہم ہوتے ہیں۔ اور یہ تاثر جغرافیائی اعتبار سے صرف لاہور والوں ہی کے لیے مخصوص نہیں تھا۔ یہ ان کے اپنے اندازِ زندگی اور فلسفے کا نام تھا۔

میاں سعید ۱۹۱۹ء میں لاہور کے ایک متوسط درجے کے پکّے پنجابی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ریلوے کے محکمے میں سینئر کلرک تھے۔ انھوں نے جلد ہی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور زراعت شروع کردی تھی۔ اس زراعتی زمین کا ایک حصہ آج بھی ان کے خاندان کے تصرّف میں ہے۔ میاں سعید کی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ چلے گئے تھے مگر تنہائی کے سبب ایک برس بعد ہی اپنے مؤلد لاہور واپس آگئے اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسلامیہ کالج ان دنوں لاہور کے اہم کالجوں میں سے ایک تھا۔ انھوں نے وہیں سے 'بیچلر آف آرٹس' کی سند حاصل کی۔ یہ اندازاً ۱۹۴۲ء کے لگ بھگ کی بات رہی ہوگی اس لیے کہ انھوں نے ہمیشہ اصرار کیا تھا کہ ایسٹرن فیڈرل یونین، کلکتے، میں ان کی ملازمت اسی برس شروع ہوئی تھی۔ حالاں کہ یہ ان کی پہلی ملازمت نہیں تھی اس لیے کہ گریجویشن کے فوراً بعد انھوں نے حکومتِ پنجاب کے 'راشننگ ڈپارٹمنٹ' میں کلرک کی حیثیت سے شمولیت اختیار کر لی تھی۔ میرے ان قارئین کی اطلاع کے لیے جنھوں نے ایسا نام کبھی نہیں سنا، یہ بتانا ضروری ہے کہ ۱۹۳۹ء میں شروع ہونے والی دوسری عالمی جنگ میں، جو جرمنی، اٹلی اور جاپان کے خلاف لڑی جارہی تھی، برطانوی ہندوستان ایک اتحادی تھا۔ جنگ کے نتیجے میں تمام متاثرہ ممالک نے ایک 'راشننگ سسٹم' نافذ کیا تھا تاکہ عوام کو اشیائے خور و نوش کی فراہمی کا تحفظ کیا جاسکے اور چور بازاری کو جہاں تک ممکن ہو کم کیا جاسکے۔ میاں سعید کو یہ ملازمت بھائی نہیں اور جیسا کہ ان کے مقدر میں لکھا ہوا تھا ان کے والد کے ایک دوست میاں بشیر نے، جو اصفہانی خاندان کے بہت قریب تھے، اور پنجاب میں ای ایف یو کے نمائندے تھے، ان کی ملاقات مرزا احمد اصفہانی سے کرادی تھی۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے جب سیاست داں اور مسلم لیگی عبدالرحمٰن صدیقی کمپنی کے چیئرمین تھے اور ریاست بھوپال کے وزیرِ خزانہ خوندکر فضلِ حیدر کمپنی کے بورڈ میں ڈائریکٹر تھے۔ ای ایف یو کی ایک شاخ اسی عمارت میں تھی جس میں آج کل، موجودہ زونل منیجر کا دفتر واقع ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ شاہراہِ قائدِ اعظم پر واقع یہ عمارت آج کل کوآپریٹو انشورنس بلڈنگ کے نام سے موسوم ہے۔ ان دنوں اس کا نام بال کرشنا بلڈنگ تھا اور یہ شاہراہ 'دی مال' کہلاتی تھی۔

میاں سعید، اصفہانی صاحب سے ملے اور ان کو پسند آئے۔ ان کو ستر روپے ماہوار کے مشاہرے کی ملازمت پیش کی گئی، میاں سعید نے قبول کرلی، ان دنوں یہ ایک بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ میاں سعید فوراً ہی کلکتے روانہ ہوگئے جہاں ای ایف یو کا صدر دفتر تھا، وہیں ان کی انشورنس میں تربیت بھی ہوئی تھی۔ اس وقت نیوزی لینڈ کے مسٹر ہیکسٹر جنرل منیجر تھے اور میاں سعید ان کے بڑے مداح تھے اس لیے کہ انھوں نے میاں سعید اور دوسرے نئے کارکنوں کو اعلیٰ عہدوں کے لائق بنانے کی تربیت دینے اور اور نئے نئے گُر سکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ انھوں نے اکثر صدیقی صاحب کا بھی تذکرہ کیا ہے جو خود تو انشورنس کی تکنیکی مہارت نہ رکھتے تھے مگر زیرِ تربیت نوجوان ملازمین کی 'کردار سازی' میں خود حصہ لیتے تھے۔ ملازمین اور افسروں کے درمیان 'ٹیم اسپرٹ' مثالی ہوتی رہی ہوگی اور یقیناً یہ اُن وجوہات میں سے ایک وجہ رہی ہوگی جس کی بنا پر کمپنی تیزی سے ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن تھی جب کہ وقت کے حالات مسلمانوں کے تجارتی اداروں کی کوششوں کے لیے ہرگز سازگار نہیں تھے۔ مناسب درجے کی انڈر رائٹنگ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی اس لیے کہ حالات کے مطابق کاروباری ضروریات منافعے کے لیے ضروری تھیں۔ سرمایہ کاری سے ہونے والی آمدنی کی حیثیت ثانوی تھی۔ آج کے مقابلے میں اس وقت کے انشورنس کے حالات قطعی مختلف تھے۔ اگر ہم ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۲ء کے ای ایف یو مالیاتی میزانیے پر نظر دوڑائیں تو پتا چلے گا کہ اس زمانے میں سرمائے پر منافعے کی شرح صرف تین اعشاریہ پانچ سے چار فی صد تک ہوا کرتی تھی اور ان دنوں زیادہ تر سرمایہ کاری گورنمنٹ بانڈ اور حکومتی تمسکات یا ڈی بینچرز میں کرنی پڑتی تھی۔ ہندوستانی حکومت کے تمسکات، کلکتہ امپرومنٹ ٹرسٹ، کلکتہ پورٹ ٹرسٹ، پنجاب بانڈ، کشمیر ریاست کے بانڈ وغیرہ جن میں قابلِ ذکر ہیں۔

میاں سعید کی تربیت ہوئی اور چیلنج کی ایک بالکل نئی اور حیرت انگیز دنیا ان کے سامنے تھی۔ کلکتے میں ان کا قیام تین برس تک رہا، جب کہ اپنی سالانہ تعطیلات وہ اپنے والدین کے ساتھ لاہور میں گزارتے تھے۔ ان کی شادی ۱۹۴۳ء میں ہوئی اور ان کا پہلا بیٹا شوکت سعید احمد ۱۹۴۴ء میں تولد ہوا اور ۱۹۴۵ء کے اوائل میں ان کا خاندان کلکتے منتقل ہوگیا۔ مگر یہ ملاپ صرف چند ماہ تک ہی رہ سکا۔ اس لیے کہ کلکتے کے فسادات کی وجہ سے میاں سعید نے اپنے اہلِ خانہ کو لاہور روانہ کردیا اور سال کے آخر تک وہ خود بھی اپنا تبادلہ کرا کے لاہور منتقل ہوگئے اور وہیں کمپنی کے فائر ڈپارٹمنٹ میں کام شروع کردیا۔ مگر جلد ہی ان کو ایک طرح کے فائر بریگیڈ کی خدمات انجام دینی پڑ گئیں اس لیے کہ اپنی جامع تربیت کی وجہ سے وہ 'ہرفن مولا' کی حیثیت اختیار کر گئے تھے اور انھیں ضرورت کی مطابق ایک شعبے سے دوسرے شعبے اور دوسرے سے تیسرے شعبے میں جانا پڑتا تھا۔ اس وقت تک اپنی محکم تربیت اور تکنیکی علم کی وجہ سے، اور سب سے بڑھ کر سرگرمی اور محنتی انداز میں کام انجام دینے کی صلاحیتوں، عادات اور کمپنی کے مفاد کے خیال رکھنے پر وہ اپنے ادارے میں مشہور ہو چکے تھے۔ ان کے بیٹے کے مطابق، ان کے نزدیک ای ایف یو ہی سب کچھ تھی، جس کی حیثیت دوسری بیوی کے مترادف ہو چکی تھی۔ کچھ تعجب نہیں کہ جب لائل پور شاخ کو ایک تجربے کار افسر کی خدمات کی ضرورت پڑی تو میاں سعید ہی سب سے بہتر انتخاب ٹھہرے اور ان کا تبادلہ کردیا گیا۔ کمپنی کے قد آور ڈپٹی جنرل منیجر نے خود ان کا انٹرویو کیا اور وہ اس نوجوان افسر کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی وقت سے یہ طے پا گیا تھا کہ اس ادارے میں میاں سعید کے لیے ایک نہایت تاب ناک مستقبل فراہم تھا۔ جب ۱۹۵۹ء میں ایک اعلیٰ افسر کی حیثیت سے اس کمپنی میں میرا تقرر ہوا تو مسٹر آئیون نے کراچی چھوڑنے سے پہلے جن لوگوں کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتایا تھا ان میں سعید بھی شامل تھے اور مجھے ہدایت کی تھی کہ میں ان کا خاص خیال رکھوں۔

ان دنوں کا لائل پور اور آج کا فیصل آباد ملک میں ابھرنے والی پارچہ بافی کی صنعت کے مراکز میں سے ایک تھا۔ لائل پور کاٹن ملز، کریسنٹ ٹیکسٹائلز اور کوہِ نور ٹیکسٹائل ملز بڑی صنعتوں میں قابلِ ذکر تھیں۔ وہ میاں سعید ہی کی شخصیت تھی جس نے سہگل برادران سے دوستی کے رشتے استوار کیے اور میاں یوسف کی معیت میں، انھوں نے ای ایف یو کو بہت اچھے گاہکوں سے متعارف کرایا تھا۔ یہ رشتے آج بھی محکم ہیں اور اس طرح کہ ان صنعتوں کی اہم شخصیات آج ای ایف یو کے خاندان کے اہم اور اندرونی افراد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کمپنی سے میاں سعید کا اپنے ادارے سے تمسک اور ان کی دوستانہ شخصیت نے ان کو شہر کے تجارتی حلقوں اور اس کی تہذیبی شاخوں میں ممتاز کردیا۔ ان کے بے مثال اور نہایت دوستانہ کردار نے ان کو تجارتی شخصیتوں کا معیاری حصے دار بنا دیا جو اسی قسم کی لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ مکمل طور پر بے تعصب اور کُلی طور پر بے غرضانہ مشوروں کے لیے وہ ان ہی پر انحصار کرنے لگے تھے۔ ایک بے غرض، مذہبی اور دروں بیں قسم کی شخصیت ہوتے ہوئے ان کے اطراف ایک قسم کا مسحور کن حصار پیدا ہوگیا تھا، ایک کھلا ہوا ذہن جس میں کسی کے لیے بھی کسی قسم کے تعصّبات کا گزر نہیں تھا جو پہلی بار عجیب سا لگتا تھا۔ وہ بہت ہی نفیس حسِ مزاح رکھتے تھے۔ ان کے پاس لطیفوں کا خزانہ تھا، بہت اچھے اور پُر لُطف، اوچھے وار سے قطعی پاک۔ سکھوں کے بارے میں تو انھیں ہزاروں لطیفے یاد تھے۔ وہ جس طرح لطیفے سناتے تھے وہ ان کا اپنا ہی انداز تھا۔ لطیفے سناتے وقت وہ اشاروں اور کنایوں کا استعمال بھی کرتے تھے، ساتھ ہی رحم دلی کا بھی اظہار کرتے جاتے تھے، اس طرح گویا لطیفوں میں شامل شخصیات کا کوئی قصور نہیں ہوتا اور ان سے سب کو ہمدردی کرنی چاہیے۔

میاں سعید کا ۱۹۵۹ء میں لاہور کے زونل چیف کی حیثیت سے تقرر کردیا گیا تھا، اس سے چند ماہ قبل جب میں کراچی پہنچا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے روشن علی بھیم جی کا تقرر ہوگیا تھا اور یہ طے ہوا کہ ساجد زاہد کے ساتھ، جو کمپنی کے ایکچوری بنا دیے گئے تھے، میاں سعید کو بھی ایک برس کے تربیتی کورس پر میونخ ری بھیج دیا جائے۔ پہلے تین ماہ ان دونوں نے جرمن ایلپس کے دامن میں واقع شہر Murnau میں جرمن زبان سیکھنے میں گزارے۔ اگرچہ ان دونوں کو جرمن زبان سیکھنا مشکل لگا تھا مگر انھیں اس پر کوئی تردّد نہیں تھا۔ یہ

تضیعِ اوقات نہیں، ایک اچھی کوشش تھی، ایک دانشورانہ چیلنج تھی جو آگے چل کر ان کے جرمنی کو، بلکہ یورپ کو بھی سمجھنے میں معاون ہوگی۔ میاں سعید نے میونخ سے واپسی پر مجھ سے کہا تھا کہ ''ہمارا نظامِ تعلیم اکثر یہ فریب دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب برطانوی سلطنت کی تہذیب کے مماثل تھی۔ اس کا سیاسی نظام، تہذیب اور روایات وغیرہ مغربی تہذیب کے پرتو نظر آتے تھے۔ مگر میرے جرمنی میں ایک برس کے قیام نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور اب میں برِّ اعظم یورپ کے مختلف النوع علاقائی ڈھانچے، ان کی بوقلموں نسلی اور علاقائی یگانگت اور اس کے باسیوں کو بہتر طور پر دیکھ اور سمجھ سکتا ہوں۔ بہر حال اس سفر نے مجھے یہ کچھ سکھایا ہے۔ میونخ اور وہاں کے میرے جرمن دوستوں کا یہ کرم ہے کہ انھوں نے اپنے شہر میں واقع اقبال کی یادگار دکھا کر مجھے ان کو زیادہ پڑھنے پر راغب کر دیا اور اب مجھے معلوم ہوا کہ جرمن ادیب اور فلسفیوں کو اقبال نے کیوں متاثر کیا تھا۔''

جرمنی سے واپسی پر میاں سعید کو مغربی پاکستان کا چیف منیجر بنا دیا گیا تھا، جو ایک اہم اور بڑا عہدہ تھا۔ انھوں نے کراچی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور ان کا پورا خاندان، یعنی ان کی اہلیہ اور دو بیٹے، کراچی آ گئے جو اس وقت تک پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ ان کے بیٹے شوکت نے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آغا حسن عابدی کے نہایت کامیاب بینکاری کے تجربے، یونائیٹڈ بینک میں ملازمت اختیار کر لی جس سے ایسٹرن فیڈرل یونین کے بہت اچھے کاروباری رشتے استوار ہوئے تھے۔

یہ زمانہ ایسٹرن فیڈرل کا سنہرا دور تھا، صرف لائف انشورنس کے لیے ہی نہیں جس میں اس ادارے نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بے مثال پیش قدمی کی تھی۔ جنرل انشورنس کا کاروبار بھی بڑھا، اور میاں سعید نے بھی کامیابی کی اس نئی داستان میں اپنا مقام بنا لیا تھا۔ میاں سعید کراچی منتقل تو ہو گئے تھے مگر، پکّے پنجابی ہونے کے ناتے وہ کراچی کو اپنا نہیں سکے۔ باوجود اس کے کہ مسٹر بھیم جی، معین الدین اور میں، ہم سب نے ان کو سہارا دیا تھا۔ وہ یہاں لاہور کو، اپنے لاہوری دوستوں کو، وہاں کی نہروں کو، قدیم مساجد اور 'اپنے لاہور' کی تاریخی یادگاروں کو یاد کرتے رہتے تھے۔ سب سے زیادہ ان کو اپنے کاروباری رشتے اور اس سے منسلک ان کے دوست یاد آتے تھے۔ ہماری، دفتر میں بھی اور میرے گھر پر بھی، گھنٹوں زندگی کے اسی موضوع پر باتیں ہوتیں۔ کبھی تو وہ، اپنے کاروباری فرائض اور دل کی خفیہ خواہشات کے ٹکراؤ سے بہت ناخوش دکھائی دیتے تھے۔ کمپنی کے تمام اعلیٰ اور اہم عہدے دار اس بات کے قائل تھے کہ مطمئن میاں سعید ہمارے لیے زیادہ اچھا اثاثہ ہوں گے۔ اس کے نتیجے میں کمپنی کی انتظامیہ میں بڑے پیمانے پر ایسا ردوبدل کیا گیا جو سب کے موافق ہو۔ میاں سعید کو لاہور بھیج دیا گیا اور آغا ناصر علی، جو جنرل انشورنس میں ایک کامیاب برانچ منیجر اور زونل منیجر ثابت ہو چکے تھے، کراچی تبدیل کر دیا گیا۔ آغا صاحب کو لائف انشورنس کے شعبے میں نو تشکیل شدہ گروپ انشورنس کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ میاں سعید لاہور میں رہے اس کے باوجود مغربی پاکستان کے چیف منیجر ہی رہے۔

بدقسمتی سے ۱۹۶۶ء میں ان کی اہلیہ ایک حادثے کا شکار ہو کر جسمانی طور پر چھ برس تک معذور رہی تھیں۔ ان کے لیے کراچی کا یہ زمانہ دردناک رہا تھا جس نے ان کی سماجی اور ذاتی زندگی پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ اس حادثے نے انھیں ایک حساس اور دردمند شوہر کے روپ میں اُجاگر کیا۔ بالآخر ان کی اہلیہ معذوروں کی گاڑی سے نکل کر اپنے پیروں چلنے لگیں، اور بلا شبہ یہ میاں سعید کی ان سے والہانہ محبت اور انتھک خدمات کا نتیجہ تھا۔ اس میں ان کے دونوں بیٹوں کی اخلاقی امداد بھی شامل رہی تھی۔

شوکت اور ان سے پانچ برس چھوٹے بھائی دونوں اپنے والدین کو اچھے کلمات میں یاد کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اپنے والد کے لیے بے حد احترام کے جذبات موجزن ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے والد اسکول ماسٹروں کی طرح اپنے سخت اصولوں کی پابندی کراتے تھے مگر وہ انسانی اور اخلاقی عادتوں کی نشوونما کا بہت خیال رکھتے تھے۔

میرے Tutzing کے گھر میں بیٹھے ہوئے شوکت نے اپنے والد کو یاد کرتے ہوئے کہا تھا، ''میری تعلیم کے دوران، اسکول کی ہو

یا کالج کی، میں جو کچھ بھی کرتا تھا، والد صاحب اس میں بہت دل چسپی لیتے تھے۔ وہ میرے استادوں سے برابر رابطے میں رہتے اور میری تعلیمی نشوونما کے بارے میں معلومات لیتے رہتے تھے۔ وہ اس وقت بہت بے چین ہوتے جب یہ دیکھتے کہ سب کچھ ان کی توقعات کے مطابق نہیں ہو رہا ہے۔ ویسے وہ بہت مہربان، نرم خو اور منکسر المزاج انسان تھے۔ مگر وہ مکمل نظم وضبط پر اصرار کرتے تھے۔ وہ ہمیں ڈرائیوروں کے ساتھ کبھی نہیں بھیجتے تھے۔ ہم یا تو پیدل چلتے یا پھر بائیسکل استعمال کرتے تھے۔ اور ہمیں شام ڈھلنے سے قبل ہی گھر واپس ہونا ضروری ہوتا تھا۔ میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ ایک شام میں اپنے دوستوں کے ساتھ نہر میں پیراکی کے لیے چپکے سے نکل گیا تھا۔ والد نے ہم دونوں کے لیے اس کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ اور جیسا کہ اکثر ایسے موقعوں پر ہوتا ہے، اتفاق سے وہ اُدھر سے گزرے اور میں پکڑا گیا۔ وہ بہت خفا ہوئے۔ اگلی صبح کو مجھے حجام کے پاس لے کر گئے اور سزا کے طور پر میرے سر کے بال منڈوا دیے۔ یہ بہت بڑی سزا تھی، مگر ایک سبق بھی تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکا۔''

میاں سعید سخت نظم وضبط کے قائل تھے، اپنے لیے بھی اور اپنے اہلِ خانہ کے لیے بھی۔ شوکت کہتے ہیں کہ ''مگر وہ جو بھی قدم اٹھاتے، ہم دونوں بھائیوں کو اس کا یقین تھا کہ وہ ہماری بھلائی اور ہم دونوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہی ہوگا۔''

شوکت یونائیٹڈ بینک میں ملازم ہو گئے تھے اور ان کی ذمے داری بینک کے سب سے اہم کھاتے دار شیخ زید بن سلطان النہیان، ابوظہبی کے حاکم کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ صدی کے چھٹے عشرے تک ابوظہبی سے تیل نکلنا شروع ہو گیا تھا اور اچانک شیخ کا شمار دنیا کے امیر ترین اشخاص میں ہونے لگا تھا۔ انھوں نے ملک سے باہر سفر شروع کر دیا تھا اور آغا حسن عابدی ان کی قربت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ آغا صاحب نے جو بہت سے کام کیے تھے ان میں ایک کام یہ بھی تھا کہ یونائیٹڈ بینک میں ایک استقبالیہ قائم کر دیا تھا جس کا کام صرف اہم کھاتے داروں کی خواہشات اور ضروریات کا خیال رکھنا ہوتا تھا۔ شوکت اس محکمے کے ایک رُکن بنا دیے گئے تھے مگر انھیں یہ کام بالکل پسند نہیں تھا۔ ''ہم بینکر ہیں یا ہمارا کام دلالی کرنا ہے۔'' ان کا مشہور جملہ تھا جب وہ اپنے اعلیٰ ترین افسر کے روبرو اپنی ذمے داریوں کی شکایت کرتے ہوئے پھٹ پڑے تھے اور ۱۹۶۹ء میں یونائیٹڈ بینک چھوڑ دیا تھا۔ انھوں نے یہ قدم اٹھانے سے قبل اپنے والد اور مسٹر بھیم جی سے مشورہ نہیں کیا تھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ دونوں آغا صاحب کے قریبی دوست ہیں۔ دونوں حضرات نے شوکت کے ردِعمل سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد شوکت نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایسٹرن فیڈرل یونین میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان سے پہلے بہت سے بیٹے اپنے والدوں کی طرح، جنھوں نے اس ادارے کی وفاداری سے خدمت کی تھی، اس ادارے میں شامل ہو چکے تھے۔ شوکت سے پوچھا گیا کہ وہ سعودی عرب میں کھلنے والی کمپنی کے شاخ میں تبادلہ پسند کریں گے یا نہیں۔ ان کے والد نے ان کو اس کے قبول کر لینے کا مشورہ دیا۔ جرمنی میں اپنے قیام کے دوران شوکت کو اپنے ملک کے ساحل کو چھوڑ کر غیر ملکی تہذیب کے تجربے کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے والد کا مشورہ قبول کر لیا۔ شوکت کے والد نے ۱۹۷۹ء میں، جب شوکت کا تبادلہ منیجر کی حیثیت سے فیصل آباد میں کر دیا گیا تھا، بہت مدد کی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی تین عشرے قبل جہاں ان کے والد تعینات تھے اور انھوں نے کمپنی کے ایک ہونہار افسر کی حیثیت سے ایک نہایت کامیاب مستقبل کی ابتدا کی تھی۔

''شروع شروع میں میرے والد، والدہ کے ہمراہ تقریباً ہر ہفتے فیصل آباد آتے۔ اور ہم ایک ساتھ میرے دفتر جاتے۔ وہ ہر کلیم کے کاغذات کی جانچ پڑتال کرتے اور جہاں ضرورت ہوتی تبادلۂ خیالات کرتے۔ میں ان کا بے حد شکر گزار ہوتا تھا۔ اتنی قربت کے باوجود میرے لیے یہ کبھی ممکن نہ ہوا کہ میں ان کے دل اندر جھانک کر دیکھ سکتا، اگر چہ میرا خیال تھا کہ وہ میری کوشش پر خوش ہوتے۔ مگر ان کے بارے میں میرے دل میں احترام کے گہرے جذبات آڑے آجاتے تھے، جن کو میں کبھی عبور نہیں کر سکا۔ ایک مثال دینا چاہوں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں تمباکو نوشی کرتا ہوں، اور میری یہ بہت پرانی عادت ہے۔ مگر زندگی بھر میں نے ان کی موجودگی میں تمباکو نوشی کی جرأت نہیں

کی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ جب میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میں تمبا کونوشی کر رہا تھا۔ جوں ہی وہ داخل ہوتے میں جلدی سے سگریٹ بجھا کر اپنی دونوں انگلیوں بجھا کر پتلون کی جیب میں ڈال لیتا۔ ایسا کرنے میں کئی بار میری انگلیاں بُری طرح جل گئی تھیں اور میرے جیبوں میں سوراخ ہوگئے تھے۔ وہ دیکھ کر مسکرا دیتے اور کہتے، 'بیٹا، مجھے علم ہے کہ تم تمباکونوشی کرتے ہو، تو پھر تم میرے سامنے اس کو چھپانے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟' میں ان کو بھلا کیسے بتاتا کہ باپ کی حیثیت سے آپ کے لیے میرے دل میں جو احترام ہے اور آپ نے مجھے جو کچھ سکھایا ہے اس کو بھلانا میرے لیے ممکن نہیں۔''

کمپنی کے لیے سعید صاحب کی عظیم خدمات کے اعتراف کے طور پر کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ایک رُکن کی حیثیت سے ان کو منتخب کر لیا گیا تھا اور ۱۹۷۶ء سے رفتہ رفتہ وہ کمپنی کی ذمے داریوں سے فارغ ہوگئے۔ ان کے کم عمر ساتھی سلطان احمد نے ان کی جگہ لے لی۔ سلطان احمد بعد میں کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو بن گئے تھے۔ ۱۹۸۱ء میں وہ ایڈوائزر بنا دیے گئے اور بالآخر ۱۹۸۴ء میں پینسٹھ برس کی عمر میں ریٹائر ہوگئے۔ انھوں نے مجھے بہت خوب صورت خط لکھا تھا، جس میں مستقبل کے منصوبے تھے۔ انھیں نے لکھا تھا کہ وہ اپنے والد کی طرح زراعت پر توجہ دینا چاہتے ہیں جو ان کی دیرینہ خواہش تھی۔ مگر ۲۲ر نومبر ۱۹۸۶ء میں دل کے عارضے میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دو برس بعد ان کی بیوی بھی چل بسیں۔ اگرچہ حادثے سے وہ بہ خوبی جاں بر ہوگئی تھیں مگر شوہر کے انتقال کے بعد انھیں زندہ رہنے میں کوئی دل چسپی نہیں رہ گئی تھی۔

شوکت کے مطابق، ''ان کی زندگی ہی انشورنس تھی۔ کچھ باغبانی اور کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ برج کھیل لینا۔ مگر آخری وقت میں تو صرف انشورنس ہی ان کی مصروفیت رہ گئی تھی۔ اس کے چھٹنے کے بعد زندگی میں کچھ نہیں رہ گیا تھا، اس لیے شاید انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے۔''

مگر میاں سعید ابھی زندہ ہیں، اس ادارے، ایسٹرن فیڈرل انشورنس کی روز مرہ کی زندگی میں، جس سے وہ ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔ ان کے بیٹے شوکت اپنے والد کے مشن سے وابستہ ہیں اور ان کا پیغام آگے بڑھا رہے ہیں۔ اپنے والد کی تعلیمات کی روشنی میں وہ کمپنی کے زونل آفس لاہور میں ایک اعلیٰ ترین افسر کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں۔ اور پانچ عشروں میں میاں سعید کے بنائے ہوئے زیادہ تر گاہک اب بھی کمپنی کے ساتھ ہیں اور ان کے بیٹے کے ہاتھوں اسی قسم کی خدمات سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

کمپنی کے ڈائریکٹر جناب جہانگیر صدیقی اپنے کاروبار کے سلسلے میں برابر لاہور جاتے رہتے ہیں۔ ایک بار شوکت ان سے ہوائی اڈّے پر ملے اور ان کو اپنی کار میں چھوڑنے جا رہے تھے۔ راستے میں صدیقی صاحب نے شوکت سے سوال کیا کہ ''مجھے حیرت ہے کہ آپ لوگ ای ایف یو کے گاہکوں کو اتنے عرصے تک کس طرح اپنے ساتھ رکھتے ہیں، اس کا پس منظر کیا ہے؟'' شوکت نے جواب دیا، ''جناب، یہ میاں صاحب کی رکھی ہوئی بنیاد ہے، اور اتنی مستحکم ہے کہ یہ لوگ خود ہی ہم کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ سہگل، نون، الیکٹرک امپیریل اور بہت سے آج بھی ہمارے ہیں۔ ان کے کاروبار کو میرے والد نے کمپنی سے متعارف کرایا تھا، اور یہ لوگ آج بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان کی اُسی معیار کی خدمت کر سکتا ہوں جیسی کہ میرے والد کیا کرتے تھے۔ یہ میرے والد ہی کا فیض ہے کہ ان لوگوں کے کاروبار کا ۹۹ فی صد میرے پاس ہے۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔''

اسی کو میرے دوست اور ساتھی مرحوم میاں سعید 'لاہوری کنکشن' کہا کرتے تھے۔ مجھے لاہور کا ۱۹۶۰ء کا بہار کا موسم اب بھی یاد ہے۔ وہ برانچ منیجر تھے اور ہوائی اڈّے پر مجھے لینے کے لیے آئے تھے۔ لاہور کا پرانا ہوائی اڈّہ بہت چھوٹا سا تھا، بالکل کسی گودام کی طرح۔ مسافروں کو الوداع کہنے والے ایک نیچے سے جنگلے سے الگ رہ جاتے تھے، چند گز کے فاصلے پر، اتنے قریب کہ تار کی جالیوں کے اوپر سے ہاتھ ملایا جا سکتا تھا۔ انھوں نے مجھے بہت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا اور فوراً ہی میرے جرمن ساتھی اِروِن سی آئیون کی تعریف کرتے ہوئے

کہا، ”اگر وہ نہ ہوتے تو شاید میں کامیاب نہ ہوتا۔ میں کسی معروف خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا مگر ان کو مجھ پر اعتماد تھا اور انھوں نے مجھے لائل پور شاخ کا منیجر بنا دیا تھا۔“ اور پھر وہ اپنی شاخ کے کاروبار کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتاتے رہے۔ اس وقت کمپنی کا دفتر شہر کے مرکز میں تھا، جو آج بھی وہیں ہے، اور جو اس دفتر کو قائم رکھے ہوئے ہے اسی کمپنی کے ایک افسر ہیں جو کمپنی کے ملازمین کی تیسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے گاہکوں کی ویسی ہی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کا نام قنبر حمید ہے اور وہ کمپنی کے زونل آفس میں ڈپٹی ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے والد جناب اختر حمید، جن کی اب عمر پچھتر برس ہو چکی ہے، ای ایف یو کے زونل آفس کے چیف اکاؤنٹنٹ تھے، اور ان کے خسر، جناب حق بھی اسی کمپنی کے لائف ڈپارٹمنٹ میں ملازم رہ چکے ہیں۔ یہ ہے وہ عظیم روایت، جسے میاں سعید اپنی زبان میں 'لاہوری کنکشن' کہتے تھے!

ایک دفعہ ہم لاہور کے معروف ہوٹل فلیٹیز جا رہے تھے۔ وہی لاہور کا پرانا ہوٹل جو اپنی وسیع، خوب صورت خواب گاہوں، بڑے بڑے ملاقاتی کمروں اور سرد موسم میں استعمال میں آنے والے اصلی آتشدانوں کے لیے مشہور تھا۔ ہوٹل جاتے ہوئے راستے میں رُک کر میاں سعید نے برونز میٹل سے بنی ہوئی سبز، دُنیا بھر میں مشہور 'زمزمہ' توپ دکھانی چاہی جس کو ہم اس وقت سے Kims' Gun کے نام سے جانتے تھے، جب ہم نے رَڈیارڈ کپلنگ کا مشہور ناول پڑھا تھا۔ یہ توپ مال روڈ کے درمیان، یونی ورسٹی کے بڑے ہال کے سامنے نصب ہے۔ میاں سعید مجھے مغل شہنشاہوں اور لاہور سے ان کی وابستگی کے بارے میں بہت کچھ پہلے ہی بتا چکے تھے۔ یہ بھی کہ یہ توپ برصغیر میں ڈھالی جانے والی سب سے بڑی توپ تھی جو ۱۷۶۱ء میں شاہ ولی خان نے بنوائی تھی۔ اور پھر انھوں نے مجھے اس پر کندہ تحریر 'The Zam-zamah The taker of Strongholds' دکھائی۔

میاں سعید نے کہا کہ میں اس توپ کے سائے میں بڑھ کر جوان ہوا ہوں اور جب بھی مجھے ضرورت پیش آئی ہے، میں نے اس پر کندہ جملے 'the taker of strongholds' سے ذہنی توانائی اور استقلال حاصل کیا ہے اور مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ میں اس مشکل کو حل کر لوں گا۔“

سیّد سبطِ حسن

جتنے بڑے ادیب اتنے ہی بڑے آدمی

سبطِ حسن کے رُتبے کے آدمی کا خاکہ لکھنا ہر شخص کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہوگا۔ ایسے انسان کے بارے میں لکھنے میں انصاف کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے جو نہ صرف اپنے وقت کا ایک بڑا ادیب، مفکر اور فلسفی ہو بلکہ ساتھ ہی ساتھ ایک بہت متنازعہ سیاسی شخصیت بھی ہو۔ ایسا بے غرض انسان جس نے اپنے لا متناہی خوابوں، حقوقِ انسانی اور اپنے وطن کے پسے ہوئے عوام کے بہتر مستقبل کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کو اپنی زندگی کے آخری لمحات میں عمر بھر کے خواب چکنا چور ہوتے دیکھنا پڑ رہا ہو۔

اس نرم خو، تہذیب یافتہ اور اعلیٰ صلاحیتوں سے بھرپور انسان کو میں قریب سے جانتا تھا۔ اس کی حیات اس مختصر سے خاکے سے زیادہ تفصیلی تذکرے کی حق دار ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس کا حق ادا کروں کہ اس کی زندگی بہت سے حیرت انگیز پہلوؤں، بہت سے بدنما اور مسرت کے لمحات سے مملو تھی۔

سید سبطِ حسن مشرقی یو پی، ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ علاقہ صوبہ بہار سے ملا ہوتھا۔ ان کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں، عین اس زمانے میں ہوئی تھی جب پہلی عالمی جنگ جاری تھی۔ ان کے والد کا خاندان بڑے زمینداروں کا تھا، والدہ بھی جاگیردارانہ پس منظر رکھتی تھیں۔ وہ نواب باغ بنارس کی بیٹی تھیں اور عیش و عشرت کی پروردہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چھوٹی موٹی خدمت پر بھی انعام کے طور پر سونے کے سکّے دینے کی عادی تھیں، اس وقت بھی جب ان کا خاندان اس اسراف کا متحمل نہیں تھا۔ نوشابہ زبیری کے الفاظ میں، ''وہ دیکھنے میں بھی نواب خاندان کا فرد لگتی تھیں۔'' سید صاحب کی بیٹی نوشابہ زبیری ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، نفیس اور پُرکشش خاتون ہیں۔ وہ اسکول میں استانی کے فرائض سے سبکدوش ہو چکی ہیں اور اپنے آرام دہ مکان میں بیوگی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ میں برسوں قبل، اپنی اہلیہ کے ہمراہ ان سے مل چکا تھا جب وہ اسی شہر میں رہتی تھیں اور ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان سے میری مختصر سی ملاقات ای ایف یو کی گولڈن جوبلی کی تقریبات میں بھی ہو چکی تھی۔ مگر اس بار جب میں ان سے ملا تو پہلی دفعہ میں نے اُن سے ان کے مرحوم والد کے خاندانی پس منظر، اُن کی کامیابیوں اور زندگی میں جدوجہد کے بارے میں باتیں کرنی چاہیں جس کی ایک چاہنے والی اور قریبی شخصیت سے توقع کی جاسکتی ہے۔ جس طرح انھوں نے اپنے والد کی زندگی کے مختلف نوع کے واقعات بیان کیے اس میں ان کی تعریف بھی تھی اور ایک طرح کا احساسِ طمانیت بھی۔ اس دوران مجھے یہ بھی فوراً ہی محسوس ہوگیا کہ ان کے تعلقات اور ان کے محسوسات صرف ایک عام باپ بیٹی جیسے نہیں تھے، جیسے کہ دنیا کے اس خطے میں ہوا کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اپنے والد کے تذکرے کے دوران جذبۂ تعریف بھی تھا اور احساسِ تفاخر بھی، مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ جذبہ اور یہ احساس انھیں اپنے والد کی تعلیمات اور آزاد ذہن کی مدد سے ایک فاصلے سے دیکھ کر پیدا ہوا تھا جو اپنی راہ چلنے اور اپنے انفرادی انداز سے سوچنے کا عادی ہو۔ وہ کشاں کشاں، مجھے اپنے جذبات کی وادیوں

سے لے گئیں مگر مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ ایسے مواقع پر جس قسم کی جذباتیت در آتی ہے وہ اس سے اپنا دامن بچاتی رہیں۔ میں ان کے اس انداز کا شکر گزار تھا اس لیے کہ میں جو تصویر دیکھ رہا تھا وہ زیادہ شفاف اور قابلِ قدر ہو گئی تھی۔

انھوں نے کہا، ''جی ہاں! میرے والدین کے خاندان اس روایتی اعلیٰ درجے کی زندگی گزار رہے تھے جیسی کہ اس زمانے کے اشرافیہ اور جاگیردار گزارتے تھے۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں، اپنی عمر کے آخری دنوں تک میری نواب زادی دادی بالکل ویسی ہی رہیں۔ وہ اسی قسم کے لباس استعمال کرتی تھیں جیسا کہ اس درجے کے لوگ پہنا کرتے تھے۔ وہ بڑے ٹھاٹھ باٹ کی پروردہ تھیں اور اپنے ان اطوار کو تبدیل نہیں کر سکی تھیں جو اس تہذیب کا خاصہ تھے۔ مگر یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ جس خاندان میں وہ بیاہ کر آئی تھیں اس کے حالات ۱۸۵۷ء کے دور کے بعد یکسر تبدیل ہو گئے تھے۔ بلا شبہ ان میں ان کے خاندان کے کچھ افراد ملوث تھے اور جب انیسویں صدی میں ہندوستان کے اس علاقے میں ریلوے کی تعمیر شروع ہوئی تھی اور اس کے لیے زمین کی ضرورت پڑی تو انھیں لوگوں سے حاصل کی گئی جو اس نام نہاد 'بغاوت' کے ملزم تھے۔ اس کے نتیجے میں میرے والد کے بزرگوں کی زمین کا خاصا بڑا حصہ زبردستی لے لیا گیا تھا۔ میں اپنے دادا سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھی اس لیے کہ میرے بچپن کے دوران ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ مگر میں نے سنا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات میں ان کے خاندان کی شمولیت کی وجہ سے ذاتی سطح پر ان کو بہت صعوبتیں اُٹھانی پڑی تھیں۔ اس کا اثر میرے والد پر بھی پڑا تھا، اس لیے کہ جب میرے دادا کا انتقال ہوا تھا اس وقت میرے والد تعلیم کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ وہ بی۔اے کر رہے تھے اور میرا خیال ہے کہ اس وقت تک انھوں نے ملازمت شروع نہیں کی تھی۔''

سبطِ حسن نے الٰہ آباد اور بعد میں علی گڑھ میں، جو ہندوستان کی مسلم اُمہ کے عظیم اذہان کی تربیت گاہ تھے، تعلیم پائی تھی۔ وہاں جس قسم کے لوگوں سے ان کا تعامل ہوا تھا، اور ان کے دادا کے لیے کام کرنے والے کسانوں کو دیکھ کر جس قسم کے تجربات ہوئے تھے، انھوں نے ان کے تنقیدی دماغ کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ وہ اپنی تعطیلات اپنے نانا کے ہاں گزارتے تھے۔ وہ لوگ بڑے زمیندار تھے، جن کی زمین پر بہت سے کسان کام کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زمینداری اور جاگیرداری اپنے شباب پر تھی، جب کسان جاگیرداروں کی زمین سے بندھے ہوتے تھے، گویا یہ ایک قسم کی غلامی تھی۔ ''اور میرے والد وہاں اپنی چھٹیاں گزارتے تھے، وہ گاؤں میں جاتے اور خود غریب کسانوں کے حالات دیکھتے تھے۔ کسان جو کچھ بھی پیدا کرتے وہ زمیندار کی ملکیت ہوتا اور اپنے ہاتھوں سے کی ہوئی محنت کے عوض کسان کو صرف ایک معمولی سا حصہ دیا جاتا تھا۔ میرے والد کو یہ چیزیں پسند نہیں تھیں۔ وہ کسانوں سے کہتے، بلکہ انھیں اکساتے کہ وہ زمینداروں کو کچھ نہ دیں، حالاں کہ وہ خود زمینداروں میں سے ایک کے نواسے تھے۔ وہ ان لوگوں کے حقوق کے علم بردار بن گئے تھے جنھیں ریاست کے جاگیردار اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے اور اپنی غلامی میں رکھتے تھے، جس سے میرے والد کو نفرت ہو گئی تھی۔ ان کی زبانی ہنرمندی حیرت انگیز تھی حالاں کہ وہ شرمیلے اور خود بیں قسم کے ایک خاموش طبع انسان تھے۔ کم از کم اپنے زندگی کے نشوونمائی دور میں، اپنے سماجی رُتبے کے پیشِ نظر، انھوں نے اپنے لیے ایک ناقابلِ قبول قسم کا قد تراش لیا تھا تا کہ ان کی اپنی شناخت قائم ہو سکے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ نہ ان کو زیب دیتا ہے نہ اس ماحول سے میل کھاتا جس میں ان کی پرورش ہوئی ہے۔ ان لوگوں کی نظر میں میری والد کی کوئی خاص عزّت نہیں تھی جن کے سماجی کردار پر وہ تنقید کیا کرتے تھے، کم از کم میری والدہ اور میری دادی نے یہی کچھ مجھے بتایا تھا۔ میرے والد غریب کسانوں کی قسمت تو بدل نہیں سکتے تھے مگر کسانوں کو اپنے مالکوں سے زیادہ اجرت طلب کرنے کی جُرأت دینے میں کامیاب ہو گئے، جن میں ان کے دادا شامل تھے، اور آخر کار کسان اس ڈگر پر چل پڑے۔ اس زمانے میں یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ اس لیے لوگ ان کے اتنے شکر گزار ہوئے کہ انھیں کندھوں پر اٹھائے پھرے۔ تو صحیح معنوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سبطِ حسن اپنی زندگی کے اوائل ہی سے غریبوں کے لیے لڑتے رہے، حالاں کہ صحیح معنوں میں وہ کچھ زیادہ حاصل نہیں کر سکے، اس لیے کہ وہ تنہا تھے۔''

ابتدائی تجربے نے انھیں سکھایا ہوگا کہ صرف ایک تنہا ذات کچھ زیادہ حاصل نہیں کرسکتی، کم از کم سیاسی معنوں میں۔ اور پھر جلد ہی ان کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے جن کے خیالات اور امنگیں ان جیسی تھیں۔ سب ان ہی کے انداز میں سوچنے لگے اور آہستہ آہستہ سبطِ حسن بے دین مفکّرین کی طرح مارکس اور لینن کے سیاسی دھارے میں شامل ہوگئے اور 'Communist Internationale' کے ایک فعّال کارکن بن گئے تھے۔ نوشابہ نے بتایا کہ انھوں نے خود کو علی گڑھ یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر ڈاکٹر اشرف کے سانچے میں ڈھال لیا تھا جو شاید پولیٹیکل سائنس کے شعبے کے سربراہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر اشرف نے بہت سے مضامین لکھے، وہ ایک زبردست مقرر تھے مگر انھوں نے کبھی کوئی مکمل کتاب تصنیف نہیں کی تھی۔ مگر سبطِ بھائی کی بیٹی کو یقین ہے کہ ڈاکٹر اشرف ہی وہ شخص تھے میرے والد جس سے متاثر ہوئے تھے اور انھیں کے سانچے میں خود کو ڈھالنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر اشرف یقیناً مارکسی رہے ہوں گے، جس طرح سبطِ حسن اور ان کے سارے دوست اعلیٰ تعلیم یافتہ عمیق مطالعے والے اور بہت بولنے والے تھے۔ ان کا زیادہ وقت ایک ساتھ گزرتا تھا۔ ان کے دروازے ان تمام ذہین دماغوں کے لیے کھلے رہتے تھے جو نصف صدی کے عرصے میں ابھرتی ہوئی تحریکِ آزادی میں آگے آگے ہوتے تھے مگر انھوں نے اس سے پہلے اتنی لگن سے کام نہیں کیا تھا۔ گاندھی، نہرو اور جناح جیسے لوگ سبطِ حسن اور ان کے ساتھیوں سے واقف تھے اور ان دنوں ان لوگوں کی ان مشاہیر سے ملاقات بالکل آسان بات تھی۔

بہت جلد یہ بات بھی آشکار ہوگئی کی سبطِ حسن کو لکھنے کا بھی شوق تھا جس پر انھوں نے دل لگا کر محنت کی تھی اور ان کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ ان کا قلم کسی قابل تھا۔ ان کے دوستوں نے بھی ان کو ادب کا پیشہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ انھوں نے ترقی پسند انجمن میں شمولیت اختیار کرلی تھی جو برطانیہ اور اس کے خوشامدیوں اور حاشیہ برداروں کو پسند نہیں کرتی تھی۔ ان لوگوں نے بہت سے رسالے اور پمفلٹ شائع کیے جس کے مضامین اربابِ اختیار کو پسند نہیں تھے۔ ان لوگوں نے اپنی تحریروں کو علی گڑھ سے باہر منتقل کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے تھے۔ وہ اپنے مضامین کو جھابیوں میں چھپا کر ان پر آم کی تہیں لگا کر ان کو ملک کے بہت سے مراکز کو روانہ کردیتے۔ اپنے برطانوی آقاؤں کو جھانسا دینے میں نہ صرف وہ بہت آسودگی محسوس کرتے تھے بلکہ انھیں یک گونہ لطف بھی حاصل ہوتا تھا۔

اس قسم کی تمام حرکتیں بہت وقت مانگتی تھیں اور سبطِ حسن کے ذہن کو بھٹکاتی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے بی اے کرلیا مگر قانون کی سند حاصل کرنے میں ناکام رہے، جس کا انھیں ہمیشہ افسوس رہا۔ وہ علی گڑھ سے لکھنؤ چلے گئے جو ان دنوں برطانوی ہندوستان میں دانش اور تہذیب کے اہم مرکزوں میں سے تھا۔ ان کو اس خوب صورت، سرسبز شہر سے عشق ہوگیا، جس کو 'باغِ ہند' کہا جاتا تھا۔ لکھنؤ اس زمانے میں اودھ کے نوابوں اور تعلقے داروں کا شہر تھا۔ مختلف درجے کے سیکڑوں نواب اور تعلقے دار مستقل طور پر وہاں آباد ہوگئے تھے اس لیے ان میں صرف چند ہی تھے جن کے جائیدادیں بچ رہی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر 'وسیقے' پر زندہ رہتے تھے۔ وسیقہ اس سود کو کہتے تھے جو ماہ بہ ماہ ان لوگوں کو ادا کیا جاتا تھا، اودھ حکمرانوں کے سنہرے دور میں برطانوی حکومت نے جن سے قرضے حاصل کیے تھے۔ جاگیرداری کا اپنی تمام چمک دمک اور خرابیوں کے ساتھ لکھنؤ پر راج تھا۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اس موضوع کو بہت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

لکھنؤ کوئی تجارتی مرکز نہیں تھا۔ وہاں کھانے والے تمباکو کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا اور کچھ عطر بنانے والے اداروں پر ہی ان دنوں وہاں کی تجارت مشتمل تھی۔ مگر یہ شہر مسلمان شاعروں اور مصوروں کی قیام گاہ بنا ہوا تھا، اگر چہ بہت سے برہمن خاندان بھی اس کے اطراف آباد تھے۔ اس طرح لکھنؤ مختلف فنونِ لطیفہ، متضاد فلسفیانہ طریقوں کا سنگم تھا، جس میں تیئس برس کا ایک نوجوان اپنے سیاسی ہدف کے لیے نشانے تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ سبطِ حسن نے ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی پہلی ملازمت انگریزی اخبار Pioneer سے شروع کی۔ انھوں نے بہت اچھا کام کیا ہوگا اس لیے کہ بہت جلد نہ صرف لکھنؤ بلکہ وہاں کی دانش کی سرحدوں سے باہر بھی روّیوں کی تشکیل کرنے

والے کی حیثیت سے ان کا نام لیا جانے لگا تھا۔ سبطِ حسن بہت اچھی انگریزی لکھتے تھے مگر ان کی اصل محبت اردو زبان سے تھی۔ ایک کتاب کے سوا، جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی، ان کی ساری تصنیفات اردو زبان ہی میں تھیں۔ انھیں لکھنؤ کا عالمانہ ماحول پسند تھا مگر جب حیدر آباد دکن کے اردو اخبار 'پیام' کے مالک نے اپنے اخبار کے ایک حصے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھیں کام کرنے کی دعوت دی تو بلا کسی تامل کے سبطِ حسن نے قبول کر لی۔ اس وقت اخبار کے مالک پروفیسر غفار تھے جو بہت جلد سبطِ حسن کے گرویدہ ہو گئے۔ سبطِ حسن کی بیٹی نوشابہ زبیری کہتی ہیں، جنھیں وہ ایک بیٹے کی طرح سمجھتے تھے، کہ ان دنوں بیشتر صحافی بائیں بازو کے خیالات پیش کرتے تھے۔ سبطِ حسن کا بھی ویسا ہی انداز تھا جس کی وجہ سے نظام حیدر آباد کے ریاستی کارندے انھیں ہراساں کرتے تھے۔ کیا سبطِ حسن نے حیدر آباد اسی وجہ سے چھوڑا تھا یا کمیونسٹ پارٹی نے انھیں اپنی جگہ بدلنے کے احکامات جاری کیے تھے، اس پر بحث کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس پارٹی کو میرے ملک جرمنی کے مشرقی حصے سے ہدایات دی جاتی تھیں اور مجھے یقین ہے کہ سبطِ حسن جو اپنی پارٹی کے نہایت فعال کارکن تھے خود سے فیصلے نہیں کرتے تھے، سوائے اس کے جو پارٹی کے مقتدر ارکان ماسکو سے جاری کرتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے پینتالیس برس بعد ۱۹۹۰ء میں بالآخر سوویت یونین کی کمیونسٹ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا (چار سال قبل ہی، ۱۹۸۶ء میں، سبطِ حسن کا دہلی کے ہوائی اڈے پر انتقال ہو گیا، جب وہ لکھنؤ سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقریبات میں حصہ لینے کے بعد اپنے وطن پاکستان واپس آ رہے تھے۔ (مترجم بھی اس وقت ہندوستان میں موجود تھا۔)

یہ صرف خوش قسمتی یا اتفاق نہیں تھا کہ ۱۹۴۶ء میں سبطِ حسن کو امریکا کی کولمبیا یونی ورسٹی نے پولیٹیکل سائنس پڑھنے کے لیے اسکالر شپ دے دی تھی جہاں سے سبطِ حسن ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس وقت وہ دنیا کے مشہور اخبار 'New Age' کے نمائندے کے طور پر کام کرنے کے باعث اقوامِ متحدہ میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب بین الاقوامی اشتراکیت کے خلاف میکارتھی اور اس کے ساتھی تحریک چلا رہے تھے۔ اس لیے سبطِ حسن بھی نشانہ بنے اور امریکی اربابِ اختیار نے ان کو ملک سے نکال دیا۔ سبطِ حسن کے ملک بدر کیے جانے کے دوسرے دن امریکا کے سربرآوردہ صحافیوں نے اخبار سے احتجاج کیا اور سبطِ حسن کے احترام میں اپنے مضامین دینے سے انکار کر دیا تھا جو ان کے لیے امریکی ساتھیوں کے احترام کا منھ بولتا ثبوت تھا۔

سبطِ حسن امریکا سے ملک بدر ہونے کے بعد واپس ہندوستان نہیں گئے، ان کی پارٹی نے انھیں پاکستان جانے کی ہدایت کی جو اس وقت پاکستان میں سر اُبھار چکی تھی۔ سبطِ حسن کو یہ احکامات اس وقت ملے تھے جب وہ امریکا سے نکالے جانے کے بعد چند ماہ کے لیے لندن میں ٹھہر گئے تھے۔ نوشابہ سوال کرتی ہیں کہ ''واقعی کیا یہ ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ تین ایسے افراد کو ہندوستان کے اس علاقے میں بھیجنا جہاں وہ کبھی نہیں گئے تھے، نہ وہاں کی زبان سے واقف تھے، نہ تہذیب سے تاکہ کمیونسٹ حلقے قائم کریں اور جلد سے جلد 'عالمی انقلاب' کی راہ ہموار کریں، کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے والد کو بھی بڑے شبہات رہے ہوں گے، وہ، ان کے قریبی دوست سجاد ظہیر اور ایک اور صاحب کو، جن کا نام مجھے یاد نہیں، پارٹی کا حکم بجا لانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب سب کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ پارٹی کے ان سپاہیوں کے ساتھ کیا ہو رہا تھا جنھوں نے وہ کچھ نہیں کیا جس کا حکم دیا جا رہا تھا؟''

توقع کے مطابق نیا ملک اور نیا علاقہ سبطِ حسن اور ان کے گہرے سیاسی اعتقادات کے لیے کچھ آسان نہیں تھا۔ ان کے سیاسی اعتقادات سے متفق، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض جیسے اور بہت سے ادیب اور شاعر، دانش ور افراد کی، جو خود کو سوشلسٹ یا کمیونسٹ کہتے تھے، کوئی کمی نہ تھی۔ قائدِ اعظم کے بنیادی تصور کے مطابق پاکستان کو کبھی مذہبی ریاست نہیں بننا تھا، برداشت سے اتنا عاری اور منتقم نہیں جتنا کہ یہ آج بن چکا ہے۔ اس میں 'اللہ کی حکومت' قائم کرنا مقصد نہیں تھا مگر اس نوزائیدہ ریاست کو ویسی ہی جمہوریت، اور ویسے ہی اجتماعی، برداشت کے اصولوں کے مطابق ڈھالنا تھا، اسلام کے بنیادی احکام جن کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایک ملک جو بالآخر اسلام اور ہندو مہاسبھا کے

درمیان صدیوں پرانی جاری جنگ کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

سیاست داں اور تاریخ داں جو کچھ بھی کہیں، اگر ایک لادین عالمی انقلاب ایسے ہزاروں ملّاؤں سے جنگ میں مصروف ہو جو کروڑوں غیر تعلیم یافتہ افراد کے ذہنوں اور اچھے یا بُرے خیالات پر اثر انداز ہوں گے تو کیا نتائج نکل سکتے ہیں، یہ ہم اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے تبدیل کرلیں، خدا کی جگہ لینن، اسٹالن یا کسی اور کمیونسٹ لیڈر کو رکھیں؟ انجیل یا قرآن کے مقابلے میں کارل مارکس اور ولادی میر الیانوف لینن کو تصور کرلیں؟ نتیجہ کچھ زیادہ مختلف نہیں نکلے گا!

سبطِ حسن جیسی دانش اور جذباتی سطح کے انسان کا کسی بھی قسم کے رومانوی بہادری کے اصولوں سے معاملہ مشکل ہوتا ہے۔ وہ بہت سنجیدہ اور متوازن شخصیت کے انسان تھے۔ بس ان کے ساتھ ایک ہی طرح کا جنون سا تھا جس نے ساری عمر ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ایشیا کے غریب عوام کے مسائل کا حل ڈھونڈنا ان کا دیرینہ خواب تھا۔ ان کے نزدیک آسودہ حال لوگوں کو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ عوام کی حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے اپنے راستے چلتے رہیں اور ایک مخصوص حلقے میں پُرتعیّش زندگی بسر کرتے رہیں۔ جہاں تک میرے علم میں ہے، ان کو اپنی پارٹی کی رومانوی بہادری کے اصولوں پر پورا اعتماد نہیں تھا، اس لیے کہ وہ کبھی بے لچک اور کٹر کارکن نہیں تھے، ورنہ وہ باآسانی سے 'ماسکو کے مذہب' کے ایک کامیاب 'مُلاّ' کبھی کے بن چکے ہوتے۔

میں بڑے وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ سید سبطِ حسن سیاست کے اس کھیل کے لیے موزوں نہیں تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پارٹی کے لیے اتنی طویل خدمات کے باوجود، اپنی تمام عمر میں صرف ایک بار 'حج ماسکو' کے لیے بلائے گئے تھے اگر چہ بہت سے لوگوں کی بارہا ایسی 'عزت افزائی' ہوئی تھی۔ یہ افتخار ان کی زندگی بھر کا سرمایہ تھا اور وہ بھی عمر کے آخری دنوں میں انھیں بخشا گیا تھا۔ اب ہم پلٹ کر حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ عزت افزائی نہ ہی ہوئی ہوتی تو شاید بہتر ہوتا۔

سید سبطِ حسن کو اپنے ایقان اور توقعات کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ لام پر بھیجے جانے والے، یا جنگ کے دوران غائب تصور کیے جانے والے پیشہ ور فوجیوں کی طرح ان کو بھی اپنے اقربا سے طویل عرصے کی دوری برداشت کرنی پڑی تھی۔ ان کی بیٹی صرف پانچ برس کی تھی جب وہ امریکا گئے تھے۔ نوشابہ کہتی ہیں کہ ''جب وہ امریکا گئے تھے تو ہم اور ہماری والدہ چچا جان کے پاس ڈھاکے اور چاٹگام میں مقیم رہے۔ انھوں نے ہندوستان میں مقیم میرے دادا سے درخواست کی تھی کہ ان کے حصے کی جائیداد میرے نام کردی جائے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح کم از کم میرے تعلیم کے خراجات ادا ہوتے رہیں گے۔ اور جب وہ امریکا سے واپس آئیں گے تو وہ میرے اور میری والدہ کے اخراجات اٹھانے کے قابل ہوں گے۔ آپ نے دیکھا کہ چوں کہ وہ پارٹی کے لیے کل وقت کام کر رہے تھے اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے تھے۔ اور میں اور میری والدہ اپنے آبائی گاؤں میں اس لیے مقیم نہیں رہ سکتے تھے کہ وہاں کوئی اسکول نہیں تھا۔ والدہ کہتی تھیں کہ ان کو اعزّہ کے ساتھ ہی رہنا چاہیے اس لیے کہ میں ان کی واحد اولاد تھی اور انھوں نے اپنے شوہر سے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھ کو باقاعدہ تعلیم دلوائیں گی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم لوگ مشرقی پاکستان منتقل ہو گئے تھے اور میری والدہ نے مجھے اس وقت کے بہترین اسکول میں داخل کرادیا تھا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ ہماری ساری جائیداد ضبط ہوگئی اور میرے دادا ہماری کفالت کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔ وہ یہ بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ لڑکیوں کو باقاعدہ تعلیم دی جانی چاہیے۔ مگر ہمارے چچا نے ہماری مدد کی۔ میں ان کی اور اپنی والدہ کی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اپنی کوششوں میں کوئی کمی نہیں کی۔ انھوں نے اس کو اپنا فرض سمجھ کر ادا کیا تھا۔''

یہ ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے کہ سبطِ حسن مشہور راولپنڈی سازش مقدمے میں ملوث ہونے کے الزام میں قید کردیے گئے۔ ان کو سزا نہیں ہوئی تھی۔ ان پر کچھ گھڑے ہوئے الزامات تھے جن کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ اربابِ اقتدار نے ان کو چار برس تک لاہور جیل میں قید رکھا۔ الزام ثابت نہ ہونے پر انھیں رہا تو کردیا گیا مگر ان کی سخت نگرانی کی جاتی رہی۔ کچھ دنوں تک وہ مختلف اشاعتی اداروں میں معمولی قسم

کے کام کرتے رہے، جو کسی طرح بھی قابلِ فخر نہیں تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں حکومت تک ان کی خبریں پہنچتی رہتی ہیں، اور وہ تیار رہتے تھے کہ کسی وقت بھی ان کا سرکاری مہمان خانے میں جانا ہوسکتا ہے۔ انھوں نے جیل میں کاٹے ہوئے عرصے کی بابت مجھ سے کبھی بات نہیں کی۔ مگر جب بھی حکومت تبدیل ہوتی تو وہ اپنے اہلِ خانہ اور خاندان سے کہتے تھے کہ ''میں اپنے سرہانے خشک دودھ اور چائے کی پتی تیار رکھتا ہوں، مبادا مجھے اچانک جیل جانا پڑ جائے تو کم از کم یہ دو اشیا تو میرے پاس ہوں۔'' لاہور جیل میں ان کو بیشتر قید تنہائی میں رکھا جاتا تھا۔ بس اسی قدر بات انھوں نے اپنے قریب ترین دوستوں کو بتائی تھی، اور جیل میں اپنی ذہنی کیفیت کے بارے میں یہ کہ جب وہ یہ سوچتے تھے کہ 'میں کس مشکل میں ہوں، واقعی اب میری موت قریب ہے۔' ان کے آس پاس کے لوگ تشدد سے ادھ موئے کردیے جاتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے وقت میں وہ سوچتے رہے ہوں گے یہ سب کس لیے ہو رہا ہے، اور کیوں؟ مگر انھوں نے مجھ سے اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں کی، نہ ہی اپنے کسے ساتھی سے۔

۱۹۵۸ء میں اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان نے حکومت کا تختہ الٹ دیا اور سبطِ حسن ایک بار پھر، بغیر کسی الزام اور مقدمے کے بغیر ایک بار پھر جیل بھیج کر خاموش کردیے گئے۔ اس وقت تک، ۱۹۵۵ء میں ان کی رہائی کے بعد، ان کی اہلیہ اور بیٹی مشرقی پاکستان چھوڑ کر ان سے آملے تھے۔

''میں اس وقت کالج میں پڑھ رہی تھی جب ان کو دوبارہ قید کرلیا گیا۔ خفیہ پولیس کے چیف کی بیٹی میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ اس کو ایک دن قبل ہی یہ اطلاع مل گئی تھی، جس کا ذکر اس نے بعد میں مجھ سے کیا تھا۔ وہ میرے خطوط اپنے والد کے ذریعے پہنچوادیتی تھی اور اپنے والد سے میرے والد کی جلد رہائی کی درخواست بھی کرتی رہتی تھی۔ اس دنوں تمام لوگ میرے اور میرے والد کے ساتھ ہم دردی ظاہر کرتے تھے۔ میں آزادی سے اپنے والد کو خط لکھ سکتی تھی۔ چوں کہ میرے والد اپنے سیاسی خیالات کی وجہ سے قید میں تھے اس لیے مجھے ایک ہیروئن کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ برسوں بعد جب میری شادی ہوئی تو اُن صاحب نے، جو کبھی سیکریٹری داخلہ اور خفیہ کے چیف تھے، اپنے ایک خط میں میرے والد سے اظہارِ معذرت کیا تھا کہ مجھے آپ کے خلاف بہت کچھ کرنا پڑتا تھا مگر یہ میری مجبوری تھی۔ یہ بھی لکھا تھا کہ میں آپ اور آپ کی بیٹی کے لیے روئے زمین پر موجود تمام خوشیوں کی تمنا کرتا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اپنا شرم سے جھکا ہوا سر کبھی نہیں اُٹھا سکیں گے۔ مگر وہ تو صرف ایک حکومتی کارندے تھے جو حالات کو بدل نہیں سکتے تھے۔ مگر اب، جب کہ وہ ملازمت سے فارغ ہو چکے ہیں اور آزادی سے بات کرتے ہیں، اس لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔''

ایوب خان کی حکومت نے ان کو دو برس تک نظر بند رکھنے کے بعد ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ نوشابہ کہتی ہیں، ''کئی برس بعد وہ اتنے خوش ہوئے تھے اس لیے کہ لاہور کے ایک بہت مشہور ہفتہ وار رسالے 'لیل و نہار' کے مدیر بنادیے گئے تھے۔ انھیں یہ کام بہت پسند تھا۔ وہ اس میں اس وقت تک رہے جب حکومت نے 'پرگریسیو پیپرز' کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا، جو ''لیل و نہار'' کا مالک ادارہ تھا۔ یہ ایک لاجواب رسالہ تھا۔ اب تک پاکستان ایسا رسالہ جاری نہیں کر سکا ہے۔ یہ بالکل TIME میگزین جیسا تھا اور اس کی اشاعت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ مگر پھر اس رسالے کو ضبط کرلیا گیا اور میرے والد کو اس وقت تک چھوٹے موٹے کام کرنے پڑے جب تک کہ ان کے دوست روشن علی بھیم جی نے انھیں اپنے ادارے ایسٹرن فیڈرل انشورنس میں ملازمت فراہم نہیں کردی تھی۔''

روشن علی بھیم جی ان کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی زندگی میں سبطِ حسن سے زیادہ قریب کوئی اور دوست نہیں تھا۔ سیاسی اعتبار سے دونوں کے نظریات میں وسیع اختلافات رہے ہوں گے مگر ذہنی اور جذباتی سطح پر ان میں یکسانیت تھی۔ نوشابہ زبیری نے بتایا کہ یہ دونوں کس طرح ایک دوسرے کے زندگی بھر کے دوست بن گئے۔

''میرے والد لکھنؤ میں رہتے تھے۔ وہ مشہور انگریزی اخبار پائنیر کے ایڈیٹر تھے۔ ایک دن ان کے ایک دوست رشید صاحب نے

فون پر بتایا کہ روشن علی بھیم جی نام کے ایک صاحب جو جاپانیوں کی بمباری کے باعث اپنا سب کچھ کھو کر، رنگون سے فرار ہو کر، حال ہی میں ہندوستان پہنچے ہیں، لکھنؤ آنے والے ہیں۔ انھوں نے میرے والد سے درخواست کی کہ وہ ریلوے اسٹیشن سے انھیں لے آئیں اور ان کا خیال رکھیں۔ میرے والد ان سے ملنے ریلوے اسٹیشن گئے۔ اس وقت روشن علی بھیم جی کی جیب میں صرف دو روپے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ روشن علی اب بہت بڑے آدمی ہیں مگر وہ آج بھی اسی طرح پیش آتے ہیں جیسے کہ اب بھی ان کی جیب میں صرف دو روپے ہوں، اتنے منکسر المزاج انسان ہیں وہ، انھوں نے آج تک کبھی دولت کے بارے میں بات نہیں کی ہے۔ میرے والد کی بات ہمیشہ اس جملے پر ختم ہوتی تھی کہ ان کے اور بھیم جی کے درمیان تعلقات آج بھی ویسے ہی ہیں جیسے کہ اس دن تھے جب ریلوے اسٹیشن پر ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور ان کی جیب میں صرف دو روپے تھے۔ اور یہی احساسات تھے جن کی بنا پر ان کی دوستی اس وقت تک قائم رہی جب میرے والد کا انتقال ہوا تھا۔''

زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ، ملک کے غریب لوگوں کے بارے میں ان کی فکر، شاعری سے ان کا شغف اور، غیر مذہبی سیاست کا جنون ان کی دوستی کی بنیادیں تھیں۔

میں اس وقت ای ایف یو ہی میں کام کر رہا تھا جب بھیم جی صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ ہماری کمپنی میں، جو اب ایک بڑا مالیاتی ادارہ بن چکی تھی، سبطِ حسن کو ایک اعلیٰ عہدے پر ملازم رکھنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ بھیم جی صاحب کے گھر پر اکثر سبطِ حسن سے میری ملاقاتیں ہوتی تھیں اور میں ان کے بارے میں بہت سُن چکا تھا۔ ای ایف یو کو اپنی تعلقاتِ عامّہ کے لیے بڑے پیانے پر اقدامات کی ضرورت ہوگئی تھی۔ جناب تھاور (Thaver) کی صورت میں کمپنی کو اس کام کے لیے ایک مستعد شخصیت کی معاونت حاصل تھی۔ اس وقت تک ای ایف یو ایک گھریلو نام بن چکا تھا اور اس کو نئے ساحل اور نئے افق کی تلاش تھی۔ مگر ضروری یہ تھا کہ کمپنی ہی میں کوئی ایسی شخصیت ہو جو کمپنی کی اپنی پیداوار بن سکے اور جناب تھاور کی طرح نہ صرف لوگوں کی رہنمائی کر سکے بلکہ ان میں ایسے جذبات ابھار سکے جو ملک کے عام لوگوں میں کمپنی کا امیج بڑھانے میں مدد دے سکیں۔ تو کیا سبطِ حسن جیسا فلسفی ادیب، دن کی روشنی میں خواب دیکھنے والا اس کام کے لیے موزوں تھا یا نہیں؟ اس کا جواب تو اس وقت مل سکتا تھا جب ان کو اس کام پر لگا کر تجربہ کیا جائے۔ اس کام کے لیے ایسے انسان کی ضرورت تھی جو روشن علی بھیم جیسی دور رس نگاہ اور اس پر عمل کرنے کی ہمت بھی رکھتا ہو۔ شاید بھیم جی خود خواب میں بھی یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ یہ کوشش اتنی کامیاب ہوگی۔

۱۹۸۲ء میں منائی جانے والی ای ایف یو کی گولڈن جوبلی میں اپنی تقریر میں اپنے دوست کو اس مرتبے پر فائض کرنے کے بارے میں بھیم جی کے الفاظ تھے، ''صدی کے چھٹے عشرے میں انشورنس کمپنیوں نے تشہیر پر کبھی دھیان نہیں دیا۔ ہمارے پاس ایک معمولی سا بجٹ ہوتا تھا جس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی شعبہ نہیں تھا۔ ہم نے اس کام کے لیے ایک مناسب شخصیت کی تلاش شروع کی تو ہماری نظر سید سبطِ حسن پر پڑی۔ پہلے تو انھوں نے یہ کہہ کر جواب دے دیا تھا کہ انھیں تشہیر کا کوئی تجربہ نہیں، وہ صرف ایک صحافی اور ادیب تھے۔ ہمیں یہ کام ان پر زبردستی لادنے میں کافی محنت کرنی پڑی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ای ایف یو کو ٹیلی وژن پر تشہیر کا تین بار انعام دیا گیا۔ یہ سبطِ حسن ہی تھے جنھوں نے 'ای ایف یو۔ عافیت کا نشان' جیسا نعرہ ایجاد کیا تھا جو گھر گھر مشہور ہوا، جو زندگی کے بیمے کے معنیٰ کا قریب ترین ترجمہ تھا: اگر آپ کو تابناک اور اچھا مستقبل درکار ہے تو آپ کو ای ایف یو کی ضرورت ہے۔

سید سبطِ حسن کا ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کی حیثیت سے تقرر کمپنی کی خوش قسمتی تھی۔ صحافی کی حیثیت سے سبطِ حسن کے کبھی نہ ختم ہونے والے تجربے اور ان کے علم کی دولت سے ای ایف یو کو بہت فائدہ ہوا۔ میں نے ہمیشہ ان کو ایک باکمال دانشور جانا ہے، جو نہ کبھی افسردہ ہوتا تھا، جس کے پاس دل چسپ کہانیوں اور عمدہ لطیفوں کا خزانہ ہوتا تھا، ہمیشہ مدد کے لیے مستعد، ایک ہاتھ میں پائپ شاید جس سے

نکلنے والے دھویں سے نئے نئے خیالات اور منصوبوں کے چشمے پھوٹتے تھے۔ اپنی مخصوص نظریاتی وابستگیوں کے باوجود ہر حلقے میں ان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

سبطِ حسن اور میں، ایک منزل پر، قمر ہاؤس میں پڑوسی بھی تھے اور اچھے دوست بھی۔ اگر چہ ان کے مقابلے میں میری عمر بہت کم تھی، میں ان کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں تھا، پھر بھی کبھی کبھی سیاست کے وسیع میدان میں ہم اتفاق بھی کرتے تھے۔ میرا تعلق ایسے ملک سے تھا جو کمیونسٹ اثرات کے حلقے سے بہت قریب تھا اور آمرانہ حکومت کے بارے میں میرے تجربے ان سے مباحثے میں بہت کام آتے تھے۔ انھوں نے کبھی قبول نہیں کیا تھا مگر مجھے احساس تھا کہ کبھی کبھی ان کے دل میں شبہات سر ابھارتے تھے مگر شاید کسی خاص تبدیلی کے لیے بہت دیر ہو چکی تھی۔

سبطِ حسن کو جب ماسکو آنے کا دعوت نامہ ملا تھا، میں پاکستان چھوڑ چکا تھا۔ بھیم جی نے مجھے اس بارے میں لکھا تھا اور تجویز پیش کی تھی کہ ماسکو سے واپسی پر سبطِ حسن کو نہ صرف انگلستان بلکہ میونخ بھی جانا چاہیے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ میں قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتا مگر مجھے اس بات پر بالکل حیرت نہیں ہوئی کہ وہ ماسکو کے آہنی پردے کے پیچھے سے آنے والے کسی دوستانہ اشارے کی وجہ سے میونخ نہیں گئے۔ شاید اس لیے کہ ۱۹۶۸ء میں، جب وہ ماسکو گئے تھے، جرمنی کا مغربی حصہ 'سرد جنگ' کا مرکز بنا ہوا تھا۔

سبطِ حسن کی بیٹی کے مطابق، سوویت یونین کی اپنی پہلی اور آخری یاترا کے بعد، جس کی ان کو ہمیشہ خواہش رہی ہوگی، انھوں نے کچھ زیادہ بات نہیں کی تھی۔ ''ہمیں اس بات پر حیرت تھی کہ واپسی پر انھوں نے کوئی زیادہ بات نہیں کی۔ انھوں نے سوویت یونین پر نکتہ چینی بھی نہیں کی تھی مگر ہمیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہاں کے حالات بہت اچھے بھی نہیں تھے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ خوش نہیں تھے اور انھیں وہاں دوبارہ جانے کی کوئی خواہش بھی نہیں تھی۔ وہ بڑے تنقیدی دماغ کے مالک تھے اور ماسکو والے اس بات کو جانتے رہے ہوں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اتنے دنوں تک وہ ان کو نظر انداز کرتے رہے۔ سبطِ حسن کسی سے بھی ناانصافی کے سخت خلاف تھے۔ انھیں اپنے نظریات پر پورا اعتماد تھا اور وہ سچ مچ اس بات کے قائل تھے کہ کمیونزم ہی دنیا کی نجات کا باعث ہوگی۔ وہ کسی بھی صورت میں طاقت کے استعمال کو بُرا سمجھتے تھے۔ سوویت یونین سے واپسی پر ان میں تبدیلی آ گئی تھی، وہ بہت پُرسکون ہو گئے تھے۔ مگر انھوں نے خاموش رہنا ہی پسند کیا تھا۔ میرے خیال میں انھیں اس بات کا احساس تھا کہ اگر انھوں نے بولنا شروع کیا تو انھیں اپنے دلی خیالات کا اظہار کرنا پڑے گا، اس لیے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ وہ ہمیشہ وہی کہتے تھے، ان کی نظر میں جو صحیح ہوتا تھا۔ انھیں خراب نتائج کی کبھی پروا نہیں رہی۔ اور شاید ان کی زندگی کا یہی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔''

سید سبطِ حسن کمیونسٹ سلطنت کا زوال دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے۔ وہ ستر برس پرانا 'آہنی پردہ' اُٹھنے اور کمیونزم کے زوال سے پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ''یہ پہلا موقع تھا جب میں واقعی خوش تھی کہ وہ زندہ نہیں تھے۔ ان دنوں ہم لوگ ملک سے باہر تھے اور برلن، بوڈاپسٹ، بخاریسٹ، وارسا اور دوسرے مقامات پر جو کچھ ہو رہا تھا ٹیلی وژن پر دیکھ رہے تھے۔ ہم نے سارا ڈھانچا سب نرم گودے سے بنی ہوئی عمارت کی طرح ڈھیتے دیکھا۔ میرے شوہر نے کہا تھا، کیا تم خوش نہیں ہو کہ ڈیڈی یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں؟ تم نے دیکھا، یہ سب ایک خواب تھا۔ کم از کم اب تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خواب تھا۔''

سید سبطِ حسن کا انتقال ہندوستان میں ۱۹۸۷ء میں، دلّی میں ہوا۔ وہ اُس سال دلّی میں منعقد ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقریبات کے منتظمین میں سے ایک تھے۔ انھوں نے کراچی میں ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے بہت محنت کی تھی۔ نوشابہ کہتی ہیں، ''وہاں کئی لوگ ان کی مدد کے لیے موجود تھے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ وہ کسی کو اہم ذمے داری سونپنے کے معاملے میں اچھے نہیں تھے۔ انھوں نے سب کچھ خود کرنا چاہا تھا۔ وہ بہت کم زوری محسوس کر رہے تھے، اس قدر کہ انھوں نے ڈاکٹر مانجی سے مشورہ بھی کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ کوئی خاص بات نہیں تھی ۔ انھیں تامل تھا مگر انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دلّی نہیں جائیں گے۔ مگر آخر وقت میں انھوں نے اپنا ارادہ اس لیے بدل دیا کہ ماسکو سے احکامات ملے تھے کہ دلّی میں ان کی موجودگی ضروری تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا، 'میں ایک کمیونسٹ کارکن ہوں اور میں پارٹی کا حکم بجالاؤں گا' اور دلّی چلے گئے۔ کانفرنس کے بعد وہ ذاتی حیثیت میں لکھنؤ چلے گئے تھے جہاں سے ان کی بہت سی جذباتی یادیں وابستہ تھیں۔ انھوں نے اپنے ایک قریبی دوست سے کہا تھا کہ 'میں نہیں سمجھتا کہ یہاں آجانے کے بعد میں کبھی پاکستان زندہ جاسکوں گا۔'

وہ دلّی واپس گئے اور ان کو دل کا شدید دورہ پڑا جس سے وہ جاں بر نہیں ہو سکے۔ ان کا جسدِ خاکی کراچی لایا گیا جہاں ان کی تدفین ہوئی۔ ان کی موت پر ہر طرف سے تعزیت کی گئی، جس میں سیاسی جماعتیں اور ممالک کے سربراہ بھی شامل تھے۔

(یہ واقعہ دراصل اپریل ۱۹۸۶ء کا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کا جلسہ دلّی میں نہیں، سجاد ظہیر کے آبائی شہر لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ راقم خود اس جلسے میں موجود تھا، جب سبطِ حسن پاکستان سے آنے والے وفد کے صدر تھے اور ڈائس پر جلوہ افروز تھے۔ انھوں نے بوسکی کا کُرتہ اور سفید لٹھے کی شلوار زیب تن کر رکھی تھی۔ لکھنؤ کے جلسے کے بعد سبطِ حسن اپنے کامریڈ ساتھی ضیاء الحق سے ملنے الٰہ آباد گئے تھے۔ واپسی کے وقت پاکستان سے آنے والے وفد کے استقبال کے اعزاز میں غالب اکادمی دلّی میں ایک جلسہ معین تھا مگر اسی دن صبح سبطِ حسن کو دل کا دورہ پڑا، وہ ابوالکلام اسپتال میں داخل ہو کر انتقال کر گئے اور غالب اکادمی کا استقبالیہ جلسہ سبطِ حسن کے لیے تعزیتی جلسے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ مترجم)

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک سربرآوردہ رُکن، سبطِ حسن اردو کے بہترین ادیبوں میں سے تھے۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئی تھیں اور آج بھی پڑھی جاتی ہیں۔ ریاستی لادینیت اور مسلم اُمّہ اور بالخصوص پاکستان کے تناظر میں ملّائیت ان کے محبوب موضوعات میں سے تھے۔ ان کی کتابیں بہت سے فلسفیانہ، تہذیبی اور تاریخی موضوعات کا احاطہ بھی کرتی ہیں۔ ایک زیرِ تصنیف کتاب جو ان کی موت کی وجہ سے مکمل نہیں ہو سکی، ان کے بہت قریبی دوست اور اردو کے بہت بڑے شاعر فیض احمد فیض کے بارے میں تھی جو انھوں نے فیض کی موت کے بعد لکھنی شروع کی تھی۔ اس کتاب میں وہ فیض کی نظموں کے تہذیبی اور سیاسی پس منظر کی تلاش میں تھے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب بڑی ادبی اہمیت کی حامل ہے اس لیے کہ ان کے علاوہ علی گڑھ کے دنوں سے شاید ہی کوئی ان سے زیادہ فیض سے قریب رہا ہوگا۔

سبطِ حسن اب اپنی تحریروں میں اور اس کردار میں زندہ ہیں جو انھوں نے ایسٹرن فیڈرل کے تعلقاتِ عامّہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کمپنی کو عوام میں مقبول بنانے میں ادا کیا تھا۔

ایس ایف عالم اپنے چیئرمین روشن علی بھیم جی کے ہمراہ

روشن علی بھیم جی ، ایس ایف عالم اور آغا ناصر علی یونائیٹڈ بینک سے گروپ انشورنس کے معاہدے پر مسرور،
یو بی ایل کے مندر راوالا بھی مطمئن نظر آ رہے ہیں

ایس ایف عالم
ایک بے عیب اور معتبر انسان

شاہ فیاض عالم ایک خاموش طبع، سادہ مزاج مگر بہت غیر معمولی انسان تھے۔ ان کا مضبوط کردار اور مستعد ذہن ان کی حلیم الطبعی اور منکسر المزاجی کے بالکل برعکس تھا اور یہی ان کی مخصوص پہچان تھی، کم از کم ان لوگوں کے لیے جنھیں ان کی قربت میسر تھی۔ جب ۱۹۶۰ء میں میری ان سے ملاقات ہوئی انھوں نے اپنی شکل وصورت، اپنے نرم خو اور فیصلہ کن اندازِ گفتگو، تصورات اور شریفانہ مزاج سے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ کمپنی کے لائف ڈپارٹمنٹ میں طویل ترین عرصے سے منسلک افسران میں سے ایک تھے۔

وہ ۱۹۱۸ء میں غازی پور میں پیدا ہوئے تھے، ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ سے بیچلر آف آرٹس اینڈ لا فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ اس زمانے میں وہ کھیل کود میں اور سماجی مصروفیتوں میں بہت فعال تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر، سر شاہ سلیمان نے ایک بار ان کو اپنی تعلیمی کوششوں پر اعزاز سے نوازا تھا۔

گریجویشن کے بعد انھوں نے وکالت شروع کردی تھی۔ تقسیم ہند سے قبل ۱۹۴۵ء میں ای ایف یو میں شامل ہوئے اور جلد ہی کمپنی کی کانپور شاخ میں برانچ منیجر ہو گئے۔ وہ کمپنی کے لائف اور جنرل کاروبار دونوں کے اس وقت تک ذمّے دار رہے جب ۱۹۵۷ء میں ہندوستان کی حکومت نے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ چوں کہ کمپنی کو جنرل بیمے کے کاروبار کے لیے ایک کُل وقتی نگہبان کی ضرورت نہ تھی اس لیے عالم صاحب کا کراچی کے لائف ڈپارٹمنٹ میں بہ حیثیت اسسٹنٹ منیجر تبادلہ کردیا گیا۔

اس کے بعد کئی برس کے دل چسپ عرصے میں جو کچھ ہوا وہ عالم صاحب کے لیے مشکل مگر ذاتی طمانیت کا باعث بھی تھا۔ عالم صاحب نے صدی کے چھٹے عشرے میں کمپنی کے کاروبار کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا جس کے نتیجے میں ان کو لاہور میں زونل منیجر کے عہدے پر فائز کردیا گیا۔ ان کی اعلیٰ کارگزاری کو ۱۹۶۴ء کی کمپنی کی سالانہ رپورٹ میں بطورِ خاص سراہا گیا تھا۔ بالآخر ان کو لائف انشورنس کے جنرل منیجر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی اور وہ ملک میں لائف انشورنس کے ایک اہم پیشہ ور افسر کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ محمد حسین علوی، شرافت علی والاجاہی اور کمپنی کے میڈیکل ڈائریکٹر ڈاکٹر تاج الدین مانجی کی ہمراہی میں عالم صاحب، کمپنی کے سربراہ مسٹر بھیم جی دستِ راست سمجھے جاتے تھے۔ اور یہ حیرت کی بات نہیں تھی کہ جب ۱۹۷۲ء میں پاکستان کی بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیا گیا تھا عالم صاحب امریکن لائف انشورنس کمپنی کے ٹرسٹی مقرر کیے گئے تھے۔

اور یہ بھی کچھ حیرت کی بات نہیں تھی جب ۱۹۷۵ء میں مسٹر بھیم جی نے آغا حسن عابدی صاحب کے لکسمبرگ میں قائم شدہ بینک کی مدد سے کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کی دبئی میں بنیاد ڈالی تو عالم صاحب کو لائف ڈپارٹمنٹ کا سربراہ مقرر کیا گیا۔

کمپنی کے لائف ڈپارٹمنٹ نے فروری ۱۹۷۹ء میں اپنا کاروبار شروع کیا تھا اور عالم صاحب نے ڈپٹی منیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت

سے اس کا انتظام سنبھالا تھا۔ یہ ایک نہایت دل چسپ مگر مشکل ذمے داری تھی۔ یا عالم صاحب کے بہت قریبی رفیق جناب ایس اے نقوی کے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ''کسی کمپنی کے لیے ایک نئے ملک میں جہاں یہ کاروبار پہلی بار کیا جا رہا ہو اور جہاں ملک ملک کے باشندے مقیم ہوں، بہت دقت طلب اور ایک بہت پیچیدہ کاروبار تھا۔ ایک اندازے کی مطابق دبئی میں ۵۸ قومیتوں کے باشندے اپنی تمام تر مخصوص ضرورتوں، سماجی اور معاشی پیچیدگیوں کے ساتھ صرف دولت کمانے کے لیے اکٹھے ہوگئے تھے۔ جہاں ہر شخص صرف 'آج' کے لیے سوچتا ہو جب کہ بیمۂ زندگی 'کل' کی ضروریات کو پورا کرتا ہے وہاں زندگی کے بیمے کی فروخت کا کاروبار ایک کارِ دُشوار تھا۔''

تعجب نہیں کہ عالم صاحب جیسی لیاقت اور منجھی ہوئی کاروباری صلاحیتوں کے ہوتے ہوئے نئی سرزمین پر نئی کمپنی بہت جلد ایک طاقت بن کر ابھری۔ ان کی ذاتی دیانت، معیاری درجے کی وفاداری، فسوں کار اور دوستانہ شخصیت نے انھیں ایک قابلِ اعتماد اور ساتھیوں کے بین پسندیدہ افسر بنا دیا تھا۔ جناب بھیم جی اور ان کے دوسرے ساتھیوں، دبئی کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر امیر علی مولیدینا اور ای ایف یو جنرل کے موجودہ مینجنگ ڈائریکٹر سیف الدین زومکاوالا سمیت سبھی عالم صاحب کا احترام کرتے تھے۔

سیف الدین زومکاوالا کہتے ہیں کہ ''وہ بہت نفیس انسان تھے۔ بڑے منجھے ہوئے اور خوش پوش، اور زندگی کے ہر پہلو سے ایک اچھے آدمی تھے۔ مجھے دبئی میں اپنے ابتدائی دنوں کا ایک واقعہ یاد ہے جب ہم سب ایک 'ایئر لائنز ہوٹل' میں مقیم تھے جس کی جگہ اب ایک نیا ہوٹل تعمیر ہو چکا ہے۔ ایک صبح مجھے ساڑھے چار بجے ایک مہمان کو لینے کے لیے ہوائی اڈے جانا تھا۔ اس ہوٹل کی لابی ایک مستطیل ہال کمرے پر مشتمل تھی جہاں مجھے عالم صاحب نظر آئے۔ وہ ایک لانبی قمیص اور پاجامے میں ملبوس ٹہل رہے تھے۔ وہ بالکل خاموش چہل قدمی کر رہے تھے۔ میں ان کو اتنے سویرے اس حال میں دیکھ کر متفکر ہوگیا کہ انھیں کوئی پریشانی تو لاحق نہیں۔ میں نے بڑھ کر ان سے پوچھا 'سر! خیریت تو ہے؟ وہ مسکرائے اور بولے آپ فکر نہ کیجیے، میں ہر صبح اسی طرح ٹہلتا ہوں، اسی وقت میرے ذہن میں اچھے خیالات آتے ہیں'۔

ان کی یادداشت حیرت انگیز تھی۔ انھیں خریداری بہت پسند تھی، اس میں انھیں بہت لُطف آتا تھا۔ اس بابت معلومات حاصل کرنے کے لیے ان سے بہتر کوئی نہیں تھا جو آپ کو بتا سکے کہ کس دکان میں کون سی شے، کس معیار کی اور کس قیمت پر مل سکتی ہے۔ اس معاملے میں وہ کمپیوٹر کی طرح تھے۔ اور ہم سب کی طرح وہ بھی لائف ڈپارٹمنٹ کو بہترین انداز میں چلا رہے تھے۔ ان کے اور امیر علی مولیدینا کے بین ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ تھی کہ ایک جنرل کا اور دوسرا لائف کا چیف ایگزیکٹیو تھا، دونوں نفیس انسان تھے اور اگرچہ وہ دونوں اپنے اپنے معاملات میں آزاد تھے مگر ان کے درمیان ایک طرح کی ہم آہنگی تھی کہ دونوں بازو اس طرح چلائے جائیں کہ ایک ہی جیسے معلوم ہوں۔ بلاشبہ دونوں شعبے آپس میں اس طرح گتھے ہوئے تھے کہ ایک ہی شعبے کی طرح کام کر رہے تھے۔''

اٹھائیس نومبر ۱۹۸۵ء کو ۶۷ برس کی عمر میں اچانک ان کے انتقال سے ای ایف یو گروپ کو بہت بڑا نقصان ہوا تھا۔ ان کو دل کا شدید دورہ پڑا تھا اور اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے خالق سے جا ملے تھے۔

ان کے رفیقِ کار امیر علی مولیدینا نے مجھے ٹیلی فون پر یہ افسوس ناک خبر سنائی۔ مجھے بھی بہت دُکھ ہوا تھا اس لیے کہ میں ہمیشہ ان کو پرانی اور نئی ایسٹرن فیڈرل کے درمیان ایک پُل کے مانند سمجھتا تھا، تقسیم سے قبل یعنی ٹام بیکسٹر اور خوند کر فضلِ حیدر کے زمانے کی ایسٹرن فیڈرل یونین اور نئی ایسٹرن فیڈرل جو روشن علی بھیم جی کے زیرِ انتظام ابھری تھی۔ عالم صاحب نے کمپنی میں کامیابی سے نئی روح پھونکنے کے عمل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ پرانے کشتی بانوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ اختیار کردہ نئی راہ ہم کو نئے آفاق کی طرف لے جائے گی۔

جیسا کہ مسٹر ایس اے نقوی نے کہا تھا، ''عالم صاحب ایک حرکی، راست، منظم اور اختراعی خصوصیات کے حامل تھے اور مشکلوں سے مقابلہ کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ دراصل ان کی زندگی غیر معمولی کامیابیوں کی داستان تھی اور وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے انسان تھے۔''

جناب شرافت علی والاجاہی (اندازاً ۱۹۷۵)

شرافت علی والا جاھی

ہمیشہ ایک قدم آگے

وہ اس وقت وہاں موجود تھے جب میں نے اپنی زندگی کے یادگار سال ای ایف یو میں شروع کیے تھے، اس وقت بھی جب کمپنی لندن میں ہونے والے واقعات کے بھنور میں تھی، اس وقت وہ اپنے پیشے کی فنی علامت بن کر ابھرے تھے جب سیاست اور کاروبار کو عوام کے نام پر گڈمڈ کردیا گیا تھا، جنھوں نے نہ توقع کی تھی نہ ہی وہ کچھ مانگا تھا جو اقتدار نے مناسب سمجھا تھا: بیمے کی صنعت کا قومی ملکیت میں لیا جانا۔ اور بلاشبہ انھوں نے میری رہنمائی کی تھی جب میں کمپنی اور اس ملک کے ابتدائی دنوں میں ماضی کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ میرے گُرو اِرون آئیون نے جرمنی سے چلنے سے قبل مجھے ان کا نام لے کر ان کا غائبانہ تعارف کرایا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ای ایف یو کے لیے صحیح راستہ تلاش کرنے میں اور نئے ملک کے اندازِ زندگی کو سمجھنے میں یہ میرے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ میرا دوست، اور باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی درست نکلا، اور جس آدمی کا نام اس نے مجھے بتایا تھا وہ میرا دوست بن گیا، اس کا نام شرافت والا جاہی ہے۔

وہ اپنے اعلیٰ درجے کے تعلیمی اور خاندانی پس منظر کے اعتبار سے کمپنی کے ابھرتے ہوئے افسران میں سے ایک تھے۔ وہ ۲۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے تھے مگر اُن کی تعلیمی اسناد میں پیدائش کا مہینہ ستمبر درج ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ لاہور سے میٹرک کا امتحان دینا چاہ رہے تھے تو ان کی عمر کم سے کم سے عمر سے دو ماہ کم تھی۔ لہٰذا ان کے بڑے بھائی نے جو انھیں لے کر لاہور گئے ہوئے تھے، ان کی تاریخِ پیدائش میں تبدیلی کردی تھی، جس سے بظاہر کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔

وہ حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے پردادا The Prince of Arcot ریاست کے حاکم تھے۔ ان کا نام محمد علی والا جاہ تھا اور میسور کے سلطان ٹیپو اور نظام حیدرآباد کے ہم عصر تھے۔ نظام حیدرآباد ہندوستان کی ریاست کے واحد حکمراں تھے جو His Exalted Highness کے خطاب سے نوازے گئے تھے۔ میرے دوست شرافت کے مطابق برطانوی دور میں جنوبی ہندوستان میں صرف یہ تین ریاستیں تھیں۔ اس کتاب کے سلسلے میں میری ملاقات شرافت سے متحدہ عرب امارات کی ریاست عجمان میں ان کے خوب صورت دفتر میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنی ایک ٹیکسٹائل فیکٹری چلا رہے ہیں۔ ان کے والد نواب نوراللہ والا جاہی مدراس سے حیدرآباد منتقل ہوگئے تھے اور وہیں شرافت کی ولادت ہوئی اور انھوں نے تعلیم پائی۔ وہ ایک ہونہار شاگرد تھے، ہمیشہ دوسروں سے ایک قدم آگے۔ ان کی عمر صرف برس کی تھی جب انھوں نے براہِ راست میٹرک کے امتحان میں بیٹھنا چاہا تھا۔ اگر وہ اسکول کی معرفت جاتے تو ایک برس اور انتظار کرنا پڑتا۔ ایک سال قبل ہی میٹرک کر لینے کا یہی راستہ تھا کہ وہ پنجاب بورڈ سے امتحان میں بیٹھتے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں ان کی تاریخِ پیدائش میں ردو بدل کیا گیا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے 'چندر گھاٹ' کالج میں داخلہ لے لیا اور اپنے شہر کی عثمانیہ یونی ورسٹی سے معاشیات اور سیاسیات میں گریجویشن کیا۔

اس یونی ورسٹی کی اپنی خصوصیت رہی ہوگی اس لیے کہ اس کو حضور نظام سابع میر عثمان علی خان کا ایک اپنی ریاست کے تعلیمی شعبے کے لیے، ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ اور اردو زبان کے لیے، یادگار تحفہ کہا جاتا ہے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھی جہاں اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا تھا اور یہ اس زمانے میں ایک متنازعہ فیصلہ تھا۔ سیاسی اعتبار سے نہایت متنازعہ تھا اور یاد رہے کہ آرٹس کالج کی جگمگاتی ہوئی عمارت کا افتتاح کرتے ہوئے خود نظام نے اس بات کو دُہرایا تھا۔ وہ عمارت ترکی، ایرانی اور دکن طرزِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ تھی۔

نظام نے فرمایا تھا، ''اردو زبان کی طرح یہ عمارت بھی حیدرآباد میں مقیم مختلف نسل کے لوگوں کے اندازِ زندگی اور ان کی تہذیبوں اور تمدن ان کی آئینہ دار ہے۔ یہ عمارت اس باہمی دوستی کا بھی خوش نما نمونہ ہے جو میری ریاست میں صدیوں سے بسنے والی رعایا کے درمیان قائم ہے اور میں اسے مزید قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔''

میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ شرافت والا جاہی نظام کے آزاد رو اور دور رس اندازِ حکمرانی سے بہت متاثر تھے۔ بچپن ہی سے انھیں ہر اس علم کو حاصل کرنے کا جنون تھا جس میں انھیں دل چسپی ہوتی۔ زندگی کی ابتدا ہی سے ان کی غیر معمولی قوتِ ارادی اور ان کا عزم ان کے اعمال پر حاوی رہا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعے ہوئی تھی مگر جلد ہی انھوں نے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کر لی۔ وہ اپنے ذاتی خرچ سے انگریزی زبان کے تمام اخبارات منگواتے، جس میں ٹائمز آف انڈیا بھی شامل تھا۔ اخباروں سے وہ نوٹ بناتے، جو جملے انھیں بھاتے کاغذ پر نقل کرتے اور ان کو یاد کرنے کی کوشش کرتے۔

سیاست کے تمام معاملات میں شرافت کی ابتدائی دل چسپیاں انھیں والد سے ورثے میں ملی ہوں گی جو ایک زمانے میں ریاست حیدرآباد کے مرکزی سیاسی ادارے کے خازن رہ چکے تھے۔ اگر چہ وہ ایک قسم کی مقامی پارٹی تھی مگر اس کی سیاست ہندوستان کے طول وعرض میں تھی اور اس کے رہنما ہندوستان کی تاریخ کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ وہ بہت معروف نہیں تھے اس لیے کہ وہ نوابی سے سیاست کی طرف راغب ہوئے تھے مگر خطابت کی اعلیٰ صلاحیت کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ ان کا نام بہادر یار جنگ تھا، اور وہ صدر تھے ایک بڑی پارٹی کے جس کا نام تھا مجلسِ اتحاد المسلمین۔ وہ حیدرآباد کے، مگر دراصل مسلم امہ کے رہنماؤں میں سے، پٹھان شرفا کی نسل سے تھے۔ قدرت نے انھیں بہت نعمتوں سے نوازا تھا جن کی شخصیت سے نوجوان والا جاہی نے کسبِ فیض کیا ہوگا۔ بہادر یار جنگ کے بارے میں بات کرتے ہوئے شرافت والا جاہی نے کہا، ''وہ لاکھوں کے مجمعے کو اپنی تقریر کے وقت پوری رات جمع رکھ سکتے تھے۔ اس بات کا میں خود گواہ ہوں کہ لوگ (ان کو سننے کے لیے) آٹھ بجے شام کو آتے اور دوسری صبح آٹھ بجے گھر واپس جاتے تھے۔ اور اسٹیج پر ان کے سوا کوئی اور شخص نہیں ہوتا تھا۔ نظام ان کا بہت احترام کرتے تھے اور جناح صاحب ان کو چاہتے بھی تھے اور مشورے بھی دیتے تھے۔

بڑے مقررین نے ہمیشہ شرافت والا جاہی کو مسحور کیا ہے۔ جب سے شرافت نے لکھنا پڑھنا شروع کیا ہے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے۔ شرافت نے نواب کو اپنی صلاحیتوں سے متاثر کیا ہوگا اس لیے انھوں نے شرافت کو ایک بہت بڑے مجمعے کے سامنے، جو نواب صاحب کو سننے کے لیے جمع ہوا تھا، اپنی پہلی تقریر کرنے کے لیے کہا۔ اس وقت شرافت صرف دس برس کے تھے مگر انھیں سیاست اور عوام کی پسندیدگی میں دل چسپی ہو گئی تھی۔ شرافت کہتے ہیں، ''یہ ایک تاریخی موقع تھا جب ایک دس برس کے بچے کو پچاس ہزار کے مجمعے کے سامنے تقریر کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ شرافت نے بڑی محنت سے اپنی تقریر کا متن تیار کیا، جس میں ان کے والد نے، جو خود اچھے مقرر تھے، اور علامہ رشید ترابی، جو ایک شیعہ رہنما تھے اور اپنی مجالس کی وجہ سے مشہور تھے، ان کی مدد کی تھی۔ یہ کوشش بہت کامیاب رہی ہوگی اس لیے کہ بقولِ شرافت ''تقریر کے بعد ایک بہت بڑا PCS افسر میرے والد کے پاس آیا اور مجھے بھی PCS افسر بننے کا مشورہ دیا۔ وہ میرے سیاسی لہجے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس نے کہا تھا کہ اربابِ اقتدار نے اس تقریر کو پسند نہیں کیا ہوگا۔''

شرافت کو بہادر یار جنگ سے اپنے رشتے پر بہت فخر تھا جن کی شخصیت ان کے لیے ایک اعلیٰ مثال کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کی رہنما شخصیت جن قدروں پر یقین رکھتی تھی: وفاداری، ہندو مسلم برابری، مذہبی اقلیتوں کے حقوق اور مخالفین کی رائے کا احترام۔ یہ تھیں وہ خصوصیات جو شرافت کے فلسفۂ زندگی کی مشعلِ راہ تھیں جو کامیاب پیشہ ورانہ زندگی میں ان کا نشانِ امتیاز تھیں۔

آزادی اور ہندوستانی افواج کے حیدر آباد پر حملے نے شرافت کو قائل کر دیا تھا کہ ان کے مولد وطن میں ان کے لیے کوئی مستقبل نہیں اور انھوں نے اپنے ایک قریبی دوست عزیز الرحمٰن کے ہمراہ مسلمانوں کے نئے وطن پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قائدِاعظم کے انتقال کے کچھ دنوں بعد، ۱۶ر نومبر ۱۹۴۸ء کو بمبئی سے روانہ ہوئے اور ۱۹ر تاریخ کو کراچی پہنچ گئے۔ شرافت نے بتایا کہ ''وہ اتوار کا دن تھا اور ہم نے ایک وکٹوریہ نامی سواری لے لی، جو آج بھی اِکا دُکا دکھائی دے جاتی ہے۔ ہمیں حیرت ہو رہی تھی کہ ایک ملک کا دارالحکومت ہونے کے باوجود اس کی سڑکیں سنسان کیوں ہیں۔ ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ اتوار کا دن تھا، سڑکیں بالکل خالی مگر صاف ستھری تھیں۔ ان دنوں کراچی میں گاڑیاں بہت کم ہوا کرتی تھیں۔''

شرافت کے والد اور دوسرے اہلِ خانہ حیدر آباد ہی میں رہ گئے تھے۔ شرافت بالکل اکیلے تھے مگر انھیں کوئی خوف نہیں تھا۔

شرافت کو اپنا وہ تجربہ بہت یاد آیا جب انھوں نے نوعمری میں پچاس ہزار کے مجمعے میں تقریر کی تھی، اور بقول ان کے اگر انھیں کوئی افسوس تھا تو یہی کہ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ آئے ہیں، جس میں وہ نوعمری کی یادیں بھی تھیں۔ انھیں اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کے والد نے اس جگہ کو نہ چھوڑنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ اس شہر میں ان کی عزت بھی تھی اور وسیع رقبے پر مشتمل زمینیں بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ایک بڑی بیمہ کمپنی، 'نیو انڈیا' کے جنرل ایجنٹ بھی تھے۔ وہ پوری ریاست حیدر آباد کے لیے اس کمپنی کے ایجنٹ تھے اور ہمیشہ کمپنی میں سب سے زیادہ کاروبار کرنے والوں کی فہرست میں ان کا نام ہوتا تھا۔ شرافت کو نیو انڈیا انشورنس کمپنی کے نفاست سے سجائے ہوئے آنے والے خوب صورت تحائف بھی یاد تھے جن پر بڑے بڑے لفظوں میں With Compliments to Nawab Noorullah Walajahi تحریر ہوتا تھا جن سے وہ بہت مرعوب ہوتے تھے۔ انھیں اس وقت خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ بھی انشورنس کی صنعت سے وابستہ ہوں گے، اور بہت کامیاب بھی ہوں گے۔ شرافت وکیل بننا چاہتے تھے، ایک بہت مشہور وکیل، اور انھیں امید تھی کہ ایک دن وہ ایک معروف اور باعزت بیرسٹر بن کے اپنے شہر واپس لوٹیں گے۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔ آج انھیں ایک مناسب نوکری کی تلاش تھی۔ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں دو ہوائی کمپنیاں کام کر رہی تھیں ان میں سے ایک تھی اورینٹ ایئر ویز جو اصفہانی کی تھی اور دوسری تھی پاک ایئر جو پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد کے داماد مجید ملک کی تھی۔ شرافت نے نائب افسرِ شماریات کی حیثیت سے پاک ایئر میں ملازمت کر لی۔ انھیں اس ادارے کی ملازمت اچھی لگی تھی۔ اس میں عبداللہ بیگ جیسے دل چسپ لوگ بھی کام کرتے تھے، جو پاکستان کے سب سے مشہور ہواباز تھے۔ پاک ایئر کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑ گیا تھا اس لیے کہ اس کا ایک جہاز تباہ ہو گیا تھا جس میں پاکستانی فوج کے بہت اہم جنرل مارے گئے تھے۔ اب شرافت کو نئی ملازمت کی تلاش تھی، مگر ان جیسی اسناد رکھنے والے کے لیے یہ زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

''مجھے یاد ہے کہ میں ۱۹۵۰ء میں ایسٹرن فیڈرل کے دفتر گیا تھا جو اُن دنوں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے قریب لائڈز بینک بلڈنگ میں واقع تھا۔ یہ بڑی خوب صورت عمارت تھی۔ ای ایف یو کا دفتر پہلی منزل پر تھا۔ میں دفتر میں داخل ہوا اور اپنا کارڈ دیا، جس پر صرف میرا نام چھپا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس وقت کے ڈپٹی جنرل منیجر مسٹر ای سی آئیون نے انٹرویو کے لیے طلب کیا۔ حالاں کہ میرا ان سے وقت طے نہیں تھا نہ میرے پاس کوئی سفارش تھی مگر وہ مجھ سے پندرہ منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے صرف یونہی کوشش کی تھی اس لیے کہ مجھے نوکری کی تلاش تھی۔ اور میں کئی بینکوں اور بیمہ کمپنیوں میں جا چکا تھا۔ میں ایون صاحب سے مل کر بہت متاثر ہوا تھا اور

شاید وہ بھی مجھ سے متاثر ہوئے تھے اس لیے کہ فوراً ہی انھوں مجھے ملازمت کی پیش کش کردی تھی اور میں نے ۲۰ راگست ۱۹۵۰ء سے کام کرنا شروع کردیا تھا۔ جی ہاں، آج سے ٹھیک سینتالیس برس قبل۔ ان دنوں بیمے کی صنعت کے زیادہ تر تجربے کار لوگ ای ایف یو ہی میں کام کرتے تھے۔ مسٹر ہیکسٹر جنرل منیجر تھے اور مسٹر آئیون ان کے نائب تھے۔ بڑے بڑے کیبن ان کے دفتر تھے۔ ان کے سامنے وصال الدین، جو اس وقت لائف منیجر تھے، جناب اختر آزاد جو فائر ڈپارٹمنٹ کے کرتا دھرتا تھے، پھر مسٹر ہاشم میرین ڈپارٹمنٹ اور مسٹر تحسین احمد کلیمز ڈپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ منیجر تھے۔

لائف ڈپارٹمنٹ میں پندرہ بیس افراد کام کرتے تھے اور مجھے اسی شعبے میں مقرر کیا گیا تھا۔ علی اکبر نام کے ایک صاحب جو بہت تجربے کار آدمی تھے انڈر رائٹنگ کرتے تھے اور مجھے تربیت کے لیے انھیں کے ساتھ کر دیا گیا۔ مجھے جونیئر افسر کا عہدہ دیا گیا تھا جس پر میں ۱۹۵۲ء تک کام کرتا رہا۔ مسٹر ایس ایم شاہ نے، جو بعد میں یونیورسل لائف انشورنس کے جنرل منیجر بن گئے تھے، از راہِ مہربانی، برٹش انشورنس ایسوسی ایشن کے وظیفے پر انگلستان جانے کا بندوبست کر دیا۔ اس زمانے میں شاہ صاحب حکومتِ پاکستان کے انشورنس ڈپارٹمنٹ میں سپر نٹنڈنٹ بھی تھے اور پاکستان انشورنس انسٹی ٹیوٹ کے سیکریٹری بھی۔ اس وجہ سے ان کے انگلستان میں رسوخ تھے۔ میں بے حد مسرور تھا۔ میں نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ اسی زمانے میں مسٹر کے ایف حیدر نے مسٹر ہیکسٹر سے کمپنی کے چیف ایگزیکٹو کے عہدے کا اختیار لیا تھا۔ وہ بھی بہت مہربان تھے۔ وہ نہایت اچھے انسان تھے۔ مجھ سے ان کا سلوک باپ جیسا تھا۔ انشورنس میں وہ نو وارد تھے، اگر چہ وہ ای ایف یو کے بنیاد گزاروں میں سے ایک تھے۔ وہ مسٹر ای سی آئیون پر بہت اعتماد کرتے تھے اور دراصل انڈر رائٹنگ اور کاروبار کے دوسرے معاملات کے ذمے دار تھے۔ میرے لندن کے قیام کے دوران انھوں نے میری بہت ہمت افزائی کی تھی۔ وہ اتنے بڑے افسر اور میں ایک چھوٹا سا جونیئر افسر۔ وہ کمبر لینڈ ہوٹل میں مقیم تھے جس کا ان دنوں کرایہ ایک پونڈ اور دس شلنگ تھا۔ میرے وظیفے کی رقم پانچ پونڈ فی ہفتہ تھی اس لیے مجھے ہوٹل کا کرایہ اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے اُن سے دوپہر کے کھانے کی دعوت پر اصرار کیا جس پر انھیں بہت حیرانی ہو رہی تھی، مگر انھوں نے میری خاطر یہ دعوت قبول کر لی۔ میں نے انھیں لندن میں اپنی تربیت کے بارے میں بتایا اور اس بات پر وہ بہت متحیر ہوئے کہ میں برطانوی انشورنس کمپنیوں کے اتنے بہت سے بڑے افسروں سے ملاقات کر چکا ہوں۔ ان میں نارچ یونین اور پروڈنشیل کے جنرل منیجر شامل تھے۔''

شرافت نے لندن میں اپنے قیام سے خوب فائدہ اٹھایا اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ انھوں نے سب کچھ اپنی کوششوں سے کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کی شاہ صاحب نے ابتدائی ملاقاتوں کا اہتمام کرا دیا تھا مگر شرافت نے اپنی ہنرمندی سے ان میں پیش رفت کو ممکن بنایا۔ شرافت پروڈنشیل انشورنس کمپنی میں تعینات تھے، پھر کچھ دنوں انشورنس ایسوسی ایشن میں، نارچ یونین، اٹلس انشورنس گروپ اور اسٹینڈرڈ میرین انشورنس کمپنی میں رہے، جو سب کی سب اوّل درجے کی کمپنیاں تھیں۔ شرافت کو بلجیم، فرانس، سوئٹزر لینڈ اور جرمنی کی انشورنس کمپنیوں کے لوگوں سے ملنے کے مواقع بھی ملے۔ ان میں سے بہت سے بین الاقومی سطح کی کمپنیوں کے لوگ تھے۔ شرافت میں ہمت تھی کہ اپنے بل بوتے پر، مشکل حالات میں بھی وہ اپنے ساتھیوں سے کئی قدم آگے نکل گئے تھے اور وہ لوگ جنھیں شرافت پیچھے چھوڑ گئے تھے، اس جارحانہ انداز میں آگے بڑھتے ہوئے حیدر آبادی ریاستی نوجوان کو اسی لیے پسند نہیں کرتے تھے۔

مگر انھیں بھی انتظار اور موقعے کی تلاش میں رہنا تھا۔ جب وہ پاکستان واپس آرہے تھے تو بحری سفر میں ان کے ساتھ مجاہد آزادی سردار عبدالرب نشتر کے بیٹے جمیل نشتر تھے۔ یہ دونوں اور شاکر درّانی جو بعد میں اسٹیٹ بینک کے گورنر بنے تھے مشہور ڈپارٹمنٹل اسٹور Harrods کے قریب ایک ہوٹل میں ساتھ رہتے تھے۔ اور جب یہ تینوں اکٹھے کراچی کی بندرگاہ پر جہاز سے اترے تو جمیل نشتر کے لیے لائڈز بینک میں تقرری کا خط لیے کوئی بندرگاہ پر استقبال کے لیے موجود تھا۔ واپسی پر شرافت کو ایک جونیئر افسر سے ترقی دے کر لائف ڈپارٹمنٹ میں سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا تھا مگر ان کو مایوسی ہوئی تھی اس لیے کہ انگلستان میں دو سال قیام کے بعد واپسی پر وہ کسی بڑے عہدے کی

توقع رکھتے تھے۔ مگر وہ ابھی صرف چوبیس برس کے نوجوان تھے اور کے ایف حیدر جیسے لوگ کامیابی اور اور توقعات کو اپنی تجربہ کار نگاہوں سے دیکھنے کے عادی تھے۔ مگر ایک تو ان میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس پر مستزاد یہ کہ انگلستان کے قیام کے دوران اس کو مزید تقویت مل گئی تھی۔ انھیں جلد ہی احساس ہوگیا تھا کہ ان کی قدیم اور روایتی کمپنی میں بھی ان کے لیے ایک شان دار مستقبل ہوگا۔ اور یہی ہوا۔ وصال الدین صاحب کے امریکن لائف میں چلے جانے اور خدا بخش کے تقرر کے بعد ان کی ترقی ہوگئی۔ ان کو انشورنس ایسوسی ایشن آف پاکستان کے اجلاسوں میں کمپنی کے نمائندے کا فرض سونپ دیا گیا۔ عام طور پر بہت چھوٹے رُتبے پر ہونے کے باعث ایسی کمیٹیوں میں بیٹھنا جن میں وصال الدین صاحب جیسے تجربے کار لوگ ہوتے تھے مناسب نہ ہوتا مگر کے ایف حیدر اور خدا بخش صاحبان شرافت کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ شرافت بہت خوش تھے۔ ان کے اپنے ادارے میں بھی اور بیرونی ماحول میں بھی ان کو بہت تجربہ ہوا۔ ان کے لیے سب سے اچھا وقت وہ تھا جب حیدر صاحب کے چلے جانے کے بعد روشن علی بھیم جی کمپنی کے سربراہ بنے تھے۔ ان کے نئے افسر کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا کہ ان کے لائف ڈپارٹمنٹ میں ایک نوجوان اور ہونہار افسر موجود ہے جس کی دانشورانہ اور تقریری صلاحیتیں اس کے ساتھیوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ یہ بھی کہ اس نوجوان میں لوگوں سے میل ملاقات کرنے، ان سے تعلقات استوار کرنے کی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں، ویسی ہی جیسی کہ اپنے ابتدائی زمانے میں خود ان میں موجود تھیں۔

مسٹر بھیم جی نے انھیں خلیلی صاحب کے ایما پر بنائی جانے والی تنظیمی کمیٹی کا چیئر مین مقرر کردیا۔ یہ کمیٹی ان مقاصد کے لیے بنائی گئی تھی، کمپنی میں خلیلی صاحب کی شرکت کے بعد جن پر عمل درآمد شروع کیا گیا تھا۔ شرافت نے وہ کچھ کر دکھایا جس کی ان سے توقع کی جارہی تھی۔ بلکہ انھوں نے اپنے افسران کی توقعات سے کہیں زیادہ بڑھ کر کارکردگی دکھائی۔ اس لیے میں نے ان سے اپنی ملاقات کے دوران ہونے والی گفتگو کے اوراق پلٹتے ہوئے ان کی شخصیت کے لیے 'ہمیشہ ایک قدم آگے' جیسا فقرہ ترتیب دیا ہے۔

پچاس برس بعد کی ملاقات میں، عجمان میں اپنے نفیس دفتر میں بیٹھے ہوئے ٹیکسٹائل فیکٹری کے مالک اور منیجنگ ڈائریکٹر شرافت والا جاہی نے کہا تھا کہ "ایک ملنسار انسان کی حیثیت میں مسٹر بھیم جی مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ ان کی یہی ادا مجھے پسند آئی تھی۔ وہ اپنی کمپنی کے افسران کو اپنے گھر پر مدعو کرتے، جہاں پارٹیوں میں سیاست دان اور سرکاری افسران بھی ہوتے تھے۔ اور چوں کہ وہ اپنے گھر پر ہم لوگوں کو مدعو کیا کرتے تھے اس لیے ہم سب پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہوتے تھے، بالخصوص مجھ پر اس لیے میں کہ عموماً ہر تقریب میں مدعو کیا جاتا تھا۔ ایسی تقریبات کے ذریعے ہی مسٹر بھیم جی نے اپنے ملک کے اربابِ اختیار و اقتدار سے اپنے مراسم پیدا کیے تھے۔ وہ ان لوگوں سے قریب تھے جو اہم تھے۔ جی ہاں! مجیب الرحمٰن، یوسف ہارون جیسے اہم لوگ ان کے بہت قریبی دوستوں میں سے تھے۔

اگر چہ انشورنس کے بارے میں بھیم جی صاحب کا علم بہت زیادہ وسیع نہیں تھا مگر جس طرح وہ لوگوں سے قریب ہو کر کام کرنے پر اکساتے تھے اس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ ان میں ایک اور خصوصیت تھی جو انھیں اس خطے کے تمام ہم عصر اور ہم رتبہ لوگوں میں ممتاز کرتی تھی۔ انھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ انشورنس کے تکنیکی آدمی ہیں۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ وہ ایک سیلز مین ہیں، بہت اچھے اور پیشہ ور۔ اور یہی سب سے اہم بات تھی۔ وہ اس بات پر بھی زیادہ زور نہیں دیتے تھے کہ انھیں کیا نہیں آتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی مخصوص صلاحیتوں کو کمپنی کے مفادات کے لیے بڑی ہنر مندی اور کامیابی سے استعمال کیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بھیم جی صاحب کا زمانہ ای ایف یو کا سنہرا دور تھا تو ہرگز بے جا نہ ہوگا۔ میرے اور ان کے درمیان بہت سے مسائل پر اختلافات رہے ہوں گے مگر ہمیں اس بات پر انھیں پوری طرح سراہنا چاہیے کہ انھوں نے کبھی، کسی کو بھی، اپنے خیالات سے مختلف خیالات ظاہر کرنے سے نہیں روکا۔ اور میرے خیال میں کسی شخصیت کی یہ خصوصیت ہی سب سے بڑی ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت بڑی کرشماتی تھی اور بلاشبہ وہ ایک اچھے سیلز مین تھے۔ وہ واقعتاً بڑی خوبی سے ان لوگوں میں اپنی کمپنی کے مفادات کو آگے بڑھاتے تھے ملک میں جن کی اہمیت ہوتی تھی۔ کمپنی کے کارکنوں، افسروں، ہر ایک میں وہ کمپنی کے

مفاد کی بات کرتے تھے، اس کی بہبود کے جذبات ابھارتے تھے اور اس کو نئی، تاریخی بلندیوں پر پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کی یہ خصوصیت مجھے آج بھی یاد آتی ہے کہ وہ اپنی کمپنی کے ابھرتے ہوئے افسروں سے کبھی خائف نہیں ہوتے تھے۔ میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں جن لوگوں سے بھی ملا ہوں ان میں بیشتر اپنے افسروں میں آگے بڑھنے کے جذبوں کی ہمت افزائی نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس مسٹر بھیم جی ہر ایک کو ابھرنے کی اجازت دیتے تھے۔ دراصل انھوں نے مجھے بہت بڑھاوا دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ شرافت تمھیں پوری آزادی ہے کہ تم جس کے پاس چاہو جاؤ اور جس سے چاہو ملو۔ وہ چیف سیکریٹری ہو یا ایک عام سرکاری افسر، تمھیں نہ مجھ سے اجازت کی ضرورت ہے نہ میری دعاؤں کی۔ اس طرح وہ لوگوں کے اعتماد میں اضافہ کرتے تھے۔ اور میرے خیال میں انھوں نے افسروں کے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا تھا اس میں یہی سب سے اہم تھا کہ وہ افسروں کو اختیارات تفویض کرتے تھے اور ان کے استعمال میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔''

شرافت کو ایک ذاتی گُرو مل گیا تھا، جس کی طرف وہ احترام اور تحسین کی نگاہوں سے دیکھ سکتے تھے، ایسا جس کو دیکھ کر وہ اپنے آپ کو بہتر بنا سکتے تھے۔ ''جس طرح مسٹر بھیم جی تعلقاتِ عامّہ کے معاملات میں خود کو پیش کرتے تھے وہ قابلِ تحسین تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی حد تک میں نے ان سے سیکھا ہے، مگر یہ صلاحیت میرے خون میں میرے والد کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، میرے والد انشورنس کے ایک کامیاب سیلز مین تھے اور اعلیٰ درجے کے سیاست داں بھی جو عوام میں گھل مل جانا پسند کرتے تھے۔ مگر انشورنس کے معاملات میں بھیم جی صاحب میرے لیے سب سے بڑی شخصیت تھے جن کی میں نے پیروی کرنے کی کوشش کی تھی، اس لیے کہ انشورنس کے معاملات میں رشتے استوار کرنے میں وہ بہت کامیاب انسان تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بہت سے لوگوں سے کئی بار کہا تھا: ''اس کمپنی میں اگر کوئی شخص ہے جو دروازے پر دستک دیے بغیر چیف سیکریٹری کے دفتر میں داخل ہو سکتا ہے تو وہ شرافت ہے۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب شرافت ان تمام معاملات میں دخیل ہوا کرتے تھے جو کمپنی کو بلندیوں کی طرف لے جاتے تھے۔ وہ کارپوریٹ سیکریٹری بنا دیے گئے، جب میں جرمنی واپس ہوا تو میری جگہ پر سیکریٹری، ریسرچ اینڈ پلاننگ بنا دیے گئے، ایگزیکٹیو آفیسر بھرتی اسکیم کے بورڈ سیکریٹری بنے، اور کمپنی کے ڈائریکٹر تعلقاتِ عامّہ سبطِ حسن کے ساتھ مل کر انھوں نے ۱۹۶۷ء کے تاریخی ڈھاکا کنونشن کی منصوبہ بندی اور تنظیم کی جو بہت کامیاب ہوا تھا۔ شرافت ای ایف یو کی جانب سے بہت سے انتظامی کورس میں شریک تھے۔ ان کو اعلیٰ درجے کے اسٹاف کالج بھی بھیجا گیا تھا جہاں اپنی تربیت کے دوران انھوں نے کئی سرکاری افسر دوست بنا لیے تھے۔ بالآخر انھیں گروپ انشورنس کے شعبے کا سربراہ بنا کر لاہور بھیج دیا گیا تھا۔ یہ ای ایف یو کا سنہرا دور تھا۔ شرافت آج بھی اس کی باتیں کرتے ہوئے بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔

شرافت بتاتے ہیں کہ ''بھیم جی صاحب نے یہ ان پر چھوڑ دیا تھا کہ گروپ انشورنس کے شعبے کا صدر مقام کہاں قائم کیا جائے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے، ہم نے اپنا دفتر واپڈا ہاؤس سے شروع کیا تھا۔ انھوں نے مجھے پوری آزادی دے رکھی تھی۔ یہ دفتر کمپنی کا ایک معیاری دفتر تھا۔ یہاں اکثر بورڈ کے اجلاس بھی ہوا کرتے تھے اس لیے کہ بھیم جی صاحب کو یہ دفتر بہت پسند تھا۔ اس کے بعد سے کمپنی کی تمام بڑی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شریک ہوتا تھا خواہ وہ ملک کے اندر کی ہوں یا باہر کی۔ بھیم جی صاحب نے کبھی ایسی میٹنگ میں اکیلے شرکت نہیں کی جس میں صرف کمپنی کے سربراہ شریک ہوتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے افسران ایسے اجلاس میں بھی شریک ہوں تاکہ ان کی ذہنی نشوونما ہو۔ اب میں ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کی میری حقیقی نشوونما ای ایف یو ہی میں ہوئی تھی، حالاں کہ قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد مجھے اسٹیٹ لائف میں بھی ایسے فرائض دیے گئے تھے جن میں انشورنس سے ہٹ کر بھی تجربات ہوئے تھے۔''

یہ سب کچھ ختم ہو گیا جب ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۷۲ء میں زندگی کے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ یہ اس کمپنی پر ایک کاری ضرب تھی حالاں کہ، ان کے اپنے الفاظ میں، اس صنعت پر کمپنی کا بہت بڑا قرض تھا۔ مگر اس واقعے سے شرافت کی ترقی نہیں رُکی۔ اس

کے برعکس اسٹیٹ لائف کارپوریشن نے ان کے پیشہ ورانہ تجربے اور ان کی عمیق دانشوری سے کسبِ فیض کیا۔ اسٹیٹ لائف ان دنوں کسی پیشہ ور کے نہیں بلکہ ایک سرکاری افسر، مسٹر بیگ کے زیرِ انتظام تھی جنھوں نے اپنی پوری کوشش کی تھی کہ حکومت کے زبردست دباؤ کے باوجود انتظامی اعلیٰ عہدوں پر سرکاری افسروں کا تقرر نہ کیا جائے۔ بیگ صاحب اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ کارپوریشن کے چھ ایگزیکٹیو ڈائریکٹروں میں سے تین سابقہ ای ایف یو سے تھے، جن میں شرافت والا جاہی شامل تھے۔ یہ کارپوریشن پر ای ایف یو کے حاوی کردار کا ثبوت تھا جس کو کچل کر بنائے گئے اسٹیٹ لائف کے تین یونٹوں میں سے ایک تک محدود کر دیا گیا تھا۔ نئی کارپوریشن سرکاری طور پر یکم نومبر ۱۹۷۲ء میں وجود میں آ چکی تھی۔ اس کے سامنے پچاس مختلف کمپنیوں، اور ان کے مختلف ماحول کو ایک ادارے میں ڈھالنا تھا تا کہ سب ایک ہی زبان میں بات کریں اور ایک ہی سمت میں سفر کریں۔ شرافت نے کہا کہ ''نیشنلائزیشن کے بعد کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا اور پیشہ ور لوگوں کے لیے یہ بڑا چیلنج تھا کہ وہ ناممکنات کو ممکنات میں بدل دیں۔ اور مجھ جیسے لوگوں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا تھا، اور یقین کیجیے کہ کارپوریشن کے کام کے لیے میں اتنا ہی وقت دیتا جتنا کہ میں ای ایف یو میں دیا کرتا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔''

میرے دوست نے بڑے کامیابی سے اسٹیٹ لائف کا کام کیا۔ ۱۹۸۱ء میں جب ان کو ۹ برس ہو چکے تھے، اس وقت کے چیئر مین ریٹائر ہوئے اور نئے چیئر مین کا تقرر ہوا۔ اس وقت شرافت والا جاہی سب سے سینئر ڈائریکٹر تھے۔ فیلو آف چارٹرڈ انسٹی ٹیوٹ بھی تھے اور انھوں نے سرکاری افسروں کی طرح اسٹاف کالج سے نہ جانے کتنی اسناد حاصل کر رکھی تھیں اور ان کے چیئر مین بنائے جانے کی تمام وجوہات موجود تھیں مگر افسوس کہ پھر سرکاری افسروں کے حلقے ہی سے نئے چیئر مین کا تقرر کیا گیا۔ شرافت نے خود سے کہا کہ اب بہت ہو چکا۔ اسی وجہ سے جب مسٹر بھیم جی نے، جن سے بہت قریب رہ کر وہ بیس برس کام کر چکے تھے، انھیں لندن میں نئی بنائی جانے والی کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنیوں کے گروپ میں شرکت کی پیش کش کی تو انھوں نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور نئی سرزمین پر قسمت آزمائی کی خاطر یہ پیش کش فوراً قبول کر لی۔

مسٹر بھیم جی اور آغا حسن عابدی کے اشتراک میں نئی کمپنیاں بنی تھیں، جو عابدی صاحب کے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کی بہنوں کی مانند تھیں۔ ۱۹۸۱ء جولائی کے مہینے میں شرافت ان کمپنیوں کے ڈائریکٹر بن گئے تھے۔ کراچی میں ایف یو کے صدر نواب حسن کی معیت میں شرافت کو ان کمپنیوں کے مختلف بازوؤں کے درمیان ہم آہنگی اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں کاربار کی ممکنات تلاش کرنے کی ذمے داریاں سونپی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سفر کیے اور کافی تحقیقاتی کام کیے۔ وہ افریقا اور ایشیا کے مختلف ممالک میں گئے اور میونخ رِی میں اپنے پرانے دوستوں سے ملے۔ مگر بعد کے حالات اتنے سازگار نہیں رہے جیسی کہ توقعات تھیں۔ بدقسمتی سے آغا حسن عابدی کی بنائی ہوئی مالیاتی سلطنت زمیں بوس ہو گئی اور ان کے ساتھ ہی یہ کمپنیاں بھی باقی نہ رہ سکیں۔ میں نے اس بارے میں پچھلے صفحات میں، اور بالخصوص روشن علی بھیم جی کی سوانح حیات میں تفصیل سے لکھا ہے۔

اس واردات کے بارے میں شرافت والا جاہی کے اپنے الگ خیالات تھے، اور یہ ان کی بدقسمتی ہی تھی کہ انھیں اس میدان میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی حالاں کہ وہ ماضی میں ایک بہت خوب صورت پیشہ ورانہ زندگی گزار چکے تھے۔ ان کے خیال میں اگر یہ تجربے کامیاب ہو جاتے تو ایک نئی کاروباری دنیا وجود میں آ سکتی تھی۔ وہ آج بھی اس شخصیت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جو نہ صرف پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں بینکاری کی نئی تاریخ رقم کرتے کرتے رہ گیا۔

شرافت کے الفاظ ہیں، ''میں آج بھی کہتا ہوں کہ عابدی صاحب ایک عظیم آدمی تھے۔ میں پاکستان کے لیے ان کی خدمات کے باعث ان کی بہت عزت کرتا ہوں۔ عابدی نے دنیا کی بینکاری کے نقشے پر پاکستان کا نام ثبت کر دیا۔ اور کوئی یہ کام نہیں کر سکا۔ قومی صنعت میں لیے جانے سے قبل بینکاری کی صنعت کی ترقی کے ذمے دار عابدی ہی تھے۔ ان کی اس تخلیق کی عدم موجودگی میں نہ یونائیٹڈ بینک اور نہ

حبیب بینک اتنی ترقی کر سکتے تھے۔ یہ ان کی پیدا کردہ مسابقت ہی کا نتیجہ تھا کہ اتنا کچھ ہوگیا۔ گویا آغا حسن عابدی ایک ہمالیائی بلندی کی شخصیت تھے۔ یہ انھیں کی انتھک کوشش تھی جس کی وجہ سے BCCI ایسی بلندیوں کو چھو سکا تھا۔ دراصل اس ادارے کے ڈھانچے میں ہی خرابیاں تھیں۔ یہ خرابیاں ان کی پیدا کردہ تھیں یا ان کے نائبین میں سے کچھ لوگ ذمے دار تھے، مجھے اس کا علم نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس ادارے کے کس کارکن میں یہ ہمت تھی کہ وہ کھڑا ہوکر یہ کہہ سکتا کہ جناب اس کام کو اس طرح نہیں، مختلف انداز میں کرنا چاہیے، یہ اک خرابی پیدا ہوچکی ہے اور اس کو درست کیا جانا چاہیے۔ اور میں ان لوگوں کو اسی طرح قصوروار سمجھتا ہوں جس طرح کوئی عابدی صاحب کو موردِ الزام ٹھہرائے۔ میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جس نے اعتراض کیا تھا۔ اس کو نوکری سے نکالا نہیں گیا۔ بس ایک کنارے لگادیا گیا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی کو ملازمت سے برطرف نہیں کیا، صرف کنارے لگا کر خاموش کرادیا۔ یہ تو اور بھی بُری بات تھی۔ اس طرح لوگوں کے دماغ غلط راہوں پر لگ گئے، کچھ ایسا ہی انشورنس کاروبار میں بھی ہوا اور ہم بھی غلط رہے۔ ہم سب کو اس بات کا پورا اندازہ ہی نہیں ہوسکا تھا کہ مالیات کا میدان بین الاقوامی تناظر میں اس سے کہیں مختلف تھا جیسا کہ ہمیں پاکستان میں نظر آتا تھا۔"

زندگی صرف کھلتے ہوئے گلاب اور بوگن ویلیا جیسی نہیں ہوتی۔ مجھے اور شرافت کو اپنے مشترک ماضی میں جھانکنے اور اپنے ضمیر کھنگالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔

'عابدی سلطنت' کے زوال کے بعد شرافت نے اپنا زندگی بھر کا پیشہ ترک کردیا اور اپنا کاروبار شروع کردیا۔ پہلے لندن میں اور اب دبئی میں۔ اپنے بہت سے ہم عمر لوگوں کی طرح وہ بھی اب دبئی میں مقیم ہیں اور دبئی کے کچھ شراکت داروں کی معاونت سے لباس تیار کرنے کا ایک کارخانہ چلارہے ہیں۔ آج بھی خوب صورت بیوی سلطانہ کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ انھیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ موجودہ امیگریشن کے قوانین کے مطابق اپنے زندگی کے اس باب کو بھی بند کرنا ہوگا اور کسی اور سرزمیں پر نیا گھر بسانا ہوگا۔ والا جاہی آج بھی سماجی زندگی کی گہما گہمی کو پسند کرتے ہیں اور شرافت کے ساتھ سلطانہ بھی ان میں متحرک رہتی ہیں۔ اپنی خوشحال ازدواجی زندگی میں دونوں نے ایک دوسرے کی کمی کو بڑی خوبی سے دور کیا ہے۔ انھیں اس بات کے مواقع بھی ملے تھے کہ وہ اپنے شوہر سے ان ہی کے میدان میں مسابقت کرتیں اس طرح کہ وہ چارٹرڈ انشورنس انسٹی ٹیوٹ کی ایسوی ایٹ شپ حاصل کرنے والی دوسری خاتون ہیں۔ ان کی اپنی شخصیت بھی مسحور کن ہے اور ان کی تنظیمی صلاحیتیں اکثر ان کے شوہر کی پیشہ ورانہ زندگی میں کام بھی آئیں تھیں۔

ای ایف یو کے ماضی کے بارے میں اس کتاب کی تدوین کی خود اختیار کردہ ذمے داری میں بھی شرافت نے میری بہت مدد کی ہے۔ اور ہم نے مل کر بہت سے ایسے امور دریافت کیے ہیں جو شاید کبھی ظاہر نہ ہو سکتے، اور تلف ہو جاتے۔ میں اور میری اہلیہ دونوں اس مسحور کردینے والے جوڑے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ہم نے نہ صرف ماضی کی باتیں کیں بلکہ پاکستان کے حال اور اس کے ممکنہ مستقبل کے بارے میں خیال آرائیاں کیں۔ انھیں کے ساتھ، کے ایف حیدر کے بیٹے اور اپنے پرانے دوست سجاد حیدر سے بھی ملے جو اس ابلتے ہوئے شہر میں کامیاب کاروباری زندگی گزار رہے ہیں۔ اور ہم، اپنے پیارے دوست ماموں سجالی کے چھوٹے بھائی حمید سجالی سے بھی ملے، جو کچھ برس آدمجی انشورنس کے نوجوان افسر رہے تھے۔ حمید کچھ برس ہوئے اٹلی کی انشورنس کمپنی Assecurazione Generali سے ریٹائر ہوکر پاکستان واپس آگئے ہیں اور ای ایف یو کے ایڈوائزر ہو گئے ہیں۔

میں یہاں شرافت کے ان دو دوستوں کا تذکرہ کر رہا ہوں اس لیے کہ یہ دونوں اس بڑے نقصان کی علامت ہیں جو پاکستان میں بیمے کی صنعت ان کی غیر موجودگی کی بنا پر اٹھا رہی ہے۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا بیشتر حصہ گزارنے کے بعد حمید سجالی کی پاکستان واپسی ایک حیرت انگیز قدم ہے اور بلا شبہ ای ایف یو کے لیے ایک نیک شگون ہے۔ شرافت، سجاد حیدر اور حمید اپنا ملک چھوڑ کر چلے گئے، اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہاں ان کے لیے بہتر مواقع موجود تھے۔ وہ صحیح نکلے اور انھوں نے اپنے پیشے میں بہت کامیابی حاصل کی۔ مگر بالآخر انھیں اپنے

ملک واپس ہونا پڑے گا، یا پھر انگلستان یا امریکا جانا ہوگا۔

اپنے دوست شرافت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں زندگی سے کسی شکایت کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ آج بھی اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات سے لطف حاصل کرتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں انھیں ''زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ زندگی مجھ پر بہت مہربان رہی ہے۔ میں لندن میں رہا ہوں اور وہاں اپنا کاروبار کیا ہے۔ میں دُبئی آیا اور یہاں ایک بڑا ادارہ قائم کیا ہے میں جس کا چیئر مین ہوں اور شہر کے کچھ صاحبِ حیثیت باشندے ڈائریکٹر ہیں۔ ہم کامیاب کاروبار کر رہے ہیں۔ ہمارے بچے اچھی حالت میں ہیں۔ ہم سب پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں اور ہمارے پاس خوش وخرم رہنے کے لیے ہر طرح کا جواز موجود ہے۔''

ان کے پیش کردہ خلاصے کا ایک ایک حرف خالص محسوسات سے مملو ہے۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ اس کے باوجود کچھ ہے جو مجھ کو آزردہ کردیتا ہے۔ میری خواہش ہے، بلکہ امید ہے کہ میرے دوست شرافت مجھے معاف فرمائیں گے، اگر میں یہ کہوں کہ وہ ملک جس کو یہ اپنا وطن کہتے ہیں، اس غیر معمولی شخص کی تہ در تہ صلاحیتوں سے فیضیاب ہوسکتا تھا اگر یہ اپنے ملک ہی میں قیام کرتے، جس کے ساحل پر اٹھارہ برس کی عمر میں ان کے قدم پڑے تھے۔ انھوں نے نئے سرے سے اپنی زندگی بنائی تھی۔ انھوں نے ایسٹرن فیڈرل یونین کی بے مثال کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا جو ان کی عزت اور ان کے لیے شکریے کی مقروض ہے۔

اگر انھوں نے ملک سے باہر قدم نہ نکالا ہوتا تو اپنی دھرتی کے لیے کچھ نہ کچھ کیا ہوتا، اگر افسر شاہی کی لاپرواہی ان کو یہ قدم اٹھانے سے روک دیتی۔ یہ شاید ایک بہت بڑے معمار اور ہنرمند کاروباری شخص ہوتے۔

بہر حال، اپنی حیثیت میں یہ ایک حیرت انگیز انسان ہیں، ایک ایسے انسان جو اس بات پر فخر کرسکتے ہیں، اپنی شریکِ زندگی سلطانہ کی معیت میں وہ بہت کچھ حاصل کرسکتے تھے۔

۱۹۶۲ء میں ساجد زاہد اور سعید احمد اپنی مالکہ مکان کے ساتھ

ساجد زاھد

ایک آزاد منش

ساجد زاہد جیسے انسان سے شناسائی ایک حیرت انگیز تجربہ ہے اور ان کا دوست بن جانا ایک بڑی رعایت ہے۔
میں شاید ہی کبھی ان جیسے منفرد، منحنی، خود پسند، راست باز اور سیدھے سادے انسان سے ملا ہوں گا۔ ایک مشہور باپ کے بیٹے، جن سے وہ بہت محبت کرتے تھے مگر جن کا سایہ زندگی بھر ان کے پیچھے لگا رہا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ساجد نے کبھی اپنے باپ کے نام کو اپنے لیے بار تصور کیا تھا مگر بلا شبہ یہ نام ان کے ذہن کی نشو ونما اور ان کی ذاتی ترقی میں دخیل رہا ہے۔
ہم اور وہ، دونوں ایک ہی عمر کے ہیں، نوعمری کے دور میں ہمارے تجربات بھی مشترک رہے ہیں، جن پر سیاست اور تباہ کن حالات، خواہ وہ جنگ، فسادات یا سول نافرمانی کی صورت میں ہوں، اثر انداز رہے ہیں۔
ساجد زاہد ۱۹۳۰ء میں ایک معروف سرکاری افسر کے گھر پیدا ہونے والے تین بیٹوں میں سے ایک تھے۔ ان کے والد، جناب زاہد حسین، اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے پہلے گورنر کی حیثیت سے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل وہ برطانوی ہند کی سول سروس کے ایک رُکن تھے۔ برطانوی ہند میں ان کی آخری تعیناتی ریلوے کے مالیاتی کمشنر کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے فوراً بعد وہ حیدر آباد دکن کے وزیرِ مالیات بنا دیے گئے تھے۔ مگر سرکاری معاملات میں نظام سے ان کی نہیں بنی اور انھوں نے فروری ۱۹۴۷ء میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ یہ سال اس پورے خطے کے لیے بہت اہم تھا۔ زاہد اور ان کے بیٹے جب پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں مجھ سے ملنے آئے، اس سے پہلے ہم لندن میں اس وقت ملے تھے جب وہ کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کے ابتدائی دنوں میں اس سے منسلک تھے۔ اپنی گفتگو کے دوران ساجد نے اپنی یاد داشت کو کھنگالتے ہوئے اپنے والد کے بارے میں بتایا، ''اس وقت ان کی عمر چون برس تھی، اور انھوں نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاید آپ کو علم ہو کہ ان دنوں ریٹائر ہونے کی عمر پچپن برس ہوتی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ایک ٹکٹ تھا جو انھیں سیدھا لاہور لے جاتا، جہاں انھوں نے ریٹائر ہونے کے بعد بس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر دلّی میں انھیں اس وقت ریل گاڑی سے اتار لیا گیا جب قائدِاعظم نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میرے والد کو علی گڑھ یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا جائے گا۔ میرے والد نے یہ فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ کچھ بہت مصروف ہفتے گزر گئے۔ وہ ایک مختصر عرصے کے لیے لاہور آئے، جہاں ساجد کالج میں تعلیم پا رہے تھے۔ پھر وہ دلّی واپس چلے گئے جہاں وہ یونی ورسٹی سے تقرری کے احکامات کے منتظر رہے۔ احکامات اپریل کے مہینے میں ملے۔ پھر وہ علی گڑھ چلے گئے اور چند ہفتوں بعد گرمی کی چھٹیاں ہو گئیں اور ہم سب گرم موسم سے دور رہنے کے لیے کوئٹے چلے گئے۔ وہاں ہم نے سنا کہ پاکستان یقیناً بنے گا۔ قائدِاعظم نے ۳ رجون کو اپنی مشہور تقریر کی تھی۔ اس کے بعد کافی عرصے تک ان کی میرے والد سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تقسیم کی کونسل کے ساتھ میرے والد لاہور میں اور اس کے بعد دلّی میں تھے۔ اس لیے ہم اہلِ خانہ ان کے بغیر ہی اگست ۱۹۴۷ء کی ابتدا میں،

پاکستان کے قیام سے چند دن قبل، کراچی منتقل ہو گئے۔ جناح صاحب نے میرے والد کو دلّی میں پاکستان کا پہلا ہائی کمشنر بنادیا تھا۔ وہ حکومت سے بات چیت کے لیے اکثر کراچی آتے رہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ مارچ یا اپریل ۱۹۴۸ء میں انھیں اس عہدے سے فارغ کر کے اسٹیٹ بینک کا گورنر بنادیا گیا تھا۔''

میں خود جنگ اور اس سے ہونے والی تباہیوں، کروڑوں افراد کے دیس نکالے اور ہجرتوں سے گزر چکا ہوں۔ اس لیے میں ایسے لوگوں کے حالات میں خاص دل چسپی لیتا ہوں۔ تقسیمِ ہند کے بعد بہت سے انسان ایسے ہی تجربے سے گزرے تھے جنھیں ایک جگہ سے دوسرے جگہ جانا اور بسنا تھا۔ اسی لیے میں نے ساجد سے سوال کیا تھا کہ تقسیمِ ہند کے موقعے پر کبھی انھیں یا ان کے اہلِ خاندان کو ذاتی طور پر ایسے تجربوں سے دوچار ہونا پڑا تھا؟ خوش قسمتی سے ان کا جواب نفی میں تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ''کراچی میں انھوں نے کوئی مار کاٹ نہیں دیکھی سوائے کچھ لوٹ مار کے۔ کچھ لوگ ان سکھوں کے پیچھے پڑ گئے تھے جو ملک کے بالائی حصے سے کراچی آگئے تھے تا کہ یہاں سے جہاز میں سوار ہو کر ہندوستان جا سکیں۔ میں نے ذاتی طور پر بس اتنا ہی دیکھا تھا۔ مگر ہمیں علم تھا کی سرحد کے پار دونوں طرف کیا ہو رہا تھا۔ یہ پاگل پن تھا، ایسے پیمانے پر مار کاٹ ہو رہی تھی جیسی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ لہٰذا ہمارے نزدیک آزادی ایک اچھی چیز نہیں تھی، یا ایسی چیز جس کو پلٹ کر دیکھیں تو خوشی محسوس ہو۔ بہت سے خاندان ایسے بٹ گئے تھے کہ ایک کو دوسرے کی اتنی خبر بھی نہ تھی کہ وہ زندہ ہیں یا مار دیے گئے۔ ہمیں یہاں سکون سے بسنے میں بہت عرصہ لگا تھا۔''

ان کے بچپن کا سب سے طویل عرصہ دلّی میں گزرا تھا جہاں وہ ابتدائی تعلیم پا رہے تھے۔ انھوں نے بتایا، ''ہم نے کئی بار مکان تبدیل کیے تھے مگر میرے بچپن کا مرکز دلّی ہی تھا، ویسا ہی جس میں انسان کو اپنے اطراف ہونے والے واقعات سے آگاہی ہونے لگتی ہے، جہاں اس کو احساس ہونے لگتا ہے کہ زندگی کیا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ میری یادداشت پشاور سے شروع ہوتی ہے جہاں ہم ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء تک رہے تھے۔ مگر یہ سب ایک خواب کی مانند دھندلا اور تاریک سا ہے۔'' میں نے ان سے سوال کیا کہ چوں کہ ان کے والد اتنے اہم اور مشہور سرکاری افسر تھے اور برِصغیر کے رہنمایانِ آزادی سے، بالخصوص قائدِاعظم سے ان کے تعلقات تھے تو کیا کھانے کی میز پر کبھی ان مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ انھوں نے بلا کسی تامل کے جواب دیا کہ ''یہ مسائل زیرِ گفتگو آتے ضرور تھے مگر اس حد تک نہیں جس کی آپ توقع کر رہے ہوں گے۔'' اور پھر انھوں نے فوراً ہی ایک دل چسپ بات کہی، ''ہم تین بھائی تھے اور ہم تینوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی سرکاری ملازمت میں نہیں جائے گا۔ میرا چھوٹا بھائی، جس کا انتقال ہو چکا ہے، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنا۔ دوسرا وکیل بنا اور آج کل عدالتِ عالیہ پاکستان میں جج ہے۔ میں کیمیا پڑھنا چاہتا تھا مگر میری صحت کے باعث ڈاکٹروں نے اس کے خلاف مشورہ دیا۔''

مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی اس لیے کہ ان کے والد پاکستان کی ایک معروف شخصیت تھے، وہ اسٹیٹ بینک کے گورنر رہے تھے جو دنیا کی کسی بھی حکومت میں ایک بڑا عہدہ ہوتا ہے۔ تو پھر ان کے تینوں بیٹوں کا ایسا رویہ کیوں؟ وہ مسکرائے، چند ثانیے توقف کیا اور بولے، ''بہت سے لوگ ہمارے رویے کو نہیں سمجھے ہیں۔ کئی اہم عہدوں پر ہمارے والد کو بہت سارے کام کرنے پڑتے تھے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ سرکاری ملازموں کو اکثر کسی نہ کسی نوعیت کی بے عزتی بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا نہ ہی سیاسی معاملات میں الجھنا پسند کروں گا۔ لیکن اگر میں اپنے والد کی ملازمت کے آخری برسوں پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ پنجابیوں اور بنگالیوں کے درمیان برتری کی ایک رسہ کشی جاری تھی۔ اس کش مکش میں وہ کسی کا ساتھ دینا نہیں چاہتے تھے اس لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس جنجال سے نکل جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم تین بھائیوں نے آزاد پیشوں میں جانے کا ارادہ کر لیا تھا جہاں ہم کسی کے ملازم نہ ہوں۔ میں اپنے بارے میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ڈاکٹروں کے مشورے کے باعث مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے بہت سے راستے تلاش کیے۔ پہلے تو معاشیات کی طرف خیال گیا، پھر طباعت کا کام شروع کرنے کا ارادہ کیا اور بالآخر Actuary بن گیا۔''

ساجد زاہد نے ایکچوریل سائنس کی تعلیم انگلستان میں حاصل کی، وہیں سے تمام امتحان پاس کیے اور پاکستان آگئے۔ وہ پہلے پاکستانی ایکچوری تھے جو کسی پاکستانی بیمہ کمپنی میں ملازم ہوئے۔ ساجد زاہد سے قبل پاکستان سے دو ایکچوری بنے تھے۔ ان میں سے ایک مسٹر خلفے (Khalfe) تھے، جنھیں ان کے ابتدائی مددگار مسٹر روشن علی بھیم جی بمبئی سے لے آئے تھے۔ مسٹر خلفے پاکستان کے سب سے طویل عرصے تک رہنے والے کنٹرولر آف انشورنس تھے۔

میں نے طے کرلیا تھا کہ پاکستان میں رہوں گا اور کسی پاکستانی کمپنی میں ملازمت کروں گا۔ میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ میں اپنی پریکٹس شروع کرتا۔ مجھے نہ پاکستان میں بیمے کے بارے میں کچھ معلومات تھیں، نہ اس ملک کے بیمے کی صنعت کے بارے میں۔ بس مجھے اتنا علم تھا کہ ایسٹرن فیڈرل انشورنس اس ملک کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی تھی اور میں نے اسی میں ملازمت کی درخواست بھیج دی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ عبدالرحمٰن صدیقی اس کے مؤسسین میں سے تھے جن کے میرے والد سے مراسم تھے۔ کلکتے میں فسادات کے بعد ان سے میری ملاقات ہوئی تھی، بعد میں ہم دلّی میں بھی ملے تھے۔ وہ بہت دبلے پتلے آدمی تھے اور میرے خیال میں وہ بہت عصیلی سیاسی شخصیت تھے اور اسی باعث شہر میں مشہور تھے۔ ان کو زیر کرنا آسان نہ تھا، مگر مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں تھا اس لیے کہ جب میں ان سے ملا تھا مجھے کسی انشورنس کمپنی میں ملازمت کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ ہم لوگ ان کو عبدالرحمٰن بنگالی کہا کرتے تھے اس لیے کہ ایک اور عبدالرحمٰن صاحب ہوا کرتے تھے، دونوں ایک ہی جسامت کے تھے اور اپنی نسل کے غیر معمولی لوگوں میں سے تھے جو مسلمانوں کی رہنمائی میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کا بہت جلد انتقال ہو گیا تھا، اور عبدالرحمٰن بنگالی نے تجارت اختیار کر لی تھی۔

بہر حال میں نے ای ایف یو میں ملازمت کی درخواست بھیج دی۔ حیدر صاحب نے میرا انٹرویو کیا جو اس وقت PIC میں شامل ہو چکے تھے اور ان کی جگہ کسی اور کا تقرر نہیں ہوسکا تھا۔ یہ ۱۹۶۱ء کا واقعہ ہے۔ میرے لیے مول بھاؤ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ای ایف یو والے ایک ہزار روپے سے زیادہ دینے پر تیار نہ تھے جب کہ امریکن لائف سے مجھے تین ہزار روپے ملنے کی توقع تھی۔ بڑی مشکل سے معاملہ ڈیڑھ ہزار پر ٹھہرا۔ میں اپنے والد کے حوالے سے حیدر صاحب سے اس وقت سے واقف تھا جب وہ بھوپال میں وزیرِ مالیات تھے اور ہم لوگ تو ایک رات ان کے گھر ٹھہر بھی چکے تھے۔''

میرے خیال میں ساجد زاہد اور ای ایف یو کا ساتھ خوش آئند تھا۔ ہم اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ ہم اور وہ دونوں مشہور 'تنظیمی کمیٹی' کے ارکان تھے جس کی تشکیل ای ایف یو کے چیف ایگزیکٹو کا پہلا بڑا فیصلہ تھا جو انھوں نے ۱۹۶۱ء میں کمپنی کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد کیا تھا۔ اس کمیٹی نے کمپنی کے پرانے انتظامی ڈھانچے کے بارے کچھ سخت فیصلے کیے تھے۔ کمپنی کے چیئرمین شرافت والا جاہی تھے، ہم تینوں، یعنی میں، ساجد اور شرافت ایک ہی برس ۱۹۳۰ء کے پیدا ہوئے تھے۔

ساجد زاہد کہتے ہیں، ''مجھے ای ایف یو میں کام کرنے میں بہت لطف آیا۔'' اس جملے کو انھوں نے کئی بار دہرایا۔ ''واقعی لطف آیا اس لیے کہ ہم نے نئی راہیں بنانے میں کامیابیاں حاصل کیں۔ سب سے اہم گروپ انشورنس اسکیم تھی۔ بلا شبہ پاکستان کی فوج کا بیمہ میرے زمانے کا سب سے اہم واقعہ تھا۔ دوسرا واقعہ تعلیم اور تربیت کے میدان میں کمپنی کی پیش رفت تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ہم ایک ساتھ تھے تو آپ نے بھی اس پر بہت زور دیا تھا کہ ملک میں بیمے کی صنعت کے لیے کارکنوں کی تیاری اور بالخصوص ایکچوریل سائنس کے میدان میں کمپنی کی کامیابی ایک بڑا کارنامہ تھا۔ صرف ای ایف یو نے کئی ایکچوری تیار کیے تھے جو ہم سے کہیں بڑا ادارہ اسٹیٹ لائف آج تک نہیں کر سکا ہے۔ صرف گیارہ برسوں کے عرصے میں یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ یہ سب کچھ ٹھپ ہو کر رہ گیا، مگر اس کے لیے ہم صرف مسٹر بھٹو کو ذمے دار نہیں ٹھہرا سکتے اس لیے کہ اس زمانے کے انتخابات کے لیے ہر سیاسی پارٹی کے منشور میں زندگی اور جنرل، بیمے کی دونوں اصناف کو قومی ملکیت میں لیا جانا شامل تھا۔ ہر سیاسی پارٹی کی نگاہیں ان کے سرمائے پر لگی ہوئی تھیں۔ ان میں کسی کو بیمے کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا، بس

وہ تو اس کو سیاسی رعایت کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔"

ساجد زاہد نے ای ایف یو بہت جلد چھوڑ دیا تھا اس لیے کہ وہ خود اپنے مالک بننا چاہتے تھے تا کہ وہ بیمہ داروں کے تحفظ کا فریضہ انجام دے سکیں۔ اگر چہ کمپنی کی انتظامیہ سے ان کے مضبوط رشتے قائم ہو چکے تھے، مگر انھوں نے اپنی پریکٹس قائم کرنے کی غرض سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مسٹر بھیم جی کی شمولیت کی وجہ سے کمپنی نئی بلندیوں کو چھو رہی تھی اور مسٹر بھیم جی بیمے کے سب زیادہ با رسوخ کاروباری بن چکے تھے۔ ساجد کہتے ہیں، "پاکستان میں مسٹر بھیم جی ہی تھے جو بیمے میں بصیرت رکھتے تھے۔ آج تک ان کے سوا کوئی شخصیت ایسی نہیں تھی جس کے پاس تصورات بھی تھے اور وہ ان کو عمل میں لانا بھی جانتے تھے۔ میں پہلی ملاقات ہی میں اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ وہ اس کمپنی کو بڑی بلندیوں تک لے جا سکتے ہیں۔ میرے لیے وہ باپ جیسے تھے۔ مجھ پر ان کے اعتماد نے مجھے کام کرنے کا حوصلہ دیا تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، میں اس قسم کا انسان نہیں ہوں جو کسی کے حکم پر چل سکوں اور میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں جو کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا وہ کرنا پڑا ہو۔ مگر زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں، جب آپ ملازمت میں ہوں تو آپ کو یہ کچھ کرنا پڑتا ہے مگر مجھے کبھی ایسا نہیں کرنا پڑا تھا۔"

میں ان سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ اپنی ابتدائی زندگی میں کیا انھوں نے کسی خاص شخصیت کو اپنا ماڈل سمجھا تھا۔ خاندان کے اشخاص کے علاوہ میرے خیال میں قائدِ اعظم شاید ایسی شخصیت رہے ہوں۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ قائدِ اعظم کو اپنا معیار بنانا ہمیشہ آسان ہوتا رہا ہوگا۔ مگر میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کتاب کے سلسلے میں ہماری ملاقات کے دوران ساجد زاہد نے بار بار قائدِ اعظم کا نام لیا تھا۔ بلکہ انھوں نے کئی واقعات کا بھی ذکر کیا تھا میں جن سے ناواقف تھا، نہ ہی میں نے ان کے بارے میں کہیں پڑھا تھا۔ انھوں نے ایک واقعہ اپنے والد کے حوالے سے بیان کیا تھا جو ان کے والد نے لکھا تھا۔ اس خط میں زاہد صاحب نے لکھا تھا کہ جناح صاحب کو ڈاکٹروں نے کچھ دوائیں لکھی تھیں جو انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ جب جناح صاحب کو بتایا گیا کہ حکومت نے حکم دیا ہے کہ یہ دوائیں آپ کو دی جائیں تو جواب میں جناح صاحب نے کہا کہ "سوائے خدا کے میں کسی کا حکم نہیں مانتا۔"

۱۹۱۲ء میں کانپور میں پیش آنے والا ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ حکام ایک سڑک کو کشادہ کرنے کے لیے ایک مسجد کا کچھ حصہ گرانا چاہتے تھے۔ نتیجے کے طور پر کانپور میں فسادات پھوٹ پڑے جس میں کئی جانیں چلی گئیں۔ کچھ مسلمان رہبر جناح صاحب سے ملاقات کے لیے گئے جب وہ بمبئ میں وکالت کرتے تھے اور ان سے پیروی کی درخواست کی۔ جناح صاحب نے کاغذات کے معائنے کے بعد کہا کہ حکومت کا قانونی موقف صحیح ہے اور انھیں نے یہ مقدمہ لینے سے انکار کر دیا۔ اگر جناح صاحب یہ مقدمہ لے لیتے تو اس بات کا پچاس فی صد امکان تھا کہ مصالحت ہو جاتی مگر یہ جانتے ہوئے کہ حکومت کا موقف درست تھا، جناح صاحب نے مقدمہ لینے سے انکار کر دیا حالاں کہ اس کے ذریعے ان کو بہت شہرت ملتی۔ ساجد زاہد کے مطابق وہ قانون کے پاسدار انسان تھے۔

ساجد نے اپنی پریکٹس شروع کی، جس سے وہ آج بھی منسلک ہیں، تو ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ان کے صاحب زادے جو اس کتاب کے سلسلے میں ہماری ملاقات کے دوران اپنے والد کے ساتھ آئے تھے، بہت محنتی، ذہین اور ہمت رکھنے والے نوجوان لگتے ہیں۔ ان سے بات کر کے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ انھیں اپنے ملک سے بہت محبت ہے اور وہ اس کے روشن مستقبل پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق "پاکستان میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو ملکوں کو دنیا میں اہم مقام عطا کرتی ہیں، ہمارے پاس افرادی قوت ہے، تجربے کار پیشہ ور لوگ ہیں۔ بس اس ملک میں ایک ہی کمی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اچھے رہنما پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جو ملک کی سربراہی کر سکتے۔ اہم پیشوں میں ہمارے پاس قابل لوگ ہیں، ہم نے بینکنگ کے شعبے میں دنیا کے بہترین دماغ پیدا کیے ہیں۔ پاکستان میں تربیت یافتہ بینکر کو دنیا کے کسی بھی خطے میں ملازمت مل سکتی ہے۔ اور ہم نے دنیا کے کئی اہم ڈاکٹر پیدا کیے ہیں۔ اب ہم اپنے تعلیمی اداروں کی ترتیب نو کر رہے ہیں، ہم کاروباری ادارے بنا رہے ہیں، لہٰذا ہمارے پاس بہت اچھے دماغ ہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ملک کی رہنمائی کر سکیں۔ مگر

اب لوگوں نے حالات کو سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ کراچی میں اب لوگ ایسے لیڈروں کو ووٹ دیتے ہیں جو ان کے جیسے مکانوں میں رہتے ہیں، موٹر سائیکل پر سفر کرتے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی ترقی صرف ملک کے اسی حصے میں ہو رہی ہے۔ ملک کے دوسرے حصوں تک اس کے پہنچنے میں ابھی وقت لگے گا۔''

ایک فخر کرنے والے باپ کی طرح ساجد اپنے بیٹے کی باتوں پر اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ اپنی خوب صورت سپید ڈاڑھی میں، جو میں نے پہلی بار دیکھی تھی، وہ ایک بزرگ دانشور، کسی قبیلے کے سردار لگ رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن وہ اس منصب پر فائز ہوں گے۔ جب میں نے ان کی توجہ اس طرف دلائی تو انھوں نے مسکرا کر کہا، ''آپ کی نوازش ہے، مگر مجھ سے زیادہ عمر کے بہت سے لوگ ابھی زندہ ہیں۔ اس سلسلے میں عمر بہت اہم ہوتی ہے۔ لیڈر کے رتبے تک پہنچنے کے لیے اسّی برس کی عمر چاہیے ہوتی ہے۔''

مجھے یقین ہے کہ ایک دن میں اپنے دوست سے ملوں گا جب وہ اپنے قبیلے کے بزرگ سرداروں میں سے ہوں گے۔ اپنی فطرتی جھینپ اور دروں بیں طبیعت کی وجہ سے، جو ان کے سماجی رویوں پر اثر انداز ہوئی ہے، وہ کبھی خطرات اور چیلنج سے اچھی طرح نمٹ نہیں سکتے۔ زندگی کے بارے میں ان کا فلسفیانہ ذہن حقائق سے کبھی نظریں نہیں چرا سکتا۔ ان کو قدرت نے دانش کی نعمت سے نوازا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ہندوستان اور پاکستان کی تعلیم یافتہ نسل کے اس متوسط طبقے کے نمائندے ہیں جو ماضی کے جاگیردار اور پاکستان ہجرت کرنے والی نسل سے ابھرنے والی شخصیت ہیں، جو نہ روایت کو بالکل چھوڑنا چاہتا ہے نہ نئی قدروں کا منکر ہونا چاہتا ہے۔ سرسید کے شیدا ہونے کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ساجد دراصل ان کے شاگرد جیسے ہی ہیں۔ ان کی جودتِ طبع ان کے کانوں میں چپکے چپکے کہتی ہے کہ ان معنوں میں ان کا استاد صحیح تھا کہ یہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اگر چہ ساجد نے اس مسئلے پر مجھ سے کبھی کھل کر بات نہیں کی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ جب وہ اس کتاب کو پڑھیں گے تو مجھ سے ضرور متفق ہوں گے۔ میں یہ بھی پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سر سیّد کا پیغام ان کی آنے والی نسلوں تک ساجد زاہد جیسے 'شاگردوں' ہی کے ذریعے پہنچا ہے۔

ساجد کے بیٹے کا کہنا ہے کہ ''جہاں تک پاکستان کے مستقبل کا سوال ہے یہ بہت سیدھا سادا سا ہے۔ ہندوستان کو مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی قبول نہیں۔ یا تو وہ ان کو پاکستان میں دھکیلنے کی کوشش کرے گا یا کسی طرح انھیں کشمیر میں بند کر دے گا، جیسا کہ وہ کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت نے مشرقی پاکستان پر قبضہ نہیں کیا، ان کو بنگلہ دیش کی صورت ہی میں چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا پاکستان تو رہے گا اس لیے کہ کسی کو اس کی زمین پر قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر، اگر اس میں کوئی تبدیلی آنی ہے تو مجھے یقین ہے کہ خود اسی میں سے ابھرے گی۔ آنے والی نسل میری نسل سے بہت بہتر ہے۔ یہ لوگ زیادہ پڑھے لکھے ہیں، مستقبل پر نظر رکھنے والے ہیں اور زیادہ محنتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کو بہتر صلہ ملے گا، اور مجھے ان سے اتفاق ہے۔''

ساجد زاہد خود اپنے اجداد کی روایات اور قدروں سے جُڑے ہوئے ہیں۔ وہ بہت مذہبی آدمی ہیں مگر اسلام کی اصل روح کے مطابق جو قرآن سے مشتق ہو، نہ کہ ان تاویلوں اور تفاسیر سے جو 'خود ساختہ' بنیاد پرستوں کی ہوں۔ اس کے باوجود وہ اصولوں کا سودا کرنے کے قائل نہیں۔ میں ان کے والد سے نہیں ملا مگر جہاں تک مجھے علم ہے، یقیناً ان کے بیٹے میں ان کا معنوی وجود ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ساجد نے ایک بار اپنے خاندان کا ایک مخطوطہ دکھایا تھا جس کی شروعات ۱۹۲۵ء میں ان کے والد نے کی تھی جب انھیں ایک رسالے 'پیغامِ اتحاد' کی ادارت سونپی گئی تھی۔ ان کے والد کے کاغذات میں ایک طویل فہرست بھی تھی جس میں ان کے تمام بالغ اعزّہ کے نام، عمریں، تعلیم، پیشہ اور موجودہ آمدنی کی تفصیلات درج تھیں۔ اس سے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ ان کے قبیلے کے کون سے لوگ ہیں جنھیں مدد کی ضرورت تھی اور ان کو کیا مدد پہنچائی جا سکتی تھی۔ ان کاغذات میں تقریباً چالیس خطوط بھی تھے جو ۱۸۵۹ء کے امتدادِ زمانہ سے بچ رہے تھے۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ ان کے خاندان کے لوگ جے پور اور بیکانیر کی ریاستوں میں ملازم تھے اور یہ بھی کہ ان دنوں میں ان ریاستوں میں فارسی سرکاری زبان کے

طور پر رائج تھی۔ ان خطوط کے دل چسپ پہلو وہ تھے جن میں ان کے بزرگوں نے فرنگیوں کے لباس، رہن سہن اور زبان کے خلاف جذبات کا اظہار کیا تھا۔ وہ لوگ ہرگز سرسیّد کی تعلیمات پر کہ ہندوستانیوں کو نئے انداز کو اختیار کرنا چاہیے عمل کرنے کو تیار نہیں لگتے تھے۔ ان خطوں میں سے ایک جو ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا تھا، ایک خاندانی بزرگ نے اس بات پر اپنے خورد کی سرزنش کی تھی کہ وہ فارسی زبان سیکھنے کے بجائے عربی پڑھ رہا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا 'اس طرح تم اپنی کفالت کس طرح کر سکو گے؟'

ساجد کا بیٹا کہہ رہا تھا، ''دیکھیے، پاکستان کے تعلیمی اداروں نے کس اعلیٰ معیار کے لوگ تیار کیے ہیں۔ یہ ادارے واقعی بہت اچھے ہیں اور یہ زیادہ اچھے ادارے قائم کرنے کے بارے میں پُرعزم ہیں۔'' ساجد نے بھی اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا، ''کیا آپ کبھی ان لوگوں سے ملے ہیں جو پاکستان میں کام کرنے والے ملٹی نیشنل اداروں میں کام کر رہے ہیں۔ میری مراد پاکستانی لوگوں سے ہے؟ اگر نہیں تو ضرور ملیے تاکہ آپ دیکھ سکیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اور انھیں لوگوں کے ہاتھ میں اس قوم کا مستقبل ہے۔''

دونوں باپ بیٹے مجھے ایک جذباتی کیفیت میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس سے پہلے کبھی میرے ساتھ کام کرنے والے ایسے معاملات پر مجھ سے اتنے قریب آئے ہوں گے، نہ ہی ہم نے کبھی ایسے موضوعات پر باتیں کی تھیں۔ اب مجھے اس بات کا صحیح ادراک ہوا تھا کہ ساجد زاہد کیوں کسی کی ملازمت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا ذہن کتنا باریک بیں اور تجزیاتی تھا جس میں ان کی خاندانی سوچ کی جھلک نمایاں تھی۔ سات برس ای ایف یو اور اس کے بعد CCI London سے ان کے رشتے اپنے واضح نشانات ثبت کر گئے تھے۔

ذاتی طور پر میں ہمیشہ سے ان کی دانشورانہ دیانت داری کا قائل تھا۔ ان جیسے ہی دوستوں کے توسط سے مجھے برِصغیر کے لوگوں کو، اور ان کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملی تھی۔

اور جہاں تک ای ایف یو سے ہمارے مشترکہ لگاؤ کی بات ہے تو مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ساجد زاہد جیسے انسان کا اس ادارے سے انسلاک ادارے کی خوش قسمتی تھی۔ کمپنی ان کی پیشہ ورانہ صلاحیت سے، ان کے تصورات اور وسیع نظری سے معاملات کو دیکھنے اور ملک میں بیمے کی صنعت کی ترقی کے حوالے سے یقیناً بہت مستفید ہوئی تھی۔

نواب حسن، ۱۹۶۷ء میں ای ایف یو ہیڈ آفس کے منیجر کی حیثیت میں

نواب حسن اور ایس ایم معین الدین، باہمی اتفاق ہی ہماری قوت ہے

ای ایف یو کے وائس پریذیڈنٹ نواب حسن اپنے دوستوں ساجد زاہد (کنسلٹنگ ایکچوری)، میاں سعید احمد
(سینئر وائس پریذیڈنٹ، لاہور) اور اقبال رضوی (چیف انجینئر، اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ)
کے ساتھ ۱۹۷۰ء میں کمپنی کی اعلیٰ کارکردگی کی خوشی مناتے ہوئے

نواب حسن

سفید فام اشرافیہ کا ایک فرد

میرے لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہاں 'مقدر' کا لفظ استعمال کیا جائے یا نہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اور نواب حسن پیشہ ورانہ راستے کے ایک اہم دوراہے پر متعارف ہوئے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہوئے تھے۔

یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے جب ایسٹرن فیڈرل میں میرا پانچواں سال تھا۔ مجھے اس تیزی سے ابھرتے ہوئے ادارے، اور اس میں کام کرنے والے لوگوں کی رفاقت پسند تھی۔ مگر مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ میرا مستقبل میونخ ری انشورنس کمپنی، جرمنی سے مربوط تھا۔ مسٹر بھیم جی کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ ہم اچھے دوست بن چکے تھے اور میں ان سے یہ وعدہ کر چکا تھا کہ جب تک وہ میرا متبادل تیار نہیں کر لیتے میں کراچی ہی میں رہوں گا۔ مسٹر بھیم جی میری کمپنی سے اس موضوع پر بات کر چکے تھے اور انھیں بھی یہ انتظام قبول تھا۔ ہم نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ میرا متبادل کوئی یورپی نہیں بلکہ مقامی ہوگا جس کی جڑیں اس سرزمین میں ہوں۔ تعجب نہیں کہ ہم دونوں کو اچانک بمبئی کی دوست، نیو انڈیا انشورنس کمپنی کا خیال آیا جن سے ہمارے اچھے تعلقات تھے۔ مسٹر بھیم جی کئی برس تک پاکستان میں ان کے مفادات کی نگہداری کر چکے تھے۔ میں بھی انھیں ایک قابلِ اعتماد دوست سمجھتا تھا، اس لیے کی میری جرمن کمپنی نے ۱۹۵۱ء میں ہندوستان میں انجینئرنگ انشورنس کو متعارف کرانے میں ان کی مدد کی تھی۔ دراصل دوسری عالمی جنگ کے بعد نیو انڈیا انشورنس پہلی ایشیائی انشورنس کمپنی تھی جس سے میونخ ری نے براہِ راست اپنے کاروباری رابطے دوبارہ استوار کیے تھے۔ ہم نے سوچا کہ ہم اپنے مسئلے پر نیو انڈیا انشورنس کے ڈائریکٹر مسٹر بی کے شاہ سے کیوں نہ بات کریں وہ مسٹر بھیم جی سے ذاتی طور پر متعارف تھے اور میں بھی ان سے کئی بار مل چکا تھا۔ میں ای ایف یو میں رہتے ہوئے ان کی کمپنی کے تعاون سے کئی بار ہندوستان جا چکا تھا تاکہ اس خطے میں انشورنس کے بدلتے ہوئے حالات، اور ملازمین کی تربیت کے حاصل مواقع کا جائزہ لے سکوں۔

صرف اپنے ملک ہی میں نہیں بلکہ سرحدوں کے پار بھی نیو انڈیا کی کاروباری ساکھ اچھی تھی۔ ان دنوں وہ عالمی سطح پر کاروبار کر رہے تھے۔ برطانوی اور امریکی اداروں کے برابر تو نہیں مگر اپنے خطے کے تناظر میں وہ ایک اچھے مقام پر تھے۔ وہ ہندوستان کے مشہور اور بہت بڑے ادارے ٹاٹا گروپ کا حصہ تھے اور اپنے ملک کی معاشیاتی ترقی میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ مسٹر شاہ پیشے کے اعتبار سے ایکچوری تھے۔ ۱۹۵۷ء میں جب بیمے کی صنعت کو قومی تحویل میں لیے جانے کے باعث ان کی کمپنی کا ایک بڑا حصہ ان کے قبضے سے نکل گیا تو وہ اور ان کے ساتھی جنرل انشورنس کی مزید ترقی میں لگ گئے، اور بلاشبہ انھوں نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں اس محاذ پر بہت اچھا کام کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اور بھی اچھے کام کیے تھے مگر جو سب سے اہم کام کیا تھا وہ زیرِ تربیت افسروں کے لیے انڈین سول سروس کے خطوط پر افراد کے انتخاب اور ان کی تربیت کے لیے ایک مینجمنٹ ٹریننگ اسکیم بنائی تھی۔ اس کمپنی میں عالمی جنگ سے قبل بھی اسی قسم کی ایک اسکیم چل رہی تھی مگر وہ بہت

چھوٹے پیمانے کی تھی جس میں سال میں صرف ایک یا دو افراد کو تربیت کے لیے بھرتی کیا جاتا تھا۔ مسٹر شاہ خوب جانتے تھے کہ تربیت حاصل کر لینے کے بعد ان 'لڑکوں' کی اہلیت بازار میں بڑھ جائے گی اور وہ تیار تھے کہ پچاس فی صد تک 'لڑکے' کمپنی کو چھوڑ کر دوسرے اداروں میں ملازمت اختیار کریں گے۔ ان کا خیال تھا کہ چھوڑ کر جانے والے بھی تربیت دینے والے ادارے کے نام کو روشن کریں گے اور اس طرح نیو انڈیا کا رتبہ بلند ہوگا۔

میں اور روشن علی بھیم جی دونوں اس تربیتی اسکیم سے واقف تھے اور ہمیں امید تھی کہ نیو انڈیا کے تربیت یافتہ افسروں کے نہایت وسیع 'اسلحہ خانے' سے اپنی کمپنی کے لیے ہم ایک مناسب فرد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چوں کہ ہمیں اپنے مطلب کے فرد کو تلاش کا طریقہ معلوم نہیں تھا، اس لیے ہم دونوں نے بمبئی جانے اور مسٹر شاہ سے اپنا مدعا بیان کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے یہ قدم اٹھایا مگر ہم دونوں اکٹھے نہیں گئے۔ ہم نے سوچا کہ پہلے میں جا کر مسٹر شاہ سے ملوں اس لیے کہ یہ میرا معاملہ تھا کہ مجھے ای ایف یو سے فراغت حاصل کرنی تھی اور اسی بنا پر مسٹر شاہ کی مدد درکار تھی۔ ہمارا یہ حربہ کامیاب ہوا۔ مسٹر شاہ بہت مہربان تھے اس لیے اور بھی کہ انھیں معلوم تھا کہ اس امداد سے نہ صرف ان کے پرانے دوست مسٹر بھیم جی بلکہ میونخ ری میں ان کے دوست بھی خوش ہوں گے۔ مسٹر شاہ نے بخوشی مدد کرنے کا وعدہ کرلیا اور مجھ سے دو دن کی مہلت مانگی اور کہا کہ میں اپنے دوست مسٹر بھیم جی کو لے کر ان سے ملنے آؤں۔ ہم نے ان کے کہنے پر عمل کیا۔

مسٹر شاہ نے کہا، ''میرا خیال ہے کہ میں آپ کے مطلب کا آدمی ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے نہ صرف وہ بہت خوش نظر آرہے تھے بلکہ وہ کچھ فخر بھی محسوس کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا گویا ان کا قد بڑھ گیا ہو اور ان کی ہمیشہ چمکنے والی آنکھیں اور بھی روشن دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر انھوں نے ہمیں ۱۹۴۸ء کے مشہور تربیتی افسروں کے جتھے میں سے ایک نہایت قابل اور کامیاب افسر نواب حسن کے بارے میں تفصیل سے بتایا، جو ذاتی مگر خفیہ وجوہ کی بنا پر پاکستان ہجرت کرنا بھی چاہتے تھے۔ انھوں نے نواب حسن کو بلا کر ہم سے ملاقات کرائی اور پہلی ہی نظر میں ہم دونوں نے ان کو پسند کر لیا۔ مسٹر بھیم جی نے کمال کر دکھایا اور چوبیس گھنٹوں سے پہلے ہی سارے معاملات طے ہوگئے۔ نواب حسن نے پاکستان آنے اور ای ایف یو کے جنرل انشورنس کے شعبے میں تکنیکی سربراہ بننے پر رضامندی ظاہر کردی۔ اس طرح نواب حسن ۱۹۶۴ء میں میرے متبادل کے طور پر ڈی مینجر ہیڈ آفس بنا دیے گئے۔

نواب حسن ۱۹۲۵ء میں ہندوستان کے مشہور صوبے یوپی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا اور ان کے چچا نے جو انڈین پولیس سروس میں تھے، اپنے بیٹوں کی طرح ان کی پرورش کی۔ نواب حسن نہایت ذہین طالب علم تھے۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے علی گڑھ سے اوّل درجے میں گریجویشن کیا۔ تعلیم کے ختم ہونے پر وہ ریاست رامپور چلے گئے جو علی گڑھ سے قریب ہی تھی اور وہاں انھوں نے رضا ٹیکسٹائل ملز میں ملازمت کر لی۔ چند برس بعد انھوں نے بمبئی میں قائم ٹیکسٹائل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا، ساتھ ہی ساتھ انھوں نے نیو انڈیا کی تربیتی اسکیم میں بھی درخواست دی تھی جو امتحانات میں نمایاں کامیابی کی وجہ سے منظور کر لی گئی تھی۔

اس طرح نواب حسن نے، میرے عزیز دوست اور انشورنس کے مشہور افسر مسٹر اے سی مکر جی کی یادداشت کے مطابق، ہندوستان کے یوم آزادی کی پہلی سالگرہ کے دوسرے دن، یعنی ۱۶ راگست ۱۹۴۸ء کو نیو انڈیا انشورنس کمپنی میں ملازمت کر لی۔ مسٹر مکر جی سے میری پرانی ملاقات تھی، اس وقت سے جب وہ نیو انڈیا کے مینجنگ ڈائریکٹر اور چیئرمین تھے، اور ریٹائرمنٹ کے بعد سے ہندوستان میں ٹوکیو میرین انشورنس کمپنی کی نمائندگی کر رہے تھے۔ جب میں کلکتے گیا تھا تو میں نے ان کو تلاش کیا تھا اس لیے کہ مجھے نیو انڈیا کے مقتدر افسران سے ان کے پرانے مراسم کا علم تھا۔

مسٹر مکر جی سے میری ملاقات تاج بنگال ہوٹل کے خوب صورت لاؤنج میں ہوئی اور انھوں نے بتایا، ''نواب اور میں پندرہ برس تک ایک دوسرے سے قریب رہے تھے۔ ہم دونوں ایک ہی طرح سوچتے تھے، باوجود اس کے کہ جغرافیائی اعتبار سے ہم مختلف علاقوں ہی میں نہیں

مختلف ممالک میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ہماری قربت اس وقت سے تھی جب ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی انشورنس کے شعبے میں اپنا پیشہ ورانہ سفر شروع کیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک ہی دن، ۱۶ر اگست ۱۹۴۸ء، ملازمت شروع کی تھی۔ ہم YMCA میں ایک ہی کمرے میں مقیم تھے اور ساتھ ہی کھانا بھی کھاتے تھے۔ نواب شادی شدہ تھا اور ایک بچے کا باپ تھا۔ اس کی بیوی خوب صورت کاغذ میں لپٹے مٹھائیوں اور سینڈ وچ کے محبت بھرے تحفے بھیجا کرتی تھی۔ اور واقعی ہم دونوں ان سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ نواب کی اپنے چچا سے والہانہ محبت اور وفاداری پر میں اکثر بہت حیران ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کی باتیں کرتا تھا اور ان کی شکر گزاری کرتا تھا اس لیے کہ انھوں نے کتنی محبت سے اس کی پرورش کی تھی۔ نواب نے بتایا کہ جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو اس کے چچا بہت پریشان تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ، نواب سمیت، ان کی اولاد ہندوستان سے ہجرت کرے۔ اورانھوں نے حتی الامکان اپنے خاندان کے تمام افراد کو اس ہی ملک میں رہنے کی تلقین کی جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ اس کے چچا کی تمام اولاد پاکستان ہجرت کر گئی اور صرف نواب ہندوستان میں رہ گیا تھا۔ نواب ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ اس کے نزدیک چچا سے اس کی وفاداری زیادہ اہم تھی اور اگر اس کے چچا کی خواہش ہے تو وہ ہندوستان ہی میں مقیم رہے گا اور وہیں قسمت آزمائی کرتا رہے گا۔ بہر حال، ہم دونوں نے ایک ہی دن نیو انڈیا انشورنس کمپنی کے صدر دفتر سے ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد میں رجمنٹ ٹریننگ اسکیم سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والا ہمارا جتھا پہلا تھا۔ ہمارا انتخاب پورے ہندوستان سے درخواست دینے والے پندرہ ہزار افراد میں سے ہوا تھا۔ گویا انڈین سول سروس میں منتخب ہونے والوں سے زیادہ مشکل ہمارا انتخاب تھا۔ اور دل چسپ بات یہ ہے کہ ہمارے جتھے کے دس کے دس افراد پیشے کی ممتاز سطحوں پر پہنچے۔ ہم میں سے تین ہندوستان کی مختلف کمپنیوں یا کارپوریشن کے چیئرمین کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ نواب حسن پاکستان میں ای ایف یو کے صدر بنے۔ ہمارا ایک ساتھی ایک بڑے بینک کا سربراہ بنا اور ایک نے بین الاقوامی ری انشورنس کے شعبے میں نام پیدا کیا۔ ایک ہانگ کانگ میں کامیاب بروکر بنا۔ بقیہ تین اسی کمپنی میں جنرل منیجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ چیئرمین کے بعد سب سے بڑا عہدہ ہوا کرتا تھا۔ یہ لوگ شاید اس لیے زیادہ اوپر نہ پہنچ سکے کہ جب وہ ہمارے ساتھ منتخب ہوئے تھے تو ان کی عمریں ہم سے زیادہ تھیں اس لیے کہ وہ پہلے دوسرے اداروں میں کام کر چکے تھے۔ میں یہ سب تفصیلات یہ بتانے کے لیے بیان کر رہا ہوں کہ آپ کی کمپنی میں شامل ہونے سے قبل نواب حسن کی پیشہ ورانہ نشو و نما ایک اچھے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس کے تمام ساتھی دل چسپ لوگ تھے اور ہم سب نرم گرم جھیلے ہوئے تھے۔ چوں کہ ہمارے گروپ کی بڑی تعریف و توصیف ہوتی تھی اور ہمیں ممتاز شخصیات سمجھا جاتا تھا اس لیے ہم سے حسد کیا جاتا تھا، ہم پر طنز ہوتے تھے اور پریشان بھی کیا جاتا تھا۔ مسٹر بی کے شاہ ان تمام باتوں کے ہونے سے قبل ہی محتاط تھے۔ انھوں نے جب پہلے دن ہمیں لیکچر دیا تھا تو خود بڑے واشگاف الفاظ میں ان باتوں کی نشان دہی کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ چوں کہ ہم لوگ مراعات یافتہ لوگوں میں سے ہوں گے اس لیے ہمیں اس کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ انکسار ہماری پہلی ترجیح ہونی چاہیے۔ آپ کو اس کی پوری کوشش کرنی ہوگی تا کہ آپ لوگ عام ملازمین میں ضم ہو جائیں۔ آپ ان کے ساتھ مل کر کام کریں گے تو وہ آپ سے محبت سے پیش آئیں گے۔ اور وہ آپ کو اس لیے احترام کی نظر سے دیکھیں گے کہ آپ عہدوں پر اپنی صلاحیتوں کی بنا پر پہنچے ہیں۔ اور آپ کو ان کا پورا تعاون حاصل ہوگا۔ واقعتاً یہ بڑے حکیمانہ الفاظ تھے۔ اگر آپ اس وقت کے حالات پر غور کریں تو یہ سب کچھ انقلابی معلوم ہوتا تھا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان دنوں 'بڑا صاحب' کا تصور عام تھا اور انھوں نے بار بار ان دقیانوسی خیالات کو تج دینے کی تلقین کی اور مشورہ دیا کہ سب کو آزادی سے اس طرح گھل مل جانا چاہیے جیسے کہ سب ایک جیسے ہوں۔ وہ بہت دل چسپ دن تھے، ہم اور نواب دونوں ایک ایک دن سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ تربیت کے دوران سکھائے جانے والے گُر ہمیں نئے نئے چیلنج سے مسابقت میں مدد کرتے تھے۔ یہ اچھے دن تقریباً ڈیڑھ برس تک رہے۔ پھر ہم جغرافیائی اعتبار سے علیحدہ ہو گئے۔ مجھے سیلون انشورنس کمپنی میں متعین کر دیا گیا جہاں سے مجھے تربیت کے لیے میونخ، جرمنی بھیج دیا گیا۔ وہاں میں نے کافی عرصہ آپ کی

کمپنی اور اَلیانز میں گزارا۔ نواب کا تبادلہ ڈھاکا کر دیا گیا جہاں اس نے اپنی پیشہ ورانہ تعلیم شروع کی اور چارٹرڈ انشورنس انسٹی ٹیوٹ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کر لی۔ اور جیسا کہ میری تقدیر میں لکھا تھا، جرمنی سے واپسی پر مجھے اپنی کمپنی کا کاروبار سنبھالنے کے لیے کلکتے میں تعینات کر دیا گیا۔ اس طرح میں اور نواب جغرافیائی اعتبار سے پھر قریب آ گئے اور ہمیں جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو ایک دوسرے سے مشورہ کرتے۔ ہم دونوں کے لیے یہ ایک دل چسپ دور تھا۔''

نواب حسن کے لیے ۱۹۵۸ء ایک اہم سال تھا۔ کراچی میں نیو انڈیا کے منیجر ریٹائر ہونے والے تھے اور نواب حسن کو یہ مشکل کام عارضی طور پر سونپا گیا تھا۔ مشکل اس لیے کہ اس عہدے پر رہنے والے کا قیام اگرچہ بمبئی میں ہوتا تھا مگر اس کو بمبئی اور کراچی کے درمیان بار بار آنا جانا ہوتا تھا اور اس سفر کی مشکلات اور تکالیف سے ہم سب واقف ہیں۔ نواب حسن کے لیے اس میں خیر کا پہلو یہ تھا کہ اس طرح انھیں اپنے خاندان کے زیادہ تر افراد سے، ان سے بھی جو پاکستان ہجرت کر کے کراچی میں آباد ہو گئے تھے، ملنے جلنے کے مواقع ملتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس تعیناتی نے نواب حسن کے ای ایف یو میں شامل ہونے اور پاکستانی قومیت حاصل کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔

نواب حسن ان دنوں بمبئی ہی میں تھے جب ہماری ان کی ۱۹۶۴ء کے موسمِ بہار میں ملاقات ہوئی تھی۔ مگر نیو انڈیا انشورنس کے کارِ منصبی کی بجا آوری کے لیے انھیں ایران، عراق، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی جانا ہوتا تھا۔

مسٹر مکر جی نے بتایا کہ ''جب ای ایف یو نے سلسلہ جنبانی کی اور آپ کا اور مسٹر بھیم جی کا بمبئی آنا ہوا تو نواب نے فوراً مجھ سے رابطہ قائم کیا اور رازدارانہ انداز میں مجھے بتایا کہ اس نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس اطلاع سے مجھے دھچکا سا لگا تھا۔ اس لیے کہ ایک تو ہم دوسرے اتنے قریبی دوست رہے تھے دوسرے یہ کہ اب تک جو کچھ اس نے مجھ سے کہا تھا، اس کے پیشِ نظر میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس ملک کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ اس نے دورانِ گفتگو بارہا یہ کہا تھا کہ اپنے چچا سے محبت اور احترام کے پیشِ نظر وہ اس ملک میں رہ کر خوش تھا۔ مگر اس نے یہ بھی کہا اس کے زیادہ تر رشتے دار پاکستان میں بس گئے ہیں اور خوش ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ وہ ہندوستان میں اپنی ملازمت اور ترقی کے ممکنہ مواقع سے بھی مطمئن ہے مگر اس کو اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔ میں نے اس کے خیالات سے اتفاق کیا مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، مجھے اس بات سے دھچکا ضرور لگا تھا۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ اس زمانے میں فسادات بھی ہو رہے تھے اور شاید ان حالات کے پیشِ نظر ہی وہ اس فیصلے پر پہنچا ہوگا۔ میں نے اس کے فیصلے پر سرِ خم کر دیا اور یہ جانتے ہوئے کہ پاکستانی مارکٹ میں ایسٹرن فیڈرل یونین کا بڑا نام تھا، ساتھ ہی یہ بھی کہ آپ کی کمپنی سے بھی اس ادارے کے قریبی تعلقات تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پیشہ ورانہ نقطۂ نظر سے نواب حسن صحیح فیصلہ کر رہا تھا۔ ہم دونوں نے یہ عہد و پیماں کیے کہ ہم اگرچہ جغرافیائی طور پر الگ ہو رہے ہیں مگر ہمیشہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے، یہ جانتے ہوئے کہ دونوں ملک کے اربابِ اقتدار بھلا کس حد تک ہم دونوں کو بار بار ملنے کے مواقع فراہم کرنے کی اجازت دیں گے۔''

میں مسٹر مکر جی کے خیالات سے، اور جس انداز میں انھوں نے اپنے دوست کا تذکرہ کیا تھا، بہت متاثر ہوا تھا۔ ان سے مل کر مجھے اس انسان کے اندرونی معاملات سے آگہی کے مواقع ملے تھے جس کی بنا پر ہم بھی اس کی ذاتی اور کاروباری زندگی سے متاثر ہوئے اور کراچی منتقل ہونے کے فیصلے کے بعد میں نے اس کے نئے مستقبل پر ہمیشہ نگاہ رکھی تھی۔

نواب حسن اس شہر میں باقاعدہ آن بسے جو ان کے لیے اجنبی نہیں رہ گیا تھا۔ انھیں اس ماحول میں جذب ہونے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ یہاں بسے ہوئے رشتے دار بھی اس تبدیلی میں ان کے معاون ہوئے تھے۔ اور شاید یہ بتانا کچھ ضروری نہیں کہ ہم لوگوں نے بھی ان کی مدد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ہم دونوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ کہ تقریباً چھ ماہ تک ہم، ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھیں گے اور دونوں مل کر سارے فیصلے کریں گے۔ بہت جلد ہی ہم ایک بے مثال ٹیم بن گئے اور دو سے تین ماہ کے اندر ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اتنا ہی

بہت ہے۔ میں نے چیف ایگزیکٹیو سے کہا کہ اب مزید کوئی ضرورت نہیں کہ ہم ایک ہی کام کو دوبار کریں اور اب نواب حسن کو کام پر اکیلے لگا دیا جائے، جس سے انھوں نے بہ خوشی اتفاق کیا۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ کام کرنے میں بہت مزہ آیا تھا اور نواب اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایسے بہت سے مواقع آئے جب ہم نے ایک دوسرے سے سیکھا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان اور ہماری دونوں کمپنیوں کے درمیان بھی تبادلۂ تجربات ہوتا رہا جس سے میونخ ری نے بھی فائدہ اٹھایا۔ نواب کے گہرے پیشہ ورانہ احساس اور ان کی تہذیبِ کار نے مجھے بہت متاثر کیا جس کی وجہ سے ہم دونوں میں ایک ایسا جذبۂ احترام پیدا ہوگیا تھا کہ میرے پاکستان اور ای ایف یو کو چھوڑنے کے بعد بھی یہ رشتہ مضبوطی سے قائم رہا۔ مجھے نواب کی خاموش طبعی سے کام کے مسائل کو سلجھانے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا۔ حالاں کہ وہ ایک خود بین و خود پسند انسان تھے مگر اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں سے ان کا جذباتی لگاؤ ان کی شخصیت پر چڑھی ہوئی خاموش طبعی کی 'جادوئی ٹوپی' کے باوجود جھانکنے والوں کو صاف دکھائی دیتا تھا۔ نواب حسن ایک کامل مہذب انسان تھے جن کا احترام ان کے حریفِ کار بھی کرتے تھے۔ بہت جلد ہی نواب حسن انشورنس کے تمام تکنیکی معاملات میں مقتدر مانے جانے لگے۔ وہ انشورنس ایسوسی ایشن آف پاکستان کی فائر کمیٹی کے چیئر مین اور مرکزی کمیٹی کے رُکن منتخب کر لیے گئے۔ یہ ادارے برسوں سے بیمے کی صنعت میں سب سے اہم حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں ایس ایم معین الدین کی وفات، اور بالخصوص ۱۹۷۶ء میں زندگی کے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد، مسٹر بھیم جی کے علاوہ نواب حسن سب سے بارسوخ شخصیت ہو گئے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں انھیں کمپنی کا صدر بنا دیا گیا اور کمپنی کے 'تین بندوق برداروں' (Three Musketeers) میں سے 'پہلے بندوق بردار' بن گئے جنھوں نے مسٹر بھیم جی کی خودساختہ جلاوطنی کے دوران ای ایف یو کا کاروبار چلایا تھا۔

اس کے بعد پاکستان، سعودی عرب اور انگلستان میں بہت مصروف سال گزرے۔ نواب حسن کمپنی کے صدر بنے اور بعد میں تکنیکی مشیر کی حیثیت میں انھوں مسٹر عظیم رحیم کی معاونت کی جو 'دوسرے بندوق بردار' بن چکے تھے۔ ۱۹۸۰ء میں مسٹر سلطان احمد نے کمپنی کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ نواب حسن کہیں بھی رہے ہوں، خواہ وہ سعودی عرب میں کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر یا لندن میں ہولڈنگ کمپنی کے ڈائریکٹر، وہ کسی نہ کسی صورت میں اس ادارے سے منسلک ہی رہے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے سے ہمیشہ رابطے میں رہے خواہ وہ کاروباری سلسلے میں ہو یا ذاتی۔ نئے گروپ کو بھی ان کے تکنیکی پیشہ وارنہ مشوروں کی ضرورت رہی۔ بدقسمتی سے ان کی صحت خراب ہونے لگی اور ایسا لگا کہ اب وہ ملازمتی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ بالآخر ۱۹۸۹ء میں وہ ملازمتی ذمے داریوں سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو گئے اور اپنا باقی ماندہ وقت اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ گزارنے لگے تھے۔ ہمارے سلسلے اب ٹیلی فون پر بات چیت تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے بعد ہمیں ملاقات کا موقع نہیں ملا۔

جب ہم اپنے دوست کے بارے میں بات کر رہے تھے جن کا اچانک ۱۹۹۴ء میں انتقال ہوگیا تھا تو مسٹر مکر جی نے کہا، ''ہاں نواب حسن سہت خود بیں آدمی تھے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے بھی تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔ میں بھی ذہنی طور پر نواب حسن جیسا ہی انسان ہوں، اگر چہ میں لوگوں سے میل جول رکھتا ہوں۔ گویا ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے۔ ہم دونوں خود بیں ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت کھلے ذہن سے ملتے تھے اور بغیر کسی تکلف کے بہت ساری ذاتی باتیں کرتے تھے۔ وہ لیے دیے رہنے والے انسان نظر آتے تھے مگر اچھے دوست اور اچھے انسان تھے۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ نواب حسن نسبتاً کم عمری میں انتقال کر گئے۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد جب ہماری کراچی میں ملاقات ہوئی تو ان سے مل کر میں بہت افسردہ ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے اندرونی خول میں واپس جانا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے ڈاڑھی بڑھانی شروع کر دی تھی اور میرے پوچھنے پر کہا تھا، ''نہیں میں اب کوئی کام نہیں کرتا۔'' وہ بہت مذہبی آدمی ہو گئے تھے، اگر چہ وہ ایسے نہیں تھے۔ انھوں نے بار بار مجھ سے کہا تھا، ''اپنے اطراف مجھے مسئلے ہی مسئلے نظر آتے ہیں، اور ان سے نمٹنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے آپ کو ایک مختلف ذہنی کیفیت میں ڈھال لیا تھا جس کی وجہ سے ان کی

وہ شخصیت باقی نہیں رہی تھی، میں جسے اتنے برسوں سے اتنے قریب سے جانتا تھا۔''

نواب حسن بہت نظم و ضبط کے آدمی تھے اور انھیں اپنے اوپر بہت قابو بھی تھا۔ میں نے ان کو غصے میں کبھی نہیں دیکھا۔ جیسا کہ ان کے انتقال پر تعزیت میں انشورنس جرنل نے لکھا تھا، ''فطرتی طور پر وہ خاموش طبع اور شریف انسان تھے۔'' ان لوگوں سے جن سے ان کا مزاج اور ذہنی سطح ملتی تھی، باتیں کرنے میں انہیں بہت لطف آتا تھا۔ وہ مذاق بھی کرتے تھے بشرطیکہ اس میں بھی کوئی عقلی پہلو ہو۔ وہ ٹھٹھا مار کبھی نہیں ہنستے تھے، بس ایک دل آویز مسکراہٹ ان کی خوشی کا سب سے بڑا اظہار ہوتی تھی۔ میں نے ہمیشہ ان کو ایسے ''سفید فام اشرافیہ کے ایک فرد'' سے تعبیر کیا ہے جو اپنے تمامتر دوستانہ جذبے کے ساتھ اچانک منظر پر نمودار ہوتا ہے اور بغیر کسی ذاتی منفعت کے امداد کی پیش کش کرتا ہے۔ انھوں نے کبھی کسی کو جان بوجھ کر نقصان نہیں پہنچایا۔ ان کی زندگی کی مختلف اختیار کردہ راہوں میں آپ کو کوئی بھی گھائل پڑا ہوا نظر نہیں آئے گا۔

اور جس طرح وہ اچانک آئے تھے، اپنی عادت کے مطابق، جہاں انھیں جانا تھا خاموشی سے چلے گئے۔ میں اور میری اہلیہ نواب حسن کے انتقال کے پانچ برس بعد مسز حسن سے ملاقات کے لیے گئے تو انھوں نے بتایا کہ یہ سب کس طرح ہوا۔ نواب حسن علی الصبح اٹھنے کے عادی تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد روزانہ وہ سیر کے لیے نکل جاتے۔ اس آخری صبح انھوں نے وہ کچھ کیا جو وہ کبھی نہیں کرتے تھے۔ اٹھنے کے بعد اپنی بیوی کو بھی اٹھایا اور کہا، ''اب تمھیں ہر بات کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ میں نے سب کچھ اس طرح کر دیا ہے کہ گھر اسی طرح چلتا رہے گا۔ اور پھر انھوں نے اپنا سب سے اچھا سوٹ نکال کر بستر پر رکھ دیا۔ جب ان کی بیوی نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کو کسی جلسے میں جانا ہے تو انھوں نے کہا کہ وہ حسبِ معمول صبح کی سیر کو جا رہے ہیں اور واپس آ کر لباس تبدیل کریں گے اور بعد میں کہیں جائیں گے۔ مسز حسن کو بہت عجیب سا لگا۔ وہ کہتی ہیں کہ ''وہ بہت پُرسکون تھے مگر عجیب سے لگ رہے تھے۔'' انھوں نے خدا حافظ کہا جو وہ سیر پر جانے سے قبل کبھی نہیں کہتے تھے۔ اور پھر وہ باہر چلے گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد کسی نے دروازے پر دستک دی اور پوچھا کہ کیا جو صاحب ابھی سیر کو باہر گئے ہیں۔ وہ آپ کے شوہر تھے۔ ان کی اہلیہ نے کہا، جی ہاں، یقیناً۔ مگر اس وقت وہاں اور لوگ بھی جمع تھے جو ان کو اٹھا کر گھر کے اندر لائے۔ وہ انتقال کر چکے تھے۔ چند دقیقوں کے اندر ہی ان کا انتقال ہو گیا ہو گا۔ ان کا چہرہ بالکل پُرسکون تھا، کسی درد یا تکلیف کے آثار نہیں تھے۔

اُس دن نواب حسن آخری بار گھر آئے تھے۔

ای ایف یو کے مینجنگ ڈائریکٹر، ۱۹۷۸ء، عظیم رحیم

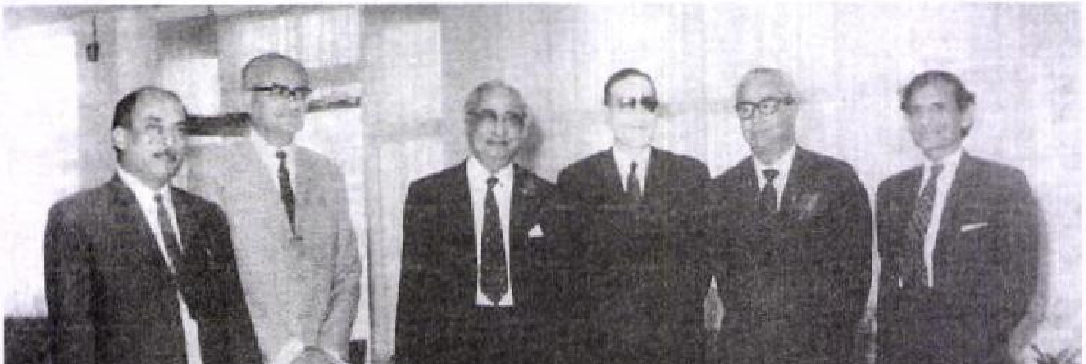

روشن علی بھیم جی اور ای ایف یو کے ڈائریکٹر کا ۱۹۶۷ء کے لائف کنونشن کے موقع پر ڈھاکا ایئرپورٹ پر استقبال مشرقی پاکستان میں ای ایف یو کے منیجر عظیم رحیم اور حکومتِ پاکستان کے سابق سیکرٹری ایم یو احمد بھی تصویر میں نمایاں ہیں

عظیم رحیم
بنگالی طرزِ شرافت

انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ ''زندگی ایک کھیل کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں جیت بھی ہوتی اور ہار بھی۔ میں نے شروع ہی سے جیتنے والوں کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

عظیم رحیم سے میری پہلی ملاقات ستمبر ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ میرے پیش رو مسٹر شوارز جرمنی واپس جا چکے تھے اور کمپنی کے جنرل مینجر اور موئسس مسٹر حیدر پاکستان انشورنس کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر ہو گئے تھے۔ کمپنی میں ایک قسم کا خلا پیدا ہو چکا تھا۔ اسی دوران میں نے ملک کے مشرقی بازو کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈھاکا جانے والی پی آئی اے کی بوئنگ ۷۰۷ کی چھ گھنٹے کی طویل پرواز موسم کی خرابی کی وجہ سے تاخیر سے پہنچی۔ مشرقی پاکستان کے دارالحکومت پر موسلا دھار بارش ہو چکی تھی۔ مشرقی پاکستان میں ایسٹرن فیڈرل یونین کے چیف عظیم رحیم نے مجھے لینے کے لیے اپنے ڈرائیور کو اس پیغام کے ساتھ ہوائی اڈّے بھیجا تھا کہ وہ جیم خانہ کلب میں میرے منتظر ہوں گے۔ ہوائی اڈے سے جیم خانہ پہنچنے میں بہت وقت لگا اس لیے کہ کچھ سڑکوں پر پانی جمع ہوگیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رکشے والوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی سواریوں کو پانی سے خشکی پر لے جانے میں مصروف تھے۔ کلب کے دروازے پر بھی پانی بھرا ہوا تھا۔ کچھ پتھروں پر رکھے ہوئے تختوں کی مدد سے بہ مشکل تمام میں اندر پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ عظیم رحیم صاحب لابی میں میرے منتظر ہیں۔ میرے منتظر ساتھی ایک کھلے ہوئے برآمدے میں تشریف فرما تھے اور ان کے اطراف بہت سے دوست بظاہر کسی اہم معاملے پر بحث میں مشغول تھے۔ عظیم رحیم صاحب نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ یہ کوئی اہم بحث نہیں، بس یوں ہی دوستانہ گپ شپ تھی۔ انھوں نے مجھے دوستوں سے متعارف کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر نسبتاً ایک پُر سکون گوشے کی طرف لے گئے۔ کراچی جیم خانہ اور سندھ کلب کے مقابلے میں، ہم جس کے عادی تھے، اس جگہ زیادہ بھیڑ تھی مگر یہاں کا ماحول غیر رسمی سا تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ میرے مقامی ساتھی یہاں موجود لوگوں سے کافی گھلے ملے ہوئے تھے۔

عظیم رحیم خاصے دراز قد اور خوش لباس آدمی تھے۔ وہ ٹائی باندھے ہوئے تھے جو یہاں کے ماحول میں عام نہیں تھی۔ ان سے بات کرتے ہی مجھے محسوس ہوگیا کہ وہ بہت نرم گفتار انسان تھے جن سے بہت آرام سے بات کی جاسکتی تھی۔ انھوں نے جس انداز میں مجھے خوش آمدید کہا اس میں خلوص جھلکتا تھا، ان کا انداز دوستانہ تھا اور اور وہ کھلے ذہن کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ کام کے آدمی ہیں اور آج جب میں چالیس برس پہلے کی ملاقات کو یاد کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کا یہ انداز ہی ہمارے درمیان مستقبل میں کاروباری رشتہ استوار کرنے کی بنیاد بنا تھا۔

عظیم رحیم ۱۹۱۹ء میں کلکتے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ نہایت روانی سے بنگالی بولتے تھے۔ بہت ہی کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کا خاندان سندھی تھا۔ غالباً انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں ان کا خاندان کچھ (Kutch) ہجرت کر گیا تھا۔ جس جگہ وہ آباد ہوئے اس کو بدری

کہا جاتا تھا۔ ان کے والد تین یا چار بھائی تھے۔ ان سب نے دنیا کے مختلف علاقوں میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک مشرقی افریقا چلا گیا، دوسرا کلکتے میں آباد ہو گیا اور ایک یا دو گجھ ہی میں رہ گئے تھے۔ جیسا کہ ہندوستانی خاندانوں میں ہوتا ہے، ایک گھرانے کے جانے کے بعد دوسرے گھرانے والے بھی پہنچ جاتے، آپس میں کاروبار کرنے لگتے اور تاجر بن جاتے۔ عظیم رحیم کے والد کلکتے میں بس گئے تھے اور انیسویں صدی کے آخر میں انھوں نے بنیان بنانے کا کارخانہ لگالیا، ان کے تمام اہلِ خانہ جس سے کسی نہ کسی طور پر منسلک تھے۔ ان سب کا کاروبار اچھا خاصا چل گیا تھا۔ عظیم رحیم کے والد نے تین شادیاں کی تھیں جن سے بارہ بچے پیدا ہوئے۔ عظیم رحیم ان ہی میں سے ایک تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اینگلو گجراتی اسکول میں ہوئی جس کے بعد وہ کلکتے کے سینٹ زیویر اسکول اور کالج میں پڑھتے رہے تھے۔ مگر جلد ہی تقریباً پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی اور مسلمانوں کا کاروبار مندا پڑ گیا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، عظیم رحیم ہمیشہ جیتنے والے گروہ میں ہونا پسند کرتے تھے، اس لیے انھوں نے بنیان کے کاروبار کو خیر باد کہا اور دوسرے امکانات کی تلاش میں لگ گئے۔ عظیم رحیم کے خاندان کے دوست یوسف خالد بیٹھانے، جو بمبئی میں نئی ساختہ حبیب انشورنس کمپنی کے منیجنگ ڈائریکٹر تھے، ان کو انشورنس کے کاروبار میں قسمت آزمائی کا مشورہ دیا جو انھوں نے قبول کر لیا۔ عظیم رحیم نے پہلے برٹش انڈیا انشورنس کمپنی کے کلکتے کے دفتر میں ۱۹۴۵ء میں کام شروع کیا۔ تقسیم ہند کے بعد بیٹھا صاحب نے عظیم رحیم کو ایسٹرن فیڈرل اور ایک اور کمپنی کے مشترکہ دفتر میں حبیب انشورنس کمپنی کا نمائندہ مقرر کر دیا۔ حسبِ معمول عظیم رحیم نے جیتنے والے گروہ کی تلاش میں ایسٹرن فیڈرل یونین میں شرکت کر لی۔ پہلے وہ چاٹگام میں اور پھر ڈھاکے کی شاخ کے منیجر بنا دیے گئے۔ بعد میں وہ پورے مشرقی پاکستان کے منیجر ہو گئے اور کمپنی نے ان کا عہدہ بڑھا کر ان کو سینئر ایگزیکٹیو وائس پریزیڈنٹ بنا دیا۔

عظیم رحیم گفتگو میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے علی رحیم نے بتایا کہ "میں ہمیشہ دیکھتا تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ کسی نہ کسی سے ٹیلی فون پر گفتگو شروع کر دیتے تھے۔ مجھے خبر نہیں کہ کس سے مگر صبح آٹھ بجے سے ہی یہ سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہر روز وہ مختلف گاہکوں سے مصروفِ گفتگو ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے گاہکوں سے ان کے مضبوط رشتے قائم رہیں۔ بچپن ہی سے میں اپنے والد کو ایک ہیڈ ماسٹر کی مانند سمجھتا تھا۔ وہ لوگوں کو برابر وہ کام کرنے پر راضی کرنے کی کوشش کرتے جو ان کے نزدیک ان لوگوں کے لیے بہتر ہوتا، بالکل کسی اسکول کے ماسٹر کی طرح۔ جب بھی میں ان کے دفتر جاتا تو ان کو بڑی سی میز پر کاغذ پنسل پھیلائے دستخط کرتے دیکھتا تھا۔"

مشرقی پاکستان میں ای ایف یو کے جنرل ڈپارٹمنٹ کے کاروباری سربراہ کی حیثیت سے عظیم رحیم نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی تھی کہ ان کی 'سلطنت' اتنی مضبوط ہو کہ کراچی میں بیٹھے ہوئے افسران کو ان کے معاملات میں دخل اندازی کا موقع نہ مل سکے۔ عظیم رحیم مشرقی پاکستان کے سیاسی دھارے کے جذبات کی مدد سے کلیم دلوانے کے لیے اپنے پتّے بڑی ہنرمندی سے کھیلنا جانتے تھے۔ اگر چہ وہ پیدائشی پکّے بنگالی تھے مگر انھوں نے کبھی سیاسی جذبات کی لہروں کے بل پر اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بہت بارسوخ دوست اور ہنرمند گر و رکھتے تھے، اور جب بھی ضرورت پڑتی ان کے مضبوط بازوؤں کی مدد سے اپنا مقصود حاصل کر لیتے۔ ۱۹۶۰ء تک انھوں نے اصفہانی خاندان سے اچھے تعلقات استوار کر رکھے تھے، مشرقی پاکستان میں جن کے سارے کاروبار کا بیمہ ایسٹرن فیڈرل ہی کے پاس تھا۔ آدمجی خاندان سے بھی ان کے بہت اچھے تعلقات تھے جو ان دنوں مشرقی پاکستان کے بڑے صنعتکاروں میں سے ایک تھے۔ ڈھاکے کے کاروباری حلقے میں عظیم رحیم بہت مقبول تھے اور اس طرح کمپنی کے لیے وہ ایک بڑا اثاثہ تھے۔ جس طرح ہندوستان میں برطانوی راج کے تسلط کے خلاف جدو جہد جاری تھی کچھ اسی طرح کمپنی کے صدر دفتر اور شاخوں کے درمیان رسّہ کشی کی ایک کیفیت تھی جس کو ہم وسیع معنوں میں بنگال کی مسلم قومیت اور کراچی (اور بعد میں اسلام آباد) کے مرکزِ اقتدار کے درمیان کھینچا تانی کے مماثل قرار دے سکتے ہیں۔ ملک کے مشرقی بازو کے عام اور مخصوص حالات اور کیفیات کا پورا ادراک کیے بغیر کمپنی کے صدر دفتر کو مکمل مرکزِ اقتدار بنانا، غیر ارادی طور پر، شاید کمپنی نے بھی برطانوی راج کے طریقۂ کار ہی سے سیکھا تھا۔ اگر آپ بنگال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو نہایت سخت گیر قوم پرست طبقہ نظر آئے گا

جو وقتی طور پر تحریکِ پاکستان کے ہراول دستے میں شامل ہوگیا تھا۔ تاریخ کے بیشتر طالب علم اس بات کے قائل ہو چکے ہیں کہ ۱۶ردسمبر ۱۹۷۱ء کو بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ہونے والے واقعات بنگالی قوم پرست طبقے کی اسی جدوجہد کا شاخسانہ بن کر اُبھرے تھے۔

میں یہ نہیں کہنا چاہ رہا ہوں کہ عظیم رحیم کمپنی میں اپنی ایک آزاد سلطنت بنانے میں بنگالی سیاست پر عمل کر رہے تھے۔ بظاہر اس قسم کی سیاست اس لیے ضروری نہیں تھی کہ کمپنی کے دونوں چیف ایگزیکٹیو، جن کی ماتحتی میں وہ کام کر چکے تھے، جناب عبدالرحمٰن صدیقی اور جناب کے ایف حیدر خود نہ صرف بنگالی النسل تھے بلکہ ملک کے مقدر لوگوں سے ان کے ویسے ہی قریبی تعلقات بھی تھے جیسے کہ مسٹر بھیم جی نے بھی قائم کر رکھے تھے۔ میں در اصل یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ عظیم رحیم جیسا انسان بھی جس کی مشرقی پاکستان کی سماجی اور معاشیاتی زندگی اور حلقۂ اقتدار تک پہنچ تھی، مشرقی اور مغربی بازو کے درمیان چلنے والی زیریں لہروں اور گرم جذبات سے متاثر ہوا ہوگا جن کے نتیجے میں ۱۹۷۱ء کے بدقسمت واقعات رونما ہوئے تھے۔

جی نہیں! عظیم رحیم کسی زاویے اور کسی معنوں میں بھی سیاست داں نہیں تھے۔ تمام تر تکنیکی اڑنگوں کے باوجود وہ ان حقوق کے لیے بڑی بہادری سے لڑتے رہے تھے جو ان کے نزدیک ان کے گاہکوں اور دوستوں کو ملنے چاہییں تھے۔

عظیم رحیم اور ان کے اہلِ خانہ اس وقت کراچی میں مقیم تھے جب مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہونا شروع ہوئے تھے اور بالآخر بنگلہ دیش قائم ہوگیا تھا۔ ان کا بیٹا کہتا ہے کہ ''جب مشرقی پاکستان کا زوال ہوتو ہم سب موجودہ حالات کا محاسبہ کر رہے تھے۔ جو کچھ بھی ہمارے پاس تھا تقریباً سب کھو چکا تھا۔ ہم سب اکٹھے تھے جب اچانک میرے والد نے کہا تھا، 'کیا یہ سب سے بڑی نعمت نہیں ہے کہ ہم سب زندہ اور صحیح و سالم ایک ساتھ ہیں۔ آج سے ہم مشرقی پاکستان کو بھول کر نئی ابتدا کریں گے۔ تم سب کو خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تمھارے باپ کے پاس اس وقت بھی ایک باقاعدہ ملازمت ہے۔ ہم نے جو کچھ بھی کھویا ہے اب ہم اس کی پروا نہیں کریں گے۔' یہ سُن کر واقعی مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ جو کچھ ہمارے پاس تھا اس کے لیے انھوں نے بہت جدوجہد کی تھی، انھوں نے ساری زندگی کام کیا تھا۔ اور اب وہ سب کچھ کھو چکے تھے، تمام اثاثہ، اپنا خاندانی سلسلہ، حتیٰ کہ دوست بھی۔ اور اب وہی کہہ رہے تھے کہ فکر نہ کرو ہمیں پھر سے شروعات کرنی ہے۔ چند برس بعد بنگلہ دیش سے میرے ایک بنگالی دوست ہم سے ملنے آئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر ہم سب واپس ڈھاکا آجائیں تو، فوراً تو نہیں مگر چند برسوں کے اندر اندر، جو کچھ بھی ہم نے کھویا ہے وہ سب واپس مل جائے گا۔ یہ سن کے میں بہت جذباتی ہوگیا اور میں نے اپنے والد سے اس موضوع پر بات کی۔ وہ بہت پُرسکون رہے اور سر ہلا کر کہا، 'ہم نے جو کچھ کھویا ہے وہ کھوگیا ہے، اس کو بھول جاؤ، اپنے کاروبارِ زندگی میں لگے رہو۔ میں نے وہاں جو کچھ کھویا ہے مجھے اس کی بالکل فکر نہیں نہ مجھے اس کا افسوس ہے۔' میرے والد کی سوچ کا یہی انداز تھا۔ وہ اسی قسم کے انسان تھے جو ہمیشہ موجود کی پروا کرنے والے ہوتے ہیں اور ہر طرح کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔'' اس قسم کے انسان کے لیے مختلف ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال کر ضم ہو جانا کچھ آسان کام نہیں ہوتا۔ مگر ان کے بیٹے کے مطابق انھوں نے یہ چیلنج قبول کر لیا تھا اور ۱۹۷۳ء میں نواب حسن کے ساتھ اور بعد میں تنِ تنہا ان کو پوری کمپنی کی باگ ڈور سونپ دی گئی، جس کی وہ تیس برسوں سے خدمت کر رہے تھے۔ لوگوں کے مسائل کو بلا کسی تفریق اور غیر رسمی طور پر حل کرنے کی کوشش کی وجہ سے وہ اپنے دوستوں میں ہر دلعزیز ہوگئے تھے۔ کمپنی کی ملازمت کے آخری دن تک وہ اپنے شریفانہ طرز، نرم خوئی اور جذبۂ ہمدردی کی وجہ سے پسند کیے جاتے تھے۔ وہ حتی الوسع کمپنی کے سفینے کو تلاطم سے نکالنے میں کامیاب رہے، جو ان دنوں بڑے طوفانوں کی زد میں تھا۔ مشرقی پاکستان کے زوال کے نتیجے میں آدھے سے زیادہ کاروبار کا ڈوب جانا اور پھر اس کے ایک برس بعد زندگی کے بیمے کا قومی ملکیت میں لیا جانا اور اس کے ساتھ ہی کمپنی کے زیادہ تر اثاثوں کا حکومت میں تحویل میں چلا جانا (جن کی بنا پر یہ ادارہ بڑا ہوا تھا) ایسے سانحے تھے جنھوں نے بڑی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ ساتھ ہی اور بہت سی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کی وجہ سے ان تمام اداروں کے بیمے کا کاروبار سرکاری ادارے

نیشنل انشورنس کارپوریشن کی تحویل میں چلا گیا تھا جس سے کمپنی کو اور بھی دھچکا لگا تھا۔ ان سب حالات کے پیشِ نظر مستقبل کی ترقی کے لیے کمپنی کی نئے سرے سے ترتیب اہم اور مشکل بھی ہوگئی تھی۔

روشن علی بھیم جی کی خود ساختہ جلا وطنی کے بعد جو لوگ سامنے آئے اور جنھیں میں نے 'تین بندوق برداروں' کا نام دیا تھا، عظیم رحیم ان میں سے ایک تھے۔ اور جب ۱۹۸۰ء میں وہ ریٹائر ہوئے تو انشورنس کی صنعت میں انھوں نے جو کچھ بھی کامیابیاں حاصل کی تھیں، ہمیں ان پر فخر تھا۔ جن لوگوں پر کمپنی کی کارکردگی پر نظر رکھنے کے فرائض تھے، وہ ہزاروں میل دور ہوں تو اس قسم کے لوگوں کو کنٹرول کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر ایسے ہی موقعوں پر کسی اچھے کاروباری ادارے کے ایک عام برانچ منیجر اور ایک ریجنل منیجر کا فرق ابھر کر واضح ہوتا ہے۔ جب میں اور وہ دونوں رفیقِ کار تھے، ہمیں کام کرنے کے اصول معلوم تھے اور ہم ان کی حدوں میں رہ کر ہی اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جب ان کو بڑے اختیارات ملے تب بھی وہ اپنے زرّیں اصولوں ہی پر کاربند رہے تھے۔

کمپنی سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے ہر طرح کے کاروبار سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور اپنے سماجی کاموں کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہ حبیب گروپ کے وقف کی کچھ خدمت کرنا چاہتے تھے۔ مگر پھر ان کے پرانے دوستوں، 'باوانی' اور 'علی شوگر' کے مسٹر زکریا نے مل کر Reliance نام کی ایک جنرل انشورنس کمپنی بنائی اور انھوں نے عظیم رحیم سے اصرار کیا کہ کم از کم شروع دنوں میں ہی وہ اس کی باگ ڈور سنبھال لیں اور انھوں نے بہت حیص بیص کے بعد یہ ذمے داری قبول کر لی۔ اس نئی کمپنی کی تاسیس کے بعد وہ ری انشورنس کے لیے میونخ میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بعد میں جب میں کراچی آیا تو ان کے دفتر بھی ملاقات کے لیے گیا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف اپنے دوستوں کی معاونت کے لیے اس کمپنی میں شامل ہوئے تھے، جسے دو برس کے بعد انھوں خیر باد کہہ دیا تھا اور کلی طور پر ریٹائر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد وہ وقف کے کاموں میں مشغول ہو گئے تھے۔ وہ بالخصوص مشرقی پاکستان سے اجڑنے والے لوگوں کے لیے کام کر رہے تھے، ان کے رہنے کے لیے مکان، بچوں کے لیے اسکول، ملازمت کے لیے تربیت اور بیماری میں علاج وغیرہ ان کی مشغولیات تھیں۔ وہ بیواؤں اور یتیموں کے وقف کے لیے بھی سرگرمِ عمل تھے، جس سے، ان کے بیٹے کے مطابق، ''انھیں ایسے کاموں میں لطف آتا تھا اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وہ انھیں میں مشغول رہے۔ وہ کافی دنوں سے بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ سرطان ان کے پورے بدن میں پھیل چکا تھا مگر انتقال سے دو ہفتے قبل تک وہ وقف کے دفتر جایا کرتے تھے۔ میں روز صبح دفتر چھوڑنے اور شام کو واپس لانے جایا کرتا تھا۔ آخری دم تک وہ لوگوں کی مدد کے خواہاں رہتے تھے اور ان سے مل کر خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے بھائی سے کہا تھا، 'میرے پاس جتنا بھی وقت ہے میں اپنے بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں اور وقف کا جتنا بھی کام ہے میں اس کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا مگر انھوں نے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کی۔ اور اس رات جب ان کا انتقال ہوا تھا، وہ اسپتال میں تھے اور دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ انھوں نے مجھ سے کھڑکی کے پردے سرکانے کے لیے کہا اور اچانک بولے کہ اس کو دیکھ کر کیا تمھیں مشرقی پاکستان یاد نہیں آتا؟ بس یہی ان کے آخری الفاظ تھے۔ انھیں بہت پُرسکون موت نصیب ہوئی۔ آخری وقت شاید بنگال میں گزارے ہوئے کامیاب دن انھیں یاد آتے رہے ہوں گے جہاں انھوں نے اپنی دل چسپ زندگی کا بیشتر وقت گزارا تھا۔''

جب ان کا بڑا بیٹا علی رحیم مجھ سے ملاقات کے بعد واپس ہو رہا تھا تو مجھے اس کے والد عظیم رحیم سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ رہی تھی۔ میں نے ڈھاکے کی زمین پر قدم رکھا تھا تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اور جب ہم کلب سے نکل رہے تھے تو بارش تھم چکی تھی اور پورا چاند اپنی جگمگاہٹ سے پورے آسمان پر حاوی دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے ہوٹل میں چھوڑتے وقت انھوں نے آہستگی سے اپنی بھاری آواز میں کہا تھا، ''یہ ہے بنگال کا دل، مشرقی پاکستان۔ پیارا، تنک مزاج اور ناقابلِ پیشین گوئی مشرقی پاکستان! مگر ایک بار آپ اس سے پیار کر لیں تو پھر زندگی بھر اس کو پیار ہی کرتے رہیں گے۔''

سلطان احمد

سنگِ خارا

سلطان احمد ایسٹرن فیڈرل یونین کے ان 'تین بندوق برداروں' میں سے تھے جنھوں نے چیف ایگزیکٹیو کی خود ساختہ جلاوطنی میں کمپنی کا انتظام سنبھالا تھا۔ اسی زمانے میں کمپنی کا نام بھی ای ایف یو جنرل کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ان تین بندوق برداروں میں سے دو نواب حسن اور عظیم رحیم اعلیٰ درجے کی محترم شخصیات سمجھے جاتے تھے مگر جیسا کہ آپ آگے چل کر دیکھیں گے، 'سلطان بھائی' اپنے دو پیش رو سربراہوں سے مختلف تھے۔ بیمے کی صنعت کے ان تینوں پیشہ ور افسروں کی کارکردگی مثالی تھی اور تینوں ہی اعلیٰ ترین عہدوں پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

جب نواب حسن کو کمپنی کا سربراہ بنایا گیا تو یہ اچنبھے کی بات نہیں لگی تھی۔ اس لیے کہ جب میری میونخ واپسی کی غرض سے ان کو کمپنی میں شامل کیا گیا تھا تو ان کے پاس تمام ضروری اسناد اور صلاحیتیں تھیں۔

عظیم رحیم ایک زمانے سے مشرقی پاکستان میں کمپنی کے کاروبار کے سربراہ تھے۔ ملک کے اس بازو کے کٹ جانے کے بعد جو کچھ بچ رہا تھا اس کو ایک ادارے کی شکل میں باقی رکھنے کے بعد سب سے اعلیٰ عہدے کے لیے عظیم رحیم بھی ایک سنجیدہ امیدوار تھے۔

مگر سلطان احمد اپنی تمام کاروباری زندگی ایک برانچ منیجر رہے تھے اور خود ان کے لیے یہ ایک حیرت کی بات تھی کہ وہ اچانک اپنے علاقے کے سربراہ بھی اور بعد میں کمپنی کے سربراہ بن گئے۔ اگر چہ یہ ایک تعجب خیز اور اور قابل رشک ترقی کی مثال تھی، تاہم میں سمجھتا ہوں کہ کمپنی کے بدلتے ہوئے حالات اور بیمۂ زندگی کی صنعت کو سرکاری تحویل میں لیے جانے کے باعث یہ منطقی بھی تھی۔ صنعت میں اس تبدیلی کے بعد ملک کا پورا نظام اتھل پتھل سے کا شکار تھا اور اس کے ساتھ نئے چہرے بھی ابھر کر سامنے آگئے تھے۔ ای ایف یو کی انتظامیہ کے ڈھانچے میں تبدیلی کی وجہ سے سلطان احمد کو اہم کردار ملا تھا اور میں اگلے صفحات میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ یہ کیوں ہوا اور کیسے۔

اگرچہ ان کی پیدائش ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے یوپی کے شہر بریلی میں ۱۹۲۸ء میں ہوئی تھی مگر وہ دیکھنے میں بالکل پٹھان لگتے ہیں۔ کم از کم جب میں نے پہلی بار انھیں ۱۹۶۰ء میں پٹھانوں کے خفیہ دارالحکومت پشاور میں دیکھا تو مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ دراز قد اور کھلتا ہوا رنگ اس بات کی غمازی کرتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ملاقات کے مقام اور اطراف کے ماحول سے مجھے دھوکا ہو گیا ہو اس لیے کہ میں کچھ قبل ہی یورپ سے آیا تھا اور میرے پیش رو مجھے ریل کے طویل سفر کے ذریعے وہاں لے گئے جو ان دنوں ویسے بھی ایک تجربہ تھا۔ ماری انڈس میں واقع کوئلے کی کانیں جو دنیا کے اُس پار واقع تھیں، اور شاید آج بھی اسی کیفیت میں ہوں گی۔ اور وہاں سے پشاور تک کے ایک تحیر خیز سفر کے بعد سلطان احمد کے پیش رَو جناب عطا اللہ ملک نے ریلوے اسٹیشن پر ہمارا خیر مقدم کیا اور ہمیں ڈین ہوٹل لے گئے جہاں اس روز ایک کاکٹیل پارٹی کا انتظام تھا جس میں ایسٹرن فیڈرل یونین کے حریفوں کو مدعو کیا گیا جس میں سلطان احمد بھی شامل تھے۔ چند برس بعد میں اپنے

اہلِ خانہ کو بھی وہاں لے گیا تھا مگر اس وقت سلطان احمد اس دل فریب شہر میں ای ایف یو کے افسر بن چکے تھے۔ انھوں نے ہمیں شہر کی سیر کرائی اور اس دوران وہ ہمیں قصہ خوانی بازار کے ایک چھوٹے سے کارخانے میں لے گئے جہاں طرح طرح کے آتشیں ہتھیار سجے ہوئے تھے جن میں سے کوئی سا بھی خریدا جاسکتا تھا۔ وہ ہمیں مشہور درّۂ خیبر اور لنڈی کوتل بھی لے گئے راستے میں جہاں جنگجویانہ ہتھیاروں سے لیس ایک کبھی نہ ختم ہونے والا قافلہ رواں دواں تھا جسے دیکھ کر ہم بھی مرعوب ہوئے۔ سلطان احمد ہی نے پاک افغان سرحد سے بالکل ملحق دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا تھا جس میں قبائل کے سرداروں کے علاوہ حکومت کے پولیٹیکل ایجنٹ ہمارے میزبان تھے۔ تعجب نہیں کہ سلطان احمد کو میں نے ہمیشہ پٹھان ہی سمجھا۔ جب اس کتاب کے سلسلے میں، میں نے ان کی جائے ولادت کے بارے میں سوال کیا تو مجھے احساس ہوا کہ کبھی کبھی پہلی ملاقات بھی کتنی غلط ہوسکتی ہے۔ ربع صدی تک پٹھانوں کے درمیان رہ کر وہ پٹھان ہو بھی جاتے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

ان کا بچپن یو پی میں گزرا اور وہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے والد حیوانوں کے ڈاکٹر تھے اور حکومت کے زیرِ انتظام چلنے والے ایک انسٹی ٹیوٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۶ء میں ان کا لاہور تبادلہ ہوگیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں واقع ماڈل ہائی اسکول سے میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے بعد سلطان احمد نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا، وہیں سے انٹرمیڈیٹ کیا اور اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر روسی فلموں کی درآمد اور نمائش کا کاروبار شروع کیا۔ اس کاروبار میں ڈھائی برس تک مشغول رہنے کے بعد اپنے والد کے مشورے پر اس سے کنارہ کشی کی اور کافی عرصے سے قائم کوآپریٹیو انشورنس سوسائٹی آف پاکستان میں ملازمت کر لی جس کا صدر دفتر لاہور میں تھا۔ انھوں نے یکم اپریل ۱۹۵۲ء کو کوآپریٹیو انشورنس میں زیرِ تربیت انسپکٹر کی حیثیت سے ملازمت شروع کی تھی۔ اس ملازمت میں ان کو انڈر رائٹنگ اور مارکیٹنگ میں کافی عمیق تربیت سے گزرنا پڑا تھا۔ ان کے استادوں میں کمپنی کے جنرل منیجر اور انشورنس کے ممتاز کارکن نسیم احمد انصاری، لنڈن اینڈ لنکا شائر کے مسٹر وہیٹل اور سوئس ری انشورنس کے مسٹر او برائن شامل تھے۔ ان دنوں وہ دونوں کوآپریٹیو انشورنس میں مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ سلطان احمد کمپنی کے چیف ایگزیکٹو جناب ایس اے محمود سے بھی فیضیاب ہوئے جو پورے پاکستان میں انشورنس کی صنعت میں طویل تجربے کے باعث مشہور تھے۔

پوری طرح سے تربیت یافتہ سلطان احمد پشاور شاخ کے منیجر بن گئے۔ کوآپریٹیو انشورنس کا کاروبار کچھ اس طرح کا تھا کہ ان کے پاس بڑے صنعتی اداروں کے بیمے کا کاروبار نہیں ہوتا تھا۔ ان کا بیشتر کاروبار 'کھلے بازار' سے آتا تھا جس کو لانے اور سنبھالنے میں کہیں زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ اس سلسلے میں مشکلات، کاروبار کے حصول کی حکمت اور حریف اداروں کی مسابقت کے ضمن میں سلطان احمد کا اپنے افسرانِ اعلیٰ سے اختلاف رہتا تھا۔ جب میں نے ان سے انشورنس کے ابتدائی دنوں کے بارے میں سوال کیا تو وہ بولے ''مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ میں کوآپریٹیو انشورنس سوسائٹی کے لیے ناموزوں شخص تھا اور یہ بھی کہ مجھے اس صنعت کی دوسری بیمہ کمپنیوں کے کاروباری اور معاشیاتی اصول بہتر لگتے تھے۔ کاروبار کے اہم معاملات پر میرا اختلاف روز کا معمول ہوگیا تھا۔ چوں کہ مجھے اپنا کام پسند تھا اس لیے میں بڑی تندہی سے اپنے فرائض انجام دیتا تھا مگر میرے اطراف جو لوگ تھے وہ میرے جذبۂ کار اور پیشے کے بارے میں میری سنجیدگی سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ صرف ایک ملازمت تھی جو صرف پیسہ کمانے اور زندگی گزارنے کا ذریعہ تھی۔ مگر میں ان کے خیالات سے مطمئن نہیں تھا۔ میں اپنے کام اور اپنے ادارے میں، جس کے لیے کام کر رہا تھا، اپنی شناخت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح میں اپنے کاروباری ساتھیوں کے خیالات کے اعتبار سے ناموزوں تھا۔''

پھر تقدیر کا کرنا یوں ہوا کہ اس زمانے میں FFU کے منیجر برائے مغربی پاکستان جناب معین الدین اور مسٹر بھیم جی شمال میں اپنی شاخوں کے دورے پر آئے ہوئے تھے جن میں پشاور کی شاخ بھی شامل تھی۔ ایک مشترکہ دوست جناب نجم الدین احمد نے اپنے دولت خانے پر ان لوگوں کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا جس میں سلطان احمد بھی مدعو تھے۔ راولپنڈی میں جنرل ڈپارٹمنٹ کے کرتا دھرتا جناب

نیاز احمد خان نے اپنی انتظامیہ سے سفارش کی تھی کہ وہ سلطان احمد کو ای ایف یو میں لانے کی کوشش کریں۔

اس تجویز کی ان لوگوں نے پُر زور حمایت کی جو سلطان احمد اور مسٹر بھیم جی دونوں سے واقف تھے۔ معین الدین صاحب نے بھی اس سلسلے میں بات کی۔ بعد میں میاں سعید احمد نے سلسلہ جنبانی کی اور بالآخر سلطان احمد نے ای ایف یو میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔ کوآپریٹو انشورنس میں دس برس کام کرنے کے بعد سلطان احمد پشاور میں ای ایف یو کے برانچ منیجر بن گئے۔ اس طرح میری اس 'پٹھان' سے پھر ملاقات ہوئی اور ان کی خوب رُو اہلیہ عنیزہ سے بھی جن سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔

سلطان احمد نے ای ایف یو میں اپنے ابتدائی دنوں کے بارے میں بتایا کہ "میری تنخواہ ۷۵۰ روپے سے شروع ہوئی تھی، اس کے علاوہ کوئی الاؤنس نہیں تھا۔ ان دنوں عام طور پر اس تنخواہ میں بس گزارا ہوجاتا تھا۔ ابھی مجھے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ ایک دن راولپنڈی میں لائف ڈپارٹمنٹ کے چیف مجھ سے ملنے آئے اور انھوں نے مشورہ دیا کہ میں اپنی بیوی کے نام سے ایجنسی لے لوں اور کچھ زندگی کے بیمے کا کاروبار بھی کروں تا کہ کچھ اضافی آمدنی ہوجائے۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور ان کا شکر گزار ہوا اس لیے کہ واقعی برانچ منیجر کی تنخواہ میں میرا گزارا نہیں ہو رہا تھا۔ میں یہ بتا تا چلوں کہ جناب معین الدین جو مغربی پاکستان کے منیجر تھے اس بات سے خوش نہیں ہوتے تھے کہ ان کے لوگ لائف ڈپارٹمنٹ کے لیے کام کرنا شروع کر دیں۔ مگر انھوں نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کر دیا کہ جنرل ڈپارٹمنٹ کے کچھ افسران یہ کام کر سکتے ہیں اور ان سے میں ایک میں تھا۔ اس طرح ہونے والی آمدنی سے ہماری زندگی کچھ آسان ہوگئی۔"

سلطان احمد ۱۹۷۵ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ انتظامیہ کی طرف سے طویل عرصے کی منصوبہ بندی کے تحت یہ طے پایا تھا کہ میاں سعید احمد کی ریٹائرمنٹ کے بعد سلطان احمد کو ان کی جگہ مغربی پاکستان کا منیجر بنانے کے لیے تیار کیا جائے۔ پہلے تو سلطان احمد کو لاہور کے زونل آفس میں نائب بنایا گیا اور بالآخر وہ میاں سعید احمد کے ڈائریکٹر اور مشیر بن جانے کے بعد سینئر ایگزیکٹیو وائس پریزیڈنٹ بنا دیے گئے۔

بھٹو حکومت کے نیشنلائزیشن کی وجہ سے یہ بہت مشکل دور تھا، صرف ای ایف یو ہی کے لیے نہیں پورے ملک کی معشیت کے لیے بھی۔ ان کے برق رفتار فیصلوں سے ان کی پارٹی کے ارکان خوش تھے مگر اس کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی ساکھ متاثر ہوئی تھی اور سرمایہ ملک سے باہر جانے لگا تھا۔ یہ سب وجوہات ملکی ترقی کی رفتار پر منفی اثرات کا باعث ہوئیں جس نے ملک میں بیمے کی صنعت کو بھی نقصان پہنچایا۔ چوں کی زندگی کے بیمے کی صنعت اب حکومت کے ہاتھ میں تھی اس لیے بڑی بیمہ کمپنیوں کے اثاثے ان کے ہاتھ سے چھن گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صنعت کے بہت سے رہنما ملک چھوڑ کر چلے گئے اور غیر ملکوں میں انشورنس کمپنیاں کھولنے کی کوشش میں رہے۔ ان میں روشن علی بھیم جی بھی شامل تھے۔

مسٹر بھیم جی کے ملک چھوڑ کر چلے جانے سے نہ صرف یہ کہ ملک کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی پر منفی اثر پڑا بلکہ اس کے دور رس اثرات دوسری صنعتوں پر بھی پڑے۔ اس کے نتیجے میں ای ایف یو کی مرکزی حیثیت باقی نہ رہی جس پر اس کو ناز تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس ادارے کے بہت سے کامیاب افسر بھی دوسرے ملکوں میں نئے امکانات کی تلاش میں نکل گئے۔ یہ کیفیت پندرہ برس تک رہی اور اس زمانے میں سلطان احمد نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

مسٹر بھیم جی کی چھوڑی ہوئی کرسی کے بظاہر وارث نواب حسن اس وقت ٹھہرے جب انھوں نے اپنے پرانے دوست آغا حسن عابدی کے ساتھ، ان کے ادارے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کے تعاون سے کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کی برطانیہ اور مشرقِ وسطیٰ میں بنیاد رکھی۔ اس تیاری میں نواب حسن کو سینئر ایگزیکٹیو وائس پریزیڈنٹ اور کمپنی کا دوسرا اہم افسر بنا دیا گیا تھا۔ یہ ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے۔ مگر اس کے بعد حالات نے تیزی سے کروٹ بدلی اور عابدی صاحب کے بینک کی ناقابلِ یقین تیز ترقی پر سارے منصوبوں پر نظرِ ثانی کی گئی۔ ملک سے باہر نواب حسن کی خدمات کی ضرورت پیش آئی اور ان کی جگہ پاکستان میں عظیم رحیم کو کمپنی کا نیا سربراہ بنا دیا گیا۔ مسٹر بھیم جی چیئرمین اور

نواب حسن ٹیکنیکل ایڈوائزر کی حیثیتوں میں ای ایف یو سے منسلک رہے مگر اس کا مرکزی کردار قائم نہیں رہ سکا اور مسٹر محمد چودھری کی سربراہی میں یہ مقام آدمجی انشورنس کمپنی کو مل گیا۔ مسٹر بھیم جی کو جو کمپنی کے سب سے بڑے حصے دار تھے کوئی خوش فہمی نہ تھی اس لیے کہ وہ ہمیشہ یہی سمجھتے رہے تھے کہ بھٹو کی حکومت بالآخر جنرل انشورنس کے کاروبار کو بھی ہتھیا لے گی۔ مگر جیسا کہ سب جانتے ہیں، یہ نہیں ہوا۔ نواب حسن کو ملک واپس بلا لیا گیا اور عظیم رحیم نے جو ریٹائرمنٹ کے قریب تھے، نواب حسن کے لیے جگہ خالی کردی۔ یہ عارضی انتظام تھا اس لیے کہ نواب حسن کی صحت ٹھیک نہیں تھی اور یہ فیصلہ ہونا تھا کہ ان مشکل حالات میں کمپنی کی باگ ڈور کون سنبھال سکتا ہے جو تجربہ کار بھی ہو اور کمپنی کے کارکنان بھی جس کا احترام کریں۔

تو فیصلہ یہ ہوا کہ سلطان احمد کو چیف ایگزیکٹیو بنا دیا جائے۔ بیس برس بعد آج بھی کمپنی کے اندر اور باہر کے لوگوں کی طرح انھیں بھی اس بات پر حیرت ہے۔ سلطان احمد نے کہا، ''سچ پوچھیے تو مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ میں اس رتبے تک پہنچوں گا۔ میں تو اس کا خواب بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے کمپنی کے صدر دفتر میں کام کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے مسٹر بھیم جی نے از راہِ مہربانی نواب حسن صاحب کو مینجنگ ڈائریکٹر اور چیف ایگزیکٹیو کے عہدے پر فائز کر دیا اور میں نے کمپنی کے صدر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ اس طرح مجھے کچھ وقت مل گیا جس میں نواب حسن صاحب کی رہنمائی میں مجھے تجربہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ یہ انتظام ڈیڑھ برس تک چلا۔ اس کے بعد میں اس قابل ہو سکا کہ کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھال سکوں۔''

سلطان احمد سے ملاقات، ان کے اپنے بارے میں، زندگی میں ان کے ہدف اور کامیابیوں کے بارے باتیں کرنا بذاتِ خود بھی ایک تجربے سے کم نہیں۔ میں ان سے کم و بیش چالیس برس سے واقف ہوں، ایسے انسان سے جو پشاور کی وادیوں کی گم نامی، اس کے چشموں اور دریاؤں، اس کے بے شمار دیہات اور درختوں کے جھنڈ کے سائے سے اچانک نکل کر ہمارے دور کے عظیم شہر کراچی کے ساحل اور پُر شور شاہراہوں پر آنکلا ہے۔

سلطان احمد کہتے ہیں کہ ''اپنی تمام عمر میں نے محنت سے کام کرنے میں یقین رکھا ہے۔ میں اپنے مالکوں سے ہمیشہ مخلص رہا ہوں۔ اگر انھیں فائدہ ہوا ہے تو مجھے خوشی ہوئی ہے، اور اگر نقصان ہوا ہے تو مجھے دُکھ ہوا ہے۔ میرا مقصد کمپنی کو اُسی طرح کامیاب بنانا رہا جس طرح میں اپنے بارے میں چاہتا ہوں۔ کمپنی اور میں دونوں ایک رہے ہیں اور میں نے اس میں کوئی تفریق نہیں رکھی۔''

اور جب وہ یہ کہتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ان سے ۱۹۶۲ء میں باتیں کر رہا ہوں، جب پہلی بار انھوں نے کمپنی کی پشاور شاخ کا انتظام سنبھالا تھا۔ ویسے ہی الفاظ اور وہی آدمی! ان کے لیے کمپنی کے اس بڑے عہدے کی چکا چوند جس پر وہ پندرہ برس تک فائز رہے، گزرے دنوں کی ڈھول سے زیادہ نہیں۔ جب بھی کمپنی کو ضرورت ہوئی وہ کمر بستہ موجود رہے ہیں خواہ وہ بے حد مشکل دن ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے پہاڑوں اور جدو جہد کی وادیوں سے تنِ تنہا سفر کی طویل کہانی سناتے ہوئے سلطان احمد کہتے ہیں، ''جب میں کراچی آیا تو میں ویسا پریزیڈنٹ نہیں تھا جس کو میرے تمام ساتھی خوش آمدید کہتے۔ سب کو حیرت بھی تھی اور نظر انداز کیے جانے کا احساس بھی تھا مگر مجھے کسی خاص حلقے سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی، تقریباً سب ہی مہربان اور تعاون کے لیے تیار تھے، تاہم مجھے یہ ضرور محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک اس 'شمال سے آنے والے آدمی' اور 'اس پشاور والے کی یہاں ضرورت تو نہیں تھی!' یہ میرے لیے پریشانی کی بات ہو سکتی تھی مگر مسٹر بھیم جی اور نواب حسن دونوں نے میری ڈھارس بندھائی، مجھے پورا تعاون مہیا کیا اور میری مکمل پشت پناہی کی۔ اس بڑے شہر میں میرے بہت سے دوست بھی تھے جنھوں نے میری رہنمائی بھی کی اور خود اعتمادی کی راہ پر گامزن بھی کیا۔ کچھ تو ان لوگوں نے میری امداد کی اور کچھ میں نے بھی موقعے کی مناسبت سے ہمت کی، اس لیے اور بھی مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں وہ صرف کمپنی کی بھلائی کے لیے۔''

جب سلطان احمد یہ سب کچھ کہہ رہے تھے تو ان کے چہرے پر اطمینان لہریں لے رہا تھا، وہ بہت پُر سکون دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک مسرور انسان نظر آ رہے تھے۔ ویسا ہی جسے ان کے صدر نے مشکل حالات میں ادارے کی کشتی کھینچنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ ایک مشکل اور جدو جہد کا سفر جس کو صرف ایک طاقت ور انسان ہی کامیابی اور حفاظت سے طے کر سکتا تھا۔

سلطان احمد نے اپنے خیالات کے منہ زور دھاروں کو سمیٹتے ہوئے کہا، ''میں ۱۹۹۰ء میں مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوا اور تین برس کے عرصے کے لیے مجھے نائب صدر کی ذمے داری سونپی گئی۔ اس کے بعد سے میں کمپنی کے بورڈ پر ڈائریکٹر ہوں۔ اس پر مجھے فخر بھی ہے اور میرے لیے اعزاز کی بات بھی۔ اب میں لاہور منتقل ہو گیا ہوں اس لیے کہ وہاں سکون محسوس کرتا ہوں۔ میرے والدین کا گھر بھی لاہور میں تھا اور جب میں ۱۹۷۵ء میں زونل منیجر بنا تھا اس وقت میں نے بھی اپنا ایک گھر بنا لیا تھا۔ ایسٹرن فیڈرل یونین میں کام کر کے میں بہت مطمئن ہوں۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ جو بھی ذمے دارے سونپی گئی اسے میں نے بدرجۂ احسن نبھانے کی کوشش کی ہے۔ میں نہایت مسرور انسان ہوں۔''

سلطان احمد ان 'تین تفنگ بردار' کارکنوں میں سے ایک تھے جنھیں کمپنی کے چیئرمین نے اپنی خود ساختہ جلاوطنی کے دوران ادارے کے قلعے کی حفاظت کی ناخوشگوار ذمے داری سونپی تھی۔ ان میں سے سلطان احمد سب سے طویل عرصے تک یہ ذمے داری نبھاتے رہے۔ اور بلا شبہ انھوں نے اس ذمے داری کو ماضی میں اپنی کارکردگی کا انعام سمجھ کر نہیں بلکہ ایک ذاتی چیلنج سمجھ کو قبول بھی کیا اور نبھایا بھی۔ وہ جن حالات سے گزرے اس کا انھیں کبھی گمان بھی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ ناگفتہ بہ حالات سے دو چار ہوئے تھے مگر دیکھا جائے تو سلطان احمد اس ادارے کے اچھے سربراہوں میں سے ایک تھے۔ مجھے تو وہ ہمیشہ چٹان کی مانند دکھائی دیے، اور میرے خیال میں کسی انداز سے بھی دیکھا جائے تو یہ ایک مستحسن صلاحیت ہے۔

ڈاکٹر محمد سعید خان

ایک پہلکار طبیب

میری میز پر، بالکل میرے سامنے، ایک بہت پرانی تصویر ہے جو اندازاً بیس برس قبل کھینچی گئی تھی۔ اس میں تقریباً ساٹھ برس سے اوپر کی عمر کی ایک ممتاز شخصیت اور ایک انگریز خاتون ہیں، جو اس وقت تک اپنی عمر کا بیشتر حصہ پہلے یو پی میں اور پھر تقسیم کے بعد پاکستان کے شہر کراچی میں بسر کرنے کے باوجود بھی انگریز دکھائی دے رہی تھیں۔

جب ہم پہلی بار ۱۹۶۰ء میں ایک دوسرے سے ملے اس وقت عمر میں وہ مجھ سے بڑے تھے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں دوست بننے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی۔ ہم لوگ رفیقِ کار پہلے بنے تھے اس لیے کہ وہ اس وقت بھی چیف میڈیکل آفیسر تھے جب میں نے اس ادارے میں شمولیت اختیار کی تھی۔

ڈاکٹر سعید خان MRCS (Eng) LRCP لندن کے تعلیم یافتہ تھے اور بلا شبہ ان اعلیٰ نسل کے لوگوں میں سے تھے جو اس زمانے میں ای ایف یو کی انتظامیہ میں شامل تھے۔ انتظامیہ کی ٹیم میں سعید خان جیسی شخصیت کی موجودگی بھی اس بات کا ثبوت تھی کہ صرف اعلیٰ درجے کے لوگوں کے ہجوم ہی سے خود بہ خود اچھی ٹیم نہیں بن جایا کرتی۔ اس کے لیے کسی کرشماتی شخصیت اور وجدانی رہنمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس سے ٹیم میں فنکارانہ ہنرمندی پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سعید خان ایک خود بیں اور انانیت پسند انسان تھے۔ وہ یو پی کے اعلیٰ درجے کے خاندان میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ بچپن ہی سے ان کے دل میں ڈاکٹر بننے کی امنگ تھی کہ وہ شفا حاصل کرنے میں لوگوں کی مدد کریں۔ ان کے والد نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا اور ان کی کوششوں ہی سے وہ اعلیٰ پیانے کی اسناد سے سرفراز ہوئے۔ انگلستان کا قیام ان کی آئندہ زندگی پر بہت اثر انداز ہوا۔ ازابیل کی صورت میں انھیں ایک خوب صورت، شائستہ اور نوجوان لڑکی مل گئی جس کی مدد سے انھوں نے محبت اور زندگی کی للکار کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے شادی کر لی اور ان کے دو پیاری پیاری لڑکیاں پیدا ہوئیں جو دو مختلف تہذیبوں کے سنگم، قدامت پسندی اور روایتی اثرات سے مملو مشرقیت اور مغربی طرزِ حیات اور ماحول کی آزاد خیالی کے امتزاج میں پلیں بڑھیں۔

انگلستان میں اپنی تعلیم کے کامیاب اختتام کے بعد وہ واپس وطن لوٹے اور کام شروع کیا، پہلے کچھ اسپتالوں میں اور بعد میں خود اپنا مطب کھول لیا۔ جب تقسیم ہند ہوئی اس وقت ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ انھوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے اس فیصلے کے سب سے بڑے محرک جناب محمد وصال الدین تھے، جو انھیں یو پی میں بچپن کے دنوں سے جانتے تھے۔ غالباً ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر سعید خان اور ان کے اہلِ خانہ کراچی منتقل ہو گئے۔ وصال الدین اور ان کے دو بھائی ای ایف یو میں زندگی کے شعبے سے منسلک تھے۔ وصال الدین اس شعبے کے سربراہ تھے اور انھوں نے چیف میڈیکل انڈر رائٹر کے عہدے کے لیے ڈاکٹر سعید خان کی سفارش کی، جس پر وہ ۱۹۶۹ء میں

ریٹائرمنٹ کے وقت تک فائز رہے۔ چیف میڈیکل انڈر رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ادارے کے چیف میڈیکل ڈائریکٹر بھی رہے اور ادارے کے ملازمین اور ان کے اہلِ خاندان کی دیکھ بھال بھی کی۔ 'مسوری کلینک' کے نام سے ان کا اپنا مطب بھی تھا جس پر انھیں فخر تھا۔

ڈاکٹر سعید خان نہایت نفیس اور منجھے ہوئے انسان تھے۔ بہت مہذب اور متوازن۔ پاکستان کی تاریخ میں وہ پہلے میڈیکل ڈاکٹر تھے جسے طبی اور سائنسی انداز میں انڈر رائٹنگ کرنے کا احساس ہوا۔ میونخ ری انشورنس کمپنی کی معاونت سے انھوں نے اس نوعیت کی انڈر رائٹنگ کو آگے بڑھایا، جس نے سائنسی انداز میں 'غیر معیاری' زندگیوں (بیمار لوگوں) کو بیمہ مہیا کرنے کا طریقہ کار ایجاد کیا تھا۔ اس طریقے سے ان لوگوں اور خاندانوں کی بیمے کی ضروریات پوری کی گئی تھیں جو اپنی صحت کی خرابی کے باعث اس نعمت سے محروم رکھے جاتے تھے۔ کمپنی کے اسٹاف ڈاکٹر کی حیثیت میں انھوں نے نہ صرف بہت سے ملازمین کی صحت کی بہتری میں مدد کی بلکہ کئی زندگیاں بچائی بھی تھیں۔ مجھے ایک مثال خصوصاً یاد آتی ہے۔ جس رات کے ایف حیدر شدید علیل ہو کر انتقال کر گئے، ڈاکٹر سعید خان ان کے سرھانے موجود تھے۔ حیدر صاحب برسوں ان کے افسر رہے تھے مگر بعد میں وہ کمپنی چھوڑ کر پاکستان انشورنس کارپوریشن کے چیئرمین بن گئے تھے۔ اس تبدیلی کے باوجود وہ سعید خان کے مریض رہے اور انھوں نے ایک عرصے تک حیدر صاحب اور ان کے اہلِ خاندان کی اسی طرح خدمت بھی کی اور دوستی بھی نبھائی۔

میں بھی ان کے مطب جایا کرتا تھا، زیادہ تر وہ انجکشن لگوانے جو اس زمانے میں ملک سے باہر سفر کے لیے ضروری ہوتے تھے۔ ہمارا خاندانی میل ملاپ ہمیشہ ذاتی نوعیت کا رہا تھا۔ ان کی بیٹیوں کی شادی ہونے کے بعد ازابیل بہت تنہا اور اداس رہا کرتی تھیں اور کبھی کبھی انھیں دوستانہ دل جوئی کی ضرورت پڑتی تھی جو فرض ہم میاں بیوی ادا کیا کرتے تھے۔ زیادہ تر ہم لوگ کراچی جیم خانہ جایا کرتے تھے جہاں اس زمانے میں اتنا مجمع نہیں ہوا کرتا تھا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ سرِشام برآمدے میں فرحت بخش سمندری ہوائیں جسم و جاں کو تازہ کر دیتی تھیں جہاں بیٹھ کر مشروب اور مشروب کے لوازمات کام و دہن کو لذتوں سے آسودہ کر دیتے تھے۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان کے سانحے نے بھی ان کے خاندان پر گہرا اثر کیا تھا، اس لیے کہ ان کی ایک بیٹی ملک کے اسی خطے کے نوجوان سے بیاہی تھی۔ وہ سفارتی عملے میں سے تھا اور بنگلہ دیش بننے کے بعد اس نے اپنے ملک کی ملازمت کو ترجیح دی تھی۔ یہ سب مجھے مشترکہ دوستوں سے معلوم ہوا تھا اس لیے کہ ان دنوں اپنی ملازمت کے سلسلے میں میرا قیام جرمنی میں تھا اور مشرقِ بعید کے ممالک میرے ذمے تھے جہاں آنا جانا زیادہ رہتا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ سے ہمارے بیشتر دوست فاصلوں کی دھند میں گم ہو گئے تھے۔

اپنے پرانے دوستوں کے ذریعے میں نے سعید خان کے بچوں کو تلاش کیا تھا مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ اس باب کو تحریر کرنے کے لیے مجھے صرف اپنی یادداشت پر انحصار کرنا پڑا ہے۔ مگر ای ایف یو کے بارے میں کوئی کتاب وغیرہ بھی دستیاب نہیں تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اس حیرت انگیز انسان کے بارے میں اور تفصیلات مہیا کرتا اور کاش نہ صرف کمپنی بلکہ اس ملک کے بیمے کی صنعت کے لیے اس کی خدمات اور اس کے کارہائے نمایاں کا کچھ حق ادا کر سکتا۔

ای ایف یو کے چیف ایجنٹ ابوالمحمود

ابو المحمود

کامیابی کا نشان

وہ آج بھی ایسٹرن فیڈرل یونین کی ایسی روایتی شخصیت ہیں جس نے ۱۹۷۲ء کی اتھل پتھل سے قبل پاکستان میں بیمے کی صنعت میں کاروباری سلسلے میں کمپنی کا وقار بلند کیا تھا۔ ساٹھ کے عشرے سے اگر آپ کمپنی کے مجلے کی ورق گردانی کریں تو تقریباً ہر اشاعت میں، لائف ڈپارٹمنٹ کی کارکردگی کے سلسلے میں آپ کو ان کا تذکرہ اور ساتھ ہی ان کو اور اُن کی خوب صورت بیوی کی تصویر دیکھنے کو ملے گی، اس لیے کہ بیش تر مہینوں میں وہی سب سے زیادہ کاروبار کرتے تھے۔ اب وہ ای ایف یو جنرل کے چیف ایجنٹ ہیں اور اب بھی وہ کمپنی کے ایجنٹوں کی فوج کے ہراول دستے کے مانند ہیں۔ اور جب میں اس ادارے سے منسلک ہوا تو ابول بھائی اس وقت کمپنی میں موجود تھے۔

ان میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ہمیشہ کی طرح مصروفیت سے معمور بے چینی ہی ان کی شخصیت کا 'تھرمامیٹر' ہے جو ان کو ہمہ وقت متحرک رکھتی ہے۔ ان کا چہرہ آج بھی اسی طرح تازہ و تابندہ ہے جیسا کہ اس دن تھا جب ہم پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے۔ جب بھی ملتے ہیں جلدی میں ہوتے ہیں اور ان سے ملاقات کا وقفہ ایک یا دو سگریٹ نوشی کی طوالت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ جسامت سے متناسب گول مٹول چہرے والے ابول بھائی کے پاس ہمیشہ تازہ خبریں اور دل چسپ قصے ہوتے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ ہوں، کے ایف حیدر، خدا بخش، روشن علی بھیم جی، سیف الدین زومکاوالا یا میں، ان کی اتار چڑھاؤ سے مملو رسیلی آواز دروازے کے باہر سے بھی سنائی دے گی۔ اگر چہ وہ شکایتیں کر رہے ہوں گے مگر آواز میں ایک کھلنڈرا پن ہوگا جو کاروبار میں ان کی کامیابی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

ابوالمحمود صاحب اکتوبر ۱۹۲۴ء میں مغربی بنگال کے شہر کلکتے میں پیدا ہوئے تھے جو بہت سی ایسی سربرآوردہ شخصیتوں کا مسکن رہا ہے جنھوں نے ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیے تھے جو ان کی آزادی پر منتج ہوئے۔ اس وسیع اور گنجان شہر سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۴۱ء میں وہ برطانوی ہند کی حکومت میں ملازم ہو گئے۔ تین برس تک اپنے مولد میں کام کرنے کے بعد ان کا تبادلہ دلّی ہو گیا جہاں وہ وزارتِ صنعت سے تقسیمِ ہند تک منسلک رہے۔ تقسیم کے وقت انھوں نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ پاکستان آئے تو پہلے تو اپنی وزارت ہی میں تعینات ہوئے مگر جلد ہی ان کا تبادلہ وزارتِ خارجہ میں ہو گیا۔ وہ پاکستان کے کئی سفارت خانوں میں تعینات ہوئے۔ جب میری ان سے نشست ہوئی تو اپنے مخصوص انداز میں پرانے زمانے کی یادیں تازہ کرتے ہوئی انھوں نے کہا، ''میں نے سوچا کہ میں کسی اور شعبے میں یقیناً اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔ ابھی میں اس سوچ میں ہی تھا کہ میں کیا کروں کہ وزارتِ مال کے ایک ساتھی سے ملاقات ہوئی جو حکومت کے مہیا کیے ہوئے کوارٹر میں مجھ سے ملاقات کے لیے آیا تھا اور اس نے مجھے ایک بیمہ پالیسی فروخت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس سے معذرت کر لی اس لیے کہ مجھ میں پریمیم کی رقم ادا کرنے کی استطاعت نہیں تھی۔ جواب میں اس نے مشورہ دیا کہ میں پریمیم دینے کے لیے اپنے پراویڈنٹ فنڈ کی رقم استعمال کر سکتا ہوں جو ایک اچھا مشورہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس پر غور

کروں گا مگر مجھے اس کے لیے کچھ وقت چاہیے اور اس سے ایک دو ہفتے بعد آنے کے لیے کہا۔ اس دوران کچھ حیرت انگیز بات ہوئی، میرے ذہن پر ایک بجلی سی گری۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا خدا نے مجھے اپنی موجودہ مشکلات سے نکلنے کا راستہ دکھا دیا کہ میں خود ہی کیوں نہ انشورنس ایجنٹ بن جاؤں۔ اور میں نے اسی خاتون، نرگس رحیم کے نام سے جس سے چند ماہ بعد میری شادی ہوگئی، انشورنس ایجنٹ بننے کی درخواست گزار دی۔ یہ درخواست شادی کے بعد مکمل ہوئی اور مجھے نرگس محمود کے نام سے لائسنس مل گیا۔ اس کے بعد سے میرا سارا کاروبار اس نام سے ہوا اور آج بھی جنرل انشورنس کا میرا کاروبار اسی نام سے ہوتا ہے۔ جب میں اپنے ماضی پر غور کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی اوپر والا ہے جو میرے سب کام بناتا ہے۔ اس لیے کہ ابتدا ہی سے میں بے حد کامیاب رہا ہوں۔ ہر موڑ پر کامیابی میری منتظر رہی ہے۔ میں نے وزارتِ خارجہ میں اوپر سے لے کر نیچے تک تمام لوگوں کو بیمہ پالیسی فروخت کی اور سب کی سب پراویڈنٹ فنڈ سے۔ اور میں نے بہت دولت کمائی ہے۔ زندگی کے بیمے کا کام شروع کرنے کے ڈیڑھ سال بعد ہی میں نے اپنی پہلی موٹر کار خریدلی تھی اور وہ بھی صرف جز وقتی ایجنٹ کی حیثیت سے۔ اور ایک طرح سے یہ کار ہی میرے پیشے میں تبدیلی کا باعث ہوئی تھی۔ اس لیے کہ میرے لیے یہ مشکل تھا کہ اس ملازمت میں ہوتے ہوئے میرے پاس اتنی رقم ہو اور اپنی کار ہو۔ اور چوں کہ مجھ میں کچھ جسمانی خامی بھی تھی اس لیے میں نے ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی جو منظور کرلی گئی۔ بس اس کے بعد سے میں تھا اور زندگی کا بیمہ۔ بس کبھی یہاں کبھی وہاں، کام چلتا رہا۔ مگر میں نے کبھی اپنی کمپنی نہیں بدلی۔ میں عمر بھر ہمیشہ ایسٹرن فیڈرل یونین کے ساتھ رہا سوائے اس وقت کے جب بیمے کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور میں اسٹیٹ لائف کا حصہ بن گیا۔ میں اپنے لیے اور ایسٹرن فیڈرل یونین دونوں کے لیے کامیاب رہا۔ پہلے مسٹر حیدر جیسا شریف النفس انسان، خدا بخش جیسا بیمۂ زندگی کا دیوانہ اور پھر مسٹر بھیم جی آگئے۔ وہ خود بھی زندگی کے بیمے کے سیلز مین رہے تھے اور اس پیشے کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ میں اس وقت تک بہت خوش تھا جب تک میں انشورنس ایگزیکیٹو بن کر اس کی اندرونی ریشہ دوانیوں اور سیاست کے جنجال میں نہیں پھنس گیا تھا۔ پھر میں نے افسری سے استعفیٰ دے کر اپنا کاروبار شروع کردیا۔ مگر میری رگ رگ میں بیمہ سرایت کر چکا تھا۔ جب اسٹیٹ لائف بنی اور اس ادارے نے مجھے اعلیٰ افسر بنانے کا فیصلہ کیا تو میں بھی راضی ہوگیا۔ میں اسٹیٹ لائف میں چار سال تک رہ سکا۔ میں نے پھر اپنا کاروبار شروع کردیا تھا مگر پھر میں تھا اور حیرتِ یک شہر آرزو۔ بیمۂ زندگی کے چنگل سے آزادی ممکن نہ تھی اس لیے کہ یہ مجھ میں اپنے پنجے پوری طرح گاڑ چکا تھا اور جنوری ۱۹۸۷ء میں پھر اپنی پرانی کمپنی ایسٹرن فیڈرل یونین کا اسیر ہوگیا جو اب ای ایف یو جنرل بن چکی تھی اور میں نے جنرل بیمے کا کاروبار شروع کردیا۔ بہت سے لوگ حیران ہو رہے تھے کہ بھلا لائف انشورنس کا ایک پرانا آدمی اچانک جنرل انشورنس میں کیسے کام کرنے لگا اور وہ بھی بڑی کامیابی کے ساتھ۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجھے بہت کچھ نئے سرے سے سیکھنا پڑا تھا اور آج، جیسا کہ شاید آپ جانتے ہوں، میں اچھا خاصا کما رہا ہوں۔ اگر چہ یہ کہا جاتا ہے کی جنرل انشورنس میں پیسے کمانا اس لیے مشکل ہے کہ اس کاروبار میں گاہک کمیشن مانگتے ہیں اور دینا بھی پڑتا ہے۔ مگر میں اس سے بالکل اتفاق نہیں کرتا۔ شاید میں خوش قسمت انسان ہوں اس لیے کہ میں کبھی کمیشن نہیں دیتا۔ میں جنرل پالیسی بھی اسی طرح فروخت کرتا ہوں جیسے بغیر کمیشن دیے لائف انشورنس فروخت کرتا تھا۔ اس ملک میں بھی یہ ممکن ہے۔ مگر آپ کو اپنے گاہکوں کی اعلیٰ درجے کی خدمت کرنی پڑتی ہے اور بیمے کے تمام رموز سے پوری واقفیت بھی رکھنی پڑتی ہے۔ اور آپ کو اپنے گاہک اداروں کی انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں سے اچھے تعلقات بھی رکھنے پڑتے ہیں۔ کلیمز کے معاملے میں یہ رشتے بہت اہم ہو جاتے ہیں۔ کمپنی کے سربراہوں سے رابطے میں رہنا سب سے اہم ہوتا ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے ہی گاہک کی تلاش میں نہیں نکل جاتا۔ میں انھیں لوگوں کا کام لیتا ہوں جن سے میں ایک طرح سے نبھا سکتا ہوں اور ایسے لوگوں کو میں ویسی ہی خدمات فراہم کرتا ہوں جیسی کہ ان کو درکار ہوتی ہیں۔"

کامیاب اور اعلیٰ درجے کے سیلز مین کی طرح ابول بھائی کو بھی مناسب مقدار میں حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھوں نے

ہمیشہ کمپنی کے چلانے والے سے براہِ راست سلسلہ رکھنے کا خیال رکھا ہے۔ اپنے افسروں کی ناراضگی کے باوجود انھوں نے حیدر صاحب، مسٹر بھیم جی اور مسٹر سیف الدین زومکا والا سے بھی اپنے رشتے استوار کر رکھے ہیں جن کا وہ دل کی گہرائیوں سے احترام بھی کرتے ہیں اور ان کی صلاحیتیوں کے معترف بھی ہیں۔

ابول بھائی نے بتایا کہ ''جب میں نے جز وقتی ایجنٹ کی حیثیت سے ای ایف یو میں شرکت اختیار کی تو میں نے حیدر صاحب سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اسی وقت کامیابی سے کام کر سکتا ہوں جب تک میں ان سے براہ راست سلسلہ رکھ سکتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ مسٹر ریاست اللہ کو، جو اس وقت لائف ڈپارٹمنٹ کے چیف تھے، یہ بات پسند نہ تھی۔ مگر میں اسی طرح کام کرتا رہا۔ اور جب مسٹر بھیم جی آئے تو ان سے بھی میں نے یہی بات کہی تھی۔ وہ بہت فراخ دل اور زیرک انسان تھے، فوراً سمجھ گئے کہ میں ایسا سلسلہ کیوں چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ایک کے بعد دوسرا ریکارڈ قائم کرنے لگا۔ میں کمپنی کا پہلا آدمی تھا جس نے دس لاکھ روپے کی پالیسی فروخت کی تھی۔ ان دنوں اتنی بڑی رقم کی پالیسی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دراصل میں نے ایک ہی خاندان کے افراد کو سترہ لاکھ روپے کی پالیسیاں فروخت کیں اور ان سے ملنے والے کمیشن سے میں نے مسٹر بھیم جی کے مکان کے قریب ہی اپنا پہلا مکان تعمیر کیا تھا۔ اور میرے گیراج میں دو مرسیڈیز گاڑیاں ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں پاکستان میں واحد ایجنٹ میں تھا جس کے پاس مرسیڈیز گاڑی اور دوسرے متعلقہ لوازم ہوا کرتے تھے۔''

ابوالمحمود انشورنس کے پیشہ ور سیلز مین ہونے پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ اتنے برسوں اس کام کو انھوں نے اپنے انداز ہی میں کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک دکان کی ملکیت کے مانند ہے جس میں اعلیٰ درجے کے نام کی مصنوعات فروخت ہوتی ہیں۔ اس ادارے میں رہ کر کام کرتے ہوئے بھی انھوں نے اپنا طریقہ کار اپنایا۔ اپنے ہدف خود مقرر بھی کیے اور انھیں حاصل بھی کیا۔ انھیں کمپنی کے اندرونی معاملات سے، اس کی انتظامیہ سے، انتظامیہ کے مسائل سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمیشہ بہترین ادارے کی نمائندگی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے سیلز مین بنے اور اس میدان میں اپنا بھرم قائم رکھا۔ مگر انھوں نے خود کو ادارے کی مشین کا حصہ نہیں سمجھا۔ وہ ای ایف یو گروپ کے موجودہ چیف کے اس لیے معترف ہیں کہ ''انھوں نے اس ادارے کو بڑی مشکلات کے نرغے سے نکال کر مقبولِ عام بنا دیا ہے۔ لوگ اب صحیح معنوں میں مسٹر بھیم جی کے اس فیصلے کا ادراک کر سکتے ہیں کہ انھوں نے ان کو اپنا جانشین کیوں بنایا تھا۔ پاکستان میں یہ عام رواج ہے کہ لوگ ہمیشہ صرف اپنا ہی فائدہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بہت مختلف انسان ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈیولپمنٹ افسروں کی آمدنی کے اپنی آمدنی سے زیادہ ہونے پر کبھی رشک نہیں کیا۔ نہ اس پر کہ وہ ان کے گاڑی سے بڑی اور قیمتی گاڑی استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے اس ادارے کی بہبود کے لیے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور اگرچہ ان کے کئی ماتحت عرصۂ ملازمت کے اعتبار سے ان سے پرانے ہیں مگر یہ ان کے دل جیت چکے ہیں اور ان کے ذہنوں پر ان کا راج ہے۔ ایک عظیم لیڈر کا انتخاب کتنا اچھا تھا۔''

ابول بھائی نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ ان کے پاس ای ایف یو کی انتظامیہ کے اعلیٰ افسران کی شخصیات اور اس کی تنظیم کے بارے میں سوچنے کے لیے فاضل وقت نہیں ہوتا۔ وہ بہت کم لوگوں سے واقف ہیں سوائے ان کے جن سے ان کی دوستیاں ہیں۔ نہ ہی وہ کسی سے قربت کے طلب گار رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''میں اپنی دکان کھولتا ہوں، مصنوعات فروخت کرتا ہوں، اپنے گاہکوں تک پہنچاتا ہوں، دکان بند کرتا ہوں اور اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔'' ان کے اس پیغام میں پوشیدہ رازوں تک پہنچنے میں مجھے کافی وقت لگا ہے۔ مگر میں بالآخر ان کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔ ممتاز درجے کے پیشہ ور سیلز مین ایک طرح سے بھیڑیوں کے مانند ہوتے ہیں۔ یا تو وہ بھیڑیوں کے کسی غول کی سربراہی کرتے ہیں یا پھر، بھوکے اور تنہا بھیڑیے کی طرح ہمیشہ اپنے شکار کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ کسی غول کے صرف ایک معمولی رُکن بننے میں قباحت محسوس کرتے ہیں۔ بس یہی بات انھیں دوسرے سے ممتاز کرتی ہے اور انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ ہدف حاصل کرنے میں مدد دیتی

ہے۔ میرے خیال میں ابوالمحمود اسی اعلیٰ نسل کے سیلز مین افراد کی بہترین مثال ہیں۔ وہ جو کچھ ہیں اسی پر انھیں فخر ہے اور ایسا فخر بلا جواز نہیں۔ وہ اس قدیم اور قابلِ احترام ادارے کا، جس کا وہ خود بھی اہم حصہ ہیں، پرچم لہرانے میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں کہ وہ خود اپنے مالک ہیں، آزاد ہیں۔ اپنے ادارے کی کامیابیوں میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ قبل اس کے کہ میں انھیں اسی راستے سے رخصت کرنے کے لیے، جس سے بلا کسی روک ٹوک کے وہ مسٹر بھیم جی اور مسٹر حیدر سے ملنے آجایا کرتے تھے، اپنے کمرے سے باہر آتا، انھوں نے کہا، ''ای ایف یو میری کمپنی ہے۔ اس میں اِدھر اُدھر سے بہت سے داغ لگ چکے ہیں، اس کے باوجود اس کے لیے کام کرنے میں مجھے بہت لطف آتا ہے۔ جس رفتار سے یہ ترقی کر رہی ہے، اس کے امکانات بہت وسیع دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے کمپنی تبدیل کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ مجھے اس ادارے میں رہنے پر فخر ہے۔ میں ہمیشہ سے ایسٹرن فیڈرل یونین میں ہی رہا ہوں۔''

میں انھیں رخصت کرنے جب نچلی منزل تک آیا اور بحیرۂ عرب سے آنے والی تیز ہوا کا سامنا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ابوالمحمود کے سپید گھونگھریالے بال ان کے ہمیشہ کی طرح روشن، شفاف اور محنت کش چہرے پر بکھر گئے تھے۔ وہ ایک بار پھر میری طرف مڑے، انھوں نے اپنے مخصوص اور اب بھی پُرعزم انداز میں اپنا ہاتھ ہلایا اور میں ایک بے کنار ماضی کی زندہ روایت کو جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

ایس اے رشید

آپ کا مخلص

دنیا کا ادب سورماؤں اور صوفیا کے ایک سے ایک شان دار تذکروں سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ قاری خود کو ڈھالنے کے لیے ہمیشہ انسان کی کامیابی کی شان دار داستانوں کے سانچوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ تاریخ کے صفحات میں ایسے لوگوں کا ذکر ہوا ہو جو اپنی تمام زندگی خاموشی سے اُن لوگوں کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں جو شہرت کی بلندیوں پر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کم کم نظر آتے ہیں اس لیے کہ وہ پسِ پردہ طاقت کے سرچشموں سے پُر ایوانوں میں رہ کر خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی حیثیت گلدانوں میں سجے ہوئے پھولوں جیسی ہوتی ہے جن سے ماحول کو خوش نما اور خوش بو سے معمور رکھنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اور اگر کبھی ان کا تذکرہ ہو بھی جائے تو وہ فکاہیہ انداز کے ڈراموں کے معصوم اور ذرا کم عقل اور قدرے مسخرے کارندوں کی طرح ہوتا ہے جو خفیہ اور شبہات سے پُر پیغام رسانی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کچھ Leporello کی طرح خوش قسمت بھی ہوتے ہیں جو شہرت کی بلندیوں تک اس لیے پہنچ گیا تھا کہ موتسارٹ نے اس کو Don Giovanni کا قابلِ اعتماد ساتھی بننے کا اس وقت تک موقع دیا جب تک کہ اس کا آقا خود جہنم رسید نہیں ہو گیا تھا۔ یا ''سروانتے'' کے لازوال انسانی کردار سانچو پانزا کی طرح جو Don Quijote de la Mancha کا حاشیہ بردار اور سفر و حضر میں اس کا ایسا ساتھی بنا رہا تھا جس کی وفاداری کی نظیر نہیں ملتی۔

اصلی گوشت و پوست کے بھی ایسے لوگ ملتے ہیں اگرچہ ان کے کردار مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کئی بذاتِ خود عظیم بھی ہوتے ہیں اگرچہ ان کی موجودگی کبھی کبھی دنیا والوں، اور بالخصوص ان کے ہم عصروں کی نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہے۔

میں اب جس شخصیت کا تذکرہ کرنا چاہ رہا ہوں اُس کو اِس زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا جس کا تذکرہ مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے مگر اس میں کچھ ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اس کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شخصیت رشید صاحب کی ہے جو زندگی بھر مرحوم روشن علی بھیم جی کے ذاتی معاون رہے ہیں، اور آج بھی ان کے ادارے کے ایک چھوٹے سے بے آرام کمرے میں بیٹھے نظر آتے ہیں جس میں ادارے سے باہر کی دنیا کو دیکھنے کے لیے اب بھی کوئی چھوٹا سا دریچہ نہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے محبوب افسر سے کسی درجہ کم نہیں جس نے ان کو ادارے سے باہر کے آسمان پر، آفتاب پر یا بادلوں پر بھی نظر ڈالنے کا موقع نہیں دیا۔

رشید صاحب اپنے افسر اور ہیرو کی حیرت انگیز، طوفانی اور مہم جو شخصیت پر بے شمار صفحات کے لیے مواد مہیا کر سکتے ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں بھی جو کبھی بھی ان کے افسر سے قریب رہے ہیں۔

رشید صاحب یو پی کے شہر علی گڑھ میں ۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ایک سرکاری ملازم کے گھر پیدا ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں انھوں نے پاکستان ہجرت کی۔ ان کے والد ریلوے میل سروس میں ملازم تھے اور انھوں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان تبادلے کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کی تکمیل

کی خاطر رشید صاحب اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ دو برس تک ہندوستان میں مقیم رہنے کے بعد لاہور میں اپنے والد سے آملے تھے۔ اپنے والد کی مالی معاونت کے لیے رشید صاحب نے پاکستان کی سب سے پرانی بیمہ کمپنی مسلم انشورنس میں ملازمت اختیار کرلی جس کا صدر دفتر لاہور ہی میں تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ان کا خاندان لاہور سے کراچی منتقل ہوگیا جو اس زمانے میں پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ کراچی منتقل ہونے کے بعد رشید صاحب کو ایسٹرن فیڈرل یونین کے لائف ڈپارٹمنٹ میں ملازمت مل گئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ان کے خاندان کے دوست اور اس وقت کے کنٹرولر آف انشورنس مسٹر بشیر احمد رفیقی کے ذریعے ان کا تعارف مسٹر بھیم جی سے ہوا جو ان دنوں کئی ایک ذمے داریوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے تھے۔ مسٹر بھیم جی بمبئی لائف کے منیجر تھے، کینیڈا کی کمپنی ویسٹرن انشورنس کے منیجر تھے اور ساتھ ہی ہندوستان کی بڑی انشورنس کمپنی نیو انڈیا انشورنس کے پاکستان میں منتظم بھی تھے۔ ان کے علاوہ وہ پاک انڈر رائٹرز کے نام سے ایک چیف ایجنسی بھی چلا رہے تھے۔ مسٹر بھیم جی کو ایک قابلِ اعتماد ذاتی معاون کی ضرورت تھی اور انھوں نے اس کام کے لیے رشید صاحب کا انتخاب کیا۔

بھیم جی سے اپنے زندگی بھر کے ساتھ کی جڑوں کی تلاش میں اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے رشید صاحب نے کہا، ''میں ان سے ملا اور ان کے انداز اور مہربان رویے سے بہت متاثر ہوا۔ میں فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے میں لطف آئے گا۔ میں ایسٹرن فیڈرل میں ملازمت اختیار کر چکا تھا مگر میں نے ایک لمحہ بھی تامل کیے بغیر ان کے ادارے میں کام کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ انھوں نے مجھے اپنا ذاتی معاون مقرر کیا اور زندگی کے بیمے کے اپنے کاروبار کا مہتمم بھی بنا دیا۔ جب ہندوستان میں زندگی کے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تو بھیم جی صاحب نے میری خدمات اپنے دوسرے اداروں فیئر ٹریڈ، پاک جن انڈسٹریز اور میٹل پروسسنگ انڈسٹریز کے سپرد کردیں۔ جب وہ لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کے لائیزن افسر کے طور پر کام کر رہے تھے تو اس کی ذمے داری بھی میرے سپرد کردی تھی مگر اپنے ذاتی معاون کی حیثیت میں۔ بعد میں جرمنی کے ادارے Triumph International سے اشتراک میں بھی کاروبار شروع ہوا جو آج بھی بھیم جی خاندان کا بڑا صنعتی ادارہ ہے۔ جب ۱۹۵۳ء میں دو برس کی ملازمت کے بعد میں ای ایف یو چھوڑ کر بھیم جی صاحب کے ادارے میں شامل ہوا تھا اس وقت تک مجھے اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ ایک دن مجھے اسی ادارے میں واپس آنا ہوگا، مگر اس بار مختلف حیثیت میں۔ بہرحال جیسا کہ آپ جانتے ہیں بھیم جی صاحب نے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے ۱۹۶۱ء میں ای ایف یو میں شمولیت اختیار کی اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں روزانہ آدھے دن کے لیے ان کے نئے دفتر میں عظیم صاحب کی مدد کروں جو حیدر صاحب کے ذاتی معاون تھے اور اب بھیم جی صاحب سے منسلک کردیے گئے تھے۔ آپ کے جرمنی واپس جانے کے چند ماہ بعد ہی بھیم جی صاحب نے مجھے ای ایف یو میں بلا لیا اس لیے کہ وہ مجھے اپنے ذاتی کام سونپنا چاہتے تھے۔ میں خود کو روئے زمین کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں اس لیے کہ مجھے روشن علی بھیم جی جیسا افسر ملا تھا۔ انھوں نے کبھی مجھے اپنا ماتحت نہیں سمجھا بلکہ اپنے خاندان کا ایک فرد تصور کیا تھا۔ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز نصیب ہوا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ ملک کے اندر اور باہر نہ جانے کتنے لوگوں کے لیے مہربان، شریف النفس دوست تھے۔ انھوں نے میرے اور میرے اہلِ خانہ کی بھی بہت مدد کی تھی۔ انھوں نے مجھے دوپہر کے بعد کالج جانے کی بھی اجازت دے دی تھی جہاں میں اپنی تعلیم شروع کر چکا تھا۔ اس طرح میں اسلامیہ کالج سے گریجویشن کرنے میں بھی کامیاب ہوگیا۔''

میں بھیم جی صاحب کے لیے رشید صاحب کی زبان سے نکلے ہوئے تعریفی کلمات سے صفحات کے صفحات بھر سکتا ہوں۔ میں ان کی، نقد اور غیر نقد، فیاضی اور انسان دوستی کے ضمن میں بیان کی ہوئی حیرت انگیز مثالوں سے ایک طویل فہرست بھی تیار کرسکتا ہوں جو میں نے رشید صاحب کی زبانی سنی ہیں۔ میں نے تو خود بھی ایسی داد و دہش دیکھی ہے اس لیے میں رشید صاحب کے بیان کی تصدیق بھی کرسکتا ہوں۔ میں نے بھیم جی صاحب کی سوانح حیات میں ان کی فیاضی کی صرف دو مثالیں پیش بھی کی ہیں جس میں ان سے طلب کرنے والے لوگوں کے ساتھ ان کے فیضانہ رویے کی تفصیل دی گئی ہے۔ اور جو کچھ انھوں نے کیا اس کے عوض وہ کسی بات کی تمنا نہیں رکھتے تھے۔ جب رشید صاحب اپنی یاد

داشت کو کھنگال کر واقعات بیان کرتے ہیں تو ان کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا چہرہ فخر کے احساس سے چمک اٹھتا ہے کہ وہ ان خیراتی کاموں میں بھی ان کے معاون رہے تھے۔ رشید کہتے ہیں کہ "وہ کبھی ان باتوں کی منصوبہ بندی نہیں کرتے تھے۔ ان کا ردِ عمل اضطراری ہوا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ کرنے کے لیے کہہ دیتے تھے اور میں حکم بجالاتا تھا۔ خواہ اس میں ملک کے معزول صدور میں کسی ایک کے علاج کے لیے مالی معاونت ہو یا برما میں، یا دنیا میں کہیں اور بھی مقیم، ان طالب علم افراد کے لیے جن کی وہ امداد کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ معمولی امداد ہوا کرتی تھیں جن میں زیادہ رقم درکار نہیں ہوتی تھی مگر ضرورت مند کے لیے بہت اہم ہوا کرتی تھی۔ مسٹر بھیم جی کو اس وقت بھی 'وزیر ساز' کہا جاتا تھا جب وہ ایسٹرن فیڈرل یونین مین شامل نہیں ہوئے تھے۔ وہ تقریباً تمام سربرآوردہ سیاست دانوں میں مقبول تھے اور پارلیمنٹ کے بیشتر ارکان سے ان کی دوستیاں تھیں۔ آپ محمد علی بوگرہ سے تو واقف ہیں جو پاکستان کے وزیرِ اعظم بنے تھے۔ مسٹر بھیم جی کی ان سے گہری دوستی بھی تھی اور وہ ان کے ذاتی مشیر بھی تھے۔ مثال کے طور پر مسٹر حبیب ابراہیم رحمت اللہ جو کبھی مغربی پاکستان کے گورنر تھے، جب وہ حکومت سے فارغ ہوئے تھے تو مسٹر بھیم جی نے انھیں عارضی پناہ کے لیے اورینٹل بلڈنگ میں دفتر کے لیے ایک کمرہ فراہم کیا تھا اور مجھے حکم تھا کہ میں ان کے لیے بھی کچھ کام کروں۔ یہ ایک بہت چھوٹی سے مدد تھی مگر بہت اہم اور بروقت تھی، جب کی گئی تھی۔"

مسٹر بھیم جی کے دوستوں کے بارے میں رشید صاحب سے بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے پاکستان کے پہلے پچیس برسوں کے عرصے پر محیط واقعات پر لکھی ہوئی کوئی کتاب کھول دی جائے۔ وہ نام گنواتے ہیں اور ان سے منسلک چھوٹی چھوٹی باتیں اس طرح بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ سننے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ خود دیکھ رہا ہے۔ وہ ان تمام گورنر جنرلوں، صدور، وزرائے اعظم، وزیروں، سفیروں اور دوسری عزت مآب شخصیتوں کی وہ پرتیں کھولتے چلے جاتے ہیں جو عزت مآبی سے قبل عام سے انسان تھے۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ یہ سب اتنے سادہ طریقے سے بیان کرتے ہیں سننے والا محو ہو جاتا ہے۔

اگر چہ مسٹر رشید کئی برس قبل ریٹائر ہو چکے ہیں اس لیے کہ ان کی عمر اس حد سے آگے نکل گئی ہے مگر اب بھی وہ اپنی میز پر بیٹھے مسٹر بھیم جی کی وسیع مصروفیات، ان کے اہلِ خاندان اور ان کے دوستوں کے ٹیلی فون سے روابط کے انتظام میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے ہمہ جہت شخصیت رکھنے والے افسر کے معتبر معاون ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مسٹر بھیم جی کی زندگی کا کوئی بھی گوشہ مسٹر رشید کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ میں جو اُن سے اتنا قریب رہا ہوں، ان کے تمام منصوبوں سے اتنا آگاہ نہیں جتنے کہ رشید صاحب تھے۔ جس بات سے میں دم بخود رہ گیا ہوں وہ میرے دوست کی زندگی کے طویل عرصے میں ہونے والے واقعات سے رشید صاحب کا جذباتی لگاؤ تھا۔ رشید صاحب میرے دوست مسٹر بھیم جی کی دوست تقریباً تمام شخصیات سے ہر نوعیت کے تعلقات اور ان کی گہرائیوں سے اس طرح واقف ہیں کہ نہ صرف وہ ان کی طویل فہرست بنا سکتے ہیں بلکہ ہر ایک کا گہرا تجزیہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ مسٹر بھیم جی سے رشید صاحب کی بیالیس برس کی قربت ایک ذاتی مددگار سے کہیں زیادہ ہو کر ایک قریبی رشتے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ رشید صاحب اپنے افسر کے نہ صرف سب سے بڑے محرم راز ہو گئے تھے بلکہ ان کو یہ اجازت بھی تھی کہ اگر ان کا ضمیر کہتا تھا تو وہ بلا تکلف کسی معاملے میں اپنی اختلافی رائے بھی دے دیتے تھے۔ مسٹر بھیم جی رشید صاحب کے خلوص اور ان کی ہنرمندی کے معترف تھے جس سے وہ ان کی اور ان کے خاندان کی خدمت کر رہے تھے۔ مجھے ایک خط کی نقل ملی ہے جو مسٹر بھیم جی نے ۱۹۶۸ء میں میونخ میں میرے دفتر سے رشید صاحب کو تحریر کیا تھا۔ یہ نقل اس لیے میرے پاس تھی کہ انھوں نے اس ضمن میں کچھ کام میرے سپرد بھی کیا تھا۔ اپنے خط میں انھوں نے لکھا تھا:

میرے پیارے رشید، میری غیر موجودگی میں آپ کو کچھ ذہنی سکون اور جسمانی آرام ملا ہوگا۔ مگر میرے لیے آپ کے بغیر زندگی مشکل ہوتی ہے۔ بانو کے علاوہ کوئی بھی میری حرکات سے نہ اتنا واقف ہے اور نہ ان کو برداشت کر سکتا ہے جتنا کہ آپ کرتے ہیں۔ اور میں اس کے لیے ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

رشید صاحب کراچی میں خوش وخرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے تین بیٹے اور تین بہت خوب صورت لڑکیاں ہیں۔ ای ایف یو کی روایت کے مطابق ان کے دو بیٹے اسی ادارے میں کام کرتے ہیں اور بہت کامیاب ہیں۔ وہ دونوں ادارے کے سب سے بڑے کاروبار کرنے والوں میں سے ہیں۔ یہ ان کے والد کے احترام کی وجہ سے ہے جو نہ صرف اس ادارے میں بلکہ پوری مارکٹ میں ان کو حاصل رہا ہے۔ تیسرا بیٹا امریکا کے شہر جارجیا میں مرسیڈیز کار کا ایک جدید گیرج چلا رہا ہے۔ تینوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے جو ان کے والدین کے اطمینان میں اضافے کا باعث ہے۔ ایک عظیم انسان کے زندگی بھر کے معاون اور ساتھی ہونے کے باعث ان کی زندگی دل خوش کن یادوں سے معمور ہے۔ اور انھیں اپنی کامیابیوں پر بجا طور پر فخر کرنا چاہیے۔ مگر اس بات پر کوئی فخر نہیں کہ ان کے افسران پر اس وقت بھی اتنا اعتماد کرتے تھے جب انھیں ناکامیاں اور غم سہنے پڑتے تھے۔

زندگی بھر کے وفادار ساتھی اور محرم راز۔

محمود جعفری

غیر منجمد خفیہ خزانہ

جب روشن علی بھیم جی نے ۱۹۶۱ء میں ای ایف یو کی باگ ڈور سنبھالی تو انھیں نہ صرف لندن میں ہونے والے کمپنی کے نقصانات اور قرض خواہوں سے نمٹنا تھا بلکہ کمپنی کی سیلز فورس کے اعتماد کو بھی بحال کرنا تھا۔ سرمائے کی کمی اور مبہم جویانہ دور بینی کے فقدان نے ایسی حیص بیص کی صورت پیدا کردی تھی جو سرمائے کی کمی سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی عارضے کے جراثیم جسم میں داخل ہو کر رفتہ رفتہ پورے جسم کو بے کار کر دیتے ہیں، یہ ادارہ بھی سر سے پاؤں تک فالج کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔

دس برس کے عرصے تک ہر شخص سے یہی کہا جاتا رہا تھا کہ لندن میں ہونے والے نقصانات کی وجہ سے ادارے کے پاس اتنا سرمایہ نہیں رہ گیا ہے کہ کسی قسم کی سرمایہ کاری کی جا سکے جس سے مقررہ آمدنی کی ضمانت ہو۔ تعجب نہیں کہ اس قسم کی باتوں سے انتظامیہ اور کارکنوں کے درمیان کا ماحول آلودہ ہوتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے کارکنوں کی یونین طاقت ور ہوتی جا رہی تھی۔ ان معنوں میں طاقت ور نہیں کہ یہ اپنے مالی مطالبات منوا سکے۔ جس انتظامیہ کی جیب خالی ہو ملازمین کے مشاہرے میں اضافے کے لیے اس پر دباؤ ڈالنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسے حالات میں ایک طاقت ور ترین یونین بھی کچھ نہیں کر پاتی۔ مگر ایسے حالات میں ادارے کے رگ و پے میں ایک بد اعتمادی سرایت کرتی جا رہی تھی جس میں ہر ایک دوسرے کو اپنا ساتھی سمجھنے کے بجائے اپنا حریف سمجھنے لگا تھا۔ اور بلا شبہ اس سے کارکنوں کے حوصلے پست ہوتے جا رہے تھے۔ ادارے کے نظم و ضبط میں دراڑیں پڑ رہی تھیں اور مختلف درجے کے ملازمین کا آپس میں دست و گریباں ہونا روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔ اور اگر ایسی صورت میں انتظامیہ کسی کے خلاف کارروائی کرتی تو یونین درمیان میں آجاتی۔ یونین کو خوش رکھنے کے لیے عموماً انتظامیہ ہتھیار ڈال دیتی جس کی وجہ سے کارکنوں کے نظم و ضبط اور حوصلے ماند پڑتے جا رہے تھے۔

اس لیے مسٹر بھیم جی کو سب سے پہلے ان بدقسمت مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ انھیں نہ صرف یونین کے طویل معروضات کو ٹھنڈے دل سے سننا پڑا بلکہ ادارے کی تاریخ میں پہلی بار انھوں نے عہدے داروں کو احساسِ اہمیت دیا۔ بھیم جی صاحب نے صحیح معنوں میں ان لوگوں کو ادارے کا خفیہ خزانہ سمجھ کر اس کو مثبت انداز میں کمپنی کے مصرف میں لانے اور اس کی ترقی میں استعمال کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے یونین والوں کو اپنے ماضی کے بارے میں تفصیلات بتائیں، کس طرح خود انھوں نے رنگون میں دکان داروں کی ایک یونین بنائی تھی اور کس طرح بمبئی میں مشکلات میں پھنسے کارکنوں کے مسائل سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ مسٹر بھیم جی یونین کے عہدے داروں کی اپنے ارکان کی بہتری کے لیے کوششیں جاری رکھنے کی حوصلہ افزائی کی مگر اس تاکید کے ساتھ کہ ادارے کی نئی انتظامیہ کی تجوریاں خالی ہیں اور وہ ناممکن کو ممکن نہیں بنا سکتی۔ مگر انھوں نے یونین کے عہدے داروں میں ادارے کے مستقبل کے بارے میں اعتماد کی فضا بحال کرنے کی کوشش کی اور انھیں صحیح معنوں میں ادارے کا ساجھے دار بن جانے کی پیش کش کی۔ سب سے کم تنخواہ پانے والے ملازمین کی تنخواہوں میں فی الفور اضافے کر

دیے گئے۔ اس طرح اعتماد کی ایک نئی فضا وجود میں آگئی اور یونین کے عہدے داروں کو اس بات کا آسرا ہوگیا کہ حالات کی بہتری کے بعد ان کے مطالبات پر ہمدردی سے غور کیا جائے گا۔

ای ایف یو کے کارکنوں کی یونین کے عہدے داروں میں سے ایک محمود جعفری تھے جو ہیڈ آفس کے جنرل ڈپارٹمنٹ میں جونیئر کلرک تھے اور اس زمانے میں اس کی سربراہی میرے ذمے تھی۔ مجھے یونین سے منسلک مسائل کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے کہ جرمنی میں کسی ادارے کے لیے مخصوص یونیوں کا رواج نہیں تھا۔ وہاں صنعتوں کی یونینیں ہوتی تھیں۔ مگر میرے پیش رو مسٹر شوارز یونین کے پیدا کردہ مسائل کی نوعیت سے مجھے پہلے ہی آگاہ کر چکے تھے جو بنیادی طور پر ادارے کی مالی کم زوری کی وجہ سے بگڑتے جا رہے تھے۔ مگر صرف سرمائے کی کمی ہی کی وجہ سے انتظامیہ اور کارکنوں کے درمیان فضا خراب نہیں ہو رہی تھی۔ کارکنوں کو اعتراض تھا کہ انتظامیہ ان کے مسائل سے آنکھیں چراتی ہے، اور اس بات پر اور بھی تلخی تھی کہ ان لوگوں کو ادارے کے دگرگوں حالات سے باخبر نہیں رکھا جاتا۔ ادارے کے کارکنوں اور یونین کے عہدے دار مسٹر شوارز کو ذاتی طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اس لیے کہ جہاں تک ممکن ہوتا وہ ان کی مدد کرتے تھے۔ ان کے ماتحت کارکنوں میں محمود جعفری بھی تھے جن سے ان کا اکثر ٹکراؤ رہتا تھا مگر مسٹر شوارز سے ان کے ساتھیوں کی بھلائی کے لیے اقدامات کرنے کی کوشش کی بنا پر ان سے اچھے تعلقات بھی تھے۔

اپنے دورِ ملازمت کے دوران میں نے اس روایت کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر کمپنی کے ملازمین کی یونین سے میرے بھی تنازعات چلتے رہتے تھے ان میں سے ایک محمود جعفری تھے۔ وہ اتنے معمولی درجے کے کلرک تھے کہ میں ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوتا اگر وہ یونین کے نمائندے نہ ہوتے۔ وہ ہر معاملہ بڑے زور شور سے پیش کرتے اور ایک دو بار تو وہ غصے سے بے قابو بھی ہوا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود، جس انداز میں وہ ای ایف یو میں کام کرنے والے اپنے غریب ساتھیوں کے لیے جد و جہد کرتے تھے، میں انھیں پسند کرنے لگا تھا۔ وہ نچلے طبقے کے ملازمین کی نمائندگی کرتے تھے۔ نہ کہ ان لوگوں کی جو اپنا پیشہ ور مستقبل خود بنانے اور کامیابیوں کی سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ میرے اور جعفری کے درمیان ایک اچھا کاروباری رشتہ قائم ہوگیا تھا۔ جب میں چھ برس تک اس ادارے میں کام کرنے کے بعد واپس جرمنی جا رہا تھا تو اسی رشتے کے ناتے جعفری نے مجھے ایک چھوٹا سا تحفہ بھی پیش کیا تھا۔

جب میں اس کتاب کے لکھنے کے سلسلے میں منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ اس میں شمولیت کے لیے کن کن افراد کے خاکے لکھے جانے چاہییں تو ظاہر ہے کی قدرتی طور پر زیادہ تر انھی لوگوں کے نام سامنے آئے جو یا تو اس ادارے کے مؤسسین میں سے اعلیٰ عہدے دار رہ چکے تھے۔ مگر میں ایسی شخصیتوں کی تلاش میں تھا جن کے نام قدرتی طور خود بخود سامنے نہ آتے ہوں اس لیے کہ اس طرح مجھے سیکڑوں کی تعداد میں وفادار ملازمین کے بارے میں لکھنا پڑتا اور یہ کتاب کبھی ختم ہی نہ ہوتی۔ اس تناظر میں جعفری کا نام ان لوگوں میں شامل ہوگیا میں جس سے باتیں کرنا اور ای ایف یو کے تناظر میں ان کے تذکرے اس کتاب میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

آج پورے پینتیس برس بعد میں قمر ہاؤس کی پہلی منزل پر اس کمرے میں بیٹھا جعفری سے باتیں کر رہا تھا جو مجھے کمپنی کا ڈائریکٹر بننے کے بعد دیا گیا تھا، جس کے بالکل متصل کسی زمانے میں میرا دفتر ہوا کرتا تھا اور جہاں کسی معاملے میں پہلی بار میرا اور جعفری کا آمنا سامنا ہوا تھا اور جہاں جرمنی واپس ہوتے وقت جعفری نے مجھے چھوٹا سا مگر خوب صورت الوداعی تحفہ پیش کیا تھا۔ اس زمانے میں جعفری میرین ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے اور میں کمپنی کا تکنیکی سربراہ تھا۔ یہ کمرہ چیئرمین کے دفتر سے متصل ہے جس میں، اپنی صحت کی خرابی کے باعث ،مسٹر بھیم جی ہفتے میں صرف ایک بار، اور وہ بھی صرف دو گھنٹوں کے لیے بیٹھتے تھے۔

میری طرح محمود جعفری بھی بوڑھے ہو چکے تھے مگر ان کی آنکھوں کی چمک اسی طرح باقی تھی۔ وہ اب یونین میں نہیں رہے تھے مگر کمپنی کے ایک اعلیٰ عہدے تک پہنچ گئے تھے اور انھیں اس پر فخر تھا، فخر اس لیے اور بھی کہ اس ادارے سے ان کا زندگی بھر کا ساتھ رہا تھا جسے

گفتگو کے دوران کئی بار انھوں نے اپنا خاندان کہا تھا۔ میں نے ان سے اس وقت کے ان کے جذبات کے بارے میں دریافت کیا جب مسٹر بھیم جی کمپنی کے سربراہ کی صورت میں ادارے میں شامل ہوئے تھے تو انھوں نے کہا کہ میں بیان نہیں کرسکتا کہ ہم لوگ، یعنی میں اور یونین کی انتظامیہ، اس خبر کو سن کر کتنا خوش ہوئے تھے جب ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ کمپنی کے نئے سربراہ کے دل میں یونین کے نمائندوں اور اس کے ممبران کے لیے ہمدردی کے جذبات تھے۔

میں نے جعفری سے ان کے خاندانی پس منظر اور ای ایف یو کے ابتدائی دنوں کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ آگرے میں، جو اب ہندوستان کا حصہ ہے، ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے خاندان نے ۱۹۴۹ء میں پاکستان ہجرت کی تھی۔ ان کے والد سرکاری ملازم تھے اور سرکاری جائیداد کے محکمے میں متعین سٹی مجسٹریٹ کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ ان کی اعلیٰ تعلیم کراچی کے ماڈرن اسکول سے شروع ہوئی جہاں سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے جز وقتی تعلیم اختیار کی اور گریجویشن کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ایسٹرن فیڈرل یونین میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے ملازمت کرلی تھی۔ انھی دنوں مسٹر کے ایف حیدر جنرل مینجر بن کے آئے تھے اور مسٹر ایون ان کے نائب تھے۔ جعفری سے بات کرنا ایسا تھا 'گویا دبستاں کھل گیا'۔ پرانے وقتوں کے نام جو میرے حافظے میں دفن ہو گئے تھے اُن کی زبانی ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔ مہتاب احمد صدیقی، فائر ڈیپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ، ان کے نائب مسٹر رضوی، میرین ڈیپارٹمنٹ کے سخت مگر منکسر اور نہایت ذمے دار سربراہ اے۔ جی خان، ری انشورنس کے مسٹر رسل، میرین کے انڈر رائٹر دراز قد اور دبلے پتلے حیدر صاحب وغیرہ۔ ان کے بہت سے ساتھی مرکھپ چکے ہیں یا ریٹائر ہو گئے ہیں۔ بہ لحاظِ عمر جعفری صاحب بھی ریٹائر ہو جاتے مگر انھیں موٹر کلیمز ڈپارٹمنٹ میں سینئر وائس پریزیڈنٹ کے عہدے پر روک لیا گیا تھا۔ چوری ہو جانے والی گاڑیوں کے کلیم میں ان کا طویل تجربہ کمپنی کے لیے قابلِ قدر تھا اور اب بھی ہے۔ کمپنی کی روایت کے مطابق کمپنی کے ملازمین کی دوسری اور تیسری نسل بھی کام کمپنی میں کر رہی ہے، جعفری کے دو بیٹے بھی کمپنی میں ملازم ہیں۔

مسٹر جعفری آج بھی اپنے جرمن افسر مسٹر شوارز کی تعریف کرتے ہیں۔ مسٹر حیدر کے بارے میں بھی جن سے کمپنی کی یونین کے معاملے پر جھڑپیں چلتی رہتی تھیں، وہ کہتے ہیں، ''وہ بھی بہت رحم دل انسان تھے۔ اگر چہ وہ بہت سخت گیر انسان تھے مگر انھوں نے کمپنی کے مشکل ترین حالات میں بھی کسی کو کمپنی کی ملازمت سے برخاست نہیں کیا۔ اور اگر کوئی بھی ان کے دفتر میں آتا اور یہ کہتا کہ وہ مفلس ہے اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں تو حیدر صاحب کہتے کہ چلو بیٹھ جاؤ، کام شروع کردو، تمھیں سو روپے ماہانہ تنخواہ مل جایا کرے گی۔ مگر اپنے پس منظر کے پیشِ نظر وہ یونین کے مخالف تھے اور اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھیں اپنی میز پر ہمارے خطوط بالکل پسند نہیں تھے۔ اور جب کبھی ہم انھیں کوئی خط لکھتے تو وہ ہمیں بلا کر وہ خط ہمارے منہ پر مار دیتے تھے۔ ہمیں ان کے خلاف مہم چلانی پڑی تھی، ہم نے ہڑتال بھی کی تھی۔ میں ذاتی طور پر اس قسم کی کارروائیاں پسند نہیں کرتا تھا۔ یونین میں میری صدارت کے زمانے میں کوئی ہڑتال نہیں ہوئی تھی۔ میں یونین کا صدر، نائب صدر اور کمپنی کی مینیجنگ کمیٹی اور ورکس کمیٹی کا رکن رہ چکا ہوں۔ ورکس کمیٹی کے چار ارکان ہوتے تھے جس کے چیئر مین ایس ایم معین الدین اور میں وائس چیئر مین تھا۔ اس میں ہم مسائل اور ملازمین کی بہبود پر بحث مباحثے کرتے تھے۔ اور میں نے یہ کام کئی برس کیا تھا۔ ایک دن میں نے یونین کی ذمے داریوں سے سبک دوش ہونے کا فیصلہ کرلیا اور ان تمام ذمے داریوں سے فراغت چاہی میں جن سے کئی برس تک الجھتا رہا تھا۔ مگر مسٹر بھیم جی اس بات پر اڑے رہے کہ مجھے اس وقت تک یونین کے کام کرنے چاہییں جب تک کہ وہ ادارے کے سربراہ کے عہدے سے فارغ نہیں ہو جاتے۔ میں راضی ہوگیا۔ جب وہ چیئر مین بن گئے تو میں نے ایک بار انھیں ان کی بات یاد دلائی تھی۔ حالاں کہ کہ نئے سربراہ نواب حسن صاحب بھی یہی چاہتے تھے کہ میں یونین کا عہدہ اپنے پاس رکھوں مگر میں نے چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا، اس لیے کہ میں پیشہ ور یونین والا نہیں تھا اور میں اس بوجھ کو اپنے سر سے اُتار پھینکنا چاہتا تھا۔ میں ادارے کی اعلیٰ سطحوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میرے چار بچے ہو چکے تھے اور مجھے ان کی

دیکھ بھال کرنی تھی۔ اس طرح میں نے کمپنی میں اپنی جگہ بنائی جس کو میں اپنے خاندان کی طرح سمجھتا تھا۔''

پھر ہم نے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء میں کمپنی کے ان مسائل پر باتیں کیں جو مسٹر بھیم جی اور مسٹر خلیلی سے قبل پیدا ہوئے تھے۔ میں اس مقام پر ان کے خیالات میں سے کچھ اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں اس لیے کہ ان سے کمپنی کے ملازمین کے اس وقت کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

''جی ہاں، اس وقت کمپنی کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ اور عام لوگ بھی ای ایف یو کے کارکنان سے ناخوش تھے۔ ان کے کچھ اس قسم کے الفاظ ہوا کرتے تھے، 'تم لوگ کلکتے والی ایسٹرن فیڈرل میں کام کرتے ہو؟ اوہ میرے خدا! ہمیں تم لوگوں سے ہمدردی ہے' یہ روزانہ کا معمول تھا۔ مگر یہ سب کچھ ایک ڈرامائی انداز میں ایک دم تبدیل ہو گیا جب مسٹر بھیم جی نے ادارے میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس کے دو برس بعد میں کمپنی کے کسی کام سے وزارتِ خارجہ کے پریس آفس اسلام آباد میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس سیکشن کے انچارج نے مجھ سے پوچھا، 'جعفری، آپ کہاں کام کرتے ہیں؟ میں نے جواب میں کہا، ایسٹرن فیڈرل۔ وہ تقریباً چیخ کر حیرت اور توصیف سے بھری آواز میں بولا، 'اوہ ایسٹرن فیڈرل! ملک کی سب سے بڑی انشورنس کمپنی میں!' آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ سن کر مجھے کتنی مسرت ہوئی ہوگی۔ کیا تبدیلی آ گئی تھی۔ چند برس قبل ہم لوگ 'کلکتے والا' تھے۔''

مسٹر جعفری کو اپنی چالیس برس کی ملازمت پر فخر ہے۔ وہ کہتے ہیں، ''میرے جسم کی رگوں کا خون ایسٹرن فیڈرل یونین کی ملکیت ہے۔ میں نے جب ایسٹرن فیڈل میں شمولیت اختیار کی تھی اس وقت میں کچھ بھی نہیں تھا، بس ایک نوجوان تھا جس کا کوئی مالیاتی پس منظر نہیں تھا۔ ای ایف یو نے مجھے سب کچھ دیا ہے اور میں اس ادارے کا بہت شکر گزار ہوں۔ جیسا کہ میں کہتا ہوں، ای ایف یو میرے خاندان کی طرح ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان معنوں میں وہ انشورنس کی ماں ہے کہ دوسری تمام انشورنس کمپنیوں کو وہی لوگ چلا رہے ہیں جنھوں نے ابتدائی تربیت ایسٹرن فیڈرل سے حاصل کی تھی۔ وہی سب اب پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔''

میرے خیال میں ان کے الفاظ اپنے مطالب کی خود ترجمانی کرتے ہیں اور اسی وجہ سے میں انھیں اپنے قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

مرزا فیض احمد

زمین سے آسمان تک

یہ ہیں مرزا فیض احمد جو ایک زمانے سے ہمارے اطراف گردش کر رہے ہیں۔ یہ ایسٹرن فیڈرل جیسے عظیم ادارے کی تاریخ کی زندہ مثال ہیں۔ کمپنی کے سب سے پرانے کارکنوں میں سے ایک اعلیٰ افسر ہیں، جو ڈپٹی ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے عہدے پر فائض ہیں اور ان کی ذمے داریوں میں انٹرنل آڈٹ، کریڈٹ اور بجٹنگ کنٹرول شامل ہیں۔ ان سے بات کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی انسانی انسائیکلو پیڈیا کی ورق گردانی کر رہے ہوں۔ یہ ان تمام لوگوں سے واقف ہیں جنھیں آئیون، حیدر، شوارٹز، اختر آزاد، وصال الدین، معین الدین، عظیم رحیم، سلطان احمد، میاں سعید احمد، امین خراسانی، تواب حسن، شرافت والا جاہی، ساجد زاہد جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس عظیم بنگالی سے بھی جس کو خدا بخش کہتے تھے جو ۱۹۶۰ء کے زمانے میں کمپنی کے لائف ڈپارٹمنٹ کا سربراہ تھا۔ مرزا فیض احمد خود بھی ایک زندہ لی جنڈ ہیں جو اس ادارے کی سب سے نچلی سطح سے ابھر کر اوپر تک پہنچے ہیں۔

مرزا فیض ۱۹۳۵ء میں دلّی میں مقیم ایک اوسط کاروباری خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ایک چھوٹی سی بیڑی کی فیکٹری کے مالک تھے اور خام مال خریدنے کی غرض سے آسام جایا کرتے تھے۔ وہ ہوزری کی صنعت سے بھی وابستہ تھے۔ دوسرے عزیزوں کی طرح ان کے دادا کی بھی دلّی کے صدر بازار میں دکان تھی۔ جب تقسیم ہند کا اعلان ہوا تو ان کے والدین نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا، اس لیے کہ ان دنوں ہندوستان کے حالات بہت مخدوش ہو گئے تھے۔ مرزا فیض بتاتے ہیں کہ ان کے علاقے میں قتلِ عام ہو رہا تھا اور ان کے اہلِ خانہ کئی دن تک اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ ہندوؤں کے ہاتھوں ذبح کیے جانے کے خوف سے دلّی چھوڑنے کی غرض سے ان کا پورا خاندان ایک جگہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے ان کے والد کے ایک دوست دلّی میں ڈپٹی کمشنر تھے اور ان کی وجہ سے انھیں روال پنڈی کے لیے ہوائی ٹکٹ دستیاب ہو گئے تھے جس کو انھوں نے اپنا گھر بنا لیا تھا۔

مرزا فیض احمد کو وہ لاشیں کبھی نہیں بھولتیں جو دلّی ایئر پورٹ جاتے والی سڑک کے کنارے پڑی ہوئی تھیں۔ ''یہ ایک بہت بھیانک منظر تھا۔ بہت سی لاشیں بغیر سر کی تھیں۔ اور جب ہم لوگ دلّی ایئر پورٹ پہنچے تو ہمارے اطراف ہندو اور سکھ تھے جن کو دیکھ کر مجھ پر اور میرے چھوٹے بھائی بہنوں پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ اس دن ہم بیدِ مجنوں کی طرح کانپ رہے تھے خدا سے رحم کی دعائیں مانگ رہے تھے۔''

یہ لوگ خوش قسمت تھے کہ راولپنڈی پہنچ گئے تھے۔ مرزا فیض نے وہاں اسکول میں داخلہ لے لیا اور وہیں نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد نے راولپنڈی میں چھوٹا موٹا کاروبار کر لیا تھا۔ جب ان کے کچھ عزیز کراچی پہنچے تو ان لوگوں کو پتا چلا کہ کراچی کہیں بہتر مقام تھا اور وہاں کاروبار شروع کرنے کے لئے بہت سے مواقع تھے۔ اس طرح ان کے اہلِ خاندان نے کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ۱۹۴۸ء کی بات تھی۔ مرزا فیض نویں درجے کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے راول پنڈی ہی میں ٹھہر گئے تھے جہاں سے انھیں کراچی جانا

تھا۔ کراچی پہنچ کر انھوں نے میٹرک پاس کیا اور ایس ایم کالج میں آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ ان کے والد ان کے لیے اپنے اجداد کی طرح کاروبار کرنے کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ کوئی پیشہ ور انسان بنیں اس لیے کہ اس وقت تک یعنی ۱۹۵۴ء میں وہ گریجویشن کر چکے تھے۔ اس وقت تک ان کے والد مختلف کاروبار کر چکے تھے۔ یہ شوق سے نہیں بلکہ مجبوری کی وجہ سے ہوا تھا۔ مرزا فیض بتاتے ہیں کہ ''میرے والد بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ اور وہ کچھ پرانی وضع کے انسان بھی تھے۔ وہ اس زمانے کے لوگوں کی طرح جدید نہیں بن سکے تھے۔ میرے والد کے زمانے کے پرانے لوگوں کو یہی تربیت دی گئی تھی کہ وہ سیدھے سادے، ایمان دار اور کھرے انسان بنیں۔ میرے خیال میں شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اس نئے ملک میں اپنے کسی کاروبار میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ پاکستان میں انسان کو کامیابی کے لیے چلتا پرزہ بننا پڑتا تھا جو ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنا گھر بار کھو چکے تھے۔ ان کے پاس بس وہ قدریں ہی رہ گئی تھیں جو ان کو اپنے اسلاف سے ملی تھیں۔ در اصل وہ اپنی شناخت کھو چکے تھے۔ بہت قدامت پسند اور بہت زیادہ ایمان دار انسان تھے۔ میں گریجویشن کے بعد اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ دو یا تین برس تک رہا تھا۔ میں نے کاروبار میں اپنے والد کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہو سکی۔ اس لیے ایک دن میں نے اپنے دور کے رشتے دار جناب معین قریشی سے رابطہ کیا جو ایک بڑی بیمہ کمپنی ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی کے ایکسیڈنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ انھوں نے مجھے بھی ملازمت کا مشورہ دیا اور وعدہ کیا کہ وہ مجھے ملازمت دلوانے کی کوشش کریں گے۔ میں بہت خوش ہوا اس لیے کہ میرے والد کی صحت خراب ہو چکی تھی اور خاندان کی کفالت کے لیے مجھے ہی کچھ کرنا تھا۔ کالج کے دنوں میں ہی میں نے شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھنا شروع کر دیا تھا، ان دنوں جس کی بہت مانگ تھی۔ میں دن میں کالج جاتا، دوپہر کے بعد کاروبار میں اپنے والد کی مدد کرتا اور شام کو شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھتا تھا۔ ان دنوں اوسط درجے کے گھرانوں کے لیے زندگی واقعی بہت مشکل تھی۔ مگر ایک وسیع النظر خاندان سے ہونے کی وجہ سے بہادری سے ہم حالات سے نبرد آزما ہوئے، کبھی شکوہ نہیں کیا اور کبھی ہمت نہیں ہارے۔ ۱۹۵۹ء میں قریشی صاحب مجھے ملازمت دلوانے میں کامیاب ہو گئے اور میں نے ایسٹرن فیڈرل یونین کے کراچی ایجنسی سیکشن کے ایکسیڈنٹ ڈپارٹمنٹ میں کام شروع کر دیا جو اُن دنوں قمر ہاؤس میں تھا۔ مجھے Workmen Compensation Section میں تعینات کر دیا گیا۔ اس وقت تک کاروبار کلکتے ہی سے ہوتا تھا مگر ہم لوگ مقامی سطح پر دیکھ بھال کرتے اور خدمات فراہم کرتے تھے۔ کیوں کہ میں ایک کاروباری خاندان سے آیا تھا، میں نے بھی کچھ بزنس دینا شروع کر دیا۔ دفتر کے اوقات کے بعد میں مارکیٹ میں جاتا اور مجھے فخر تھا کہ میں اس کام میں کافی اچھا ثابت ہو رہا تھا۔''

مرزا فیض جس محکمے میں کام کر رہے تھے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۵ء تک اس کے سربراہ ایس ایم معین الدین تھے۔ انھیں یاد ہے کہ ۱۹۶۵ء میں معین الدین صاحب نے ڈیویلپمنٹ کا کام کرنے اور پالیسیاں بیچنے کے عوض ان کی تنخواہ میں ایک سو روپے ماہوار کا اضافہ کرا دیا تھا اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ان کی ترقی ہو گئی۔ یہ ان لوگوں کے لیے پہلا زینہ ہوتا تھا جو کمپنی میں افسر بننا چاہتے تھے۔ در اصل یہ کچھ ویسا ہی تھا جیسے کہ فوج میں افسر بننے سے پہلے سپاہیوں کو کارپورل اور سارجنٹ کے عہدے حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ مرزا فیض اس کام میں ماہر نکلے اور رفتہ رفتہ ان کا کاروبار بڑھتا گیا۔ کمپنی نے ان کی کامیابی کے عوض ان کو ۱۹۷۱ء میں سینئر ڈیویلپمنٹ افسر، اس کے بعد اسسٹنٹ منیجر اور پھر ڈپٹی منیجر بنا دیا گیا۔

مرزا فیض نے بتایا کہ ''جناب سیف الدین زومکا والا نے، جن کے ساتھ میں پانچ چھ برس تک کام کر چکا تھا سائٹ برانچ کھولی تھی۔ اور جب وہ کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس گروپ میں شمولیت کے لیے دبئی چلے گئے تو یہ برانچ میرے حوالے کی گئی جسے میں نے بحسن و خوبی چلایا۔ یہیں سے بطور سیلز مین میری پیشہ ورانہ زندگی کی بڑے انداز میں ابتدا ہوئی تھی۔ میں اور میرے ساتھی تن من دھن سے جُت گئے اور ہم نے پانچ برس کے عرصے میں اس برانچ کے کاروبار کو آسمان پر پہنچا دیا۔ مجھے ایک برس میں دو ترقیاں ملیں۔ میں پہلے منیجر بنا، پھر وائس

پریذیڈنٹ اور اس کے بعد سینئر وائس پریزیڈنٹ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے سدرن زونل آفس میں بھیج دیا گیا جہاں میں نے فصیح الدین صاحب کے ساتھ کام کیا۔ جب عظیم رحیم صاحب چلے گئے اور سلطان احمد صاحب آئے تو ۱۹۸۶ء میں مجھے سینئر ایگزیکیٹو وائس پریزیڈنٹ بنا دیا گیا۔ اور ابھی دس برس قبل، یعنی ۱۹۹۷ء میں مجھے ڈپٹی ایگزیکیٹو ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی ہے۔ یہ تھی ای ایف یو میں میری رام کہانی۔ میں آج جو کچھ بھی میں ہوں ای ایف یو کے طفیل ہوں۔''

یہ سب کچھ کتنا آسان لگتا ہے مگر اس کی تفصیل کو سن کر ایک گونہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کہانی ہے ایک ایسے انسان کی جس نے اپنی زندگی کا ایک حصہ ایک مالیاتی ادارے کی بہبود کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا ایک مقصد سمجھ کر کیا جو کسی ادارے کے نفع اور نقصان سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے جس کے عوض اس کو بہت ساری ترقیاں بھی ملیں۔ اور جب ہماری گفتگو ختم ہوگئی تو میں سوچنے لگا کی مرزا فیض نے جو کچھ کہا ہے وہی کچھ دوسرے لوگوں نے بھی بتایا تھا جب وہ اپنی زندگی کے تجربات بیان کر رہے تھے۔ مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ یہ ادارہ کسی عام قسم کے تجارتی ادارے سے کیوں مختلف تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے کچھ رہنماؤں نے خواب دیکھے تھے اور یہ انھی خوابوں کی تعبیر بن کر ہمارے سامنے موجود ہے، جو ادارے کی شمع کو لے کر چلے تھے اور انھوں نے اس کی کامیابی کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا تھا۔

۷ا رمئی ۱۹۹۷ء کو فیض مجھ سے کہہ رہے تھے ''پورے چالیس برس میں نے اس ادارے کی خدمت میں گزار دیے ہیں۔ اس عرصے میں بہت سے نئے ادارے قائم ہوئے اور مجھے بہت سے مواقع ملے مگر میں نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اس لیے کہ اس ادارے کی ترقی میں اس کے سربراہ مسٹر روشن علی بھیم جی کے اندازِ کار نے مجھ میں اس کی خدمت کی امنگ پیدا کرتی تھی۔''

جو کچھ مرزا فیض کہہ رہے تھے وہ میرے لیے کوئی کچھ نئی بات نہیں تھی نہ اس شخصیت کی توصیف کے لیے پہلی بار کہی جارہی تھی جو آج اس دنیا میں نہیں۔ مرزا فیض ان کاسہ لیس لوگوں کی طرح نہیں جو دنیا میں ہر طرف پائے جاتے ہیں جن کے بغیر یہ دنیا نامکمل نہیں۔ یہ بغیر چھل کپٹ کے ایک سیدھے سادے اور حق گو انسان ہیں اور انھوں نے وقتی فائدے پر کبھی نظر نہیں رکھی۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے انداز سے دنیا کو برتا ہے۔ ان کے خاندان کے معیار نے انھیں بچپن سے سکھایا ہے کہ صبر اور شکر کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کرو، جس پر انھیں فخر ہے۔

اس پر کسی کو حیرت نہیں ہوگی کہ مرزا فیض جیسے لوگ جو اپنی زندگی میں کامیابیوں سے ہمکنار رہے ہیں، عام دھارے کے انسانوں سے مختلف سوچ تو نہیں رکھتے تھے مگر وہ جو کچھ دیکھتے تھے، جن لوگوں سے ملتے تھے ان کا اپنے انفرادی انداز میں تجزیہ کرتے تھے، صرف اپنے اعلیٰ افسروں کے انداز ہی میں نہیں۔

سب سے دل چسپ بات جو انھوں نے بتائی وہ یہ تھی کہ جب مسٹر بھیم جی سمندر پار بیمہ کمپنی بنانے میں مشغول تھے، لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ملک کو خیر باد کہہ کر نہیں جائیں گے بلکہ آتے جاتے رہیں گے اور اس صنعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے سے اس ادارے کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے ازالے کے لیے وہ ای ایف یو جنرل کے مفادات کی نگرانی بھی کرتے رہیں گے۔

''مجھے یقین تھا کہ مسٹر بھیم جی اپنی مرضی سے ملک سے باہر نہیں جا رہے تھے۔ ان پر ضرور کسی قسم کا دباؤ ہوگا۔ ہم سب کو اس بات کا بہت افسوس تھا۔ اگر کوئی اس ملک میں کامیابی سے روزی کما رہا ہے تو اس کو لندن، سعودی عرب یا امریکا جانے کی بھلا کیا ضرورت ہوگی۔ جب میں اس کیفیت کو اپنے اوپر منطبق کر کے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ جب میرا گھر ہے، میرے اعزّہ ہیں، اچھی ملازمت ہے تو مجھے ملک چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت ہوگی؟ ان کے اپنے لیے اچھا تھا یا بُرا تھا مگر ہمیں اس بات کا ضرور افسوس تھا کہ یہ ملک اتنے بڑے اور کامیاب کاروبار کے سربراہ کی خدمات سے محروم ہو رہا تھا۔''

مرزا فیض احمد ایس ایم معین الدین کو اپنے لیے مثالی کردار سمجھتے ہیں۔ ان کے الفاظ کے مطابق ''وہ بہت خوش باش انسان تھے۔ شاید انھوں نے انشورنس کا کام بھوپال سے شروع کیا تھا جب وہ حیدر صاحب سے ملے تھے، جو ریاست کے وزیرِ مالیات رہے تھے۔ اپنے بھائی کی

مدد سے جو نیشنل بینک آف پاکستان میں اعلیٰ افسر تھے، وہ بہت کامیاب ہوئے تھے۔ معین صاحب بہت چالاک، نہایت ذہین اور موقع شناس آدمی تھے۔ وہ بہت شگفتہ آدمی تھے، اتنے کہ مزاح ان کا ٹریڈ مارک بن گیا تھا۔ میں ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا تھا۔ جب ہم ایک ساتھ بیٹھتے تو وہ بیان کرتے کہ کس طرح اپنے گاہکوں کو انشورنس فروخت کرتے ہیں اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ کیا کرتے ہیں۔ اور جب اپنے سینئر ساتھیوں کی مدد سے انھوں نے پاکستانی فوج کا انشورنس کرایا تھا، اف خدایا!، وہ تو ہم سب کے لیے ایک ہیرو بن گئے تھے۔ ایک انداز سے ان دنوں میں ان کی نقالی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں بھی معین الدین کی طرح کامیاب آدمی بنوں گا۔ اس لیے کہ اگرچہ میں ہیڈ آفس کا ملازم تھا مگر میں نے بزنس کرنا بھی شروع کردیا تھا۔ شام کا وقت فرصت کا ہوتا تھا اور میں نے اس کو استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا اور میں نے ویسا ہی کیا جس طرح معین الدین نے کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ای ایف یو کا سب سے قسمت والا اور خوش وخرم آدمی ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ ترقیاں نصیب ہوئیں۔ میں ایک معمولی ٹائپسٹ سے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچا۔ ترقی کی سیڑھیاں چڑھ کر میں نچلی منزل سے اوپر تک گیا ہوں اور یہی کامیابی میرے لیے اطمینان اور خوشی کا باعث ہے۔"

جس وقت مرزا فیض مجھے اپنی کامیابیوں کی داستان سنا رہے تھے، کاش اس وقت اس کتاب کے قاری وہاں موجود ہوتے۔ انھیں اس بات پر فخر محسوس ہو رہا تھا کہ ان سے اس کمپنی میں ان کی زندگی اور کارکردگی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا جسے وہ اپنے خاندان کے بعد سب سے اہم سمجھتے تھے۔ آپ ان کی آنکھوں سے فخر چھلکتا محسوس کر سکتے تھے جب وہ منزل بہ منزل اپنی ترقی کی باتیں بتا رہے تھے۔ دراصل کبھی کبھی جذباتی اور خوف زدہ بھی ہو جاتے تھے مگر وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ سیدھے راستے پر گامزن رہے ہیں۔ ان ہی جیسے لوگوں کی وجہ سے ادارے بڑے ہو کر اس مقام تک پہنچتے ہیں کہ دنیا کی نظروں میں آجاتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی بھی ادارے کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں اور اس کو زرخیز مٹی فراہم کرتے ہیں جس کی مدد سے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور ترقی ہوتی ہے۔

محمد حسین علوی

شہابِ ثاقب

ہم دونوں کی بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ تقریباً بیس برس قبل، ماربل آرچ اور کمبرلینڈ ہوٹل کے قریب بہت قریب، ہم روشن علی بھیم جی کی قیام گاہ ۲۵ ر پورچیسٹر پلیس لندن میں ملے تھے۔ Raynham، جہاں مسٹر بھیم جی اس زمانے میں رہا کرتے تھے جب کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس قائم تھی۔ اس پتے سے بہت تھوڑے فاصلے پر واقع ہے، پورچیسٹر پلیس جواب بھی بھیم جی خاندان کی ملکیت ہے۔

ستمبر ۱۹۹۹ء کی ایک خوب صورت صبح ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے مشترکہ دوست ابا علی یوسف نے، جنھوں نے بھیم جی خاندان کے فلیٹ کی نگہداشت کی از خود ذمے داری لے رکھی ہے، از راہِ مہربانی ہمارے لیے بسکٹ اور کافی کا انتظام کر دیا تھا تاکہ ہماری گفتگو گھریلو ماحول میں ہو۔ علوی سے میری ملاقات ۱۹۶۰ء سے تھی جب ہم دونوں ایسٹرن فیڈرل یونین میں اکٹھے کام کرتے تھے۔ ایک بار ہم پھر اس وقت رابطے میں آئے جب کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس گروپ کی لندن میں بنیاد رکھی گئی تھی اور علوی لندن میں جنرل منیجر بن کر آئے تھے۔ علوی آج بھی ویسے ہی توانا اور چاق چوبند دکھائی دیتے ہیں۔ دراز قامت، چہرے پر کھِلتی ہوئی وہی مخصوص دبی دبی سی مسکراہٹ جو مجھے ہمیشہ سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ کسی طرف دیکھنا تو اس طرح کہ ان کی نگاہ ہدف چہرے کا طواف کرتی ہوئی آنکھوں سے چند انچ پرے ہی رہے تاکہ آنکھیں چار نہ ہو جائیں۔ علوی جب کمرے میں داخل ہوئے تو ان کی محبت بھری گرم نظر بالکل ویسی ہی تھی اور ویسا ہی، بلا تصنع بالکل فطری اندازِ تخاطب۔ علوی مجھے آج بھی ویسے ہی لگے جیسے کہ اس وقت جب ۱۹۶۲ء میں انھوں نے ایسٹرن فیڈرل یونین برانچ منیجر کی حیثیت سے راولپنڈی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ مگر جب میں نے غور سے ان کے چہرے کا جائزہ لیا تو ان کی شان دار پیشہ ورانہ زندگی کے کچھ نئے اوراق بھی نظر پڑے جو ان کے جاذبِ نظر چہرے میں پیوست تھے۔ یہ وہی چہرہ تھا جس کو میں اپنے دوست مسٹر بھیم جی سے گفتگو کے دوران ای ایف یو کا شہابِ ثاقب کہا کرتا تھا۔

علوی مشرقی پنجاب کے اس حصے میں ۲۸ ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے تھے جو تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان کا حصہ بن گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے وقت علوی نے آرٹ میں داخلہ لیا ہی تھا کہ ان کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان کے شہر لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ علوی نے بی اے لاہور سے پاس کیا۔ یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔ علوی نے اس وقت تک اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی خاص منصوبہ نہیں بنایا تھا اور پاکستانی پنجاب کے نہر کے محکمے میں ملازمت کر لی تھی۔ مگر انھیں فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس قسم کی منشی گیری کے لیے نہیں بنے تھے۔ اس لیے دو برس بعد یہ ملازمت انھوں نے چھوڑ دی تاکہ کچھ اور مختلف نوعیت کے کام کر سکیں۔ اور پھر انھوں نے امریکن لائف انشورنس میں ایجنٹ بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اور لوگوں کی طرح یہ ان کے ایک قریبی دوست کا اثر تھا جس نے اس نئی کمپنی میں شمولیت اختیار کی تھی اور علوی کو اسی میں شمولیت کے لیے راضی کر لیا۔ علوی نے کہا، ”ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور اس نے مجھے اس لیے بہت زور دے کر اس کام کو شروع

کرنے کا مشورہ دیا تھا کہ میرے بہت سے لوگوں سے اچھے تعلقات تھے اور ایسے لوگ کامیاب انشورنس ایجنٹ بن سکتے ہیں اور بہت پیسے کما سکتے ہیں۔ میرے دوست نے مجھے پوری طرح باور کرادیا تھا کہ میں اس پیشے میں کامیاب رہوں گا اور ساتھ ہی ساتھ کچھ گر بھی سکھا دیے تھے۔ میں اس کی باتوں سے بہت متاثر ہو چکا تھا اور چوں کہ مجھے سفر کا اور لوگوں سے ملنے جلنے کا بہت شوق تھا تو میں نے سوچا کہ میں یہ کام اچھی طرح کرسکوں گا۔ اور پھر وہی ہوا۔ پہلے ہی دن سے میں کامیاب ہو گیا اور اس زمانے کے اعتبار سے میں بہت سارا پیسا کمانے لگا تھا۔''

اس زمانے میں امریکن لائف پاکستان کی سب سے پرانی اور بڑی انشورنس کمپنی ایسٹرن فیڈرل یونین کی حریف بن کر ابھری تھی اور صرف وہی کمپنی اپنے سیلز اسٹاف کو باضابطہ تربیت فراہم کرتی تھی۔ علوی اس کمپنی کے پیشہ ورانہ اندازِ کار اور جدید انتظامی اور سیلز کی تکنیک سے بہت متاثر تھے۔ ۱۹۵۴ء میں ایسٹرن فیڈرل یونین کے درخشندہ ستارے مسٹر وصال الدین نے، جو لائف ڈپارٹمنٹ کے سربراہ تھے، چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے امریکن لائف میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ اسی دوران علوی اپنی سیڑھیاں طے کر رہے تھے۔ جلد ہی وہ امریکن لائف کی سیلز ٹیم کے درخشندہ ستارے بن گئے۔ ان کو یونٹ منیجر بنا دیا گیا اور پھر سرگودھا میں برانچ منیجر کی ذمے داریاں سونپ دی گئیں۔

علوی نے امریکن لائف میں پورے دس برس کام کیا۔ ایک بار پھر ان کے ایک قریبی دوست نے ان کو اپنی زندگی کا ایک اور اہم فیصلہ کرنے پر اکسایا۔ وہ دوست کراچی میں مسٹر خدا بخش کے، جو وصال الدین کی جگہ لائف ڈپارٹمنٹ کے سربراہ بنے تھے، ہمسائے تھے۔ اگرچہ علوی بہت وسیع ذہن اور بڑے دل والے انسان ہیں مگر کسی بات پر ان کی امریکن لائف میں اپنے افسر سے ناچاقی ہوگئی تھی۔ انھیں خود بھی ایک غیر ملکی کمپنی میں کام کرنا ناپسند ہو چلا تھا۔ گویا حالات بدل رہے تھے اور علوی خود بھی پر تول رہے تھے کہ ان کے دوست مسٹر انصار حسین نے انھیں اپنے ہمسائے مسٹر خدا بخش سے ملنے کی دعوت دی۔ وہ دونوں خدا بخش سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات کے لیے گئے۔ کافی نوشی کے دوران ان کی طویل گفتگو رہی اور بالآخر علوی نے ای ایف یو کی راولپنڈی برانچ کی سربراہی سنبھالنے پر رضامندی ظاہر کردی۔ ای ایف یو کے مسٹر برکی جو فوج کے زیرِاثر اس شہر کے بہت تعلقات رکھنے والے آدمی تھے، چھوڑ کر جا چکے تھے اور کمپنی کو کسی ایسے آدمی کی سخت ضرورت تھی جو برکی سے زیادہ طاقت ور ہو۔ ۱۹۶۲ء کی یکم اکتوبر کو علوی، پاکستانی فوج کے ہیڈکوارٹر کے بیچوں بیچ، راولپنڈی منتقل ہو گئے جو ای ایف یو کے مستقبل کے لیے ایک اہم مقام بن چکا تھا۔ اس وقت تک راولپنڈی میں لائف ڈپارٹمنٹ کا کوئی دفتر نہیں تھا، بس جنرل ڈپارٹمنٹ کے دفتر میں ایک میز ڈال دی گئی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب میں علوی سے پہلی بار ملا تھا۔ علوی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اپنے تقرر کو درست ثابت کرنے کے لیے اور اپنا ایک الگ، وسیع اور جنرل ڈپارٹمنٹ سے کہیں زیادہ خوب صورت دفتر بنانے کے لیے دن رات ایک کردیں گے۔

اگرچہ مجھے اس وقت ان کی لاف زنی پر یقین نہیں آیا مگر میں علوی سے مل کر بہت متاثر ہوا تھا۔ مجھے احساس ہو چلا تھا کہ میری ہی عمر کا یہ خوش لباس، توانا اور محنتی نوجوان شاید وہ کچھ کر گزرے جس کے وعدے کر رہا ہے۔ اور پھر وہی ہوا کہ اس نے نہایت چالاک، پیشہ ورانہ انداز میں اور سرعت سے کامیابی کی منزلیں طے کرنی شروع کردیں۔

علوی نے کہا، ''جب میں نے ای ایف یو میں شمولیت اختیار کرلی تب احساس ہوا کہ ہمیں ملک کے اس حصے میں اپنا کاروبار نئے سرے سے شروع کرنا ہوگا۔ میں نے اپنی حریف کمپنیوں کے بہت سے کارکنوں کو ای ایف یو میں شمولیت پر تیار کرلیا اور اس طرح رفتہ رفتہ ہمارا کاروبار بڑھنے لگا۔ مجھے اپنا علیحدہ دفتر مل گیا اور سات آٹھ برس کے بعد میرا علاقہ ملک بھر میں سب سے زیادہ بزنس کرنے لگا۔ ابتدا ہی سے مجھے مسٹر خدا بخش اور مسٹر بھیم جی کی پوری پشت پناہی حاصل تھی۔ آپ سے پہلی ملاقات کے چند ہفتوں ہی بعد بڑے صاحب سے میری پہلی ملاقات نومبر ۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ اس کے بعد میری کئی اور بار بار ملاقاتیں ہوئیں۔ جب بھی وہ پنڈی آتے تو ہم دونوں ساتھ بہت وقت گزارتے۔ ہم دونوں طویل فاصلے چہل قدمی کیا کرتے اور اس دوران کمپنی کی اور اس کے کاروبار کی ترقی کے لیے باتیں کرتے۔ اپنی

مثبت سوچ اور بیمے کے طویل پس منظر اور بے مثال معلومات کے ساتھ وہ مجھے بہتر سے بہتر ہدف حاصل کرنے پر زور دیا کرتے تھے۔ لہٰذا رفتہ رفتہ میں نے اپنے علاقے کے ہر شہر میں دفتر کھولنے شروع کر دیے۔ ۱۹۶۳ء کے بعد سے ۱۹۷۲ء تک جب بیمہ قومی ملکیت میں لے لیا گیا، پورے ملک کے بیمے کی صنعت میں مجھ زیادہ آمدنی والا کوئی آدمی نہیں تھا۔''

ابتدا ہی سے ای ایف یو کے نئے سربراہ کے دل میں اس پنجابی نوجوان کے لیے پسندیدگی کے جذبات موجزن ہو گئے تھے جس نے خدا بخش کی طرح زندگی کے بیمے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ اپنی بے پناہ محنت اور سیلز کی فطری صلاحیت کی بنا پر علوی ذاتی کامیابی کی بلندیوں تک تیزی سے پہنچ گئے۔ انھیں راولپنڈی کا زونل منیجر بنا دیا گیا اور کمپنی کے لیے اپنی خدمات کے صلے میں ان کو سینئر وائس پریزیڈنٹ بنا دیا گیا۔

علوی سیلز والوں کی اس کھیتی کی پیداوار تھے جو مسٹر بھیم جی اپنے ادارے میں لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ بے حد بردبار، نرم گفتار اور مہذب انسان - علوی اپنی ذمے داریوں سے اچھی طرح واقف تھے اور انھیں دوسروں کو خوش رکھنے کا فن بھی آتا تھا۔ اپنے افسروں کا احترام کرنا اور ماتحتوں سے شفقت سے پیش آنا۔ لوگوں کی مدد کے لیے ہر وقت حاضر رہنا۔ ان سب خواص کو ملا کر علوی ایک بشاش شخصیت کے مالک تھے۔ ای ایف یو کے لیے وہ ایک مثالی کارکن تھے۔ ملک کے دارالحکومت اسلام آباد جہاں ملک کی ساری طاقتیں مجتمع تھیں اور عساکرِ پاکستان کے صدر مقام راولپنڈی کے جبروت کے درمیان علوی کمپنی کی خدمات کے لیے مستعد رہتے تھے۔

انھوں نے کہا، ''ہم واقعی بہت کامیاب تھے اور ہمارا اندازِ کارپوری طرح پیشہ ورانہ ہوتا تھا۔ اس دور میں کارکنوں کی تربیت اور ان کی صلاحیتوں کا بہترین استعمال ہی ہماری قابلِ ذکر کامیابیوں کی بنیاد تھے۔ ہمارے ساتھ ہر طرح کے لوگ تھے جس نے ہمیں صحیح معنوں میں طاقت ور بنایا تھا۔ مسٹر بھیم جی میں بہت سارے مختلف لوگوں کو یک جا رکھنے کی صلاحیت تھی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ذرا سوچیے تو کہ خدا بخش، کرنل بشیر، سبطِ حسن اور میں! مگر وہ سب سے رابطے میں رہ سکتے تھے اور سب کو مطمئن اور پُرسکون بھی رکھ سکتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے، بلکہ سب کچھ ان ہی کی دین ہے۔ جب بھی میں ان کے ساتھ چہل قدمی پر گیا وہ مجھے لیکچر دیتے رہتے تھے۔ پہلے کبھی ایسا میرے ساتھ کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے ان سے بہتر کوئی انسان نہیں دیکھا جو مختلف النوع لوگوں سے رابطے میں رہتا رہا ہو۔ انھیں فوراً معلوم ہو جاتا کہ کس کام کے لیے کس سے رابطہ کرنا ہے۔ ان کے اہم فوجی جرنیلوں، وزیروں اور سرکاری افسروں سے رابطے رہتے تھے۔ ہر ایک ان سے قربت کا خواہاں رہتا تھا۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر مالک، جسٹس ستار، ایس ایم یوسف یا عثمان علی جیسی سطح کے لوگ ان سے دوستی رکھنا چاہتے تھے، اور ایسے لوگ اپنی ذات میں انجمن ہوتے تھے۔

سارے گُروں سے بڑھ کر انھوں نے مجھے تعلقاتِ عامّہ کے گُر سکھائے تھے۔ وہ اس میں بہت ماہر تھے۔ ان کے دور میں ہماری کمپنی کے خلاف ایک بھی مضمون کسی اخبار میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ہم اس بات کا اہتمام کرتے تھے۔ یہ صرف ملک کے تمام اہم پبلشروں، ایڈیٹروں اور صحافیوں سے بھیم جی صاحب کے اپنے روابط اور ان کے مثبت طریقے سے استعمال سے ممکن ہوتا تھا۔ ہم نے راولپنڈی میں بھی ایک صحافی کو کل وقتی طور پر اپنا پبلک ریلیشنز افسر بنا رکھا تھا۔ اور میرے خیال میں اس سے ہمیں بہت فائدے ہوئے۔ کم از کم سال میں ایک بار مسٹر بھیم جی پریس کے تمام اہم ارکان کو لنچ یا ڈنر پر مدعو کرتے، ان کو بیمے کی صنعت کو درپیش مسائل سے آگاہ بھی کرتے اور ان سے توقع رکھتے کہ وہ لوگ ہمارے مسائل کو مثبت طور پر پیش کریں گے۔ ہمارا تعلقاتِ عامّہ کا محکمہ ہر سطح پر متحرک رہتا تھا، وہ ایڈیٹر ہوں یا معمولی درجے کے رپورٹر، مسٹر بھیم جی ان سب کے لیے ذاتی وقت بھی نکالتے تھے۔ الطاف گوہر سب سے زیادہ بااثر آدمی تھے جن سے بھیم جی صاحب برابر ملتے رہتے تھے۔ جب میں اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو بھیم جی صاحب کو اپنا اتالیق اور استاد پاتا ہوں۔ میں نے سب کچھ انھیں سے سیکھا تھا۔ کس طرح وہ ای ایف یو کو بنانا چاہتے تھے، کون سی نئی باتیں کرنا چاہتے تھے، وہ مجھے سب کچھ بتاتے رہتے۔ مجھے

اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اونچی آواز میں خود کلامی کرتے تھے تا کہ تمام سننے والے سن لیں کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں ان سے اتنا قریب تھا کہ ان کے مقرّب ترین لوگ بھی یہ سمجھتے تھے مجھے ان کے ہر وقت کی سوچ سے بھی واقفیت تھی۔''

بیسویں صدی کے چھٹے عشرے کے آخری برسوں میں بھیم جی صاحب مہینے میں کم از کم ایک بار دارالحکومت اسلام آباد ضرور جاتے تھے اور علوی صاحب ہی ان کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ مسٹر بھیم جی کی حرکات وسکنات کی منصوبہ بندی علوی ہی کرتے تھے، اس وجہ سے وہ اسلام آباد اور راولپنڈی کی مسحور کن سوسائٹی کے مقبول ترین انسان بن گئے تھے۔ چھٹے عشرے کے آخر تک ای ایف یو کے سربراہ اتنے اہم آدمی بن چکے تھے کہ ملکی معاملات میں فیصلے کرنے والے تمام لوگوں کے دروازے ان کے لیے ہمیشہ کھلے ہوتے تھے۔ اور علوی ای ایف یو افسر کے دیے ہوئے پتے بڑی خوبی سے کھیلتے تھے۔ اسی لیے ان کے بزنس میں بھی دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی تھی۔ دراصل وہ ای ایف یو کے دل فریب شہابِ ثاقب کا روپ دھار چکے تھے۔

علوی جو عمر میں بھیم جی صاحب سے گیارہ برس چھوٹے تھے، ایک طرح سے ان کے ہمزاد جیسے ہو گئے تھے جو نہ صرف ملک کے اعلیٰ ترین سرکاری اور فوجی افسران سے ان کے تعامل میں سائے کی طرح ان کے ساتھ ہوتے تھے بلکہ رائے ساز شخصیتوں اور پریس کے اہم لوگوں سے تعامل علوی کے اتالیق خود طے کرتے تھے۔

تعلقاتِ عامّہ کا ایک سب سے بڑا کام جو علوی کے سپرد ہوا تھا وہ ۱۹۶۹ء میں، جب ای ایف یو کی کامیابی اور شہرت کا سورج نصف النہار پر تھا، راولپنڈی میں کمپنی کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنا تھا۔ ادارے کی شہرت کی وجہ وہ انقلابی اقدام تھا جس کے ذریعے پاکستان کی فوج کا گروپ انشورنس کیا گیا تھا۔ اگر چہ یہ دھماکا ادارے کے کچھ اعلیٰ اور اہم افسران کی کوششوں اور منصوبہ بندی سے ممکن ہوا تھا مگر مقامی ہیرو کی حیثیت سے علوی کا اس میں بڑا ہاتھ تھا۔ ملک کے مرکزِ اقتدار کے بالکل بیچوں بیچ ایک بڑی عمارت کی تعمیر ایک خواب تھا جو علوی کے محبوب افسر نے دیکھا تھا اور علوی نے کوشش کی تھی کہ یہ کام دھوم دھام سے انجام پائے۔ افسوس کہ کچھ سرکاری رکاوٹوں کے باعث اس عمارت کی تعمیر شروع نہ ہو سکی اور ۱۹۷۲ء میں بیمے کو قومی ملکیت میں لیے جانے کی وجہ سے ادارے کی کامیابی کی داستان اور بہت سے نامکمل منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اور اس سانحے نے علوی کے حالات بھی بدل ڈالے۔

ملک کی سب سے بڑی اور بارسوخ انشورنس کمپنی کے سینئر وائس پریزیڈنٹ اور اس کے حاکمِ اعلیٰ کے سب سے اہم مددگار ہونے کے ناتے دس برس تک وہ مرکزِ نگاہ بنے رہے تھے۔ جو کچھ انھوں نے چاہا انھیں ملا، کامیابی، دولت اور اپنے اتالیق کا مکمل اعتماد اس حد تک کہ لوگ ان کو ادارے کے سربراہ کا سایہ سمجھنے لگے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس صنعت میں ان کے دوست کم اور حسد کرنے والے زیادہ تھے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں تھی کہ اسٹیٹ لائف کے قیام کے بعد صرف یہی واحد سینئر وائس پریزیڈنٹ تھے جنھیں کوئی عہدہ نہیں دیا گیا۔ کچھ تگ ودو اور کھینچا تانی کے بعد علوی نے اس صنعت ہی سے کنارہ کشی کرنے اور کوئی اور کاروبار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسٹیٹ کارپوریشن نے علوی کے خلاف کچھ مقدمات بھی بنا لیے تھے جن کا علوی کو سامنا کرنا پڑا تھا اور بہ دقّت تمام وہ ان سے باعزت بری ہو گئے۔ یہ تھا ایک شان دار قصے کا ایک افسوس ناک انجام!

اس وقت تک مسٹر بھیم جی لندن، دبئ اور سعودی عرب میں اپنے نئے منصوبوں کی تیاری میں مشغول ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے منصوبوں کے مشترک حصے دار جناب آغا حسن عابدی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مسٹر علوی کو لندن میں اپنے ساتھ رکھنا چاہیں گے۔ اور پھر یہی ہوا۔ علوی صاحب نے سعودی عرب، دبئ اور کویت کے معلوماتی دورے کیے اور ۱۹۷۴ء میں آخر میں لندن پہنچ کر CCI Holding کی بنیاد رکھنے میں مشغول ہو گئے۔ مسٹر علوی لندن میں قائم ہونے والی کمپنی کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کے جنرل منیجر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

ایک بار پھر لندن میں بھیم جی صاحب کے ساتھی کی حیثیت سے اس کمپنی میں علوی کے تقرر پر کسی کو حیرت نہیں ہوئی جو بدقت تمام

کاروبار شروع کرنے والی تھی۔ اس لیے کہ کمپنی کو ایک اچھی اور محنت کش فیلڈ فورس کی ضرورت تھی جس کے لیے، ای ایف یو کے طویل اور کامیاب تجربے کے باعث علوی سے بہتر کوئی فرد میسر نہ تھا جو نہ صرف ایک اچھا لیڈر تھا بلکہ خود ایک پیشہ ور سیلز مین رہ چکا تھا۔

اس لائف انشورنس کمپنی سے میرا تعلق مختلف پہلوؤں سے رہ چکا تھا۔ اور میں بار بار یہ کہہ چکا ہوں کہ یورپ اور جنوبی ایشیا کے مختلف ممالک میں ایک بڑی تارکِ وطن آبادی کی انشورنس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے آغا حسن عابدی، روشن علی بھیم جی اور ان کے معتمد ساتھیوں کی شراکت سے قائم کی جانے والی انشورنس کمپنیاں ایک اچھا خیال تھا اور ان کو کامیاب ہونا چاہیے تھا۔ میں ان جذبوں اور محنت کا چشم دید گواہ ہوں جو علوی، ابا علی یوسف اور بہت سے ایسے ساتھیوں نے لندن کی کمپنی ے بنانے میں صرف کیے تھے جس کے پاس بہت مختصر سی رقم تھی اور جس کا سارا ابتدائی کام بھیم جی صاحب کے Beatty House کے چھوٹے سے فلیٹ سے شروع ہوا تھا۔

علوی نے بہت دنوں بعد اپنی یادوں کو مجتمع کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ سب کچھ بہت بنیادی سطح پر شروع کیا گیا تھا۔ ہم میں سے کسی کو کوئی تنخواہ نہیں دی گئی تھی۔ بس مسٹر بھیم جی نے کہہ دیا تھا کہ زندگی گزارے کے لیے کم سے کم جتنی ضرورت ہو ہم لے لیا کریں اور اپنا کام جاری رکھیں۔ ہمیں صرف ایک جز وقتی سیکریٹری کی خدمات حاصل تھیں۔ مجھے دو سو یا تین سو پاؤنڈ کا اعزازیہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ بے شک مسٹر بھیم جی میرے اہلِ خاندان کے اخراجات کے لیے کچھ رقم راولپنڈی میں بھجوا دیا کرتے تھے اس لیے کہ وہ اس وقت تک راولپنڈی ہی میں مقیم تھے۔ ہماری کمپنی کے ایک بہت بڑا ادارہ بننے کے بہت امکانات تھے اور ایک دن یہ ہو بھی گیا تھا۔ مگر کچھ مسائل بھی تھے۔ بدقسمتی سے ہمیں بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کے نقش قدم پر چلنا پڑتا تھا۔ وہ ایک کامیاب ادارہ بن چکا تھا اور ہر کام ایک خاص معیار کے مطابق کرنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔ ہمیں چھوٹے پیمانے پر کام کرنا چاہیے تھا اور ہم اس کے لیے تیار بھی تھے۔ بجائے دوسرے اخراجات کے ہمیں اپنی انتظامیہ پر سرمایہ لگانا چاہیے تھا۔ ہمیں شہر کے مرکز میں عالی شان دفتر قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں بڑے بڑے مکانات اور آسائشوں کی ضرورت نہیں تھی جو ہم کو فراہم کی گئیں تھیں۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک کہ ہمارا ادارہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو جاتا۔ میں اپنے ساتھیوں سے کہا کرتا تھا کہ یہ ملک دکھاوے کا نہیں۔ اس میں جو لوگ واقعی بڑے مالدار ہیں وہ بھی ظاہر نہیں کرتے۔ اور مجھے معلوم تھا کہ ادارے کے باہر کے لوگ ہمارے شاہانہ انداز پر نکتہ چینی کرنے لگے تھے۔ مگر ہم لوگ یہ سب اس لیے کرتے تھے کہ آغا صاحب انشورنس والوں کو بھی اسی سطح پر دیکھنا چاہتے تھے جس پر بینک والے پہنچ چکے تھے۔ مگر بینک کے بہت سے اعلیٰ افسر انشورنس والوں کے اندازِ کار کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ سب بہت بڑے ہو چکے تھے اور بدقسمتی یہ تھی کہ وہ اپنے معاملات کو پیشہ ورانہ طور پر نہیں چلا رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ لالچی تھے، انھیں اپنے کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔''

ہمیں اب معلوم ہوا ہے کہ علوی صاحب کے بہت سارے مشوروں پر اس لیے عمل نہیں ہو سکا تھا کہ بینک کے سربراہ کے تصورات اور تھے۔ ان کا خواب تھا کہ پورا گروپ دنیا کے سب سے بڑے اور عالی شان اداروں میں سے ایک بن جائے اور وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے 'ایشیائی انداز' امیرانہ طریقے اپنانا چاہتے تھے جس کے ظاہر اور باطن میں بڑا تفاوت تھا۔ میرا خیال ہے کہ علوی اس بات سے بہت مطمئن تھے کہ بالآخر ان کے بہت سے تصورات CCL کے آخری مراحل میں مکمل ہو گئے تھے۔ یہ سب اس وقت ہوا جب وہ سعودی عرب کے شہزادے محمد الفیصل کی پیشکش پر، جن سے ان کے تعلقات پاکستان میں قیام کے دوران ہی استوار ہو چکے تھے، اس ادارے کو خیر باد کہہ کر جا چکے تھے۔ شہزادہ محمد نے اسلامی اصولوں کی بنیاد پر انشورنس کا تصور پیش کیا تھا اور علوی کو اس میں شمولیت کی پیش کش کی تھی۔ شہزادہ محمد نے علوی کو بتایا تھا کہ وہ گروپ کے چار عہدوں کے لیے جن صدور کی تلاش میں تھے وہ انھیں میسر نہیں ہو رہے ہیں۔ شہزادے نے ایک عہدہ علوی کو دینے کی پیش کش کی۔ اس ادارے کی مالیاتی بنیاد بہت مستحکم تھی۔ علوی نے انھیں اس نوعیت کے تمام اداروں کے بارے میں معلومات فراہم کیں جو اس وقت تک مہیا ہو سکتی تھیں۔ اگرچہ بظاہر علوی مسٹر بھیم جی کے ادارے سے الگ نہیں ہونا چاہتے

تھے تاہم انھوں نے اپنے اتالیق سے اس بات پر مشورہ کیا تھا اور آغا حسن عابدی صاحب سے بھی بات کی تھی۔ دونوں نے علوی سے کہا تھا کہ ''اگرچہ ہمیں یہ بالکل پسند نہیں کہ آپ ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں مگر ہم شہزادہ محمد اور ان کے ادارے سے اپنے بے مثال تعلقات برقرار رکھنا چاہیں گے۔ اگر آپ وہاں ہوں گے تو ہمارے لیے بھی کارآمد ہوں گے۔''

مسٹر بھیم جی، علوی اور ان کی ٹیم کی برسوں پر محیط رفاقت یکم اپریل ۱۹۸۲ء کو ختم ہوگئی۔ انھوں نے جنیوا میں شہزادہ محمد کے ادارے میں شمولیت اختیار کر لی اور جیسا کی ان سے توقع کی گئی تھی، اس ادارے کے لیے بہت بڑے کام کیے۔

محمد حسین علوی اپنے بال بچوں کے ساتھ اب لندن میں مقیم ہیں اور اچھے حال میں ہیں۔ وہ ایک فنانشل ایڈوائزر ادارے کے مالک ہیں اور، میری اطلاع کے مطابق، خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں۔ ستر کے پیٹے میں ہونے کے باوجود وہ اپنی عمر سے کم نظر آتے ہیں۔ جب وہ اپنے ای ایف یو کے ساتھیوں، خدا بخش اور بھیم جی وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

ہم سے رخصت ہوتے وقت انھوں نے کہا، ''میں اس بات پر بہت خوش ہوں کہ میں ای ایف یو کے حوالے سے اتنے بڑے لوگوں سے ملا ہوں۔ اور یہ بھی میری قسمت کا کھیل تھا کہ میں بھیم جی صاحب جیسے انسان سے ملا تھا جو میرے بزرگ دوست کا درجہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ہر طرح سے مجھے تیار کیا تھا۔ ان سے اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے قربت میری یادوں کا بہترین اور قابلِ فخر سرمایہ ہے۔ وہ زمانہ میری زندگی کا سب سے دل خوش کن دور تھا۔''

علوی برابر اپنے ملک جاتے رہتے ہیں۔ وہ بطورِ خاص اپنے ان تمام پرانے ساتھیوں سے ملاقات کرتے ہیں جن سے انھیں خصوصی قربت تھی۔ پرانے لوگ انھیں ان کی بے مثال پیشہ ورانہ مہارت، اپنے ادارے سے وفاداری کے لیے اور انشورنس کے آسمان کے ایک درخشندہ ستارے کے طور پر انھیں یاد کرتے ہیں۔

ابا علی یوسف

نگہبان

جب سے میری ان سے ملاقات ہے میں نے انھیں اس جگہ پایا جہاں ان کی ضرورت ہوتی۔ خدادا صلاحیت کے مالک ہمیشہ عملی طور پر مستعد، ایسے کہ مشکل سے مشکل معاملات میں بھی ان کی مدد رائگاں نہیں جاتی۔ جب ۱۹۷۳ء میں ان کے اتالیق مسٹر روشن علی بھیم جی نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور ملک سے باہر کچھ نئی انشورنس کمپنیاں بنانے کا منصوبہ تیار کیا تھا، مسٹر ابا علی یوسف ان تمام منصوبوں سے منسلک نظر آئے ہیں۔

اور انھیں سلسلوں سے ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے۔ ان دنوں بھیم جی صاحب سے متعلق تمام لوگ بس ایک دھن میں تھے کہ کس طرح ایک اعلیٰ درجے کی انشورنس کمپنی کی بنیاد ڈالی جائے۔ اور فضا میں بالکل اس طرح کا عالم تھا جیسے کہ شہد کی مکھیوں کا کوئی جھنڈ اپنی ملکہ کو تلاش کرنے میں مصروف ہو۔ مگر میرے دوست ایسے نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح پُرسکون اور اطراف کی ہلچل سے بے پروا رہتے۔ یہ ظاہر تھا کہ چوں کہ وہ برطانیہ میں کافی عرصے سے مقیم تھے، ان کے تجربے اور عملی مشورے آنے والی نئی ٹاسک فورس کے لیے بہت مفید تھے۔

بھٹو کی حکومت نے جب بینکوں کو قومی ملکیت میں لے کر لکھنؤ کے 'جادوگر' اور پاکستان کی بینکاری کے گرو آغا حسن عابدی کو یونائیٹڈ بینک سے محروم کردیا تو نتیجے میں انھوں نے اپنا بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس شروع کردیا۔ کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس میں سرمایہ انھیں کے ذریعے آرہا تھا۔ نئے ادارے کو چلانے کے لیے پاکستان میں انشورنس کے گرو مسٹر بھیم جی کو ای ایف یو کی انتظامیہ کے پرانے ساتھی، کچھ بارسوخ دوست اور ایک انشورنس کمپنی کی امداد اور کچھ خوش قسمتی کی ضرورت تھی۔ جو کچھ ہونے جارہا تھا وہ بالکل آسان لگ رہا تھا۔

مارچ ۱۹۷۵ء میں جب ساری کاغذی کارروائیاں مکمل ہوگئی تھیں اور کاروبار شروع ہوگیا تھا، اس وقت کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کا مستقبل بہت روشن دکھائی دے رہا تھا۔ سب سے پہلے جس افسر کی کمپنی میں سیکریٹری کی حیثیت میں تعیناتی ہوئی تھی وہ مسٹر ابا علی یوسف تھے۔ دراصل ابا علی یوسف مارچ ۱۹۷۳ء ہی سے ان لوگوں میں شامل تھے جو اس کمپنی کی داغ بیل ڈالنے کے لیے کام کررہے تھے۔ کمپنی کی ابتدا لندن کے ایک مہنگے ترین ہوٹل اور عظیم الشان 'ان آن دی پارک' میں ہوئی تھی جس کی صدارت آغا حسن عابدی صاحب نے کی تھی۔

ابا علی یوسف کا تعلق کاٹھیاواڑ سے تھا۔ جو مہاراشٹر کے علاقے بانٹوا کے قریب ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں وہ ۴/اپریل ۱۹۴۳ء کو ایک متوسط درجے کے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا خاندان میمن تھا اور ان کے والد کھانے پینے کی اشیاء کی تجارت کرتے تھے۔ تقسیمِ ہند کے اعلان کے ساتھ ہی ان کے اہلِ خاندان نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کرلیا اور کراچی آکر آباد ہوگئے۔ کراچی میں ان کا پہلا قیام

برنس روڈ پر رہا تھا۔ بعد میں وہ لوگ بولٹن مارکٹ منتقل ہو گئے، جو قمر ہاؤس سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ وہی قمر ہاؤس جو اُن کی ملازمت کے سلسلے میں بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ ان کے والد نے پھر سے اپنا کاروبار شروع کر دیا اور ساتھ ہی کھانے پینے کی اشیا بنانے والی صنعتوں کے ایجنٹ بن گئے تھے۔ نفری اعتبار سے ان کا خاندان بھی بڑا ہو گیا تھا، جیسا کہ ان دنوں ہوا کرتا تھا۔ ابا علی کے ایک بھائی اور پانچ بہنیں تھیں۔ ان کے والدین بچوں سے بہت محبت کرنے والے تھے۔ ابا علی کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اسکول کے زمانے میں وہ والی بال کھیلا کرتے تھے۔ ابا علی ایک اچھے طالب علم تھے۔ میٹرک اور بی کام کرنے کے بعد انھوں نے اوّل درجے میں مسلم لا کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۰ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد ابا علی نے اپنی تعلیم اور والدین کی مدد کی خاطر ملازمت تلاش کرنی شروع کر دی تھی۔ انھیں مسٹر روشن علی بھیم جی نام کے ایک صاحب نے اپنے دفتر میں ٹائپسٹ کی ملازمت کی پیش کش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ابا علی کے افسر غیر ملکی انشورنس کمپنیوں کی نمائندگی بھی کرتے تھے اور ان کے ایجنٹ بھی تھے۔ ان کا ایک ادارہ پاک انڈر رائٹر کے نام سے قائم تھا، ساتھ ہی کچھ چھوٹے چھوٹے صنعتی کارخانے بھی کام کرتے تھے۔ یہ تمام ادارے سب ایک چھتری تلے کام کرتے تھے جس کے منتظم مسٹر بھیم جی تھے۔ ان کا دفتر میکلوڈ روڈ پر اورینٹل بلڈنگ میں تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ان کے بھائی مسٹر اکبر علی بھیم جی کا انکم ٹیکس کا کاروبار اور ایک معزز آڈٹ کا ادارہ بھی تھا۔ اوّل درجے میں ایل ایل بی کرنے کے بعد ابا علی کا بھیم جی صاحب سے پہلی بار رابطہ ہوا تھا۔ اگر چہ وہ بھیم جی صاحب کے دفتر میں کافی دنوں سے کام کر رہے تھے مگر انھیں دور ہی دور سے دیکھتے رہے تھے، ان سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ ابا علی نے چالیس برس بعد مسٹر بھیم جی کے لندن فلیٹ پر مجھ بتایا کہ ''امتحان میں کامیابی کے بعد پہلی بار مسٹر بھیم جی نے میرے مستقبل کے بارے میں بات چیت کرنے کے لیے مجھے اپنے گھر پر مدعو کیا تھا۔ وہ ابا علی کی تعلیمی کامیابی پر بہت خوش تھے۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں واقعی اب ان کے ادارے میں نہیں رہ سکوں گا اس لیے کہ میرا ارادہ لندن جا کر بیرسٹری کرنے کا تھا۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہوئے اور میری کامیابی کی خوشی میں ایک لفافے میں رکھ کر کچھ رقم دی اور مجھ سے کہا کہ میں ان سے کھل کر اپنے مستقبل کے بارے میں بات کروں۔ میں نے انھیں بتایا کہ ایک ادارے نے مجھے لندن جا کر بیرسٹری کرنے کے لیے مالی امداد کا وعدہ کر لیا ہے۔ مسٹر بھیم جی نے، جو اس وقت تک ایسٹرن فیڈرل یونین کے سربراہ بن چکے تھے، مجھے دوسرے امکانات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے بہتر ہوگا کہ میں ایگزیکٹو آفیسر کی تربیت لے کہ ای ایف یو کی لندن شاخ میں چلا جاؤں۔ ان امکانات کے پیشِ نظر میں نے بیرسٹری کرنے کے بجائے انشورنس کے شعبے ہی میں اپنا مستقبل بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے اور ان دنوں ہر طرف ای ایف یو کا چرچا تھا۔ پاکستان میں لائف انشورنس کے تناظر میں ای ایف یو اور انشورنس گویا ایک ہی نام تھے۔ مجھے اس فیصلے پر کوئی افسوس نہیں۔ میں نے قمر ہاؤس میں واقع ای ایف یو کے صدر دفتر میں شمولیت اختیار کر لی، چھ ماہ تک تربیت حاصل کی اور پھر کمپنی کے لندن دفتر میں کام کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس زمانے میں برطانیہ میں لائف انشورنس کے حوالے سے صرف اسی کمپنی کا دفتر قائم تھا۔ EFU Agencies نام کے اس دفتر کے منیجر مسٹر علی تھے اور میں ان کا نائب تھا۔ اس کمپنی کے دو انگریز ڈائریکٹر تھے جن کا تعلق ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کمپنی میسرز لٹل جان سے تھا۔ ان میں سے ایک کا نام مسٹر جان پال تھے جو مسٹر بھیم جی کے دوست بن گئے تھے اور بعد میں یہ کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کے بھی ڈائریکٹر ہو کر آپ کے بھی ساتھی ہو گئے تھے۔ وہ ہم سب پر بہت مہربان تھے اور بالخصوص مجھ پر جب میں اسسٹنٹ منیجر بن کر ای ایف یو کی لندن شاخ میں کام کر رہا تھا۔ مسٹر علی کی ریٹائرمنٹ کے بعد دفتر کی ذمے داری مجھ پر آ گئی اور میں اس وقت تک اس عہدے پر رہا جب ۱۹۷۲ء میں زندگی کے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور حکومت نے اس دفتر کی ملکیت بھی سنبھال لی۔ اس وقت ہی مجھے معلوم ہوا کہ آدم جی اور کچھ دوسری کمپنیاں بھی کچھ لوگوں کے ذاتی پتے سے برطانیہ میں کاروبار کر رہی تھیں مگر ان میں سے صرف ای ایف یو ہی باقی رہ سکی تھی اور اسٹیٹ لائف نے اپنے ایک آدمی کو اس کے سربراہی کے لیے متعین کیا تھا۔ اس طرح میں ایک بار پھر اس کا ماتحت بن گیا۔ ہمارا دفتر لندن کے ویسٹ اینڈ میں واقع

گولڈن اسکوائر میں تھا جو میرے عظیم اتالیق مسٹر جان پال کے دفتر سے بہت قریب تھا۔ جان پال نے بہت کوشش کی تھی کہ پاکستان کی حکومت ہمارے دفتر پر قبضہ نہ کر سکے مگر بدقسمتی سے ہمیں کامیابی نہیں ہوسکی۔ میں ایک برس کے لگ بھگ اس دفتر میں اس وقت تک کام کرتا رہا جب تک کہ مسٹر بھیم جی نے مجھے آغا صاحب اور بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کی ملکیت لائف انشورنس کمپنی کی بنیاد رکھنے کے لیے طلب نہیں کرلیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے قابلِ اعتماد دوستوں، میونخ ری، جان پال اور ڈیوڈ ڈاؤلن کو، جو لائیڈز آف لندن کے ایک مشہور بروکر تھے، اس نئے ادارے میں شریک کرلیا۔

ہمارا پہلا دفتر BCCI کی سٹی آف لنڈن کی شاخ واقع مارک لین میں قائم ہوا جو بینک کے صدر دفتر Leadenhall Street سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس دوران ای ایف یو کے درخشندہ ستارے اور مسٹر بھیم جی کے بااعتماد ساتھی مسٹر علوی جنرل مینیجر بن کر شامل ہو گئے۔ انھوں نے سب سے پہلا کام سیلز کے لوگوں کی بھرتی کا شروع کیا۔ ہم لوگ بہت پُر امید اور جذباتی ہو رہے تھے۔ یہ ایک بالکل نئے ماحول میں ای ایف یو کی نشاۃِ ثانیہ کے مماثل لگ رہا تھا۔ بالکل مختلف ماحول ہونے کی وجہ سے اس بات کے امکانات تھے کہ ہم سے غلطیاں ہوں گی مگر ہمارے نڈر راہنما مسٹر بھیم جی ایک چٹان کی طرح جمے رہے اور جب بھی ہم میں سے کوئی مایوسی کا شکار ہوتا دکھائی دیتا تو وہ خوش دلی اور مزاح سے مایوسی کی فضا کو صاف کردیتے۔ ان کی ہمت قابلِ داد تھی، اور اپنی کامیابی کا ان کو پورا یقین تھا۔ اور شروع ہی سے ہمیں Viscount of Brentford جیسی بارسوخ کی شخصیت کی مدد حاصل تھی۔ لندن کے مالیاتی مرکز میں ان کا بڑا مقام تھا اور وہ ہماری نئی کمپنی کے چیئرمین بن گئے تھے۔ ان کے بیٹے بیرسٹروں کی ایک معروف کمپنی Joyson & Hicks کے ساتھ وکالت کرتے تھے۔ مسٹر بھیم جی اور ان کے تصورات پر اپنا اعتماد ظاہر کرتے کے لیے انھوں نے ہماری کمپنی کے کچھ حصص بھی حاصل کر لیے تھے۔ ہمارے پہلے ایکچوری مسٹر Amit De تھے جنھوں نے ہماری بہت مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ ہمیں آغا حسن عابدی کے بینک کی مالی پشت پناہی حاصل تھی جو Financial Times کے مطابق برطانیہ کا سب سے تیز رفتار ترقی کرنے والا ادارہ بن چکا تھا جس کی کامیابی سب پر اچھی طرح واضح تھی۔ لندن میں اس کی شاخیں کھلتی جارہی تھیں اور اس کی کامیابی ایک ناقابلِ شکست داستان بن رہی تھی۔ ہر ایک آگے بڑھنے پر تیار نظر آتا تھا۔"

اور جب میں ان کی پالیسی ساز مشاورت میں شرکت کے لیے میونخ سے لندن آیا تو صاف نظر آرہا تھا کہ ای ایف یو کی روایتی پہلکاری کے جذبات پوری طرح برانگیخت ہو چکے ہیں، گویا پرانی ای ایف یو دوبارہ زندہ ہوچکی ہے اور ایک نیا دور انگڑائی لیتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اکثر آغا علی مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے ہوائی اڈے آیا کرتے اور بہت ساری خبروں سے مجھے آگاہ کرتے۔ اس کمپنی کی اُس ٹیم میں آغا علی کا کردار بہت اہم تھا جو اپنے Leadenhall Street کے ساتھیوں جیسی کامیابیوں کے خواب دیکھ رہے تھے، حالاں کہ بہت جلد یہ واضح ہوگیا تھا کہ بینک کے اعلیٰ افسران انشورنس کمپنی کے اپنے بھائیوں کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے اور ان لوگوں کو کسی حد تک شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ ان لوگوں کو اپنے مقابلے میں کمتر درجے کی مخلوق اور اپنی کامیابیوں کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اب ہم ماضی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ اپنی گوناگوں کمزوریوں کے باوجود، اگر ان کا بینک دیوالیہ نہ ہو جاتا تو، یہ نام نہاد 'انشورنس والے' بالآخر کامیاب ہوجاتے۔

اپنے ساتھیوں کے برخلاف آغا علی یوسف ان تمام مسائل سے، جو براہِ راست کمپنی کے ڈھانچے پر اثر انداز ہو رہے تھے، ابتدائی دور کے معاملات اور سرکاری محکموں کے دخل سے پیدا ہوئے تھے، عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کمپنی سیکریٹری ہونے کے ناتے کمپنی کے معاملات کی نبض پر ان کا ہاتھ ہوتا تھا اور وہ کمپنی کے سربراہ سے بھی ہمیشہ رابطے میں رہتے تھے۔ اور تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ کمپنی کے مستقبل کے بارے میں کبھی شبہے میں نہیں رہے۔ سب کی طرح وہ بھی اپنے افسرِ اعلیٰ کی جادوئی انگلیوں کے کمالات پر یقین رکھتے تھے جو

مشکل سے مشکل سوالات کے جوابات اور طاقت ور ترین ساتھیوں کو یکجا رکھنے میں کمال رکھتی تھیں۔ اور مسٹر بھیم جی کی جگہ پر جو بھی آتا اُسے کمپنی سیکریٹری مسٹر یوسف پر اعتماد کرنا پڑتا تھا اس لیے کہ وہ تمام مختلف طاقتوں سے بیک وقت تعلقات استوار رکھتے ہوئے بھی کمپنی کے لوگوں کے باہمی تناؤ سے دور رہتے تھے۔ اختلاف اور دشمنی ان کی فطرت ہی میں نہیں تھی۔ ایک بار انھوں مجھ سے خود کہا تھا کہ وہ اپنے افسرِ اعلیٰ کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے ہیں ''جو ہمیشہ ہر ایک کو، خواہ وہ دفتری کارکن ہو، سیلز کا آدمی ہو یا ان کا اپنا ذاتی ملازم، ان سب کو ایک بڑے اور پیارے خاندان کے افراد کی مانند سمجھتے تھے۔ اور ہر ایک کو یہ محسوس ہو جاتا تھا۔ ای ایف یو کمپنی کی طرح نہیں بلکہ ہمیشہ ایک خاندان کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ اور ہم نے اسی قسم کا احساس اپنی نئی کمپنی میں اجاگر کیا تھا۔ ہمیں کبھی کمپنی کے ملازم ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے ہمیشہ ایسا ہی سمجھا گویا یہ کمپنی ہماری ملکیت ہو۔ ہمارے خاندان کے سربراہ بلا کسی تفریق کے ایک باپ کی طرح ہماری ذاتی ضروریات کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اس کے لیے میں اپنی ذاتی مثال پیش کروں گا۔ جب لندن کی ای ایف یو ایجنسی کو اسٹیٹ لائف نے قبضے میں لے لیا تھا اس وقت میں اپنا پہلا مکان خریدنے کے معاملات طے کر رہا تھا۔ اور میں نے اپنے افسر اور اسٹیٹ لائف کے ڈائریکٹر سمیع الحسن صاحب کو اسٹاف قرض کے لیے ایک درخواست روانہ کی تھی، سمیع الحسن صاحب جو اکچوری ہیں اور ایک نفیس انسان۔ میری درخواست اس لیے رد کر دی گئی کہ درخواست گزار ملک سے باہر قیام پذیر تھا اس لیے اس کو منظور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مکان کا سودا ٹوٹنے والا تھا کہ مسٹر بھیم جی کو خبر ہوگئی۔ حالاں کہ ان سے میرا کوئی سرکاری سلسلہ نہیں رہ گیا تھا مگر انھوں نے مطلوبہ رقم مجھے اپنی جیب سے ادا کر دی۔ میں نے ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا نہ ان سے قرض کا طلب گار ہوا تھا پھر بھی اطلاع ملتے ہی انھوں نے از خود میری امداد کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ انھوں نے اس قرض کی رقم کی واپسی قبول بھی کی تھی یا نہیں۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ انھوں نے میری بر وقت امداد کی تھی اور میں اپنے اہلِ خاندان کے لیے اپنا مکان خریدنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اور اس پہلے مکان ہی کہ وجہ سے میں مستقبل میں ایک خاصا بڑا مکان خریدنے کے قابل ہوا تھا جو نہ صرف مہنگا تھا بلکہ نسبتاً ایک اچھے علاقے میں واقع تھا۔ آج میں جو بلا کسی قرض کے ایک اعلیٰ درجے کے مکان کا مالک ہوں یہ ان کی دریا دلی اور مہربانی ہی کی بدولت ممکن ہوا تھا۔ وہ ہم لوگوں کے دلوں میں اس قسم کے جذبات پیدا کرتے تھے اور میرا خیال ہے کہ وہ اس میں کامیاب رہے تھے۔''

مسٹر یوسف کی اور نہ ہی CCL کی انتظامیہ کے دوسرے کرداروں کی کم زوریوں کی وجہ سے اس کمپنی کو فروخت کرنا پڑا تھا، جو برطانیہ میں مقیم تارکینِ وطن میں تیزی سے قبولیت حاصل کرتی جا رہی تھی۔ در اصل یہ سب کچھ BCCI کے زوال کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں نے اس افسوس ناک واقعے کے سلسلے میں تفصیل سے کسی اور باب میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ مسٹر یوسف کو نئی انتظامیہ کے ساتھ کام کرنے کی پیش کش کی گئی تھی جس پر کچھ دنوں انھوں نے عمل بھی کیا تھا۔ ان دنوں مسٹر طاہر ساچک، جو اب کراچی میں ای ایف یو کے کامیاب سربراہ ہیں، مسٹر یوسف کے رفیقِ کار تھے۔ بعد میں مسٹر یوسف نے لندن میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اب رئیل اسٹیٹ اور فنانشل سروسز کے میدان میں ان کا خاصا اچھا کاروبار ہے۔ اکثر وہ مسٹر علوی سے مل کر بھی کچھ کام کرتے ہیں جو ریٹائر ہونے کے بعد خود مختار مشیرِ مالیات کی حیثیت سے ان دنوں کاروبار کر رہے ہیں۔ مسٹر یوسف کہتے ہیں کہ انھیں کسی بات پر افسوس نہیں۔ وہ اب بھی بہت محنتی انسان ہیں، اپنے ماضی کی یادیں اپنے دل میں بسائے ہوئے ہیں اور آج بھی ان کے دل میں اپنے مرحوم افسر کی محبت جا گزیں ہے۔ مسٹر یوسف آج بھی بھیم جی خاندان کے فلیٹ کی نگہبانی کرتے ہیں جس کے ناتے سے ان کا ای ایف یو خاندان سے آج بھی رشتہ قائم ہے۔ جب پاکستان میں ای ایف یو کی نئے سرے سے بنیاد رکھی جا رہی تھی تو مسٹر بھیم جی نے مسٹر یوسف کو اس کمپنی میں شمولیت کی پیش کش کی تھی اور اگر وہ چاہتے تو اس میں اعلیٰ عہدہ حاصل کر سکتے تھے مگر چوں کہ وہ اور ان کے اہلِ خانہ برطانیہ میں رچ بس چکے تھے اور ان کی جڑیں گہری ہوگئی تھیں اس لیے انھوں نے اس کے خلاف فیصلہ کیا۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ سب انگلستان ہی

میں بس گئے ہیں۔ وہ خود لندن میں رہتے ہیں۔ ان کی بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے، اس کے دو بیٹے ہیں اور وہ برمنگھم میں رہتی ہے۔ اس طرح برطانیہ مسٹر یوسف کے خاندان کا مرکز بن چکا ہے۔ انھوں نے بادلِ ناخواستہ اپنی دل سے عزیز کمپنی کو چھوڑا تھا جس میں انھوں نے پینتیس برس تک کام کیا تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے اس کو یاد کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مرحوم افسر سے جو کچھ سیکھا تھا اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بہت لگن سے اپنی میمن برادری کے لیے کچھ سماجی کام بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اپنے سماجی ادارے کی پچیسویں سالگرہ منانے کی تیاریوں اور ایک مجلّے کی اشاعت کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ اس ادارے کے لیے ان سے بہتر کوئی کارکن نہیں مل سکتا تھا۔ میں اپنے طویل عرصے کے تجربے کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے ادارے کے لیے بہترین خدمات انجام دے سکتے ہیں اور اس سے لطف بھی اٹھا سکتے ہیں۔ اور وہ سارے کام اپنے انداز میں بڑی خاموشی اور لگن سے کرنے کے عادی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے ادارے کے لیے ضروری مواد مہیا کرلیں گے اور ادارے کی کارکردگی پر ایک توصیفی رپورٹ تیار کرلیں گے۔ اور شاید انھیں یاد ہوگا کہ ایک مشہور ادیب نے کبھی لکھا تھا، ''مٹی کھودنے سے بھلا کیا فائدہ اگر آپ اس سے کوئی کام کی چیز نہیں بناتے۔ یعنی اینٹیں، جس کی مدد سے کوئی خوب صورت تخلیق یا ایک اچھا مستقبل تعمیر ہو سکے۔''

اور اگر انھوں نے یہ خوب صورت الفاظ نہیں پڑھے ہیں تب بھی مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ان کو ایجاد کرلیں گے اس لیے کہ وہ ہمیشہ مہربان رہنے اور خدمت کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

محمد فصیح الدین

ایک تیکنیکی ضمیر

یہ ان باقیاتِ الصالحات میں سے ہیں جو کسی زمانے میں مجھ سے بہت قریب رہے تھے۔ فصیح نے ای ایف یو کی تاریخ کے اوراق خود تحریر کر لیے ہیں اس لیے مجھے ان کے تعارف کی زیادہ ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ تاریخ کے اوراق میں اس لیے رہیں گے کہ وہ اس پہلی کھیپ میں سے ہیں جو ایگزیکٹیو آفیسر اسکیم کے تحت بھرتی کیے گئے تھے۔ اگر یہ ادارہ خود اتنا قدیم اور مشہور نہ ہوتا تو شاید اس اسکیم کی بنا پر ملک میں ضرور مشہور ہو جاتا۔

ادارے کی نئی انتظامیہ نے جہاں اس کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کے سلسلے میں بہت سے کام کیے تھے وہیں اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے اس کو جدید اندازِ کار سے لیس ایسے نوجوان افسروں کی ضرورت ہوگی جو اس کا مستقبل سنوارنے میں مدد فراہم کر سکیں۔ لہٰذا ایک ایگزیکٹیو افسر منصوبہ بنایا گیا جو نئی انتظامیہ کا سب سے اہم اور دور رس کارنامہ تھا۔ شرافت والا جاہی نے کہا، ''اس کے ذریعے واقعی ایک نئی تاریخ رقم کی گئی تھی۔ یہ ایک کاروباری ادارہ تھا اور اس بات کا بہت امکان تھا کہ اعلیٰ سرکاری افسروں کے بیٹے، بھتیجے اور بھانجے اعلیٰ عہدوں پر متعین ہونے کے لیے اس میں بھرتی کر لیے جاتے۔ مگر کمپنی یہ کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے وہ لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کی بنیاد پر رکھنا چاہتی تھی۔ اور میں اس بات کا گواہ ہوں اس لیے کہ میں ہی اس منصوبے کا سیکریٹری تھا۔ ہم نے اس کے لیے اخبارات میں اشتہار دیے اور پورے ملک سے سیکڑوں کی تعداد میں درخواستیں موصول ہوئیں۔ ہم نے درخواست گزاروں کا تحریری امتحان لیا اور منتخب افراد سے بالمشافہ گفتگو بھی کی۔ ہم نے دو سیلیکشن بورڈ ترتیب دیے تھے۔ پہلے بورڈ کے سربراہ معروف ماہرِ تعلیم جناب یو کرامت تھے جو آکسفرڈ کے پڑھے ہوئے اور پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ بات چیت میں بھی نہایت نفیس اور خوش مزاج انسان تھے۔ مسٹر بھیم جی کی ان سے واقفیت تھی اور انھیں نے ان کا نام پیش کیا تھا۔ ہم لوگ پورے ملک میں گئے اور کراچی، لاہور، پشاور اور مشرقی پاکستان میں لوگوں کے انٹرویو کیے اور امیدواروں کو منتخب کیا تھا۔ کتنا اعلیٰ درجے کا سیلیکش بورڈ بنایا گیا تھا جس نے آخری انٹرویو کیے تھے؟

سیلیکش بورڈ کے چیئرمین کمپنی کے چیئرمین جناب عباس خلیلی تھے۔ جو خود بھی ایک اعلیٰ درجے کے دانشور تھے۔ وہ نہ صرف سینئر ICS افسروں میں سے ایک تھے بلکہ بلا شبہ پاکستان کے اعلیٰ ترین سرکاری افسروں میں سے ایک تھے۔ سیلیکشن بورڈ کے دوسرے ارکان میں جناب سعید احمد شامل تھے جو اس وقت اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ڈپٹی گورنر تھے اور جسٹس ستار جو سپریم کورٹ کے جج تھے۔ ان کے علاوہ مسٹر بھیم جی اور میں بھی بورڈ کے سیکریٹری کی حیثیت سے اس میں شامل تھا۔ پاکستان جیسے ملک کے لیے یہ اسکیم تہلکہ خیز تھی۔ میں یہاں یہ بات دُہرانا چاہوں گا کہ ہر وہ شخص جو اس اسکیم کے تحت بھرتی ہوا تھا نہ ہی مسٹر بھیم جی نہ سیلیکشن بورڈ کے کسی رُکن کا عزیز تھا۔ جن لوگوں نے درخواستیں دی تھیں سب اچھے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ ان دنوں ای ایف یو کی ساکھ اتنی بڑھ چکی تھی کہ لوگ سرکاری ملازمتوں

کے بجائے اس ادارے میں کام کرنے کو فوقیت دیتے تھے۔ واقعی ہمارے گاہک ایسے ہی تھے ہم جن کی تلاش میں ہوا کرتے تھے۔ اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کافی حد تک ہماری کامیابی ہمارے جنرل منیجر اور چیئرمین کی دور رس پالیسیوں پر منحصر تھی۔''

واقعی یہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔ یہ اسکیم نئی انتظامیہ کی ابتدا کے دو برس بعد شروع ہوئی تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، کمپنی کی ساکھ بہت گر چکی تھی۔ اور یہ سب کچھ صرف دو برس کے عرصے میں تبدیل ہوگیا تھا۔ آج کل مسٹر فصیح الدین چیف ایگزیکٹو کے دو نائبین میں سے ہیں۔ یہ ان چار افسران میں سے ہیں جو پہلی کھیپ میں بھرتی کیے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی ملازمت ۱۵ر جنوری ۱۹۵۴ء میں شروع کی تھی۔ میں نے پینتیس برس بعد، اس مقام پر جہاں سے چند گز کے فاصلے پر انھوں نے اپنے پہلے چند روز میری سربراہی میں گزارے تھے، ان سے سوال کیا کہ آپ نے اس ملازمت کے لیے درخواست کیوں دی تھی؟ ان کا جواب تھا:

''جس وقت اس اسکیم کا اشتہار اخبار میں شائع ہوا تھا میں بینک آف بہاولپور میں ملازمت کر رہا تھا۔ میری تنخواہ اس مشاہرے سے کہیں زیادہ تھی جو اس اسکیم میں دی جانے والی تھی۔ مجھے سات سو روپے اور آنے جانے کے اخراجات ملتے تھے جب کہ ای ایف یو پانچ سو روپے دینے والی تھی۔ اس میں بہت فرق تھا اور اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے درخواست دینے کا فیصلہ کیا اس لیے کہ میں اس اسکیم کے اشتہار سے بہت متاثر ہوا تھا۔ بالخصوص اس لیے کہ کامیاب ہونے والے درخواست گزاروں کو سمندر پار تربیت کے لیے بھیجا جانے والا تھا۔ مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ سمندر پار کے ملکوں میں ہندوستان کا بھی شمار ہونا تھا، اس لیے کہ لوگ ان دنوں تربیت کے لیے امریکا یا برطانیہ بھیجے جاتے تھے۔ حالاں کہ میں اس ادارے کی مالی مشکلات کے بارے میں سن چکا تھا مگر سیلیکشن بورڈ میں شامل افراد نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ سب بہت معروف شخصیات تھیں اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اس ادارے کا مستقبل اچھا ہوگا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ اتنی اہم شخصیات کی موجودگی میں کوئی بھی اپنے رسوخ استعمال نہیں کر سکے گا۔ اور پھر انٹرویو کے دوران ہم سب کو بہت احترام دیا گیا تھا۔ میرے نزدیک تنخواہ میں اتنی بڑی کٹوتی لے کر اپنا مستقبل سنوارنے کی کوشش کرنا ہی ہمارے حق میں بہتر تھا۔ اور نیو انڈیا انشورنس بمبئی میں اپنی تربیت کے دوران مجھے احساس ہوا کہ ہمارا یہ فیصلہ کیا اچھا فیصلہ تھا کہ ہم اپنے جیسے ماحول کے لوگوں ہی کے درمیان تربیت کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اور پھر جس قسم کی تربیت ہمیں دی گئی ہم اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ ان کی تربیت گاہ میں پوری دنیا سے لڑکے آئے تھے۔ تربیت کا یہ ادارہ بڑی مہارت سے چلایا جا رہا تھا جہاں سارا زور تربیت ہی پر تھا۔ اس کمپنی کے اپنے نوجوان بھی اسی قسم کی تربیت حاصل کر رہے تھے جیسی کہ ہمیں دی جا رہی تھی۔ ہم سب ایک ہی جتھے میں تھے۔ اور آج تقریباً سب ہی ہندوستان کے انشورنس کی صنعت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔''

فصیح ۱۲ر مئی ۱۹۳۷ء کو مرکزی ہندوستان کی ریاست اندور میں پیدا ہوئے تھے جس کا حاکم ایک ہندو راجا تھا اور جہاں کی آبادی میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا اس وقت فصیح کی عمر صرف دس برس تھی۔ ان کے والد ہندوستان کی سرکاری ملازمت میں تھے اور انھوں نے ہندوستان ہی میں قیام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہاں کا حاکم بہت روشن خیال انسان تھا اور تمام تر کوششوں کے باوجود بھی دونوں بڑی قوموں کے درمیان مذہبی آویزش کو روکا نہیں جا سکا۔ لہٰذا، فصیح کے والد نے عارضی طور پر مسلم ریاست بھوپال چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر جب تناؤ بڑھنا شروع ہوا تو پاکستان منتقل ہو جانا ہی بہتر سمجھا گیا۔ اسی دوران فصیح کے والد کو Forbes, Forbes, Cambell & Company میں ملازمت مل گئی جو دوسرے کاروبار کے ساتھ ساتھ بہت ساری جہاز راں کمپنیوں کے ایجنٹ بھی تھے۔ اور یہ ملازمت کراچی کے لیے تھی۔ اس لیے ان کے اہلِ خاندان نے نے ۳۰ر مئی ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے لیے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ فصیح کہتے ہیں کہ ''مجھے یہ تاریخ اس لیے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن ہم اپنی زندگی کے ایک بہت اہم اور خطرناک موڑ پر تھے۔ جب ہم نے پاکستان کے سفر شروع کیا تو ہمیں بمبئی جانے کے گاڑی بدلنے کے بیچ کے ایک اسٹیشن پر انتظار میں ٹھہرنا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ میرے والد

دوڑتے ہوئے ہماری طرف آئے۔ وہ بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔اور پھر انھوں نے ہمیں بتایا کہ ابھی ابھی گاندھی جی کو گولی ماردی گئی ہے۔ میرے والد کا سانس پھول رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے کہ ریلوے اسٹیشن کے آس پاس کے تمام ہندوؤں نے کہا ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کو فوراً قتل کردیں گے۔اور پھر خوش قسمتی سے آل انڈیا ریڈیو سے اعلان ہوگیا کہ جس نے گاندھی جی کو قتل کیا ہے وہ مسلمان نہیں تھا، یہ اس کے برعکس تھا جیسا کہ پہلے لوگ سمجھ رہے تھے۔ پندرہ منٹ کے بعد ہی ریڈیو نے بتایا کہ دائیں بازو کی سیاست کرنے والے ایک نوجوان ہندو نے گاندھی جی پر گولی چلائی تھی۔ یہ خبر سن کر مجمع چھٹ گیا۔ ہم لوگ موت سے کس قدر قریب تھے! میں یہ سوچ کر آج بھی کانپ جاتا ہوں کہ یہ اعلان دس پندرہ منٹ کے اندر نہ ہوجاتا تو کیا ہوتا! ہم لوگ خیریت سے بمبئی پہنچ گئے۔ تین دن کے سوگ کا اعلان ہو چکا تھا اور سڑکوں پر سناٹا چھا چکا تھا۔ مسلم لیگ کے کچھ رضا کار اسٹیشن پر موجود تھے جنھوں نے ہم جیسے پاکستان جانے والوں کے لیے محفوظ مقام پر قیام کا انتظام کر رکھا تھا۔ یہ ایک طرح کا کیمپ تھا۔ ہم لوگ وہاں کچھ عرصے کے لیے ٹھہر گئے اس لیے کہ آمد ورفت کے لیے سواریاں عنقا تھیں۔ان دنوں کراچی اور بمبئی کے درمیان دو جہاز چلتے تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس کمپنی کا نام P&O Liners تھا۔ پاکستان جانے والوں کا بہت ہجوم تھا اور جہاز کے ٹکٹ بلیک مارکیٹ میں فروخت ہو رہے تھے۔ ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ جس ادارے میں ملازمت کے سلسلے میں میرے والد کراچی جارہے تھے وہ ان دو جہازوں کا بھی منتظم تھا۔ اس طرح ہمیں ٹکٹ ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی، بس صرف ہمیں جہاز کی روانگی کا انتظار کرنا پڑا تھا۔''

جب فصیح اپنی دردناک کہانی سنا رہے تھے تو میں بالکل خاموشی سے سنتا رہا۔ میں جامد وساکت ہوگیا تھا۔ میں خود بھی عالمی جنگ کے دوران اس قسم کے حالات سے گزر چکا تھا اور ان واقعات کو یاد کر کے کانپ جاتا تھا۔ مجھے وہ تمام واقعات یاد آرہے تھے جو میں نے اپنے ملک کی تقسیم کے حوالے سے سنے تھے جو اس بھیانک جنگ کا نتیجہ تھے، مرکزی یورپ جس کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔

فصیح مجھے بتارہے تھے کہ جب انھوں نے سب کچھ چھوڑ کر اور صرف چند سوٹ کیس لے کر اپنے اندور کے گھر کا دروازہ آخری بار بند کیا تھا تو ان کے جذبات کیا تھے۔ وہ لوگ اس امید میں تھے کہ جب حالات پُرسکون ہو جائیں گے تو وہ کم ازکم عارضی طور پر واپس آ کر اپنی جائیداد فروخت کر سکیں گے۔ اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر کوئی ہندو تو ان کا گھر خریدنے کو تیار نہ ہوتا۔ مسلمان تو خود ہجرت کی تیاریوں میں تھے۔ ان معنوں میں کم ازکم فصیح کا خاندان خوش قسمت تھا کہ نہ صرف کراچی میں ان کی ملازمت تیار تھی بلکہ وہاں پہنچ کر فوراً اندور ہی سے پہلے ہجرت کرنے والے ایک دوست خاندان کے گھر میں عارضی پناہ مل گئی تھی۔ مگر ان دنوں اس شہر کے، جہاں اچانک اتنے لوگ آ جائیں، حالات اچھے نہ تھے۔ مکان مشکل سے ملتے تھے۔ ان کے گھر والوں کو ہوٹل میں منتقل ہونا پڑا اس لیے کہ میزبان کے رشتے دار آرہے تھے اور ان لوگوں کو بھی جگہ کی ضرورت تھی۔ ہوٹل کا کرایہ بھی بہت تھا۔ فصیح نے بتایا کہ ''ہم لوگ چھ ماہ تک ہوٹل میں مقیم رہے۔ اس کے بعد ہمیں ایک چھوٹا سا فلیٹ مل گیا جس کے لیے ہمیں اس کے مکین کو کچھ رقم دینی پڑی تھی۔ میں خوش قسمت تھا کہ مجھے اسکول میں داخلہ بھی مل گیا۔ ان دنوں مہاجرین کی آمد کی وجہ سے اسکول کی عمارتیں خالی کرالی گئیں تھیں اس لیے کہ قیام کے لیے جگہ کم تھی۔ مجھے بوہریوں کے ایک اسکول میں جگہ ملنے کے لیے انتظار کرنا پڑا تھا۔ اسکول اچھا تھا اور اس کا ہیڈ ماسٹر ایک پارسی تھا۔ میں نے اس جیسا منتظم انسان آج تک نہیں دیکھا۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ اسی اسکول کی دین ہے۔ اس نہایت منتظم شخص کی تربیت نے میری زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔''

اس معلم نے جو بنیاد رکھی تھی وہ واقعی بہت محکم تھی اس لیے کہ فصیح اپنی تعلیمی کارکردگی میں بے مثال تھے۔ اسکول کے بعد وہ کراچی یونی ورسٹی میں داخل ہوگئے اور وہیں سے اکنامکس میں ایم اے آنرز کیا۔ اس کے بعد انھوں نے قانون پڑھا۔ تعلیم کے دوران وہ جز وقتی ملازمت کے ذریعے اپنے والد کی مالی مدد کرتے رہے۔ فصیح نے بتایا کہ ''جز وقتی ملازمت سے میں نے عام طور پر بہت کچھ سیکھا تھا۔'' اس لیے کہ اس کے ذریعے فصیح اس وقت کے کئی اہم لوگوں سے قریب رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ''خوش قسمتی سے دو ماہ کے لیے مجھے جناب

آئی آئی چندریگر کے لیے کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ایک عرصے تک جناح صاحب سے منسلک رہے تھے اور اس وقت سے قومی سیاست میں بھی شامل تھے۔ وہ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رُکن بھی تھے اور بعد میں پاکستان کے وزیرِ اعظم بھی بنے تھے۔ وہ مختلف ادوار میں وزیر رہے تھے، اور ایک بار حزبِ اختلاف کے لیڈر بھی بنے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں ایوب خان نے ملک کا انتظام سنبھال کر جمہوریت کا بوریا بستر لپیٹ دیا تھا۔ میں چندریگر صاحب کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا اور میری خواہش تھی کہ میں انھیں کے نقشِ قدم پر چلوں۔ مگر والد کی انتقال کے وجہ سے میں مزید تعلیم جاری نہیں رکھ سکا اور اپنے خاندان کی ذمے داریوں کی وجہ سے بیرسٹری پڑھنے انگلستان نہ جا سکا جس کا میں نے ارادہ کر رکھا تھا۔ اس لیے میں نے بینک آف بہاولپور میں ملازمت کر لی۔ اور پھر میں نے اخبارات میں اس ادارے کے وہ اشتہارات دیکھے جن کی کشش نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔''

پہلی کھیپ میں ۷۰۰ درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ پہلی کھیپ میں فصیح ان چار لوگوں میں سے تھے جن کا انتخاب کیا گیا تھا۔ پورے ملک میں اس اسکیم کی کامیابی کے چرچے تھے اس لیے کی اس میں معیار کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ دیکھا دیکھی دوسرے اداروں نے بھی اسی قسم کی اسکیمیں شروع کر دی تھیں۔ صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بھٹو حکومت کے منصوبے تک یہ اسکیم بہت کامیابی سے چلی تھی۔ اگر یہ اسکیم چلتی رہتی تو ملک میں انشورنس ہی نہیں ہر نوع کی انتظامیہ کے لیے افراد کی فراہمی کے ضمن میں بہت پیش رفت ہو سکتی تھی۔ اس اسکیم سے منسلک جو طریقۂ کار تھا وہ اتنا منفرد اور ایسا انقلابی تھا کہ لوگوں کو اس بات پر مشکل سے یقین آتا تھا کہ منتخب لوگوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ، بغیر کسی سفارش کے، صرف ان کی اپنی کوششوں پر منحصر تھا۔ فصیح کہتے ہیں کہ ''جب میں لوگوں کو بتاتا تھا کہ میں بغیر کسی سفارش کے منتخب ہو گیا ہوں تو لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے پاکستان جیسے ملک میں ایسا ہونا ناقابلِ یقین ہے۔ میں ان سے کہتا کہ میں تو اس ادارے سے منسلک کسی سے واقف نہیں ہوں اور میں صرف اپنی صلاحیت کی بنا پر منتخب ہوا ہوں۔ مگر کوئی مجھ پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔''

اگر فصیح اپنے ساتھیوں کو یہ بتاتے کہ چندریگر صاحب کے ساتھ کام کرنے کے سلسلے میں وہ صرف ایک بار عباس خلیلی صاحب سے ملے تھے اور انھیں تو یہ ملاقات یاد بھی نہ رہی ہوگی تو کوئی ان کی بات پر یقین نہیں کرتا۔ دراصل فصیح، چندریگر صاحب کی طرف سے ارسال کیے جانے والے کچھ کاغذات پہنچانے کے لیے ایک بار عباس خلیلی صاحب سے ملے تھے۔ فصیح نے مندرجہ ذیل الفاظ میں چندریگر صاحب کے ساتھ کام کرنے کے عرصے کے واقعات بیان کیے ہیں:

''میں خوش قسمت ہوں کہ چندریگر صاحب کی وجہ سے میں اس وقت کی بہت سی اہم شخصیات سے مل سکا تھا۔ چندریگر صاحب برج کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اسی وجہ سے ان کے گھر پر ان کے بہت سے دوست جمع ہوتے تھے، مثلاً صدر اسکندر مرزا، مسٹر شعیب، جو اس وقت وزیرِ خزانہ تھے، ہائی کورٹ کے جج صاحبان، مسٹر سہروردی وغیرہ۔ اور میں نے چندریگر صاحب کو عباس خلیلی صاحب کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے خود سنا تھا۔ تو وہ کتنے باکمال اور روشن دماغ سرکاری افسر رہے ہوں گے۔ وزارتِ تجارت کے سکریٹری کی حیثیت میں پاکستان کی معاشی ترقی میں ان کا کردار بہت اہم اور بے مثال تھا۔ انھی دنوں ایوب خان کی حکومت نے بہت سے اہم سرکاری افسروں کو معزول کر دیا تھا جن میں عباس خلیلی صاحب شامل تھے۔ ان کو 'چارج شیٹ' کیا گیا تھا اور اسی سلسلے میں وہ چندریگر صاحب سے مشورے کر رہے تھے۔ مجھے اس چارج شیٹ کو دیکھنے کا موقع ملا تھا اس لیے کہ میرے افسر خلیلی صاحب کے لیے اپنے مشورے ترتیب دے رہے تھے۔ اور یہ سلسلہ تھا جس کے باعث مجھے خلیلی صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا جب مجھے انھیں کچھ کاغذات دینے اور کچھ حاصل کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ چندریگر صاحب نے اپنے دوست پر لگائے گئے الزامات کی بہت چھان بین کی تھی اور انہیں اس میں کوئی حقیقی مواد نہیں ملا تھا۔ کچھ ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ سب کچھ بنایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ چندریگر صاحب نے مجھے ان کی فائل دی تھی اور اس کو پڑھ کر ایک خلاصہ تیار کرنے کے لیے کہا تھا۔ جب میں کاغذات دینے کے لیے ان سے ملا تھا تو خلیلی صاحب کو علم نہیں تھا کہ مجھے ان کے مندرجات کا علم تھا۔ اس دن میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ ایک

دن میں ان کے سامنے انٹرویو کے لیے پیش ہوں گا اور وہ مجھ سے فلم 'لارنس آف عربیا' کے بارے میں سوالات کریں گے جو حال ہی میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ مجھ سے انشورنس سے متعلق سوالات کیے جائیں گے نہ کہ کسی فلم یا "Pillars of Wisdom" جیسی کتاب کے بارے میں جو لارنس کی لکھی ہوئی تھی اور بدقسمتی سے میں نے پڑھی بھی نہ تھی۔''

ماضی کو یاد کرتے ہوئے فصیح اعتراف کرتے ہیں کہ انٹرویو میں شریک اتنی اہم شخصیات شامل تھیں کہ وہ بدحواس ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے بتایا کہ ''میں انٹرویو سے تقریباً بارہ بجے فارغ ہوکر اپنے دفتر چلا گیا۔ اور جب میں شام کو گھر پہنچا تو وہاں تار سے بھیجا گیا ایک پیغام میرا منتظر تھا، 'مبارک ہو، آپ کو منتخب کر لیا گیا ہے۔ از راہِ مہربانی ہمارے دفتر سے رابطہ کیجیے اور ملاقات کا وقت مقرر کر لیجیے۔' انٹرویو کرنے والوں میں اتنے بڑے اور اہم لوگوں کی موجودگی سے درخواست گزاروں کو احساس ہوتا تھا کہ یہ کوئی چھوٹا موٹا معاملہ نہیں، بلکہ ہم لوگ ایک اہم مرحلے سے گزارے جا رہے ہیں۔ اور میں آج بھی یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمام منتخب امیدوار اس بات پر فخر کر رہے تھے انھیں ایسے ادارے میں کام کرنے کے لیے چنا گیا ہے۔ ہم لوگ خوش قسمت تھے کہ مسٹر بھیم جی جیسا دوربیں انساں ہمارا سپہ سالار تھا۔ اگر چہ ہم لوگ بہت چھوٹے درجے کے ملازمین میں سے تھے مگر وہ اہم میٹنگ میں ہم لوگوں کو شامل کیا کرتے تھے۔ یہ عمل ہم لوگوں میں ایک ابھار پیدا کر دیتا تھا اور ادارے کے دوسرے ملازمین ہماری طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔''

فصیح اپنے تعلیمی پس منظر کو وسعت دینے میں منہمک رہے۔ ان کے پارسی استاد نے انھیں سکھایا تھا کہ محکم عمارتیں محکم بنیادوں ہی پر قائم کی جاتی ہیں۔ سات ماہ کی اپنی نیو انڈیا انشورنس کمپنی میں تربیت کے دوران ہی انھوں نے چارٹرڈ انشورنس کے امتحانات دینے شروع کر دیے تھے اور دو سال سے کم عرصے میں انھوں نے سارے امتحانات میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے ایک ساتھ سات پرچوں کا امتحان دے کر پہلی ہی بار کامیابی حاصل کر لی تھی جو پاکستان کے لیے ایک ریکارڈ تھا جو آج تک نہیں توڑا جا سکا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے فیلوشپ کے لیے امتحانات دینے شروع کیے اور پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ میں ارشد عبداللہ صاحب کے تربیتی پروگرام میں بھی شامل ہوئے۔ ارشد عبداللہ صاحب جو آج کل ای ایف یو میں تربیت کے شعبے کے سربراہ ہیں، ان دنوں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ کے سربراہ تھے۔ فصیح آج بھی ان تربیتی پروگراموں کی تعریف کرتے ہیں۔ اس ادارے کے تمام تربیتی پروگراموں میں فصیح نے شرکت کی تھی۔ پہلا جونیئر ایگزیکٹیو کا کورس چھ ماہ کے عرصے کا تھا۔ اس کے بعد وہ 'Management by Objective' اور 'Techniques of Management' اور آخر میں انھوں نے ۱۹۸۰ء میں 'Advanced Management' کا کورس بھی مکمل کیا جو انسٹی ٹیوٹ کا سب سے اعلیٰ درجے کا کورس تھا۔

فصیح الدین نہ صرف ادارے کے دوسرے سب سے بڑے عہدے پر پہنچے ہیں بلکہ ملک کے حریف اداروں میں انشورنس کے تکنیکی ماہر کے طور پر مانے جاتے ہیں۔ اس لیے سمندر پار کے ملکوں میں پاکستان کی بیمے کی صنعت کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں اور ملک کے اندر قائم کئی اداروں کی انتظامیہ میں بھی شریک رہے ہیں۔ المختصر وہ ای ایف یو کے 'تکنیکی ضمیر' کے مماثل ہیں، ان کا احترام کیا جاتا ہے اور اپنی خوش مزاج شخصیت کی وجہ سے لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی ذاتی گرمجوشی نے انھیں ادارے کے اندر بھی اور باہر بھی بہت سے دوست مہیا کر دیے ہیں۔ اتنی کامیاب پیشہ ور زندگی کے باوجود وہ آج بھی ویسے ہی مکمل انکسار اور سادگی کا نمونہ ہیں جیسے کہ چھتیس برس قبل تھے جب میں پہلی بار ان سے ملا تھا۔ ان کا دوستانہ چہرہ ذرا بھی نہیں بدلا ہے اور جب ان سے ای ایف یو کے بارے میں بات کی جائے تو وہ اسی طرح جذباتی ہو جاتے ہیں گویا وہ کسی ایسے اہم انٹرویو کے لیے تیاری کر رہے ہوں جس میں ملک کے بہترین دماغ ان سے سوالات کرنے والے ہوں۔ اور وہ یہ جان کر اور بھی متعجب ہوں گے کہ انٹرویو لینے والوں میں خود ان کا نام بھی شامل ہوگا، جو اپنی جگہ پر بھی بہت اہم اور اپنے ملک کے وقار کا باعث ہوگا۔

ڈاکٹر تاج الدین مانجی

ہمیشہ حاضر

ڈاکٹر مانجی ای ایف یو کے اسٹیج پر اس وقت نودار ہوئے تھے جب میں اپنا رختِ سفر باندھ رہا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن، وہ ہمیشہ حاضر رہے ہیں، گروپ کی بیمہ زندگی کے شعبے کے افسر کی حیثیت سے یا بھیم جی خاندان کے معالج اور ایک قریبی دوست کی حیثیت میں۔

ڈاکٹر تاج الدین مانجی ۱۹۳۸ء میں اندور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سوتی کپڑوں کے بیوپاری تھے اور شہر سے تقریباً سو میل دور ان کی اپنی کاٹن جننگ فیکٹری تھی۔ ان کے والد کا گھرانا پانچ بھائیوں اور چار بہنوں پر مشتمل ایک بڑا خاندان تھا۔ تاج کی ابتدائی تعلیم بمبئی میں ہوئی جہاں سے انھوں نے گریجویشن کیا تھا۔ تاج نے ۱۹۶۱ء میں پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا، کراچی آئے اور بعد میں برطانیہ چلے گئے۔ انھوں نے لندن سے MRCP کیا، ایڈنبرا سے MRCP کیا اور ۱۹۶۴ء میں گلاسگو سے بھی MRCP کیا۔ اس کے بعد ان کو لندن اور ایڈنبرا کے رائل کالج آف فزیشینز نے فیلو کے اعزاز سے نوازا۔ یہ فیلوشپ ان ممتاز لوگوں کو عطا کی جاتی ہیں جنھوں نے اپنے کالج کے لیے اہم کام کیے ہوں۔ تاج ایک طبّاع طالب علم تھے۔ ان ہی کی طرح ان کے بھائی بھی رہے ہوں گے اس لیے کہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور پریکٹس کر رہے ہیں۔ دو تاج کی طرح ڈاکٹر ہیں، دو قانون داں اور ایک بھائی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ ان کے قانون داں بھائی قانون کے پروفیسر ہوتے اور بمبئی کے ہائی کورٹ میں جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے سوا سارے بھائی پاکستان آگئے تھے۔ وہ اسّی برس کے تھے۔ ان کی ساری بہنیں بھی پاکستان آگئی تھیں اور یہیں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہیں۔

۱۹۶۵ء میں تاج نے انگلستان میں اپنی تعلیم ختم کی اور پاکستان واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان واپسی سے قبل لندن میں پاکستان کے ہائی کمشنر نے انھیں چائے کی دعوت دی اس لیے کہ برطانیہ میں ان کی تعلیمی کامیابیاں اعلیٰ درجے کی رہی تھیں جن کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ اس طرح ڈاکٹر مانجی نے اپنی زندگی کی داستان بیان کی جو اُن کی کامیاب پیشہ ورانہ زندگی پر روشنی ڈالتی ہے۔

''جب میں ہائی کمشنر سے ملاقات کے لیے لندن پہنچا تو وہاں دو یا تین حضرات موجود تھے جن میں ایک مسٹر بھیم جی تھے، میں جن سے واقف نہیں تھا۔ اور جب میرا ان سے تعارف ہوا تو انھوں نے بے ساختہ کہا، 'نوجوان! اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ میں پاکستان واپس جا رہا ہوں اور وہاں اپنی پریکٹس شروع کروں گا۔ وہ مسکرائے اور کہا 'اچھا، میں آپ کو ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی میں خوش آمدید کہنا چاہوں گا۔ اس لیے، جب آپ پاکستان آئیں تو مجھ سے رابطہ قائم کریں۔' یہ تھا میرا پہلا تعارف اور اس کے بعد سے ان کے انتقال کے آخری لمحے تک میرے ان سے دوستانہ تعلقات قائم رہے۔ یہ ایک طویل اور خوشگوار عرصہ تھا۔''

اور پھر بالکل ایسا ہی ہوا۔ کراچی پہنچنے کے فوراً بعد تاج الدین مانجی نے مسٹر بھیم جی سے رابطہ کیا اور مسٹر بھیم جی نے ان کو ای ایف یو کے ساتھ، جو اس وقت پاکستان کی سب سے بڑی کمپنی بن چکی تھی، کام کرنے کی پیش کش کی۔ ادارے کی سب سے بڑی اور اہم شخصیت

جس انداز میں ان سے پیش آئی اور بات چیت کی تھی، تاج اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ تاج نے کہا ''انھیں دنوں میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا، اس لیے مجھے مسٹر بھیم جی ایک باپ جیسی شفیق شخصیت نظر آئے اور صحیح معنوں میں اسی بات نے مجھے ان کی جانب کھینچا تھا۔ جس انداز میں وہ مجھ سے بات کرتے رہے تھے وہ نہایت مشفقانہ تھا۔ اور پھر مجھے کمپنی کا ڈپٹی چیف میڈیکل آفیسر بنا دیا گیا۔ چیف کا عہدہ ڈاکٹر سعید خان کے پاس ہی تھا۔ وہ ایک جنرل پریکٹیشنر، ایک روایتی انڈر رائٹر اور چیف میڈیکل آفیسر تھے اور مجھے ان کا نائب بنا دیا گیا۔ یہ ۱۹۶۶ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔ اس وقت سے ادارے کو قومی ملکیت میں لیے جانے تک میں اس ادارے سے منسلک رہا تھا۔''

ڈاکٹر سعید خان ای ایف یو کے ساتھ اس وقت سے تھے جب کمپنی کا صدر دفتر کراچی منتقل ہوا تھا۔ وہ پاکستان کے سب سے پرانے میڈیکل انڈر رائٹر تھے اس لیے کہ اس وقت کوئی اور اس میدان میں موجود نہیں تھا۔ تمام لائف کمپنیاں اپنے انڈر رائٹنگ مسائل کو اپنی ری انشورنس کمپنی کے پاس بھیجا کرتی تھیں۔ اس وجہ سے وہ اس میدان میں اکیلے تھے۔ ساتھ ہی وہ ای ایف یو اور میونخ ری انشورنس کمپنی کے درمیان اس وقت سے رابطے کا ذریعہ بنے تھے جب ۱۹۵۰ء میں دونوں اداروں کے درمیان تعاون شروع ہوا تھا۔ ڈاکٹر سعید خان ایسٹرن فیڈرل یونین کے ملازمین کے معالج کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ قمر ہاؤس میں ان کے لیے ایک دواخانہ قائم کر دیا گیا تھا جہاں ہر صبح وہ ملازمین کو دیکھا کرتے تھے۔ تاج کہتے ہیں کہ'' وہ بہت سینئر آدمی تھے، بڑے لوگوں سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے اور لوگ ان کو بہت پسند کرتے تھے۔ جب میں نے ان کے ساتھ چار پانچ برس تک کام کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی صحت ان کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔ اس کے باوجود میرا اور ان کا بہت قریبی ساتھ رہا۔ ہم ایک ساتھ بیٹھ کر انڈر رائٹنگ کے مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں پاکستان میں انڈر رائٹنگ اپنے ابتدائی دنوں میں تھی۔''

ڈاکٹر تاج الدین مانجی کے چیف میڈیکل ڈائریکٹر اور چیف انڈر رائٹر بننے کے بعد انڈر رائٹنگ کے معاملات میں تبدیلیاں ناگزیر تھیں۔ کمپنی کے سربراہ کی ہمت افزائی پر انھوں نے میونخ ری انشورنس کمپنی سے قریبی روابط استوار کیے۔ انھوں نے نئے ادارے ای ایف یو لائف کے چیف میڈیکل ڈائریکٹر بننے کے بعد ان رابطوں کا دوبارہ احیا کیا۔

ڈاکٹر مانجی کے ۱۹۶۵ء میں پاکستان واپس آنے کے بعد سے اور ای ایف یو لائف میں شمولیت کے دوران میں ان سے واقف رہا ہوں۔ پچھلے برسوں میں میری ان سے ملاقاتیں رہی ہیں مگر زیادہ تر نجی نوعیت کی اس لیے کہ ۱۹۷۲ء میں صنعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد سے انھوں نے اس صنعت سے اپنا ناتا توڑ لیا تھا۔ انھوں نے اپنی پریکٹس پر زیادہ توجہ دینی شروع کر دی اور آغا خان اسپتال اور کچھ دنوں پاکستان میں اسماعیلی برادری کی سربراہی بھی کی۔ ڈاکٹر مانجی پاکستان کی طبّی دنیا کی سطح پر سب سے زیادہ قابلِ احترام کارڈیولوجسٹ ہیں اور بلا شبہ اس میدان میں وہ اپنی ذات میں انجمن ہیں۔ ان کی دل ربا شخصیت نے طبّی میدان سے باہر بھی بہت سے دوست بنائے ہیں۔ ان سے بات کرنے میں لطف آتا ہے اس لیے کہ وہ ایک وسیع ذہن کے مالک ہیں اور چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹوں کے پردے میں کبھی کبھی وہ بہت چالاکی کی باتیں بھی کر جاتے ہیں۔ روشن علی بھیم جی صاحب کی وفات کے تقریباً چھ ماہ بعد جب وہ میرے ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ مجھے دل رُبا انداز میں ای ایف یو کے اپنے دل چسپ تاریخی تجربات کے مختلف مراحل سے گزاریں گے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس کتاب کے سلسلے میں میری بہت مدد کریں گے اور کمپنی کی اہم شخصیات، بالخصوص میرے محبّ دوست کے بارے میں محبت بھری تفصیلات بتائیں گے۔ مجھے اس بات بھی اندازہ تھا کہ میں ان کی ذات اور ان کی اپنی زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیلات اخذ نہیں کر سکوں گا۔ کراچی کے اہم اور ممتاز افراد کے حلقے سے تعلق رکھنے، جواں سال نظر آنے والی شخصیت، خوش اسلوبی اور شائستگی سے مملو، توانا لہجہ، شریفانہ شکل وصورت، مگر چابک دست اندازِ تکلم، کے باوجود وہ اپنے اندر ایسی خاکساری برقرار رکھتے ہیں کہ ان کی شخصیت سے پیار کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

جب وہ کسی کے بارے میں بات کرتے ہوں تو جی چاہتا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی' کسی پر نکتہ چینی بھی کر رہے ہوں تو کبھی کوئی ناشائستہ لفظ منھ سے نہیں نکلتا۔ ان کا بلّور جیسا شفاف ذہن، اپنی تمام تر تنک مزاجی اور ضرورت سے زیادہ احتیاط کے باوجود، بڑی محنت سے اپنے موضوع کی چھان پھٹک کے بعد سننے والے کے سامنے نہایت معصومانہ انداز میں اپنے خیالات بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ اگر چہ وہ بہت وسیع القلب انسان ہیں مگر جب ان کے ذہن پر غیر ضروری بوجھ پڑنے لگے تو یہ ایسے صاف گو کردار کے مالک ہیں کہ کسی تجزیے کے دوران وہ ہلکی سے ناراضگی کا اظہار بھی کر جاتے ہیں۔

جب وہ اپنے پیش رو کے بارے میں بات کرتے ہیں تو، اگر چہ وہ علمِ طب کے اعتبار سے ان سے کمتر تھے، جس میں ان کا بظاہر کوئی قصور نہیں تھا، وہ انڈر رائٹنگ کے میدان میں، جو فن بعد میں ترقی کی منزلوں سے گزر چکا ہے، انشورنس کی صنعت میں ان کی پہل کاری کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

اور واقعی سننے کے قابل ہوتا ہے وہ تذکرہ جب ڈاکٹر مانجی خدا بخش جیسے انسان کے بارے میں بات کرتے ہیں، جو اُس وقت جب یہ اس ادارے میں شامل ہوئے تھے، زندگی کے شعبے کے سربراہ تھے۔ دانش اور جسمانی اعتبار سے ان دونوں شخصیات میں کتنا فرق تھا۔ ایک، بلند قامت اور خوب رو اور دوسری منحنی اور کوتاہ قامت بنگالی۔ خدا بخش کا تذکرہ کرتے ہوئے تاج نے کہا، '' کیا پیارا انسان تھا وہ، اپنے ادارے کا وفادار۔ اس انسان نے اپنی زندگی، اپنے دن رات، صبح ہو کہ شام، اپنا سب کچھ بیمۂ زندگی کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اپنے گھر میں ہوں کہ دفتر میں، لائف انشورنس ان کا اوڑھنا بچھونا تھا' اس کے علاوہ کوئی اور بات ہوتی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے پیشے سے مکمل طور پر وابستہ تھے۔ واقعی وہ ایک انوکھے انسان تھے۔ صبح سے آدھی رات تک وہ اپنے کارکنوں سے رابطے میں رہتے تھے۔ اور ایک بات جو مسٹر بھیم جی سے انھوں نے سیکھی ہوگی وہ یہ تھی ان ہی کی طرح وہ دفتر ہی نہیں اپنے گھر کے دروازے بھی کارکنوں کے لیے ہر وقت کھلے رکھتے تھے۔ ان کے اور کارکنوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے پیشے سے متعلق معاملات میں ہمیشہ غرق رہتے تھے، بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ان کی زندگی میں لائف انشورنس کے سوا اور کوئی شے، اور کوئی دل چسپی تھی ہی نہیں۔''

اور جب ایس ایف عالم صاحب یا محمد حسین علوی کا ذکر آتا ہے، جو بعد میں کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی دبئی اور لندن سے منسلک ہو گئے تھے، تو کچھ اسی قسم کے الفاظ ان کی زبان سے جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات بیمے کی صنعت کے قومی ملکیت میں لیے جانے سے قبل ای ایف یو میں اعلیٰ افسر تھے۔ ڈاکٹر مانجی کہتے ہیں کہ ''اسے خوش قسمتی کہیے یا بد قسمتی، ان دنوں ایسٹرن فیڈرل یونین سے جتنے لوگ منسلک تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سب نے انشورنس سے شادی کر رکھی ہو۔ میرے خیال میں، اعلیٰ افسروں میں شرافت والا جاہی ذرا مختلف تھے اس لیے کہ ان کے نزدیک زندگی کا تصور کچھ اور ہی تھا اور ان کی اپنی سماجی زندگی بھی تھی۔ وہ ای ایف یو کے شاید واحد آدمی تھے جنھوں نے اپنے وسیع سماجی تعلقات بنا رکھے تھے۔ ان معنوں میں وہ مسٹر بھیم جی کے مماثل تھے۔ اور پھر دوسرے افسروں کے مقابلے میں ان کی عمر بھی کم تھی۔ در اصل چوں کہ ان دنوں ان کی ذمے داریاں بنیادی طور پر کارپوریٹ اور قانونی معاملات سے منسلک زیادہ ہوتی تھیں، ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کی دیکھ بھال اور سرکاری افسروں سے تعلقات میل ملاقات کا بوجھ بھی انھی کے کاندھوں پر تھا اس لیے، نواب حسن صاحب کے مقابلے میں وہ انشورنس کے مرکزی دھارے سے ذرا کٹے ہوئے رہتے تھے۔ وہ بہت مصروف آدمی تھے۔ اس میں انھیں بہت لطف آتا تھا۔ یہ ان کے چہرے سے عیاں اور ان کی حرکات وسکنات سے صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ معاملات کو پیشہ ورانہ انداز میں سلجھانے کے عادی تھے۔ جیسا کی بظاہر نظر آتا تھا، سماجی ماحول میں باہمی میل جول کے حوالے سے وہ بہت کھلے مزاج کے آدمی نہیں تھے۔ وہ ایک طرح کی خود بینی کے عادی تھے مگر ہمیشہ پیشہ ور رہے اور نہایت مستعد۔ جنرل انشورنس کے سلسلے میں وہ بہت پڑھے لکھے انسان تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ای ایف یو کے ماضی کے تذکرے میں یہ باتیں بیان کرنی ضروری تھیں۔''

ان کے لبوں پر خیالات کا دھارا اس طرح رواں تھا جیسے کسی چشمے سے پانی جاری ہو اور میں ان کو سننا چاہ رہا تھا۔ انھوں نے بڑے بارسوخ افراد پر مشتمل بورڈ آف ڈائریکٹرز ترتیب دینے اور ادارے کے معاملات کو بہت خوبی سے سلجھانے پر اپنے اتالیق، مسٹر بھیم جی کے لیے تعریفی کلمات استعمال کیے۔ مثال کے طور پر مسٹر ایس ایم یوسف اور مسٹر سعید احمد جن کے میں خاکے لکھ چکا ہوں، یا جسٹس ستار جو ہائی کورٹ کے چیف جسٹس، اور الیکشن کمیشن آف پاکستان کے کمشنر رہ چکے تھے جن کے زیرِنگرانی پاکستان کے سب سے شفاف انتخابات ہو چکے تھے، جن سے مجیب الرحمٰن ایک بڑے منتخب لیڈر بن کر ابھرے تھے اور بعد میں ایک نئی مملکت بنگلہ دیش کے پہلے صدر بنے تھے۔ ان سے بھیم جی صاحب کے اتنے قریبی تعلقات تھے کہ ڈاکٹر مانجی ان کو اپنے مریض کے طور پر دیکھا کرتے تھے۔ ایک بار تو وہ ڈھاکا صرف اپنے سابق ڈائریکٹر کے علاج کے لیے بھی گئے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر مالک کا بھی ذکر کیا جو طب کے پیشے سے تھے اور ملک کے مشہور سیاست داں بھی تھے۔ وہ سیاست چھوڑ کر ای ایف یو کے ڈائریکٹر بن گئے تھے۔ بنگلہ دیش کی تشکیل کے بعد وہ اس کے پہلے گورنر بھی رہے تھے۔ ڈاکٹر مانجی کا خیال تھا کہ اس ادارے سے اتنے بڑے بڑے ناموں کے منسلک ہونے کی وجہ سے، دوسرے تجارتی اداروں کے مقابلے میں، ای ایف یو کے وقار میں بہت اضافہ ہوا تھا اس لیے کہ بقولِ تاج ''ان کا یہ نعرہ تھا کہ یہ ادارہ حصے داروں کا نہیں صرف عوام کی ملکیت ہے۔ اور دوبارہ پھر جب ای ایف یو لائف کا پرچم بلند ہوا، انھوں نے اور مسٹر زومکا والا نے دوسرے لوگوں سے یہی کہا تھا کہ اگر آپ لوگ اس نئے ادارے میں سرمایہ کاری کریں تو فوری منافعے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ اور یہ سب کہنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے، اور پھر پچھتر برس کی عمر کے انسان کے لیے۔ یقیناً یہ آسان کام نہیں تھا کہ دولت بہائی جاتی رہے اور کافی عرصے تک منافع ملنے کی توقع نہ ہو۔ اس ملک میں تو سرمایہ کاری کرنا ایسا سمجھا جاتا ہے جیسے کہ ایسی مشینیں لگائی جارہی ہوں جن میں ایک طرف سے پیسہ ڈالا جارہا ہو اور دوسری طرف سے منافع نکل رہا ہو۔ مسٹر بھیم جی نے اپنی ضعیفی کی عمر میں بھی ایسا چیلنج قبول کیا تھا۔ وہ اپنے مقصد سے اتنی سچائی سے جڑے ہوتے تھے کہ لوگ ان پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتے تھے۔''

یہی وجہ تھی کی جب انھوں نے ڈاکٹر مانجی کو اس ادارے میں شمولیت کی پیش کش کی تو انھوں نے بلاکسی تامل کے قبول کر لی۔ اور ڈاکٹر مانجی کو اس فیصلے پر ذرا بھی افسوس نہیں اس لیے یہ ادارہ صحیح سمت میں اور اعلیٰ پائے کی مارکٹ کی ضروریات کے مطابق کام کر رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر آج کوئی نوجوان اپنے مستقبل کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ای ایف یو لائف سے پالیسی لے لے تو اس کو کسی بات کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ اور میں سمجھتا ہوں کی یہ پاکستان کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ پرانے زمانے سے یہ سب کچھ کتنا مختلف ہے۔ جب میں اس ادارے کی نئی ٹیم کے ساتھ بیٹھا اور انھوں نے میرے سامنے 'Critical Illness' بیمے کے بارے میں تفصیلات رکھیں تو میں حیران رہ گیا، اس لیے کہ میں نے اس سے قبل اس نوعیت کے بیمے کے بارے میں سنا بھی نہیں تھا۔ میں قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد بیس برس سے بیمے کی صنعت سے منسلک ہوں مگر مجھے اس صنعت کی اتنی ترقی کا علم نہیں تھا۔ اسی لیے مجھے مسٹر بھیم جی نے میونخ اور لندن جانے کے لیے کہا اور میں ان دونوں جگہ گیا بھی۔ میں اب تک چار یا پانچ بار جا چکا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ہمیں اس صنعت کو جدید خطوط پر استوار کرنا ہے تو اپنے ری انشوررز کی مدد سے اپنے ملک کے صارف کو بھی اس نوعیت کے بیموں سے متعارف کرانا ہوگا۔ زندگی کے بیمے کا کام ہی لوگوں کو ذہنی سکون مہیا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کی اس صنعت کا پورا تصور ہی بدل گیا ہے اور اب سیلز میں مختلف قسم کے لوگ ملازم رکھے جاتے ہیں۔ مجھے اب اندازہ ہوا ہے کہ ای ایف یو لائف کو نئے خون کی کیوں ضرورت پڑی ہے، جو پڑھا لکھا بھی ہو اور اسی میں اپنی زندگی کا مستقبل بھی دیکھ رہا ہو۔ لوگوں کو اب احساس ہو چلا ہے کہ اب اس پیشے کا پورا انداز ہی بدل گیا ہے۔ کہ اب آپ صرف تعلقات کے بل بوتے ہی پر انشورنس فروخت نہیں کر سکتے۔ آپ کو ایک پیشہ ور اور تربیت یافتہ کارکن بننا ہوگا تا کہ آپ اپنے مشن کو پورا کر سکیں۔ اور مسٹر بھیم جی، جن کو میں انھی باتوں کی وجہ سے پسند کرتا ہوں، اس معاملے میں بہت واضح نظریے کے حامل تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا تھا، ''تاج بیمے کی درخواست منظور کرنے سے پہلے آپ جو سوال چاہیں کر سکتے ہیں مگر پالیسی جاری ہو جانے کے بعد اگر کلیم آ جاتا ہے تو میں بیوہ سے غیر ضروری سوالات کرنے کے حق میں نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بیوہ سے بہت احتیاط کے ساتھ پیش آئیں اور جتنی جلد ہو سکے کلیم ادا کیا جائے۔''

ڈاکٹر تاج سے بات کر کے بہت فرحت محسوس ہوتی ہے اس لیے کہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق، جو کچھ بھی وہ کہتے ہیں اس میں معصومیت جھلکتی ہے اور ان کے تصورات انتظامیہ سے مختلف ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ کبھی اس کا حصہ نہیں رہے ہیں۔ جس طرح ایک نہایت پڑھا لکھا اور تجربے کار اسپیشلسٹ اپنے مریضوں کی دیکھ بھال کرتا ہے اسی طرح ڈاکٹر مانجی ای ایف یو کے کام کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جس طرح وہ پرانی ای ایف یو کے ساتھ رہے تھے اسی طرح نئے ادارے کے ساتھ بھی ہیں، پیشہ ورانہ جذباتیت سے ماورا، اپنی تمام تر صلاحیتوں، ٹھنڈے دماغ اور مستعد ہاتھوں کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ذات کے لیے کسی صلے کی پروا کیے بغیر، ان کے دیے ہوئے مشورے ہمیشہ صائب اور قیمتی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ جب ہم دونوں ان لوگوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے جنھوں نے اپنا سب کچھ ادارے کے لیے وقف کر دیا تھا، یا آج بھی اس سے منسلک ہیں، تو ہم ایک ہی طرح سوچ رہے تھے۔ یہ ان ہی کا فیض تھا جس کے ذریعے ہم گزرے ہوئے وقتوں اور لوگوں کو دوبارہ یاد کرنے اور ان کے تصورات اور خوابوں کو دیکھنے کے قابل ہو رہے تھے، لہٰذا ان کی ذات ان شخصیات کے کتنی قریب رہی ہوگی۔ یہ ان کی قربت ہی تھی جس کی بنا پر وہ میرے مرحوم دوست روشن علی بھیم جی کی، جن کے آخری سانس تک وہ ان کے ساتھ رہے تھے، کارگزاریوں کا خلاصہ پیش کر رہے تھے۔

اس بار جب میں ای ایف یو لائف کے دفتر میں ان سے ملاقات کے لیے گیا تو وہ کہہ رہے تھے ''لحہ لحہ ہم ای ایف یو کے شجر کو تناور ہوتے دیکھ سکتے ہیں۔ لوگ اس شخص کو ہمیشہ یاد رکھیں گے جس نے اس ملک کی بھلائی کے لیے اس کمپنی کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ باوجود اپنی علالت اور کبرسنی کے اس سلطنت کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے نام سے یاد کی جائے گی۔ آج ان کی یہ سلطنت پھل پھول رہی ہے اور ہم لوگوں کو ای ایف یو کو کامیاب ہوتے دیکھ کر طمانیت اور خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اور جب میں ان کے خاندان کے کسی فرد سے ملتا ہوں تو مجھے بے ساختہ شخصیت کے اس بلند مینار کی یاد آ جاتی ہے۔ جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں، ایسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ یہ میرا ذاتی نکتۂ نگاہ ہے، جو کمپنی کے نکتۂ نگاہ سے بھی صحیح ہے۔''

مجھے ڈاکٹر مانجی کی آواز روشن ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس گفتگو کے سحر میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ پرانی کمپنی ہی کی طرح نئی کمپنی سے ان کی وفاداری بڑے اطمینان کی بات ہے۔ اسی دن صبح میری ای ایف یو کے درخشندہ ستارے ابوالمحمود سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی جو نیشنلائزیشن کے بعد زندگی کے بیمے کو چھوڑ کر ای ایف یو جنرل کے چیف ایجنٹ بن گئے تھے۔ ہم نے ایک بار پھر گزرے دنوں اور حیدر صاحب کی باتیں کی تھیں جنھوں نے ابوالمحمود کو پاکستان فارن سروس کو چھوڑ کر انشورنس کی راہ دکھائی تھی۔ ڈاکٹر مانجی سے انشورنس کے مستقبل کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد میں سوچنے لگا کہ ہمارا ادارہ کتنا خوش قسمت ہے کہ تاج جیسے آدمی دوبارہ اسی کشتی پر سوار ہو گئے ہیں اور ان کی حیثیت اس پُل کی ہے جو ماضی اور شان دار مستقبل کے درمیان قائم ہو گیا ہے۔

ای ایف یو گروپ کے لیے ڈاکٹر مانجی کی خدمات بظاہر ایک نعمت سے کم نہیں۔ پاکستان جیسے معاشرے میں ای ایف یو میں ان جیسی پیشہ ور اور سماجی شخصیت کی شمولیت عوام الناس کی نظر میں کمپنی کے وقار میں اضافے کا باعث ہوئی ہے۔ ای ایف یو گروپ کے اداروں سے چالیس برس پر محیط ان کے رابطوں نے مسٹر بھیم جی جیسی بلند و بالا شخصیت کی تمام تر قوتوں کو پھیلانے کے لیے ایک ڈائنامو کی طرح کام کیا ہے۔ جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ڈاکٹر مانجی ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ جب بھیم جی صاحب اپنی خراب ہوتی ہوئی صحت سے جنگ میں مصروف تھے تو انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر مانجی میرے لیے 'رحمت کے فرشتے ہیں'۔ اس جنگ میں ڈاکٹر مانجی نے ہر قدم پر ان کا ساتھ

دیا۔ تاج نے تعریف سے پُر آواز میں کہا کہ "میں نے ان کو جنگ کرتے دیکھا ہے۔ وہ لڑتے رہے، لڑتے رہے اور بالآخر ہار گئے۔ لاہور میں فالج کے حملے نے ان کو گہری مایوسی میں دھکیل دیا تھا مگر اس سے جلد ہی نکلنے کے بعد انھوں نے دونوں اداروں سے نہ صرف رابطے شروع کر دیے بلکہ قمر ہاؤس اور لائف کے پی ای سی ایچ ایس دفاتر بھی جانے لگے۔ وہ ہر وقت اسی فکر میں رہتے کہ اداروں کے سربراہوں کے کام میں مداخلت کے بغیر ان کو کس طرح بڑھایا جائے۔ جس دن ان کا انتقال ہوا اس دن بھی ان کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔"

جب مسٹر بھیم جی نے انتقال کیا اس وقت بھی ڈاکٹر تاج الدین مانجی ان کے پاس موجود تھے۔ وہ باپ جیسی شخصیت کے، جس سے ان کو والہانہ محبت تھی، آخری لمحات میں ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ پچھلے پینتیس برسوں کی طرح اس دن بھی اپنے پُرسکون مزاج اور مددگار ہاتھوں کے ساتھ ایک قابلِ اعتماد دوست اپنے دوست کی خدمت میں موجود تھا۔

حسن علی عبداللہ

ناقابلِ خرید وفروخت جنس

عمر پچاس کے پیٹے میں مگر دیکھنے میں جوان، چہرے پر ہمیشہ کھیلتا ہوا خوب صورت تبسم، تصنع سے مبرّا ایسا تبسم جو دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہوا لگے، نرم خو چال ڈھال سے ملتا ہوا ملائم لہجہ، اور مہذب انداز۔ کیا یہ کسی چیف اکاؤنٹنٹ یا کمپنی سیکریٹری کا سراپا معلوم ہوتا ہے؟ ضروری نہیں؟ مگر یہ تو بالکل حسن علی عبداللہ لگتے ہیں اور میں نے تو ان کو ہمیشہ ایسا ہی پایا ہے!

حسن علی، جیسا کہ لوگ عام طور پر انھیں پکارتے ہیں، ای ایف یو جنرل کے ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر اور کارپوریٹ سیکریٹری ہیں۔ یہی نہیں، یہ ای ایف یو لائف کے بھی ڈائریکٹر ہیں۔ میں اس بات پر اب بھی مصر ہوں کہ، عام آدمی کے معیار کے مطابق، اپنے بشرے سے وہ چیف اکاؤنٹنٹ نہیں لگتے، یعنی، لانبا، دبلا پتلا، بڑے بڑے چشمے پہنے، بے حد خود بیں، شرمیلا اور خشک مزاج، مزاح سے دور کا بھی واسطہ نہیں، روکھا پھیکا اور بدمزاج! مگر ہمارے حسن علی تو ایسے نہیں ہیں۔ وہ تو اس سے بالکل مختلف شخصیت ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ یہی ہمارے چیف اکاؤنٹنٹ ہیں۔ تو کیا ہمیں عوام کے تصورات کے مطابق اپنے پیشہ ور لوگوں کے حُلیے کو تبدیل کر دینا چاہیے؟

بہر حال ہمارے حسن علی اپنے پیشے کے مندرجہ بالا قسم کے نمائندے نظر نہیں آتے اور ہمیں اسی بات کی خوشی ہے کہ وہ جو کچھ ہیں وہی نظر آتے ہیں۔

ہندوستان کے کچھ نامی علاقے کے ایک درمیانہ درجے کے خاندان میں حسن علی ۷ ارنومبر ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئے۔ وہ صرف تین ماہ کے شیر خوار تھے جب ان کے والدین نے ہندوستان سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کا خاندان اسماعیلی برادری کے ایک گروہ کے ہمراہ کشتی کے ذریعے تقریباً چار دنوں کے سفر کے بعد کراچی پہنچا تھا۔ ان کے والد بہت سے کاروباری اداروں کے حسابات گجراتی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ ان کی اپنی زبان میں اس کام کے کرنے والے کو 'مہتا جی' کہتے ہیں۔

حسن علی کی ابتدائی تعلیم ایک اسکول میں ہوئی جو اس جگہ، یعنی قمر ہاؤس سے بہت قریب ہے جہاں وہ آج کل کام کرتے ہیں۔ اس کا نام پاکستان سی نیشنل سیکنڈری اسکول ہے۔ ۱۹۶۴ء میں اسی اسکول سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران ایک برس کے لیے انھوں نے حبیب پبلک اسکول میں بھی تعلیم حاصل کی تھی مگر وہاں سے اس لیے منتقل ہوگئے کہ وہاں کی فیس بہت زیادہ تھی اور ان کے والد اتنا مالی بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے Essom Commerce College میں داخلہ لیا اور وہیں سے ۱۹۶۸ء میں بی کام کا امتحان پاس کیا۔ اپنی گریجویشن سے بہت پہلے ہی انھوں نے آڈیٹرز اور ٹیکس ایڈوائزرس کی ایک مشہور کمپنی حیدر بھیم جی اینڈ کمپنی میں ملازمت کر لی تھی۔ یہ کمپنی روشن علی بھیم جی صاحب کے بڑے بھائی چلاتے تھے۔ حسن علی نے اس ادارے میں میٹرک کی طالب علمی کے عرصے میں ۱۹۶۴ء میں شمولیت اختیار کی تھی اور ۱۹۶۸ء میں گریجویشن کے بعد ان کو آرٹیکل شپ ملی تھی۔ حسن علی کو اس ادارے میں کام کرنے

میں بہت لطف آرہا تھا مگر وہاں تنخواہ بہت کم تھی، اس لیے کہ ان دنوں رواج یہ تھا کہ زیرِ تربیت لوگوں کو تقریباً جیب خرچ کے برابر ہی تنخواہ دی جاتی تھی۔ اور انھیں پیسوں کی اشد ضرورت تھی اس لیے انھوں نے اس ادارے کو ۱۹۷۱ء میں خیر باد کہہ دیا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے اتالیق اکبر علی بھیم جی کو چھوڑ دیا، جو روشن علی بھیم جی بڑے بھائی تھے اور کراچی رولنگ ملز میں ملازمت کر لی۔ یہاں حسن علی دو برس تک کام کرتے رہے، جب تک کہ وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ نہیں بن گئے۔ یہ ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے۔ پھر کچھ تجربہ حاصل کرنے کی خاطر انھوں نے دوبارہ حیدر بھیم جی اینڈ کمپنی میں شمولیت اختیار کر لی اور وہاں دو برس تک کام کرتے رہے۔

۱۹۷۵ء میں انھوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا اور ایسی ملازمت کی تلاش میں لگ گئے جو نہ صرف ان کا بلکہ ان کے خاندان کا بوجھ بھی اٹھا سکے۔ ان پرانے مالکان، کراچی رولنگ ملز والے انھیں واپس لینا چاہتے تھے مگر انھی دنوں ای ایف یو جنرل کو ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی ضرورت پیش آئی اور اخبارات میں ان کا اشتہار شائع ہوا۔

ان دنوں مسٹر واصف علی چیف اکاؤنٹنٹ اور کمال شیرازی ایڈیشنل چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔ شیرازی پرانے وقت سے کمپنی میں ملازم تھے اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اصفہانی خاندان کے دور میں ملازمت کی تھی اور اپنی محنت لگن اور وفاداری کی بنا پر نچلی سطح سے اس رتبے تک پہنچے تھے۔ وہ بہت قابلِ اعتماد اور محنتی انسان تھے مگر تکنیکی معاملات میں اتنے اچھے نہیں تھے کہ اکاؤنٹینسی کے جدید اندازِ کار کے تربیت یافتہ لوگوں کی طرح نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کمپنی کے اربابِ اختیار نے ایک ایسے شخص کی تلاش شروع کی جو ڈپٹی چیف اکاؤنٹینٹ کی حیثیت سے کام کرنے کے قابل ہو۔

حسن علی نے درخواست دی اور کمپنی کے صدر جناب سلطان احمد، مینجنگ ڈائریکٹر، جناب فصیح الدین، جناب واصف علی اور سابق سرکاری افسر، جو اس وقت کمپنی کے ڈائریکٹر تھے، جناب ایس ایم یوسف پر مشتمل بورڈ نے ان کا انٹرویو کیا۔

حسن علی اس انٹرویو سے بہت متاثر ہوئے تھے، بالخصوص جناب ایس ایم یوسف کی موجودگی سے اس لیے کہ وہ پاکستان کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ حسن علی نے کہا، ''یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی کہ پورے ملک میں مشہور و معروف ایس ایم یوسف صاحب جیسے لوگوں نے میرا انٹرویو لیا تھا۔ مجھے ان کا آخری سوال ابھی تک اچھی طرح یاد ہے۔ انھوں نے پوچھا تھا کہ 'ہم آپ کو کتنے میں خرید سکتے ہیں' اور میں نے جواب دیا تھا کہ آپ مجھے کسی قیمت پر بھی نہیں خرید سکتے مگر متعینہ شرائط پر آپ میری خدمات ضرور خرید سکتے ہیں، تو یہ ایک چھوٹا سا جملہ تھا جو میرے ذہن پر آج تک کندہ ہے۔''

پھر یوں ہوا کہ شرائط طے ہوئیں اور حسن علی نے ۳؍ جون ۱۹۷۹ء کو کمپنی میں شمولیت اختیار کر لی۔ حسن علی اس ادارے کے لیے بالکل نئے نہیں تھے اس لیے کہ جب وہ حیدر بھیم جی اینڈ کمپنی میں ملازم تھے اس وقت وہ ای ایف یو میں آڈٹ کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ اس لیے جب وہ ای ایف یو میں شامل ہوئے تو کافی لوگوں سے ان کی واقفیت تھی اور وہ سب ان کے کام کے پہلے سے مدّاح تھے۔ مگر حسن علی کمپنی کے چیئرمین مسٹر روشن علی بھیم سے ذاتی طور پر متعارف نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے دو اتالیق، مسٹر اکبر بھیم جی اور ان کے بیٹے حیدر بھیم جی سے ان کے بارے سن ضرور رکھا تھا۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء میں جب واصف صاحب کمپنی چھوڑ گئے اور شیرازی صاحب چیف اکاؤنٹنٹ بنا دیے گئے تب چیئرمین صاحب نے حسن علی صاحب کو اپنا رازداں بنانا شروع کیا اور عہدہ دیے بغیر ہی دھیرے دھیرے ان کو قائم مقام چیف اکاؤنٹنٹ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

حسن علی آج بھی اپنے پرانے اتالیق مسٹر اکبر علی بھیم جی کے بارے باتیں کر کے خوش ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا، اور میں اس بات کی تائید کر سکتا ہوں اس لیے کہ میں روشن علی بھیم جی صاحب کے بڑے بھائی سے متعارف رہ چکا تھا۔ ''وہ نہایت نفیس انسان تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ اس شخص کو سکھانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے جو سیکھنا چاہتا تھا۔ پوچھنے والے سے کہتے، 'بس

آپ بیٹھ جائیے اور کوشش کیجیے۔ آپ کامیاب ہو جائیں گے۔' ان کے دل بڑھانے کے اس انداز نے وہ کچھ سیکھنے میں میری مدد کی تھی جو آج میرے کام آرہا ہے۔ ٹیکس کے معاملات میں نے اکبر بھیم جی صاحب سے سیکھے تھے۔ ان کا بے حد احترام کیا جاتا تھا۔ بڑے سے بڑے سرکاری افسر اُن کا احترام کرتے تھے۔ اس میدان میں ان سے بہتر کوئی نہ تھا۔ اسی وجہ سے ملک کے زیادہ تر سربرآوردہ کاروباری ان کے کلائنٹ تھے۔ اور یہ سب صرف اس وجہ سے نہیں تھا کہ تقسیم ہند سے قبل وہ حکومتِ ہندوستان میں کمشنر آف انکم ٹیکس جیسے اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ پاکستان میں ان کا احترام بنیادی طور پر ان کی اعلیٰ درجے کی قابلیت کی وجہ سے کیا جاتا تھا۔ اور وہ اپنے کلائنٹ کو اچھی خدمت فراہم کرتے تھے۔ کسی بھی ادارے کی بیلنس شیٹ کی نیچے ان کی دستخط سے اس کی دھاک بیٹھ جاتی تھی۔''

حسن علی اکبر بھیم جی کے بیٹے کا بھی اتنا ہی احترام کرتے ہیں، جو اس ادارے میں سینئر پارٹنر ہیں جس میں انھوں نے اپنے محترم والد کے ساتھ کام کیا تھا۔ اپنے میدان کے وہ بھی ایسے شہسوار ہیں کہ جب کسی حکومت کو ٹیکس کے معاملات میں مشورے درکار ہوتے ہیں تو انھی سے رجوع کیا جاتا ہے۔

حسن علی کہتے ہیں کہ ''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 'بھیم جی' نام بھی بلند ہوا ہے اور حیدر بھیم جی نے اس نام کی بلندی کو قائم رکھنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔''

حسن علی کو اپنا کام بہت پسند ہے۔ وہ اپنے عظیم اتالیق مسٹر روشن علی بھیم جی کے بڑے مدّاح ہیں۔ انھیں بھیم جی صاحب کا غیر محدود اعتماد حاصل تھا، اس قدر کہ وہ اپنے ذاتی مالی معاملات میں بھی حسن علی سے مشورے کیا کرتے تھے۔ امیر علی مولیدینا کے انتقال کے بعد بھیم جی صاحب کو کسی با اعتماد آدمی کی ضرورت تھی جو لاہور میں تعمیر ہونے والی کمپنی کی عمارت کی نگہداری کر سکے۔ اس سلسلے میں حسن علی مسٹر بھیم جی کے قریب ہو گئے تھے۔ ان کے چیئر مین کے نزدیک یہ عمارت بہت اہم تھی اور وہ منصوبہ بندی کے وقت سے ہی بذاتِ خود اس میں دل چسپی لے رہے تھے۔ زیادہ تر فیصلے ان کے دستخط سے ہوتے تھے۔ در اصل صبح سے شام تک زیرِ تعمیر عمارت ان کے ذہن پر سوار رہتی تھی حالاں کہ صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ کچھ ان کے بس میں نہ تھا جتنا کہ وہ چاہتے تھے۔ حسن علی نے اس دودھاری نازک ذمے داری کو بہت خوب صورتی سے نبھایا۔ ایک طرف تو وہ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے کوشاں رہتے جو کبھی کبھی مشکلوں سے دوچار ہو جاتا تھا، اور دوسری طرف وہ اپنے چیئر مین کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے لاہور میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس میں پورے انہماک سے شریک رہتے ہیں۔ میں ایسے بہت سے مواقع کا عینی شاہد ہوں جن میں انھوں نے بڑی ہنر مندی سے اور ذاتی ذمے داری سمجھ کر کام سر انجام دیے تھے۔ ایسے ہی موقعوں پر مجھے محسوس ہوا تھا کہ ای ایف یو کے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کے سربراہ حسن علی صرف سرکاری افسروں کے حلقوں ہی میں نہیں بلکہ ملک کے تجارتی اور کاروباری حلقوں میں بھی کمپنی کے سفیر کی طرح کام کرتے ہیں۔ جب آپ ان کے ساتھ سماجی جلسوں میں شریک ہوں تو یہ بات اور بھی واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ وہ اور ان کی خوب صورت اہلیہ سماجی حلقوں میں بہت مقبول ہیں جب کہ اس شہر میں، جہاں کی خاصی آبادی انسان کی بھلائی کے لیے اپنی دولت لٹا دیا کرتی تھی، اب ان کی جیسی حیثیت کے لوگ اپنے اطراف ایک قسم کے تکبّر کا ہالہ سا بنا لیتے ہیں۔ یہ حسن علی جیسے لوگوں کا فطری انکسار ہے جس کی بنیاد پر مجھے یقین ہے کہ اس بھرے پُرے شہر میں آج بھی پرانے فیاض اور دانش ور لوگوں کی کمی نہیں ہے اور یہ بھی کہ اس شہرِ دلآرا پر کبھی نو دولتیے اور خدائی فوجدار راج نہیں کر سکیں گے۔

اپنے احوالِ زندگی کے بیان کو سمیٹتے ہوئے، میرے اس سوال پر کہ اگر آپ کی کوئی ایک خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر لیا جائے تو آپ کس چیز کی تمنا کریں گے، حسن علی نے کہا کہ '' یہ میرے مرحوم والدین ہی کا فیض ہے کہ میں آج تعلیم یافتہ ہوں۔ عمر کے اعتبار سے میں اپنے خاندان کا سب سے بڑا فرد ہوں اور میرے والد کے پاس بہت دولت نہیں تھی، مگر جو کچھ وہ کماتے تھے اس کا بیشتر حصہ تعلیم پر صرف کر دیتے تھے۔ میں بہت مطمئن انسان ہوں۔ میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ میں اس سطح تک پہنچ گیا ہوں جہاں اتنی جلد پہنچنے کی مجھے توقع

نہیں تھی۔ میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی کرنا ہو اس کو کل پر چھوڑنے کے بجائے آج ہی کر لینا چاہیے۔ کسی کی یاد دہانی یا تقاضے کا انتظار کیوں کیا جائے۔ تقاضا مجھے زہر لگتا ہے۔ مجھے اپنے اوپر کسی کا دباؤ اچھا نہیں لگتا اس لیے کہ میں، ذرا آگے ہی بڑھ کر، ہمیشہ لوگوں کو خوش رکھنا چاہتا ہوں مگر جب لوگ مجھ پر دباؤ ڈالتے ہیں تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ میں سماجی کام بھی کرتا ہوں، اور مجھے معلوم ہے کہ کس طرح لوگوں کی مدد کی جاسکتی ہے۔ اگر کوئی آپ کو کسی کام کی ذمے داری سونپے تو آپ کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ آپ اس کام کو نہیں کر سکتے۔ آپ ضرور کر سکتے ہیں مگر آپ کوئی معجزہ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ایک اکاؤنٹنٹ ہیں تو یقیناً آپ سے کسی مشین کے ایجاد کی توقع نہیں کی جائے گی۔ دنیا میں کوئی کام بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ 'کرو، کرو، کرو!''

کیا اب آپ کے تصور میں کسی نرے اکاؤنٹنٹ کا نقشہ ابھرا؟ جب میں اور حسن علی اکبر، بھیم جی کے بڑے بیٹے، حیدر بھیم جی، کے بارے میں باتیں کر رہے تھے تو میں نے ان کو ایک خود بین اور خاموش طبع انسان کہا تھا۔ اور میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ایک دقیقے کے لیے حسن علی کچھ الجھ سے گئے تھے، بلکہ متعجب ہو گئے تھے اور فوراً ہی انھوں نے کہا تھا، '' شاید وہ ایسے ہی ہیں، مگر اس ملک کی اکاؤنٹنٹ برادری میں یہ کیفیت عام ہے۔''

دیکھا آپ نے؟

طاہر ساچک

ایک غیر متوقع نعمت

کراچی جیسے تیزی سے پھیلتے ہوئے شہر میں ان کو تلاش کرنے کے لیے آپ کو اپنے ہاتھوں میں پورے شہر کا نقشہ لے کر گھومنا پڑے گا۔ وہ آپ کو بڑے بینکوں، انشورنس کمپنیوں، اسٹاک بروکروں اور تجارتی اداروں کے پاس نہیں ملیں گے جن کے دفاتر ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں میں محمد علی جناح روڈ، چندریگر روڈ، ایلفنسٹن اسٹریٹ اور صدر جیسے بڑے مقامات پر ہوا کرتے تھے۔ آج کل، مالیات اور تجارت کی دنیا پورے شہر کے وسیع علاقوں میں پھیل گئی ہے، کاروباری مراکز اب کلفٹن، ڈیفنس، پی ای سی ایچ ایس، ڈرگ روڈ (جس کو اب شارع فیصل کہتے ہیں) وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور بالآخر انھیں مقامات میں سے کسی ایک جگہ آپ کو طاہر ساچک مل جائیں گے، بشرطیکہ آپ کسی محفوظ ڈرائیور کے رحم و کرم پر ہوں۔ ان کا دفتر ایک بہت آرام دہ بنگلے میں واقع ہے جو ایک گلی کے آخر پر ہے جہاں سے بظاہر آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں نظر آتا۔ رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ ان کے دفتر کا خوب صورت سبزہ زار ہر آنے والے کا دل موہ لیتا ہے۔ سو، یہ ہے وہ مقام جہاں ۱۹۷۲ء میں سرکاری ملکیت میں لیے جانے والی ای ایف یو لائف کی، جس نے پاکستان کی تاریخ کے اوراق اپنی کامیابیوں سے دیے تھے، دوبارہ تجسیم ہوئی ہے۔

مندرجہ ذیل صفحات اس عظیم ادارے کی نشاۃ الثانیہ کی داستان سے مملو ہیں جس کے کرتا دھرتا ایک بار پھر کامیابیوں کی نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ دراصل یہ داستان اس شخصیت کے تذکرے کا مقدمہ ہے جو برطانیہ میں ایک چھوٹی سے لائف انشورنس کمپنی میں ڈائریکٹر کے رتبے تک پہنچ گیا تھا۔ CCL نام کی اس کمپنی کے بنیاد گزار دو عظیم پاکستانی بینکر اور کاروباری، مرحوم آغا حسن عابدی اور مسٹر روشن علی بھیم جی تھے۔ آغا صاحب سے کون واقف نہیں، جنھوں نے کاروبار کی دنیا میں ایک بڑی مالیاتی 'سلطنت' بنانے کے بظاہر ناممکن خواب کو حقیقت کا روپ دے کر ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ان کے ہم رکاب تھے جناب روشن علی بھیم جی، جنھیں پاکستان کے لوگ انشورنس کے 'گرو' کے نام سے یاد کرتے ہیں، جو پاکستان کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی ایسٹرن فیڈرل یونین کے سپہ سالار رہ چکے تھے اور ای ایف یو گروپ آف کمپنیز کے اس نئے شگوفے کے شفیق باپ تھے۔

بنیادی طور پر یہ اس شخص کا خاکہ ہے جو اس نئی کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہے۔ اس کا نام طاہر ساچک ہے، جس کو اس کے اعزہ اور دوست 'پیچو' جیسی پیاری کنیت سے پکارتے ہیں۔ طاہر افریقا کے ملک ٹانگانیکا میں پیدا ہوئے تھے جس کو اب تنزانیہ کہا جاتا ہے۔ ان کے ہندوستانی باپ نے 'کچھ' سے ہجرت کی تھی اور اپنی نئی سرزمین پر پٹسن جیسے ایک پودے (Sisal) کی کاشتکاری کرتے تھے جس کے ریشے سے افریقا میں رسیاں بنائی جاتی ہیں۔ اس زمانے میں بہت سے ہندوستانی، برطانوی سرکار کے ایما پر مختلف ممالک میں پھیل گئے تھے۔ طاہر کی والدہ بھی ہندوستانی نسل کی تھیں مگر وہیں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والد بھی، اپنے بھائی کی طرح جو چند برس قبل ہجرت کر گئے تھے، ٹانگانیکا

چلے گئے تھے۔ یہ کیفیت ہندوستانیوں میں عام ہے کہ خاندان کا ایک فرد اگر کہیں جا کر آباد ہو جاتا ہے تو اس کے قریبی عزیز و اقارب بھی نئی بستیوں میں قسمت آزمانے نکل پڑتے ہیں۔

اپنی یادوں کی وادیوں میں بھٹکتے ہوئے طاہر نے بتایا کہ ''میرے والد نے اپنا کاروبار نئے سرے شروع کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد اور والدہ کئی گھنٹے کی مسافت طے کر کے اپنے علاقے میں پہنچتے تھے اور بڑی محنت سے اپنی فصل لگاتے تھے۔ بالآخر زراعت کے میدان میں ان کی کوششیں کامیاب ہو گئیں اور انھوں نے کافی جائیداد بنالی تھی۔ مگر افسوس کہ برطانیہ کے تسلط کے اختتام پر ملک کی آزادی کے بعد سب کچھ ضبط کر لیا گیا اور ہندوستانی نسل کے لوگوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔ وہ در بدر ہو گئے اس لیے کہ اب ان کا کوئی ملک نہیں رہ گیا تھا، نہ ہندوستان جہاں سے وہ ہجرت کر چکے تھے نہ ہی برطانیہ جس کی شہریت حاصل کر لینے کے باوجود ان کے بنیادی حقوق سلب کر لیے گئے تھے۔ ہمارا خاندان بھی بٹ کر رہ گیا تھا۔ ہم سب انفرادی طور پر جدھر سینگ سمائی اُدھر چل دیے۔ میرے ایک بھائی اور ایک بہن کینیڈا چلے گئے، میرے والدین ایک بھائی اور بہن کے ساتھ کینیا کے شہر مومباسا چلے گئے جو ہمارے 'گھر' سے صرف دو تین گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ مومباسا میں میرے والدین نے چھٹیاں گزارنے کے لیے ایک فلیٹ لے رکھا تھا، اس لیے کہ وہ مقام تفریحی چھٹیوں اور خریداری کے لیے بہت اچھا تھا۔ اس طرح مومباسا ہمارے خاندان کی قیام گاہ بن گیا۔ پھر میری بہن کی شادی ہو گئی اور وہ تعلیم کے لیے امریکا چلی گئی۔ اور میں نے برطانیہ ہی میں قیام کا فیصلہ کیا جہاں میں تعلیم کے سلسلے میں مقیم تھا۔ میری عمر گیارہ برس تھی جب مجھے تعلیم کے لیے برطانیہ بھیج دیا گیا تھا۔ میں نے اپنی تعلیم وہیں مکمل کی اور بزنس ایڈمنسٹریشن میں ایم اے کیا تھا۔ منصوبہ تو یہ تھا کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں واپس تنزانیہ چلا جاؤں گا اور کاروبار میں اپنے خاندان کا ہاتھ بٹاؤں گا۔

سرکاری کاغذات میں میری پیدائش ۱۹۴۸ء درج ہے مگر ہماری خاندانی روایات کے مطابق عموماً پیدائش کا اندراج بعد میں کرایا جاتا تھا۔ ہم سب بھائی بہنوں نے اپنی اصل تاریخِ پیدائش نکالنے کی کوشش کی ہے اور اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ میں ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ یہ حالات پر منحصر ہے کہ یہ بات مضحکہ خیز بن جائے یا شرمندگی کا باعث ہو مگر، بالخصوص، جب میں نے برطانوی سرکار کی ملازمت کا ارادہ کیا تھا اس وقت یہ مسئلہ میرے لیے شرمندگی کا باعث بھی ہوا تھا۔ بہر حال سب کچھ بخوبی طے ہو گیا تھا مگر اس میں شک نہیں کہ میری سرکاری اور اصل تاریخ پیدائش کا مسئلہ ہمیشہ باقی رہے گا۔''

'پیچھ' پانچ برس تک برطانیہ کی سرکاری ملازمت میں رہے تھے پھر چند ذاتی وجوہ کی بنا پر اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ وہ برسٹل میں مقیم تھے مگر ساری عمر وہاں رہنا انھیں بالکل پسند نہیں تھا۔ انھوں نے اپنا تبادلہ لندن کرانا چاہا جو نہیں ہو سکا۔ اس لیے انھوں نے لائف انشورنس میں کام کرنے کا ارادہ کر لیا۔ انھوں نے بتایا کہ ''یہ حادثاتی طور پر ہوا تھا۔ میں اپنے بھائی کے مومباسا کے دنوں کے ایک دوست سے ملا جو الائیڈ ڈنبار (Allied Dunbar) میں کام کرتے تھے، اور خاصے کامیاب تھے۔ انھوں نے مجھے اس ادارے میں شمولیت کا مشورہ دیا اور کہا کہ کچھ دن کام کر کے میں خود اندازہ لگاؤں کہ میں اس کاروبار میں کامیاب ہو سکتا ہوں یا نہیں۔ اپنی تعلیمی پس منظر کی بنا پر میرا خیال تھا کہ میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میرا یہ نیا دوست تو چاہتا ہی تھا کہ میں اس ادارے میں پھنس جاؤں اس لیے کہ میرے تعارف کے صلے میں اسے پچاس پاؤنڈ ملنے والے تھے۔ میں نے اس کو مایوس نہیں کیا۔ میں نے الائیڈ ڈنبار میں شمولیت اختیار کر لی اور دو برس تک سیلز مین کی حیثیت سے کام کیا۔''

اس ادارے کا مرکزی دفتر سوینڈن (Swindon) میں تھا۔ یہ کمپنی برطانیہ کے انشورنس کے شعبے میں کامیابی کی ایک حیرت انگیز داستان بن چکی ہے۔ اس ادارے نے مختلف نوعیت کی پالیسیاں بنائی تھیں اور جدید تکنیک کی مدد سے خدمات کے سلسلے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ لوگ انشورنس کے روایتی ایجنٹوں کے برعکس اپنے کارکنوں کو سخت تربیت کے ذریعے صحیح معنوں میں لاجواب پیشہ ور بنا دیتے

تھے۔ طاہر ساچک خود انشورنس بیچنے کے ساتھ ساتھ فنِ تربیت میں، نئے انداز سے فروخت کے طریقوں اور جدید تکنیک میں ہمیشہ دل چسپی لیتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اونچے درجے کی تربیت دینے والوں میں بھی رضا کارانہ طور پر شامل ہو جاتے تھے۔ لہٰذا منطقی طور پر، جوں ہی کمپنی میں ٹریننگ منیجر کی جگہ خالی ہوئی انھوں نے درخواست دے دی۔ ان کو تمام قسم کے انٹرویو سے گزرنا پڑا، اور نئے تربیتی نصاب کی کامیاب تمثیل کے بعد انھیں ملازمت مل گئی۔

طاہر نے بتایا کہ ''اس وقت میری سالانہ تنخواہ چھ ہزار پاؤنڈ تھی اور ملازمت پکّی ہو جانے کے بعد ایک موٹر کار کا بھی وعدہ کیا گیا تھا، یعنی پانچ دروازوں والی اسٹیشن ویگن جیسی ایک Citroen GSA میں بہت خوش ہوا اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ میں کمپنی کے معیار پر پورا اتروں گا اور یہیں سے میرے دل چسپ پیشے کی ابتدا ہوگی، مجھے اس بات کا پورا یقین تھا۔ مجھے بہت سوچ بچار بھی کرنا تھا اس لیے کہ میری اہلیہ امید سے تھیں اور میری پہلی اولاد متوقع تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ بچہ برسٹل ہی کے قیام کے دوران پیدا ہو اس لیے کہ ہم جتنے ڈاکٹروں سے واقف تھے سب وہیں مقیم تھے۔ اس طرح مجھے کئی ماہ اپنی اہلیہ سے الگ گزارنا پڑے تھے مگر ملازمت کے اعتبار سے یہ ایک خوش آئند فراق ٹھہرا۔''

ٹریننگ منیجر کی حیثیت میں 'پیچو' کو بہت پسند کیا گیا اور ان کی بہت عزت افزائی ہوئی۔ لوگ ان کی نرم خوئی، ملائم آواز اور محکم انداز میں پیغام پہنچانے کے طریقے کے گرویدہ ہو گئے۔ خود انھیں بھی اپنے کام میں بہت لطف آنے لگا تھا۔ الائیڈ ڈنبار کے ڈھانچے میں تمام تکنیکی تربیت ان کے مرکزی دفتر واقع سوینڈن ہی میں ہوتی تھی اس لیے تربیت دینے والوں کو ہر قسم کے تکنیکی نصاب کو ایک مرکزی مقام پر ہی پڑھانا ہوتا تھا جو ان کے لیے اچھا اور دل چسپ بھی ہوتا تھا۔ مرکزی تربیت گاہ میں تین برس کی کامیاب اور دل چسپ ملازمت کے بعد ان کو جنوب مغربی ریجن کے دفتر برسٹل میں برانچ منیجر بنانے کی پیش کش کی گئی۔ طاہر نے کہا کہ ''مجھے اس پیش کش کو قبول کرنے کے لیے بہت سوچ بچار کرنا پڑا تھا اس لیے کہ میں سوینڈن میں بہت خوش تھا۔ ہمارا تربیت کا مرکز بہت عمدہ تھا اور کارکنوں سے میرے اچھے روابط استوار ہو گئے تھے۔ مگر میری ترقی کی ایک نئی راہ کھل رہی تھی اس لیے میں نے بالآخر اس پیش کش کو قبول کر لیا۔ اس وقت تک یہ ادارہ Hambro Life بن چکا تھا۔ میں اس ملازمت میں پانچ برس تک رہا۔''

طاہر ساچک اس ادارے میں، جو اب ہیمبرو لائف بن چکا تھا، بہت خوش رہے ہوں گے اس لیے کہ وہ ہمیشہ اس کے لیے اچھے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اپنی زندگی کے اس عرصے کو یاد کر کے مسحور ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اس کمپنی کی اعلیٰ درجے کی پیشہ ورانہ صلاحیت کی تعریف کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ادارے کی تیز ترقی کے لیے اپنی جدید تکنیکی درس گاہ، اور ایک مخصوص تہذیب پر انحصار سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا ہوگا۔ پھر ایک دن انھیں Trident Life, Gloucester سے پورے ملک کے لیے Manager for Sales and Development Training کی پیشکش کی گئی تو وہ پس وپیش میں پڑ گئے، اور کسی حد تک افسردہ بھی ہوئے تھے۔

اب ماضی پر نظر ڈالتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ''شاید مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر زندگی واقعات کی ایک زنجیر کی طرح ہوتی ہے، جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی جاتی ہیں۔ میں نئی ملازمت میں کچھ زیادہ خوش نہیں رہا تھا مگر کم از کم یہ آگے کی جانب ایک قدم تھا، یعنی مقامی سے قومی حیثیت کے طرف۔ یہ ملازمت کسی ادارے میں میری سب سے کم عرصے کی ملازمت تھی۔ وہاں میں سیلز ڈائریکٹر کو جواب دہ تھا اور وہ حضرت کہتے کچھ تھے کرتے اور کچھ اور تھے۔ بڑے بڑے وعدے کیے جاتے مگر پورے نہیں ہوتے تھے۔ میں ان کے ساتھ کام کرنے میں دقت محسوس کرنے لگا تھا مگر سکون اور قناعت کے لیے انسان کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اتفاق سے یہی وہ وقت تھا جب میرا CCL سے رابطہ ہوا تھا۔ میں نے اس کمپنی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، کہ اس کا تعلق ملک میں سب سے زیادہ تیزی سے ترقی کرتے ہوئے ایک بینک BCCI سے ہے جو کچھ پاکستانی حضرات، آغا حسن عابدی اور روشن علی بھیم جی، نے مل کر قائم کیا ہے جن کے نام میں نے کبھی نہیں سنے تھے۔ اب اس کمپنی کے سربراہ میرے Allied Dunbar/Hambro Life کے زمانے کے ایک پرانے ساتھی

مسٹر عزیز خان تھے جو مجھ سے بہت سینئر تھے۔ CCL میں آنے سے پہلے عزیز خان سویڈن میں ایڈمنسٹریشن ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان دنوں میں اس ادارے میں ٹریننگ منیجر تھا۔ کمپنی کے ڈائریکٹر ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے واقف تھے مگر میں ان سے زیادہ واقف نہیں تھا۔ انھوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنی کمپنی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر، سیلز اینڈ ڈیولپمنٹ کی ملازمت کی پیش کش کی۔ میں نے ان کی پیش کش قبول کر لی اور ۴/جولائی ۱۹۸۴ء سے میں نے وہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یہ تاریخ اس لیے یاد ہے کہ یہ امریکا کا یوم آزادی تھا۔ باوجود اس کے کہ CCL کی ساکھ کچھ خراب سی تھی، میں نے اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ لوگ اس بات پر حیرت کر رہے تھے کہ مجھ جیسا شخص، جو اچھی شہرت کی برطانوی کمپنیوں میں کام کر چکا ہے، ایسے ادارے میں کیوں جا رہا ہے، جس کو غیر ملکی لوگ چلا رہے ہیں۔ مارکٹ میں یہ کمپنی خاصی گھٹیا شہرت رکھتی تھی۔ مگر میں تو اس لیے شامل ہو رہا تھا کہ میں عزیز خان سے بہت متاثر تھا۔ میں نے کمپنی میں شمولیت سے پہلے دیکھ لیا تھا کہ اب اس میں اچھی ساکھ والے، مشہور اور پیشہ ور، اعلیٰ درجے کی برطانوی کمپنیوں کے لوگ، میں جن میں کام کر چکا تھا، شامل ہو رہے ہیں۔ CCL میں ایسے لوگوں کی آمد اور موجودگی کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ اس ادارے میں شمولیت کے لیے یہی سب سے اچھا وقت ہے، اس لیے کہ جب کسی ادارے کے حالات خراب رہے ہوں اور اس میں اچھے لوگ شامل ہو رہے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں سدھار کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ لہٰذا میرے لیے اس ادارے میں ترقی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔''

طاہر کی حس اور توقعات نے ان کو ماضی میں کبھی دھوکا نہیں دیا تھا، اور جتنے بھی قدم انھوں نے اٹھائے تھے سب درست سمت میں تھے۔ ان کے پرانے ساتھی، عزیز خان نے، جن کو وہ ''قوت کا منبع'' کہتے تھے، بہت جلد اس بیمار ادارے کے حالات پر قابو پا لیا اور اس میں ایک کامیاب لائف آفس بننے کے آثار پیدا ہو چلے تھے اور لگتا تھا کہ یہ بھی الائیڈ ڈنبار جیسی ایک کامیاب داستان بننے والی ہے۔ اور پھر نہ صرف عزیز خان نے بلکہ دوسرے لوگوں نے، اور کمپنی کے بورڈ نے، بھی مسٹر ساچک کے کام کی تعریف کی۔ طاہر نے کمپنی کی نئے سرے سے تنظیم میں بھی ہاتھ بٹایا اور ساتھ ہی سیلز والوں، بیمہ داروں اور تعلقاتِ عامہ سے متعلق سارے مطبوعہ مواد کو نئے انداز سے ترتیب دے کر خوب صورت اور اثر انگیز بنا دیا۔ اس کام کے صلے میں، جس نے ادارے کی ساکھ کو بلند کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا، طاہر کو ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اپنی فطرت کے مطابق وہ اب اپنے کام سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے اور اس میں ایسے غرق رہتے کہ انھیں اپنے اطراف ہونے والی باتوں تک کا علم نہیں ہوتا تھا۔ انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ 'بورڈ روم' میں روشن علی بھیم جی، ان کے دو پرانے وفادار ساتھی، شرافت والا جاہی، نواب حسن اور دو پرانے انگریز ساتھی جو روزِ اوّل سے کمپنی کے ڈائریکٹر تھے یعنی ڈیوڈ ڈاؤلین (David Dowlen) اور جان پال (John Paul) ایک طرف ہو گئے تھے اور اپنے معتمد ساتھیوں کے ہمراہ عزیز خان اور BCCI کے اعلیٰ افسران (کمپنی میں حصے داروں کی نمائندگی کرنے والے) دوسری طرف تھے اور ان میں رسہ کشی جاری تھی۔ طاہر کو اپنے قریبی ساتھیوں سے اتنا ضرور معلوم ہوتا رہتا تھا کہ ابھی حالات بالکل ٹھیک نہیں ہوئے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ دوپہر کے کھانے کی میز پر یا شام کو بیئر (Beer) نوشی کے دوران زیرِ بحث آتا رہتا تھا۔

طاہر کہتے ہیں کہ ''میں اپنے کام میں بہت مصروف رہتا تھا۔ میرے سامنے کمپنی کی جو تصویر کھینچی جاتی تھی وہ بہت خوش نما ہوتی تھی۔ خوب صورت اور دیدہ زیب شائع شدہ مواد، اچھے اشتہارات وغیرہ کو دیکھ کر اس بات پر یقین کرنے کو جی چاہتا تھا کہ واقعی حالات صحیح سمت میں جا رہے ہیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارا لاجواب ساتھی ادارہ BCCI، بین الاقوامی سطح پر بیسواں سب سے بڑا مالیاتی ادارہ بن چکا تھا اور اس کے زیرِ انتظام بیس کھرب پاؤنڈ جمع ہو چکے تھے۔ ہاں! یہ سارا منظر جو باہر کی دنیا کے لیے بنایا جا رہا تھا، کتنا خوش نما لگتا تھا۔ اور کم از کم لائف انشورنس کمپنی کے تعلق سے یہ سب کچھ صحیح بھی تھا اور اچھا بھی۔ ہم لوگ، یعنی ہماری بیمہ کمپنی CCL، کافی مستحکم ہو چکی تھی اور ترقی کی طرف گامزن تھی۔ ہم تمام سینئر افسروں میں سے کسی کو بھی یہ گمان بھی نہیں تھا کہ ہماری مالک کمپنی CCI

Luxembourg کی مالی ساکھ کو کوئی خطرہ درپیش ہوسکتا ہے۔ مگر یہ سب ایک رات میں تہ وبالا ہوگیا جب Financial Times نےBCCI کے ناگوار اندازِ کار کے بارے میں کہانیاں اور حقائق شائع کردیے جن سے ظاہرہوتا تھا کہ Bank of Credit & Commerce بڑی مشکلات سے دوچار ہو چکا ہے۔''

میرے خیال میں اس وقت کے حالات کا یہ ایک ستھرا تجزیہ ہے۔ اور ہم اگر پلٹ کر دیکھیں تو لندن کے بینک میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کے برعکس دبئی، سعودی عرب اور لندن کی بیمہ کمپنیاں اچھا خاصا کام کر رہی تھیں۔ اگرچہ وہ سب Credit & Commerece ہی کے نام سے کام کر رہی تھیں مگر ان کی مشترکہ مالیاتی بنیادیں ایک ہونے کے باوجود وہ بیمے کے کاروبار میں الگ الگ اپنے اپنے تشخص بنا چکی تھیں۔ جیسے ہی انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ آغا صاحب کے گرد موجود بینک کی اہم شخصیات انشورنس کمپنیوں پر بھی اپنی شاہانہ حکمرانی چاہتی ہیں، مسٹر روشن علی بھیم جی کی 'صاحبِ کشف' شخصیت نے، جو ہمیشہ سے تھی اور آج بھی ان کی اصل قوت ہے، اپنا الگ تشخص بنانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوگئی۔ ان کے تمام ساتھی خود کو ایک الگ خانے میں رکھ کر پیش کرنے لگے تھے مگر اسے ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ جب مسٹر بھیم جی پاکستان کی وزیرِاعظم کے مشیرِ مالیات بن کر اسلام آباد چلے گئے تھے تب بھی لندن کی انشورنس کمپنی اپنے ستھرے کاروبار کی بنا پر مقامی روپ میں نظر آنے لگی تھی۔ اس سلسلے میں طاہر ساچک نے بہت کام کیا تھا۔ ان ہی کی وساطت اور موجودگی کی وجہ سے ان کی پہلی کمپنی ٹرائیڈنٹ لائف میں کام کرنے والے بہت سے برانچ منیجر اس نئی کمپنی میں شامل ہونے لگے۔ اس طرح CCL کی سیلز ٹیم ایسی مستحکم ہوگئی تھی کہ بہت سی مقامی کمپنیوں کو ان پر رشک آنے لگا تھا۔

بہر حال جوں ہی اخبارات میں بینک کے بارے میں تباہ کن خبریں آنی شروع ہوئیں CCL انشورنس کمپنی کی تمام ترقیاتی کامیابیوں کو گہن لگنا شروع ہوگیا۔ پالیسی ہولڈر سراسیمہ ہو کر اپنی پالیسیاں بند کرانے لگے اور جب بینک آف انگلینڈ نے بینک کو بند کرنے کا حکم صادر کردیا تو بینک میں جمع انشورنس کمپنی کی بیشتر رقم ایک آن میں ڈوب گئی۔ برطانیہ کے نہایت سینئر اور قابلِ احترام ایکچوری مائیکل بیل (Michael Bell) کو، جو ابتدائی دنوں میں انشورنس کمپنی بنانے کے سلسلے میں بھی مسٹر بھیم جی کی مدد کرچکے تھے، CCL کے لیے خریدار تلاش کرنے پر مامور کردیا گیا۔ قصہ مختصر، اکتوبر ۱۹۹۲ء میں اس کمپنی کو Century Life Assurance نے خرید لیا۔ یہ کمپنی اب بھی قائم ہے مگر پرانی انتظامیہ کے بغیر۔ اس طرح ایک ''تقریباً'' کامیاب کمپنی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ افسوس کہ وہ کمپنی جو بڑے چاؤ اور امیدوں کے ساتھ سے قائم کی گئی تھی، اور اپنی مشکلات کے اندھیروں سے نکل کر کامیابی کی طرف گامزن ہو چکی تھی، اپنے اچھے دن دیکھنے سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔

جب طاہر مجھے CCL کے آخری دنوں کی روئیداد سنا رہے تھے تو بہت افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ افسردہ اس لیے کہ جس کمپنی کو اتنی محنت سے بنایا گیا تھا وہ برطانوی مارکٹ میں آگے چل کر ایک بڑا خوب صورت اور مستحکم ادارہ بن سکتی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ''جب سینچری لائف نے ہماری کمپنی کو خرید لیا اس وقت بھی ایک تاب ناک مستقبل کی توقع پیدا ہوگئی تھی اور ہم سب بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ مگر بعد میں حالات صحیح سمت میں نہیں بڑھے۔ ہم سب کو ناراحتی کا احساس ہونا شروع ہوگیا اس لیے کہ ہمیں اپنا مستقبل محفوظ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں تو سکون سے تھا، میرے کام میں تو کسی نے دخل اندازی نہیں کی مگر میں نے دیکھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بہت نامناسب برتاؤ شروع ہوگیا تھا۔ میں دراصل دروغ گوئی کا مرتکب ہوں گا اگر میں یہ کہوں کہ اس وقت بھی مجھے اپنے کام میں لطف آرہا تھا۔ لہٰذا اب وہ وقت آگیا تھا کہ ہم لوگ کام کر رہے تھے، اپنی تنخواہ حلال کر رہے تھے مگر کام کرنے میں مزہ نہیں رہا تھا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک روز اچانک ہمارے افسر عزیز خان کو کمپنی سے نکال باہر کیا گیا۔ روزِ اوّل سے کمپنی سیکریٹری کے فرائض انجام دینے والے مسٹر یوسف بھی سبکدوش کردیے گئے مگر کچھ دنوں کے لیے ان کو مشیر کے طور پر رکھ لیا گیا تھا۔ ایک روز انھوں نے مجھے بتایا کہ مسٹر بھیم جی پاکستان میں ایک نئی کمپنی بنانے والے ہیں۔ پھر اس سلسلے میں مجھ سے بات کی جانے لگی۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ میں اتنی دور واقع ملک پاکستان کی کسی کمپنی میں کبھی کام کروں گا۔''

یہ قسمت کا کھیل تھا یا کوئی شدنی امر کہ جس دن جب برطانیہ میں کمپنیز رجسٹرار کے کارڈف دفتر نے سند جاری کی تھی کہ CCL Assurance Ltd نے اپنا نام تبدیل کرلیا ہے اور اب اس کا نام Century Life Assurance Ltd ہوگیا ہے، اُسی دن، وہی مسٹر بھیم جی، جنھوں نے CCL کی ابتدا کی تھی، پاکستان میں ایک نئی کمپنی کی بنیاد رکھ رہے تھے، یعنی اس وقت مسٹر بھیم جی کا ایک بہت پُرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا تھا اس لیے کہ حکومتِ پاکستان نے نجی شعبے میں بیمۂ زندگی کی اجازت دی دے تھی، اور ای ایف یو لائف ان میں سے ایک تھی۔

طاہر ساچک کو مزید تفصیلات کا علم نہیں تھا مگر ان کو اتنا ضرور بتایا گیا تھا کہ اسٹاک ایکسچینج میں ای ایف یو لائف کے شیئرز کی فروخت کی شروعات کے فوراً بعد کمپنی کے صدر دفتر کے شہر اسلام آباد میں ایک رنگا رنگ تقریب منعقد کی گئی ہے۔ اس تقریب کے مہمانِ خصوصی جسٹس میاں محبوب تھے اور اس میں اعلیٰ فوجی اور سرکاری افسران اور تجار بھی مدعو کیے گئے تھے۔ یہ نومبر ۱۹۹۲ء کی بات ہے، مسٹر بھیم جی کی پچھترویں سالگرہ کے چند دن بعد کی۔ ان کے لیے یہ کتنا اچھا اور یادگار موقع تھا، ایک فخر کا اور تسکین کا موقع۔ اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن آف پاکستان کی تشکیل کے پورے بیس برس بعد زندگی کے بیمے کی صنعت پر حکومت کی اجارہ داری ختم ہوگئی تھی اس لیے کہ نجی شعبے میں ای ایف یو لائف دوبارہ زندہ ہوگئی تھی۔

مسٹر بھیم جی جانتے تھے کہ ایک نئی، اور شاید اپنی زندگی کی آخری، کمپنی کا بوجھ اٹھانا ان کے لیے مشکل ہوگا۔ اس لیے انھوں نے اس نئی کمپنی کے مناسب اعلیٰ افسران کے لیے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایسے لوگ پاکستان میں دستیاب نہیں تھے۔ ملکی بیمے کی صنعت پر حاوی تمام بڑے لوگوں کو اسٹیٹ لائف نے اپنے آپ میں جذب کرلیا تھا اور اب صرف وہی لوگ رہ گئے تھے جو ریٹائر ہو چکے تھے یا اپنی عمر کے آخری حصے میں تھے۔ ان میں سے جو بچ رہے تھے وہ صحیح معنوں میں 'سرکاری افسر' بن چکے تھے اس لیے اس نئی کمپنی کے لیے مناسب نہیں رہے تھے۔ نہ بڑے افسر اور نہ نچلے درجے کے ملازمین، انتظامیہ کے یا سیلز فورس کے، کوئی بھی نجی اداروں کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ نئی کمپنی کی انتظامیہ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ نئے خون کی فراہمی، پڑھے لکھے، تیز طرّار اور تربیت یافتہ نوجوانوں پر مبنی ایسی سیلز ٹیم کی تشکیل تھا جو موجودہ معاشرے کی ایک ممتاز کمپنی کے سفیر کی حیثیت اختیار کرسکیں۔ اس ادارے کے خالق کو یقین تھا کہ اگر محنت کی جائے تو ایسے لوگ فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ مگر تجربے کار لوگوں کی تلاش ذرا مشکل مسئلہ تھا۔ لہٰذا مائیکل بیل، جو بعد میں کمپنی کے چیف کنسلٹنگ ایکچوری بنے، عمر مرشد، مسٹر بھیم جی کے دونوں بیٹوں، مسٹر سیف الدین زومکا والا اور میونخ ری کے دوستوں کے درمیان طویل مشاورت کے بعد یہ طے پایا کہ کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو کی آسامی کے لیے لندن میں مناسب شخص کی تلاش کی جائے۔

روشن علی بھیم جی نے اس سلسلے میں اپنے پرانے ساتھی ابا علی یوسف سے رابطہ کیا جو اس وقت بھی کچھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں سینچری لائف سے متعلق تھے۔ انھوں نے مسٹر طاہر ساچک کا نام پیش کیا جن کو پاکستان میں اس پیش رفت کا علم تھا۔

طاہر نے کہا، "میں ایک دن مسٹر بھیم جی کے بڑے بیٹے رفیق سے، ماربل آرچ کے قریب لندن کے فلیٹ میں جو کریڈٹ اینڈ کامرس کے زمانے سے ان کے خاندان کی ملکیت تھا، ملاقات کر رہا تھا اور وہ مجھے تفصیل سے بتا رہے تھے کہ نئی کمپنی کس طرح وجود میں آئے گی۔ پھر انھوں نے اصل سوال اٹھا کہ کیا میں اس منصوبے میں کسی بھی حیثیت میں شامل ہونا پسند کروں گا، یا، کم از کم کچھ وقت کے لیے اس کمپنی کی شروعات میں مدد کرنے پر راضی ہوں گا۔ پھر چند دنوں بعد مسٹر بھیم جی خود لندن آئے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں دو ہفتوں کے لیے خود پاکستان آکر دیکھنا پسند کروں گا کہ کراچی کے حالات کیسے ہیں۔ انھوں نے مجھے یہ پیش کش بھی کی کہ میری اہلیہ اور میرا بیٹا بھی کراچی آسکتا ہے، اس لیے کہ ان کے اعزہ کراچی میں مقیم تھے۔ اور پھر ایک دن ہم نے تین بجے رات خود کو کراچی کے ایئرپورٹ پر پایا۔ ہمیں لینے کے لیے اور ہر وقت خدمت کے لیے ایک کار ایئرپورٹ پر موجود تھی۔ پھر میں قمر ہاؤس گیا، مسٹر بھیم جی اور ان کے ساتھیوں سے میری

ملاقات ہوئی ۔ دن بھر بات چیت کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر چہ میری خواہش تھی کہ میں عملی طور پر بھی کچھ دیکھوں۔ مگر بس اس منصوبے کے بارے میں اور اس میں میری شمولیت کے موضوع پر باتیں چلتی رہیں۔ انھوں نے مجھے لاہور اور اسلام آباد جانے کے لیے بھی کہا۔ مجھے خبر نہیں کیوں، مگر پھر ہم لوگ لاہور اور اسلام آباد بھی ہو آئے، مگر مستقل طور پر میرا پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ صرف ایک مشیر کی حیثیت میں ان کی مدد کے لیے تیار تھا، ہمیشہ کے لیے کراچی میں بسنے کے لیے نہیں۔ ہم نے دو دل چسپ ہفتے کراچی میں بسر کیے اور آخر میں مسٹر بھیم جی نے مجھے ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کمپنی میں شمولیت کی پیش کش کر دی۔ میں اس اچانک پیش کش پر حیران ہوگیا اور کہا کہ میں اپنی اہلیہ اور اہلِ خاندان سے مشورے کے بعد جواب دوں گا۔

بات اسی مقام پر ختم ہوگئی۔ میں لندن واپس چلا گیا اور تین چار ماہ بعد مسٹر بھیم جی مجھ سے پھر ملاقات کے لیے لندن آئے۔ ہم نے باتوں کا سلسلہ وہیں سے شروع کیا جہاں پر کراچی میں ختم ہوا تھا۔ اسی دوران میں نے مسٹر بھیم جی کے کچھ افسران کی تربیت بھی کی جو اُن کے ساتھ لندن آئے ہوئے تھے۔ وہ لوگ لندن اور میونخ لائے گئے تھے تاکہ مائیکل بیل اور میونخ کے اعلیٰ افسران سے ان کی ملاقاتیں بھی ہو سکیں اور ان کو کچھ لیکچرز بھی دیے جا سکیں۔ نئی کمپنی میں میری شمولیت پر اصرار جاری رہا اور بالآخر میں نے انکار کر دیا۔ میں نے مسٹر بھیم جی سے معذرت بھی کی اور وضاحت بھی کی کہ میرے لیے ان کی پیش کش قبول کرنا ممکن نہیں۔ مسٹر بھیم جی نے اصرار کیا کہ ان کی اہلیہ 'بانو' میرے گھر آکر میری بیوی شمیم کے سامنے مجھ سے بات کریں گی۔ انھوں نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اس طرح میں پوری طرح سمجھ سکوں گا کہ وہاں میرے لیے کیا مواقع ہیں اور اگر میں نے اس کمپنی میں شمولیت نہ کی تو میرا کتنا نقصان ہوگا۔ پھر وہ لوگ میرے گھر آئے۔ ان دنوں میری اہلیہ امید سے تھیں۔ خواتین نے مل جُل کر خورد ونوش اور چائے کا انتظام کیا اور وہیں ہمارے فیصلہ کن مذاکرات ہوئے۔ ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد شمیم سے میری باتیں ہوئیں اور دوسرے دن میں نے مسٹر بھیم جی کو ٹیلی فون پر بتایا کہ ہم کراچی آنے کے لیے تیار ہوگئے ہیں۔''

کراچی میں ان کے نفیس دفتر میں بیٹھے ہوئے جب میں نے طاہر ساچک سے کہا کہ آپ کو ای ایف یو لائف کے مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت میں کام کرتے ہوئے آٹھ برس ہوگئے ہیں تو کیا اب آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ آپ نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا اور بالآخر پاکستان آنے کے لیے رضامندی کیوں ظاہر کر دی تھی؟ جواب میں انھوں نے کہا کہ ''میں مسٹر بھیم جی کی شخصیت کی گرم جوشی اور معاملات میں ذاتی دل چسپی لینے کے انداز سے بہت متاثر ہوا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ اپنی جوانی کے زمانے میں وہ بہت بڑے آدمی رہے ہوں گے مگر اس عمر میں بھی ان کا جوشِ حیات اور ان کی جسمانی قوت میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ مجھے ان کے تصورات، ان کی فراخ دلی اور ان کے ساتھیوں کی ان سے وفاداری نے بالخصوص بہت متاثر کیا تھا۔ وفاداری صرف ان لوگوں کی نہیں جو اُن پر انحصار کرتے تھے، ان لوگوں کی بھی جن کا ان کے حلقۂ اثر سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ان کے ترقیاتی منصوبے کا حصہ بننے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔''

مسٹر طاہر ساچک ای ایف یو لائف میں شامل ہوئے، اس کے مینجنگ ڈائریکٹر بن گئے اور اور اس طرح انھوں نے بہت جلد مسٹر بھیم جی کے اعتماد کو صحیح ثابت کر دیا۔

ان کے روز مرّہ کے کاروبار میں اور اس ادارے کو مستعد و کامیاب بنانے میں کمپنی کے نیشنل سیلز ڈائریکٹر مسٹر نسیم چودھری، اور دو جنرل منیجر، مسٹر زیدی اور مسٹر نقوی نے ان کو مدد فراہم کی۔ ان لوگوں کو برطانیہ اور دبئی میں رہ کر کام کرنے کا طویل تجربہ تھا اس لیے ایک نئی کمپنی کی شروعات کے سلسلے میں ان حضرات کی موجودگی بہت کارآمد تھی۔

یہ مسٹر ساچک کا کمال تھا کہ انھوں نے بیرونِ ملک سے آنے والے لوگوں کی جدید تکنیکی مہارت اور نیشنلائزیشن سے قبل کی ایک بہت بڑی شخصیت مسٹر ایم ایچ رضوی کے تجربے کے امتزاج سے، جنھوں نے ان کے نائب کی صورت میں ان کا ساتھ دیا، سات برس کے قلیل عرصے میں ادارے کو حیرت انگیز کامیابی سے ہم کنار کر دیا۔ ان لوگوں نے مل کر بڑی کامیابی اور ہنر مندی سے نہ صرف اسٹیٹ لائف

کی اجارہ داری کے قلعے میں دراڑیں ڈال دیں، بلکہ ان لوگوں نے نجی شعبے کے اپنے حریف، 'امریکن لائف' اور 'کمرشل یونین' کو بھی اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔

ابتدائی دنوں ہی سے اخراجات پر کڑی نظر رکھنا ان کا کلیدی لفظ رہا ہے۔ ان کے ساتھی اعلیٰ افسران کی ٹیم نے بہترین مثال قائم کی ہے۔ ابتدا میں ان لوگوں نے قمر ہاؤس سے کام شروع کیا تھا۔ ای ایف یو جنرل نے اپنے دفاتر میں سے ان کو جگہ فراہم کی تھی۔ ان کا بورڈ روم ان لوگوں کے تصرف میں رہا تھا۔ سکون سے کام کرنے کی جگہ تو کجا، بیٹھنے کے لیے جگہ کی بھی کمی اور اس پر مستزاد، سہولتوں کے فقدان کے باوجود ان لوگوں کے کام کرنے کے جذبے بلند تھے۔ حالات میں اس وقت کچھ بہتری آئی جب ان کو پی ای سی ایچ ایس کے بلاک 6 میں ایک بنگلہ مل گیا جو ان کے چیئر مین کی قیام گاہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھا۔ کمپنی کی ترقی کے منصوبے کے مطابق اس بنگلے کے مالک نے مزید تعمیر کرائی اور ان لوگوں کو اپنے دفاتر کو کارکنوں کے لیے جدید سہولتوں سے آراستہ کرنے کے موقع فراہم کر دیا۔

ای ایف یو کے چیئر مین، مسٹر بھیم جی، نئے ادارے کی کامیابی سے بہت خوش ہوئے اور آہستہ آہستہ پُرسکون ہونے لگے تھے۔ اب سب کچھ محفوظ اور تجربے کار ہاتھوں میں محسوس ہو رہا تھا۔ اعلیٰ افسران کی ٹیم متحد تھی اور ادارے کے بلند معیار کے منصوبے کے مطابق سیلز کے لوگوں کی تربیت ہو رہی تھی۔ میڈیکل ڈائریکٹر کی حیثیت سے ڈاکٹر مانجی جیسے تجربے کار اور اونچی ساکھ کے آدمی کی شمولیت ادارے کے لیے ایک بڑا اثاثہ تھی۔ ان کے علاوہ ای ایف یو کے دوسرے پرانے افسران نے بھی ای ایف یو لائف کو قائم ہونے میں اپنی فوری امداد فراہم کی۔ آغا ناصر علی، جو پرانی ای ایف یو لائف میں سینئر ایگزیکٹیو وائس پریزیڈنٹ تھے اور اسٹیٹ لائف بننے کے بعد اس میں ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے، اس کی بہترین مثال تھے۔ جب تک یہ کتاب شائع ہو کر ای ایف یو گروپ کے کارکنوں، ان کے اہل خاندان اور دوستوں کے ہاتھوں تک پہنچے گی ای ایف یو لائف کو کاروبار شروع کیے ہوئے آٹھ برس مکمل ہو جائیں گے۔ اور اچھی بات یہ ہوئی ہے کہ اس کے بنیاد گزار اور پہلے چیئر مین اس اطمینان کے بعد اپنی کرسی چھوڑ کر دوسرے دنیا جا چکے ہیں کہ ان کی بنائی ہوئی کمپنی محفوظ اور تجربے کار ہاتھوں میں ہے۔ وہ عالمِ بالا میں اس بات پر فخر کر رہے ہوں گے کہ ان کی غیر موجودگی میں بھی ان کے شاگرد اپنا کام مستعدی سے کر رہے ہیں۔ طاہر ساچک جیسے لوگ ان کی ای ایف یو لائف کی کامیابی اور اس کو پرانی کمپنی سے بھی بڑا ادارہ بنانے کے خوابوں اور جذبوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس ملک میں بھی جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کی طرح ترقی کے بہت مواقع ہیں۔ بس صرف وسائل کو پوری طرح کام میں لانے کی دیر ہے۔

ای ایف یو لائف کے مستقبل کی جب بھی بات نکلتی ہے تو اس کے مینیجنگ ڈائریکٹر ایک قسم کی خود بیں جذباتیت اور پُر جوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسی کیفیت دوسرے حالات میں ان کی شخصیت میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ ان کی خاکسارانہ اور خود پر پوری طرح قابو رکھنے کی صلاحیت ان کو شاید ہی کبھی خوابوں اور غیر منطقی کے سیلاب میں بہنے دیتی ہوگی۔

جب بھی ہم مستقبل میں جھانکنے کی کوشش میں پچھلی باتوں کا تجزیہ کرنے لگتے ہیں تو طاہر وہی بات دُہراتے ہیں کہ ''آپ نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ مسٹر بھیم جی کی وہ کون سی ادا تھی جس نے مجھے اس نئے تشکیل شدہ ادارے میں شمولیت پر راضی کیا تھا۔ اور میں نے یہی کہا تھا کہ میں ان کی دور بینی اور جس قسم کی کمپنی وہ بنانا چاہتے تھے ان قدروں اور اعلیٰ تصورت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اور مجھے اس بات پر بڑی مسرت ہے کہ میرے ہاتھوں وہ کچھ ہو رہا ہے، مسٹر بھیم جی جس کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ای ایف یو لائف میں ہم سب کی جو ٹیم بن گئی ہے اس پر میں بہت خوش ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ہم وہ کچھ ضرور حاصل کر لیں گے جس کی تمنا کی گئی تھی۔ اور امید ہے کہ ایک دن مجھے اس شخص کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا جس نے ایک قابلِ قدر ادارہ بنانے کی کوشش میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ مسٹر بھیم جی کی طرح میں بھی ای ایف یو لائف کو ایک عظیم ادارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر ہم ان اصولوں پر کاربند رہے جن کے ذریعے ہم نے اپنا مقصد حاصل کرنے کا

عزم کیا تھا، اور ہمارے بعد آنے والے بھی انھیں خطوط پر چلتے رہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ادارے کا مستقبل بہت تاب ناک ہوگا۔ ہم نے اس ادارے کو جس قسم کی تہذیب دینے کی کوشش کی ہے، اور جس قسم کے لوگوں کا ہم نے انتخاب کیا ہے، یہ سب کچھ مل کر، یہ کمپنی ایک دن بہت بڑا ادارہ بن کر ابھرے گی۔

ہمیں نہایت معروف نام ورثے میں ملا ہے ہم سب کو اس بات کا پورا احساس ہے۔ اور میرے خیال میں روایت کے مطابق ہمیں یہ جو پس منظر نصیب ہوا ہے، اور ہم مستقبل میں کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان سب وجوہات نے ہماری ذمے داریاں اور بڑھادی ہیں۔

ہماری کمپنی کا شان دار ماضی ہمارے لیے بہت اہم ہے اس لیے کہ یہ ایک بہت بڑا ادارہ بن چکی ہے۔ میں اس زعم میں نہیں مبتلا ہوں کہ ہماری نئی کمپنی کسی دن اتنا بڑا ادارہ ہو جائے گی کہ اس میں دس ہزار لوگ کام کر رہے ہوں گے۔ دنیا بھر میں مارکیٹ کے حالات بہت بدل چکے ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جن حالات سے آج ہم دوچار ہیں ان میں انبوہِ کثیر کے ساتھ کام کرنے والے اداروں کا کیا مستقبل ہوگا۔ میں اس ادارے کو پاکستان میں الائیڈ ڈنبار رہیمبر و جیسا دیکھنا پسند کروں گا۔ ایسی کمپنی کے مماثل جس نے اپنے قیام کے بعد برطانیہ کی مارکیٹ کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ لوگ ملک کے صرف بہترین پیشہ ور مہارت والے لوگوں کا انتخاب کرتے تھے اس لیے کہ ہر کوئی ان کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل کرنے کا خواہش مند رہتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے بہترین مال کے لیے آپ لندن کے مشہور ڈپارٹمینٹل اسٹور Harrod's میں داخل ہوتے ہیں۔ میری مراد ہے اعلیٰ معیار کی مصنوعات۔ الائیڈ ڈنبار کا نام ہی معیاری مصنوعات کی ضمانت تھا۔ اور یہی کچھ میں ای ایف یو لائف کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ای ایف یو کے برانڈ نام پر تو میں اثر انداز نہیں ہو سکتا مگر میں اس کے منصب اور معیار پر اس وقت تک ضرور اثر انداز ہوتا رہوں گا جب تک مجھے اجازت ہوگی کہ جس طرح ہم نے کام کی شروعات کی ہے اسی طرح اس کو آگے بڑھاتے رہیں۔ میں پورا زور دے کر یہ کہنا چاہوں گا کہ، مجھے اس مقام تک پہنچانے والے، ہمارے چیئر مین مسٹر بھیم جی، نے میرے کام میں کبھی دخل اندازی نہیں کی۔ اور ان کے بعد بھی جب تک یہی طریقہ جاری رہا تو میرا تصور یہ ہے کہ ای ایف یو لائف ایسا ادارہ بن جائے جس کا نام آتے ہی آپ کے ذہن میں اعلیٰ درجے اور معیار کا تصور ابھرے۔ جب لوگ کثیر الاقوامی اداروں کی عظمت وجلال کے تقابل میں کامیاب مقامی تاجروں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے لگتے ہیں تو مجھے بہت ناگوار گزرتا ہے۔ ایسا تقابل کرتے وقت ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ بسا اوقات بعض قدریں کثیر الاقوامی کے نام کے ساتھ نتھی ہو جاتی ہیں اور وہ دوسرے مقامی اداروں کے نام کے ساتھ تصور نہیں کی جاتیں۔ میں اُصولی طور پر ہرگز بین الاقوامی اداروں کے خلاف نہیں۔ ان میں سے کچھ کمپنیاں بلاشبہ حیرت افزا ہوتی ہیں اور عالمی معاشیات میں ان کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ صرف بین الاقوامی ادارہ ہونا ہی کسی خاص معیار کی دلیل نہیں ہوتا۔ میں ای ایف یو لائف کو ایسا ادارہ بنانا چاہوں گا جس کے بارے لوگ بے ساختہ کہہ اٹھیں کہ دیکھو! یہ ادارہ جسامت کے اعتبار سے نہیں، اپنے معیار کے باعث مختلف ہے۔ اسی طرح جیسے کہ لوگ جنرل الیکٹرک، سیمینز وغیرہ یا بڑے عالمی بینکوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ لوگ ہمارے بارے میں کہیں کہ ہم لوگ اگر بہتر نہیں تو کم از کم بڑی کثیر الاقوامی کمپنیوں جیسے معیار کے تو ہیں۔ اس کے لیے وقت درکار ہوگا۔ ہمیں مارکس اینڈ اسپینسر اور میونخ ری یا اَلیانز کے معیار تک پہنچنے کے لیے ساٹھ یا سو برس نہیں لگیں گے۔ شاید ان کی جسامت تک ہم کبھی نہ پہنچ سکیں، یہ کئی وجوہ سے ناممکن ہوگا، مگر ایسے معیار کے لیے جس پر اپنے ادارے پر لوگ فخر کر سکیں، پچاس ساٹھ برس کا عرصہ لگ سکتا ہے جو میرے بعد ہی ہو سکے گا۔ میں اس وقت تو صرف بیج ہی بو سکتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ اس سے نکلنے والے انکھوے مستقبل میں پھلیں گے پھولیں گے۔"

مجھے یقین ہے کہ ان کے مرحوم مرشد یہ الفاظ سن کر بہت خوش ہوتے جو میرے خیال میں ان کے خوابوں کے حقیقت بننے اور نئی زندگی پانے والی جدید ای ایف یو لائف کی ضمانت ہیں۔

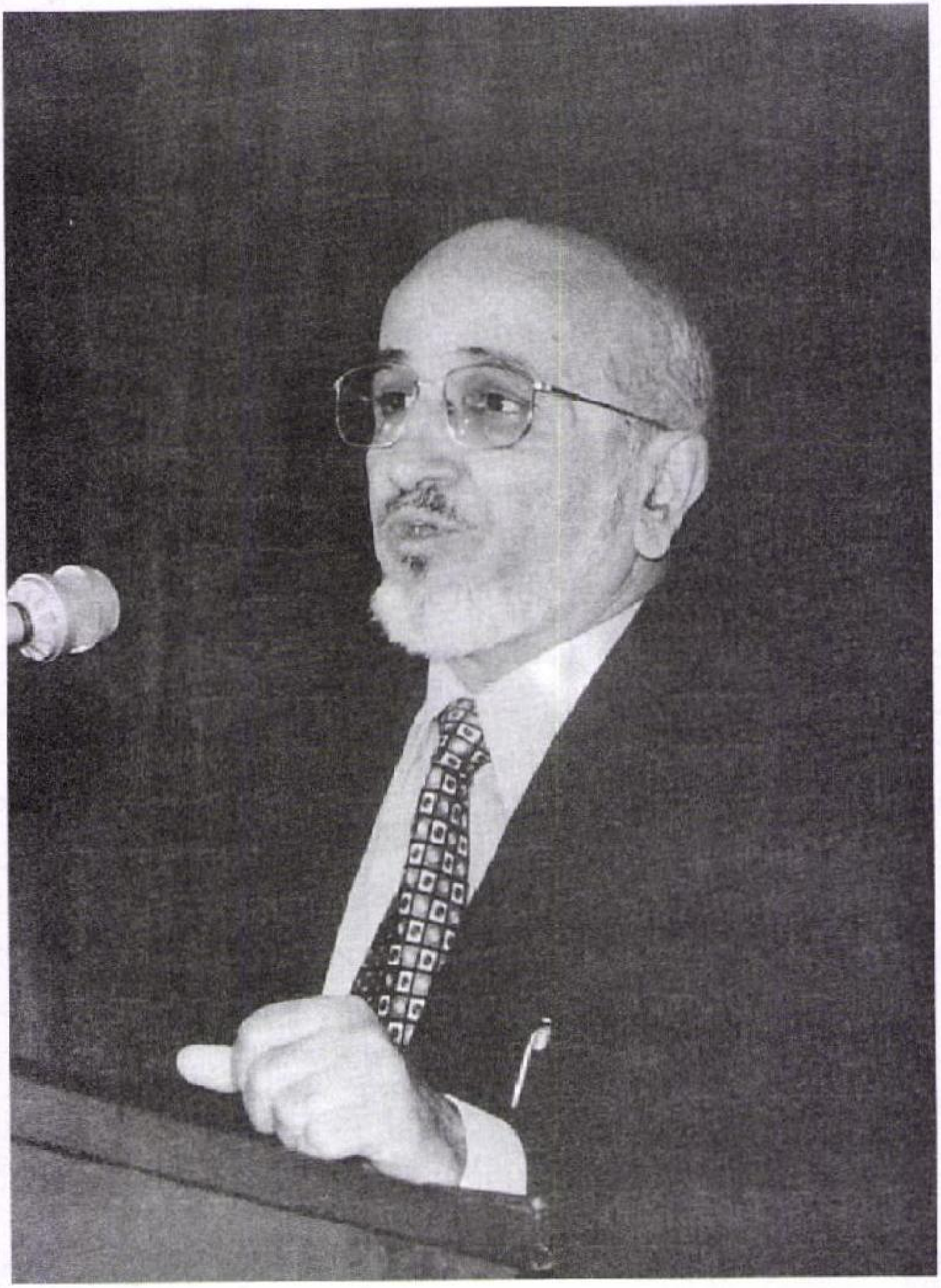

ای ایف یو جنرل کے مینجنگ ڈائریکٹر اور چیف ایگزیکٹو، ای ایف یو لائف اور الیانز ای ایف یو ہیلتھ انشورنس کمپنی
کے چیئرمین سیف الدین زومکا والا۔

سیف الدین زومکا والا

آزاد بھی اور منسلک بھی

اگر آپ EFU General کے موجودہ مینجنگ ڈائریکٹر کے قریب ہوں تو یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ کو روشن علی بھیم جی یاد نہ آئیں، اس لیے چالیس برس کی رفاقت میں بھیم جی صاحب مرحوم نے نہ صرف انھیں تحریک دی، بلکہ ان کی شخصیت کو بالکل بدل دیا ہے۔ بھیم جی صاحب کی تصویریں ہر جگہ ملتی ہیں۔ دفتر میں، داخلے کے ہال میں، بورڈ روم میں اور ادارے کے تمام کتابچوں پر جو مسٹر سیف الدین زومکا والا کے اطراف بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ وہی مقام ہے جس سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر وہ کمرہ ہے جہاں میری اور ان کی اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب وہ باقاعدہ کمپنی کے چیف کی حیثیت سے ذمے داری سنبھالنے والے تھے۔ اس مقام سے صرف چند قدم کے فاصلے پر انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ''بھیم جی کے برسوں کے بارے میں سوچنا، یا بھیم جی کے عہد کی بات کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ یہ کسی ایک فرد کا عہد نہیں بلکہ یہ دور ہے متحدہ کوششوں کا۔''

''سب سے پہلے ادارہ ہوتا ہے۔ اور پھر وہ لوگ جو اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ سب کچھ بتدریج معرضِ وجود میں آتا ہے، لوگ صرف ہاتھ بٹاتے ہیں۔ عبد الرحمٰن صدیقی کی پیش بینی ہو یا مسٹر کے ایف حیدر کی، مسٹر بھیم جی یا سیف الدین کی شخصیتیں اتنی اہم نہیں ہوتیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ ارتقا سے سب کچھ آپ ہی آپ ترتیب پا جاتا ہے۔''

مندرجہ بالا دو جملے سیف الدین زومکا والا کی زبان سے اس وقت ادا ہوئے تھے جب ان کے شفیق استاد مسٹر بھیم جی کا انتقال ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اسی دن شام کو جب میں ہوٹل کے کمرے میں واپس آیا تو میں نے اپنی ریکارڈنگ مشین کو چلا کر ان کو دوبارہ سنا۔ اگر میرے لیے ممکن ہوتا تو میں ان جملوں کے ریکارڈ کو پھر چلاتا اور اس کی آواز کو اتنا بلند کر دیتا کہ میرے مرحوم دوست تک یہ جملے پہنچ جاتے۔ مجھے یقین ہیں کہ ان خیالات کو سُن کر وہ خوش بھی ہوتے اور فخر بھی کرتے۔ میں بھی سُن کر بہت خوش ہوا تھا، حالاں کہ میں نے اپنے دل کی بات اس انسان کو نہیں بتائی تھی جو میرے مقابل بیٹھا ہوا سکون اور صبر کے ساتھ میرے سوال سنتا جاتا تھا اور اپنے مخصوص، دوستانہ اور نڈر لہجے میں جواب دیتا جاتا تھا۔ جو مجھے اپنی زندگی، اپنے خیالات، اپنی فکرمندی، اپنے خواب اور اپنے تصورات کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بے ساختہ میرا جی چاہا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ میں اس کے آخری جملے سن کر کتنا مسرور ہو رہا ہوں۔ مگر پھر میں نے خود سے کہا کہ میرے مشن کی تکمیل سے پہلے ایسا کرنا قبل از وقت ہوگا۔

جب سیف الدین زومکا والا ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے تھے اس وقت دوسرے عالمی جنگ ہر طرف تباہی پھیلا رہی تھی۔ ہندوستان کے رہنے والے بجا طور پر خوف زدہ ہو رہے تھے کہ ان کو بھی اس آگ اور خون کے کھیل میں گھسیٹا جائے گا، اس لیے کہ ان کے بیشتر اہم شہر جاپانی ہوائی فوج کے نشانے پر تھے۔ کچھ بم کلکتے پر گرائے جا چکے تھے اور اربابِ اقتدار نے تنبیہ کر دی تھی کہ جلد یا بدیر بمبئی بھی ان کا نشانہ بن

سکتا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے دیہات میں یا چھوٹے شہروں میں بھیج دیا تھا، جیسا کہ یورپ میں رہنے والے لوگ بہت عرصے سے ہوائی حملوں کی تباہیوں کے خوف سے کر رہے تھے۔ یہی کچھ زومکاوالا خاندان نے کیا تھا۔ جب سیف الدین رحم مادر میں تھے ان کی والدہ کو بھی بمبئی سے ایک سو ساٹھ کیلو میٹر دور واقع 'سورک' (Surak) نامی ایک چھوٹے سے شہر میں ان کے گھر روانہ کر دیا گیا تھا۔ ان کے والد اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے بمبئی میں ہی ٹھہرے رہے۔ ان کے والد تار سے بنی ہوئی رسیوں اور سامان اٹھانے والی مشینوں کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ کاروبار آج بھی بمبئی میں چل رہا ہے اور ان کے والد کے دو چھوٹے بھائی اس کی نگہداشت کرتے ہیں۔ تقسیم ہند کے وقت پہلے تو ان کا خاندان ہندوستان ہی میں مقیم رہا تھا مگر ۱۹۵۲ء میں ان لوگوں نے پاکستان ہجرت کرنے اور اپنے لیے نیا گھر بسانے کا ارادہ کر لیا۔

اس وقت سیف الدین کی عمر دس برس کی تھی اور وہ کراچی کے معروف اسکول سینٹ پیٹرک میں داخل کر دئے گئے تھے، جہاں سے بعد میں انھوں نے میٹرک کیا تھا۔ چوں کہ انھوں نے امتحان اول درجے میں پاس کیا تھا اس لیے ان کو سائنس میں مزید تعلیم کیلیے چن لیا گیا۔ چنانچہ ان کا داخلہ لیگل سائنس کالج میں ہو گیا جہاں تمام اول درجے والے طالب علموں کو ریاضی، فزکس اور کیمسٹری پڑھنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ جب میں نے سیف الدین سے ان کے ماضی کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں مجھے اپنا رازداں بناتے ہوئے کہا ''میں دراصل سائنس کی تعلیم کے لیے موزوں نہیں تھا۔ یہ شاید میرا موضوع نہیں تھا۔ اس کی مجھے زیادہ سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ مگر چوں کہ ہم سب اسی گروپ میں شامل تھے اس لیے ہم سب کو پڑھنا پڑا اور میں نے بھی فزکس، ریاضی اور کیمسٹری میں بی۔ ایس۔ سی کر لیا۔ مجھے سب سے کم نمبر ملے تھے، بس پاس ہونے بھر کے۔ غالباً میں سب کچھ رٹ لیا تھا اور بس کامیاب ہو گیا۔ اس وقت تک مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا رجحان کامرس کی طرف تھا اس لیے میں بزنس ایڈمنسٹریشن کی طرف چلا گیا اور میں نے کراچی انسٹی ٹیوٹ سے ماسٹرز کر لیا۔''

ان کے والد کا اپنا کاروبار تھا اور چوں کہ تعلیم میں ان کا زیادہ وقت نہیں لگتا تھا اس لیے سیف الدین اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ ''صرف وقت گزارنے کے لیے، تاکہ تھوڑا بہت کاروبار کا بھی عملی طور پر اندازہ ہو جائے۔''

اتفاق کی بات ہے کہ سیف الدین کی اپنے اسکول کے زمانے کے ایک طالبِ علم سے ملاقات ہو گئی جو لائف انشورنس بیچ کے بہت پیسے کما رہا تھا۔ اس نے اپنے والد کو بھی پالیسی بیچی تھی اور خود اپنے لیے بھی خریدی تھی۔ اس دوست نے سیف الدین سے پوچھا کہ انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن سے گریجویشن کے بعد ان کا کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ ساتھ ہی مشورہ دیا کہ وہ بھی، کم از کم جز وقتی طور پر ہی سہی، بیمہ بیچ کر دیکھیں تو سہی کہ ان کو یہ پیشہ پسند بھی آتا ہے یا نہیں۔

''میں نے سوچا کہ یہ ایک دلچسپ تجویز ہو سکتی ہے اس لیے آزما کر دیکھنا چاہیے۔ میں اس میں کافی کامیاب رہا۔ اپنے دوستوں اور قریبی عزیزوں کو پالیسی بیچنا مجھے بہت آسان لگا لہذا میں نے ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے ڈھاکہ کنونشن میں شرکت کے لیے کامیابی حاصل کر لی، جس میں جز وقتی طور پر میں نے کام شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے میں غالباً وہی ایک کمپنی تھی جس کا نام بیشتر پاکستانیوں نے سنا ہو گا۔ پھر میں ڈھاکہ پہنچا مگر کنونشن کی کسے پروا تھی، میں تو تمام وقت کسی سیاح کی طرح ادھر ادھر گھومتا پھرتا رہا۔ اس سفر میں مجھے بہت لطف آیا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی کی اس شعبے میں بڑے بڑے آدمی کام کر رہے تھے اور وہ سب بظاہر بہت آسودہ حال تھے۔ ہم سب ایجنٹ لوگوں کو بالکل نئے بنے ہوئے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے، اور میں بھی اسی پر عمل کرتا ہوں کہ سارے اعلیٰ افسر، مسٹر بھیم جی اور ڈائریکٹر حضرات، ایک فور اسٹار ہوٹل میں مقیم ہوئے مگر ہم لوگوں کو اس سے اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں ٹھہرنے اور لطف اٹھانے کا موقعہ دیا۔ نئے ہوٹل میں جگہ کی کمی پڑ گئی تھی اس لیے کہ یہ بہت بڑا کنونشن تھا۔''

یہ واقعہ ۱۹۶۷ء کا ہے جس نے نوجوان سیف الدین زومکا والا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اور جہاں تک ان کے پیشے کے

مستقبل کا سوال تھا، یہ واقعہ ان کے لیے فیصلہ کن تھا۔ اور پھر یوں ہوا کہ اتفاق سے ڈھاکہ کنونشن کے ہجوم میں جنرل ڈپارٹمنٹ کے اعلیٰ افسر اس۔ ایم۔ معین الدین کی خاتون سیکریٹری مسز ماچس والا بھی شریک تھیں جن کا تعلق بھی سیف الدین کی بوہری برادری سے تعلق تھا۔ مسز ماچس والا نواب حسن صاحب کے برابر ہی کھڑی ہوئی تھیں، جو ۱۹۶۴ء میں تکنیکی ماہر کے طور پر میری جگہ پُر کرنے کے لیے نیو انڈیا انشورنس بمبئی سے لائے گئے تھے۔ اتفاق سے سیف الدین ادھر سے گزرے اور ان سے سلام دعا ہوئی تو مسز ماچس والا نے سیف الدین کا نواب حسن صاحب سے تعارف کرایا۔ مسز ماچس والا نے سیف الدین سے ذکر کیا تھا کہ جنرل ڈپارٹمنٹ ایسے نوجوانوں کی تلاش میں تھا جن کو انشورنس کا کچھ تجربہ بھی ہو اور وہ کاروباری برادری سے بھی تعلق رکھتے ہوں۔ نواب حسن کو یہ نوجوان پسند آیا اور انھوں نے سیف الدین کو کراچی پہنچ کر ملاقات کی دعوت دی۔ مگر ہمارے 'نوجوان دوست' نے اپنے لا ابالی انداز میں سنی ان سنی کردی، جیسا کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کرنے کے عادی تھے۔ مگر سیف الدین نے اس بات کا ذکر اپنے والد سے کردیا تھا اور انھوں نے سیف الدین کو نواب حسن سے ملاقات کا مشورہ دیا۔ سیف الدین نے پھر بھی اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی اور سوچا کہ جب کبھی انھیں ہیڈ آفس قمر ہاؤس جانے کے لیے کوئی کام نکلے گا تو وہ نواب حسن سے ملنے کی کوشش کریں گے۔

وقت گزرتا گیا، سیف الدین کو کچھ جلدی بھی نہیں تھی۔ آخر ایک دن مسز ماچس والا نے سیف الدین کو فون کیا اور ڈھاکے کے واقعے کی یاد دہانی کراتے ہوئے کہا کہ نواب حسن صاحب سنجیدگی سے ان کے انتظار میں ہیں۔ اس ٹیلی فون نے سیف الدین کو نواب حسن سے ملاقات کے لیے آمادہ کردیا۔ نواب حسن نے اپنے روایتی ملائم انداز میں سیف الدین کو جنرل ڈپارٹمنٹ کے ایکزیکیٹیو ٹریننگ اسکیم میں شمولیت کی دعوت دی۔

''مجھے اچانک ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے اس قسم کی پیش کش کی توقع نہ تھی۔ میں کچھ خوف زدہ بھی ہوا اس لیے کہ میں آزاد قسم کا انسان تھا اور اپنے طور پر ہی کام کرنا چاہتا تھا۔ مجھے جز وقتی طور پر زندگی کا بیمہ بیچنے میں بہت لطف آرہا تھا۔ میں ان دنوں اچھے خاصے پیسے کما رہا تھا اور چوں کہ مجھ پر گھربار چلانے کی کوئی ذمے داری نہیں تھی اس لیے یہ سب کچھ میرے جیب خرچ کے لیے تھا۔ ہمارے خاندان میں مجھ سے پہلے کسی نے کبھی کسی اور کے لیے کام نہیں کیا تھا۔ جب سے مجھے ملازمت کی پیش کش کی گئی تھی یہ خیالات میرے دماغ میں گردش کررہے تھے۔''

مجھ سے گفتگو کے دوران، اتنے دنوں بعد بھی ان باتوں کو بیان کرتے ہوئے، جب کہ سیف الدین ای ایف یو کے سربراہ کے عہدے پر فائض ہو چکے ہیں، انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی یہ سب کچھ ان کے ساتھ ہو گیا ہے۔

سیف الدین پھر گویا ہوئے'' دیکھا آپ نے۔ اس وقت تک میں نے اپنی تعلیم مکمل بھی نہیں کی تھی۔ مجھے ایک سال اور پڑھنا تھا۔ اور زندگی کا بیمہ بیچنا کتنا آسان کام تھا۔ میرے اتنے سارے دوست تھے اور ان کے علاوہ میرے والد کے دوست بھی تھے۔ مجھے صرف تعارف حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، باقی کام تو وہ خاتون کرتی تھیں جن کے نام سے پالیسیاں بیچی جاتی تھیں۔ مگر میرے والد نے مجھ سے اس پیش کش کو آزمانے کا مشورہ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر تمھیں اس کام میں لطف نہ آئے تو جب چاہو میرے کاروبار میں شامل ہو سکتے ہو۔ اس طرح میرے لیے یہ سہولت موجود تھی کہ اگر یہ کام مجھے پسند نہ آیا تو والد کا کاروبار میرے لیے حاضر تھا۔ یہ خیال میرے ذہن میں ہمیشہ سے تھا اس لیے میں نے ان کی تجویز کو منظور کرلیا اور اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا اس طرح انتظام کرلیا کہ صبح کے بجائے میں شام کو کالج جانے لگا۔ اس طرح مجھے انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن میں ایک سال کے بجائے ایک سال چھ ماہ جانا پڑا تھا۔ اپنے والد کے کاروبار میں کام کرنے کے بجائے اب میں ایسٹرن فیڈرل انشورنس کے دفتر جانے لگا۔ اس طرح میں نے Non-Life Insurance Executive کی حیثیت سے ۱۹۶۷ء میں کام شروع کردیا۔ میرا انٹرویو نواب حسن اور ایس۔ ایم۔ معین الدین، جنرل منیجر نے لیا تھا جو خود بھی بے مثال سیلز میں رہ چکے تھے۔ میں ان سے واقف نہیں تھا مگر انھیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ وہ ایک خوش وضع، سپید بالوں والے بزرگ انسان تھے۔ میری

ملازمت کے بارے میں وہ بالکل بے فکر تھے۔ وہ میرے والد کو جانتے تھے۔ میری ملازمت کے خط پر دستخط کرنے کے بعد وہ نواب حسن کی طرف مڑے اور کہا "یہ نوجوان ای ایف یو میں زیادہ دن نہیں چلے گا۔ آج نہیں تو کل، یہ اپنے والد کے کاروبار میں واپس چلا جائے گا۔"

بڑے عظیم لوگ بھی غلطی کر جاتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آج اگر ہمارے پرانے دوست معین الدین زندہ ہوتے سیف الدین کی کامیابی دیکھ کر مسکرا اٹھتے۔ اور معین الدین ہی کیا، ای ایف یو کا کوئی بھی آدمی ہوتا تو یہ دیکھ کر حیران ہوتا کہ ایک کاروباری خاندان کا یہ نوجوان صرف پانچ سو روپے تنخواہ پر نوکری کرنے کیوں آ رہا ہے جب کہ یہ صرف زندگی کے بیمے کی چند ہی پالیسیاں بیچ کر اس کے چار پانچ گنا روپے کما لیتا ہے۔ نوکری کے پہلے دن سیف الدین نواب حسن کے پاس گئے تھے اور ان کو نواب حسن کے پی۔ اے مسٹر ایم۔ ڈی۔ ملک کے پاس چند کتابیں دے کر بٹھا دیا گیا تھا۔ ملک صاحب میرے بھی پی۔ اے رہ چکے تھے اور غالباً سیف الدین ہی کے عمر کے رہے ہوں گے۔ وہ سیدھے سادے آدمی تھے مگر وہ سیف الدین جیسے امیر گھرانے میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے سیف الدین سے بڑی نرمی سے پوچھا "آپ ای ایف یو میں کیوں ملازمت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے والد کا اتنا بڑا کاروبار ہے تو آپ ان کے ساتھ کیوں کام نہیں کرتے"۔ میرے اس نوجوان دوست نے، جو اس چھوٹے سے دلچسپ واقعے کو بیان کر رہا تھا، سوال کرنے والے کو زندگی کا بیمہ بیچنے کی تفصیلات بتائیں، اور یہ بھی کہا کہ ان کو اس کام میں اس لیے اور بھی لطف آ رہا تھا ان سے کوئی کمیشن نہیں مانگتا تھا۔ اس نے ملک صاحب سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی تربیت کے بعد جنرل بزنس کے میدان میں بھی کام کرنے کا خواہش مند ہے۔ بظاہر ملک صاحب کو اس کے بیان کی سنجیدگی پر یقین نہیں رہا ہوگا اس لیے کہ انھوں نے اچانک پلٹ کر کہا "تم کیا سمجھتے ہو کہ تم ایک دن اس کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر بن جاؤ گے؟" اور شاید سیف الدین نے پلٹ کر کہا ہوگا "کیوں نہیں"۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ان کو اس بات کا گمان بھی نہیں رہا ہوگا کہ ایک دن ایسا ہو بھی جائے گا۔ سیف الدین نے میرے کئی بار استفسار پر کہا کہ "مجھے صحیح الفاظ تو یاد نہیں مگر کچھ اسی طرح ہوا تھا۔ میرے لیے بھی یہ حیرت کی بات تھی۔"

ایک کاروباری برادری سے تعلق رکھنے والے سیف الدین کو توقع تھی کہ ان کو کمپنی میں کسی ایسی جگہ تعینات کیا جائے گا جہاں وہ نہ صرف تکنیکی گر سیکھیں گے بلکہ ان کو بزنس بھی لانا پڑے گا۔ اور پھر یہی ہوا بھی۔ چند دن بعد نواب حسن صاحب نے ان کا کراچی برانچ میں تبادلہ کر دیا۔ کراچی میں صرف یہی ایک برانچ تھی، جس کو اس زمانے میں ایجنسی سیکشن کہا جاتا تھا۔ بہت دنوں تک مسٹر معین الدین کے زیر انتظام رہنے کے بعد اب یہ برانچ جناب آل مجتبیٰ کے پاس تھی اور مسٹر فصیح الدین، جو آجکل کمپنی کے ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر ہیں، وہاں اسسٹنٹ مینیجر تھے۔ فصیح ایگزیکیٹو آفیسر اسکیم کی پہلی کھیپ سے تعلق رکھتے تھے اور تکنیکی معاملات میں انھیں خاصا درک تھا۔ مجتبیٰ صاحب بھی اپنے پیشے کے تکنیکی معاملات میں ماہر تھے۔ وہ ای ایف یو کی پہلے افسر تھے جس نے ACII امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی۔ لہٰذا تکنیکی اعتبار سے سیف الدین اس سے بہتر ہاتھوں میں نہیں ہو سکتے تھے۔ ان دو افسروں کو بھی اپنے نئے ساتھی کی سنجیدگی کے بارے میں یقین نہیں تھا کہ وہ انڈر رائٹنگ وغیرہ جیسے تکنیکی معاملات کی گہرائی میں جا کر سیکھنے کی کوشش کریں گے۔ انھوں نے بھی سیف الدین کو انشورنس سیکھنے کے بجائے بازار میں جا کر انشورنس بیچنے کی ترغیبات دیں۔ سیف الدین نے اپنے دو افسروں کو مایوس نہیں کیا۔ اپنے والد کے رسوخ کے استعمال سے وہ دو بڑی صنعتوں کا بزنس لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس میں تیزی سے اضافے ہوتے رہے۔ مگر چوں کہ سیف الدین کو ایگزیکیٹو ٹریننگ اسکیم میں بھرتی کیا گیا تھا اس لیے یہ سلسلہ یہیں رک گیا اور ان کو کمپنی کے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، واقع بہادر آباد، تربیت کے لیے بھیج دیا گیا۔

انسٹی ٹیوٹ کی ذمے داری فوج کے ایک ریٹائرڈ افسر کرنل بشیر کے سپرد تھی اور شرافت والا جاہی، مجتبیٰ، فصیح الدین، رضوی اور اے۔ جی۔ خان جیسے لوگ انشورنس کے مختلف موضوعات پر لیکچر دینے کے لیے آیا کرتے تھے۔ یہ کُل وقتی کورس تھا طلبا دفتر میں حاضری سے مستثنیٰ تھے اور ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں ہی رہتے تھے۔ چوں کہ وہاں جگہ کی قلت تھی اس لیے سیف الدین کو اپنے گھر رہنے کی اجازت تھی۔

سیف الدین کہتے ہیں ''مگر یہ کافی مشکل کام تھا۔ مجھے ہر روز آٹھ بجے صبح انسٹی ٹیوٹ میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔ مگر میرے لیے ایک خوش خبری آنے والی تھی۔ فائنل امتحان میں مجھے اول درجے میں کامیابی ملی۔ اس کامیابی نے مجھے بہت آگے بڑھنے میں مدد دی۔ جب میں واپس اپنے دفتر آیا تو میرے ساتھ ہر شخص کا برتاؤ مختلف تھا۔ خاص کر مجتبیٰ صاحب اور فصیح الدین میری کامیابی سے بہت خوش تھے۔ اس لیے کہ میرے ساتھ کے سارے طلبا کم از کم دو سال سے EFU میں کام کر رہے تھے۔ سب کے سب تکنیکی کام کرتے تھے اور انھیں بزنس بھی نہیں لانا پڑتا تھا۔ اس طرح میری بہت ہمت افزائی ہوئی۔ مجتبیٰ صاحب نے میری ہمت بندھائی اور مجھے اپنے کمرے میں بیٹھنے کی جگہ فراہم کر دی تھی۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر بیٹھنے کے بجائے مجھے اپنے مقابل اپنی میز پر جگہ دی۔ میں ان کے ٹیلیفون بھی اٹھاتا اور جب بھی کسی شعبے کا ذمے دار غیر حاضر ہوتا تو مجھے اس کی جگہ بٹھا دیا جاتا۔ اس سے بھی میری حوصلہ افزائی ہوئی اور انشورنس کو اس کی گہرائیوں میں اتر کر سیکھنے کا موقع ملا۔''

۷۲-۱۹۷۰ء میں ملکی صنعت میں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی کمپنی کا آدھے سے زیادہ کاروبار جاتا رہا۔ مشرقی بازو کے سینئر افسران اور دوسرے ملازمین کو مغربی پاکستان میں کھپانا پڑا تھا۔ تقریباً سو کے قریب ملازمین، جو مشرقی پاکستان کی شاخوں سے منسلک تھے کراچی آگئے تھے۔ ان میں مسٹر عظیم رحیم جنرل انشورنس کے منیجر برائے مشرقی پاکستان تھے۔ ان کے نائب تھے مسٹر امیر علی مولیدینا، جو چاٹگام میں کنٹرولر آف برانچز تھے، مشرقی پاکستان کے سانحے سے قبل ہی تبادلے کے ذریعے کراچی آچکے تھے۔ یہ تبادلہ دراصل مستقبل میں آنے والی کسی حکمت عملی کا پیش خیمہ تھا۔ مسٹر ایس۔ ایم۔ معین الدین اور لاہور کے میاں سعید احمد، دونوں مستقبل قریب میں ریٹائر ہونے والے تھے۔ اس لیے یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اس علاقے کی انتظامیہ کو مضبوط بنانے کی غرض سے امیر علی بھائی کو مشرق سے مغرب بلا لیا جائے۔ امیر علی بہت تجربے، کار پڑھے لکھے اور بڑے جرأت مند افسر تھے۔ انھوں نے مشرقی پاکستان میں بہت اچھا کام کیا تھا۔ میرے زمانے میں ہی ان کو ایک طرح سے عظیم رحیم صاحب کیساتھ توازن برقرار رکھنے کے لیے مشرقی پاکستان بھیجا گیا تھا جو خالصتاً سیلز کے آدمی تھے۔ امیر علی ساختیاتی صلاحیتوں کے انسان ہونے کے باوجود تکنیکی ضروریات اور شرارتی نزاکتوں کے امتزاج سے نئی تخلیق کا ایسا ہنر جانتے تھے کہ وہ دوستوں اور دشمنوں دونوں کو اپنی فن کاری سے حیران کر دیتے تھے۔ انھوں نے مشرقی پاکستان کی انتظامیہ کی دوبارہ تشکیل کی اور عظیم رحیم صاحب کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے نہ صرف امیر علی کے کام میں مداخلت نہیں کی بلکہ ان کی بہت مدد کی تھی۔

امیر علی کو کراچی، سندھ اور بلوچستان کے لیے زونل چیف بنا دیا گیا تھا۔ جب مجتبیٰ صاحب نے کراچی میں ایک اور شاخ کھولنے کی تجویز پیش کی تو انھوں نے فوراً ان کی تائید کر دی۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ ہمارے دوست سیف الدین زومکا والا کو یہ مشکل ذمے داری سونپی جائے۔

''یہ واقعی مسٹر امیر علی مولیدینا کی دور رس نگاہ تھی جس نے ملک کے اس حصے میں ہمارے کاروبار کی مزید ترقی کے لیے نئی راہیں ہموار کیں۔ ان کی خلاّقی اور منصوبہ بندی کی صلاحیت نے ہم میں وہ جذبہ پیدا کیا تھا جس کی مدد سے ہم میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ہوا۔ انھوں نے ہی ایک نیا جنوبی زون بنانے کا خیال پیش کیا تھا اور ہم لوگ اس کے مغز کے طور پر کام آئے۔ مولیدینا صاحب اس نئے زون کے سربراہ بنے جب کہ مددگار اور ذمے دار افسرن میں فصیح الدین صاحب، مجتبیٰ صاحب، مرزا فیض احمد صاحب اور بعد میں سلیم طارق صاحب بھی شامل ہو گئے تھے۔ دراصل یہی لوگ تھے جنھوں نے سارے فیصلے کیے تھے اور نیا جنوبی زون تخلیق کیا تھا۔''

جب سے ہم نے کمپنی اور اس کے مستقبل کے بارے میں باتیں شروع کی تھیں، جس کا بہت انحصار ان کی ذات پر، ان کے تصورات، پیش بینی اور کامیابیوں پر ہے، سیف الدین نے بار بار یہی کہتے رہے ہیں کہ ''زندگی ایک حادثہ ہے۔ میں سچ مچ اس پر یقین رکھتا

ہوں۔ جب مجھے شہر میں ایک برانچ بنانے کی ذمے داری سونپی گئی تو میں بہت خوش ہوا، مگر ساتھ ہی ڈر بھی رہا تھا۔ مجھے اس بات کا خوف تھا کہ نئی برانچ میں جانے اور خود مختار ہونے کے اپنے بھی خطرات ہوتے ہیں۔ یہ خوف میرے دل میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں کامیاب ہوا تو خوب تمغے ملیں گے مگر ناکام ہوا تو ننگا ہو جاؤں گا۔ جب میں کراچی برانچ کا حصہ تھا اس وقت اس کی کامیابیوں میں سب کا حصہ تھا۔ ناکامی کی صورت میں کوئی فرد نہیں بلکہ برانچ ناکام کہلاتی۔ لہٰذا سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ کی برانچ میرے لیے ایک بڑی تبدیلی تھی۔ مگر اب میں ماضی میں جھانک کر دیکھتا ہوں تو میرے لیے یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار یہ موقع ملا تھا کہ میں خود کچھ کر کے دکھا سکوں اور میں پروردگا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے یہ موقع فراہم کیا۔ وہ برانچ کامیاب، بلکہ حقیقتاً بہت کامیاب ہوئی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہم نے اس کام کو بالکل بنیاد سے شروع کیا تھا۔ اب میں اس کی جزئیات سنا کر آپ کو بیزار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اس لیے کہ ان کے ذریعے ہی میں اپنا نقطۂ نگاہ وضاحت سے پیش کر سکوں گا۔

سب سے پہلا کام تو ایک دفتر کی تلاش تھی۔ تلاش میں ہم لوگ مارے مارے پھرتے رہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان دنوں یونائیٹڈ بینک سے ہمارا ایک رشتۂ خاص ہو گیا تھا۔ لہٰذا سب سے پہلے ہم نے SITE میں ان کی کئی شاخوں میں سے ایک کے منیجر سے ملاقات کی اور اپنی ضرورت بیان کی کہ بہت جلد ہم ان کے نئے پڑوسی بننے والے ہیں۔ انھوں نے ہمیں خنداں پیشانی سے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ انھوں نے حال ہی میں اپنا نیا دفتر بنا لیا ہے اور یہ بھی کہ جو دفتر انھوں نے چھوڑا ہے جائیداد مالک کو واپس دے رہے ہیں اور ہم چاہیں تو اس کو لے سکتے ہیں۔ اس طرح ہم کو وہ تمام چیزیں بھی مفت مل جائیں گی جن کو وہ لوگ یوں ہی چھوڑ رہے ہیں۔ ان دنوں یونائیٹڈ بینک کا کام اچھا چل رہا تھا۔

اس طرح ہمارا سارا مسئلہ ایک آن میں حل ہو گیا، اسی لیے میں نے کہا تھا کی زندگی ایک حادثہ ہوتی ہے اور ہر شئے بس خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ اس مسئلے کے حل ہو جانے کے بعد کا مسئلہ یہ تھا کہ کراچی برانچ سے ہمیں کون سے کارکن ساتھ لے جانے ہوں گے۔ یہ ایک بڑا فیصلہ تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ نئی برانچ سے کمپنی اچھے کاروبار کی توقع رکھے گی میں نے از خود یہ طے کیا کہ بجائے کسی تکنیکی کارکن کے ہم ایسے افراد کو ساتھ لے جائیں جو نئے بزنس لانے میں اچھے ہوں۔ جب کاروبار شروع ہو جائے گا تو کمپنی خود ہی ہم کو تکنیکی ماہر فراہم کر دے گی۔ اس لیے میں نے رضوی نام کے ایک صاحب کو ساتھ جانے کا فیصلہ کیا جن کے بھائی کسٹم میں کلکٹر تھے اور میرا خیال تھا کہ ان کی وجہ سے SITE کے علاقے سے اچھا کاروبار ہو سکے گا۔ ان کے علاوہ میں اپنے ساتھ اقبال ملکانی کو لے گیا جو آج کل کریڈٹ اینڈ کامرس دبئی میں، جس کا نام اب الائینس انشورنس ہو گیا ہے، اسسٹنٹ جنرل منیجر ہیں۔ میں بھی اس کمپنی میں کام کر چکا تھا۔ وہ بھی اچھا بزنس کرنے کے خواہشمند تھے۔ وہ پہلے چاٹگام میں اچھا کام کر چکے تھے اور میں نے سوچا کہ ہم تین لوگ کافی ہوں گے۔ اس طرح ہمارا کاروبار شروع ہو گیا۔ اپنے دفتر میں ہر آنے والے کو ہم چائے پیش کرتے خواہ اس کا بزنس ملے یا نہ ملے۔ ہماری خواہش کے خلاف شروع دنوں میں ہمارے پاس اخبارات پڑھنے کے لیے بہت وقت ہوتا تھا مگر پھر آہستہ آہستہ کاروبار شروع ہوا اور ہماری برانچ بہت کامیاب رہی۔''

ایسی ہی مثبت کامیابیوں نے ہمیں ڈھاکہ کے زوال کے بعد ہونے والی تباہی سے نکالا تھا۔ اس تباہی کے باوجود لائف ڈپارٹمنٹ ایک بعد دوسری منزل مارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پوری کمپنی میں ہر طرف بڑا جوش اور جذبہ تھا۔ مگر جب مئی ۱۹۷۲ء میں وزیرِاعظم بھٹو کی حکومت نے دوسرے صنعتوں کے ساتھ بیمۂ زندگی کو قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کر دیا تو سب کچھ ایک جھٹکے سے ساتھ رُک گیا۔ قلم کی ایک جنبش سے ہماری صنعت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ہم سے چھن گیا۔ یہی نہیں اس سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ صنعت کے زیرِ انتظام لائف فنڈ جو پچھلے پندرہ برسوں میں ہماری ترقی کے لیے جنریٹر کا کام کر رہا تھا وہ سب حکومت کی تحویل میں چلا گیا۔

اس سیاسی تبدیلی نے نہ صرف ای ایف یو بلکہ ملک کی پوری مالیاتی دنیا کو ڈرامائی انداز میں بدل کر رکھ دیا۔ اس سے ملکی معاشیات

پر بھی اثرات مرتب ہوئے۔ کسی بھی تجارتی ادارے کے لیے، اور بالخصوص کسی بڑے ادارے کے لیے ایسی صورتِ حال بہت نازک ہوتی ہے۔ اسی دوران مسٹر عظیم رحیم کراچی آ چکے تھے اور ان کے لیے بھی کوئی جگہ بنانی تھی۔ امیر علی نے رضا کارانہ طور پر اپنے وسیع القلب، نہایت مہربان اور محبت کرنے والے سابقہ افسر کے لیے جگہ خالی کر دی۔

مشرقی پاکستان کی علٰحدگی نے پورے ملک کو زخم آلود کر دیا تھا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کے نیشنلائزیشن نے اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ ای ایف یو ملک کے زندگی کے بیمے کا پچاس فیصد کاروبار پیدا کر رہی تھی اور ایسی صورت اس کے کارکنوں کے لیے بہت مشکل تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب یہ افواہ اڑا دی گئی تھی کہ ای ایف یو کے چیف ایگزیکٹیو ملک چھوڑ کر برطانیہ اور مشرقِ وسطیٰ میں نئی کمپنیاں قائم کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ یہ باتیں سیف الدین زومکا والا پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوئیں۔ ان کی SITE برانچ بہت اچھا کام کر رہی تھی۔ اس کے باوجود پورے ملک کا ماحول تبدیل ہو گیا تھا۔

مسٹر مولیدینا نے، جنھیں مسٹر بھیم جی نے مشرقِ وسطیٰ سے حقائق جمع کرنے کے لیے بھیجا تھا، اپنے سب زیادہ کامیاب برانچ مینیجر سے یہ معلوم کرنے کے لیے رابطہ کیا کہ اگر کوئی کمپنی بنائی جائے تو وہ دبئی میں کام کرنا پسند کریں گے۔ سیف الدین نے فرمایا کہ ''میں مسٹر مولیدینا پر اس قدر اعتماد کرتا تھا کہ میں نے اپنے اہلِ خانہ سے بھی مشاورت نہیں کی اور کہا کہ ٹھیک ہے چلیے ہم دونوں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ میرے ایسے غیر متوقع اقرار کی وجہ ملک کے اندر پھیلی مایوسی کی فضا تھی۔ اس لیے بھی کہ ان دنوں ہر شخص ہی ملک سے باہر بھاگنے اور مشرقِ وسطیٰ کی بہتی ندیا میں ہاتھ دھونے کے چکر میں تھا۔ ہم اپنے بہت سے دوستوں سے سن رہے تھے کہ وہ دبئی، مسقط یا سعودی عرب جا رہے ہیں۔ پورے ملک کی فضا ایسی ہی تھی کہ اگر آپ کو بیرونِ ملک جانے کا موقع مل جائے تو نکل جایئے۔ مگر اس وقت مسٹر مولیدینا کا انداز کچھ لاپروائی کا سا تھا۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ، ہندوستان کی طرح، ہر شخص کسی دن بھی جنرل انشورنس کے نیشنلائزیشن کی توقع کر رہا تھا۔ ہم کسی بھی اتوار کو اس کی توقع کرتے تھے اس لیے کہ ان دنوں ہفتے اور اتوار کو سرکاری تعطیل ہوتی تھی، جس طرح کہ اب پھر ہونے لگی ہے۔ مگر سچ پوچھیے تو میں بالکل بے فکر تھا۔ اس لیے کہ، جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، میں جانتا تھا کہ اگر کچھ گڑ بڑ ہو بھی جائے تو میرے لیے والد صاحب کا کاروبار تو موجود ہوگا۔ اور یہ ہمارے تحفظ کا بہترین ذریعہ تھا۔ اس اطمینان نے مجھے آزادی سے کام کرنے کا موقع فراہم کیا تھا مگر دوسروں کے لیے یہ پریشانی تو تھی ہی۔ پورا ملک ایک ذہنی دباؤ کی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ صنعتیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں اور لوگ جوق در جوق ملک چھوڑ کر جا رہے تھے۔ جس کو لوگ دانش کا ضیاع کہتے ہیں۔ حکومت سے تو کچھ اور ہی سننے میں آ رہا تھا۔ حکومتی حلقے اس بات پر مسرور ہو رہے تھے کہ ملک میں کثیر مقدار میں زرمبادلہ آ رہا ہے۔ جو کوئی بھی زرمبادلہ پیدا کرتا تھا تو اس کو ملک میں کام کرنے والوں کے مقابلے میں زیادہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ کتنی بے تکی بات تھی؟۔''

وقت گزرتا رہا اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ جنرل انشورنس کا کاروبار نیشنلائز نہیں ہوا، اگر چہ ہمہ وقت اس کا خطرہ منڈلا رہا تھا۔ EFU اس وقت بھی ایک مستحکم ادارہ تھا، اگر چہ نسبتاً کم درجے کا۔ مولیدینا صاحب پھر مختلف ممالک کے دورے پر چلے گئے تھے۔ ان کے تجزیے کے مطابق متحدہ عرب امارات اس کام کو شروع کرنے کے لیے بہت موزوں جگہ تھی۔ اور پھر یہی ہوا۔ کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس (یو۔اے۔ای) دبئی میں قائم کی گئی جس میں زندگی اور جنرل دونوں قسم کے بیمے کا کاروبار کیا جا سکتا تھا۔ امیر علی مولیدینا اس کے مینیجنگ ڈائریکٹر اور جنرل انشورنس کے شعبے کے کرتا دھرتا بنے اور زندگی کے بیمے کے لیے جناب ایس ایف عالم ان کے نائب متعین ہوئے۔ اب سیف الدین کو فیصلہ کرنا تھا اس لیے کہ امیر علی جنرل انشورنس کے شعبے کے لیے ان کو اپنا نائب بنانا چاہتے تھے۔ ان کو باقاعدہ پیش کش کی گئی، ویزے کے کاغذات تیار کیے گئے۔ اور جب اچانک ہمارے دوست کو احساس ہوا کہ یہ سب کچھ ہو گیا ہے تو ایک بار ان کا دل دھڑکا۔ ملک سے باہر کی زندگی، نئی تہذیب، نئے امکانات اپنی جگہ مگر ان کو اب کچھ زیادہ ہی احساس ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ اتنا آسان بھی نہیں ہوگا۔

بہر حال، ان کا کھوجی مزاج اور آگے بڑھنے کی خواہش غالب آئی۔ جیسا کہ ان جیسے عقلمند انسان سے توقع تھی، انھوں نے اپنے والدین سے مشورہ کیا۔ پہلے اس لیے نہیں کیا تھا کہ انھیں معلوم نہ تھا کہ یہ بیل منڈھے چڑھے گی بھی یا نہیں تو کیوں ان کو خبریں سنا کر پریشان کرتے۔ والدین نے اپنے بیٹے کی ہمت افزائی کی اور سیف الدین اپنی کاروباری زندگی کے اہم سفر پر روانہ ہوئے۔

سب کو ملا کر کُل بارہ افراد تھے جو ۲۵ رستمبر ۱۹۷۵ء کو دبئ روانہ ہوئے تھے۔ پچیس برس بعد بھی جب سیف الدین واقعات بیان کر رہے تھے تو ان کو یہ تاریخ اچھی طرح یاد تھی۔ مجھے بھی یہ گفتگو نہیں بھولے گی اس لیے کہ روانگی کی تاریخ بتانے نے بعد سیف الدین کچھ وقفے کے لیے خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی کچھ زیادہ ہی طویل ہوئی تو میں سمجھا کہ وہ کسی ذہنی کشمکش میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ پھر آہستگی سے مگر مسکراتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''نہیں۔ میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں گیا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے اگر میں بزدل نظر آیا تھا، مگر حقیقت تو یہی تھی۔ جب ویزہ آیا تو میں حیص بیص کے عالم میں تھا۔ اور پر مستزاد یہ کہ بہت دنوں سے مجھے ہرنیا پریشان کر رہا تھا اور مجھے اس کا آپریشن کرانا تھا، جس کو کئی بار ٹالا جا چکا تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ اس کام سے اسی وقت فارغ ہو جانا چاہیے۔ پھر میں نے آپریشن کرا لیا اور میرا جانا دو ماہ کے لیے مؤخر ہو گیا۔ بالآخر ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء کو میں دبئ کے لیے روانہ ہو گیا۔''

سیف الدین نے دبئ میں کمپنی کے لیے تقریباً چودہ برس جم کر کام کیا۔ وہ خود بھی کامیاب ہوئے اور کمپنی بھی کامیاب ہوئی۔ وہ کہاں بزدل تھے؟ ان سے گفتگو کے اس حصے کو میں نے بار بار سنا اور غور کرتا رہا کہ اس کو ان کے خاکے میں نقل کروں یا نہ کروں۔ مگر ان سے پوچھے بغیر میں نے اس کو نقل کرنے کا فیصلہ کر لیا، اس لیے کہ یہ باتیں اس شخص کی شخصیت کو اجاگر کرتی ہیں جس نے ہمیشہ اپنی آزادی، اپنے اندازِ زندگی کے لیے جد و جہد کی ہے اور جو بے ساختہ ان سے محبت کرنا چاہتا ہے جو اس کو پیارے ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر مجھے تاریخ کے وہ پروفیسر یاد آئے جنھیں میں بھول چکا تھا۔ انھوں نے کہا تھا ''جو لوگ خوف زدہ ہوتے ہیں وہی خندق کو پار کر لیتے ہیں۔''

شدید مسابقت کے ماحول میں کسی کمپنی کو بنیاد سے شروع کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ مگر ای ایف یو کے جاں نثار توقع سے زیادہ کر گزرتے ہیں۔ ان کو تو بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کی امداد بھی حاصل تھی۔ اس وقت تک وہ لوگ امارات میں کافی مستحکم بھی ہو چکے تھے۔ ابوظبی کے فرمانروا آغا حسن عابدی صاحب کے بڑے مداح بھی تھے اور بینک کی ہر طرح سے مدد بھی کرتے تھے۔ انھیں نئی بیمہ کمپنی سے بھی ہمدردی ہو گئی تھی۔ C&C گروپ کے رُکن ہونے کے ناتے ہمیں بھی دبئ میں خوش آمدید کہا جا رہا تھا۔ مگر ہمیں بہت محنت کرنی پڑی تھی۔ سیف الدین کہتے ہیں کہ ''ہمیں بارہ تیرہ گھنٹے روزآنہ کام کرنا پڑتا تھا۔ مولیدینا صاحب ہم لوگوں کا بڑا خیال رکھتے تھے، بالکل باپ کی طرح۔ کیوں نہ ہو ہم لوگ ایک خاندان ہی کی طرح تو تھے۔ ہمارا ادارہ بس واجبی سرمائے سے شروع ہوا تھا اور مالی اعتبار سے ہمارے دن مشکل سے گزر رہے تھے۔ میرے ذاتی اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے تھے اس لیے مجھے اپنے والد صاحب سے پیسے منگواتے پڑتے تھے۔ مگر مولیدینا صاحب کی ہمدردیاں دل خوش کر دیتی تھیں۔ اور پھر واقعی ہم نے اس ادارے کو کامیاب بنا دیا جس سے ہم سب کو بڑی مسرت ہوئی تھی۔''

اگر اس کو ایک جملے میں سمونے کی کوشش کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''تین چار برس میں کریڈٹ اینڈ کامرس، دبئ، ہر معنوں میں ایک نہایت کامیاب اور قابلِ احترام ادارہ بن گئی تھی'' دراصل C&C گروپ کی یہ واحد کمپنی تھی جو منافع دے رہی تھی اور یہ گروپ کی ٹوپی میں سرخاب کے پر کی طرح تھی۔

بڑی ہونے کے ساتھ ساتھ اب ہماری کمپنی اپنے افسروں اور کارکنوں کو بہتر مشاہرے دینے کے قابل ہو گئی تھی، اور سیف الدین کے والد کو اب ان کی مالی مدد نہیں کرنی پڑتی تھی۔

یہ دل خوش کن کیفیت سات برس تک قائم رہی، جب تک کہ دبئ کے قانون کے مطابق کمپنی کے کم سے کم اکیاون فی صد حصص

کسی مقامی کی ملکیت ہونے کی شرط عائد نہیں ہوئی تھی۔ مگر ہماری کمپنی پر اس کا زیادہ اثر نہیں ہوا اس لیے کہ بینک والوں نے ہمارے لیے ایک مقامی سرمایہ کار مہیا کر دیا تھا، اور انتظامیہ ہمارے ہی ہاتھوں میں رہی۔ بہر حال دو تین برس بعد ہم پر دباؤ شروع ہو گیا کہ یا تو ہم ایک باقاعدہ لائسنس یافتہ غیر ملکی ادارے کی طرح کام کریں یا مختلف ڈھانچے والی ایک مکمل مقامی کمپنی بن جائیں۔ میں نے اس بدقسمت کیفیت کا ایک مختلف باب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وجہ جو بھی رہی ہو، نتیجہ وہی رہا: اچھی خاصی ترقی اور عمدہ کاروبار کے باوجود، اندرونی معاملات کمپنی پر اثر انداز ہوئے اور مسٹر امیر علی مولیدینا کو مینجنگ ڈائریکٹر کا عہدہ چھوڑ کر پاکستان واپس آنا پڑا۔ پہلی نظر میں تو ایسا لگا کہ کمپنی میں سیف الدین کی موجودہ حیثیت قائم رہے گی۔ نئے مالکان چاہتے تھے کہ وہ کمپنی میں رہیں مگر کچھ ایسے حالات بدلے کہ ان کو ایک بڑا فیصلہ کرنا پڑا۔ میں تفصیل کو کم سے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

۱۹۸۸ء کے آخر تک مسٹر روشن علی بھیم جی کو کچھ ایسے اہم فیصلے کرنے پڑے جو نہ صرف ان کی اپنی ذاتی زندگی پر اثر انداز ہوئے بلکہ گروپ کی وہ تمام انشورنس کمپنیاں اس سے متاثر ہوئیں جو اس وقت بالواسطہ یا بلا واسطہ ان کے زیرِ انتظام چل رہی تھیں۔ انھیں پاکستان کی وزیرِاعظم بینظیر بھٹو صاحبہ سے پیش کش ہوئی کہ وہ ان کی کابینہ میں مالیاتی مشیر کے طور پر شریک ہو جائیں جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ اس وجہ سے انھوں نے لندن میں قائم کریڈٹ اینڈ کامرس گروپ کی انشورنس کمپنی CCL سے استعفیٰ دے دیا۔ انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ انھیں اپنی پرانی محبت، EFU General کے لیے بھی وقت نہیں مل سکے گا۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس ذمے داری کو سنبھالنے کے لیے کسی کو تیار کرنا پڑے گا۔ انھوں اپنے کئی قریبی ساتھیوں سے مشورے کیے اور اپنی نظریں سیف الدین زومکا والا پر مرکوز کرنی شروع کر دیں۔

مسٹر بھیم جی کافی دنوں سے اس نوجوان پر نظر رکھے ہوئے تھے اور اپنے برادرِ نسبتی جناب امیر علی مولیدینا سے ان کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے جو اس کے افسر رہ چکے تھے اور اس کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ وہ بمبئی کے اس خوبصورت ڈاڑھی والے بوہری نوجوان کے ٹھنڈے مزاج کے ساتھ فیصلے کرنے کی عادت کے مداح تھے۔ انھیں یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی تھی کہ یہ دوستانہ صفت کا حامل انسان، جو بظاہر شرمیلا اور بزدل دکھائی دیتا ہے بڑے ٹھنڈے مزاج کے ساتھ جب اپنے فیصلوں پر عمل کرانے کا وقت ہو تو کس قدر پُر اعتماد اور محکم ہو جاتا ہے۔ نرم خو، ملائم لہجہ، مگر جہاں ضرورت ہو تو اہم معاملات میں کسی قسم کی گڑ بڑ برداشت نہیں کرتا نہ ہی کسی سے رورعایت کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی بات جو شروع سے ان کو پسند تھی وہ اس کا اندازِ آزاد روی تھا۔ اس نے کبھی ضرورت سے زیادہ بلند خیالی نہیں دکھائی، بس صرف اپنے مثبت خیالات اور کارآمد مزدوروں سے اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔ اس کا دوستانہ انداز ہمیشہ دلی ہوتا ہے، دکھاوے کا نہیں۔ اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے میرے دوست روشن نے ایک بار اس کو ایسے ایک تجربے کار شکاری کا مماثل قرار دیا تھا جو اپنے شکار کی تلاش میں ہمیشہ چوکنا رہتا ہے اور جوں ہی موقع ملتا ہے پہلے ہی حملے میں اس کو جا لیتا ہے۔ مگر اس کے دل میں شکار کے لیے احترام کے طور پر افسوس کے جذبات بھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ یہ کبھی نہیں بھولتا کہ اس کا ہدف کیا ہے اور کیا کرنا ہے۔

بھیم جی نے سیف الدین سے اپنے مخصوص انداز میں معاملت کی تھی۔ انھوں نے سیف الدین کو سیدھے سادے انداز میں کوئی پیش کش نہیں کی تھی، بلکہ یوں ہی چلتے پھرتے ان سے پوچھ لیا تھا کہ اگر وہ کسی تبدیلی کے خواہش مند ہوں تو گروپ کے اندر ہی ان کے لیے کچھ امکانات نکل سکتے ہیں۔ اس طرح صرف اشارے دیے، تفصیلات بیان نہیں کیں۔ وہ جانتے تھے کہ دبئی میں سیف الدین کے قریبی خاندانی رشتے تھے اور ان کو ملک میں واپسی کے لیے تیار کرنے میں وقت لگے گا اس لیے اور بھی کہ امارات کے مقابلے میں اس وقت پاکستان کے حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔

سیف الدین نے بتایا کہ ''ایک دن مسٹر بھیم جی نے مجھے ٹیلی فون کیا اور مجھ سے ملنے کے لیے کہا۔ میں ملنے جا رہا تھا تو میرے دل

میں خیال تھا کہ شاید وہ مجھے سعودی عرب یا لندن میں جانے کی پیش کش کریں گے۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے کراچی میں ای ایف یو کو سنبھالنے کے لیے کہیں گے۔ وہ بہت جذباتی ہو رہے تھے جب انہوں نے مجھ سے کہا ''سیف الدین میں چاہتا ہوں کہ تم کراچی آ کر ای ایف یو کو سنبھال لو۔ انھوں نے مجھے بڑے عجیب انداز میں گلے سے لگایا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا جواب دوں۔ حیران تھا اور کچھ کہہ نہیں سکا۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ اس وقت ای ایف یو کی حالت بہت خراب تھی، کراچی کی لاقانونیت عروج پر تھی اور میں سب سے زیادہ اس بات سے پریشان تھا کہ میرے اہلِ خانہ اس تبدیلی کو کیسے برداشت کریں گے۔ میرے والدین بھی دبئی میں جم گئے تھے۔ ہمارے دبئی جانے کے بعد وہ بھی لمبے عرصے قیام کے خیال سے وہیں آ گئے تھے۔ میرے والد ریٹائر ہو چکے تھے مگر صرف مصروفیت کے خیال سے انھوں نے اپنا ایک چھوٹا سا کاروبار کر رکھا تھا۔ میری ایک بہن بھی دبئی میں بس گئی تھی۔ مالی اعتبار سے میں خوش حال تھا۔ صحیح معنوں میں میرے لیے تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر میرے سامنے میز پر ایک پیش کش رکھی ہوئی تھی اور میں مسٹر بھیم جی کی بے حد عزت کرتا تھا اس لیے اور بھی کہ آخر وہی تھے جو مجھے دبئی لے گئے تھے۔ لہٰذا میں نے سوچنے کے لیے اور اپنے اہلِ خانہ سے مشورے کے لیے کچھ وقت مانگا۔ میں ان کا شکریہ بھی ادا کیا کہ انھوں نے مجھے اس ذمّے داری کے قابل سمجھا۔''

سیف الدین کے لیے یہ وقت بہت نازک تھا اس لیے کہ ان کے خاندان والوں کو بھنک لگ گئی ہوگی کہ وہ پاکستان واپس جانے کے لیے پر تول رہے ہیں، باوجودیکہ وہاں کے حالات بہت خراب ہیں۔ حتمی فیصلے میں کافی دن لگ گئے۔ بھیم جی کو امید نہیں رہی تھی کہ ان کی پسند کی شخصیت ای ایف یو کی سربراہی کی پیش کش کے لیے راضی ہوگی، کہ اچانک مثبت فیصلہ ہو گیا۔ کس طرح ہوا اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

زندگی میں پہلی بار سیف الدین پریشان ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ایک قابلِ احترام شخصیت کی جانب سے بڑی باعزت ملازمت کی پیش کش تھی۔ اسی شخصیت کی طرف سے جو اُن کو دبئی لے آئی تھی، جہاں انھوں نے ہر اعتبار سے اپنی زندگی کے بہترین دن گزارے تھے۔ ادھر یہ عالم کہ اُن کے اہلِ خانہ کے نزدیک کراچی کے خراب حالات کے درمیان پاکستان واپسی کا خیال پاگل پن کے مترادف تھا۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر ان کا دل کہہ رہا تھا کہ اہلِ خاندان درست ہیں۔ مگر ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ مسٹر بھیم جی کو صاف انکار کر دیں۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے۔ مسٹر بھیم جی روزآنہ ان کو ٹیلی فون کر رہے تھے اور وہ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ میں اپنے اہلِ خانہ سے مشورہ کر رہا ہوں۔ سیف الدین بہت افسردہ تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کی اس مخمصے سے کیسے نکلیں۔ پھر اچانک انھیں بوہری جماعت کے روحانی سربراہ، سیّدنا صاحب یاد آئے، دبئی آنے سے پہلے بھی جن سے انھوں نے اجازت لی تھی اور ان سے دعاؤں کے بھی طالب ہوئے تھے۔ سیف الدین نے قابلِ احترام سیّدنا صاحب سے ملاقات کے لیے درخواست کی۔ سیّدنا صاحب جب قاہرہ گئے تو سیف الدین سے ان سے ملاقات کے لیے وہاں پہنچ گئے۔

سیف الدین کہتے ہیں کہ'' میں اپنی اہلیہ لولو کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے سیّدنا صاحب سے بڑی تفصیل سے بات کی اور انھوں نے مجھے فیصلہ کرنے کے لیے صحیح راہ دکھائی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ حالات سن کر مجھے مشورہ دیں گے مگر انھوں نے مجھے سمجھایا کہ کیوں یہ فیصلہ مجھے خود ہی کرنا چاہیے۔ سیّدنا صاحب نے مجھ سے سوال کیا 'سیف الدین، جب تم دبئی آئے تو کس کے ساتھ آئے تھے؟' میں نے عرض کیا کہ جناب میں مسٹر بھیم جی کے گروپ کے ساتھ آیا تھا۔ انھوں نے فرمایا 'بالکل ٹھیک۔ تم کتنے دنوں کے لیے دبئی آئے تھے اور تمہارے ارادے کیا تھے؟' میں نے عرض کیا کہ جناب میں سمجھتا تھا کہ دو یا تین برس کے لیے۔ تو وہ بولے 'تم دبئی میں کتنے عرصے سے ہو؟' میں نے جواب دیا کہ جناب مجھے یہاں تقریباً چودہ برس ہو گئے ہیں۔ انھوں نے پھر سوال کیا کہ 'تمہارا کیا خیال ہے، کیا تم ساری عمر دبئی میں رہ سکتے ہو؟' میں عرض کی نہیں جناب، اگر میں چاہوں تب بھی یہاں ساری عمر نہیں رہ سکتا۔ ایک دن تو مجھے اپنے ملک واپس جانا ہی ہوگا۔

زیادہ سے زیادہ میں یہاں دس برس اور کام کرسکوں گا مگر پھر بھی مجھے واپس تو جانا ہی ہوگا۔ انھوں نے پھر سوال کیا' کمپنی کے نئے مالک عرب کیا تمھیں تمام عمر ملازم رکھنا پسند کریں گے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ عرب ایک دن فیصلہ کرلیں کہ اب سارے کام ان کے اپنے لوگوں کو ہی کرنے کا وقت آگیا ہے۔ کہ اب انھیں غیروں کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی؟ اس وقت تم کہاں جاؤ گے، پاکستان؟ اور اگر پاکستان گئے تو کس کے پاس کام کرو گے، انھیں کے پاس جو تم کو دبئ لے آئے تھے؟' میں نے عرض کی کہ اگر میں پاکستان واپس گیا تو شاید یہی صورت ہوگی۔ انھوں فرمایا کہ ایسی صورت میں تم ان کے سامنے ایک بھکاری کی طرح جاؤ گے اور کہو گے کہ میں آپ کے پاس کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت وہ لوگ خود تمھیں پاکستان واپس جانے کی پیش کش کررہے ہیں۔ تم اگر عربوں کے نکال دینے کے بعد مسٹر بھیم جی کے پاس گئے تو تم ان سے مہربانی کی توقع لے کر جاؤ گے۔ تو اب تم ہی فیصلہ کرو کہ تم ان کی پیش کش قبول کرنے میں پہل کرو گے یا بعد میں ایک بھکاری کی حیثیت میں ان کے سامنے جانا پسند کرو گے؟ سیّدنا صاحب نے فرمایا کہ اگر تم عربوں کے ہاتھوں فارغ کردیے جانے کے بعد ان کے پاس گئے تو تم ان کی مہربانی کے خواستگار ہو گے۔ سو، تم کیا چاہتے ہو، پہلی ہی بار ان کی پیش کش کو قبول کر کے چلے جانا یا ہاتھوں میں کاسۂ گدائی لیے جانا؟ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ دبئ میں میری بہن رہتی ہے، اس کے بچے میرے بچوں جیسے ہیں اور مجھ سے پلے ہوئے ہیں۔ مجھے اور لولو کو بہت دکھ ہوگا اگر ہم ان کو چھوڑ کر چلے گئے۔ سیّدنا صاحب نے فرمایا: سیف الدین، ہمیشہ یاد رکھو، زندگی ایک دریا کی مانند ہوتی ہے۔ اس دریا کو دریا بنانے والے چھوٹے چھوٹے نالے ہوتے ہیں جو پانی فراہم کرتے ہیں۔ اگر تمھارا دریا مستحکم ہے تو نالے مستحکم نہیں ہوں گے۔ اس لیے جب تم کوئی فیصلہ کرو تو مرکزی سلسلے کو درہم برہم نہ کرو اور تمھارے فیصلے نالوں کی کیفیت پر منحصر نہیں ہونے چاہییں۔ تمھاری بہن اور ان کے بچوں کی زندگیاں ان کی اپنی زندگیاں رہیں گی۔ تم کہیں بھی رہ کر ان کے لیے بھلائی کرسکتے ہوں اور تمھارا یہ فعل مستحسن ہو گا۔ اور پھر انھوں نے آخری جملہ کہا: سیف الدین، اپنے فیصلے تمھیں خود کرنے چاہییں۔ ہم ان سے رخصت ہو کر باہر نکلے تو میں نے لولو سے کہا، میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ سیّدنا صاحب نے یہ تو نہیں کہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، مگر مجھے بتادیا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ لہٰذا ہم دبئ کے لیے روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچتے ہی میں نے بھیم جی صاحب کو ٹیلی فون کیا اور انھیں بتادیا کہ میں نے واپس آنے اور اُن کے ساتھ کام کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

اور پھر ۱۵ر مئی ۱۹۸۹ء کو انھوں نے اسی کمپنی میں شمولیت اختیار کرلی جس کو ۱۹۷۵ء میں چھوڑ کر دبئ گئے تھے۔ جولائی ۱۹۹۰ء میں سلطان احمد کی جگہ ان کو منیجنگ ڈائریکٹر بنادیا گیا۔ سلطان احمد ان' تین بندوق برداروں' کے آخری فرد تھے جو مسٹر بھیم جی کی طویل غیر موجودگی میں ای ایف یو کے قلعے کی حفاظت کررہے تھے۔ ان کو ڈپٹی چیئرمین بنادیا گیا۔ تختِ حکومت خالی نہیں رہا اس لیے کہ بالآخر نیا حکمراں آگیا تھا۔

مسٹر بھیم جی جانتے تھے کہ سیف الدین کی موجودگی میں انھیں EFU General کے لیے کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔ آفیسر ٹریننگ اسکیم کے رُکن، زندگی کے بیمے کے ایجنٹ، SITE برانچ کے پہلے منیجر، اور اب دبئ کے کامیاب چودہ برس کے بعد کے سیف الدین ہر قسم کی مسابقت کا سامنا کرنے اور کمپنی کا سفینہ چلانے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کو اکیلا چھوڑا جاسکتا تھا تاکہ ان کے چیئرمین ۱۹۷۲ء میں ہونے والے نقصانات کے ازالے کے لیے، جو اُن کے ذہن سے محو نہیں ہوئے تھے، اپنی پوری توجہ مرکوز کرسکیں: یعنی زندگی کے بیمے کو دوبارہ نجی شعبے میں لانے کے لیے سنجیدگی سے جدو جہد کرسکیں۔

۱۹۹۰ء کا سال ہمارے دوست کے لیے خوشیوں سے بھرا زمانہ رہا ہوگا۔ تقریباً ۵۲ر برس قبل جو سیف الدین ایک بیمہ ایجنٹ کی حیثیت سے کمپنی میں شامل ہوئے تھے آج وہی کمپنی کے سفینے کے ناخدا بن چکے تھے۔ ان کو اپنے چیئرمین کا پورا اعتماد حاصل تھا۔ چیئرمین ان کو اپنے دونوں بیٹوں کی طرح سمجھتے تھے۔ مگر اُسی برس کے شروع میں سیف الدین کے بہت پیار کرنے والے والد کا بھی انتقال ہوگیا اور اختتام کے قریب ان کے اتالیق اور باپ جیسے شفیق امیر علی مولید ینا بھی اس عالم فانی سے کوچ کرگئے۔ سیف الدین کے لیے یہ افسردگی کا زمانہ تھا

جس میں ان کی اہلیہ لولو اور ان کی بہن نے ان کی دلجوئی کی اور انھیں غموں کو سہنے کا سہارا دیا۔ سیف الدین ہمیشہ اپنے اہلِ خانہ سے بہت قریب رہے ہیں جو ان کی زندگی کے اہم موڑ پر ان کے معاون رہے ہیں۔ جس طرح وہ اپنے فرائض کے بارے میں سنجیدہ ہوتے ہیں اسی طرح ان کا خاندان بھی انھیں بہت عزیز رہتا ہے۔ دل کی گہرائیوں سے سب کو خوش دیکھنے کی آرزو سیف الدین اپنے رفیقانِ کار کی بھلائی کے لیے بھی ہمیشہ آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں سے زیادہ کام کی توقع رکھتے ہیں تو ان کو نوازتے بھی خوب ہیں۔ اس طرح وہ ایسے جدید کاروباری رہنماؤں کے نمائندے نظر آتے ہیں جو پیشہ وری میں یقین رکھتے ہیں اور اپنے کارِ منصبی سے جذباتی وابستگی برقرار رکھتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ انسانی قدریں کامیابی اور ترقی کے قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتی رہیں۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں انسانیت کا عنصر شامل نظر آتا ہے اور یہی انداز ان کو اس مقام تک لے آیا ہے۔

جب تک یہ کتاب چھاپے خانے سے باہر آئے گی سیف الدین ایک عظیم کمپنی کے کامیاب چیف ایگزیکٹو کی دسویں سالگرہ منا چکے ہوں گے۔ جس کو بھی ان سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے اس کو فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ سیف الدین اپنے تصورات کا اور اپنی سمت کا، جدھر وہ جانا چاہتے ہیں، پورا ادارک رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا ''میں اپنی منزل سے پوری طرح واقف ہوں۔ میں ریل گاڑی کے انجن کا ڈرائیور ہوں اور اپنے سارے مسافروں کو بتا چکا ہوں کہ جو بھی میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے میں اس کے بارے میں سنجیدہ رہوں گا اور اس کی نگہداشت کرتا رہوں گا۔ مگر ان سب کو میرے ہمراہ ریل گاڑی میں رہنا ہوگا۔ میرے راستے میں روڑے اٹکانے کے لیے نہیں۔ اگر لوگ میری گاڑی سے اتر جانا چاہتے ہیں تو ان کے یہ option موجود ہے۔ مگر میں اپنے راستے سے کبھی منحرف نہیں ہوں گا اور ایسے بہت سے لوگ تلاش کرلوں گا جو میری مدد کریں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا کام بخوبی چل رہا ہے۔ میں نے اپنے اتالیق مسٹر روشن علی بھیم جی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی مدد کے بغیر، جو انھوں نے مجھے فراہم کی ہے، میں اس عہدے تک نہیں پہنچ سکتا تھا جس پر آج ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے یا اللہ کی مہربانی کہ ایگزیکٹو آفیسر اسکیم میں بھرتی ہونے والوں میں سے میں واحد آدمی ہوں جو مسٹر بھیم جی کے بیٹوں اور ان کی بیگم صاحبہ کے ساتھ مل کر کام کرنے کے عوض EFU Life کے چیئر مین اور EFU General کے مینجنگ ڈائریکٹر عہدوں تک پہنچ گیا ہوں۔ میں خداوندِ کریم کا شکر گزار ہوں کے میرے تمام ساتھی فرائضِ منصبی ادا کرنے میں میری مدد کرتے ہیں۔ میں اسی جذبے سے اس کمپنی کی خدمت کرتا رہوں گا جیسے کہ مسٹر بھیم جی اپنی زندگی کے طویل عرصے میں کرتے رہے ہیں۔ میرے اپنے بھی تصورات میں، خواب ہیں جنھیں میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک سب سے پہلے کمپنی اور اس کے بعد اس میں کام کرنے والے ہیں۔ میرے نزدیک سب کچھ خود بخود ہوتا رہتا ہے، لوگ صرف ہاتھ بٹاتے ہیں۔''

سیف الدین نے بہت کچھ کیا ہے، اور ان سے بہت کچھ اور کرنے کی توقع ہے۔

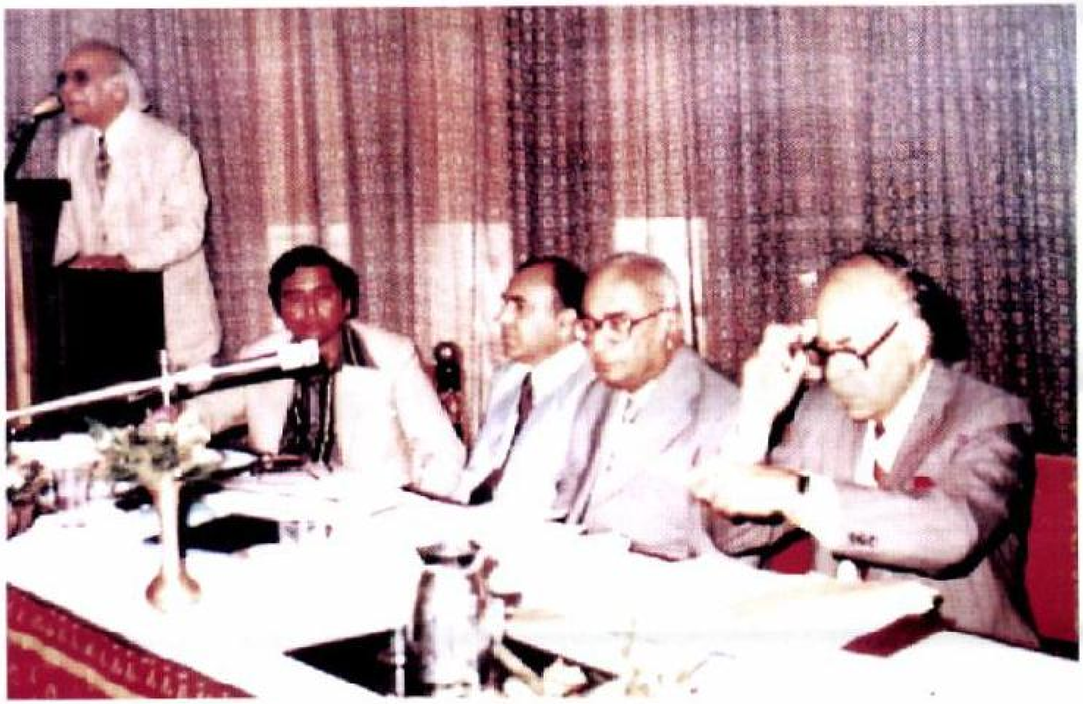

ای ایف یو کی اعلیٰ انتظامیہ کی میٹنگ سے سیّد سبطِ حسن خطاب کر رہے ہیں، اسٹیج پر
(دائیں سے) سلطان احمد، روشن علی بھیم جی، نواب حسن اور فصیح الدین بیٹھے ہیں

روشن علی بھیم جی اور ان کی اہلیہ ۱۹۸۲ء کی گولڈن جوبلی تقریب میں سیّد سبطِ حسن کو خوش آمدید کہتے ہوئے،
تصویر میں دائیں طرف جہانگیر صدیقی بھی نظر آرہے ہیں

دسمبر ۱۹۹۹ء میں ساجد زاہد اپنے کراچی کے گھر میں

نواب حسن کے بے حد قریبی دوست اور نیو انڈیا، بمبئی کے سابق مینجنگ ڈائریکٹر اے سی مکھرجی

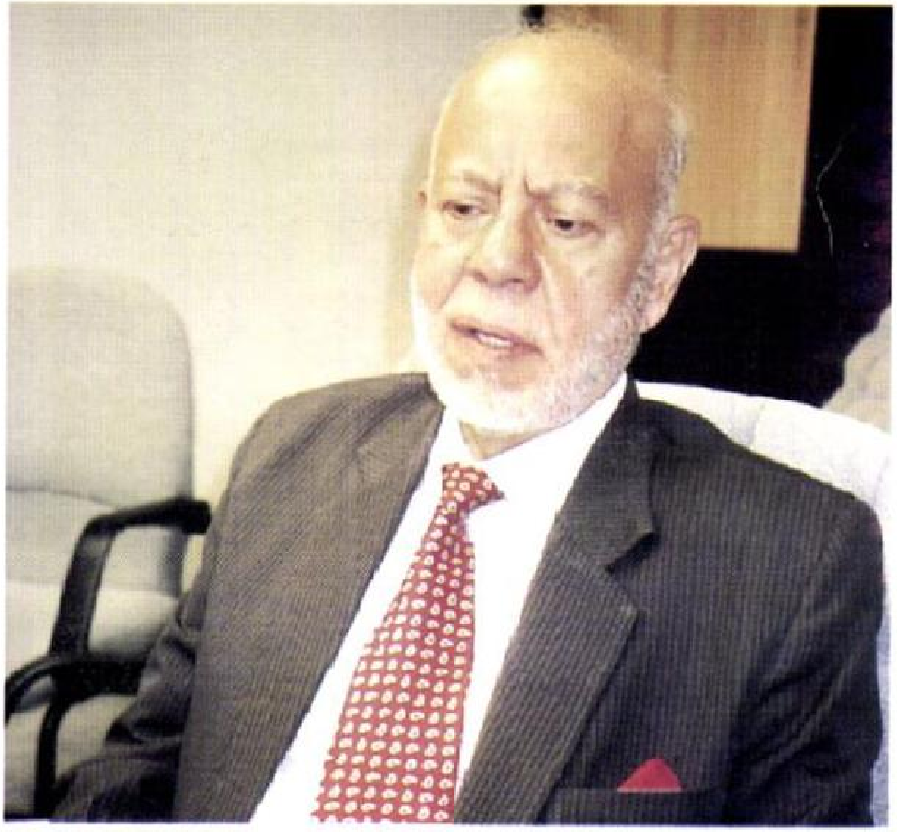

ای ایف یو کے سابق صدر اور منیجنگ ڈائریکٹر سلطان احمد جواب کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز پر ہیں، ۱۹۹۸ء

ای ایف یو کے تین سابق چیف ایگزیکٹو آفیسرز نواب حسن، روشن علی بھیم جی اور سلطان احمد

ڈپٹی ایگزیکٹوڈائریکٹر مرزا فیض احمد، قمر ہاؤس میں کتاب کے مصنف کے دفتر میں، ۱۹۹۹ء

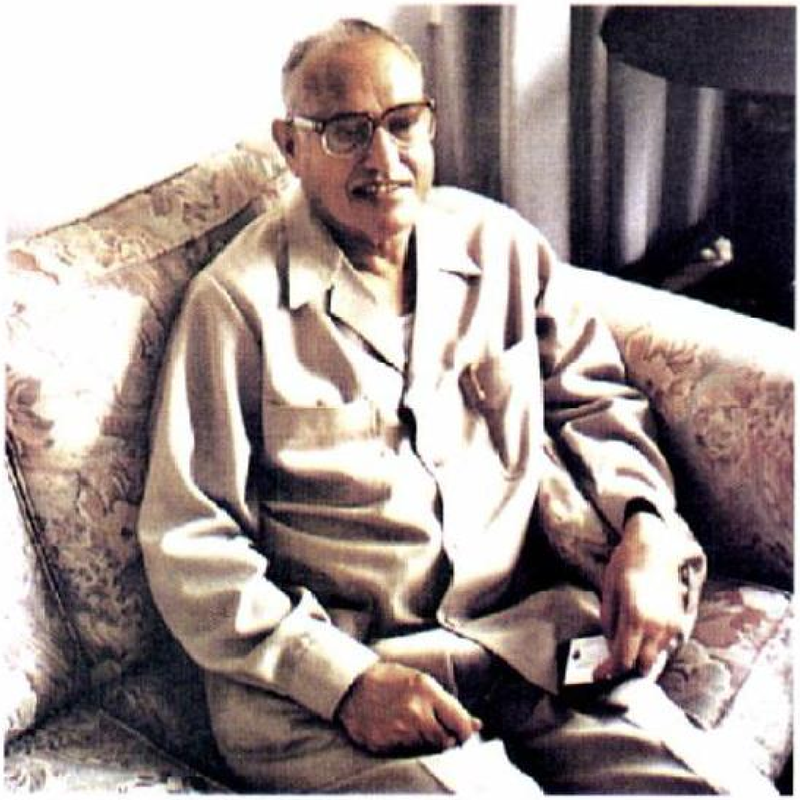

محمد حسین علوی لندن میں، ۱۹۹۹ء

آغا علی یوسف لندن میں، ۱۹۹۹ء

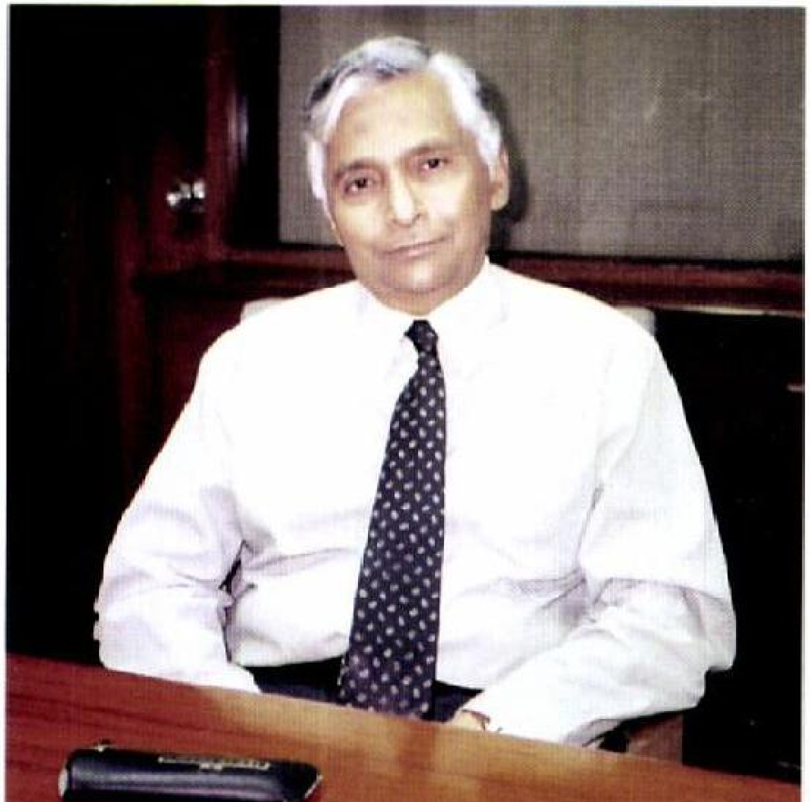

ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر اے ایف یو ایم فصیح الدین، قمر ہاؤس میں کتاب کے مصنف کے دفتر میں، ۱۹۹۷ء

ای ایف یو لائف کے میڈیکل ڈائریکٹر ڈاکٹر تاج الدین مانجی، پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کراچی، ۱۹۹۸ء

ای ایف یو جنرل کے ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر حسن علی عبداللہ، ۱۹۹۸ء

ای ایف یو لائف کے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں حسن علی عبداللہ، فصیح الدین، مائیکل بیل، عبدالرحمٰن حاجی
اور کتاب کے مصنف کے ساتھ، عقب میں منیر بھیم جی اور رفیق بھیم جی بھی نظر آرہے ہیں

روشن علی بھیم جی، عالی مرتبت آغا خان کے ساتھ

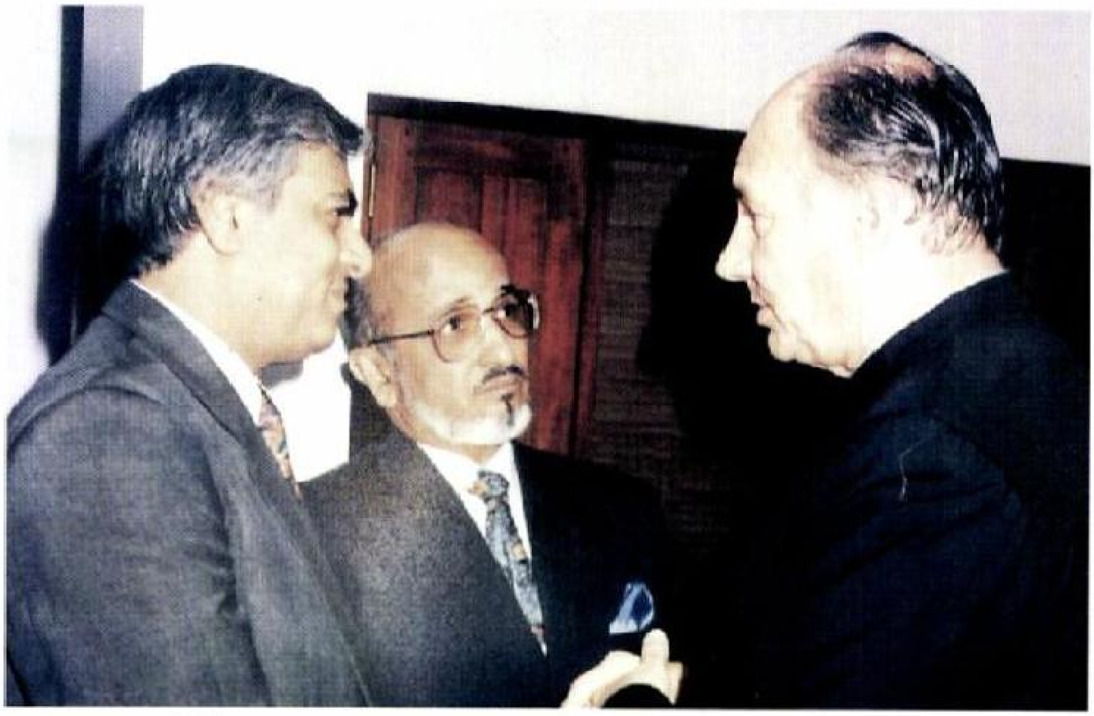

حسن علی عبداللہ اور سیف الدین زومکا والا عالی مرتبت آغا خان سے محوِ گفتگو

ای ایف یو لائف کے مینیجنگ ڈائریکٹر طاہر جی ساچک ۱۹۹۹ء میں اپنے دفتر میں

جسٹس میاں محبوب احمد اور روشن علی بھیم جی، طاہر ساچک کے ساتھ ان کے
دفتر کے دورے کے موقع پر، ۱۹۹۸ء

روشن علی بھیم جی اور جسٹس ناصر اسلم زاہد، ایک خوش گوار اندازِ گفتگو

ای ایف یو جنرل اور ای ایف یو لائف کا حالیہ بورڈ آف ڈائریکٹرز

۱۹۹۲ء میں ای ایف یو لائف کا پہلا بورڈ آف ڈائریکٹرز

ای ایف یو جنرل کے مینیجنگ ڈائریکٹر اور چیف ایگزیکٹو، ای ایف یو لائف اور الیانز ای ایف یو ہیلتھ انشورنس کمپنی کے چیئرمین سیف الدین زومکاوالا

روشن علی بھیم جی کتاب کے مصنف سے شہریار جلیس کا تعارف کراتے ہوئے (۱۹۸۹ء)

میونخ ری کے افسران کا استقبالیہ (دائیں سے) ورنر بگل، مسز بانو بھیم جی، ڈبلیو ڈبلیو کرنوسکی، روشن علی بھیم جی
عبدالرحمٰن حاجی حبیب، سلطان احمد اور ریز وڈرز

تقریب کے شرکاء کا باہمی تعارف

ای ایف یو گروپ کی بورڈ میٹنگ

ای ایف یو لائف، کراچی کے دفتر میں مرحوم روشن علی بھیم جی کو خراجِ تحسین (دائیں سے)
ای ایف یو لائف کے مینجنگ ڈائریکٹر طاہر ساچک، منیر بھیم جی، رفیق بھیم جی اور مرحوم کے پوتے سعد

احباب، رفقائے کار اور ای ایف یو گروپ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبران کے علاوہ ای ایف یو جنرل کے
چیف ایگزیکٹو آفیسر، ای ایف یو لائف اور الیانز ای ایف یو ہیلتھ انشورنس کمپنی کے چیئرمین سیف الدین
زومکاوالا بھی شریک ہیں

کتابیات

اس کتاب کی تدوین میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

Ahmad, Shaikh Mahmud (1961) Pilgrimage of Eternity - Iqbal's "Javid Nama"
Institute of Islamic Culturel, Lahore
Ahsan, Aitzaz (1996) The Indus Saga and The Making of Pakistan
Oxford University Press, Karachi
Ali, Tariq (1985) Die Nehrus und die Gandhis - Eine indische Dynastie
Ullstein, Frankfurt/Main
Allana, G. (1985) Our Freedom Fighters (1947-1562) - Twenty-one great lives
Ferozsons (Pvt.) Ltd.
Ali, Tariq(1985) Die Nehrus und die Gandhis - Eine indische Dynastie
Ullstein, Frankfurt/Main
Arberry, A.J. (1961) Tales from the Masnavi
George Allen & Unwin Ltd.
Berg,, Hans Walter (1983) Gesichter Asiens, Dreißig Jahre Augenzeuge der Geschichte
Hoffmann und Campe, Hamburg
Bhutto, Benazir (1989) Daughter of the East
Droemer Knaur
Bolitho, Hector (1954) Jinnah - Creator of Pakistan
John Murray, Allies Book Corporation, Karachi
Braibanti, Ralph (1999) Chief Justice Cornelius of Pakistan
Oxford University Press, Karachi
Burnes, Alexander (1834) A Voyage on the Indus
John Murray, London
Burney, I.H., (1996) No Illusions, Some Hopes and no Fears

Oxford University Press, Karachi
Chishti, M.A. (1987) Insurance Industry: Policies & Practice in Pakistan
Deens Publications, Karachi
Cloughley, Brian (1999) A History of the Pakistan Army - Wars and insurrections
Oxford University Press,
Dani, Prof. Ahmad Hasan (1998) Founding Fathers of Pakistan
Sang-e-Meel Publications
Duncan, Emma (1989) Breaking the Curfew - A Political Journey Through Pakistan
Arrow Books
Elliot, Sir H.M. (1869) The History of India - The Muhammadan Period
Susil Gupta (India) private Ltd., Calcutta
Fitzgerald, Edward (new edition 1947) Rubaiyat of Omar Khayyam
Collins, London and Glasgow
French, Patrick (1997) Liberty or Death - India's Journey to Independence and Division
Harper Collins Publishers
Gandhi, M.K. (1927) An Autobiography
or The Story of My Experiments with Truth
Pinguin Books, London
Gauhar, Altaf (1993) Ayub Khan - Pakistan's first Military Ruler
Sang-e-Meel Publications , Lahore
Harvey, Andrew / Hanut, Eryk (1999) Perfume of the Desert
Inspirations from Sufi Wisdom
The Theosophical Publishing House, Wheaton, IL
Hasan, Sibte (1986) The Battle of Ideas in Pakistan
Pakistan Publishing House
Hodson, H.V. (1969, 1985) The Great Divide - Britain-India-Pakistan
Oxford University Press, Karachi
Hussain, J. (1997) A History of the Peoples of Pakistan - Towards Independence
Oxford University Press, Karachi
Ikram, S.M. / Spear, P. (1955) The Cultural Heritage of Pakistan
Oxford University Press, Karachi
Iqbal, Javid (1961) Stray Reflections - A Note-Book of Allama Iqbal
SH. Ghulam Ali & Sons, Lahore
Ispahani, M.A. H. (1966) Qaid-e-Azam Jinnah As I Knew Him

Process Pakistan, Karachi
James, Lawrence (1997) RAJ The Making and Unmaking of British India
Little, Brown and Company (UK), London
Jinnah, Mahomed Ali (1947-1948) Speeches as Governor General
Pakistan Publications, Karachi
Kayani, M.R. (1963) Not the Whole Truth
Pakistan Writers' Co-operative Society, Lahore
Keay, John (1991) The Honourable Company
A History of the English East India Company
Harper Collins Publishers
Khairi, Saad R. (1996) Jinnah Reinterpreted - The Journey from Indian
Nationalism to Muslim Statehood
Oxford University Press
Khaliquzzaman, Choudhry (1961) Pathway to Pakistan
Longmans Green & Co., Ltd UK
Khan, Mazhar Ali, (1996) Pakistan - The first Twelve Years
The Pakistan Times Editorials
Oxford University Press
Khan, Mohammad Ayub (1967) Friends Not Masters - A Political Autobiography
Oxford University Press, Karachi
Khan, Rahim Bux (1967) My Beloved Pakistan
Trade and Industry Publications Ltd., Karachi
Khuro, Hamida / Mooraj, Anwer (1997) KARACHI Megacity of our Times
Oxford University Press
Kiernan, V.G. (1955) Poems from Iqbal
John Murray, Albemarle Street, London, W.
Kiernan, V.G. (reprinted 1999) Poems from Iqbal - Renderings in English Verse
with Comparative Urdu Text
Oxford University Press
McGrath, Allen (1996) The Destruction of Pakistan's Democracy
Oxford University Press
Moraes, Frank (1956) Nehru
Verlag Kurt Desch, Wien, München, Basel
Nanda, B.R. (1958) Mahatma Gandhi, A Biography
Oxford University Press, Delhi
Nanda, B.R. (1962) The Nehrus - Motilal and Jawaharalal

George Allen & Unwin Ltd., London
Nehru, Jawaharlal (1946) The Discovery of India
The Signet Press, Calcutta
Nevile, Pran (1997) Lahore - A Sentimental Journey
Harper Collins Publishers, India
Pakistan-German Forum, Karachi (1960) Mohammad Iqbal
Poet and Philosopher
Paz, Octavio (1995) In light of India
The Harvill Press, London
Philips, C.H./ Wainwright, Mary Doreen (1970) The Partition of India
Policies and Perspectives 1935 - 1947
George Allen and Unwin Ltd, London
Prawdin, Michael (1963) The Builders of the Mogul Empire
George Allen & Unwin Ltd., London
Qadir, Sh. Abdul (1975) IQBAL - The Great Poet of Islam
Sang-e-Meel Publications, Lahore
Quereshi, Saleem (1998) Jinnah The Founder of Pakistan
Oxford University Press, Karachi
Schimmel, Annemarie (1977) Muhammad Iqbal, Botschaft des Ostens
Horst Erdmann Verlag, -Tübingen und Basel
Schimmel, Annemarie, (1994) Berge, Wüsten, Heiligtümer
Meine Reisen in Pakistan und Indien
C.H. Beck, München
Schimmel, Annemarie, (1995) Die Zeichen Gottes
Die religiöse Welt des Islams
C.H. Beck, München
Shah, Idries (1964) Die Sufis - Botschaft der Derwische, Weisheit der Magier
Diederichs Gelbe Reihe, München
Siddiqui, Dr. Muhammad Ali (1996) Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah
SPEECHES Round Table Conference 1930-1932
Sharma, HD (1998) 100 Best Pre-Independence Speeches 1870 - 1947
Harper Collins Publishers India
Syeed, Khalid Bin (1968) Pakistan - The Formative Phase 1857 -1948
Oxford University Press, Karachi
Suleri, Z.A. (1966) Politicians and Ayub
Being a Survey of Pakistani Politics from 1948 to 1964

Lion Art Press Ltd., The Mall, Lahore
Talbot, Ian (1996) Freedom's Cry - The Popular Dimension in the Pakistan Movement and Partition Experience in North-West India
Oxford University Press, Karachi
Veltheim-Ostrau, Hans-Hasso von (1956) Tagebücher aus Asien
Claassen Verlag Hamburg
Wilcox, Wayne Ayres (1963) Pakistan - The Consolidation of a Nation
Columbia University Press, New York and London
Wolpert, Stanley (1993) Zulfi Bhutto of Pakistan - His Life and Times
Oxford University Press, Karachi
Wolpert, Stanley (1984) Jinnah of Pakistan
Oxford University Press, Karachi
Wolpert, Stanley (1996) Nehru - A Tryst with Destiny
Oxford University Press, New York
Woodruff, Philip (1953) The Founders - The Men who Ruled India
Allden Press, Oxford
Woodruff, Philip (1954) The Guardians - The Men who Ruled India
Allden Press, Oxford
Zakaria, Rafiq (1989) The Trial of Benazir
Popular Prakashan Private Limited, Bombay
Ziring, Lawrence (1997) Pakistan in the Twentieth Century - A Political History
Oxford University Press, Karachi

اشاریہ

آ

آدمجی، وحید۔ ۲۲۱۔
آرنلڈ، سرٹی ڈبلیو۔ ۴۹، ۵۰۔
آزاد، اختر۔ ۸۰، ۸۷، ۹۶، ۹۷، ۱۰۰، ۱۰۷، ۳۳۳، ۳۷۹۔
آزاد، مولانا ابوالکلام۔ ۱۵۲، ۱۸۴۔
آغا خان۔ ۴۲، ۴۴، ۵۴، ۶۰، ۸۵، ۹۷، ۱۰۳، ۱۲۱، ۱۲۴، ۱۲۷، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۵۶، ۱۹۳، ۲۰۹۔
آئن اسٹائن، البرٹ۔ ۵۱، ۶۵۔
آئیون، ای سی۔ ۷۸، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۱۰۰، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۲۰۳، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۹، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۳۰، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۷۹۔
آئیون، مسز۔ ۲۸۱، ۳۰۳۔

ا

ابو المحمود (ابول بھائی)۔ ۱۷۵، ۱۷۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۴۰۳۔
اتاترک، مصطفےٰ کمال۔ ۱۵۴۔
اچاریہ، گوپال (راجاجی)۔ ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷۔
احمد، امیر۔ ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵۔
احمد، تحسین۔ ۸۷، ۳۰۳، ۳۳۳۔
احمد، جنرل افتخار۔ ۱۰۴۔
احمد خان، سرسیّد۔ ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۹، ۴۰، ۴۲، ۴۶، ۵۱، ۵۲، ۱۱۵، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۹، ۱۵۰، ۳۴۴۔
احمد، سلطان۔ ۹۰، ۳۱۵، ۳۵۲، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۷۹، ۳۸۱، ۴۰۶، ۴۲۹۔
احمد، شوکت سعید۔ ۹۰، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶۔
احمد، مرزا فیض۔ ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۴۲۳۔
احمد، میاں سعید۔ ۹۰، ۱۰۳، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۶۱، ۳۷۹، ۳۹۴، ۴۰۲۔
احمد، نجم الدین۔ ۳۶۰۔
ارسلا۔ ۱۵۔
ازمے، لارڈ۔ ۶۹۔
اسپونر۔ ۹۸۔
اسٹالن۔ ۳۰۵۔
اسٹیفورڈ۔ ۷۸، ۱۰۲۔
اسماعیل، حبیب۔ ۱۰۹۔
اسمتھ۔ ۱۰۳۔
اشرف، ڈاکٹر۔ ۳۱۹۔
اصفہانی، ابوالحسن۔ ۶۸، ۷۶، ۱۰۰، ۱۴۲، ۱۵۷، ۱۶۱، ۱۷۳، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۵، ۲۱۷، ۲۸۱، ۳۰۴۔
اصفہانی، اِسکی۔ ۲۰۵، ۲۰۶۔
اصفہانی، ایران۔ ۲۰۵۔
اصفہانی، بیگم قمر۔ ۱۷۲، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۵، ۲۰۶۔
اصفہانی، صدری۔ ۱۹۸، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۲۱۔
اصفہانی، ضیا۔ ۲۰۵، ۲۰۶۔

اصفہانی، مرزا احمد۔ ۸۶، ۱۵۷، ۱۸۶، ۱۹۲، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۲۸، ۲۸۲، ۳۱۱۔

اقبال، جاوید۔ ۵۳۔

اقبال، علامہ محمد۔ ۳۱، ۳۵، ۳۶، ۴۶، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۶۸، ۱۱۵، ۱۳۹، ۲۰۹، ۲۱۳، ۲۲۵، ۲۲۷، ۳۱۳۔

اکبر، شہنشاہ۔ ۲۳، ۳۱۔

الانہ، جی۔ ۵۴، ۵۵، ۶۲، ۶۹، ۷۰۔

الزائمر، ڈاکٹر الوس۔ ۸۸۔

اللہ بخش، میاں۔ ۵۲۔

اللہ رکھا۔ ۱۵۸۔

النہیان، شیخ زید بن سلطان۔ ۳۱۴۔

امین۔ ۱۶۹۔

امینہ، شہزادی۔ ۳۰۶۔

انصاری، ڈاکٹر ایم اے۔ ۸۵، ۱۲۷، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۶، ۱۵۹۔

انصاری، عبدالعزیز۔ ۸۵، ۸۶، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۷۱۔

انصاری، مقبول۔ ۹۸، ۲۸۲۔

انصاری، نسیم احمد۔ ۳۶۰۔

اوبرائن۔ ۳۶۰۔

اورنگزیب، شہنشاہ۔ ۲۶، ۲۷۔

ایٹلی، کلیمنٹ۔ ۲۴، ۶۸، ۷۴۔

ایڈوانی۔ ۱۱۰۔

ایشلے، ایڈورڈ جان۔ ۱۰۶۔

ایلزبتھ دوم، ملکہ۔ ۱۳۸۔

ایوب، طاہر۔ ۲۳۴، ۲۳۵۔

ایوب، گوہر۔ ۲۳۴، ۲۳۵، ۳۰۱۔

اینڈریا۔ ۱۵۔

ب

باقر نقوی۔ ۱۱۔

بائی، متھی۔ ۶۲، ۶۳۔

بخش، خدا۔ ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۳۳۴، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۸، ۴۰۱۔

بذل اللہ، سر محمد۔ ۱۸۳۔

برکی۔ ۳۸۴۔

برنہارڈ۔ ۱۶۸، ۱۶۹۔

بروہی، اے کے۔ ۲۴۸۔

بساریا، راجا اودھ نرائن۔ ۸۶۔

بسنت، اینی۔ ۲۸، ۲۰۹۔

بشیر، کرنل۔ ۳۸۵۔

بشیر، میاں۔ ۳۱۱۔

بنرجی، سریندر ناتھ۔ ۳۸۔

بنگالی، عبدالرحمٰن۔ ۳۴۲۔

بوس، سبھاش چندر۔ ۲۸۰۔

بوس، سورت چندر۔ ۷۰۔

بوگرہ، محمد علی۔ ۲۰۵۔

بیٹن، لارڈ ماؤنٹ۔ ۶۸، ۶۹، ۷۴، ۱۲۲، ۱۳۹۔

بیکسٹر، ٹی۔ ۷۸، ۸۷، ۹۶، ۱۰۰، ۱۷۴، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۳۱۱، ۳۲۸، ۳۳۳۔

بیکن، فرانسس۔ ۱۸۴۔

بیگ، عبداللہ۔ ۳۳۲۔

بیگم زبیدہ یوسف۔ ۲۲۷۔

بیگم، سکندر۔ ۱۲۳۔

بیگم قاضی۔ ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۳، ۱۷۲۔

بیگم مولانا محمد علی جوہر۔ ۱۳۰۔

بیگم، نواب قدسیہ۔ ۱۲۳۔

بیل، مائیکل۔ ۴۱۳، ۴۱۴۔

بھائی، پونجا۔ ۶۲۔

بھٹو، بینظیر۔ ۲۵۲۔

بھٹو، ذوالفقار علی۔ ۷۳، ۱۰۳، ۱۹۰، ۱۹۳، ۲۰۵، ۲۲۳، ۲۳۶، ۲۴۲، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۸، ۲۹۱، ۳۳۵، ۳۴۲، ۳۶۱، ۳۸۹، ۴۲۳۔

بھیم جی، اکبر علی۔ ۳۹۰، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸۔

بھیم جی، بانو۔ ۴۱۵۔

بھیم جی، حیدر۔ ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸۔

بھیم جی، رفیق۔ ۱۳۔

بھیم جی، روشن علی۔ ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۴۳، ۳۶، ۶۱، ۸۵، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۱۰۳، ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۷، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۸، ۳۰۷، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۸، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۵، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۸۱، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۴، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۹، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۵، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰۔
بھیم جی، منیر۔ ۱۳۔

پ

پال، جان۔ ۲۰، ۳۹۰، ۳۹۱، ۴۱۲۔
پٹیل، ولبھ بھائی۔ ۶۹، ۱۴۲، ۱۸۵۔
پرنس آف ویلز۔ ۱۲۷۔
پرتل۔ ۸۰۔
پروین (معین الدین)۔ ۲۹۶، ۳۰۰۔
پشاوری، عبدالرحمٰن۔ ۱۵۲۔
پلمپ، جان۔ ۱۰۰، ۱۰۶۔

ت

تابانی، اشرف۔ ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱۔
ترابی، علامہ رشید۔ ۳۳۱۔
تھاور۔ ۳۲۳۔
تھیکرے، ولیم۔ ۳۲

ٹ

ٹالسٹائی، لیو۔ ۱۴۱، ۲۱۶۔
ٹیگور، رابندر ناتھ۔ ۴۸، ۲۱۲۔

ث

ثانی، شاہ عالم۔ ۳۱۔

ج

جارج پنجم، شہنشاہ۔ ۴۲، ۱۳۸، ۱۵۲۔
جارج، لائڈ۔ ۶۱۔
جانوٹ، ایچ کے۔ ۸۸۔
جعفری، محمود۔ ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸۔
جلیس، شہریار۔ ۲۱۔
جمال الدین۔ ۲۸۲۔
جناح، فاطمہ۔ ۶۳، ۶۹، ۱۷۳، ۲۱۰۔
جناح، قائدِ اعظم محمد علی۔ ۲۳، ۳۱، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۱۰۹، ۱۱۵، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۳۰، ۱۳۴، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۶۱، ۱۶۸، ۱۷۰، ۱۷۳، ۱۸۸، ۱۹۲، ۱۹۷، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۲، ۲۲۶، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۴۳، ۲۴۹، ۲۵۰، ۳۱۱، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۳، ۳۹۷۔
جوٹا، مولانا۔ ۱۵۹، ۱۶۰۔
جوہر، مولانا شوکت علی۔ ۴۲، ۱۲۴، ۱۵۶، ۲۰۹۔
جوہر، مولانا محمد علی۔ ۳۷، ۴۲، ۱۲۴، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۲۰۹۔
جیمز، ایڈورڈ کوک۔ ۱۸۴۔
جیمس، لارنس۔ ۳۸۔

چ

چٹرجی، بنکم چندر۔ ۳۷۔
چرچل، ونسٹن۔ ۶۱، ۱۳۸، ۲۲۶۔
چشتی، ایم اے۔ ۸۱، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۵۔
چشتی، خواجہ معین الدین۔ ۱۰۰۔
چندریگر، آئی آئی۔ ۳۹۷۔

چودھری، محمد۔ ۸۰، ۸۹، ۹۷، ۹۹، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۵۷، ۱۵۸، ۲۸۲، ۳۶۲۔

چودھری، نسیم۔ ۴۱۵۔

چیپلن، چارلی۔ ۱۳۵۔

ح

حبیب اللہ، جنرل۔ ۲۳۵، ۳۰۱۔

حبیب، حاجی۔ ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۲۔

حبیب، عبدالرحمٰن حاجی۔ ۳۲۲، ۳۰۴۔

حبیب، عبدالغنی (عبدل سیٹھ)۔ ۲۲۰، ۲۲۱۔

حبیب، محمد علی۔ ۱۰۹، ۱۱۰۔

حسن، سروزیر۔ ۲۰۹۔

حسن، سید سبط۔ ۲۰۸، ۲۴۸، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۳۵، ۳۸۵۔

حسن، مسز۔ ۳۵۳۔

حسن، ممتاز۔ ۵۱، ۵۴، ۲۳۰، ۲۹۶۔

حسن، نواب۔ ۳۳۶، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۹، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۷۷، ۳۷۹، ۴۰۱، ۴۱۲، ۴۲۱، ۴۲۲۔

حسین، انصار۔ ۳۸۴۔

حسین، زاہد۔ ۸۷، ۹۹، ۲۳۰، ۲۳۲، ۲۳۳، ۳۱۰، ۳۴۰۔

حسین، سیّد اشتیاق۔ ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۶۔

حسین، فدا۔ ۲۳۵۔

حسین، کھتری۔ ۴۰۔

حق، سیّد احمد۔ ۴۰۔

حمید، اختر۔ ۳۱۶۔

حمید، قنبر۔ ۸۹، ۹۰، ۳۱۶۔

حیات، ڈاکٹر سکندر۔ ۳۹۔

حیدر، سجاد۔ ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۸، ۳۳۷۔

حیدر، کے ایف۔ ۲۰، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۹۶، ۱۰۳، ۱۱۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۸، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۶۳، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۹۲، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۷، ۳۱۱، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۷، ۳۴۲، ۳۵۵، ۳۵۷، ۳۶۵، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۲، ۳۷۷، ۳۷۹، ۳۸۱، ۴۰۳۔

حیدر، مصطفیٰ۔ ۲۰، ۱۷۲، ۲۸۲، ۳۲۸۔

حیدری، سر اکبر۔ ۸۶۔

خ

خالد، یوسف (میٹھا)۔ ۳۵۶۔

خان، امیر حبیب اللہ۔ ۱۵۴۔

خان، اے جی۔ ۳۷۷، ۴۲۲۔

خان، ایوب۔ ۱۰۵، ۱۸۴، ۱۹۰، ۱۹۱، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۴۴، ۲۵۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۳۰۱، ۳۴۲، ۳۹۷۔

خان، راجا ابوالحسن۔ ۳۱۲۔

خان، سر ظفر اللہ۔ ۲۵۰۔

خان، عزیز۔ ۴۱۲، ۴۱۳۔

خان، عمر۔ ۱۲۸۔

خان، لیاقت علی۔ ۴۷، ۶۸، ۱۵۷، ۱۹۷، ۲۲۶، ۲۳۳۔

خان، محمد۔ ۱۲۳۔

خان، ڈاکٹر محمد سعید۔ ۱۷۸، ۳۶۴، ۳۶۵، ۴۰۰۔

خان، مہاراجا محمد علی محمد۔ ۲۰۹۔

خان، نواب نصر اللہ۔ ۱۲۳۔

خان، نور۔ ۳۰۱۔

خان، نیاز احمد۔ ۳۶۱۔

خان، یحییٰ۔ ۲۳۷، ۲۹۱، ۳۰۱۔

خراسانی، امین۔ ۲۴۸، ۳۷۹۔

خلیق الزماں، چودھری۔ ۵۴، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۷، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۲۰۹، ۳۱۹۔

خلیلی، ضیا۔ ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۹۔

خلیلی، عباس۔ ۴۷، ۸۷، ۸۸، ۱۰۳، ۱۷۷، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۶، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۳، ۲۴۸، ۲۵۱، ۳۴۴، ۳۷۸، ۳۹۴، ۳۹۷۔

خلیلی، محمد۔ ۱۸۳۔

خیری، سعد۔ ۶۵۔

د

داغ، نواب مرزا۔ ۵۳۔

داؤد، سر آدمجی حاجی احمد (آدمجی سیٹھ)۔ ۲۰۲، ۲۱۹، ۲۳۶، ۳۰۴۔

دُباش، روسی۔ ۸۰، ۹۷، ۱۰۵، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۳۔

دت، رمیش چندر۔ ۳۸۔

دستور۔ ۱۰۲۔

دیانند سارس وتی، سوامی۔ ۲۸۔

ڈ

ڈاؤلن، ڈیوڈ۔ ۴۰، ۸۸، ۳۹۱، ۴۱۲۔

ڈریک، ایلین سی۔ ۴۰۔

ڈزرائیلی، وزیر اعظم۔ ۱۷۰۔

ڈفرن، لارڈ۔ ۳۸، ۴۵۔

ڈی، ایمٹ۔ ۳۹۱۔

ر

راجا صاحب محمود آباد۔ ۲۲، ۶۸، ۸۷، ۱۲۷، ۱۳۲، ۱۵۱، ۱۵۷، ۱۷۳، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷۔

رحمٰن، (مٹھو سیٹھ)۔ ۱۵۲، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۳۔

رحمت اللہ، حبیب ابراہیم۔ ۱۸۹، ۳۷۳۔

رحمت علی، چودھری۔ ۵۴۔

رحیم، عظیم۔ ۱۱۲، ۳۵۲، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۷۹، ۳۸۱، ۴۲۳، ۴۲۵۔

رحیم، علی۔ ۳۵۸۔

رحیم، نرگس۔ ۳۶۸۔

رشتر، پروفیسر۔ ۱۷۔

رشید۔ ۲۴۴۔

رشید، ایس اے۔ ۲۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴۔

رشید، ہارون۔ ۳۸۲۔

رضا، آغا۔ ۸۷، ۹۶۔

رضوی، ایم ایچ۔ ۴۱۵، ۴۲۲، ۴۲۴۔

رفیق، شیخ۔ ۴۸۔

رفیقی، بشیر احمد۔ ۳۷۴۔

رنگون والا۔ ۵۱، ۲۹۶، ۳۰۴۔

روپرٹی، ارنسٹ جسٹس۔ ۳۰۵۔

روپرٹی، مسز۔ ۳۰۵۔

ریاست اللہ۔ ۱۷۵، ۱۷۶، ۳۶۹۔

ریڈنگ، وائسرائے لارڈ۔ ۱۲۵۔

ریلے، سر والٹر۔ ۱۷۔

ز

زاہد، ساجد۔ ۲۲۸، ۳۱۰، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۷۹۔

زائرنگ، لارنس۔ ۴۱۔

زبیدالرحیم۔ ۲۸۸، ۲۹۲۔

زبیری، نوشابہ۔ ۳۱۷، ۳۲۰، ۳۲۴۔

زکریا۔ ۳۵۸۔

زومکا والا، سیف الدین۔ ۱۲، ۱۳، ۲۱، ۸۹، ۲۵۱، ۳۲۸، ۳۶۷، ۳۶۹، ۳۸۰، ۴۰۲، ۴۱۴، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰۔

س

ساچک، طاہر جی۔ ۹۰، ۲۵۱، ۳۹۲، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶۔

ساسون، سر وکٹر۔ ۸۵۔

سالماں (معین الدین)۔ ۲۹۶، ۳۰۰۔

سجانی، ایس سی (مامو)۔ ۸۰، ۹۷، ۱۰۴، ۱۰۵۔

سجانی، حمید۔ ۲۱، ۸۰، ۳۳۷۔

سدھوا، ڈی ایچ۔ ۲۰۔

سروانتے۔ ۳۷۱۔

سعید، خالد بن۔ ۳۷، ۴۵، ۶۹، ۱۵۰۔

سعید، محمد علی۔ ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱۔

سکندر۔ ۲۳۔

سلطان، ٹیپو۔ ۳۳۰۔

سلطان، عابدہ۔ ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۷۲، ۱۷۳،

۳۱۱، ۲۹۵۔
سلطانہ (شرافت والا جاہی)۔ ۳۳۷۔
سلیمان، سر شاہ۔ ۳۲۷۔
سمیع الحسن۔ ۳۹۲۔
سنگھ، بلدیو۔ ۶۸۔
سنگھ، ہوتے۔ ۱۸۴۔
سونیا۔ ۱۰۴۔
سہروردی، پروفیسر۔ ۳۰۶۔
سہروردی، حسین شہید۔ ۱۴۹، ۱۵۷، ۲۰۰، ۳۹۷۔

ش

شاہ، آغا جنگی۔ ۱۳۸۔
شاہ، بی کے۔ ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰۔
شاہ، سر سلطان محمد۔ ۱۹۳، ۳۳۳۔
شرما، شنکر دیال۔ ۱۳۰۔
شریف المجاہد۔ ۳۷۔
شفیع، سر محمد۔ ۱۴۱۔
شمس الحق۔ ۱۵۸۔
شمس العالم۔ ۲۰۔
شمیم (طاہر ساچک)۔ ۴۱۵۔
شمیم (محمد علی سعید)۔ ۲۵۱۔
شوارز، ہائنز ڈبلیو۔ ۸۷، ۸۸، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۵، ۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۹۹، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۵۵، ۳۷۶، ۳۷۷۔
شہاب الدین، جسٹس۔ ۲۴۸۔
شہنشاہ ایران۔ ۲۰۵۔
شیرازی، کے ایچ۔ ۸۶، ۱۰۰، ۴۰۶۔
شیرازی، غلام حسین۔ ۱۹۲، ۱۹۷۔

ص

صادق، محمد۔ ۹۶۔
صدیقی، اے یو۔ ۹۷، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۱۳۔
صدیقی، جہانگیر۔ ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۵، ۲۴۶، ۳۱۵۔
صدیقی، سلیم الزماں۔ ۲۹۶۔
صدیقی، عبدالرحمٰن (ARS)۔ ۲۲، ۸۵، ۸۶، ۱۲۴، ۱۲۷، ۱۴۹، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۹، ۲۰۲، ۲۸۱، ۲۸۲، ۳۱۱، ۳۳۲، ۳۵۷۔
صدیقی، مہتاب احمد۔ ۳۷۷۔
صدیقی، مہدی علی۔ ۳۲۔
صلاح الدین۔ ۲۸۲۔

ض

ضیاء الحق۔ ۳۲۵۔

ط

طارق، سلیم۔ ۴۲۳۔

ظ

ظفر اللہ خاں، چودھری محمد۔ ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۴۱۔
ظہیر، سیّد سجاد۔ ۳۲۰، ۳۲۵۔

ع

عابدی، آغا حسن۔ ۸۸، ۸۹، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۲۷، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۶۱، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۱، ۴۰۹، ۴۱۱، ۴۱۳، ۴۲۶۔
عالم، ایس ایف۔ ۳۲۷، ۳۲۸، ۴۰۱۔
عبدالحق، شیخ۔ ۸۹۔
عبدالرحیم، سر۔ ۱۸۳۔
عبدالستار، جسٹس۔ ۲۰۲، ۳۸۵، ۳۹۴، ۴۰۲۔
عبدالقادر، سر شیخ۔ ۲۰، ۳۹، ۵۰، ۵۶۔
عبداللہ، ارشد۔ ۸۹، ۳۹۸۔
عبداللہ، حسن علی۔ ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸۔
عزیز الرحمٰن۔ ۳۳۲۔
عطا محمد۔ ۴۸۔
عقیلی۔ ۲۳۰، ۲۹۶۔
علوی، محمد حسین۔ ۳۲۷، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸،

۳۹۲۳۹۱، ۴۰۱۔
علی، آغا ناصر۔۲۸۳، ۳۱۳، ۳۱۶۔
علی، اسد۔۱۲۴۔
علیؓ، حضرت ۔۱۳۶۔
علی، چودھری محمد۔۱۸۸، ۱۸۹۔
علی، حاکم ۔۲۲۱۔
علی، سرور۔۱۲۴۔
علی، شجاعت عثمان ۔۱۸۸۔
علی، عثمان ۔۸۷، ۱۰۳، ۱۹۲، ۳۸۵۔
علی، واصف ۔۲۴۴، ۴۰۶۔
علی، ملک برکت ۔۲۱۳۔
عیسیٰؑ، حضرت ۔۱۴۱۔

غ

غفار، پروفیسر۔۳۲۰۔

ف

فاروق، غلام ۔۱۰۳، ۲۰۱، ۲۳۰۔
فاطمہؓ، حضرت ۔۱۳۶۔
فدا، معین ۔۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳۔
فرائیڈ، سگمنڈ ۔۵۱۔
فرنچ، پیٹرک ۔۱۲۸۔
فصیح الدین، محمد ۔۲۸۱، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۴۰۶، ۴۲۲، ۴۲۳۔
فضل الحق، اے کے ۔۱۵۷، ۱۹۹، ۲۰۰۔
فضل الرحمٰن ۔۱۸۴۔
فیروزہ بیگم ۔۱۳۔
فیض، فیض احمد ۔۳۲۰، ۳۲۵۔
فیضی، امیر علی ۔۱۰۲، ۱۰۴، ۱۷۸، ۱۹۱۔

ق

قادر، منظور ۔۴۹۔
قاضی، این اے ۔۹۵، ۹۶، ۹۷، ۱۱۲۔
قاضی، پروفیسر۔۱۵۹، ۱۶۲، ۱۶۳۔
قاضی، ڈاکٹر زیڈ کے ۔۱۵۳۔
قریشی، شعیب ۔۸۵، ۱۰۰، ۱۲۷، ۱۵۱، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۶۳، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۹۰، ۲۴۲، ۳۹۷۔
قریشی، معین ۔۳۸۰۔

ک

کارول، لوئیس ۔۱۲۹۔
کاؤس جی، اردشیر۔۱۸۸۔
کبیر، ہمایوں ۔۱۸۴۔
کچز، لارڈ۔۱۴۰۔
کچلو، ڈاکٹر سیف الدین ۔۱۴۹۔
کرامت اللہ، محمد ۔۱۸۳، ۱۸۸، ۱۹۱۔
کرامت، یو۔۳۹۴۔
کرزن، لارڈ۔۴۱، ۶۱، ۱۳۹۔
کرمانی ۔۳۰۱۔
کرنوسکی ۔۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۰۳، ۱۶۹، ۲۱۰، ۲۴۸۔
کریم ۔۲۹۹، ۳۰۰۔
کلاڈیا۔۱۵۔
کلائی می ۔۱۰۶، ۱۰۷۔
کلف، ریڈ۔۲۴۔
کنٹریکٹر، زال ۔۱۷۷۔
کنیز عابد، رانی ۔۲۱۲۔
کولنز، بی ایم ۔۸۵، ۸۷، ۱۵۶، ۱۷۲۔
کولنز، کلائیو۔۱۷۱۔
کیرنن، پروفیسر۔۴۹۔

گ

گالینا (مسز شوارز)۔۳۰۵۔
گاندھی، مہاتما۔۲۳، ۳۴، ۴۴، ۶۰، ۶۱، ۶۴، ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰،

۷۳، ۱۲۴، ۱۳۸، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۵۴، ۱۶۰، ۱۶۸، ۱۸۵، ۱۸۶، ۲۲۹، ۳۱۹،
۳۹۶۔
گلیڈ اسٹن، ولیم ۔۴۲، ۱۷۰۔
گوکھلے، جی کے ۔۳۸، ۴۳، ۴۴، ۱۴۰، ۱۴۲۔
گوہر، الطاف ۔۳۸۵۔
گوئٹے، جان وولفگانگ ۔۵۱۔

ل

لارنس، لارڈ پیتھک ۔۷۰۔
لسٹوویل، لارڈ ولیم فرانسس ۔۶۶، ۷۴۔

م

ماچس والا، مسز ۔۴۳۱۔
مارکس، کارل ۔۵۱۔
مالک، ڈاکٹر ۔۳۸۵۔
مانجی، ڈاکٹر تاج الدین ۔۹۰، ۲۲۵، ۳۲۴، ۳۲۷، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱،
۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۱۶۔
مجتبیٰ ۔۴۲۲، ۴۲۳۔
مجیب الرحمٰن، شیخ ۔۱۵۷، ۲۰۴، ۲۸۹، ۲۹۲، ۳۳۴، ۴۰۲۔
محبوب، جسٹس میاں ۔۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۴۱۴۔
محسن الملک، نواب ۔۱۳۸، ۱۴۰۔
محمد الفیصل، شہزادہ ۔۳۸۷، ۳۸۸۔
محمدؐ، حضرت ۔۲۳، ۱۳۵، ۱۳۷۔
محمد خاں دہلوی، سر علی ۔۱۴۹۔
محمد، غلام ۔۲۲، ۸۰، ۸۵، ۱۱۰، ۱۲۷، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۶۳، ۱۶۸، ۱۷۱،
۱۷۴، ۱۸۸، ۱۸۹، ۲۰۵، ۲۳۰، ۲۳۳، ۲۴۸، ۲۵۰، ۲۹۷، ۳۳۲۔
محمود، ایس اے ۔۲۶۰۔
محمود، ڈاکٹر سید ۔۱۴۹۔
محمود، منصور ۔۱۵۲۔
محمود، نرگس ۔۳۶۸۔
مرزا اسکندر ۔۲۱۰، ۲۳۴، ۳۲۲، ۳۹۷۔
مرشد، عمر ۔۹۰، ۴۱۴۔
مسعود، سر سیڈ راس ۔۱۲۸۔
مسولینی ۔۶۱، ۶۵۔
مظہر الدین، ایس ایم ۔۲۹۷۔
معروف ۔۸۰۔
معین الدین، ایس ایم ۔ ۸۷، ۱۰۸، ۱۲۲، ۱۶۹، ۱۷۰، ۲۹۰، ۲۹۲،
۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۱۳، ۳۵۲، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۷۷،
۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳۔
مکھرجی، اے سی ۔۴۰، ۳۴۹، ۳۵۱، ۳۵۲۔
ملک، ایم ڈی ۔۴۲۲۔
ملک عطا اللہ ۔۳۵۹۔
ملک، مجید ۔۳۳۲۔
ماکانی، اقبال ۔۴۲۴۔
منٹو، لارڈ ۔۴۳، ۴۴، ۱۴۱۔
منی تک، ای این ۔۸۵، ۱۷۴۔
موتسارٹ ۔۳۷۱۔
مورائس فرینک ۔۱۸۴۔
مورلے، لارڈ ۔۴۲، ۴۳، ۱۴۱۔
موسیٰ ۔۲۳۔
مولیدینا، امیر علی ۔۳۲۸، ۴۰۷، ۴۲۳، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۹۔
مونٹاگو ۔۶۴۔
مہتا، ایچ اے ۔۱۰۲۔
مہتا، ایم آر ۔۲۰۔
مہتا، فیروز شاہ ۔۳۸۔
مہدی امام ۔۴۰۔
میاں، محمد ۔۲۱۔
میر حسن، سید ۔۴۸۔

ن

ناظم الدین، خواجہ ۔۱۴۹، ۱۶۱، ۱۷۲۔
نائیڈو، مسز سروجنی ۔۴۹، ۱۴۱، ۲۰۹۔
نشتر، جمیل ۔۳۳۳۔
نشتر، سردار عبدالرب ۔۳۳۳۔

نظام حیدرآباد ۔۲۲، ۴۳، ۷۳، ۸۶، ۹۷، ۹۹، ۱۳۴، ۲۱۲، ۳۲۰، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۴۰۔

نقوی، ایس اے ۔۳۲۸۔

نمازی، مریم ۔۱۸۳۔

نواب بہادر یار جنگ ۔۳۳۱، ۳۳۲۔

نواب بھوپال، سر حمید اللہ خان ۔۸۵، ۹۷، ۹۹، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۴، ۱۵۱، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۷، ۱۹۳، ۲۰۲، ۲۰۸، ۲۹۷، ۲۹۹۔

نواب، ڈھاکا ۔۱۵۷۔

نواب، رام پور ۔۱۵۶۔

نور الدین، خواجہ ۔۱۲۴، ۱۶۱، ۱۹۹، ۲۰۰۔

نور محمد ۔۴۸۔

نورو جی، دادا بھائی ۔۳۸، ۶۷۔

نہرو، جواہر لال ۔۳۴، ۶۰، ۶۴، ۶۵، ۶۸، ۶۹، ۱۲۴، ۱۲۸، ۱۶۸، ۱۸۴، ۱۹۴، ۲۰۹، ۲۴۹، ۳۱۹۔

نہرو، موتی لال ۔۴۴، ۱۲۸۔

و

والا جاہ، محمد علی ۔۳۳۰۔

والا جاہی، شرافت ۔۱۷۶، ۳۲۷، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۴۲، ۳۷۹، ۴۰۱، ۴۱۲، ۴۲۲۔

والا جاہی، نواب نور اللہ ۔۳۳۰، ۳۳۲۔

والپرٹ، اسٹینلے ۔۶۰، ۶۱۔

وحید الزمان ۔۲۰۴، ۲۹۱۔

وصال الدین، محمد ۔۸۷، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۹، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۶۴، ۳۷۹، ۳۸۴۔

وقار الملک، نواب ۴۲، ۱۴۹۔

وکٹوریہ، ملکہ عظمیٰ ۔۳۸، ۴۱، ۶۳، ۱۳۸۔

ووک، ہر ۔۱۹۰، ۲۴۲۔

وویکا نند، سوامی ۔۲۸۔

ویٹیل ۔۳۶۰۔

ہ

ہارڈنگ، لارڈ ۔۱۵۴۔

ہارون، سر عبداللہ ۔۲۲۰۔

ہارون، محمود ۔۱۷۔

ہارون، یوسف ۔۲۲۰، ۳۳۴۔

ہاشم، ایم اے ۔۹۶، ۹۷، ۳۳۳۔

ہاشمی ۔۸۷۔

ہان، پروفیسر ۔۲۹۶۔

ہٹلر، ایڈولف ۔۳۰۵۔

ہرمر ۔۱۶۹۔

ہنٹر، سر ولیم ۔۲۷۔

ہوڈسن، ایچ وی ۔۷۰، ۷۴۔

ہیوم، ایلن آکٹاوین ۔۳۸۔

ی

یاکمین (معین الدین) ۲۹۶، ۳۰۰۔

یوسف، اباعلی ۔۳۸۳، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۴۱۴۔

یوسف، ایس ایم ۔۱۰۳، ۱۰۴، ۱۸۸، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۴۴، ۳۸۵، ۴۰۲، ۴۰۶۔

یوسف، میاں ۔۳۱۲۔